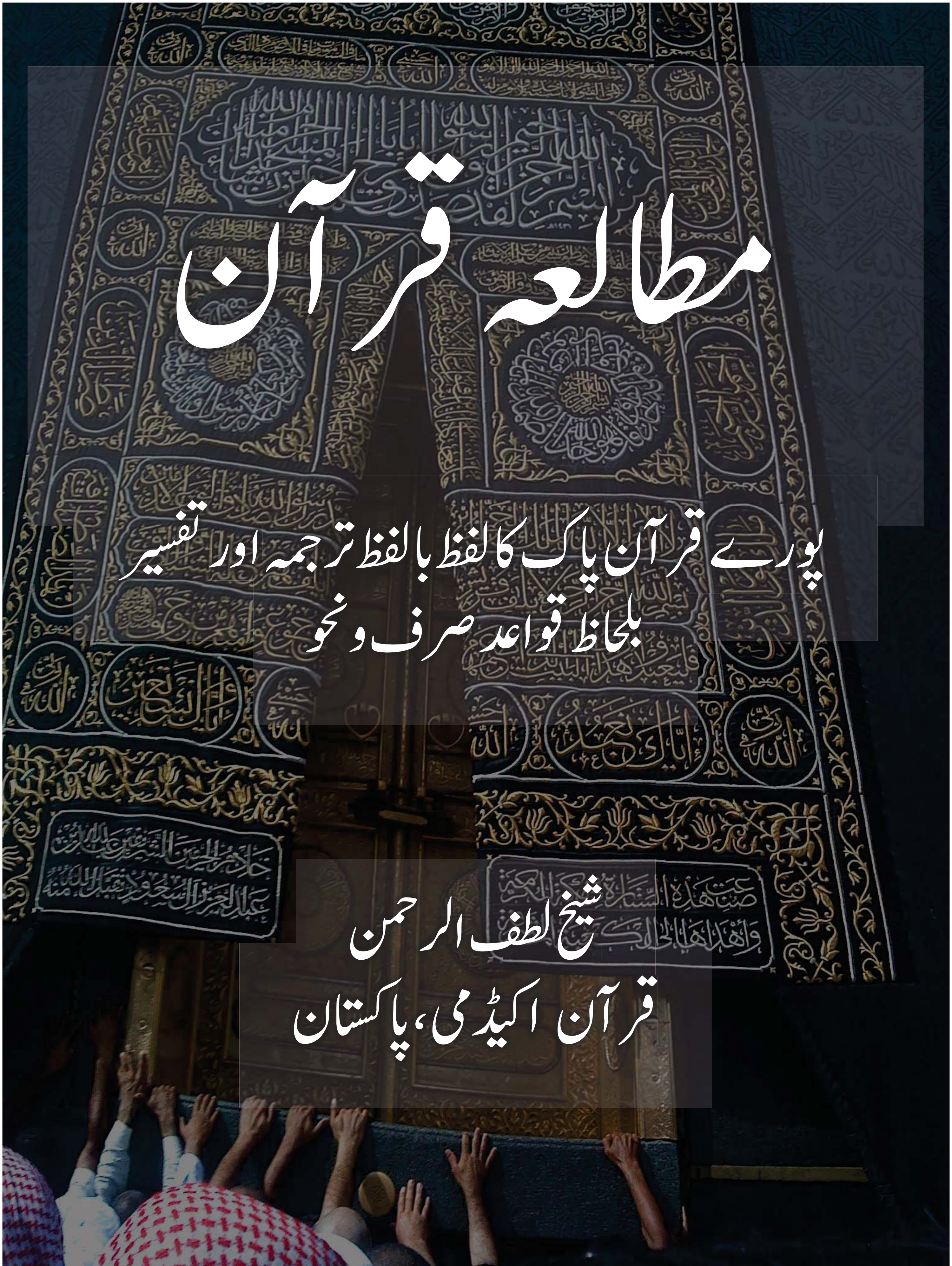

مطالعہ قرآن

پورے قرآن پاک کا لفظ بالفظ ترجمہ اور تفسیر
بلحاظ قواعد صرف و نحو

شیخ لطف الرحمن
قرآن اکیڈمی، پاکستان

تقریظ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ترجمہ وتفسیر القرآن کی مساعیٔ حسنہ

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اپنے آخری نبی ورسول حضرت محمد ﷺ کو ساری دنیا کے انسانوں کے لیے ہدایت کی خاطر مبعوث کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے: ((لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهِ)) تاکہ دینِ حق کو تمام ادیانِ باطلہ پر غالب کردیں۔ چنانچہ اس حقیقت کا پوری دنیا میں اعتراف پایا جاتا ہے کہ مذاہبِ عالم میں اسلام ہی واحد دین ایسا ہے جو تا قیامت انسانوں کی ہر شعبۂ زندگی میں منفردانہ رہنمائی کا آئینہ دار ہے، اور کتبِ سماوی میں سے قرآن کریم ہی واحد کتاب ایسی ہے جو تحریف وتغیر سے پاک ہے اور حضور سید المرسلین حضرت محمد ﷺ کی ذاتِ اقدس پر جس صورت اور جن معلومات اور حقائق پر مشتمل نازل ہوئی تھی بعینہ وہ آج بھی دنیا میں اسی طرح موجود ہے اور یہ واحد کتاب ایسی ہے جس کی ہمہ نوعیت کی حفاظت کا اللہ تعالیٰ نے اعلان فرمایا ہے اور ذمہ داری لی ہے جبکہ دیگر کتبِ سماویہ کی حفاظت اور ذمہ داری قبول کرنے کے احکام قطعاً نہیں ہیں۔

قرآن کریم کی حفاظت کے عملی اقدامات میں سے اُمت مسلمہ کے قائم کردہ تحفیظ القرآن، دینی تعلیم کے مدارس اور حلقہ ہائے تدریس، تعلیم اور تفسیر القرآن بھی ہیں، نیز قرآنی تدبر اور تفکر کے سلسلے میں جو مساعیٔ حسنہ بروئے کار آرہی ہیں وہ بھی تحفیظ القرآن اور غلبہ اسلام ہی کی مستحسن کوششیں ہیں۔

اس سلسلے میں دنیائے اسلام کے دوش بدوش اسلامی مملکت پاکستان میں بھی تدریس وتفہیم القرآن کی حتی المقدور کوششیں متلاشیانِ حق کے لیے مشعل راہ ہیں انہی میں سے ہمارے لائق صد تحسین عزیز ڈاکٹر جہاں زیب صاحب کی قابل ستائش وتبریک مساعیٔ حسنہ ہیں جو وہ باذوق اور سلجھے ہوئے جدید تعلیم یافتہ حلقے میں درس وتعلیم القرآن کے سلسلے میں انجام دے رہے ہیں۔ مجھے ان کے حلقۂ درسِ قرآن کریم میں شرکت اور ان کے طریقۂ تدریس کے مشاہدے کا موقع ملا ہے، مجھے بے حد خوشی اور اطمینان ہوا کہ ان کا انداز نہایت مؤثر اور عصر حاضر کے تقاضے کے عین مطابق ہے۔ وہ الفاظ کی صرفی اور نحوی تراکیب سے لے کر معانی اور تفسیر تک ماہرانہ دسترس رکھتے ہیں اور خوب مطالعۂ تفاسیر کرتے ہیں۔ مجھے مزید مسرت اس پر ہوئی کہ وہ اپنے حلقۂ درس میں پیش کیے گئے اسباق پر مشتمل ''مطالعۂ قرآن مجید'' کے نام سے کتاب شائع کرنے کا اہتمام کر رہے ہیں جو ایک ایسی پیشکش ہے جس سے حلقۂ درس کے علاوہ امت مسلمہ کے دیگر افراد بھی استفادہ کرسکیں گے۔ یہ ایک مستحسن اقدام اور صدقہ جاریہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ڈاکٹر جہاں زیب صاحب کو جہاں انسانی ظاہری بیماریوں کے علاج کا ماہر بنایا ہے اسی طرح انسانوں کی روحانی امراض کے صحیح علاج اور بالیدگی کے سلسلے میں اللہ ان کی مساعیٔ حسنہ میں مزید نکھار، ترقی اور فکر سلیم کی نعمتوں سے نوازتا رہے اور ان کی عرق ریزیوں اور کاوشوں کو شرف قبولیت عطا کرے تاکہ امت مسلمہ کے افراد اس سے استفادہ کر کے دنیا اور آخرت میں کامرانی سے ہمکنار ہو سکیں۔ وَبِاللّٰهِ التوفیق۔

دعا گو

مجاہد الحسینی

فاضل دار العلوم ڈابھیل (انڈیا)

کتاب سیرت پر اول صدارتی ایوارڈ یافتہ

سابق ایڈیٹر روزنامہ آزاد، روزنامہ نوائے پاکستان

ہفت روزہ خدام الدین، لاہور۔

۶ ذی الحجہ ۱۴۳۱ھ

۱۳ نومبر ۲۰۱۰ء

رہائش:

۶۵۔ بی پیپلز کالونی

فیصل آباد

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سنہری زنجیر کی ایک کڑی

قرآن کے پیاسوں کی پیاس بجھانے کے لیے فہم القرآن میں سہولتیں فراہم کرنے کا سلسلہ بہت قدیم بھی ہے، بہت طویل بھی ہے اور یہ ایک سلسلہ لامتناہی ہے۔ اس کی تفصیل میں جانا یہاں مقصود نہیں ہے۔ اس وقت صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ عربی کے شارٹ کورسز کرنے والوں کے لیے گرامر کے لحاظ سے قرآن مجید کے چھ اسباق مرتب کرنے کا جب میں نے فیصلہ کیا تھا، اس وقت مجھے یاد آیا تھا کہ خود میں نے جب عربی پڑھنے کے بعد قرآن کو از خود سمجھنے کی کوشش کی تھی تو سب سے زیادہ مشکل مجھے عربی ڈکشنری دیکھنے میں پیش آتی تھی۔ کیونکہ کوئی لفظ عربی ادب میں جتنے معانی میں استعمال ہوتا ہے وہ تمام معانی ڈکشنری میں دیے ہوتے تھے اور مجھے یہ فیصلہ کرنے میں مشکل بھی ہوتی تھی اور وقت بھی لگتا تھا کہ اس آیت میں یہ لفظ کس معنی میں آیا ہے۔ امام راغب اصفہانیؒ کی مفردات القرآن نے بڑی حد تک اس مشکل کو آسان کیا۔ کیونکہ اس میں صرف اُن الفاظ کے مادے دیے گئے ہیں جو قرآن میں استعمال ہوئے ہیں اور ہر لفظ کے زیادہ تر وہی معنی دیے ہیں جس معنی میں وہ قرآن میں آیا ہے۔ اور قرآن مجید کی آیات کا حوالہ بھی دیا گیا ہے جس کی وجہ سے ہمارے جیسے قرآن کے مبتدی طلبہ کو الفاظ کے معنی سمجھنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔ اس آسانی کے ساتھ کچھ تشنگی بھی محسوس ہوئی۔ ایک یہ کہ اُس میں یہ نہیں دیا ہے کہ کوئی مادہ ثلاثی مجرد کے کس باب میں آتا ہے۔ نیز یہ کہ کسی مادہ سے بننے والے جتنے الفاظ قرآن میں آئے ہیں، اُن میں سے چند ایک کی وضاحت کی گئی ہے، باقی بہت کچھ طلبہ کی ذہانت پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ عقلمنداں را اشارہ ہی است، قسم کے عقلمند طلبہ امام صاحب کے زمانے میں ہوا کرتے تھے۔ آج کل تو ہمارے جیسے طلبہ کی اکثریت ہے۔ اس لیے اس خلا کو پر کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

چنانچہ مطالعہ قرآن حکیم کے اسباق مرتب کرنے میں آیات کی ترکیب (Sentence Analysis) سے پہلے الفاظ کے معانی بھی دینے کا فیصلہ کیا اور طے کیا کہ ہر مادے کا ثلاثی مجرد میں استعمال دیا جائے گا، خواہ اُس باب کے کوئی فعل قرآن مجید میں آیا ہو یا نہ آیا ہو۔ اس کے ساتھ ہی اُس مادہ سے بننے والے جتنے الفاظ قرآن مجید میں آئے ہیں، اُن سب کے معانی آیات کے حوالے کے ساتھ جائیں گے۔ اِس کوشش میں بھی البلاغ فاؤنڈیشن کے متعدد طلبہ متعدد پہلوؤں سے تشنگی محسوس کر رہے ہیں۔ مثلاً افعال میں مفعول کے ساتھ صلہ کا استعمال نہیں دیا ہے، اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہ۔ چند الفاظ کو چھوڑ کر زیادہ تر الفاظ کے لغوی مفہوم اور اصطلاحی مفہوم کے باہمی ربط کو نہیں کھولا گیا ہے۔ مترادفات القرآن یعنی ایسے الفاظ جو ہم معنی یا قریب معنی ہوں، جیسے جَآءَ (آنا)، قَدِمَ (آنا)، اَتٰی (آنا)، اُن الفاظ کے باہمی تقابل اور فرق کی وضاحت نہیں کی گئی، وغیرہ۔ طلبہ نے جب میری ان فروگزاشتوں کی نشاندہی کرنا شروع کی تھی اُس وقت تک میں تقریباً ۲۴، ۲۵ پاروں کے اسباق مرتب کر چکا تھا اور میرے لیے عملاً ان تشنگیوں کو دور کرنا ممکن نہ رہا تھا۔ البتہ میری خواہش بھی تھی اور دعا بھی کہ اللہ تعالیٰ اپنے خصوصی فضل سے کسی کو توفیق دے کہ وہ مذکورہ خلاؤں کو پر کر دے۔

یہ جان کر مجھے خوشی بھی ہوئی ہے اور میں نے اپنے رب کا شکر ادا کیا ہے کہ فاؤنڈیشن کے ایک طالبعلم ڈاکٹر جہاں زیب ندیم سلمہٗ نے اس کام کو مکمل کرنے کا نہ صرف عزم کیا ہے بلکہ بڑی عرق ریزی کے ساتھ اس کی ابتداء بھی کر دی ہے۔ اس بات پر مجھے انشراح صدر حاصل ہے کہ ڈاکٹر جہاں زیب سلمہٗ کی یہ کاوش فہم القرآن کے لیے سہولتیں فراہم کرنے والی سنہری زنجیر کی ایک اہم کڑی ثابت ہوگی۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں استطاعت اور استقامت عطا فرمائے اور ان کے ہاتھوں اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دے۔ اور اس کام کو ان کے لیے اور ان کے تمام معاونین و کارکنان کے لیے بہترین صدقۂ جاریہ اور ذخیرہ آخرت بنا دے۔ (آمین)

لطف الرحمٰن خان
البلاغ فاؤنڈیشن لاہور
مورخہ ۲۱ ذیقعدہ ۱۴۳۱ھ
بمطابق ۳۰ اکتوبر ۲۰۱۰ء

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قرآن حکیم، اللہ تعالیٰ کا نوع انسانی کے نام آخری مستند (authentic) کلام ہے جو نوع انسانی کی ہدایت و رہنمائی کے لیے نازل ہوا۔ کلام بلاشبہ اللہ کا ہے، لیکن اللہ نے نوع انسانی تک اسے پہنچانے کے لیے اپنے محبوب ترین بندے، فخر موجودات، رسول کامل، محمد عربی ﷺ کو ذریعہ بنایا اور انہی کو ''رحمۃ اللعالمین'' کے اعلیٰ ترین لقب سے سرفراز فرمایا۔ بقول علامہ اقبال ؎

نوع انسانی را پیامِ آخریں حامل اُو رحمۃً للعالمین

اللہ کا یہ ابدی پیغام صرف اہل عرب کے لیے نہیں تھا، پوری نوع انسانی کے نام تھا محض چودہ سو سال قبل کے اُس دور کے لیے نہیں تھا جب یہ نازل کیا گیا، بلکہ قیامت تک آنے والے ہر انسان کے نام تھا۔ نبی آخر الزمان ﷺ اپنی 63 سالہ حیات دنیوی میں جزیرہ نمائے عرب کی حد تک اپنے مشن کی تکمیل فرما کر، رفیق اعلیٰ کی طرف مراجعت فرما گئے۔ خطبہ حجۃ الوداع کے موقع پر ایک لاکھ سے زائد امتیوں سے یہ گواہی لے کر کہ ''انا نشھد انك قد بلغت و ادیت و نصحت'' اس مشن کو امت کے کندھوں پر منتقل کرتے ہوئے فرمایا کہ ''فلیبلغ الشاھد الغائب'' یعنی جو لوگ یہاں موجود ہیں اور اس بات کے گواہ ہیں کہ میں نے اللہ کے پیغام کو پہنچانے کا ہر اعتبار سے حق ادا کر دیا ہے وہ اب اس پیغام کو بقیہ نوع انسانی تک پہنچانے میں اپنا کردار ادا کریں۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ آج یہ اُمت بحیثیت مجموعی اپنے اس اہم فرض منصبی کو فراموش کر چکی ہے۔ علامہ اقبال نے اس حوالے سے قوم کو جگانے کی کوشش کی تھی۔ ''جوابِ شکوہ'' میں اللہ کی طرف یہ پیغام نہایت خوبصورت الفاظ میں امت تک پہنچایا ؎

وقت فرصت ہے کہاں، کام ابھی باقی ہے نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے!

اگرچہ یہ تلخ حقیقت ہے کہ امت بحیثیت مجموعی اس ذمہ داری سے غافل ہے، لیکن یہ بھی امر واقعہ ہے ہر دور میں کچھ لوگ امت میں اس مشن کو لے کر آگے بڑھتے رہے ہیں، اور سچی بات تو یہ ہے کہ آج اس حوالے سے کرنے کا اہم ترین کام یہ ہے کہ خود مسلمانوں کا رشتہ قرآن مجید کی ساتھ از سر نو جوڑا جائے اور انہیں قرآن کے ابدی پیغام اور کامل ہدایت کی طرف موثر انداز میں متوجہ کیا جائے۔ قرآن حکیم کو محض ایک مقدس کتاب کا درجہ دینے کی بجائے اسے فی الواقع کتاب ہدایت کے طور پر متعارف کیا جائے اور اسے سمجھ کر پڑھنے اور اس کی علمی و عملی رہنمائی سے فائدہ اٹھانے کی طرف انہیں آمادۂ عمل کیا جائے۔ اس معاملے میں ابتدائی اور اہم رکاوٹ زبان کی مغائرت ہے۔ عربی زبان سے ایک خاص حد تک واقفیت جب تک نہ ہو، ہم اس کلام کی عظمت اور اس کی دلوں کو بدل دینے اور باطن میں انقلاب برپا کرنے والی تاثیر سے صحیح طور پر استفادہ نہیں کر سکتے۔ بقول اقبال ؎

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف

قرآن کے نور ہدایت اور اس کی تاثیر سے حقیقی معنوں میں استفادے کے لیے عربی زبان اور اس کے قواعد کا فہم ناگزیر ہے۔ اسی ضمن میں اُن طالبانِ قرآن کی سہولت کی خاطر جو قرآن حکیم سے براہِ راست استفادہ کی لذت سے اپنے قلوب کو شاد کام کرنا چاہتے ہیں، بعض عاشقانِ قرآن نے تعلیم و تعلّم قرآن کو اپنی زندگی کا مشن بنایا اور فہم قرآن کی رکاوٹوں کو دور کرنے کے حوالے سے طالبان قرآن کی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دیا۔ زیر نظر کتاب کے مؤلف برادرم ڈاکٹر جہاں زیب ندیم بھی ان خوش نصیب لوگوں میں سے ہیں جن کو اللہ نے اس مبارک گروہ کا حصہ بننے کی سعادت عطا فرمائی۔ انہوں نے اپنی دیگر ہمہ جہت دنیاوی مصروفیات کے ساتھ ساتھ قرآن مجید کے حوالے سے اُس مشن کو آگے بڑھانے کی خاطر نہایت محنت اور عرق ریزی کے ساتھ کام کیا جس کا آغاز بقول برادرم ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب، اس دور میں استاد محترم حافظ احمد یارؒ نے کیا تھا اور جسے اوّلاً ان کے ایک شاگرد محترم لطف الرحمٰن صاحب نے آگے بڑھایا اور جس میں مزید آگے قدم بڑھانے کی سعادت برادرم ڈاکٹر جہاں زیب ندیم صاحب کو حاصل ہوئی۔ یہ کام بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی کاوشوں کو شرف قبول عطا فرمائے اور جس نہایت اہم کام کا آغاز انہوں نے اللہ تبارک و تعالیٰ کے بھروسے پر کیا ہے اسے مکمل کرنے کی ہمت اور توفیق بھی عطا فرمائے۔

ع ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد!

احقر

حافظ عاکف سعید عفی عنہ

امیر تنظیم اسلامی

سرپرست انجمن خدام القرآن، فیصل آباد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآن حکیم کلامُ اللہ ہے اور رسول اللہؐ کا ارشاد ہے: ''کلام اللہ کی فضیلت و برتری دیگر تمام کلاموں پر ایسے ہے جیسے خود اللہ کی فضیلت اس کی تمام مخلوقات پر۔''

قرآن حکیم اپنی اس غیر معمولی عظمت کے ساتھ معجزۂ خالدہ ہے اور رہتی انسانیت کے لیے سرچشمۂ ہدایت اور منبعِ علم وعرفان ہے۔ ہر دور میں اربابِ فکر و دانش نے اپنے اپنے شعبۂ ہائے تخصّص کے مطابق مختلف پہلوؤں سے اسے مطالعہ وتحقیق کا موضوع بنایا ہے اور زمانے کے نت نئے تقاضوں کے مطابق اس سے ہدایت کشید کرنے کی کوشش کی ہے۔لیکن یہ آخری آسمانی معجز کتاب وہ بحرِ ناپید کنار ہے جس میں مزید غوّاصی کی گنجائش ہمیشہ موجود رہے گی۔

ڈاکٹر جہانزیب ندیم صاحب انجمن خدام القرآن فیصل آباد سے وابستہ ایک علم دوست کارکن ہیں جنہوں نے بنیادی طور پر ڈاکٹر اسرار احمد صاحب سے استفادہ کرتے ہوئے عربی زبان وگرامر اور فہمِ قرآن کو اپنی محنت کا میدان بنایا اور قابل قدر استعداد حاصل کر کے قرآنِ حکیم کے درس و تدریس میں جتے ہوئے ہیں۔

باذوق احباب کے مشورے سے انہوں نے ایک وقیع کام کا بیڑا اُٹھایا ہے اور وہ یہ کہ تفاسیر اور عربی لغت وگرامر کی معاون کتب سے استفادہ کرتے ہوئے آیت درآیت تین قسم کا مواد ترتیب دیا جائے:

(۱) ہر نئے کلمہ کی ایسی لُغوی تشریح کہ اُس کے تین حرفی مادے سے نکلتی ہوئی جتنی شکلیں بھی قرآن میں کہیں استعمال ہوئی ہیں ان کا احاطہ ہوجائے اور معنوی تغیر وارتقاء سامنے آجائے جس سے ایک مادۂ اشتقاق رکھنے والے تمام کلماتِ قرآنی کے درمیان ربط قائم ہو کر تفسیرُ القرآن بالقرآن کی راہ ہموار ہوسکے۔

(۲) ہر آیت کے ہر جملہ کی نحوی ترکیب عام فہم انداز میں بیان کردی جائے۔

(۳) اہم الفاظ وتعبیراتِ قرآنی پر جامع نوٹس بیان کردیے جائیں جن کی روشنی میں ان الفاظ وتعبیرات واصطلاحات کی معنوی گہرائی وگیرائی بھی سامنے آئے اور مختلف مفسرین کے نقطۂ ہائے نظر سے بھی آگاہی ہوجائے۔

بتوفیقہ تعالیٰ راقم الحروف تقریباً دو دہائیوں سے قرآنِ حکیم کی تدریس سے وابستہ ہے جس میں مدارس کے نصاب کے مطابق تدریس کے علاوہ عوامی درسِ قرآن اور جدید تعلیم یافتہ طبقات کے لیے فہمِ قرآن کلاسز وغیرہ کا سلسلہ شامل ہے۔راقم اپنے اس تدریسی تجربہ کے ضمن میں قدرے وسعت کے ساتھ اس منہج پر تالیفی کام کی ضرورت محسوس کرتا اور اسے اپنے ہدف میں شامل رکھے ہوئے تھا،لیکن معمولی پیش رفت کے بعد یہ کام تعطّل کا شکار تھا۔ڈاکٹر صاحب نے حُسنِ ظن کے تحت اپنے اس تالیفی کام پر نظرِ ثانی کو فرمایا تو راقم نے اسے اپنے ہدف کی تکمیل گردانتے ہوئے غنیمت سمجھا اور راقم اس کا معترف ہے کہ اس مجموعہ کے مرحلہ وار مطالعہ کے نتیجے میں کچھ افادہ تو نجانے کر پایا یا نہیں،لیکن بحمد للہ استفادہ کا موقع ضرور ملا ہے اور ڈاکٹر صاحب اس کام میں موفّق ومنصور نظر آئے ہیں۔

شاید اس امر کا اظہار بھی مناسب ہو کہ بعض غیر عالم عصری تعلیم یافتہ حضرات جب مطالعہ کے زور پر یا چند شارٹ کورسز کر کے دینی تعلیم وتدریس یا تالیف کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو راسخین فی العلم سے اپنے کو مستغنی سمجھ لیتے ہیں، دینی مسائل وعلوم میں رائے زنی میں بیباک ہوجاتے ہیں اور اپنی غیر معمولی قابلیت کے زعم میں مبتلا دکھائی دیتے ہیں،لیکن بحمد للہ انجمن خدام القرآن فیصل آباد کے حضرات ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب اور ان کے لائق تلامذہ ڈاکٹر جہانزیب صاحب اور ماہر عربیت عامر سہیل صاحب وغیرہ کو راقم نے اس سے کوسوں دُور پایا ہے۔ یہ حضرات اپنے دائرہ کار سے بخوبی واقف ہیں، اپنے مبلغِ علم سے زائد کے لیے اپنے کو اہلِ علم وفضل کا محتاج سمجھتے ہیں اور اپنے زیرِ درس احباب کو بھی اسی کی تلقین کرتے ہیں۔ زیرِ نظر مجموعہ میں بھی ڈاکٹر صاحب نے شاید ہی کہیں اپنی بات کی

ہو، معروف تفاسیر ہی کا تتبّع کیا ہے اور اسلوبِ نگارش بھی عمدہ ہے۔

ابتدائی عربی زبان و گرامر سے واقف ایسے حضرات جو قرآن فہمی میں رُسوخ چاہتے ہوں اور بڑی تفاسیر تک رسائی کے خواہاں ہوں وہ درمیانے مرحلے کے طور پر اگر اس مجموعہ کا مطالعہ کریں تو بہت مفید ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اس تالیف کے نفع کو عام و تام فرمائیں اور پہلی جلد کے بعد بقیہ جلدوں کی ترتیب و تدوین اور طباعت و اشاعت آسان فرمائیں۔

آمین بحرمة سيد المرسلين عليه الصلاة و التسليم

سعید احمد

فاضل وفاق المدارس العربیہ پاکستان

متخصّص جامعہ دار العلوم کراچی

ایم اے عربی انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد

امام و خطیب جامع مسجد الامین ستیانہ روڈ فیصل آباد

استاذ الحدیث جامعۃ الفرقان جڑانوالہ روڈ فیصل آباد

مرتب شارٹ اسلامک کورسز (النور ٹرسٹ)

28-03-2016

بسم اللہ الذی یسر القرآن للذکر

استاد محترم پروفیسر حافظ احمد یار صاحب نے لغت القرآن پر جو کام شروع کیا تھا اس کو اولاً لطف الرحمٰن خان صاحب اور اب عزیزم ڈاکٹر جہانزیب ندیم نے تفسیری زاویے کے اضافے کے ساتھ بڑی عرق ریزی سے آگے بڑھایا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کاوش کو ان کے حق میں قبول فرمائے اور ان کے والدین کے لیے صدقہ جاریہ بنائے۔ ڈاکٹر جہانزیب نے یہ کام کسی مشغلے کے طور پر نہیں بلکہ اسی لگن اور priority کے ساتھ کیا ہے جیسے انہوں نے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج سے M.B.B.S کیا تھا۔ موصوف کی یہ کاوش انشاء اللہ قرآن مجید کے طالب علموں اور قرآن حکیم پڑھانے والے مدرسین اور قرآن مجید پر تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے ایک reference book کا کام کرے گی، انشاء اللہ۔

ڈاکٹر عبدالسمیع

صدر انجمن خدام القرآن فیصل آباد

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرضِ مرتب

نَحۡمَدُہٗ وَ نُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ ... اَمَّا بَعۡدُ!

ایں سعادت بزورِ بازو نیست

تا نہ بخشد، خدائے بخشندہ

اس ناچیز نے تو زندگی میں کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ وہ کبھی قرآن مجید کے اسباق صرف، نحو اور لغت کے اعتبار سے مرتب کرے گا بلکہ راقم الحروف کی زندگی جس نہج پر گزر رہی تھی، اس زندگی میں اگر ناظرہ قرآن پڑھنے کا موقع ہی مل جاتا تو غنیمت تھا۔ یہ سب اللہ تعالیٰ ہی کا فضل ہے کہ آج راقم الحروف اپنے ''مطالعۂ قرآن مجید'' کی پہلی جلد کے لیے ''عرضِ مرتب'' لکھ رہا ہے۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ دل کے کسی کونے میں دین کی خدمت کی تمنّا ضرور تھی اور یہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کا خصوصی فضل ہے کہ زندگی کے نشیب و فراز میں یہ تمنّا قائم رہی۔

راقم الحروف کو سب سے پہلے جس شخصیت نے اسلام کی حقّانیت سے متعارف کروایا وہ ہیں جناب ڈاکٹر ذاکر نائیک صاحب۔ اِن کے بعد دو شخصیات ایسی ہیں جنہوں نے احقر کو سب سے زیادہ متاثر کیا۔ وہ دو شخصیات ہیں محترم جناب احمد دیدات صاحبؒ اور محترم جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحبؒ۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحبؒ ہی وہ شخصیت ہیں جنہوں نے ناچیز کو قرآنِ مجید کے ساتھ جوڑا اور قرآنِ مجید کے پیغام سے روشناس کروایا۔ ان ہی کے کہنے پر ناچیز نے عربی زبان کے بنیادی قواعد جناب لطف الرحمٰن خان صاحب (آسان عربی گرائمر حصّہ اوّل، دوم اور سوم)، محترم جناب ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب اور محترم جناب عامر سہیل صاحب سے سیکھے۔ لیکن میرا ہرگز یہ دعویٰ نہیں کہ میں نے عربی زبان میں مہارت حاصل کر لی ہے۔ بہرحال اپنی تمام تر کم علمی کے باوجود اساتذہ کے کہنے پر ابتدا میں کچھ عربی کلاسز اور کچھ سورتوں کی صرفی و نحوی تحلیل کی کلاسز پڑھائیں۔ پھر اساتذہ ہی کے کہنے پر درسِ قرآن کا آغاز کیا حالانکہ راقم الحروف اب بھی اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں سمجھتا۔ بہرحال اس ذمہ داری کو ادا کرنے کے لیے احقر نے ڈاکٹر اسرار احمد صاحبؒ کے دروس سے فائدہ اٹھانے کے ساتھ ساتھ دو کاموں کو ضروری جانا: ایک یہ کہ دورِ حاضر کے مستند علماء سے رجوع کیا جائے اور دوسرے یہ کہ جید علمائے کرام کی مستند تفاسیر سے استفادہ کیا جائے۔ چنانچہ سب سے پہلے راقم الحروف نے حضرت مولانا مجاہد الحسینی صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر قرآنِ مجید پڑھانے کی درخواست کی لیکن حضرت کی کبر سنی اور جسمانی صحت نے اس کی اجازت نہیں دی البتہ حضرت نے راقم الحروف کے حلقہ مطالعہ قرآنی میں شرکت کی حامی بھر لی اور پھر کچھ عرصہ باقاعدگی سے شرکت بھی کی۔ اس کے بعد جامعہ امدادیہ فیصل آباد کے جناب مفتی شعیب صاحب سے راقم الحروف نے کچھ عرصہ استفادہ کیا۔ پھر جناب مفتی سعید احمد صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر قرآن اور حدیث پڑھانے کی درخواست کی جو حضرت نے قبول کر لی اور ان سے باقاعدہ پڑھنے کا آغاز ہوا جو کہ تاحال جاری ہے۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ تفاسیر کے ذریعے جن بزرگوں سے قلبی اور روحانی تعلق قائم ہوا، ان کی بھی ایک لمبی فہرست ہے۔ سب سے زیادہ جن دو بزرگوں کو راقم الحروف نے اپنے قلب و روح کے قریب محسوس کیا وہ ہیں حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحبؒ اور حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی صاحبؒ۔ ان دونوں بزرگوں کی تفسیر عثمانی بلاشبہ بہترین تفسیروں میں سے ایک ہے۔ ان کے بعد جن بزرگوں کی تفاسیر سے احقر نے سب سے زیادہ راہنمائی حاصل کی وہ ہیں حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی صاحبؒ (بیان القرآن)، مفتی محمد شفیع صاحبؒ (معارف القرآن)، مولانا عبدالماجد دریابادی صاحبؒ (تفسیر ماجدیؒ)، حضرت مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ (تفہیم القرآن)، حضرت پیر کرم شاہ صاحبؒ (ضیاء القرآن)، حضرت مولانا محمد جوناگڑھیؒ اور حضرت مولانا صلاح الدین یوسفؒ (تفسیر

احسن البیان)، حضرت مولانا عبدالحق حقانی صاحبؒ (تفسیر فتح المنّان المشھور بہ تفسیر حقانی) اور حضرت مولانا امین احسن اصلاحی صاحبؒ (تدبر قرآن)۔ اِن تمام بزرگوں کی تفاسیر امت کا سرمایۂ علم ہیں اور حقیقت میں ان بزرگوں کے ساتھ تعلق کی وجہ بھی محترم جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحبؒ ہی ہیں۔ ہندوستان کی ایک اور نہایت اہم شخصیت جن سے تعلق کا ذریعہ بھی محترم جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحبؒ ہی بنے، وہ ہیں شاعر مشرق، علامہ محمد اقبال۔ حالانکہ احقر نہ کبھی اردو ادب کا طالب علم رہا ہے نہ ہی شاعری سے کوئی خاص لگاؤ ہے لیکن علامہ اقبال کی شاعری نے احقر کے قلب وجگر پر اَن مِٹ نقوش چھوڑے ہیں۔

احقر کی قرآنی خدمت ''مطالعۂ قرآنِ مجید'' کی بنیاد استادِ محترم جناب لطف الرحمٰن خان صاحب کی قرآنی خدمت ''مطالعہ قرآنِ حکیم'' پر ہے۔ اس خدمت کے لیے مندرجہ بالا کتب کے علاوہ امام راغبؒ کی مفردات القرآن، مولانا عبدالرشید نعمانیؒ کی لغات القرآن، مولانا عبدالرحمٰن کیلانیؒ کی مترادفات القرآن اور مصباح اللغات سے بھی بھرپور استفادہ کیا گیا ہے۔ نحوی تراکیب کے لیے محیي الدین الدرویشؒ کی ''اعراب القرآن الکریم و بیانہ''، محمد سید طنطاویؒ کی ''نور الیقین معجم و سیط فی اعراب القرآن الکریم'' اور محمود سلیمان یاقوتؒ کی ''اعراب القرآن الکریم'' سے استفادہ کیا گیا ہے۔ البتہ نحوی ترکیب کو سادہ اور عام فہم رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

دیکھیے میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ میں ہرگز اس کام کی اہلیت نہیں رکھتا اور نہ ہی میرے قلم میں ایسا زور ہے کہ اس خدمت کے ذریعے میں قرآن فہمی کے راستے سے تمام رکاوٹیں دور کردوں۔ اپنی اِن تمام کوتاہیوں کا پورا احساس ہوتے ہوئے بھی اِس خدمت کا کچھ حصہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس کی وجہ میرے پاس اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ اللہ ربّ العزّت نے ہی ایسا چاہا اور یہ ہوگیا۔ اسی مسبّب الاسباب نے اسباب فراہم کردیے اور اسی کی توفیق سے یہ خدمت ہوسکی۔ اب اسی سے دعا ہے کہ نبی اکرمؐ کے طفیل اس خدمت کو شرف قبولیت عطا فرمائے اور اسے عام کردے۔ اس ''مطالعہ قرآنِ مجید'' کو پڑھتے ہوئے اگر کہیں کوئی خوبی نظر آئے تو یقین کیجیے کہ اُس کی تعریف کی مستحق وہ ہستیاں ہیں جن کی خدمتِ قرآنی سے استفادہ کیا گیا اور کہیں کوئی کمی اور نقص نظر آئے تو اس کا ذمہ دار یہ احقر ہے۔

کوشش بھی ہے اور دعا بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ غلطیوں اور کوتاہیوں سے بچاتے ہوئے، خاص اپنی رحمت اور توفیق سے یہ کام پورا کروادے۔ اہل علم سے بھی درخواست ہے کہ غلطیوں اور کوتاہیوں کی نشاندہی کرکے اس کی اصلاح میں مدد کریں۔

آخر میں مَیں ہر اس شخص کا شکرگزار ہوں جس نے کسی بھی درجے میں اس تالیف میں میری مدد کی۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو بھی جزائے خیر عطا فرمائے اور میرے والدین، میرے بہن بھائیوں، بیوی بچوں، اساتذہ اور دوستوں سب کے لیے اسے صدقہ جاریہ اور ذخیرۂ آخرت بنادے۔ آمین۔

وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ○

جہاں زیب ندیم
انجمن خدام القرآن، فیصل آباد
jjzee4567@gmail.com
00-92-322-8664004

اِسۡتِعَاذَۃٌ

﴿ اَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ ﴾

ع و ذ

باب	مصدر/اسم	معانی
(ن)	(ا) مَعَاذًا	مَعَاذًا مصدر میمی ہے۔ کسی کی پناہ میں آنا۔ پناہ طلب کرنا۔ کسی کا دامن مضبوطی سے پکڑ لینا۔ ﴿ وَ اِنِّیۡ عُذۡتُ بِرَبِّیۡ وَ رَبِّکُمۡ اَنۡ تَرۡجُمُوۡنِ ﴿۲۰﴾ ﴾ (44/الدخان:20) ''اور میں پناہ لے چکا ہوں اپنے رب اور تمہارے رب کی اس بات سے کہ تم مجھ کو سنگسار کرو۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ) ﴿ وَّ اَنَّہٗ کَانَ رِجَالٌ مِّنَ الۡاِنۡسِ یَعُوۡذُوۡنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الۡجِنِّ ﴾ (72/الجن:6) ''اور یہ کہ تھے کتنے مرد آدمیوں میں سے پناہ پکڑتے تھے کتنے مردوں کی جنوں میں سے۔''
	(ب) مَعَاذٌ	مَعَاذٌ اسم ذات بھی ہے جس کا مطلب ہے ''پناہ''۔
(افعال)	اِعَاذَۃً	کسی کو کسی کی پناہ میں دینا۔ ﴿ وَ اِنِّیۡۤ اُعِیۡذُہَا بِکَ ﴾ (3/آل عمران:36) ''اور میں اس کو تیری پناہ میں دیتی ہوں۔'' باب افعال میں فعل کے ساتھ اُس کا مفعول بنفسہٖ آتا ہے اور پھر ''ب'' صلہ کے ساتھ اُس کا ذکر ہوتا ہے جس کی پناہ میں اُس مفعول کو دیا جائے۔
(تفعیل)	تَعۡوِیۡذًا	خود کسی کو پناہ دینا۔ اس باب سے قرآن میں فعل استعمال نہیں ہوا۔
(استفعال)	اِسۡتِعَاذَۃً	کسی کی پناہ طلب کرنا۔ ﴿ فَاِذَا قَرَاۡتَ الۡقُرۡاٰنَ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ ﴿۹۸﴾ ﴾ (16/النحل:98) ''پس جب تم قرآن پڑھو تو اللہ کی پناہ مانگو مردود شیطان سے۔'' شاید اس حکم کے نتیجے میں اَعُوۡذُ کا صیغہ استعمال ہوتا ہے یعنی میں آتا ہوں اللہ کی پناہ میں۔ (واللہ اعلم)

شیطان: لغت میں اس کے دو مادے آتے ہیں۔

(ا) ش ط ن

(ن)	شَطۡنًا	کسی سے دور ہونا۔ کسی کی مخالفت کرنا۔ عربی زبان میں بِئۡرٌ شَطُوۡنٌ کا مطلب ہے بہت گہرا کنواں یعنی جس کا پانی دور ہو۔ اسی طرح شَطَنَ الرَّجُلُ کا مطلب ہے آدمی حق سے دور ہوا۔
	شَیۡطٰنٌ	ج: شَیٰطِیۡنُ۔ ش ط ن مادے سے فَیۡعَالٌ کے وزن پر شَیۡطٰنٌ بنا ہے جس کا مطلب ہے بہت زیادہ دور ہونے والا اللہ کی رحمت سے یا حق سے۔ بہت زیادہ مخالفت کرنے والا حق کی۔

(ب) ش ی ط

(ض)	شِیَاطَۃً، شَیۡطًا	غصے سے سوختہ ہو جانا۔ جلنا
	شَیۡطٰنٌ	ش ی ط مادے سے فَعۡلَانٌ کے وزن پر شَیۡطٰنٌ بنتا ہے اور یہ مبالغے کا صیغہ ہے جس کا مطلب ہے بہت زیادہ جلنے والا، بہت زیادہ غصے سے سوختہ ہونے والا۔
نوٹ:	شَیۡطٰنٌ	شیطان ایک صفاتی نام ہے جو ہر سرکش کو کہتے ہیں خواہ جن ہو، انسان ہو یا حیوان ہو۔ جو بھی حق سے دوری اختیار کرے اور اُس کی مخالفت کرے وہ شیطان ہے۔ سب سے پہلے جس نے یہ کام کیا وہ ایک جن تھا اور اس سرکشی کی وجہ سے اُسے شیطان اور ابلیس کہا جاتا ہے۔ ابلیس بھی صفاتی نام ہے۔ اُس جن کا اصل نام عزازیل تھا (بحوالہ تفسیر ماجدیؒ، ص:925)۔

اسی طرح انسان کی ہر بری خصلت کو بھی شیطان کہا جاتا ہے اَلْحَسَدُ شَیْطَانٌ وَالْغَضَبُ شَیْطَانٌ (مفردات)۔شیطان کے مجازی معنی بدہیئت (بدشکل) سانپ کے بھی ہیں اور آیت ﴿طَلْعُهَا كَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّيٰطِيْنِ﴾ (37/ الصّٰفّٰت:65) میں یہی معنی مراد ہیں۔تفسیر ماجدیؒ میں اس کا ترجمہ یوں کیا گیا ہے ''اُس کے پھل ایسے ہیں جیسے سانپ کے پھن۔'' تفسیر عثمانیؒ میں اس کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے ''یعنی سخت بدنما شیطان کی صورت یا شیاطین کہا سانپوں کو یعنی اُس کا خوشہ سانپ کے سر کی طرح ہوگا جیسے ہمارے ہاں ایک درخت کو اسی تشبیہ سے ''ناگ پھن'' کہتے ہیں۔''

ر ج م

(ن) **رَجْمًا** سنگسار کرنا یعنی پتھر برسانا۔اَلرِّجَامُ پتھر کو کہتے ہیں اس سے اَلرَّجْمُ ہے۔جس کو سنگسار کیا گیا ہوا سے مَرْجُوْمٌ کہتے ہیں۔پھر استعارہ کے طور پر رَجْمٌ کا لفظ جھوٹے گمان، اندھیرے میں تیر چلانے، تکے مارنے، بدکلامی کرنے اور دھتکارنے کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔شیطان کو رَجِیْمٌ اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ ملائکہ اعلیٰ کے مراتب سے نکالا گیا۔﴿وَيَقُوْلُوْنَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًۢا بِالْغَيْبِ﴾ (18/الکھف:22) ''اور وہ لوگ کہتے ہیں پانچ ہیں اور چھٹا ان کا کتا ہے۔اندھیرے میں تیر چلاتے ہیں۔''

مَرْجُوْمٌ اِسم المفعول۔جس کو دھتکارا گیا۔سنگسار کیا گیا۔مردود۔﴿قَالُوْا لَىِٕنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰنُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ﴾ (26/الشعراء:116) ''اُن (مغروروں) نے کہا اے نوح! اگر تم باز نہ آئے (تو یاد رکھو) تمہیں ضرور سنگسار کر دیا جائے گا۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)

رَجِیْمٌ فَعِیْلٌ کے وزن میں ہمیشگی کا مفہوم ہوتا ہے اور یہ وزن اسم الفاعل اور اسم المفعول دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔رَجِیْمٌ اسم المفعول ہے یعنی رَجِیْمٌ بمعنی مَرْجُوْمٌ ہے۔سنگسار کیا ہوا۔مردود۔ہمیشہ کے لیے دھتکارا ہوا۔حضرت مولانا مودودیؒ فرماتے ہیں ''محاورے میں یہ لفظ اُس شخص کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جسے مقامِ عزت سے گرا دیا گیا ہو اور ذلیل و خوار کر کے رکھ دیا گیا ہو۔'' ﴿قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ﴾ (15/الحجر:34) ''اللہ تعالیٰ نے فرمایا تو نکل جا یہاں سے بے شک تو مردود ہے۔''

رُجُوْمٌ آلاتِ سنگساری۔یہ رَجْمٌ کی جمع ہے جو مصدر ہے۔اس کا اطلاق اس چیز پر بھی ہوتا ہے جس سے مارا جاتا ہے اسی استعمال کی وجہ سے اس کی جمع رُجُوْمٌ بنی ورنہ مصدر کی جمع نہیں ہوتی۔قرآن مجید میں شُهُبٌ (ستاروں) کو رُجُوْمٌ کہا گیا ہے۔﴿وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ﴾ (67/الملک:5) ''اور اُنہیں شیاطین کو مار بھگانے کا ذریعہ بنا دیا ہے۔''

ترکیب: اَعُوْذُ ثلاثی مجرد سے واحد متکلم کا صیغہ ہے (فعل + فاعل)۔اَعُوْذُ کے ساتھ عموماً دو صلے استعمال ہوتے ہیں جس کی پناہ طلب کی جائے اُس کے ساتھ ''بِ'' کا صلہ آتا ہے اور جس سے پناہ طلب کی جائے اُس کے ساتھ ''مِنْ'' آتا ہے۔اللہ کے ساتھ ''بِ'' کا صلہ ہے چنانچہ اللہ کی پناہ طلب کی جارہی ہے اور الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ جو کہ مرکب توصیفی ہے اس سے پہلے مِنْ کا صلہ ہے چنانچہ مردود شیطان سے پناہ طلب کی جارہی ہے۔دونوں مرکب جاری، بِاللّٰهِ اور مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ متعلق ہیں جملہ فعلیہ اَعُوْذُ کے۔

ترجمہ	اَعُوْذُ بِاللّٰهِ	مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ
	میں اللہ کی پناہ میں آتا ہوں	ہمیشہ کے لئے دھتکارے ہوئے شیطان سے

نوٹ۔1 مذکورہ بالا استعاذہ قرآن مجید کا حصہ نہیں ہے۔لیکن سورۃ النحل کی آیت نمبر 98 میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ جب تم قرآن پڑھو تو شیطان سے اللہ کی پناہ مانگ لیا کرو۔اس لئے قرآن پڑھتے وقت بسم اللہ سے پہلے استعاذہ پڑھنا ضروری ہے۔

نوٹ۔2 لفظ اللہ کے لیے آگے بسم اللہ دیکھیں۔

تَسْمِيَةٌ

﴿ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ① ﴾

س م و

باب	مصدر/اسم	معانی
(ن)	سُمُوًّا	بلند ہونا۔ نمایاں ہونا۔ عربی میں کہتے ہیں سَمَا اِلَيْهِ بَصَرِیْ۔ میری نظر اُس کی طرف اُٹھی یا سَمَوْتُ اِلَيْهِ بِبَصَرِیْ (ب تعدیہ) میں نے اس کی طرف اپنی نظر اٹھائی۔ جب کسی کا نام لیا جاتا ہے تو گویا اس کو بلند و بالا کرتے ہیں تا کہ وہ آنکھوں میں نچ جائے۔
(تفعیل)	تَسْمِيَةً	تَسْمِيَةً، تَفْعِلَةٌ کے وزن پر مصدر ہے۔ کسی کو نمایاں کرنا۔ کسی کا نام رکھنا۔ نام بولنا۔ نام لینا۔ ﴿وَ اِنِّیْ سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ﴾ (3/آل عمران:36) ''اور میں نے اس کا نام مریم رکھا ہے۔''
	سَمِّ	ج: سَمُّوْا۔ فعل امر ہے۔ تو نام لے۔ ﴿قُلْ سَمُّوْهُمْ ؕ﴾ (13/الرعد:33) ''آپ کہیے، تم نام لو اُن کے۔''
	مُسَمًّى	باب تفعیل سے اسم المفعول ہے۔ جس کا نام لیا گیا ہو۔ نام رکھا ہوا۔ نمایاں کیا ہوا۔ کوئی معین چیز۔ ﴿وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ ؕ كُلٌّ يَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ﴾ (13/الرعد:2) ''اور اس نے سورج اور چاند کو مسخر کیا۔ ہر ایک رواں ہے ایک معین وقت تک کے لئے۔''
	اِسْمٌ	ج: اَسْمَاءٌ۔ کسی چیز کی علامت جو اسے دوسروں سے نمایاں کرے۔ نام۔ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اِسْمٌ کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''اسم کا مفہوم عربی میں اردو کے نام سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ اسم وہ ہے جس کے ذریعہ سے کوئی چیز جانی جائے، پہچانی جائے اور یہ شناخت ممکن نہیں جب تک اعراض، خواص، آثار کا علم بھی ساتھ ساتھ نہ ہو۔'' (تفسیر ماجدیؒ، ص ۲۰)
	سَمِيٌّ	ہم نام اور مثل و مشابہ یعنی کسی کی مانند ہونا۔ نظیر ﴿هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا ۟ ع﴾ (19/مریم:65) ''کیا تم جانتے ہو اس کا کوئی ہم نام۔'' مطلب جو اس نام کا مستحق ہو۔ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ سَمِيٌّ کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''سَمِيٌّ کے ایک معنی تو یہی ''ہم نام'' کے ہیں۔ چنانچہ ائمہ تفسیر نے یہاں بھی یہی مراد لی ہے۔ لیکن لغت ہی میں ایک دوسرے سَمِيٌّ ''ہم صفت''، یا مثل، شبیہ و نظیر کا بھی پتہ چلتا ہے اور بعض اکابر لغت و اکابر تفسیر کے نزدیک وہی معنی یہاں ثابت ہیں۔'' (تفسیر ماجدیؒ، ص ۶۵۰)
	سَمَاءٌ	ج: سَمٰوٰتٌ۔ بلندی، آسمان، فضائے آسمانی۔ ہر شے کے بالائی حصے کو سَمَاءٌ کہتے ہیں جیسے اَرْضٌ بول کر ہر چیز کا نچلا حصہ مراد لیتے ہیں جیسے شاعر نے گھوڑے کی صفت میں کہا ہے

وَاَحْمَرُ كَالدِّيْبَاجِ اَمَّا سَمَاؤُهٗ   فَرُبًّا وَ اَمَّا اَرْضُهٗ فَمَحُوْلٗ

وہ دیباج کی طرح سرخ ہے، اس کا بالائی حصہ موٹا ہے اور اس کا زیریں حصہ (یعنی ٹانگیں) لاغر اور سخت ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ اسمائے نسبیہ سے ہے کہ ہر سماء اپنے ماتحت کے لحاظ سے سَمَاءٌ ہے لیکن اپنے مافوق کے لحاظ سے اَرْضٌ ہے بجز سماء علیا (فلک الافلاک) کے کہ وہ ہر لحاظ سے سَمَاءٌ ہی ہے اور کسی کے لیے ارض نہیں بنتا۔ بادل اور بارش کو بھی سَمَاءٌ کہا جاتا ہے مثلاً ﴿وَ اَرْسَلْنَا السَّمَآءَ عَلَيْهِمْ مِّدْرَارًا ۪﴾ (6/الانعام:6) ''اور ہم نے اُن پر خوب کثرت سے بارش برسائی۔'' تفسیر ماجدیؒ کے مطابق السماء یہاں بارش کے معنی میں ہے اور اَرْسَلْنَا برسانے کے معنی میں۔ حضرت شیخ

الہندؒ نے یہاں ترجمہ ''آسمان'' سے ہی کیا ہے اور صاحبؒ ضیاء القرآن نے 'بادل' سے ترجمہ کیا ہے۔ صاحبؒ تفسیر ماجدی فرماتے ہیں عربی میں ہر اُس چیز کو سَمَاءٌ کہتے ہیں جو انسان کے اوپر واقع ہو حتیٰ کہ مکان کی چھت کو بھی سَمَاءٌ کہتے ہیں۔ مِنَ السَّمَاءِ کا اطلاق ہر اُس چیز پر ہوتا ہے جو آسمان کی سمت سے نازل ہو۔ (تلخیص)۔ لفظ سَمَاءٌ مذکر مؤنث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے مثلاً قرآن مجید میں ہے ﴿ اِلسَّمَآءُ مُنْفَطِرٌۢ بِهٖ ؕ ﴾ (73/المزمل:18) ''اور جس کی سختی سے آسمان پھٹا جا رہا ہوگا۔'' (مذکر) اور ﴿ اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ۙ﴾ (82/الانفطار:1) ''جب آسمان پھٹ جائے گا۔'' (مؤنث)۔ امام راغبؒ کے مطابق لفظ سَمَاءٌ واحد اور جمع دونوں طرح استعمال ہوتا ہے اسی لیے البقرہ: 29 میں ''السماء'' کے لیے ''هُنَّ'' جمع کی ضمیر آئی ہے۔ (واللہ اعلم)

اَجَلٌ مُسَمًّى مقررہ یا متعین مدت۔ ﴿ وَاَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ ﴾ (6/الانعام:2) ''اور ایک دوسری مدت اور بھی ہے جو اس کے ہاں طے شدہ ہے۔''

ء ل ہ

(ف) **اُلُوْهَةً** غلامی کرنا۔ عبادت کرنا۔

اِلٰهٌ عبادت کیا ہوا یعنی جس کی عبادت یا غلامی کی گئی۔ معبود۔ اِلٰهٌ، فِعَالٌ کے وزن پر مَاْلُوْهٌ ہے (مَفْعُوْلٌ کا وزن)۔ فِعَالٌ کا وزن اسم المفعول کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جیسے کِتَابٌ یعنی لکھا ہوا یا جس پر لکھا گیا۔ اسی طرح اِلٰهٌ میں مفعول کا مفہوم ہے۔ مطلب جس کی غلامی یا عبادت کی گئی۔ اِلٰهٌ کے تین مفہوم ہیں:

(1) ہر وہ چیز جس کی طرف انسان اپنی تکلیف اور مصیبت کو دور کرنے کے لیے اور اپنی ضروریات پوری کرانے کے لیے رجوع کرے اور جس کو انسان اپنے نفع و نقصان کا مالک سمجھ کر اس کی پرستش کرے خواہ وہ چیز کوئی بت ہو یا کوئی مقام ہو یا آستانہ یا حیوانات یا شجر و حجر یا مظاہر قدرت ہوں، اِلٰهٌ کہلاتا ہے۔

(2) وہ ہستی جس سے انتہائی محبت ہو۔

(3) وہ ہستی جس کا ادراک ممکن نہیں۔ جو ہمارے فہم اور تصور سے ماوراء ہو۔

اِس کی جمع اٰلِهَةٌ اور مؤنث اِلٰهَةٌ ہے۔ اِلٰهَةٌ کا مطلب دیوی ہے چنانچہ سورج پرست سورج کو (جو کہ عربی میں مؤنث استعمال ہوتا ہے) اِلٰهَةٌ کہتے ہیں۔ اِلٰهٌ کا لفظ معبود برحق اور معبود باطل دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

اَللّٰهُ لفظ اِلٰهٌ پر لام تعریف داخل کرنے سے قاعدے کے مطابق لفظ اَلْاِلٰهُ بنتا ہے لیکن خلاف قاعدہ مادہ کا ہمزہ گرا کر اَلْ لٰهُ بولتے ہیں اور اس طرح لکھتے ہیں اَللّٰهُ۔ مطلب ہے معبود حقیقی یعنی اصل اِلٰهٌ۔ اللہ کا لفظ خدا تعالیٰ کے لیے بطور اسم ذات استعمال ہوتا ہے۔ یہ کسی خاص صفت کے لیے نہیں بولا جاتا۔ باقی تمام صفات اس کی طرف منسوب کی جاتی ہیں۔ نزول قرآن سے پہلے بھی یہ لفظ خدا تعالیٰ کے لیے بطور اسم ذات استعمال ہوتا تھا۔ اہل عرب نے کبھی اس لفظ کو کسی معبود باطل کے لیے استعمال نہیں کیا۔ اسی لیے قرآن میں اللہ تعالیٰ نے سوال کیا ہے کہ کیا تم اس کے کسی ہمنام کو جانتے ہو۔ ﴿ هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا ﴾ (19/مریم:65) ''کیا تم جانتے ہو اس کا کوئی ہم نام۔'' اللہ کا تثنیہ اور جمع نہیں آتے اور اس پر ''یا'' (حرف ندا) داخل نہیں ہوتا بلکہ یا حرف ندا کے عوض آخر میں میم مشدّد لگ کر اَللّٰهُمَّ (اے اللہ) استعمال ہوتا ہے۔

ر ح م

(س) **رَحْمَةً ، مَرْحَمَةً ، رُحْمًا** مہربان ہونا، مہربانی کرنا، رحم دل ہونا، شفقت کرنا۔ ﴿ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ﴾ (3/آل عمران:8) ''پروردگار، جب تو ہمیں سیدھے رستہ پر لگا چکا ہے، تو پھر کہیں ہمارے دلوں کو کجی میں مبتلا نہ کر دیجیو۔ ہمیں اپنے پاس سے رحمت عطا کر۔'' ﴿ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ﴾ (90/البلد:17) ''اور (خلق

خدا پر) رحم کرنے کی تلقین کی۔'' ﴿فَاَرَدۡنَاۤ اَنۡ یُّبۡدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَیۡرًا مِّنۡهُ زَکٰوۃً وَّ اَقۡرَبَ رُحۡمًا ﴿۸۱﴾﴾ (18/الکھف:81)''اس لیے ہم نے چاہا کہ ان کا رب اس کے بدلے ان کو ایسی اولاد دے جو اخلاق میں بھی اس سے بہتر ہو اور جس سے صلہ رُحمی بھی زیادہ متوقع ہو۔''

رَحِمٌ ج: اَرۡحَامٌ۔ بچہ دانی، رشتہ داری، قرابت داری۔ رَحِمٌ مجازاً قرابت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے کیونکہ اہل قرابت ایک ہی رحم سے پیدا ہوتے ہیں۔ اہل قرابت سے اچھے تعلقات قائم رکھنے کو صلۂ رحمی اور اِن تعلقات کو خراب کرنے کو قطع رحمی کہتے ہیں۔ احادیث مبارکہ میں صلہ رحمی کے بے شمار فضائل آئے ہیں۔ صاحبِ تفہیم القرآن اِن الفاظ میں اِس لفظ کی وضاحت کرتے ہیں ''رحم کا لفظ عربی زبان میں قرابت اور رشتہ داری کے لیے استعارہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ ایک شخص کے تمام رشتہ دار، خواہ وہ دور کے ہوں یا قریب کے، اس کے ذوی الارحام ہیں۔ جس سے جتنا زیادہ قریب کا رشتہ ہو اس کا حق آدمی پر اُتنا ہی زیادہ ہے اور اس سے قطع رحمی کرنا اُتنا ہی بڑا گناہ ہے۔ صلۂ رحمی یہ ہے کہ اپنے رشتہ دار کے ساتھ جو نیکی کرنا بھی آدمی کی استطاعت میں ہو اُس سے دریغ نہ کرے۔ اور قطع رحمی یہ ہے کہ آدمی اس کے ساتھ برا سلوک کرے، یا جو بھلائی کرنا اس کے لیے ممکن ہو اس سے قصداً پہلو تہی کرے۔'' (تفہیم القران، ج۵، ص۲۷) ﴿وَ یَعۡلَمُ مَا فِی الۡاَرۡحَامِ ؕ﴾ (31/لقمان:34) ''اور وہ جانتا ہے جو بچہ دانیوں میں ہے۔'' ﴿اِنۡ تَوَلَّیۡتُمۡ اَنۡ تُفۡسِدُوۡا فِی الۡاَرۡضِ وَ تُقَطِّعُوۡۤا اَرۡحَامَکُمۡ ﴿۲۲﴾﴾ (47/محمد:22) ''اگر تم لوگوں کو اقتدار ملے تو تم لوگ حقوق و فرائض کا توازن بگاڑ و زمین میں اور تم لوگ کاٹ دو اپنی رشتہ داریوں کو۔''

اَلرَّحۡمٰنُ اور اَلرَّحِیۡمُ یہ دونوں لفظ رَحۡمَةٌ سے مشتق ہیں اور دونوں مبالغے کے صیغے ہیں۔ رَحۡمَانُ، فَعۡلَانُ کے وزن پر ہے جس میں انتہائی شدت اور جوش کا مفہوم پایا جاتا ہے جیسے عَطۡشَانُ (انتہائی پیاسا)، غَضۡبَانُ (انتہائی غصیلا)، جَوۡعَانُ (انتہائی بھوکا)۔ اسی طرح رحمان کا مطلب ہے انتہائی رحمت والا۔ جس کی رحمت میں شدت بھی ہے اور جوش بھی۔ رَحِیۡمٌ، فَعِیۡلٌ کے وزن پر ہے جس میں کثرت کے ساتھ دوام اور استمرار کا مفہوم ہوتا ہے۔ اس کی جمع رُحَمَاءُ آتی ہے۔ علمائے کرام نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ رحمٰن میں رحیم کی نسبت زیادہ مبالغہ ہے، اس میں رحیم کی نسبت ایک حرف زائد ہے اور عربی میں کہتے ہیں زِیَادَةُ اللَّفۡظِ تَدُلُّ عَلٰی زِیَادَةِ الۡمَعۡنٰی مطلب زائد حرف زیادہ معنی پر دلالت کرتے ہیں۔ چنانچہ رحمٰن اور رحیم کا مطلب ہوا ایسی ہستی جس کی رحمت میں شدت اور جوش بھی ہے اور دوام اور استمرار بھی ہے۔ رحمٰن کا لفظ اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے۔ جیسے قرآنِ مجید میں فرمایا: ﴿قُلِ ادۡعُوا اللّٰهَ اَوِ ادۡعُوا الرَّحۡمٰنَ ؕ﴾ (17/بنی اسرائیل:110) ''اے نبی ﷺ! ان سے کہو: ''اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر۔'' اس کا تثنیہ اور جمع نہیں آتا۔ رحمٰن وہ ہستی ہے جو اپنی تمام مخلوق پر یکساں مہربانی کرنے والی ہو۔ اور یہ تمام مہربانی صرف اللہ تعالیٰ ہی سے متعلق ہو سکتی ہے۔ چنانچہ رحمان صرف اللہ تعالیٰ ہے کوئی دوسری مخلوق رحمٰن نہیں ہو سکتی۔ جبکہ رحیم کا لفظ اللہ تعالیٰ کے علاوہ دوسروں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً قرآن مجید میں یہ لفظ حضور ﷺ کے لیے اور صحابہؓ کے لیے استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ حضور ﷺ کے بارے میں فرمایا: ﴿لَقَدۡ جَآءَکُمۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡ اَنۡفُسِکُمۡ عَزِیۡزٌ عَلَیۡهِ مَا عَنِتُّمۡ حَرِیۡصٌ عَلَیۡکُمۡ بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ رَءُوۡفٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۱۲۸﴾﴾ (9/التوبۃ:128) ''دیکھو! تم لوگوں کے پاس ایک رسول ﷺ آیا ہے جو خود تم ہی میں سے ہے، تمہارا نقصان میں پڑنا اس پر شاق ہے، تمہاری فلاح کا وہ حریص ہے، ایمان لانے والوں کے لیے وہ شفیق اور رحیم ہے۔'' اور صحابہؓ کے بارے میں فرمایا: ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰهِ ؕ وَ الَّذِیۡنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَی الۡکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیۡنَهُمۡ﴾ (48/الفتح:29) ''محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں (یعنی صحابہؓ) وہ کفار پر سخت ہیں اور آپس میں رحیم ہیں۔'' رحمٰن کے معنی عام الرّحمۃ اور رحیم کے معنی تام الرّحمۃ بھی کیے گئے ہیں۔ لفظ رحمٰن کے بارے میں علمائے عربیت کا اختلاف ہے کہ یہ عربی زبان کا لفظ ہے یا نہیں اور عربی ہونے کی صورت میں یہ مشتق ہے یا غیر مشتق۔ مُبرّد اور ثعلب جو عربیت اور لغت کے امام ہیں وہ اس طرف گئے ہیں کہ یہ عبرانی لفظ ہے اگر اس کو عبرانی لفظ مان لیا جائے تو اس

صورت میں یہ لفظ اللہ کی طرح ذات باری کا اسم علم ہوگا۔ قرآن مجید میں یہ لفظ 57 جگہ مذکور ہے (فواد عبد الباقیؒ) اور بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا استعمال بطور صفت نہیں بلکہ بطور اسم علم ہوا ہے۔ (واللہ اعلم)

ترکیب

اِسْمٌ کا مادہ س۔ م۔ و ہے اور اس کے شروع میں ہمزۃ الوصل ہے۔ اس لئے قاعدہ کے لحاظ سے اس کا املا بِاسْمِ اللّٰهِ ہونا چاہئے تھا لیکن صرف بِسْمِ اللّٰهِ کا یہ مخصوص املا ہے کہ اس میں ہمزۃ الوصل لکھا بھی نہیں جاتا، ہمزۃ الوصل ساقط ہونے کے بدلے میں ''ب'' لمبی لکھی جاتی ہے۔ باقی ہر جگہ قاعدہ کے مطابق لکھا جاتا ہے۔ البتہ پڑھا نہیں جاتا مثلاً ﴿وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ ۖ﴾ (5/المائدہ:4) ''اور اس پر اللہ کا نام لو۔'' الرَّحْمٰنِ اور الرَّحِيْمِ کو اگر لفظ اللہ کا بدل مانا جائے تو ترجمہ اس طرح ہوگا ''جو انتہائی رحمت والا ہے، جو ہمیشہ رحمت کرنے والا ہے۔'' لیکن اگر انہیں صفت مانا جائے تو ترجمہ ہوگا ''رحمٰن اور رحیم اللہ کے نام سے'' دونوں ترجمے درست مانے جائیں گے۔ یہ دونوں حال نہیں ہو سکتے کیونکہ حال نکرہ اور حالت نصب میں ہوتا ہے۔ یہ پورا فقرہ مرکب جاری ہے، جملہ نہیں ہے۔ اس لئے اس سے قبل کچھ محذوف ماننا ضروری ہے۔ اگر اسے جملہ اسمیہ مانا جائے تو اس سے قبل کوئی مبتداء محذوف مانا جائے گا جیسے اِبْتِدَائِیْ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ''میری ابتداء اللہ کے نام سے ہے جو رحمٰن ہے رحیم ہے۔'' اگر جملہ فعلیہ مانیں تو اس سے قبل کوئی فعل محذوف مانا جائے گا جیسے اَبْتَدِءُ ''میں ابتداء کرتا ہوں۔'' جملہ اسمیہ ہونے کی صورت میں قرآن کریم سے مثال: ﴿وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا ۭ﴾ (11/ھود:41) ''نوحؑ نے کہا ''سوار ہو جاؤ اس میں، اللہ ہی کے نام سے ہے اس کا چلنا بھی اور اس کا ٹھہرنا بھی۔'' (آیت مبارکہ میں مَجْرٖىهَا اور مُرْسٰىهَا مبتداء مؤخر ہیں اور بِسْمِ اللّٰهِ جار مجرور مل کر قائم مقام خبر مقدم ہے) اور جملہ فعلیہ ہونے کی صورت میں مثال: ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۚ﴾ (96/العلق:1) ''پڑھو! (اے نبیؐ) اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا۔'' (اِقْرَاْ فعل امر ہے اور بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ جار مجرور مل کر متعلق فعل ہیں)۔ علامہ زمخشریؒ کی رائے یہ ہے کہ جو کام کر رہے ہوں اس کا فعل محذوف مانیں جیسے اَكْتُبُ ''میں لکھتا ہوں۔'' اَرْكَبُ ''میں سوار ہوتا ہوں۔''

ترجمہ

بِسْمِ اللّٰهِ	الرَّحْمٰنِ	الرَّحِيْمِ
اللہ کے نام سے	جو انتہائی رحمت والا ہے	جو ہمیشہ رحمت کرنے والا ہے

نوٹ: حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ معارف القرآن میں فرماتے ہیں ''بِسْمِ اللّٰهِ، یہ کلمہ تین لفظوں سے مرکب ہے ایک حرف باء، دوسرے اسم، تیسرے اللہ، حرف باء عربی زبان میں بہت سے معنی کے لیے استعمال ہوتا ہے، جن میں سے تین معانی مناسب مقام ہیں، ان میں سے ہر ایک معنی اس جگہ لیے جا سکتے ہیں۔ اوّل: مصاحبت، یعنی کسی چیز کا کسی چیز سے متصل ہونا۔ دوسرے: استعانت، یعنی کسی چیز سے مدد حاصل کرنا، تیسرے: تبرّک، یعنی کسی چیز سے برکت حاصل کرنا۔

لفظ اِسْمٌ میں لغوی اور علمی تفصیلات بہت ہیں، جن کا جاننا عوام کے لیے ضروری نہیں، اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ اردو میں اس کا ترجمہ نام سے کیا جاتا ہے۔

لفظ اَللّٰهُ، اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سب سے بڑا اور سب سے زیادہ جامع نام ہے، اور بعض علماء نے اسی کو اسم اعظم کہا ہے، اور یہ نام اللہ کے سوا کسی دوسرے کا نہیں ہو سکتا، اس لیے اس لفظ کا تثنیہ اور جمع نہیں آتے، کیونکہ اللہ واحد ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، خلاصہ یہ ہے کہ اللہ نام ہے اس موجود حق کا جو تمام صفاتِ کمال کا جامع اور صفاتِ ربوبیت کے ساتھ متصف، یکتا اور بے مثال ہے۔ اس لیے کلمۂ بسم اللہ کے معنی حرف باء کے مذکورہ تین معانی کی ترتیب سے یہ ہوئے: اللہ کے نام کے ساتھ، اللہ کے نام کی مدد سے، اللہ کے نام کی برکت سے، لیکن تینوں صورتوں میں یہ ظاہر ہے کہ یہ کلام نامکمل ہے، جب تک اس کام کا ذکر نہ کیا جائے جو اللہ کے نام کے ساتھ یا اس کے نام کی برکت سے کرنا مقصود ہے، اس لیے نحوی قاعدے کے مطابق یہاں کوئی فعل مناسب مقام محذوف ہوتا ہے، مثلاً ''شروع کرتا ہوں یا پڑھتا ہوں اللہ کے نام کے ساتھ۔'' اور مناسب یہ ہے کہ یہ فعل بھی بعد میں محذوف مانا جائے، تا کہ حقیقۃً شروع اسم اللہ ہی سے ہو، وہ فعل محذوف بھی اسم اللہ سے پہلے نہ آئے، صرف حرف باء کا اسم اللہ سے پہلے آنا عربی زبان کے لحاظ سے ضروری و ناگزیر ہے، اس میں بھی مصحف عثمانی میں باجماع صحابہؓ یہ رعایت رکھی گئی ہے کہ حرف باء رسم الخط کے قاعدے سے الف کے ساتھ ملا کر لکھنا چاہیے تھا اور لفظ اسم الگ، جس کی صورت ہوتی بِاسْمِ اللّٰهِ، لیکن مصحف عثمانی کے رسم الخط میں حرف ہمزہ کو حذف کر کے حرف باء کو سین کے ساتھ ملا کر صورۃً اسم کا جزء بنا دیا، تا کہ شروع اسم اللہ سے ہو جائے، یہی وجہ ہے کہ دوسرے مواقع میں یہ حرف الف حذف نہیں کیا جاتا، جیسے اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ میں ب کو الف کے ساتھ لکھا جاتا ہے، یہ صرف بسم اللہ کی خصوصیت ہے کہ حرف باء کو سین کے ساتھ ملا دیا گیا ہے۔'' (معارف القرآن، ج۱ص:۷۵)

سُوْرَۃٌ

(ج: سُوَرٌ)

جس طرح دنیا کی دوسری کتابیں مختلف ابواب وفصول میں تقسیم ہوتی ہیں اسی طرح قرآن مجید کو بھی مختلف پہلوؤں سے مختلف حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے مثلاً منزلوں، پاروں اور سورتوں وغیرہ میں۔ ان تقسیمات میں سے سب سے اہم تقسیم سورتوں کی تقسیم ہے۔ یہ تقسیم توقیفی ہے یعنی حضورؐ کے بتانے پر ایسا ہوا ہے۔

سورۃ میں جو ''و'' ہے اسے اصلی یا بدلا ہوا ماننے کی صورت میں مشتقات میں فرق ہوجاتا ہے۔ چنانچہ اگر ''و'' کو اصلی مانا جائے تو:

(ا) یہ اَلسُّوْرَۃُ سے مشتق ہوگا جس کے معنی ہیں بلند مرتبہ۔ نابغہ کا ایک شعر ہے اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ اَعْطَاکَ سُوْرَۃً ___ تَرٰی کُلَّ مَلِکٍ دُوْنَھَا یَتَذَبْذَبُ یعنی بے شک اللہ نے تمہیں ایسا ''بلند مرتبہ'' بخشا ہے جس کے ورے ہر بادشاہ متذبذب نظر آتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کی ہر سورۃ اپنے بلند رتبے کی وجہ سے ''سورۃ'' کہلاتی ہے۔

(ب) یا سورۃ کا لفظ سُوْرُ الْمَدِیْنَۃِ سے ماخوذ ہے۔ سُوْرٌ عربی زبان میں اونچی اور بلند دیوار کو کہتے ہیں۔ وہ دیوار جو کسی مکان کی نہیں بلکہ کسی شہر، قلعہ یا احاطہ کے گرد حفاظت کے لیے بنائی گئی ہو اور سُوْرَۃُ الْمَدِیْنَۃِ شہر پناہ کو کہتے ہیں۔ چنانچہ اس معنی کے اعتبار سے قرآن مجید کی ہر سورۃ بھی اپنے مضامین کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

(ج) اگر ''و'' کو اصلی نہ مانا جائے اور بدلا ہوا مانا جائے تو اِس صورت میں یہ سُؤْرَۃٌ (مہموز العین) سے مشتق ہے جس کے معنی کسی شے کے بقیہ اور بچے ہوئے حصے (ٹکڑا) کے ہیں۔ اس معنی کے اعتبار سے سورۃ بھی قرآن مجید کا ایک ٹکڑا اور حصہ ہے۔ اس صورت میں ''و'' کو ''ء'' سے بدلا ہوا مانا جائے گا۔ (واللہ اعلم)

شرع میں قرآنِ مجید کے اس حصے کو ''سورۃ'' کہتے ہیں کہ جس میں کم از کم تین آیتیں ہوں اور اس حصے کا کوئی نام معین بھی ہو جیسے سورہ فاتحہ، بقرہ وغیرہ (حقانیؒ)۔

قرآن مجید میں سورتوں کی جو ترتیب رکھی گئی ہے ان میں سب سے پہلے سورۃ الفاتحہ ہے۔ سورۃ الفاتحہ کے بعد وہ سورتیں ہیں جن کو اَلسَّبْعُ الطِّوَالُ کہا جاتا ہے یعنی ''سات لمبی سورتیں''۔ یہ سات سورتیں مشہور قول کے مطابق مندرجہ ذیل ہیں (1) البقرۃ (2) آل عمران (3) النساء (4) المائدۃ (5) الانعام (6) الاعراف (7) الانفال اور التوبۃ (دونوں ملاکر) واللہ اعلم۔ اس کے بعد وہ سورتیں ہیں جن کی کم وبیش سو سو آیات ہیں۔ یہ سورۂ یونس سے سورہ فاطر تک ہیں۔ اِن کو اصطلاح میں ''مِئِیْن'' کہا جاتا ہے۔ اِن سورتوں کے بعد ''مَثَانِیْ'' ہیں، جن میں مضامین دہرا دہرا کر بیان کیے گئے ہیں۔ یہ سورۂ یٰسٓ سے سورۂ فتح تک ہیں (ایک قول کے مطابق ''مِئِیْن'' میں سے الحج، النور، الفرقان، العنکبوت اور الروم مَثَانِیْ میں سے ہیں۔ واللہ اعلم) پھر قرآن مجید کے آخر میں وہ چھوٹی سورتیں آتی ہیں جن کو مُفَصَّل یا مُفَصَّلَات کہتے ہیں۔ اِن کو مفصل یا مفصلات اِس لیے کہتے ہیں کہ یہ سورتیں پورے قرآن مجید کا خلاصہ ہیں۔ اِن مفصلات میں پھر تقسیم کی گئی ہے۔ حجرات سے نازعات تک، طِوَالُ مُفَصَّلٍ کہلاتی ہیں۔ عبس سے الشّمس تک اَوْسَاطُ مُفَصَّلٍ کہلاتی ہیں اور الضحٰی سے الناس تک قِصَارُ مُفَصَّلٍ کہلاتی ہیں۔ سورتوں کی یہی ترتیب حضور ﷺ کی ایک حدیث میں بھی بیان ہوئی ہیں جس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ ترتیب خود حضور ﷺ ہی کی اختیار کردہ ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''مجھے تورات کے بدلے السبع الطوال، زبور کے بدلے مئین اور انجیل کی جگہ مثانی عطا کی گئی ہیں اور جو مجھے بطور فضیلت ملا وہ مفصل ہیں۔'' (مسند احمد جلد ۴، ص: ۱۰۷)۔ سورتوں کی اس تقسیم کے علاوہ مُسَبِّحَاتؒ ان سورتوں کو کہتے ہیں جن کی ابتداء لفظ سُبْحَانَ، سَبَّحَ، یُسَبِّحُ یا سَبِّحْ سے ہوتی ہیں۔ یہ سات سورتیں ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں: (1) بنی اسرائیل (2) الحدید (3) الحشر (4) الصّف (5) الجمعہ (6) التغابن (7) الاعلیٰ۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ ''قرآن کے مجموعی نظام کا ظاہری پہلو'' کے تحت فرماتے ہیں:

''اگر آپ سورتوں کی اس ترتیب پر ایک نظر ڈالیں، جس ترتیب سے وہ مصحف میں ہیں تو ایک چیز آپ کو بالکل صاف نظر آئے گی کہ قرآن میں مکی اور مدنی سورتوں کے ملے جلے سات گروپ بن گئے ہیں جن میں سے ہر گروپ ایک یا ایک سے زائد مکی سورتوں سے شروع ہوتا ہے اور ایک یا ایک سے زیادہ مدنی سورتوں پر تمام ہوتا ہے۔ ہر گروپ میں پہلے مکی سورتیں ہیں۔ ان کے بعد مدنی سورتیں ہیں۔

پہلا گروپ فاتحہ سے شروع ہوتا ہے، مائدہ پر ختم ہوتا ہے۔ اس گروپ میں فاتحہ مکی ہے باقی چار مدنی ہیں۔

دوسرا گروپ انعام اور اعراف دو مکی سورتوں سے شروع ہوتا ہے اور انفال و توبہ دو مدنی سورتوں پر ختم ہوتا ہے۔

تیسرے گروپ میں پہلے 14 سورتیں یونس تا مومنون مکی ہیں۔ آخر میں سورہ نور ہے جو مدنی ہے۔ اس گروپ کی دو سورتوں رعد اور حج کو بعض لوگوں نے مدنیات میں شمار کیا ہے لیکن یہ خیال غلط ہے۔ اس مسئلے پر ہم مذکورہ سورتوں کی تفسیر میں بحث کریں گے۔

چوتھا گروپ فرقان سے شروع ہوتا ہے، احزاب پر ختم ہوتا ہے۔ اس میں 8 سورتیں مکی ہیں۔ آخر میں ایک احزاب مدنی ہے۔

پانچواں گروپ سبا سے شروع ہوتا ہے، حجرات پر ختم ہوتا ہے۔ اس میں 13 سورتیں مکی ہیں۔ آخری تین مدنی ہیں۔

چھٹا گروپ ق سے شروع ہو کر تحریم پر ختم ہوتا ہے۔ اس میں پہلے سات مکی ہیں اس کے بعد دس مدنی۔ اس گروپ میں بعض لوگوں نے سورۂ رحمان کو مدنی قرار دیا ہے لیکن ہم سورہ کی تفسیر میں واضح کریں گے کہ یہ خیال بے بنیاد ہے۔

ساتواں گروپ ملک سے شروع ہو کر الناس پر ختم ہوتا ہے۔ ہمارے نزدیک اس میں بھی مکیات اور مدنیات کی ترتیب اسی طرح ہے جس طرح دوسرے گروپوں میں ہے لیکن اس کی سورہ دہر اور آخری بعض سورتوں کے بارے میں چونکہ اختلافات ہیں اس وجہ سے ان پر بھی ہم ان سورتوں کی تفسیر ہی میں بحث کریں گے۔

سورتوں کی یہ ترتیب، ہر صاحب علم جانتا ہے کہ اتفاقی نہیں بلکہ توقیفی ہے۔ یہ وہ ترتیب ہے جس ترتیب پر قرآن لوح محفوظ میں ہے۔ یہی ترتیب ہے جس پر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت جبریل امین، جیسا کہ حدیثوں سے ثابت ہے، ہر رمضان میں قرآن مجید کا مذاکرہ فرماتے تھے۔ اسی ترتیب کے مطابق صحابہ رضی اللہ عنہم بھی رمضان میں قرآن مجید سنتے سناتے تھے۔ اور اسی ترتیب کے مطابق سیدنا عثمان غنیؓ نے مصحف کی نقلیں تمام ممالک اسلامیہ میں بھجوائیں۔ اس وجہ سے یہ ترتیب حکمت سے خالی نہیں ہوسکتی۔'' (تدبر قرآن، ج ۱، ص: ۲۵)

اٰیَۃٌ

(ج: اٰیَاتٌ)

مولانا مودودیؒ لفظ آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’آیت کے اصل معنی اس نشانی یا علامت کے ہیں جو کسی چیز کی طرف رہنمائی کرے۔ قرآن میں یہ لفظ چار مختلف معنوں میں آیا ہے۔

(1) کہیں اس سے مراد محض علامت یا نشانی ہی ہے۔

(2) کہیں آثارِ کائنات کو اللہ کی آیات کہا گیا ہے، کیونکہ مظاہر قدرت میں سے ہر چیز اُس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے جو اس ظاہری پردے کے پیچھے مستور ہے۔

(3) کہیں ان معجزات کو آیات کہا گیا ہے جو انبیاء علیہم السلام لے کر آتے تھے، کیونکہ یہ معجزے دراصل اس بات کی علامت ہوتے تھے کہ یہ لوگ فرمانروائے کائنات کے نمائندے ہیں۔

(4) کہیں کتاب اللہ کے فقروں کو آیات کہا گیا ہے، کیونکہ وہ نہ صرف حق اور صداقت کی طرف رہنمائی کرتے ہیں، بلکہ فی الحقیقت اللہ کی طرف سے جو کتاب بھی آتی ہے، اس کے محض مضامین ہی میں نہیں، اس کے الفاظ اور اندازِ بیان اور طرزِ عبارت تک میں اس کے جلیل القدر مصنف کی شخصیت کے آثار نمایاں طور پر محسوس ہوتے ہیں۔

ہر جگہ عبارت کے سیاق وسباق سے بآسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ کہاں ’’آیت‘‘ کا لفظ کس معنی میں آیا ہے۔(تفہیم القرآن، ج ۱ ص:۶۹)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ الفاتحۃ

آیت:1-2

﴿ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۙ﴿۱﴾ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۙ﴿۲﴾ ﴾

ح م د

(باب)	مصدر/اسم	معانی
(س)	حَمۡدًا	محسن کی تعریف کرنا۔اُس کے فضائل بیان کرنا بشرطیکہ وہ افعال اختیاری ہوں۔(نوٹ: حمد کی مزید تفصیل آگے نوٹ میں دیکھیں)۔
	حَامِدٌ	ج: حَامِدُوۡنَ۔اسم الفاعل ہے۔حمد کرنے والا۔﴿ اَلتَّآئِبُوۡنَ الۡعٰبِدُوۡنَ الۡحٰمِدُوۡنَ ﴾(9/التوبۃ:112)''توبہ کرنے والے،عبادت کرنے والے،حمد کرنے والے۔''
	مَحۡمُوۡدٌ	اسم المفعول ہے۔حمد کیا ہوا یعنی جس کی تعریف کی گئی۔﴿ عَسٰۤی اَنۡ یَّبۡعَثَکَ رَبُّکَ مَقَامًا مَّحۡمُوۡدًا ﴿۷۹﴾ ﴾(17/بنی اسرائیل:79)''قریب ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچادے،آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا رب،حمد کئے ہوئے مقام پر۔''
(تفعیل)	تَحۡمِیۡدًا	محسن کی کثرت سے حمد کرنا۔
	مُحَمَّدٌ	اسم المفعول ہے۔اَلۡمُحَمَّدُ هُوَ الَّذِیۡ حُمِدَ مَرَّةً بَعۡدَ مَرَّةٍ۔محمد وہ ہے جس کی بار بار تعریف کی گئی ہو۔کثرت سے حمد کیا ہوا۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مبارک۔امام راغبؒ فرماتے ہیں''جس کی تعریف کی جائے اُسے محمود کہا جاتا ہے۔مگر مُحَمَّدٌ صرف اسی کو کہہ سکتے ہیں جو بکثرت قابل ستائش خصلتیں رکھتا ہو۔''﴿ مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰہِ ؕ﴾(48/الفتح:29)''محمد اللہ کے رسول ہیں۔''(نوٹ: محمد کی مزید تفصیل آگے نوٹ میں دیکھیں)
	اَحۡمَدُ	افعل تفضیل ہے۔دوسروں کی بنسبت زیادہ(تفضیل بعض)یا سب سے زیادہ(تفضیل کل)حمد کرنے والا۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مبارک۔جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ نام استعمال ہو تو معنی ہوتے ہیں اَحۡمَدُ الۡحَامِدِیۡنَ لِرَبِّہٖ یعنی تمام حمد کرنے والوں سے بڑھ کر اپنے رب کی حمد کرنے والا۔﴿ وَ مُبَشِّرًۢا بِرَسُوۡلٍ یَّاۡتِیۡ مِنۡۢ بَعۡدِی اسۡمُہٗۤ اَحۡمَدُ ؕ﴾(61/الصّف:6)''اور بشارت دینے والا ایک رسول کی،وہ آئیں گے میرے بعد،ان کا نام احمد ہوگا۔''
	حَمِیۡدٌ	فَعِیۡلٌ کا وزن اسم المفعول کے معنی میں یعنی مَحۡمُوۡدٌ۔ہمیشہ ہمیشہ سے حمد کیا ہوا۔وہ ذات جو حمد کی مستحق ہے کوئی حمد کرے یا نہ کرے۔مولانا مودودیؒ فرماتے ہیں''حمید کا لفظ اگرچہ محمود ہی کا ہم معنی ہے،مگر دونوں لفظوں میں ایک لطیف فرق ہے۔محمود کسی شخص کو اُسی وقت کہیں گے جبکہ اس کی تعریف کی گئی ہو یا کی جاتی ہو۔مگر حمید آپ سے حمد کا مستحق ہے،خواہ کوئی اس کی حمد کرے یا نہ کرے۔''(تفہیم القرآن،جلد2،صفحہ469)﴿ اَنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ حَمِیۡدٌ ﴿۲۶۷﴾ ﴾(2/البقرہ:267)''بیشک اللہ تعالیٰ غنی ہے حمید ہے۔''

نوٹ: حَمۡدٌ حمد کہتے ہیں کسی کے اوصاف حمیدہ اور فضائل کے بیان کرنے کو بشرطیکہ وہ افعال اختیاری ہوں۔حمد کا مفہوم سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ عربی ہی کے دو اور الفاظ''مدح''اور''شکر''کے مفہوم کو پہلے سمجھا جائے۔حمد،مدح سے خاص اور شکر سے عام اور زیادہ وسیع ہے۔اس کی تفصیل کچھ اس طرح سے ہے۔مدح(تعریف کرنا)ان افعال پر بھی ہوتی ہے جو انسان اختیاری طور پر کرتا ہے اور ان خوبیوں پر بھی جو انسان میں پیدائشی طور پر موجود ہوں جن پر اس کا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔اگر کوئی شخص سخی ہے اور سخاوت کرتا ہے تو یہ اس کا اختیاری فعل ہے چنانچہ اس پر جو تعریف کی جائے گی وہ مدح بھی ہے اور

حمد بھی۔ اگر یہی شخص خوبصورت ہے اور دراز قامت بھی تو اس پر بھی اس کی تعریف کی جائے گی لیکن یہ تعریف مدح کہلائے گی حمد نہیں کیونکہ حمد اختیاری افعال پر ہوتی ہے۔ چنانچہ ''ہر حمد تو مدح ہے لیکن ہر مدح، حمد نہیں'' (مفردات)۔ لہٰذا جیسے پہلے عرض کیا کہ 'حمد، مدح سے خاص ہے۔'' اللہ تعالیٰ کے لیے مدح کا لفظ غیر موزوں ہے کیونکہ اللہ کے سب افعال پسندیدہ بھی ہیں اور اختیاری بھی اور مدح کا لفظ قرآن مجید میں کہیں نہیں آیا۔ حمد کا لفظ صرف اچھی صفتیں بیان کرنے پر بولا جاتا ہے۔ اگر کسی کی بری صفات بیان کی جائیں گی تو حمد نہ ہوگی۔ شکر کسی کے احسانات وانعامات کی وجہ سے اس کی تعریف کو کہتے ہیں۔ اس کی ضد کفر ہے۔ کوئی چیز جتنی عیب و نقص سے پاک ہوگی اس کی اتنی ہی تعریف کی جائے گی اور اگر یہ احساس پیدا ہوجائے کہ وہ چیز ہمارے فائدے کے لیے ہے تو جو جذبہ پیدا ہوگا وہ شکر ہے اس شکر کے جذبے کے ساتھ جو تعریف کی جائے گی وہ حمد ہے۔ مثلاً اگر یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں بھوک میں کھلاتا ہے اور پیاس میں پلاتا ہے تو ان نعمتوں کا احساس اور اظہار شکر ہے۔ اور اس شکر کے جذبے سے اللہ تعالیٰ کی جو تعریف کی جائے گی وہ حمد ہے۔ لیکن اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ اس کائنات کا نظام کس خوبی سے چلا رہا ہے تو یہ صرف ''حمد'' ہوگی۔ اس لیے شروع میں عرض کیا کہ حمد، شکر سے زیادہ وسیع مفہوم رکھتی ہے۔ لہٰذا ''ہر شکر تو حمد ہے مگر ہر حمد، شکر نہیں'' (مفردات)۔ شکر اور حمد کے باہمی تعلق پر مولانا امین احسن اصلاحیؒ فرماتے ہیں: ''استعمالات کے لحاظ سے اگرچہ حَمْد کا لفظ شکر کے مقابل میں زیادہ وسیع ہے، شکر کا لفظ صرف انہی خوبیوں اور انہی کمالات کے اعتراف کے موقع پر بولا جاتا ہے جن کا فیض آدمی کو خود پہنچ رہا ہو، برعکس اِس کے ''حمد'' ہر قسم کی خوبیوں اور ہر قسم کے کمالات کے اعتراف کے لیے عام ہے خواہ اُن کا کوئی فیض خود حمد کرنے والے کی ذات کو پہنچ رہا ہو یا نہ پہنچ رہا ہو، تاہم شکر کا مفہوم اِس لفظ کا جزوِ غالب ہے۔ اِس وجہ سے اس کے ترجمہ کا پورا پورا حق ادا کرنے کے لیے یا تو تعریف کے لفظ کے ساتھ ''شکر'' کا لفظ بھی ملانا ہوگا یا پھر شکر ہی کے لفظ سے اُس کی تعبیر کرنا زیادہ مناسب رہے گا۔'' (تدبر قرآن، ج ۱، ص ۵۶)۔ ''قرآن مجید میں اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کے استعمالات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ جملہ عموماً شکر ادا کرنے کے لیے آیا ہے، مثلاً ﴿وَ قَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۣ﴾ (7/الاعراف:43) ''انہوں نے کہا، شکر کا سزاوار ہے اللہ جس نے ہمیں ہدایت بخشی۔'' اور ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ وَهَبَ لِیْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ ؕ﴾ (14/ابراہیم:39) ''شکر ہے اللہ کے لیے جس نے مجھے بڑھاپے میں اسماعیلؑ اور اسحاقؑ عطا فرمائے۔'' شاہ عبدالقادرؒ، ڈپٹی نذیر احمدؒ، مولانا فتح محمدؒ اور شیخ الہندؒ نے یہاں 'اَلْحَمْدُ' کا ترجمہ 'شکر' کیا ہے۔ مولانا تھانویؒ نے سورۂ فاتحہ کے حاشیہ میں لکھا ہے ''عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الشُّكْرُ لِلّٰهِ'' (ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کے معنی ہیں، شکر اللہ کے لیے) امام ابن جریر طبریؒ فرماتے ہیں ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ'' کے معنی ہیں شکر خالص اللہ جل ثناءہ کے لیے......'' (تفسیر طبری جلد اول) امام رازیؒ کا ارشاد ہے ''حمد نعمتوں پر ہوتی ہے۔'' (تفسیر کبیر، جلد اول۔ بحوالہ فی ظلال القرآن، جلد اول، صفحہ 70)

نوٹ: مُحَمَّدٌ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ فرماتے ہیں: ''مُحَمَّدٌ، لفظی معنی ہیں وہ شخص جس کی مدح بہت یا بار بار کی جائے یا جو صفات حسنہ کا مجموعہ ہو۔ یُقَالُ فُلَانٌ مُحَمَّدٌ اِذَا كَثُرَتْ خِصَالُهُ الْمَحْمُوْدَةُ (راغبؒ)۔ اسم علم ہے، ہمارے رسول ﷺ اور دنیا کے آخری نبی کا۔ حضور ﷺ کی بعثت سے قبل اس نام کا رواج بہت کم تھا۔ علامہ ابوجعفر محمد بن حبیب بغدادی المتوفی ۲۴۵ھ نے کل سات آدمی اس نام کے گنائے ہیں (کتاب المعتبر صفحہ 130) اور ان میں سے ایک محمد بن سفیان بن مجاشع کی بابت تو یہ کہا ہے کہ اُن کے والد نے ایک شامی راہب سے یہی سن کر کہ آئندہ پیمبر کا نام محمد ہوگا اپنے لڑکے کا یہی نام رکھ دیا۔'' (بحوالہ تفسیر ماجدیؒ صفحہ 191)

ترکیب الحمد میں ''ال'' استغراق کا ہے یعنی اشارہ جنسِ اسم اور اِس کی تمام قسموں کی طرف ہے یعنی حمد کی جتنی بھی صورتیں ممکن ہیں وہ سب اس لفظ میں شامل ہیں اس لیے الحمد کا ترجمہ ہوگا تمام حمد۔ اُردو زبان میں حمد کا مفہوم ادا کرنے کے لیے کوئی مناسب لفظ نہیں ہے اس لیے بہتر ہے کہ حمد کا ترجمہ حمد ہی سے کیا جائے البتہ ہمارے بزرگوں نے ہمیں اِس لفظ کا مفہوم سمجھانے کے لیے اُردو زبان میں اِس لفظ سے قریب ترین الفاظ کے ساتھ ترجمہ کیا ہے مثلاً ''سب تعریفیں''، ''ساری تعریف''، ''شکر کا سزاوار''۔ اَلْحَمْدُ مبتداء ہے اس کی خبر ثَابِتٌ (ثابت ہے) یا وَاجِبٌ (واجب ہے) محذوف ہے۔ لِلّٰهِ مرکب جاری ہے اور قائم مقام خبر ہے۔

ترجمہ	اَلْحَمْدُ	لِلّٰهِ
	تمام حمد	اللہ کے لئے ہے

نوٹ:1 قرآن مجید میں سورتوں کے نام مرکب اضافی کی ترکیب میں لکھے ہیں۔چنانچہ سُوْرَۃُ الْفَاتِحَۃِ بھی مرکب اضافی ہے۔فَتَحَ سے اسم الفاعل واحد مونث فَاتِحَۃٌ بنتا ہے۔اس لئے اس کا لفظی ترجمہ ہوگا ’’کھولنے والی کی سورۃ‘‘لیکن اردو محاورہ کے لحاظ سے ہم کہیں گے ’’کھولنے والی سورۃ۔‘‘

نوٹ:2 الف لام کی اقسام: الف لام کی دو قسمیں ہیں: (1) اسمی (2) حرفی

(1) الف لام اسمی: الف لام اسمی وہ ہے جو اسم فاعل اور اسم مفعول پر داخل ہوتا ہے اور یہ اَلَّذِیْ اسم موصول کے معنی میں ہوتا ہے اور اس کا صلہ وہ اسم فاعل اور اسم مفعول ہوتا ہے جس پر وہ داخل ہوتا ہے۔مثلاً ضَارِبٌ اسم الفاعل ہے اس پر ’ال‘ داخل کریں گے تو اَلضَّارِبُ بنتا ہے اور یہ ’ال‘، اَلَّذِیْ کے معنوں میں ہے چنانچہ مطلب ہوگا اَلَّذِیْ یَضْرِبُ۔وہ جو مارتا ہے/ مارے گا۔مَضْرُوْبٌ اسم المفعول ہے اس پر ’ال‘ داخل کریں گے تو اَلْمَضْرُوْبُ بنتا ہے اور یہ ’ال‘، اَلَّذِیْ کے معنوں میں ہے چنانچہ مطلب ہوگا اَلَّذِیْ یُضْرَبُ وہ جسے مارا جاتا ہے/ مارا جائے گا۔قرآن مجید کی سورۂ مائدۃ آیت 38 میں فرمایا وَ السَّارِقُ وَ السَّارِقَۃُ فَاقْطَعُوْۤا اَیْدِیَهُمَا یہاں السَّارِقُ کا مطلب ہے اَلَّذِیْ یَسْرِقُ اور السَّارِقَۃُ کا مطلب ہے اَلَّتِیْ تَسْرِقُ۔

(2) الف لام حرفی: الف لام حرفی وہ ہوتا ہے جو اسم فاعل اور اسم مفعول کے علاوہ کسی اور اسم پر داخل ہو۔

الف لام حرفی کی پھر دو قسمیں ہیں (ا) زائدہ (ب) غیر زائدہ۔

زائدہ کی تعریف: الف لام حرفی زائدہ وہ ہوتا ہے جس کے گرانے سے معنی فاسد نہ ہو یا بعنوان دیگر جس کے آنے کا فائدہ نہ ہو اور جانے کا نقصان نہ ہو۔

غیر زائدہ کی تعریف: الف لام غیر زائدہ وہ ہوتا ہے جس کے آنے کا فائدہ ہو اور جانے کا نقصان ہو۔

پھر غیر زائدہ کی چار قسمیں ہیں: (۱) جنسی (۲) استغراقی (۳) عہد خارجی (۴) عہد ذہنی۔

الف لام کے مدخول (یعنی جس لفظ پر ’ال‘ داخل ہو) سے ماہیت (یعنی حقیقت، کیفیت) مراد ہوگی یا افراد، اگر ماہیت مراد ہو تو یہ الف لام جنسی ہوگا جیسے اَلرَّجُلُ خَیْرٌ مِّنَ الْمَرْاَۃِ (جنس مرد بہتر ہے جنس عورت سے) یہاں یہ معنی نہیں کہ افراد رجل، افراد مرأۃ سے بہتر ہیں۔کیونکہ بہت سے افراد عورتوں کے مردوں کے افراد سے بہتر ہوتے ہیں جیسے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا وغیرہ۔اگر افراد مراد ہوں تو دو حال سے خالی نہیں تمام افراد مراد ہوں گے یا بعض، اگر تمام افراد مراد ہوں تو اس کو استغراقی کہتے ہیں جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ (بے شک تمام انسان خسارے میں ہیں)۔یہاں پر الف لام جو انسان پر داخل ہے استغراقی ہے یعنی اشارہ جنسِ انسان کے تمام افراد، مرد ہوں یا عورت، سب کی طرف ہے۔اگر الف لام کے مدخول سے بعض افراد مراد ہیں تو پھر یہ دو حال سے خالی نہ ہوگا وہ بعض افراد خارج میں متعین ہوں گے یا غیر متعین۔اگر متعین ہوں تو اس کو الف لام عہد خارجی کہتے ہیں اور اگر غیر متعین ہوں تو اس کو الف لام عہد ذہنی کہتے ہیں اول کی مثال اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے فَعَصٰی فِرْعَوْنُ الرَّسُوْلَ (پس فرعون نے رسول کی نافرمانی کی) اس مثال میں الرَّسُوْلَ سے مراد وہ متعین رسول ہیں جس کا ذکر پہلے اِنَّاۤ اَرْسَلْنَاۤ اِلَیْكُمْ رَسُوْلًا ۙ۬ شَاهِدًا عَلَیْكُمْ كَمَاۤ اَرْسَلْنَاۤ اِلٰی فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا ؕ میں آچکا ہے یعنی حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام مراد ہیں۔ثانی کی مثال، وَ اَخَافُ اَنْ یَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ (پس مجھے خوف ہے کہ کھا جائے گا اس کو بھیڑیا)۔یہاں ذئب سے خارج میں کوئی متعین بھیڑیا مراد نہیں بلکہ کوئی بھیڑیا مراد ہے۔

فائدہ: (1) الف لام عہد ذہنی کا مدخول نکرہ کے حکم میں ہوتا ہے معرفہ نہیں ہوتا۔اسی وجہ سے اس کو مبتدا بنانا بھی درست نہ ہوگا۔

فائدہ: (2) جو ’ال‘ اسم عَلَم پر داخل ہو وہ زائد ہوتا ہے کیونکہ اسم علم خود ہی معرفہ ہے۔لیکن ہر ایک اسم علم پر ’ال‘ نہیں لگایا جاسکتا ہے۔اہل زبان نے جہاں لگایا ہے وہیں لگے گا: الحسن، الخلیل، الفضل، العباس، النُّعمان، الحارث کہہ سکتے ہیں۔کیونکہ اہل زبان سے ایسا سنا گیا ہے مگر المحمود نہیں کہا جاتا۔

اکثر ملکوں کے نام پر ’ال‘ زائدہ لگایا جاتا ہے: الشّام، الرّوم، الھند، الباکستان، العرب، الیمن، الفرنسا وغیرہ لیکن شہروں کے نام پر بہت کم ’ال‘ آتا ہے۔مکۃ، مصر، بَغْدَادُ، لاھور وغیرہ پر ’ال‘ داخل نہیں ہوتا۔البتہ المدینہ پر ’ال‘ لگایا جاتا ہے کیونکہ مَدِیْنَۃٌ تو ہر ایک بڑے شہر کو کہہ سکتے ہیں۔اسی طرح القاھرۃ پر بھی لام تعریف داخل ہوتا ہے۔

نوٹ:3 اوپر بات ہوئی ہے کہ اَلْحَمْدُ کی خبر محذوف ہے۔اس ضمن میں بات سمجھ لیں کہ ہر زبان میں کسی جملے میں سے کچھ الفاظ حذف کر دینے کا رواج ہے مثلاً گھر کی گھنٹی بجے تو ہم کہتے ہیں ''کون ہے؟''۔ یہاں لفظ ''آیا'' محذوف ہے۔ پورا جملہ ہے ''کون آیا ہے؟'' کسی کو جاتا دیکھ کر ہم کہتے ہیں کہاں؟ اس میں الفاظ ''جا رہے ہو'' محذوف ہے۔اسی طرح عربی میں بھی اور قرآن مجید میں بھی محذوفات ملیں گے۔لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جہاں جی چاہے اور جو جی چاہے محذوف مان لیا جائے۔محذوفات کا فیصلہ زبان کے محاورہ اور جملہ کے سیاق وسباق کے پیشِ نظر کیا جاتا ہے۔

نوٹ۔4 عربی میں مرکب جاری اور ظرف، جملہ اسمیہ میں متعلق خبر بن کر آتے ہیں یعنی خبر کی وضاحت اور تشریح کرتے ہیں لیکن خود خبر نہیں بنتے۔جملہ میں خبر اگر محذوف ہو تو پھر یہ قائم مقام خبر کہلاتے ہیں۔مثلاً اَلرَّجُلُ مَوْجُوْدٌ فِی الْبَیْتِ میں فِی الْبَیْتِ متعلق خبر ہے۔اور اَلرَّجُلُ فِی الْبَیْتِ میں فِی الْبَیْتِ قائم مقام خبر ہے۔

ر ب ب

(ن) رَبًّا اس لفظ میں دو مفہوم پائے جاتے ہیں: (1) مالک ہونا۔(2) تربیت کرنا، پرورش کرنا۔صاحبؒ ضیاء القرآن فرماتے ہیں ''رب مصدر ہے اس کا معنی ہے تربیت اور تربیت عربی میں کہتے ہیں تَبْلِیْغُ الشَّیْءِ اِلٰی کَمَالِہٖ بِحَسْبِ اِسْتِعْدَادِہِ الْاَزَلِیِّ شَیْئًا فَشَیْئًا (روح المعانی) کسی چیز کو اس کی ازلی استعداد و فطری صلاحیت کے مطابق آہستہ آہستہ مرتبۂ کمال تک پہنچانا'' (ضیاء القرآن، ج۱،ص ۲۲)۔امام راغبؒ فرماتے ہیں: ''ھُوَ اِنْشَاءُ الشَّیْءِ حَالًا فَحَالًا اِلٰی حَدِّ التَّمَامِ یعنی کسی چیز کو یکے بعد دیگرے ایک حالت سے دوسری حالت میں اس طرح نشوونما دیتے رہنا کہ حدِ کمال تک پہنچ جائے۔'' (بحوالہ لغات القرآن، ج ۳،ص ۴۵)

رَبٌّ ج: اَرْبَابٌ۔تربیت کرنے والا، پرورش کرنے والا، پالنے والا، پروردگار۔(یہ مصدر ہے لیکن بطور اسم الفاعل بھی استعمال ہوتا ہے)۔کسی چیز کو آہستہ آہستہ درجۂ کمال تک پہنچانے والا اور اُس کی تمام ضروریات کا خیال رکھنے والا۔اِس تربیت میں محبت، حفاظت اور نگہداشت کا عنصر موجود ہوتا ہے جیسے ماں باپ کا بچے کو پالنا۔رَبٌّ اضافت اور لام تعریف کے بغیر ہو تو صرف اللہ تعالیٰ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔اضافت کے ساتھ اللہ اور دوسروں پر بھی بولا جاتا ہے اور اس صورت میں عام طور پر ''مالک، آقا'' کے معنی دیتا ہے۔جیسے رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ (تمام جہانوں کا پالنے والا یا تمام جہانوں کا مالک) اور رَبُّ الدَّارِ (گھر کا مالک)۔قرآن مجید میں آتا ہے ﴿قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّیْٓ اَحْسَنَ مَثْوَایَ ؕ﴾ (12/یوسف:23) ''یوسفؑ (پاکباز) نے فرمایا خدا کی پناہ! (یوں نہیں ہوسکتا) وہ (تیرا خاوند) میرا محسن ہے۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن) اس آیت کے تحت مولانا عبد الماجد دریا بادیؒ فرماتے ہیں: ''اِنَّهٗ میں ضمیر زلیخا کے شوہر عزیزِ مصر کی جانب ہے۔ رَبِّیْ۔ لفظ رب ظاہر ہے کہ یہاں خالق و پروردگار کے معنی میں نہیں دنیوی مالک اور آقائے مجازی کے معنی ہی میں ہے۔'' اور فرمایا: ﴿وَقَالَ لِلَّذِیْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِیْ عِنْدَ رَبِّكَ ۡ فَاَنْسٰىهُ الشَّیْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ﴾ (12/یوسف:42) ''اور کہا یوسفؑ نے اُسے جس کے بارے میں اُن کو یقین تھا کہ وہ نجات پا جائے گا اُن دونوں میں سے کہ اپنے آقا سے میرا ذکر کرنا۔مگر شیطان نے اسے ایسا غفلت میں ڈالا کہ وہ اپنے آقا سے اس کا ذکر کرنا بھول گیا۔'' اس آیت کی تفسیر میں مولانا عبد الماجد دریا بادیؒ فرماتے ہیں ''عِنْدَ رَبِّكَ یعنی اپنے آقا بادشاہ ملک سے......بعض جدید اہل قلم نے بادشاہ کے لیے ایک پیمبر کی زبان سے لفظ رب کے ادا ہونے پر بڑی حیرت کا اظہار کیا ہے۔حالانکہ جب لفظ کے کھلے ہوئے معنی علاوہ خالق پروردگار کے آقا و مالک کے بھی موجود ہیں تو اس کے استعمال پر یہ اظہار حیرت خود حیرت انگیز ہے۔پیغمبرؑ حقائق کے ترجمان ہوتے ہیں ان کی زبان آجکل کے اخبار نویسوں، پرجوش خطیبوں اور سیاسی لیڈروں کی زبان نہیں ہوتی۔مالک وآقا کی تعبیر لفظ رب سے کرنا زبان عرب میں عام ہے۔''

رَبَّانِيٌّ ج: رَبَّانِیُّوْنَ۔ اسم نسبت ہے۔ رب والا۔ اللہ والا۔ رَبَّانِيٌّ میں 'الف' اور 'ن' کا اضافہ مبالغے کے لیے ہے یعنی بالکل اللہ والا۔ پیر کرم شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں: ''رَبَّانِيٌّ، رب کی طرف منسوب ہے اس نسبت کی وجہ سے اسے رَبِّيٌّ ہونا چاہیے تھا۔ لیکن بسا اوقات مبالغہ کے لیے الف نون کا اضافہ کر دیا کرتے ہیں۔ مثلاً (لِحْيَةٌ بمعنی داڑھی سے) جس کی بڑی گھنی داڑھی ہو اُسے باضافہ الف نون لِحْيَانِيٌّ اور (رَقَبَةٌ بمعنی گردن سے) جس کی گردن بہت فربہ ہو اُسے باضافہ الف نون رَقَبَانِيٌّ کہا جاتا ہے۔ اس صورت میں اس کا معنی ہو گا بالکل اللہ والا۔ مبرد نے اس کا ایک دوسرا ماخذ بتایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ ربّان کی جمع ہے جو رَبَّهٗ يَرُبُّهٗ فَهُوَ رَبَّانٌ سے ماخوذ ہے۔ اس کا معنی ہے تربیت نفوس، اصلاح احوال اور تدبیر اُمور کرنے والا۔ اب رَبَّانِيٌّ کا معنی ہو گا نوعِ انسانی کی صحیح تربیت اور ان کی اِصلاح کرنے والا۔'' (ضیاء القرآن، ج ۱، ص ۷۲۴ تلخیصاً) ﴿ لَوْ لَا يَنْهٰىهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ ﴾ (5/المائدہ:63) ''کیوں نہیں منع کرتے ان کو اللہ والے لوگ۔''

رِبِّيُّوْنَ اس کی واحد رِبِّيٌّ ہے۔ مراد ہے اللہ والے یا جماعتیں۔ حضرت مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں: ''ربّ کی طرف منسوب ہے جیسے رَبَّانِيٌّ، معنی ہیں رب والے۔ اس میں حرف را مفتوح کی بجائے مکسور خلاف قیاس ہوا ہے (روح)۔ بعض حضرات نے اس کے معنی بہت سی جماعتوں کے کیے ہیں ان کے نزدیک یہ رِبَّةٌ بکسر را بمعنی الجماعۃ کی طرف منسوب ہے۔'' (معارف القرآن، جلد2، صفحہ 200)۔ اور پیر کرم شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں: ''رِبِّيُّوْنَ کی را پر تینوں حرکتیں آسکتی ہیں۔ زمخشری نے تو اس کا معنی رب والے ہی کیا ہے۔ اَلرِّبِّيُّوْنَ: اَلرَّبَّانِيُّوْنَ (کشاف)۔ لیکن علامہ قرطبیؒ نے اس کا دُوسرا معنی انبوہِ کثیر بھی لکھا ہے اَلرِّبِّيُّوْنَ: اَلْجَمَاعَةُ الْكَثِيْرَةُ۔ اِس صورت میں اس کا واحد رُبِّيٌّ ہے اور رِبَّةٌ بمعنی جماعت کی طرف منسوب ہے۔ (ضیاء القرآن، جلد 1، صفحہ:281)۔ ﴿ وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ ﴾ (3/آل عمران:146) ''اور کتنے ہی نبی گزرے ہیں کہ جہاد کیا ان کے ہمراہ بہت سے اللہ والوں نے۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)

رَبِيْبَةٌ ج: رَبَائِبُ۔ زیر تربیت سوتیلی بیٹی۔ ﴿ وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ ﴾ (4/النساء:23) ''اور تمھاری سوتیلی بیٹیاں جو تمھاری گودوں میں ہیں۔''

رُبَمَا یہ حرف جر 'رُبَّ' اور 'مَا' کافہ سے مرکب ہے۔ حرف جر رُبَّ، تشدید اور تخفیف (رُبَ) دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ رُبَّ اسم پر داخل ہوتا ہے اور رُبَمَا فعل پر بھی داخل ہو جاتا ہے۔ سیاق کلام کے مطابق رُبَمَا کسی چیز کی کثرت یا قلت کو ظاہر کرتا ہے۔ یعنی تکثیر کے اعتبار سے اس کا ترجمہ ''بہت زیادہ'' یا ''بار بار'' کیا جاتا ہے اور تقلیل کے اعتبار سے اس کا ترجمہ ''کبھی کبھی'' کیا جاتا ہے۔ ویسے کلام عرب میں یہ کافی استعمال ہوتا ہے لیکن قرآن مجید میں صرف سورۃ الحجر کی آیت 2 میں استعمال ہوا ہے۔ ﴿ رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ۝ ﴾ (15/الحجر:2) ''کافر بار بار تمنا کریں گے کہ کاش ہم مسلمان ہوتے۔'' (ترجمہ ماجدیؒ) ''(عذاب میں گرفتار ہونے کے بعد) بہت آرزو کریں گے کفار کہ کاش وہ مسلمان ہوتے۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔ اس آیت میں رُبَمَا کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا عبدالماجد دریا بادیؒ فرماتے ہیں: ''رُبَمَا۔ یہ کلماتِ حسرت کی تکرار شاید اس لیے کہ جب جب کوئی نئی شدت واقع ہو گی، اور ساتھ ہی محسوس ہو گا کہ اس کی علت کفر ہی ہے، تو یہ حسرت ہر دفعہ تازہ ہو جائے گی۔'' (تفسیر ماجدیؒ، ص ۵۶۹)

ع ل م

(ن ۔ ض) عَلَمًا نشان لگانا۔ پہچان بنانا۔

عَلَمٌ ج: اَعْلَامٌ۔ نشان۔جھنڈا۔اونچا پہاڑ۔محل۔﴿ وَمِنْ اٰيٰتِهِ الْجَوَارِ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ ﴾(42/الشوریٰ:32) ''اوراس کی نشانیوں میں سے جہاز ہیں سمندر میں اونچے پہاڑوں کی مانند۔''

عَلَامَةٌ ج: عَلَامَاتٌ۔نشان۔علامت۔﴿ وَعَلٰمٰتٍ ۭ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴾(16/النحل:16) ''اور علامتیں بھی (بنائیں) اورستاروں سے بھی (لوگ) راہ پاتے رہتے ہیں۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)

عَالَمٌ ج: عَالَمُوْنَ۔ فَاعَلٌ اسم الآلہ کا ایک وزن ہے۔ پہچاننے کا ذریعہ۔ یہ عَلَمٌ سے ماخوذ ہے جس کا مطلب ہے نشانی، علامت، ایسی علامت اور نشانی جس سے کسی کی پہچان ہو۔ یہ کائنات اللہ تعالیٰ کی کاریگری کی علامت ہے جس سے ہم اُس کی پہچان کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے سوا ہر شے کو عَالَمٌ کہتے ہیں۔ اس میں تمام مخلوق شامل ہے خواہ زمین پر ہو، آسمانوں میں اور جو کچھ ان کے درمیان ہے۔ بعض اہل علم کے نزدیک عَالَمٌ نام ہے اُس چیز کا جس کے ذریعے سے علم حاصل ہو۔ پھر ان چیزوں کے لیے استعمال ہونے لگا جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا علم حاصل ہو۔ جب اِس کی جمع عالمین بولی جائے تو یہ اور بھی عموم کا فائدہ دیتا ہے۔ قرآن مجید میں صرف جمع ہی استعمال ہوئی ہے۔ آیت زیر مطالعہ۔

(س) عِلْمًا حقیقت کو پہچان لینا۔ جاننا۔﴿ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ۭ﴾(2/البقرۃ:60) ''پہچان لیا ہر گروہ نے اپنا اپنا گھاٹ۔''﴿ اَوَلَا يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴾(2/البقرۃ:77) ''کیا وہ (یہ) نہیں جانتے کہ اللہ جانتا ہی جو وہ چھپاتے ہیں اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں۔''

عِلْمٌ اسم ذات بھی ہے۔ علم۔ قرآن مجید کی اصطلاح میں ''علم'' ایسی باتیں/حقائق کو کہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ سے اپنے انبیاء ورسل کو دی ہوں۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:﴿ وَلَىِٕنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَاۗءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴾(2/البقرۃ:145) ''اور اگر (بفرض محال) آپؐ پیروی کریں ان کی خواہشوں کی اس کے بعد کہ آچکا آپؐ کے پاس علم تو یقیناً آپؐ اس وقت ظالموں میں (شمار) ہوں گے۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔ اسی طرح قرآن میں جہاں کہیں علم کی نفی آئی ہے، بالعموم وہاں مطلب یہ ہے کہ کوئی ایسی بات جس کی کوئی سند سابقہ انبیاء ورسل کی تعلیمات میں اور رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات یعنی قرآن وسنت میں موجود نہ ہو۔ جیسے فرمایا:﴿ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ﴾(17/بنی اسرائیل:36) ''کسی ایسی چیز کے پیچھے نہ لگو۔ جس کا تمہیں علم نہ ہو۔''﴿ وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓي اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۙ فَلَا تُطِعْهُمَا ﴾(31/لقمان:15) ''اور اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ میرے ساتھ تو کسی ایسے کو شریک کرے جسے تو نہیں جانتا تو ان کی بات ہرگز نہ مان۔'' یہ اور ایسے متعدد مقامات پر علم نہ ہونے کا مطلب ہے قرآن وسنت میں سند نہ ہونا۔

واضح رہے کہ قرآن مجید میں بعض مقامات پر یہ لفظ اصطلاحی کے بجائے لغوی مفہوم میں بھی آیا ہے جیسے قارون کا قول نقل کرتے ہوئے فرمایا:﴿ قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰي عِلْمٍ عِنْدِيْ ۭ﴾(28/القصص:78) ''تو اس نے کہا'' یہ سب کچھ تو مجھے اس علم کی بنا پر دیا گیا ہے، جو مجھ کو حاصل ہے۔'' یہاں علم کا مطلب ہے تجربہ، مہارت، ہنرمندی۔ کوئی اگر آیت کے سیاق وسباق کو نظر میں رکھے تو وہ آسانی سے تمیز کر سکتا ہے کہ کہاں یہ لفظ لغوی مفہوم میں آیا ہے۔ حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ فرماتے ہیں ''محاورہ قرآن میں علم سے مراد علمِ حقائق سے ہوتی ہے اور بے علمی سے مراد اس علم سے محرومی ہے۔ علم سے قرآنِ مجید میں کہیں بھی وہ چیزیں مراد نہیں لی ہیں جنہیں دنیا میں علوم وفنون کہا جاتا ہے۔'' (تفسیر ماجدیؒ، صفحہ 929) ۔قرآن مجید کی ایک آیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی عِلْمٌ بمعنی نشانی کہا گیا ہے﴿ وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ ﴾(43/الزخرف:61) ''اور وہ (یعنی ابن مریم) دراصل قیامت کی ایک نشانی ہیں۔''

اَعۡلَمُ (1) مضارع کا واحد متکلم کا صیغہ ہے۔ میں جانتا ہوں۔ ﴿قَالَ اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۳۰﴾﴾ (2/البقرۃ:30) ’’اللہ تعالیٰ نے فرمایا بے شک میں جانتا ہوں وہ جو تم نہیں جانتے۔‘‘ ﴿وَلَاۤ اَعۡلَمُ مَا فِیۡ نَفۡسِکَ ؕ﴾ (5/المائدۃ:116) ’’اور میں نہیں جانتا جو آپ کے جی میں ہے۔‘‘

(2) اَفعل التفضیل میں واحد مذکر کا صیغہ ہے۔ کسی سے زیادہ یا سب سے زیادہ جاننے والا۔ ﴿قُلۡ ءَاَنۡتُمۡ اَعۡلَمُ اَمِ اللّٰہُ ؕ﴾ (2/البقرۃ:140) ’’آپؐ فرمایئے کیا تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ۔‘‘ ﴿اِنَّ رَبَّکَ ہُوَ اَعۡلَمُ بِمَنۡ ضَلَّ عَنۡ سَبِیۡلِہٖ ۪﴾ (68/القلم:7) ’’بے شک آپ کا رب خوب جانتا ہے اُسے جو گمراہ ہوا اُس کے راستے سے۔‘‘ اس صورت میں عام طور پر’ بِ‘ کا صلہ آتا ہے۔ (واللہ اعلم)

اِعۡلَمۡ ج: اِعۡلَمُوۡا۔ فعل امر ہے۔ تو جان۔ ﴿وَاعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰہَ عَزِیۡزٌ حَکِیۡمٌ ﴿۲۶۰﴾﴾ (2/البقرۃ:260) ’’خوب اچھی طرح سے جان لو کہ بے شک اللہ تعالیٰ عزیز اور حکیم ہے۔‘‘ ﴿وَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰہَ مَعَ الۡمُتَّقِیۡنَ ﴿۱۹۴﴾﴾ (2/البقرۃ:194) ’’اور تقویٰ اختیار کرو اللہ تعالیٰ کا اور خوب اچھی طرح سے جان لو کہ اللہ تعالیٰ متقین کے ساتھ ہے۔‘‘

عَالِمٌ ج: عَالِمُوۡنَ۔ عالم۔ جاننے والا۔ ﴿عٰلِمُ الۡغَیۡبِ وَ الشَّہَادَۃِ ؕ﴾ (6/الانعام:73) ’’وہ ہر چھپی چیز اور ظاہر چیز کا جاننے والا ہے۔‘‘ ﴿وَمَا یَعۡقِلُہَاۤ اِلَّا الۡعٰلِمُوۡنَ ﴿۴۳﴾﴾ (29/العنکبوت:43) ’’اور ان کو وہی لوگ سمجھتے ہیں جو علم رکھنے والے ہیں۔‘‘

عَلِیۡمٌ ج: عُلَمَاءُ۔ فَعِیۡلٌ کے وزن پر مبالغے کا صیغہ ہے۔ ہمیشہ اور ہر حال میں جاننے والا۔ ﴿وَہُوَ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ﴿۲۹﴾﴾ (2/البقرۃ:29) ’’اور وہ ہر چیز کو ہمیشہ سے جاننے والا ہے۔‘‘ ﴿اِنَّمَا یَخۡشَی اللّٰہَ مِنۡ عِبَادِہِ الۡعُلَمٰٓؤُا ؕ﴾ (37/فاطر:28) ’’حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے بندوں میں سے صرف علم رکھنے والے لوگ ہی اُس سے ڈرتے ہیں۔‘‘ اَلۡعَلِیۡمُ اسمائے حسنیٰ میں سے بھی ہے۔ نوٹ: عُلَمَاءُ، قرآنِ مجید میں دو ہی مرتبہ استعمال ہوا ہے، الشعراء کی آیت 197 میں اور فاطر 28 میں۔ اور دونوں جگہ اس کا رسم الخط میم کے بعد واؤ کے ساتھ ہے جس پر ہمزہ ہے اور واؤ کے بعد الف بھی لکھا جاتا ہے یعنی: عُلَمٰٓؤُا یہ اس کا مخصوص املاء ہے۔

عَلَّامٌ فَعَّالٌ مبالغہ کا وزن ہے۔ عَلَّامٌ اسی وزن پر ہے۔ اس کے آگے ۃ مبالغہ لگا دیں تو عَلَّامَۃٌ بنتا ہے۔ مطلب ہے بہت زیادہ جاننے والا۔ ﴿اِنَّکَ اَنۡتَ عَلَّامُ الۡغُیُوۡبِ ﴿۱۰۹﴾﴾ (5/المائدہ:109) ’’بیشک تو غیب کا بہت زیادہ جاننے والا ہے۔‘‘

مَعۡلُوۡمٌ اسم المفعول ہے۔ جس کو جانا گیا۔ جانا ہوا۔ معلوم۔ ﴿وَ مَاۤ اَہۡلَکۡنَا مِنۡ قَرۡیَۃٍ اِلَّا وَ لَہَا کِتَابٌ مَّعۡلُوۡمٌ ﴿۴﴾﴾ (15/الحجر:4) ’’اور نہیں ہلاک کیا ہم نے کسی بستی کو مگر یہ کہ اس کی (ہلاکت کا وقت) لکھا ہوا تھا جو معلوم تھا۔‘‘ (ترجمہ ضیاء القرآن)

مَعۡلُوۡمَۃٌ ج: مَعۡلُوۡمَاتٌ۔ مَعۡلُوۡمٌ کا مونث۔ ﴿اَلۡحَجُّ اَشۡہُرٌ مَّعۡلُوۡمٰتٌ ۚ﴾ (2/البقرۃ:197) ’’حج کے چند مہینے ہیں جو معلوم ہیں۔‘‘

(تفعیل) **تَعۡلِیۡمًا** رفتہ رفتہ تدریجاً علم دینا۔ سکھانا۔ ﴿اَلرَّحۡمٰنُ ۙ﴿۱﴾ عَلَّمَ الۡقُرۡاٰنَ ؕ﴿۲﴾﴾ (55/الرحمٰن:1-2) ’’رحمٰن نے قرآن کا علم دیا۔‘‘

مُعَلِّمٌ اسم الفاعل ہے۔ علم سکھانے والا۔

مُعَلَّمٌ اسم المفعول ہے۔ جس کو علم سکھایا گیا۔ ﴿ثُمَّ تَوَلَّوۡا عَنۡہُ وَ قَالُوۡا مُعَلَّمٌ مَّجۡنُوۡنٌ ﴿ۘ۱۴﴾﴾ (44/الدخان:14) ’’پھر انہوں نے منہ پھیر لیا اس سے اور کہا سکھایا ہوا ہے، دیوانہ۔‘‘

(تفعّل) **تَعَلُّمًا** کوشش کر کے، محنت کر کے علم حاصل کرنا، سیکھنا۔ ﴿وَ یَتَعَلَّمُوۡنَ مَا یَضُرُّہُمۡ وَ لَا یَنۡفَعُہُمۡ ؕ﴾ (2/البقرۃ:102) ’’اور وہ لوگ سیکھتے ہیں جو ان کو نقصان دیتا ہے اور نفع نہیں دیتا۔‘‘

ترکیب رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ مرکب اضافی ہے اور اس کے مضاف رَبِّ کی جر بتا رہی ہے کہ یہ اَللّٰہِ کی صفت یا بدل ہے۔ بدل ماننے سے ترجمہ

میں آسانی ہوگی۔اسی طرح اَلرَّحۡمٰنِ اور الرَّحِیۡمِ کی جر بتا رہی ہے کہ یہ بھی اَللّٰہِ کی صفت یا بدل ہیں۔

ترجمہ	رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ	الرَّحۡمٰنِ	الرَّحِیۡمِ
	جو تمام جہانوں کا پرورش کرنے والا ہے	جو رحمٰن ہے	جو رحیم ہے

نوٹ۔1 یہاں عالمین جمع کے صیغے میں آنے کے متعلق حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ اس عالم کا بھی رب ہے جسے ہم جانتے ہیں اور ان تمام عالموں کا بھی ربّ ہے جنہیں ہم نہیں جانتے۔

آیت:3

﴿ مٰلِكِ يَوۡمِ الدِّيۡنِ ؕ‏ ﴿۳﴾ ﴾

م ل ك

(ض) مِلۡكًا مالک ہونا۔غالب ہونا۔اختیار رکھنا۔﴿ قُلۡ لَّاۤ اَمۡلِكُ لِنَفۡسِىۡ نَفۡعًا وَّلَا ضَرًّا ﴾(7/الاعراف:188)''آپ ﷺ کہہ دیجئے کہ میں اختیار نہیں رکھتا اپنے نفس کے لئے کسی نفع کا اور نہ ہی کسی نقصان کا۔''

مَالِكٌ اسم الفاعل ہے۔مالک۔غالب ہونے والا۔اختیار رکھنے والا۔آیت زیر مطالعہ۔

مَمۡلُوۡكٌ اسم المفعول ہے۔غلام۔وہ جو کسی کی ملکیت میں ہو۔﴿ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبۡدًا مَّمۡلُوۡكًا ﴾(16/النحل:75)''بیان کی اللہ نے ایک مثال ایک غلام بندے کی۔''

مُلۡكٌ ملک۔جس پر اختیار و اقتدار حاصل ہو۔﴿ قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الۡمُلۡكِ تُؤۡتِى الۡمُلۡكَ مَنۡ تَشَآءُ وَتَنۡزِعُ الۡمُلۡكَ مِمَّنۡ تَشَآءُ ﴾(3/آل عمران:26)''آپ ﷺ کہہ دیجئے کہ اے اللہ ملک کے مالک تو ملک دیتا ہے جس کو تو چاہتا ہے اور تو ملک چھین لیتا ہے جس سے تو چاہتا ہے۔''

مَلۡكٌ اختیار۔﴿ قَالُوۡا مَاۤ اَخۡلَفۡنَا مَوۡعِدَكَ بِمَلۡكِنَا ﴾(20/طٰہٰ:87)''انہوں نے جواب دیا''ہم نے آپ سے وعدہ خلافی اپنے اختیار سے نہیں کی۔''

مَلِكٌ ج:مُلُوۡكٌ۔بادشاہ۔''عربی زبان میں مَلِكٌ ایسے شخص کو بھی کہہ دیا جاتا ہے جو آسودہ حال ہو، مکان، جائیداد، نوکر چاکر رکھتا ہو''(معارف القرآن)﴿ وَقَالَ الۡمَلِكُ ائۡتُوۡنِىۡ بِهٖ ﴾(12/یوسف:54)''اور بادشاہ نے کہا کہ اسے لے آؤ میرے پاس۔''﴿ اِنَّ الۡمُلُوۡكَ اِذَا دَخَلُوۡا قَرۡيَةً اَفۡسَدُوۡهَا ﴾(27/النمل:34)''بیشک بادشاہ جب داخل ہوتے ہیں کسی بستی میں تو اس میں بگاڑ پیدا کرتے ہیں۔''

مَلِيۡكٌ مَلِكٌ سے صفت کا صیغہ برائے مبالغہ ہے۔بہت بڑا بادشاہ۔﴿ فِىۡ مَقۡعَدِ صِدۡقٍ عِنۡدَ مَلِيۡكٍ مُّقۡتَدِرٍ ﴿۵۵﴾ ﴾(54/القمر:55)''سچی عزت کی جگہ، بڑے ذی اقتدار بادشاہ کے قریب۔''

مَلَاكٌ ، مَلَكٌ ج: مَلَآئِكَةٌ ۔فرشتہ۔مَلَكٌ لفظ اَلُوۡكَةٌ سے مشتق ہے۔جس کے معنی ہیں''پیغام رسانی'' کیونکہ فرشتے اللہ تعالیٰ کا پیغام اس کے مقبول بندوں تک پہنچانے کے لیے مامور ہیں اس لیے انہیں اس نام سے موسوم کیا گیا۔(ضیاء القرآن)۔ مَلَآئِكَةٌ میں 'ۃ' تانیث الجمع کی ہے۔﴿ قُلۡ لَّاۤ اَقُوۡلُ لَـكُمۡ عِنۡدِىۡ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَاۤ اَعۡلَمُ الۡغَيۡبَ وَلَاۤ اَقُوۡلُ لَـكُمۡ اِنِّىۡ مَلَكٌ ۚ ﴾(6/الانعام:50)''آپ ﷺ کہہ دیجئے کہ میں نہیں کہتا تم سے کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور میں نہیں جانتا غیب کو اور میں نہیں کہتا تم سے کہ میں فرشتہ ہوں۔''﴿ وَاِذۡ قَالَ رَبُّكَ لِلۡمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىۡ جَاعِلٌ فِى الۡاَرۡضِ خَلِيۡفَةً ؕ ﴾(2/البقرۃ:30)''اور یاد کرو جب فرمایا تمہارے رب نے فرشتوں سے کہ بے شک میں بنانے والا ہوں زمین میں ایک نائب۔''

مَلَكُوْتٌ مُلْكٌ سے انتہائی مبالغے کا صیغہ ہے۔ بادشاہت (یہ لفظ صرف اللہ تعالیٰ کی بادشاہت کے لئے مخصوص ہے اور اس لفظ میں مُلْكٌ (بادشاہی) اور مِلْكٌ (ملکیت) دونوں مفہوم شامل ہیں) ﴿ اَوَ لَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ (7/الاعراف:185) ''تو کیا یہ لوگ نظر نہیں کرتے زمین اور آسمانوں کی بادشاہت میں۔''

يَوْمٌ ج: اَيَّامٌ۔ بمعنی دن۔ غروب آفتاب سے لے کر اگلے دن کے غروب آفتاب تک کا وقت۔ لیل اور نہار کے وقت کا مجموعہ۔ ۲۴ گھنٹے۔ یَوْم کی یہ مدت انسان کے لیے ہے اور اس کا تصور بھی سورج اور زمین کی پیدائش کے بعد ہی کیا جا سکتا ہے ورنہ اللہ کے ہاں یَوْم کی مدت ایک طویل دور ہے خواہ یہ دور ہمارے حساب سے ہزاروں سال تک پھیلا ہوا ہو۔ اسی لیے زمین و آسمان کی پیدائش کے سلسلہ میں جب یَوْم کا ذکر آئے گا تو اس سے مراد ایک طویل دور ہوتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ﴾ (22/الحج:47) ''اور بے شک تمہارے رب کے نزدیک ایک یوم تمہارے حساب کی رُو سے ایک ہزار سال کے برابر ہے۔'' اسی طرح یوم الدین یعنی جزا و سزا کا دن بھی ایک طویل دور ہوگا جس کی مدت احادیث میں پچاس ہزار سال بیان کی گئی ہے۔ اَلْيَوْم: بمعنی آج کا دن۔ اور اَلْيَوْم کے وقت کی مقدار نَهَار کے مطابق ہوگی یَوْم کے مطابق نہیں۔ یعنی اس سے مراد طلوع آفتاب سے لے کر غروب آفتاب کا وقت ہوگا۔ ظلّ الیوم بمعنی آج سارا دن سایہ رہا (منجد)۔ اَلْيَوْم کا لفظ قرآن کریم میں بیشتر مقامات پر قیامت کے دن کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ يَوْمَئِذٍ: يَوْم کے بعد اِذْ کے اضافہ سے یہ لفظ بنا ہے جو کسی معین زمانہ کی طرف اشارہ کے لیے آتا ہے۔ بمعنی اُس دن یا وہ دن۔ قرآن مجید میں یہ لفظ م کی زیر کے ساتھ يَوْمِئِذٍ بھی استعمال ہوا ہے۔ مثلاً: سورہ ھود، آیت 66۔

<u>نوٹ</u>: عربی زبان میں نعمتوں کو بھی اَيَّامٌ کہا جاتا ہے اور اس سے مراد تاریخ کے وہ دن بھی ہوتے ہیں جن میں قوموں پر اللہ کی رحمت یا عذاب کے بڑے بڑے واقعات پیش آئے ہوں۔ ایام العرب سے مراد اہل عرب کی جنگیں ہیں۔ قرآنِ مجید میں فرمایا: ﴿ وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ ﴾ (14/ابراہیم:5) ''اور یاد دلاؤ انہیں اللہ تعالیٰ کے دن۔'' اس آیت کے تحت پیر کرم شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں: ''عربی میں نعمتوں کو بھی ایام کہا جاتا ہے اور گزشتہ واقعات کو بھی۔ یہاں دونوں معنی مراد لیے جا سکتے ہیں۔'' اور مولانا عبدالماجد دریا بادیؒ فرماتے ہیں: ''بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ یعنی جو بڑی بڑی نعمتیں قدرت کی طرف سے مختلف قوموں کو عطا ہوتی رہیں مثلاً حکومت و اقتدار یا جو بڑی بڑی مصیبتیں مختلف قوموں کو قدرت کی طرف سے پیش آتی رہیں۔ مثلاً وبا و قحط، محکومی و غلامی۔ غرض یہ کہ ایّام اللہ کے تحت میں ہر قسم کے اہم تاریخی واقعات آ جاتے ہیں۔ ایّام کی اضافت اللہ کی جانب ان واقعات کی اہمیت پر دلالت کرنے کے لیے ہے۔''

د ی ن

(ض) دِيْنًا مالک ہونا، حکم دینا، ذلیل کرنا / خدمت کرنا، فرماں برداری کرنا، ماتحت ہونا، قبول کرنا۔ (متضاد مفہوم ہے) ﴿ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ ﴾ (9/التوبۃ:29) ''اور نہ قبول کرتے ہیں سچے دین کو۔''

دِيْنٌ ج: اَدْيَانٌ۔ اسم ذات بھی ہی اور قرآن مجید میں کئی معنوں میں استعمال ہوا ہے مثلاً: (1) بدلہ۔ جزا۔ بدلے سے مراد اس کے دونوں پہلو ہیں۔ نیک اعمال کا اچھا بدلہ اور برے اعمال کا برا بدلہ۔ آیت زیر مطالعہ اور ﴿ وَمَاۤ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ۙ ثُمَّ مَاۤ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ﴾ (82/الانفطار:17-18) ''اور تم کیا جانتے ہو کہ وہ جزا کا دن کیا ہے؟ ہاں! (بولو) تمہیں کیا خبر کہ وہ جزا کا دن کیا ہے؟'' ﴿ يَوْمَئِذٍ يُّوَفِّيْهِمُ اللّٰهُ دِيْنَهُمُ الْحَقَّ ﴾ (24/النور:25) ''اس دن اللہ تعالیٰ انہیں پورا پورا بدلہ حق و انصاف کے ساتھ دے گا۔'' (ترجمہ احسن البیان) (2) ضابطۂ حیات یا دوسرے الفاظ میں

مذہب وشریعت۔ ﴿ وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ ﴾(4/النساء:125)''اوراس سے بہتر کس کا دین ہوگا جس نے پیشانی رکھی اللہ کے حکم پر اور نیک کاموں میں لگا ہوا ہے۔''(ترجمہ شیخ الہندؒ) ﴿ اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ ﴾(3/آل عمران:83)''سوکیا یہ لوگ اللہ کے دین کے علاوہ (کسی طریقہ کو) تلاش کررہے ہیں۔''(ترجمہ ماجدیؒ) ﴿ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ ﴾(3/آل عمران:85)''اور جو کوئی اسلام کے سوا کسی اور دین کو تلاش کرے گا سو وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔''(ترجمہ ماجدیؒ)(3) اطاعت اور فرمانبرداری۔ ﴿ اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ۭ ﴾(39/الزمر:2)''ہم نے تمہاری طرف کتاب اُتاری ہے حق کے ساتھ تو اللہ ہی کی بندگی کرو اُسی کے لیے اطاعت کو خالص کرتے ہوئے۔''(ترجمہ از تدبر قرآن)۔ ﴿ وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا ۭ ﴾(16/النحل:52)''اور اسی کی تابعداری اور اطاعت لازمی ہے۔''(ترجمہ ضیاء القرآن)۔ اس آیت کے تحت صاحبؒ ضیاء القرآن فرماتے ہیں:''دین سے مراد اطاعت واخلاص ہے۔ واصبًا کا معنی ہمیشہ ہے جب کوئی شخص کسی کام کو ہمیشہ پابندی سے کرے تو کہتے ہیں وصب الرجل علی الامر اذا واظب علیه۔ (قرطبیؒ) معنی یہ ہے کہ اسی کی اطاعت وفرمانبرداری ہر شخص پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے لازم ہے۔''(ضیاء القرآن، ۲، ص ۵۷۵)۔(4) قانونِ ملکی۔ ﴿ مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ ﴾(12/یوسف:76)''یوسفؑ اپنے بھائی کو بادشاہِ مصر کے قانون کے لحاظ سے نہیں لے سکتے تھے۔''(ترجمہ ماجدیؒ)۔ اور تقریباً تمام بزرگوں نے اس آیت میں 'دین' کا ترجمہ 'قانون' سے کیا ہے۔(5) وہ اصول و احکام جو حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک سب انبیاء میں مشترک ہیں۔ ﴿ شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا ﴾(42/الشوریٰ:13)''اُس نے تمہارے لیے، دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے، جس کا حکم اس نے نوحؑ کو دیا تھا۔''(نوٹ: دین کی بقیہ تفصیل آگے نوٹ میں دیکھیں)۔

اَلدِّيْنُ اسلام کا ضابطہ حیات۔ ﴿ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۣ ﴾(3/آل عمران:19)''یقیناً دین تو اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے۔''(ترجمہ ماجدیؒ)

مَدِيْنٌ ج: مَدِيْنُوْنَ۔ دِيْنٌ مصدر سے اسم المفعول ہے۔ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔(1) وہ جس کو بدلہ دیا جائے۔(2) محکوم۔ تابع دار۔ وہ جو کسی کے حکم کا پابند ہو۔ زیرِ فرمان۔ قرآنِ مجید میں یہ لفظ ان دونوں معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ﴿ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَدِيْنُوْنَ ﴾(37/الصافات:53)''کیا جب ہم مرگئے اور ہوگئے مٹی اور ہڈیاں، کیا ہم کو جزا ملے گی۔''(ترجمہ شیخ الہندؒ)۔ ﴿ فَلَوْلَآ اِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ ﴾(56/الواقعہ:86)''پس اگر تم کسی کے پابند حکم نہیں ہو۔''(ترجمہ ضیاء القرآن)۔ اسی آیت کا ترجمہ پہلے مفہوم کے لحاظ سے بھی کیا گیا ہے''تو اگر تمہارا حساب کتاب ہونے والا نہیں۔''(ترجمہ ماجدیؒ)۔ مَدِيْنٌ غلام اور لونڈی کو بھی کہتے ہیں کیونکہ وہ اپنے مالک کے حکم کے تابع ہوتے ہیں۔

(ض) **دَيْنًا** قرض دینا۔

دَيْنٌ قرض۔ (دَيْنٌ مصدر ہے مطلب ہے قرض دینا لیکن عربی میں اکثر مصدر بطور اسم الذات بھی استعمال ہوتے ہیں) ﴿ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۭ ﴾(4/النساء:11)''وصیت کے بعد جو اس نے وصیت کی یا قرضہ کے بعد۔'' مولانا عبدالماجد دریابادیؒ فرماتے ہیں''دَيْنٌ کا لفظ بہت وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ عربی میں یہ (عین) کے مقابلے میں ہے۔ اور اس کا اطلاق ہر اس معاملت پر ہوتا ہے جس کے معاوضے کا ایک جزء فی الفور نہ ہو۔''(تفسیر ماجدیؒ، ص ۱۴۹)

(تفاعل) **تَدَايُنًا** باہم ادھار پر لین دین کرنا۔ ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ۭ ﴾(2/البقرة:282)''جب تم لوگ قرض کا لین دین کرو ایک مقررہ مدت کے لئے تو اسے لکھ لو۔''

نوٹ: دِيْنٌ: حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں:''عربی زبان میں لفظ دین کے چند معانی ہیں جن میں ایک معنی ہے طریقہ اور روش،

قرآن کی اصطلاح میں لفظ دین ان اصول و احکام کے لیے بولا جاتا ہے جو حضرت آدمؑ سے خاتم الانبیاء ﷺ تک سب انبیاءؑ میں مشترک ہیں، اور لفظ ''شریعت'' یا ''منہاج'' یا بعد کی اصطلاحات میں لفظ ''مذہب'' فروعی احکام کے لیے بولے جاتے ہیں، جو مختلف زمانوں اور مختلف امتوں میں مختلف ہوتے چلے آئے ہیں، قرآن کریم کا ارشاد ہے:﴿ شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا ﴾(42/ الشوریٰ:13)''یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے وہی دین جاری فرمایا جس کی وصیت تم سے پہلے نوح علیہ السلام کو اور دوسرے انبیاء علیہم السلام کو کی گئی تھی۔'' اس سے معلوم ہوا کہ دین سب انبیاء علیہم السلام کا ایک ہی تھا، یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات کے جامع کمالات اور تمام نقائص سے پاک ہونے اور اس کے سوا کسی کا لائق عبادت نہ ہونے پر دل سے ایمان اور زبان سے اقرار (توحید) روزِ قیامت اور اس میں حساب کتاب اور جزا و سزا اور جنت و دوزخ پر دل سے ایمان لانا اور زبان سے اقرار کرنا (آخرت)، اس کے بھیجے ہوئے ہر نبی و رسول اور ان کے لائے ہوئے احکام پر اسی طرح ایمان لانا (رسالت)۔ (معارف القرآن، جلد ۲، صفحہ: ۳۶)۔ مولانا مودودیؒ فرماتے ہیں: دین کا لفظ عربی زبان میں متعدد مفہومات کا حامل ہے:

ایک مفہوم ہے غلبہ و اقتدار، مالکانہ اور حاکمانہ تصرف، سیاست و فرمانروائی اور دوسروں پر فیصلہ نافذ کرنا۔ چنانچہ لسان العرب میں ہے دَانَ النَّاسَ، اَیْ قَهَرَهُمْ عَلَى الطَّاعَةِ۔ دِنْتُهُمْ، اَیْ قَهَرْتُهُمْ۔ دِنْتُهٗ، سُسْتُهٗ وَمَلَكْتُهٗ۔ وَفِي الْحَدِيْثِ: اَلْكَيِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهٗ، اَیْ اَذَلَّهَا وَاسْتَعْبَدَهَا۔ اَلدَّيَّانُ، اَلْقَاضِیْ، اَلْحَكَمُ، اَلْقَهَّارُ۔ وَلَا اَنْتَ دَيَّانِیْ، اَیْ لَسْتَ بِقَاهِرٍ لِّیْ فَتَسُوْسَ اَمْرِیْ۔ مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِیْ دِيْنِ الْمَلِكِ، اَیْ فِیْ قَضَاءِ الْمَلِكِ۔......

دوسرا مفہوم ہے اطاعت، فرمانبرداری اور غلامی۔ لسان العرب میں ہے اَلدِّيْنُ، اَلطَّاعَةُ۔ دِنْتُهٗ وَ دِنْتُ لَهٗ اَیْ اَطَعْتُهٗ۔ وَالدِّيْنُ لِلّٰهِ، اِنَّمَا هُوَ طَاعَتُهٗ وَالتَّعَبُّدُ لَهٗ، فِي الْحَدِيْثِ اُرِيْدُ مِنْ قُرَيْشٍ كَلِمَةً تَدِيْنُ لَهُمْ بِهَا الْعَرَبُ، اَیْ تُطِيْعُهُمْ وَتَخْضَعُ لَهُمْ۔ ثُمَّ دَانَتْ بَعْدَ الرَّبَابِ، اَیْ ذَلَّتْ لَهٗ وَ اَطَاعَتْهُ۔ يَمْرُقُوْنَ مِنَ الدِّيْنِ، اَیْ اَنَّهُمْ يَخْرُجُوْنَ مِنْ طَاعَةِ الْاِمَامِ الْمُفْتَرَضِ الطَّاعَةِ۔ اَلْمَدِيْنُ، اَلْعَبْدُ۔ فَلَوْ لَا اِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ اَیْ غَيْرَ مَمْلُوْكِيْنَ۔

تیسرا مفہوم ہے وہ عادت اور طریقہ جس کی انسان پیروی کرے۔ لسان العرب میں ہے: اَلدِّيْنُ اَلْعَادَةُ وَ الشَّاْنُ۔ يُقَالُ مَا زَالَ ذٰلِكَ دِيْنِیْ وَدِيْدَنِیْ اَیْ عَادَتِیْ۔

ان تینوں مفہومات کو ملحوظ رکھتے ہوئے دین کے معنی اُس طرزِ عمل اور اس رویے کے ہیں جو کسی کی بالاتری تسلیم اور کسی کی اطاعت قبول کر کے انسان اختیار کرے۔ اور دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اس کی بندگی کرنے کا مطلب یہ ہے کہ'' آدمی اللہ کی بندگی کے ساتھ کسی دوسرے کی بندگی شامل نہ کرے، بلکہ اسی کی پرستش، اسی کی ہدایت کا اتباع اور اسی کے احکام و اوامر کی اطاعت کرے۔'' (تفہیم القرآن، ج ۴، صفحہ ۳۵۶)

<u>دین، شریعت اور ملت:</u> دین کی وضاحت اوپر آچکی ہے۔ شریعت سے مراد وہ احکام ہیں جو زمانے کی ضرورتوں کے مطابق بدلتے رہتے ہیں۔ مثلاً حضرت آدمؑ کی اولاد میں بہن بھائی کا نکاح جائز تھا جو بعد کی شریعتوں میں حرام کر دیا گیا۔ حضرت یعقوبؑ کی زوجیت میں دو حقیقی بہنیں تھیں جو بعد کی شریعتوں میں حرام قرار دی گئیں۔ غرض ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ دین اور شریعت کے اِس فرق کو خود رسول اللہ ﷺ نے اِن الفاظ میں سمجھایا:((اَلْاَنْبِيَاءُ اِخْوَةٌ الْعَلَّاتِ اُمَّهَاتُهُمْ شَتّٰى وَدِيْنُهُمْ وَاحِدٌ)) (متفق علیہ)''تمام انبیاء علاتی بھائی (وہ بھائی جن کا باپ ایک اور مائیں الگ الگ ہوں) ہیں۔ کہ ان کی مائیں (شریعتیں) الگ الگ ہیں اور ان کا دین (باپ) ایک ہی ہے۔'' اور ملّت سے مراد وہ نظام ہے جو ایک نبی احکام الٰہیہ کی فرمانبرداری میں اپنے ماننے والوں کی جماعت میں قائم کرتا ہے۔ دین اور شریعت میں سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتا ہے اور الہامی کتاب میں مذکور ہوتا ہے۔ سب سے پہلے نبی خود ان احکام پر عمل کرنے کا پابند ہوتا ہے ساتھ ہی وہ اِن احکام الٰہیہ کی تبلیغ کر کے اپنے ماننے والوں کی ایک جماعت بناتا ہے اور اُن سب کو بھی اِن احکامات کا پابند بناتا ہے اور ایک اسلامی نظام قائم کرتا ہے اِس نظام کا نام ملّت ہے۔ گویا ملّت احکام کا نام نہیں بلکہ اُس نظام کا نام ہے جس میں نبی امیر، اُس نبی کے ماننے والے مامور اور اُن کا دستور احکام الٰہیہ (دین، شریعت) ہوتا ہے۔ ملّت کی نسبت کسی مخصوص نبی کی طرف کی جا سکتی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ (آل عمران 95)''پس تم ملت ابراہیمؑ کی پیروی کرو جو سب سے بے تعلق ہو کر ایک اللہ ہی کے ہو گئے تھے۔'' (مترادفات القرآن۔ تلخیصاً)

ترکیب مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ مرکب اضافی ہے۔ اس کے مضاف مٰلِكِ کی جر بتا رہی ہے کہ یہ پورا مرکب اللہ کی صفت یا بدل ہے۔

ترجمہ	مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝
	جو بدلے کے دن کا مالک ہے

آیت:4
﴿ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝ ﴾

اِیَّا یہ کلمہ ضمائر منصوبہ متصلہ یعنی ضمیر مفعولی کو منفصل لکھنے اور اُس کے تلفظ کے لیے وضع کیا گیا ہے اور بالعموم حصر کا مفہوم پیدا کرتا ہے مثلاً ضَرَبْتُہٗ۔ اس میں ضمیر مفعولی فعل کے ساتھ ملا کر یعنی متصل لکھی ہے اور اس کے معنی ہیں ''میں نے اس کو مارا'' اس میں کسی اور کو مارنے کی نفی نہیں ہے۔ اب اگر ہم کہیں ضَرَبْتُ اِیَّاہُ تو اس کے معنی ہیں ''میں نے اس کو ہی مارا'' اس میں کسی اور کو مارنے کی نفی شامل ہے۔ اس کو حصر کا مفہوم کہتے ہیں۔ اب اگر ہم کہیں اِیَّاہُ ضَرَبْتُ تو معنی وہی رہیں گے البتہ حصر میں مزید زور اور تاکید پیدا ہو جائے گی۔ جیسے He Must Come میں جب مزید زور پیدا کرنا ہو تو ہم کہتے ہیں Come He Must۔

اب یہ نوٹ کرلیں کہ بات سمجھانے کی غرض سے ہم نے ضَرَبْتُ اِیَّاہُ استعمال کیا ہے ورنہ عربی میں اس کا رواج نہیں ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ ضمیر مفعولی جب اِیَّا کے ذریعہ منفصل کی جائے گی تو وہ فعل سے پہلے آئے گی۔ یعنی اِیَّاہُ ضَرَبْتُ کہا جائے گا۔ مثلاً ﴿ وَّ اشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ۝ ﴾ (16/ النحل:114) ''اور تم لوگ شکر کرو اللہ کی نعمت کا اگر تم لوگ صرف اور صرف اس کی ہی عبادت کرتے ہو'' اس قاعدہ کے دو استثناء ہیں۔

پہلا استثناء یہ ہے کہ کسی فعل کے بعد اگر اِلَّا آئے تو اِیَّا اور ضمیر مفعولی فعل کے بعد آسکتی ہے جیسے ﴿ وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ﴾ (17/ بنی اسرائیل:23) ''اور فیصلہ کر دیا تیرے رب نے کہ تم لوگ عبادت مت کرو مگر صرف اس کی ہی۔'' نوٹ کرلیں کہ ایسی صورت میں حصر کا مفہوم اِیَّا کی وجہ سے نہیں بلکہ جملہ کی ساخت کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ (یعنی نفی + استثناء)

دوسرا استثناء یہ ہے کہ کسی فعل کے بعد اگر دو ضمیر مفعولی لانا ہوں تو ان کے درمیان اِیَّا لگاتے ہیں۔ یعنی ضَرَبْتُ ھُمْ وَ کُمْ کہنا درست نہیں ہے۔ بلکہ ضَرَبْتُھُمْ وَاِیَّاکُمْ کہا جائیگا۔ جیسے ﴿ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ﴾ (17/ بنی اسرائیل:31) ''ہم رزق دیتے ہیں ان کو اور تم کو بھی۔'' ایسی صورت میں اِیَّا میں حصر کا مفہوم باقی نہیں رہتا۔

ع ب د

(ن) عُبُوْدِيَّةً عِبَادَةً کسی کے سامنے ذلت اور انکساری ظاہر کرنا۔

اس لفظ کی اتنی اہمیت ہے کہ اس ایک لفظ کے ذریعے سے تمام انسانوں اور جنوں کی تخلیق کا مقصد قرآنِ مجید میں بیان کیا گیا ہے فرمایا: ﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝ ﴾ (51/ الذاریات:56) ''میں نے جن اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لیے پیدا نہیں کیا ہے کہ وہ میری بندگی (یعنی نہ صرف پرستش و بندگی بلکہ غلامی و اطاعت بھی) کریں۔''

کسی کو معبود مان کر اس کے احسانات کو تسلیم کرتے ہوئے اس کی انتہائی تعظیم اور محبت کی وجہ سے اس کے سامنے اپنے اختیار سے اپنی انتہائی عاجزی اور فرمانبرداری کا اظہار کرنا، اس کی مکمل اطاعت کرنا، غلامی کرنا، بندگی کرنا عبادت کہلاتا ہے۔ عبادت میں بنیادی مفہوم اطاعت کا ہے کیونکہ یہ بات غلط معلوم ہوتی ہے کہ انسان جس کے سامنے انتہائی عاجزی کا اظہار کرے، زندگی کے معاملات میں اس کی اطاعت نہ کرے۔ اور اطاعت کبھی جزوی ہوتی ہے اور کبھی مجبوری سے۔ جزوی اور مجبوری سے کی ہوئی اطاعت، عبادت نہیں کہلاتی۔ کسی کے احسانات کو تسلیم کرتے ہوئے اس کی محبت میں ڈوب کر جب اطاعت کی جائے اور زندگی کے ہر معاملہ اور ہر لمحہ میں کی جائے تو ایسی اطاعت، عبادت کہلاتی ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص عبادت کے بہت سے کام اپنے اختیار سے نہیں کر رہا بلکہ کسی مجبوری یا کسی عمل کے زیر اثر کر رہا ہے تب بھی وہ

عبادت نہیں کہلائے گی کیونکہ اس کا اپنا اختیار اس میں شامل نہیں اور اسی طرح اگر کوئی شخص عبادت کے بہت سے کام کسی کی تعظیم کی وجہ سے نہیں بلکہ مذاق کے طور پر کر رہا ہے تب بھی وہ عبادت نہیں کہلائیں گے۔ اس لیے بعض علماء کا قول ہے: اَلْعِبَادَةُ تَذَلُّلٌ لِّلْغَيْرِ عَنْ اِخْتِيَارٍ لِغَايَةِ تَعْظِيْمِهٖ فَخَرَجَ التَّسْخِيْرُ وَالسَّخْرُ وَالْقِيَامُ وَالْاِنْحِنَاءُ لِنَوْعِ تَعْظِيْمٍ ''عبادت اپنے اختیار سے دوسرے کی انتہائی تعظیم کی غرض سے اس کے لیے عاجزی کا نام ہے۔ لہٰذا تسخیر کی بنا پر یا مذاق کی غرض سے ایسا کرنا نیز تعظیم رسمی کے لیے کسی کے واسطے کھڑا ہو جانا یا جھک جانا عبادت کی طرف سے خارج ہے۔'' اسی لیے محض کسی کے سامنے عاجزی اور انکساری کا اظہار کرنا عبادت نہیں مثلاً اگر کوئی بیٹا والد کے سامنے عاجزی اور انکساری کا اظہار کرے تو یہ تعظیم اور ادب ہے، عبادت نہیں، یہی تعظیم اور انکساری کوئی شخص اللہ کو معبود مان کر اور اُس کے احسانات کو تسلیم کر کے کرے تب یہ عبادت ہے۔ ہمارے بزرگوں نے عبادت کی وضاحت یوں کی ہے۔ حضرت امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں: لَفْظُ الْعُبُوْدِيَّةِ يَتَضَمَّنُ كَمَالَ الذُّلِّ وَكَمَالَ الْحُبِّ۔ ''لفظ عبودیت میں دو چیزیں لازمی طور پر شامل ہیں، کمالِ ذُلّ یعنی اپنے آپ کو اللہ کے سامنے بچھا دینا اور کمالِ محبت یعنی اللہ کے سامنے یہ جھکنا محبت اور دل کی پوری آمادگی کے ساتھ ہو۔'' امام ابن قیمؒ فرماتے ہیں: اَلْعِبَادَةُ تَجْمَعُ اَصْلَيْنِ غَايَةُ الْحُبِّ مَعَ غَايَةِ الذُّلِّ وَالْخُضُوْعِ یعنی عبادت میں دو چیزیں لازماً شامل ہوں گی، اور وہ یہ کہ ایک طرف انتہائی درجے کی محبت اور دوسری طرف اس کے ساتھ انتہائی درجے کا جھکنا اور عاجزی۔ علامہ ابن الاثیرؒ فرماتے ہیں: اَلْعِبَادَةُ فِي اللُّغَةِ اَلطَّاعَةُ مَعَ الْخُضُوْعِ۔ لغت میں عبادت نام ہے اُس اطاعت کا جو عاجزی کے ساتھ ہو۔ علامہ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں: وَفِي الشَّرْعِ عِبَارَةٌ عَمَّا يَجْمَعُ كَمَالَ الْمَحَبَّةِ وَالْخُضُوْعِ وَالْخَوْفِ۔ اور (عبادت) شرع میں عبارت ہے اس چیز سے جو انتہائی محبت، عاجزی اور خوف پر مشتمل ہو۔ شاہ عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں: ''مشغول کردن تمام اعضاء و جوارح ظاہر و باطن را در راہِ اُو و بمرضیاتِ اُو'' تمام اعضاء و جوارح ظاہر اور باطن کو مشغول کر دینا اس (اللہ) کی راہ میں اس کی مرضی کے مطابق۔ مولانا امین احسن اصلاحیؒ تدبر قرآن میں فرماتے ہیں: عبادت کے اصلی معنی عربی لغت میں انتہائی خضوع اور انتہائی عاجزی و فروتنی کے اظہار کے ہیں۔ لیکن قرآن میں یہ لفظ اس خضوع و خشوع کی تعبیر کے لیے خاص ہو گیا ہے جو بندہ اپنے خالق و مالک کے لیے ظاہر کرتا ہے۔ پھر اطاعت کا مفہوم بھی اس لفظ کے لوازم میں داخل ہو گیا ہے کیونکہ یہ بات بالبداہت غلط معلوم ہوتی ہے کہ انسان جس ذات کو اپنے انتہائی خضوع و خشوع کا واحد مستحق سمجھے زندگی کے معاملات میں اس کی اطاعت کو لازم نہ جانے۔ چنانچہ عبادت کی اس حقیقت کو قرآن مجید نے بعض جگہ کھول بھی دیا ہے مثلاً: ﴿ اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ۝۲ ﴾ (39/الزمر:2) ''ہم نے تمہاری طرف کتاب اتاری ہے حق کے ساتھ تو اللہ ہی کی بندگی کرو اسی کے لیے اطاعت کو خاص کرتے ہوئے۔'' عبادت کے ساتھ اطاعت کا یہ تعلق اس قدر گہرا ہے کہ بعض جگہ یہ لفظ صاف صاف اطاعت کے مفہوم ہی کے لیے استعمال ہو گیا ہے مثلاً: ﴿ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝۶۰ ﴾ (36/یٰسٓ:60) ''کہ شیطان کی عبادت نہ کرو کیونکہ وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔'' (تدبر قرآن، جلد ا، صفحہ: ۵۷)۔ مولانا مودودیؒ تفہیم القرآن میں فرماتے ہیں: عبادت کا مادہ عبد ہے۔ اور یہ لفظ ''آزاد'' کے مقابلے میں ''غلام'' اور ''مملوک'' کے لیے عربی زبان میں مستعمل ہوتا ہے۔ اسی معنی کے لحاظ سے ''عبادت'' میں دو مفہوم پیدا ہوئے ہیں۔ ایک پوجا اور پرستش، جیسا کہ عربی زبان کی مشہور و مستند لغت ''لسان العرب'' میں ہے: عَبَدَ اللّٰهَ، تَأَلَّهَ لَهٗ۔ وَالتَّعَبُّدُ، اَلتَّنَسُّكُ۔ دوسرے عاجزانہ اطاعت اور برضا و رغبت فرمانبرداری جیسا کہ لسان العرب میں ہے، اَلْعِبَادَةُ، اَلطَّاعَةُ، وَمَعْنَى الْعِبَادَةِ فِي اللُّغَةِ اَلطَّاعَةُ مَعَ الْخُضُوْعِ۔ وَكُلُّ مَنْ دَانَ لِمَلِكٍ فَهُوَ عَابِدٌ لَّهٗ (وَقَوْمُهُمَا لَنَا عَابِدُوْنَ)۔

وَالْعَابِدُ، اَلْخَاضِعُ لِرَبِّهٖ اَلْمُسْتَسْلِمُ الْمُنْقَادُ لِاَمْرِهٖ۔ عَبَدَ الطَّاغُوْتَ، اَطَاعَهٗ يَعْنِي الشَّيْطَانَ فِيْمَا سَوَّلَ لَهٗ وَاَغْرَاهُ۔ اِيَّاكَ نَعْبُدُ، اَيْ نُطِيْعُ الطَّاعَةَ الَّتِيْ يَخْضَعُ مَعَهَا۔ اُعْبُدُوْا رَبَّكُمْ، اَطِيْعُوْا رَبَّكُمْ۔ پس لغت کی اِن مستند تشریحات کے مطابق مطالبہ صرف اللہ تعالیٰ کی پوجا اور پرستش ہی کا نہیں ہے بلکہ اس کے احکام کی بے چون و چرا اطاعت، اوراس کے قانونِ شرعی کی برضا ورغبت پیروی، اوراُس کے امر ونہی کی دل وجان سے فرمانبرداری کا بھی ہے۔ (تفہیم القرآن، ج ۴، صفحہ: ۳۵۵)

(ک) **عُبُوْدَةٌ** باپ دادا سے غلام ہونا، جدی پشتی غلام ہونا۔

عَابِدٌ ج: عَابِدُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔عبادت کرنے والا۔ بندہ۔ غلام۔﴿ وَ لَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ﴾ (109/الکافرون:4)''اور نہ ہی میں عبادت کرنے والا ہوں اُن کی جس کی تم پوجا کرتے ہو۔''﴿ فَقَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ ﴾(23/المومنون:47)''تو انہوں نے کہا کیا ہم ایمان لے آئیں اِن دو آدمیوں پر جو ہماری مانند ہیں، حالانکہ اُن کی قوم ہماری غلام ہے۔''(ترجمہ ضیاء القرآن)۔عربی زبان میں عابد کے معنی مطیع، فرمانبردار اور خادم کے بھی آتے ہیں۔ چنانچہ حضرت شیخ الہندؒ وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ کا ترجمہ کرتے ہیں''اوران کی قوم ہماری تابعدار (خدمت گار) ہیں۔''اور مولانا عبدالماجد دریابادیؒ ترجمہ کرتے ہیں''درآنحالیکہ ان کی قوم (بھی) ہمارے زیرِ حکم ہے۔''

عَابِدَةٌ ج: عَابِدَاتٌ۔ عَابِدٌ کی مونث۔ عبادت کرنے والی۔ بندی۔﴿ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ ﴾(66/التحریم:5) ''فرمانبردار، توبہ کرنے والیاں، عبادت کرنے والیاں۔''

عَبْدٌ ج: عِبَادٌ اور عَبِيْدٌ۔غلام۔ بندہ۔ جس کی کوئی چیز اپنی نہ ہو۔ جس کی زندگی، خواہش غرضیکہ ہر چیز اس کے آقا کی ملکیت ہو۔ عَبْدٌ کا لفظ چار معنی میں استعمال ہوتا ہے(۱) اَلْعَبْدُ بمعنی غلام یعنی وہ انسان جسے خریدنا اور فروخت کرنا شرعاً جائز ہو چنانچہ آیات کریمہ ﴿ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ ﴾(2/البقرۃ:78)''اور غلام کے بدلے غلام۔''﴿ عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰي شَيْءٍ ﴾(16/النحل:75)''ایک غلام مملوک ہے جو کسی چیز کا اختیار نہیں رکھتا۔'' میں عَبْدٌ کا لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ (۲) اَلْعَبْدُ بِالْاِيْجَادِ یعنی وہ بندہ جسے اللہ نے پیدا کیا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ ﴿ اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ﴾(19/مریم:93)''آسمان اور زمین میں جو بھی ہیں سب کے سب اللہ کے غلام بن کر ہی آنے والے ہیں۔''(ترجمہ احسن البیان) میں اسی معنی کی طرف اشارہ ہے۔(۳) عَبْدٌ وہ ہے جو عبادت اور خدمت کی بدولت عبودیت کا درجہ حاصل کر لیتا ہے اس لحاظ سے جن پر عَبْدٌ کا لفظ بولا گیا ہے وہ دو قسم پر ہیں ایک وہ جو اللہ تعالیٰ کے مخلص بندے بن جاتے ہیں چنانچہ ایسے لوگوں کے متعلق فرمایا:﴿ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰي عَبْدِهٖ ﴾(25/الفرقان:1)''جس نے اپنے بندے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قرآن نازل فرمایا'' اور اس طرح کی کئی اور آیات ہیں۔(۴) دوسرے وہ جو دنیا کی لالچ اور حرص کے غلام بن کر ہر وقت اس کی پرستش میں لگے رہتے ہیں۔ چنانچہ ایسے لوگوں کے متعلق ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ((تَعِسَ عَبْدُ الدِّرْهَمِ۔ تَعِسَ عَبْدُ الدِّيْنَارِ)) درہم ودینار کا بندہ ہلاک ہو۔

عَبْدٌ کے ان معانی کے پیش نظر یہ بھی کہا جا سکتا ہے لَيْسَ كُلُّ اِنْسَانٍ عَبْدًا لِلّٰهِ کہ ہر انسان اللہ کا بندہ نہیں ہے یعنی بندہ مخلص نہیں ہے اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں: وَالنَّاسُ كُلُّهُمْ عِبَادُ اللّٰهِ کہ تمام لوگ اللہ کے ہیں یعنی اللہ ہی نے سب کو پیدا کیا ہے۔ بلکہ تمام اشیاء کا یہی حکم ہے۔

عَبْدٌ کا لفظ جب غلام کے معنی میں استعمال ہو تو اس کی جمع عَبِيْدٌ آتی ہے اور جب عَبْدٌ بمعنی عَابِدٌ یعنی عبادت گزار کے ہو تو اسکی جمع عِبَادٌ آتی ہے۔ البتہ مولانا عبدالرشید نعمانیؒ لغات القرآن میں فرماتے ہیں:''میری ناقص رائے میں یہ

قاعدہ کلیہ نہیں بلکہ اکثری ہے کیونکہ خود قرآن پاک میں ایک مقام پر عِبَادٌ کا استعمال غلاموں کے معنی میں ہوا ہے، ارشاد ہے: ﴿ وَ اَنۡكِحُوا الۡاَيَامٰى مِنۡكُمۡ وَالصّٰلِحِيۡنَ مِنۡ عِبَادِكُمۡ وَاِمَآئِكُمۡ ؕ ﴾ (24/النور:32) ''اور نکاح کر و رانڈوں کا اپنے اندر، اور جو نیک ہوں تمہارے غلام اور لونڈیاں۔'' عَبۡدٌ کے بارے میں مولانا عبدالماجد دریا بادیؒ فرماتے ہیں: ''عَبۡدٌ کا لفظ جب اس کی اضافت حق تعالیٰ کی جانب ہو، قریب یا مرتبہ خصوصی کو ظاہر کرنے والا ہوتا ہے۔ اور عبدنا یا عبداللّٰہ کا استعمال محاورۂ قرآنی میں ہمیشہ لطف ورحمت ہی کے مخصوص موقعوں پر ہوا ہے۔'' مولانا مفتی محمد شفیعؒ عَبۡدٌ کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''عِبَادٌ، عَبۡدٌ کی جمع ہے عبد کا ترجمہ ہے بندہ جو اپنے آقا کا مملوک ہو، اس کا وجود اور اس کے تمام اختیارات واعمال آقا کے حکم ومرضی پر دائر ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا بندہ کہلانے کا مستحق وہی شخص ہو سکتا ہے جو اپنے عقائد وخیالات کو اور اپنے ہر ارادے اور خواہش کو اور اپنی ہر حرکت وسکون کو اپنے رب کے حکم اور مرضی کے تابع رکھے ہر وقت گوش برآواز رہے کہ جس کام کا حکم ہو وہ بجالاؤں۔'' (معارف القرآن، ج۶،ص:۵۰۲)

اُعۡبُدۡ — ج: اُعۡبُدُوۡا۔ فعل امر کا صیغہ ہے۔ تم عبادت کرو۔ تم بندگی کرو۔ ﴿ فَاعۡبُدِ اللّٰهَ مُخۡلِصًا لَّهُ الدِّيۡنَ ؕ ۝۲ ﴾ (39/الزمر:2) ''پس آپ عبادت کریں اللہ کی خالص کرتے ہوئی اس کے لیے اطاعت کو۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔ ﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعۡبُدُوۡا رَبَّكُمُ الَّذِيۡ خَلَقَكُمۡ ﴾ (2/البقرۃ:21) ''اے لوگو بندگی کرو اپنے اس رب کی جس نے پیدا کیا تمہیں۔''

(تفعیل) **تَعۡبِيۡدًا** — غلام بنانا۔ فرمانبردار بنانا۔ عربی زبان میں طَرِيۡقٌ مُعَبَّدٌ اس ہموار راستے کو کہتے ہیں جس پر لوگ آسانی سے چل سکیں۔ اسی طرح عَبَّدۡتُ فُلَانًا کے معنی ہیں میں نے اسے مطیع کر لیا یعنی محکوم بنالیا۔ ﴿ وَتِلۡكَ نِعۡمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنۡ عَبَّدۡتَّ بَنِيۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ ؕ ۝۲۲ ﴾ (26/الشعراء:22) ''رہا تیرا احسان جو تو نے مجھ پر جتایا ہے تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنالیا تھا۔''

ع و ن

(ن) **عَوۡنًا** — پشت پناہ ہونا۔ درمیان میں ہونا۔

(افعال) **اِعَانَةً** — پشت پناہی کرنا۔ مدد کرنا۔ ﴿ فَاَعِيۡنُوۡنِيۡ بِقُوَّةٍ ﴾ (18/الکہف:95) ''پس میری مدد کرو قوت سے۔''

(تفاعل) **تَعَاوُنًا** — ایک دوسرے کی مدد کرنا۔ ﴿ وَتَعَاوَنُوۡا عَلَى الۡبِرِّ وَالتَّقۡوٰى ۖ ﴾ (5/المآئدہ:2) ''باہم مدد کرو نیکی اور تقویٰ پر۔''

(استفعال) **اِسۡتِعَانَةً** — مدد مانگنا۔ مدد چاہنا۔

مُسۡتَعَانٌ — اسم المفعول ہے۔ جس کی مدد چاہی جائے۔ جس سے مدد مانگی جائے۔ ﴿ وَاللّٰهُ الۡمُسۡتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوۡنَ ۝۱۸ ﴾ (12/یوسف:18) ''اور اللہ ہی سے مدد مانگتا ہوں اس پر جو تم لوگ بتاتے ہو۔''

عَوَانٌ — ج: عُوۡنٌ۔ درمیان۔ ادھیڑ عمر۔ عورتوں اور مویشیوں میں جو درمیانی عمر کا ہو اُس کو عَوَانٌ کہتے ہیں ﴿ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكۡرٌ ؕ عَوَانٌۢ بَيۡنَ ذٰلِكَ ؕ ﴾ (2/البقرہ:68) ''بیشک وہ ایک گائے ہے نہ بوڑھی ہے اور نہ کنواری ہے (بلکہ) دونوں عمروں کے درمیان ہے۔''

اِسۡتَعِيۡنُوۡا — فعل امر ہے۔ تم مدد مانگو۔ ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا اسۡتَعِيۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ ﴾ (2/البقرۃ:153) ''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، صبر اور نماز سے مدد لو۔''

ترجمہ

اِیَّاکَ	نَعۡبُدُ	وَ اِیَّاکَ	نَسۡتَعِیۡنُ
صرف تیری ہی	ہم عبادت کرتے ہیں	اور صرف تجھ سے ہی	ہم مدد مانگتے ہیں

نوٹ:1 بعض سلف کا قول ہے کہ اَلۡفَاتِحَۃُ سِرُّ الۡقُرۡاٰنِ وَ سِرُّ الۡفَاتِحَۃِ ھٰذِہِ الۡکَلِمَۃُ ..... یعنی قرآن کا خلاصہ یا راز سورہ فاتحہ ہے۔ اور پوری سورہ فاتحہ کا راز یا خلاصہ اس آیت اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ میں ہے۔

نوٹ:2 ''عبادت'' کی اہمیت کے پیشِ نظر یہاں اس کی مزید وضاحت دی جا رہی ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ ''عبادت'' کی حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں: ''عبادت نام ہے بندگی اور اطاعت وپیروی کا جو نماز، روزہ، حج، زکوۃ، یا ذکر وتلاوت میں منحصر نہیں اور نہ یہ چیزیں اپنی ذات میں مقاصد ہیں، بلکہ ان سب کا مقصد صرف ایک حکم الٰہی کی اطاعت ہے، یہی وجہ ہے کہ جن اوقات میں نماز کی ممانعت فرمائی گئی ہے، ان میں نماز کوئی کارِ ثواب نہیں بلکہ اُلٹا گناہ کا موجب ہے، ایام عیدین وغیرہ جن میں روزہ رکھنا ممنوع ہے، تو اس وقت روزہ رکھنا گناہ ہے، نویں ذی الحجہ کے علاوہ کسی دن کسی مہینہ میں میدان عرفات میں جمع ہو کر دعا، عبادت کرنا کارِ ثواب نہیں جبکہ نویں ذی الحجہ میں سب سے بڑی عبادت یہی ہے اسی طرح تمام دوسری عبادات کا حال ہے جب تک ان کے کرنے کا حکم ہے تو وہ عبادت ہیں اور جب اور جس حد پر اُن کو روک دیا جائے تو وہ بھی حرام و ناجائز ہو جاتی ہیں، جاہل عوام اس حقیقت سے آگاہ نہیں ہوتے، جو عبادات ان کی عادات بن جاتی ہیں بلکہ جن قومی رسوم کو وہ عبادات سمجھ کر اختیار کر لیتے ہیں، صریح احکامِ خدا اور رسول کو بھی ان کے پیچھے نظر انداز کر دیتے ہیں یہیں سے بدعات ومحدثات دین کا جزو بن جاتی ہیں، جو پچھلی شریعتوں اور کتابوں کی تحریف کا سبب ہوئی ہیں، اللہ جل شانہٗ نے مختلف پیغمبروں پر مختلف کتابیں اور شریعتیں نازل فرما کر انسانوں کو یہی سکھایا ہے کہ کسی ایک عمل یا ایک قسم عبادت کو مقصود نہ بنالیں، بلکہ صحیح معنی میں اللہ کے فرمانبردار بندے بنیں، اور جس وقت پچھلے عمل کو چھوڑ دینے کا حکم ہو فوراً چھوڑ دیں، اور جس عمل کے کرنے کا ارشاد ہو فوراً اس پر عمل پیرا ہوں۔'' (معارف القرآن، ج ۳ ص: ۱۶۳) اور حضرت پیر محمد کرم شاہ صاحبؒ عبادت کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''عبادت کیا ہے؟ آپ کو لغت وتفسیر کی ساری کتابوں میں اس کا یہ معنی ملے گا اَقۡصٰی غَایَۃِ الۡخُضُوۡعِ وَالتَّذَلُّلِ یعنی حد درجہ کی عاجزی اور انکسار۔ مفسرین اس کی مثال سجدہ سے دیتے ہیں۔ حالانکہ صرف سجدہ ہی عبادت نہیں بلکہ حالت نماز میں تمام حرکات وسکنات عبادت ہیں۔ ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونا، رکوع اور رکوع کے بعد ہاتھ چھوڑ کر کھڑے ہونا، سجدہ اور اس کے بعد حالت التحیات میں دو زانو بیٹھنا، سلام کے لیے دائیں بائیں منہ پھیرنا، یہ سب عبادت ہیں۔ اگر عبادت صرف تذلل وانکسار کے آخری مرتبہ کا نام ہے اور یہ آخری مرتبہ سجدہ ہی ہے تو کیا یہ باقی چیزیں عبادت نہیں۔ اس کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اور اگر یہ ساری چیزیں مطلقاً عبادت ہیں تو اگر کوئی شاگرد اپنے اُستاد کے سامنے اور بیٹا اپنے باپ کے سامنے دو زانو ہو کر بیٹھتا ہے یا ان کی آمد پر کھڑا ہو جاتا ہے تو کیا یہ کہنا درست ہوگا کہ اُس نے اپنے اُستاد یا باپ کی عبادت کی اور اُن کو اپنا معبود بنا لیا۔ حاشا وکلا۔ پھر وہ کون سی چیز ہے جو اِن حرکات وسکنات کو اگر یہ نماز میں ہوں تو عبادت بنا دیتی ہے اور یوں کھڑے ہونے کو (ہاتھ باندھے یا کھولے ہوئے) اور اس طرح بیٹھنے کو اور دائیں بائیں منہ پھیرنے کو تذلل وانکسار کے آخری مرتبہ پر پہنچا دیتی ہے اور اگر یہی امور نماز سے خارج ہوں تو نہ اِن میں غایۃ خضوع ہے اور نہ یہ عبادت متصور ہوتے ہیں تو اس کا ممیز ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ جس ذات کے لیے اور جس کے سامنے آپ یہ افعال کر رہے ہیں اس کے متعلق آپ کا عقیدہ کیا ہے اگر آپ اُس کو اللہ اور معبود یقین کرتے ہیں تو یہ سب اعمال عبادت ہیں اور سب میں غایۃ تذلل وخضوع پایا جاتا ہے لیکن اگر آپ اس کو عبد اور بندہ سمجھتے ہیں تو یہ اعمال عبادت نہیں کہلائیں گے، ہاں آپ ان کو احترام، اجلال اور تعظیم کہہ سکتے ہیں۔ (ضیاء القرآن، ج ۱ ص: ۲۳) (یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ غیر اللہ کے سامنے سجدہ دو قسم کا ہو سکتا ہے۔ سجدہ عبادت اور سجدہ تعظیم۔ سجدہ عبادت تو شرک کے زمرے میں آتا ہے، سجدہ تعظیم اگرچہ شرک نہیں لیکن ناجائز و حرام وہ بھی ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مظاہر حق جدید، شرح مشکوٰۃ شریف، ج ۱ ص ۱۳۳۔ مرتب)

آیت:5

﴿ اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ ۙ‏ ﴿۵﴾ ﴾

ھ د ی

(ض) ھُدًی، ھِدَایَۃً لطف اور مہربانی کے ساتھ رہنمائی کرنا۔ راستہ بتانا۔ اس کا استعمال ہمیشہ خیر و نیکی کے معنوں میں ہوتا ہے۔ ھُدًی، دراصل مصدر ھُدَیٌ تھا جو قاعدے کے مطابق ھُدًی بنا۔ یہ مبنی کی طرح استعمال ہوتا ہے یعنی تینوں اعرابی حالتوں میں ھُدًی ہی رہتا ہے (لیکن اس کو مبنی کہتے نہیں)۔ اس پر جب لام تعریف داخل ہو تو تینوں اعرابی حالتوں میں اَلْھُدٰی استعمال ہوتا ہے۔ ہدایت کے عموماً دو مفعول ہوتے ہیں یعنی کس کو ہدایت دی اور کیا ہدایت دی۔ ھُدًی کے ساتھ دوسرے مفعول کی تین صورتیں ہیں (۱) مفعول ثانی بغیر صلہ کے آتا ہے جیسے آیت زیر مطالعہ میں ہے۔ (۲) مفعول ثانی اِلٰی کے صلہ کے ساتھ آتا ہے مثلاً ﴿ وَمَنۡ يَّعۡتَصِمۡ بِاللّٰهِ فَقَدۡ هُدِىَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ﴿۱۰۱﴾ ﴾ (3/آل عمران:101) ''اور جو مضبوطی سے پکڑے گا اللہ کو تو لازماً اُس کی راہنمائی کی جائے گی ایک سیدھے راستے کی طرف۔'' (۳) مفعول ثانی ''لِ'' کے صلہ کے ساتھ آتا ہے مثلاً ﴿ وَقَالُوا الۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِىۡ هَدٰٮنَا لِهٰذَا ۖ ﴾ (7/الاعراف:43) ''تمام تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جس نے پہنچایا ہم کو یہاں تک۔''

ہدایت کا لفظ تین معنوں میں آتا ہے:

(۱) راستہ سمجھا دینا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ کام دو طرح سے کیا ہے (ا) فطری راہنمائی یا فطری ہدایت۔ جو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے ساتھ ہر جاندار چیز میں ودیعت کر رکھی ہے۔ مثلاً بچے کا پیدا ہوتے ہی ماں کے پستانوں کی طرف لپکنا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ قَالَ رَبُّنَا الَّذِىۡۤ اَعۡطٰى كُلَّ شَىۡءٍ خَلۡقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ﴿۵۰﴾ ﴾ (20/طٰہٰ:50) ''موسیٰؑ نے جواب دیا'' ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اُس کی ساخت بخشی پھر اس کو راستہ بتایا۔'' (ب) وہ راہنمائی جو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے پیغمبر بھیج کر اور کتابیں نازل کر کے کی۔ پیغمبروں نے انسانوں کے لیے اچھے اور برے راستے کی خوب اچھی طرح سے وضاحت کر دی اور نیکی اور بدی کا راستہ سمجھا دیا۔ وہ نیکی کے راستے کی طرف دعوت دیتے اور بدی کے راستے کو چھوڑنے کی تلقین کرتے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ وَجَعَلۡنَا مِنۡهُمۡ اَئِمَّةً يَّهۡدُوۡنَ بِاَمۡرِنَا لَمَّا صَبَرُوۡا ؕ ﴾ (32/السجدۃ:24) ''اور ہم نے بنی اسرائیل میں سے (دین کے) پیشوا بنائے تھے جو ہمارے حکم سے (لوگوں کو) ہدایت کرتے تھے۔'' میں ہدایت کے یہی معنی مراد ہیں۔

(۲) راستے کی درستگی پر دل کو کھول دینا یعنی توفیق دے دینا۔ یہ توفیق ہدایت یافتہ لوگوں کو عطا کی جاتی ہے ﴿ وَالَّذِيۡنَ اهۡتَدَوۡا زَادَهُمۡ هُدًى وَّاٰتٰٮهُمۡ تَقۡوٰٮهُمۡ ﴿۱۷﴾ ﴾ (47/محمد:17) ''رہے وہ لوگ جنھوں نے ہدایت پائی ہے، اللہ اُن کو اور زیادہ ہدایت دیتا ہے اور انہیں اُن کے حصّے کا تقویٰ عطا فرماتا ہے۔'' ﴿ وَمَنۡ يُّؤۡمِنۡۢ بِاللّٰهِ يَهۡدِ قَلۡبَهٗ ؕ ﴾ (64/التغابن:11) ''اور جو شخص اللہ پر ایمان لاتا ہے، تو وہ اُس کے دل کو ہدایت دیتا ہے۔''

(۳) منزل مقصود تک پہنچا دینا۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ وَقَالُوا الۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِىۡ هَدٰٮنَا لِهٰذَا ۖ ﴾ (7/الاعراف:43) ''اور وہ کہیں گے کہ ''تعریف اللہ ہی کے لیے جس نے ہمیں یہ راستہ دکھایا۔'' ﴿ اِنَّ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ يَهۡدِيۡهِمۡ رَبُّهُمۡ بِاِيۡمَانِهِمۡ ۚ ﴾ (10/یونس:9) ''بے شک جو لوگ ایمان لائے اور اُنہوں نے نیک

عمل بھی کیے اُن کا پروردگار اُنہیں پہنچا دے گا (اُن کی منزل تک) بوجہ اُن کے ایمان کے۔'' (ترجمہ ماجدیؒ) ''یقیناً وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے پہنچائے گا اُنہیں اُن کا رب (منزل مقصود تک) اُن کے ایمان کے باعث۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن) سورہ یونس کی آیت نمبر 9 کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں: ''اس میں لفظ ہدایت آیا ہے جس کے مشہور معنی راستہ بتلانے اور دکھلانے کے ہیں، اور کبھی منزل مقصود تک پہنچا دینے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، اس مقام پر یہی معنی مراد ہیں اور منزل مقصود سے مراد جنت ہے جس کی وضاحت بعد کے الفاظ میں ہوگئی ہے۔''

ایک انسان کسی دوسرے کو صرف دعوت الی الخیر اور راہنمائی کے ذریعہ ہی ہدایت کر سکتا ہے باقی اقسام ہدایت اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہیں لہٰذا جن آیات میں ہدایت کی نسبت پیغمبر یا کتاب یا دوسرے انسانوں کی طرف کی گئی ہے وہاں صرف راہ حق کی طرف راہنمائی کرنا مراد ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿وَ اِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝﴾ (42/الشوریٰ:52) ''اور بیشک آپؐ سیدھا راستہ دکھاتے ہیں۔'' ﴿وَّ لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ۝﴾ (13/الرعد:7) ''اور ہر قوم کے لیے ایک ہدایت دینے والا ہے۔'' اور جن آیات میں پیغمبروں یا دوسرے لوگوں سے ہدایت کی نفی کی گئی ہے وہاں باقی اقسام ہدایت مراد ہیں چنانچہ فرمایا: ﴿ اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ ﴾ (28/القصص:56) ''اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! آپؐ جسے چاہیں اسے ہدایت نہیں دے سکتے۔'' اور قرآن میں جہاں کہیں ظالموں اور کافروں کو ہدایت سے روک دینے کا ذکر آیا ہے وہاں یا تو ہدایت بمعنی توفیق خاص جو ہدایت یافتہ لوگوں کو عطا ہوتی ہے ان سے سلب کر لی جاتی ہے اور یا ہدایت بمعنی یہ کہ اللہ انہیں آخرت میں ثواب کی طرف ہدایت نہیں دے گا اور نہ ہی انہیں جنت میں داخل کرے گا چنانچہ فرمایا: ﴿وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝﴾ (9/التوبۃ:19) ''اور اللہ ظالم قوم کو ہدایت نہیں دیتا۔'' ﴿وَ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝﴾ (16/النحل:107) ''اور یہ کہ اللہ کافر لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔''

ویسے تو ہدایت کا استعمال ہمیشہ خیر اور نیکی کے معنوں میں ہوتا ہے لیکن قرآن مجید میں طنزاً کافروں کے لیے بھی استعمال ہوا ہے ﴿ فَاهْدُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطِ الْجَحِيْمِ ۝﴾ (37/الصّٰفّٰت:23) ''پھر ان سب کو جہنّم کا راستہ دکھاؤ۔'' یہ اُسی طرح ہے جیسے فرمایا: ﴿ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝﴾ (84/الانشقاق:24) ''لہٰذا! اِن کو دردناک عذاب کی بشارت دے دو۔'' اس میں عذاب کے لیے بشارت کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

ھدی یھدی کا صلہ جب لام آتا ہے تو اس کے معنی ظاہر ہونا، واضح ہونا، روشن ہونا بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً: ﴿ اَوَ لَمْ يَهْدِ لِلَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ اَهْلِهَآ اَنْ لَّوْ نَشَآءُ اَصَبْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ ﴾ (7/الاعراف:100) ''کیا اُن لوگوں پر جو اب زمین کے وارث ہیں بعد اُس کے سابق باشندوں کے یہ بات واضح نہیں ہوئی ہے کہ اگر ہم چاہتے تو اُنہیں بھی مصیبت میں مبتلا کر دیتے اُن کے گناہوں کے عوض میں۔'' آیت کی وضاحت کرتے ہوئے صاحبؒ تفسیر ماجدی فرماتے ہیں ''ہدایۃ کا تعدیہ جب ل کے ساتھ آتا ہے تو اس کے معنی ہوتے ہیں تَبْيِيْنٌ کے یعنی روشن و واضح ہو جانے کے۔ اِنَّمَا عُدِّيَ يَهْدِ بِاللَّامِ بِمَعْنٰى يُبَيِّنُ (بیضاویؒ)۔''

هُدًى مصدر کے علاوہ اسم ذات بھی ہے بمعنی ہدایت۔ ﴿ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى ﴾ (2/البقرۃ:16) ''یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے خرید لی گمراہی، ہدایت کے بدلے۔'' هُدًى، بمعنی اَلْهَادِيْ، ہدایت دینے والا بھی استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ کا ترجمہ بعض بزرگوں نے اسی معنی کے لحاظ سے کیا ہے۔ چنانچہ حضرت شیخ الہندؒ فرماتے ہیں: ''راہ بتلاتی ہے ڈرنے والوں کو۔'' اور صاحبؒ احسن البیان فرماتے ہیں: ''پرہیزگاروں کو راہ دکھانے والی ہے۔''

اِهْدِ ج: اِهْدُوْا۔ فعل امر ہے۔ تو راہنمائی کر۔ تو ہدایت دے۔ اِهْدِ، آیت زیر مطالعہ میں استعمال ہوا ہے۔ اور ﴿ فَاهْدُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطِ الْجَحِيْمِ ۝﴾ (37/الصافات:23) ''پھر ان سب کو جہنم کا راستہ دکھاؤ۔''

هُدِیَ ج: هُدُوْا۔ ماضی مجہول کا صیغہ ہے۔ اُسے ہدایت دی گئی۔ اس کی راہنمائی کی گئی۔ ﴿ وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾ (3/آل عمران:101) ’’جو شخص اللہ تعالیٰ (کے دین) کو مضبوطی سے تھام لے تو بلاشبہ اُسے راہ راست دکھا دی گئی ہے۔‘‘ ﴿ وَهُدُوْٓا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ ﴾ (22/الحج:24) ’’اُن کو پاکیزہ بات کی راہنمائی کر دی گئی۔‘‘

هَادٍ اسم الفاعل ہے۔ راہنمائی کرنے والا۔ ﴿ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ﴾ (13/الرعد:7) ’’اور ہر قوم کے لئے ایک ہدایت دینے والا ہے۔‘‘ هَادٍ، جب مضاف ہو تو کبھی اسے ’ی‘ کے ساتھ لکھا جاتا ہے یعنی بِهٰدِی الْعُمْیِ (النمل: 81) اور کبھی ’ی‘ کے بغیر لکھا جاتا ہے یعنی بِهٰدِ الْعُمْیِ (الروم:53)۔ هَادٍ کو حالت نصب میں هَادِيًا لکھا جاتا ہے (الفرقان:31)۔ هَادٍ جب لائے نفی جنس کا اسم ہو تو هَادِیَ لکھا جاتا ہے (الاعراف:186)۔

اَهْدٰى اَفْعَلُ التفضیل کا صیغہ ہے۔ اس کا ترجمہ ’’زیادہ راہ پانے والا، زیادہ ہدایت یافتہ‘‘ کیا جاتا ہے۔ ﴿ وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰٓؤُلَاۗءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا ﴾ (4/النساء:51) ’’اور وہ لوگ کافروں کے حق میں کہتے ہیں کہ وہ لوگ ایمان والوں سے زیادہ ہدایت یافتہ ہیں بلحاظ راستے کے۔‘‘

(تفعیل) **تَهْدِيَةٌ** تَهْدِيَةٌ، تَفْعِلَةٌ کے وزن پر مصدر ہے۔ کسی چیز کو کسی تک پہنچا دینا۔ تحفہ دینا۔

هَدِيَّةٌ اسم ذات ہے۔ تحفہ۔ ﴿ وَاِنِّىْ مُرْسِلَةٌ اِلَيْهِمْ بِهَدِيَّةٍ ﴾ (27/النمل:35) ’’اور میں بھیجنے والی ہوں انؑ کی طرف ایک تحفہ۔‘‘

هَدْیٌ هَدْیٌ کا لفظ خاص کر اس جانور پر بولا جاتا ہے جو بیت اللہ کی طرف (ذبح کے لیے) بھیجا جائے۔ اخفش نے اس کا واحد هَدْيَةٌ لکھا ہے۔ نر کی طرح مادہ جانور پر بھی ہدی کا لفظ بولا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ مصدر ہے۔ جو بطور صفت کے استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے: ﴿ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ﴾ (2/البقرۃ:152) ’’اور اگر کہیں گھر جاؤ تو جو قربانی میسر آئے۔‘‘ ایسے جانور جس شخص کے پاس ہوتے تو عرب کا معمول تھا کہ اُس کو کچھ نہ کہتے اور وہ امن کے ساتھ سفر کرتا اور اپنا مقصد پورا کرتا اس لیے ہدی بھی قیام امن کا ایک سبب ہوئی۔

(افتعال) **اِهْتِدَاءٌ** ہدایت پانا۔ لیکن یہ لفظ خاص اُس ہدایت پر بولا جاتا ہے جو انسان اپنے اختیار سے حاصل کرے۔ ﴿ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ﴾ (3/آل عمران:20) ’’پس اگر یہ لوگ اسلام لے آئیں تو یہ لوگ یقیناً ہدایت پائیں گے۔‘‘ کبھی اس کے معنی طلب ہدایت کے بھی آتے ہیں مثلاً ﴿ وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِىْ عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴾ (2/البقرۃ:150) ’’اور یہ بھی مقصود ہے کہ میں تم کو اپنی تمام نعمتیں بخشوں اور یہ بھی کہ تم راہ راست پر چلو۔‘‘ اور کبھی اس کے معنی سمجھنے کے بھی آتے ہیں مثلاً ﴿ قَالَ نَكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا نَنْظُرْ اَتَهْتَدِيْٓ اَمْ تَكُوْنُ مِنَ الَّذِيْنَ لَا يَهْتَدُوْنَ ﴾ (27/النمل:41) اس آیت کا ترجمہ حضرت شیخ الہندؒ ان الفاظ میں کرتے ہیں: ’’کہا روپ بدل دکھلاؤ اس عورت کے آگے اُس کے تخت کا ہم دیکھیں سمجھ پاتی ہے یا اُن لوگوں میں ہوتی ہے جن کو سمجھ نہیں۔‘‘ (واللہ اعلم)

<u>نوٹ:</u> قرآن مجید میں يَهْتَدِيْ کو يَهِدِّيْ بھی پڑھا گیا ہے۔ مثلاً ﴿ اَفَمَنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ يُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا يَهِدِّيْٓ اِلَّآ اَنْ يُّهْدٰى ﴾ (10/یونس:35) ’’پھر بھلا بتاؤ، جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے وہ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اس کی پیروی کی جائے یا وہ جو خود راہ نہیں پاتا اِلّا یہ کہ اس کی رہنمائی کی جائے؟۔‘‘ اصل میں يَهْتَدِيْ قاعدے کے مطابق يَهَدِّيْ بنتا ہے لیکن ’ھ‘ پر زیر پڑھنا بھی جائز ہے۔

مُّھْتَدٍ ج: مُھْتَدُوْنَ، مُھْتَدِیْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ ہدایت پانے والا۔ ہدایت یافتہ۔ ﴿فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ ۚ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ﴾ (57/الحدید:26) ''اور ان میں کوئی ہدایت پانے والا ہے اور ان میں اکثر فاسق ہیں۔'' ﴿وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ﴾ (2/البقرۃ:157) ''اور وہ لوگ ہی ہدایت یافتہ ہیں۔'' ﴿وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ﴾ (2/البقرۃ:16) ''اور وہ ہدایت یافتہ نہ ہوئے۔'' مُھْتَدٍ اصل میں مُھْتَدِیٌ تھا جو کہ قاعدے کے مطابق مُھْتَدٍ بن گیا۔ اس پر 'ال' داخل کریں تو یہ اَلْمُھْتَدِیُ بنتا ہے جو کہ پھر 'ی' ساکن کے ساتھ اَلْمُھْتَدِیْ لکھا جاتا ہے (الاعراف:178) اور کبھی اس 'ی' کو حذف کر کے اَلْمُھْتَدِ لکھا جاتا ہے (بنی اسرائیل:97)۔

ھُدًی اور ھِدایۃٌ میں فرق: اَلْھُدٰی اور ھِدایۃ اگرچہ لغۃً ہم معنی ہیں لیکن قرآن پاک نے ھُدًی کا لفظ خاص کر ہدایت الٰہی کے لیے استعمال کیا ہے اور کسی انسان کی طرف اس کی نسبت نہیں کی چنانچہ فرمایا: ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾ (2/البقرۃ:2) ''خدا سے ڈرنے والوں کی راہنما ہے۔'' ﴿فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ﴾ (2/البقرۃ:38) ''پھر جو میری طرف سے کوئی ہدایت تمہارے پاس پہنچے، تو جو لوگ میری اُس ہدایت کی پیروی کریں گے۔'' ﴿قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ﴾ (2/البقرۃ:120) ''صاف کہہ دو کہ راستہ بس وہی ہے جو اللہ نے بتایا ہے۔'' (مفردات القرآن)

س ر ط

(ن۔س) سَرَطًا۔ سَرَطَانًا نگلنا۔

سِرَاطٌ ج: سُرُطٌ اور صُرُطٌ۔ آسان راستہ۔ صاف کھلا راستہ۔ 'س' 'ط' کی وجہ سے 'ص' پڑھی جاتی ہے۔ مولانا عبدالرشید نعمانی اِس لفظ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''واضح رہے کہ صِراطٌ اصل میں سِرَاطٌ ہے۔ اس میں س کا ص سے قلب (بدل جانا) ہے تاکہ اطباق (موٹا ہونا۔ تجوید کی اصطلاح) میں طا کے مطابق ہو جائے۔ اس کی اصل سَرَطْتُ الطَّعَامَ سے ہے جس کا استعمال کھانے کے نگلنے کے لیے ہوتا ہے گویا سراط میں اس کا تصور ہے کہ رہرو (راستہ چلنے والا) راہ کو نگل لیتا ہے یا راستہ رہرو کو ہڑپ کر جاتا ہے۔'' (لغات القرآن)

ق و م

(ن) **قِيَامًا** (۱) یہ مصدر ہے مطلب ہے: کھڑا ہونا۔ ٹھہرنا۔ نگرانی یا حفاظت کرنا۔ اٹھنا۔

(۲) یہ قَائِمٌ کی جمع بھی ہے مطلب ہے کھڑے ہونے والے۔ ﴿وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا﴾ (25/الفرقان:64) ''اور وہ لوگ جو رات کاٹتے ہیں اپنے رب کے آگے سجدے میں اور کھڑے۔'' اس آیت میں حضرت درویشؒ نے قِیَامٌ کو قَائِمٌ کی جمع لکھا ہے۔

(۳) یہ اسم ذات بھی ہے مطلب وہ چیز جس پر کھڑا ہوا جائے۔ جیسے کِتَابٌ وہ چیز جس پر لکھا جائے۔ جس سے کسی چیز کی بقا وابستہ ہو۔ وہ چیز جس کے سہارے کوئی قائم رہ سکے۔ قرآن مجید میں مال کو قیام اسی معنی کے لحاظ سے کہا گیا ہے۔ ﴿وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا﴾ (4/النساء:5) ''اور اپنے وہ مال جنھیں اللہ نے تمہارے لیے قیامِ زندگی کا ذریعہ بنایا ہے، نادان لوگوں کے حوالہ نہ کرو۔'' ﴿جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ﴾ (5/المائدۃ:97) ''اللہ نے مکانِ محترم کعبہ کو لوگوں کے لیے (اجتماعی زندگی کے) قیام کا ذریعہ بنایا۔''

قِيَامَةٌ مصدر ہے۔ ایک بار کھڑے ہونا۔ اچانک اٹھ کھڑے ہونا۔ اصطلاح شرع میں اس سے مراد ہے مرنے کے بعد، جزا اور سزا کے لیے، دوبارہ زندہ ہو کر قبروں سے اٹھ کھڑے ہونا۔ یہ عقیدہ اسلام کے بنیادی عقائد میں سے ہے۔ ﴿وَيَوْمَ

الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ﴾(2/البقرۃ:85)''اور قیامت کے دن (یعنی دوبارہ کھڑے ہونے کے دن) وہ لوٹائے جائیں گے شدید ترین عذاب کی طرف۔''

قَآئِمٌ ج: قِيَامٌ اور قَآئِمُوْنَ۔ اسم الفاعل۔ کھڑا ہونے والا۔ نگرانی کرنے والا۔ قیام کرنے والا۔ ﴿اَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ ۚ﴾ (13/الرعد:33)''تو کیا وہ جو نگرانی کرنے والا ہے ہر نفس (کے عمل) کی جو اس نے کمایا۔''

قُمْ ج: قُوْمُوْا۔ فعل امر ہے۔ تو کھڑا ہو۔ ﴿قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۙ﴾ (73/مزمل:2)''کھڑے ہو جایئے رات کو (نماز کے لیے) مگر تھوڑا۔'' ﴿وَ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ۝﴾ (2/البقرۃ:238)''اور کھڑے رہو اللہ کے لیے عاجزی کرتے ہوئے۔''

قَوَّامٌ فَعَّالٌ کے وزن پر مبالغہ ہے۔ بہت زیادہ حفاظت کرنے والا۔ ذمہ دار۔ کفیل۔ قَوَّامٌ اُس شخص کو کہتے ہیں جو کسی ادارے، نظام یا فرد کے معاملات کو درست حالت میں چلانے، اُس کی نگہبانی اور حفاظت کرنے اور اُس کی ضروریات مہیا کرنے کا ذمہ دار ہو۔ اِس لیے اردو میں اِس کا ترجمہ عموماً حاکم کیا جاتا ہے۔ ﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ﴾ (4/النساء:34)''مرد حفاظت کرنے والے، ذمہ دار ہیں عورتوں پر۔'' ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ﴾ (4/النساء:135)''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، انصاف کے علم بردار اور خدا واسطے گواہ بنو۔''

قَيُّوْمٌ فَيْعُوْلٌ کے وزن پر مبالغہ ہے۔ اصل میں قَيْوُوْمٌ تھا۔ صرفی تعلیل کے بعد قَيُّوْمٌ بن گیا۔ اس کا مصدر قِيَامٌ ہے۔ اس کے معنی ہیں وہ ذات جو از خود قائم ہو اور دوسروں کو قائم رکھنے والی ہو۔ حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں: ''اَلْقَيُّوْمُ: اَلْقَائِمُ بِتَدْبِيْرِ خَلْقِهٖ مِنْ اِنْشَاءِهِمْ اِبْتِدَاءً وَاِيْصَالِ اَرْزَاقِهِمْ اِلَيْهِمْ یعنی وہ ہستی جو کائنات کی ہر چیز کی تخلیق، نشوونما اور بقاء کی تدبیر فرمانے والی ہے۔ ﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۚ﴾ (2/البقرۃ:255)''اللہ، وہ زندۂ جاوید ہستی، جو تمام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے، اُس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔''

قَيِّمٌ، قَيِّمَةٌ یہ دونوں صفت کے صیغے ہیں۔ ان کا معنی ہے ایسا سیدھا جس میں ذرا بھی کجی یا ٹیڑھا پن نہیں یا ایسا صحیح جس میں ذرا بھی غلطی کا امکان نہیں۔ قائم یا ثابت چیز۔ سیدھی چیز۔ درست کرنے والا۔ ﴿ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ﴾ (9/التوبۃ:36)''یہی ٹھیک ضابطہ ہے۔'' ﴿وَ ذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ ؕ﴾ (98/البیّنۃ:5)''یہی نہایت صحیح اور درست دین ہے۔'' اَلدِّيْنُ الْقَيِّمُ کے بارے میں امام راغبؒ نے لطیف توجیہ کی ہے، فرماتے ہیں: ''ایسا دین جو معاش و معاد اور دنیا و آخرت کو درست کرنے والا ہے۔'' گویا امام راغبؒ کے نزدیک قَيِّمٌ بمعنی مُقَوِّمٌ (باب تفعیل سے اسم الفاعل۔ درست کرنے والا) ہے۔ (بحوالہ لغات القرآن)

اَقْوَمُ افعل التفضیل کا صیغہ ہے۔ زیادہ درست رکھنے والا۔ زیادہ قائم رکھنے والا۔ بالکل سیدھا۔ ﴿وَ اَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ﴾ (2/البقرۃ:282)''اور بہت درست رکھنے والا ہے گواہی کو۔'' ﴿اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ﴾ (17/بنی اسرائیل:9)''بے شک یہ قرآن بتلاتا ہے وہ راستہ جو بالکل سیدھا ہے۔''

مَقَامٌ اسم الظرف ہے مَفْعَلٌ کے وزن پر۔ کھڑے ہونے کی جگہ۔ ٹھہرنے کی جگہ۔ ﴿وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ﴾ (2/البقرۃ:125)''اور تم لوگ بنالو ابراہیمؑ کے کھڑے ہونے کی جگہ میں سے نماز کی جگہ۔'' یہ بطور مصدر بھی استعمال ہوتا ہے۔ ﴿اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَّقَامِيْ وَ تَذْكِيْرِيْ﴾ (10/یونس:71)''اگر تم لوگوں پر بھاری ہے میرا کھڑا ہونا اور میری نصیحت۔''

قِيَمٌ (۱) صفت ہے۔ یا (۲) قِيَامٌ کا مخفف ہے۔ مطلب ہے درست، صحیح، دنیا اور آخرت کو درست کرنے والا۔ ﴿دِيْنًا قِيَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۚ﴾ (6/الانعام:161)''دین صحیح ملت ابراہیم کی جو ایک ہی طرف کا تھا۔''

قَوَامٌ اسم ہے۔ اسراف اور بخل کے درمیان حد اوسط، معتدل، میانہ، متوسط۔﴿ وَ الَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَ لَمْ يَقْتُرُوْا وَ كَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ﴾(25/الفرقان:67)''جو خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں نہ بخل، بلکہ اُن کا خرچ دونوں انتہاؤں کے درمیان اعتدال پر قائم رہتا ہے۔''

قَوْمٌ کسی جگہ یا کسی صفت پر قائم رہنے والے افراد کا گروہ۔﴿ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴾(2/البقرۃ:118)''ہم واضح کر چکے ہیں نشانیوں کو یقین رکھنے والے گروہ کیلئے۔''

(افعال) **اِقَامَةً، اِقَامًا** کھڑا کرنا۔ سیدھا کرنا۔ کسی چیز کو قائم ودائم رکھنا۔﴿ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ ﴾(5/المآئدۃ:55)''جو لوگ نماز کو قائم رکھتے ہیں۔''﴿ وَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَ اِقَامَ الصَّلٰوةِ وَ اِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ ﴾(21/الانبیاء:73)''اور ہم نے ان کی طرف نیک کاموں کے کرنے اور نمازوں کے قائم رکھنے اور زکوٰۃ دینے کی وحی (تلقین) کی۔''(ترجمہ احسن البیان)۔اِقَامٌ بھی دراصل باب افعال کا مصدر اِقَامَةٌ ہے۔تخفیف کے لیے'ت' کو آخر سے حذف کر دیا۔

مُقِيْمٌ ج: مُقِيْمُوْنَ- اسم الفاعل ہے۔ قائم رکھنے والا۔﴿ وَ الْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ ﴾(4/النساء:162)''اور نماز کو قائم رکھنے والے۔''

مُقَامٌ، مُقَامَةٌ اسم المفعول جو بطور اسم الظرف بھی استعمال ہوتا ہے۔ کھڑا کیا ہوا۔ کھڑے کئے جانے کی جگہ۔ ٹھہرائے جانے کی جگہ۔﴿ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا ﴾(33/الاحزاب:13)''تمہیں ٹھہرائے جانے کی کوئی جگہ نہیں ہے پس واپس چلو۔''﴿ الَّذِيْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ ﴾(35/فاطر:35)''جس نے ہمیں اپنے فضل سے ابدی قیام کی جگہ ٹھہرا دیا۔''

اَقِمْ ج: اَقِيْمُوْا۔ فعل امر ہے۔ تو قائم و دائم رکھ۔ تو سیدھا رکھ۔﴿ وَاَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ﴾(10/یونس:105)''اور (مجھے حکم دیا گیا ہے کہ) تو اپنا رخ سیدھا رکھ اِس دین کی طرف ہر کجی سے بچتے ہوئے۔''﴿ وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ ارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴾(2/البقرۃ:43)''اور قائم کرو/قائم رکھو نماز اور ادا کرو زکوٰۃ اور رکوع کرو رکوع کرنے والوں کے ساتھ۔''

(تفعیل) **تَقْوِيْمًا** کسی چیز کی بنیاد کو درست کرنا، ٹھیک کرنا، اعتدال پیدا کرنا (تعدیل کرنا)۔﴿ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ﴾(95/التین:4)''یقیناً ہم نے پیدا کیا انسان کو سب سے اچھے تناسب و تعدیل میں۔''

(استفعال) **اِسْتِقَامَةً** اس طرح سیدھا کھڑا ہونا کہ کوئی کجی یا کسی طرف جھکاؤ نہ ہو۔ سیدھا ہونا۔ ڈٹ جانا۔ قائم رہنا۔ سیدھا چلنا۔ دین پر ڈٹ جانا اور استقامت اختیار کرنا کے معنی حضرت عمر فاروقؓ نے اِن الفاظ میں بیان کیے ہیں:''اَلْاِسْتِقَامَةُ اَنْ تَسْتَقِيْمَ عَلَى الْاَمْرِ وَالنَّهْيِ وَاَلَّا تَرُوْغَ رَوْغَانَ الثَّعَالِبِ استقامت یہ ہے کہ تم اللہ کے تمام احکام، اوامر اور نواہی پر سیدھے جمے رہو اور یہ کہ اُس سے اِدھر اُدھر راہِ فرار لومڑیوں کی طرح نہ نکالو۔''(بحوالہ معارف القرآن)

مُسْتَقِيْمٌ اسم الفاعل ہے۔ ہر کجی اور جھکاؤ سے پاک ہو کر سیدھا ہونے والا۔ بطور صفت بھی استعمال ہوتا ہے۔ یعنی ہر کجی اور جھکاؤ سے پاک یعنی سیدھا۔

اِسْتَقِمْ ج: اِسْتَقِيْمُوْا۔ فعل امر ہے۔ تو قائم رہ۔ تو ثابت قدم رہ۔﴿ وَ اسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ﴾(42/الشوریٰ:15)''تو قائم رہ جیسا کہ فرما دیا ہے تجھ کو۔''(ترجمہ شیخ الہندؒ)۔﴿ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ ﴾(9/التوبۃ:7)''سو جب تک وہ قائم رہیں تمہارے لیے (معاہدہ پر) تم بھی قائم رہو اُن کے لیے۔''

ترکیب اِهْدِ ثلاثی مجرد سے فعل امر ہے۔ اِهْدِ کے دو مفعول ہوتے ہیں کس کو ہدایت دی اور کیا ہدایت دی، یہاں 'نا' ضمیر مفعولی، مفعول اول ہے اور

مفعول ثانی مرکب توصیفی الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ہے۔

ترجمہ	اِهْدِ	نَا	الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝
	تو ہدایت دے	ہم کو	سیدھے راستے کی

نوٹ۔1 اِهْدِ یہاں پر ہدایت کے جامع مفہوم میں ہے۔یعنی تو سیدھا راستہ ہمیں سمجھا دے۔اس پر چلنے کی توفیق عطا فرما اور اس پر چلا کر ہمیں منزل تک پہنچا دے۔علماء کرام اور بزرگان دین جب نماز میں یہ آیت پڑھتے ہیں تو ان کی دعا دراصل توفیق اور منزل تک پہنچنے کے لئے ہوتی ہے۔تفصیل کے لئے معارف القرآن دیکھیں۔

آیت: 6
﴿صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۝﴾

اَلَّذِيْنَ اَلَّذِيْ واحد اور اَلَّذِيْنَ جمع ہے۔یہ دونوں مبنی ہیں۔لیکن اس کا تثنیہ قاعدہ کے مطابق اَللَّذَانِ اور اَللَّذَيْنِ آتا ہے۔یہ بھی نوٹ کرلیں کہ اَلَّذِيْ اور اَلَّذِيْنَ ایک لام کے ساتھ لکھا جاتا ہے جبکہ اس کا تثنیہ عموماً دو لام کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔البتہ قرآن مجید کے املا پر غور کرنا ضروری ہے۔اس لئے کہ سورۃ النساء کی آیت نمبر 16 میں اَلَّذَانِ ایک لام کے ساتھ لکھا ہوا ہے۔

ن ع م

(ف۔ن) **نَعْمَةً** خوشحال ہونا۔نعمت پانا۔

(س) **نُعُوْمَةً،نَعَمًا** سرسبز ہونا۔تروتازہ ہونا۔

نَعْمَةٌ اور **نِعْمَةٌ** اسم ذات ہے۔نعمت، آرام، آسائش، اچھی حالت۔﴿وَ ذَرْنِيْ وَالْمُكَذِّبِيْنَ اُولِي النَّعْمَةِ﴾(73/المزمل:11)''اور تو چھوڑ دے مجھ کو اور جھٹلانے والوں کو جو نعمت والے ہیں۔''﴿وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ﴾(2/البقرہ:231)''اور تم لوگ یاد کرو اللہ کی نعمت کو۔''

نَعْمَآءُ ج: اَنْعُمٌ اور نِعَمٌ۔آرام۔آسودگی۔اچھی حالت۔اس کا اُلٹ ضَرَّآءُ ہے۔﴿وَ لَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ﴾(11/ہود:10)''اور اگر ہم چکھائیں اس کو آرام، تکلیف کے بعد۔''﴿فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ﴾(16/النحل:112)''تو اس نے ناشکری کی اللہ کی (دی ہوئی) نعمتوں کی۔''﴿وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّ بَاطِنَةً﴾(31/لقمان:20)''اور پوری کر دیں تم پر اپنی نعمتیں کھلی اور چھپی۔''

نَعِيْمٌ فَعِيْلٌ کا وزن ہے مطلب ہے نِعْمَةٌ كَثِيْرَةٌ۔ہمیشہ خوش حال۔ہمیشہ تروتازہ۔آرام۔راحت۔﴿اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ۝﴾(82/الانفطار:13)''بیشک نیکوکار ہمیشہ کی خوشحالی میں ہوں گے۔''﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتُ النَّعِيْمِ ۝﴾(31/لقمان:8)''بیشک جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال کئے ان کے لئے نعمتوں والے باغات ہیں۔''

نَاعِمٌ اسم الفاعل ہے۔خوش حال ہونے والا۔تروتازہ۔ہشاش بشاش۔﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ ۝﴾(88/الغاشیہ:8)''کچھ چہرے اس دن تروتازہ ہوں گے۔''

نَعَمٌ ج: اَنْعَامٌ۔مویشی۔چوپائے (یہ اللہ کی نعمت ہیں)۔﴿فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ﴾(5/المآئدہ:95)''تو بدلہ ہے ویسا ہی جو اس نے قتل کیا مویشی میں سے۔''چوپاؤں میں سے انعام یعنی مویشی ایسے جانوروں کو کہتے ہیں جن کے پیر

کے سُم (چوپائے کا کُھر) چرے ہوتے ہیں اور وہ کُچلیاں (کُچلی کی جمع۔نوک دار دانت) اور پنجے نہیں رکھتے اور نہ ہی انسان پر حملہ کرتے ہیں۔حیوانی غذا کی بجائے نباتاتی غذا کھاتے ہیں اور جگالی کرتے ہیں۔اصل میں نَعَمٌ کا لفظ خاص اونٹوں کے لیے بولا جاتا ہے اِس لیے کہ وہ عربوں کے لیے سب سے بڑی نعمت تھے۔اِس کی جمع انعام آتی ہے لیکن انعام میں باقی جانور مثلاً بھیڑ، بکری، گائے، بھینس، نیل گائے وغیرہ بھی شامل ہیں۔مگر ان جانوروں پر انعام کا لفظ اس وقت بولا جاتا ہے جب اِس میں اونٹ بھی شامل ہو وگرنہ نہیں۔گھوڑے، گدھے، شیر، وغیرہ انعام نہیں ہیں۔شائد یہی وجہ ہے کہ سورۂ آل عمران کی آیت نمبر 14 میں گھوڑوں کو انعام میں شامل نہیں کیا گیا اور ان کا ذکر الگ کیا گیا ہے۔﴿ زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ﴾ (3/آل عمران:14)

نِعْمَ و نِعِمَّا مدح یعنی تعریف کے الفاظ ہیں۔کیسا اچھا۔کتنا عمدہ۔﴿ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ ؕ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَ نِعْمَ النَّصِيْرُ ۝۴۰ ﴾ (8/الانفال:40) ''پس تم لوگ جان لو کہ اللہ تمہارا حمایتی ہے تو کیسا اچھا حمایتی اور کیسا اچھا مددگار ہے۔''
﴿ اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ ﴾ (2/البقرۃ:271) ''اگر تم لوگ علانیہ صدقہ دو تو کیسا اچھا ہے یہ۔''

نَعَمْ ہاں۔﴿ قُلْ نَعَمْ وَ اَنْتُمْ دَاخِرُوْنَ ۝۱۸ ۚ ﴾ (37/الصافات:18) ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم کہیے ہاں اور تم لوگ ذلیل ہو گے۔''

(افعال) **اِنْعَامًا** خوش حال کرنا۔نعمت دینا۔اس کے ساتھ علٰی کا صلہ آتا ہے۔﴿ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ﴾ (1/الفاتحہ:6) ''تو نے نعمت دی جن کو''، اِنعام کے معنی ہیں وہ کیفیت جسے انسان لذیذ پاتا ہے پھر اس کا استعمال ان اشیاء پر ہونے لگا جو اس لذت کا سبب بنتی ہیں۔اس لفظ کا استعمال صرف انسانوں کے لیے ہوتا ہے غیر انسان کے لیے نہیں۔مثلاً عربی میں یوں نہیں کہتے اَنْعَمَ عَلٰی فَرَسِهٖ اُس نے اپنے گھوڑے پر انعام کیا اور نہ ہی یہ لفظ اپنی ذات کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

(تفعیل) **تَنْعِيْمًا** کسی کو نعمت سے نوازنا۔﴿ فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَ نَعَّمَهٗ ۙ﴾ (89/الفجر:15) ''مگر انسان کا حال یہ ہے کہ اس کا رب جب اس کو آزمائش میں ڈالتا ہے اور اسے عزّت اور نعمت دیتا ہے۔''

ترکیب صِرَاطَ الَّذِيْنَ میں صِرَاطَ مضاف ہے اور الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کا ''بدل کل'' ہونے کی وجہ سے نصب میں ہے۔اَلَّذِيْنَ اسم موصولہ ہے، آگے جملہ فعلیہ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ اس کا صلہ ہے اور صلہ موصولہ مل کر صِرَاطَ کا مضاف الیہ ہے۔اِس لیے حالت جر میں ہے۔اِس بات کو نوٹ کر لیں اگلی آیت میں اِس کی ضرورت پڑے گی۔

ترجمہ

صِرَاطَ الَّذِيْنَ	اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ
ان لوگوں کا راستہ	جن پر تو نے انعام کیا

نوٹ: سورۃ النساء کی آیت نمبر 69 میں اللہ تعالیٰ نے اپنے انعام یافتہ افراد کی فہرست دے دی ہے اور یہ انبیاء کرام، صدیقین، شہداء کرام اور صالحین پر مشتمل ہے۔

آیت نمبر:7

﴿ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝۷ ع ﴾

غَيْرُ مختلف چیز، علاوہ چیز۔قرآن مجید میں غَيْرُ کا استعمال چار طور پر ہوا ہے (ا) صرف نفی کے لیے جیسے ﴿ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ؕ﴾ (28/القصص:50) ''یعنی اللہ کی طرف سے ہدایت نہ ہونے کی صورت میں۔'' ﴿ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ ۝۱۸ ﴾ (43/الزخرف:18) ''اور جو جھگڑے میں

اپنی بات واضح نہ کر سکیں۔'' (۲) لفظ اِلّا کی طرح صرف استثناء کے لیے۔ اس صورت میں یہ نکرہ کی صفت بن سکتا ہے۔ جیسے ﴿مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ﴾ (28/القصص:38) ''میں تو نہیں جانتا کہ تمہارے لیے میرے سوا کوئی اور معبود بھی ہے۔'' ﴿هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ﴾ (35/فاطر:3) ''کیا اللہ کے سوا کوئی اور بھی خالق ہے۔'' ﴿فَمَا تَزِيْدُوْنَنِيْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ﴾ (11/ھود:63) ''سو تم کچھ نہیں بڑھاتے میرا سوائے نقصان کے۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ) ﴿وَمَا زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتْبِيْبٍ﴾ (11/ھود:101) ''اور نہیں بڑھایا اُن کے حق میں سوائے ہلاک کرنے کے۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ) (۳) اصل چیز کو باقی رکھتے ہوئے صرف ظاہری شکل وصورت کی نفی کے لیے جیسے ﴿كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا﴾ (4/النساء:56) ''جب کبھی پک جائیں گی ان کی کھالیں تو بدل کردے دیں گے ہم اُنہیں کھالیں دوسری۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن) (۴) کسی چیز کی مکمل نفی کرکے دوسری چیز کو اس جگہ قائم کرنے کے لیے جیسے ﴿وَيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ﴾ (9/التوبۃ:39) ''تمہاری جگہ اللہ دوسری قوم کو لے آئے گا۔'' ﴿ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ﴾ (10/یونس:15) ''لے آئیے کوئی دوسرا قرآن اس کے علاوہ۔'' غَیْرُ کے بعد مستثنیٰ مجرور ہوتا ہے اور جب فقرے میں غیر کی تکرار کا مقصود ہو تو اس 'غَیْرُ' کی بجائے 'لَا' استعمال ہوتا ہے۔ اس کے بعد بھی مستثنیٰ مجرور ہوتا ہے۔ جیسے آیت زیر مطالعہ اور ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ﴾ (31/لقمان:20) ''انسانوں میں سے کچھ لوگ ہیں جو اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں بغیر اس کے کہ ان کے پاس کوئی علم ہو، یا ہدایت، یا کوئی روشنی دکھانے والی کتاب۔''

غ ض ب

(س) **غَضَبًا** انتقام کے لیے دل میں خون کا جوش مارنا۔ غضبناک ہونا۔ غصہ میں ہونا۔ نبی اکرم ﷺ نے غَضَبٌ کی تعریف یوں فرمائی ہے: ((اِتَّقُوْا مِنَ الْغَضَبِ فَاِنَّهٗ جَمْرَةٌ تُوْقَدُ فِيْ قَلْبِ ابْنِ اٰدَمَ اَلَمْ تَرَوْا اِلٰى انْتِفَاخِ اَوْدَاجِهٖ وَحُمْرَةِ عَيْنَيْهِ)) ''غضب سے بچو کہ وہ آگ کی چنگاری ہے جو ابن آدم کے دل میں جلتی ہے۔ تم دیکھتے نہیں کہ ایسے شخص کی رگیں پھول جاتی ہیں اور آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں۔'' (بحوالہ مترادفات القرآن، ص ۶۵۲، ذرا سے لفظی فرق کے ساتھ یہ حدیث مظاہر حق جدید، شرح مشکوٰۃ شریف، ج ۴، ص ۶۱۵ پر بھی ہے)۔ غضب الٰہی سے مراد عذاب اور سزا ہے۔ یہ فعل لازم ہے۔ علیٰ کے صلے کے ساتھ متعدی ہو جاتا ہے۔

غَضْبَانُ فَعْلَانُ کے وزن پر مبالغہ ہے۔ بہت زیادہ غضبناک۔ ﴿وَلَمَّا رَجَعَ مُوْسٰٓى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا﴾ (7/الاعراف:150) ''اور جب واپس ہوئے موسیٰؑ اپنی قوم کی طرف، بہت غضبناک حالت میں اور افسوس کرتے ہوئے۔''

مَغْضُوْبٌ عَلٰى لازم افعال کا مفعول اور مجہول نہیں آتا لیکن صلے کے استعمال سے مفعول اور مجہول بن جاتا ہے۔ اسی طرح غ ض ب فعل لازم ہے۔ اِس کو متعدی بنانے کے لیے علیٰ کا صلہ استعمال ہوتا ہے۔ مَغْضُوْبٌ عَلٰى اسم المفعول ہے۔ مطلب ہے جس پر غضب کیا گیا۔ جب مفعول آئے تو مفعول کی جمع نہیں بنائی جاتی بلکہ علیٰ کے بعد واحد، تثنیہ یا جمع کا ذکر کیا جاتا ہے۔ مَغْضُوْبٌ واحد ہی رہتا ہے۔ چنانچہ جس پر غضب کیا گیا اگر وہ واحد مذکر ہو تو مَغْضُوْبٌ عَلَيْهِ کہیں گے۔ واحد مؤنث ہو تو مَغْضُوْبٌ عَلَيْهَا کہیں گے۔ علیٰ ہذا القیاس۔

(مفاعلہ) **مُغَاضَبَةً** کسی پر ناراض ہونا۔

مُغَاضِبٌ اسم الفاعل ہے۔ کسی پر ناراض ہونے والا۔ ﴿وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا﴾ (21/الانبیاء:87) ''اور مچھلی والے کو جب چلا گیا غصہ ہو کر۔''

ض ل ل

(ض) **ضَلَالًا وَضَلَالَةً** بنیادی مفہوم ہے سیدھی راہ سے ہٹ جانا۔ یہ ہدایت کے مقابلے میں استعمال ہوتا ہے۔ راستے سے روگردانی دانستہ ہو یا بھول کر ہو، تھوڑی ہو یا زیادہ، اس کو ضلال کہتے ہیں۔ ضلال کا اطلاق مندرجہ ذیل معانی پر ہوتا ہے:

(۱) گمراہ ہونا۔ راہِ حق سے بھٹک کر باطل کی طرف جانا۔ مثلاً: ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ﴾ (1/الفاتحہ:7) ''جن پر غضب نہیں کیا گیا اور جو گمراہ ہونے والے نہیں۔''

(۲) راستہ کی تلاش میں ہونا۔حیران و پریشان ہونا۔مثلاً:﴿ وَ وَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ﴾(93/الضحیٰ:7)''اور آپ کو بے خبر پایا سو راستہ بتا دیا۔''(ترجمہ ماجدیؒ) اِس آیت کی وضاحت کرتے ہوئے حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ فرماتے ہیں:''ضال کے معنی حیران و سرگرداں کے ہیں۔محمد رسول اللہ ﷺ دولت رسالت سے تو بعد کو مشرف ہوئے ہیں۔اپنی قوم کی اصلاح کی فکر اور تڑپ آپ ﷺ کو بہت قبل سے تھی، اور اسی دھن میں آپ ﷺ برابر لگے رہتے تھے۔ یہاں تک کہ حق تعالیٰ نے وحی کی راہ آپ ﷺ پر کھول دی۔اور سارے حقائق دین آپ ﷺ پر منکشف کر دیئے۔ سو ضال آپ ﷺ کو آپ ﷺ کی زندگی کے دور قبل نبوت کے اعتبار سے فرمایا، جب آپ ﷺ راہِ فلاح و اصلاح کے لیے بے چین تھے۔''(تفسیر ماجدیؒ،ص ۱۱۷۶)

(۳) ناواقف ہونا۔جب کوئی شخص کسی شے کی حقیقت سے ناواقف ہو تو عرب کہتے ہیں ضَلَّ عَنْهُ۔اسی معنی میں یہ آیت ہے:﴿ وَ اِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴾(2/البقرۃ:198)''اور اِس سے قبل تم یقیناً محض ناواقفوں میں تھے۔''(ترجمہ ماجدیؒ) آیت کی تشریح کرتے ہوئے مولانا عبدالماجد دریابادیؒ فرماتے ہیں:''ضالّ ہمیشہ گمراہی کے معنی میں نہیں آتا، ناواقف کے معنی میں بھی آتا ہے۔اور ضلال سے مراد احکام الٰہی سے ناواقفیت ہوسکتی ہے اور یہاں یہی مراد ہے۔''(تفسیر ماجدیؒ،ص ۱۰۴)

(۴) گم ہونا۔ضائع ہونا۔نیست ہونا۔چنانچہ عربی محاورے میں کہتے ہیں ضَلَّ الْمَآءُ فِي اللَّبَنِ۔پانی دودھ میں گم ہو گیا۔قرآن مجید میں ہے۔﴿ وَ قَالُوْٓا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ﴾(32/السجدۃ:10)''اور کہتے ہیں کہ بھلا جب ہم زمین میں نیست و نابود ہو گئے تو کیا کہیں پھر ہم نئے جنم میں آئیں گے۔''(ترجمہ ماجدیؒ)

(۵) محبت کے معنی میں۔جیسے فرمایا:﴿ قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِيْ ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ ﴾(12/یوسف:95)''گھر والوں نے کہا بخدا (باباجی) آپؑ اپنی اس پرانی محبت میں مبتلا ہیں۔''(ترجمہ ضیاء القرآن)۔اس آیت کے تحت صاحبؒ احسن البیان فرماتے ہیں:''ضَلَالٌ سے مراد، والہانہ محبت کی وہ وارفتگی ہے جو حضرت یعقوبؑ کو اپنے بیٹے یوسفؑ کے ساتھ تھی۔بیٹے کہنے لگے، ابھی تک آپ اسی پرانی غلطی یعنی یوسفؑ کی محبت میں گرفتار ہیں۔اتنا طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود یوسفؑ کی محبت دل سے نہیں گئی۔''امام راغبؒ مفردات القرآن میں لکھتے ہیں:''تو ان آیات (یوسف آیت 8 اور 95) میں ضلال سے مراد یہ ہے کہ وہ یوسف علیہ السلام کی محبت میں اور ان کے اشتیاق میں سرگرداں ہیں اسی طرح آیت کریمہ (یوسف آیت 30) میں بھی ضلال مبین سے والہانہ محبت مراد ہے۔''﴿ وَ وَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ﴾(93/الضحیٰ:7)''اور آپ کو اپنی محبت میں خود رفتہ پایا تو منزل مقصود تک پہنچا دیا۔''(ترجمہ ضیاء القرآن)۔حضرت پیر کرم شاہ صاحبؒ نے اس آیت میں ضَآلًّا کے بارے میں 6 قول نقل کیے ہیں۔اِن میں سے چھٹا قول امام رازیؒ کا ہے چنانچہ لکھتے ہیں:''امام رازیؒ کہتے ہیں کہ الضلال بمعنی المحبت کما فی قولہ تعالیٰ انك فی ضلالك القدیم۔یعنی یہاں ضلال سے مراد محبت ہے جس طرح سورہ یوسف کی اس آیت میں ہے۔''

(۶) غلطی کے معنی میں۔ضلال کا لفظ نادانی، خطا یا نادانستگی کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔﴿ قَالَ فَعَلْتُهَآ اِذًا وَّ اَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴾(26/الشعراء:20)''(موسیٰؑ نے) کہا واقعی میں وہ حرکت کر بیٹھا تھا اور مجھ سے نادانستہ غلطی ہو گئی تھی۔''(ترجمہ ماجدیؒ)۔اس آیت کے حاشیے میں مولانا عبدالماجد دریابادیؒ فرماتے ہیں:''ضال کے معنی ہی ہیں انجان کوئی حرکت کر بیٹھنے والا۔ضلال کا لفظ ارادی و غیر ارادی، بڑی اور چھوٹی ہر غلطی کے لیے عام ہے۔اور اسی لیے اس کا اطلاق ضلال انبیاء و ضلال کفار دونوں پر ہوتا ہے۔حالانکہ اس ضلال اور اُس ضلال کے درمیان زمین و آسمان کا

فرق ہے۔'' (تفسیر ماجدیؒ، ص ۷۶۳)

(۷) غفلت یا غافل ہونا کے معنی میں۔ جیسے فرمایا: ﴿ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى ﴾ (20/ طٰہٰ: 52)

''میرا رب نہ غافل ہوتا ہے نہ بھولتا ہے۔''

(۸) بھول جانے کے معنی میں۔ جیسے فرمایا: ﴿ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا ﴾ (2/ البقرۃ: 282) ''اور اگر اُن میں سے ایک بھول جائے گی۔'' مفردات القرآن کے مطابق یہاں تَضِلَّ کے معنی بھول جانے کے ہیں۔ اور یہی وہ نسیان ہے جسے عفو قرار دیا گیا ہے۔

(۹) اس درخت کو بھی عربی میں ضلالۃ کہتے ہیں جو صحرا میں اکیلا کھڑا ہو اور آس پاس کوئی دوسرا درخت نہ ہو۔

(۱۰) ضائع ہونے کے لیے بھی ضلال کا لفظ بولا جاتا ہے۔ مثلاً کوئی چیز ناموافق اور ناسازگار حالات میں ضائع ہو رہی ہو۔

(۱۱) ہلاک ہونے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

ضَالٌّ ج: ضَآلُّوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ گمراہ ہونے والا۔ راستہ کی تلاش میں سرگرداں ہونے والا۔ ضال کے معنی ہی ہیں انجان کوئی حرکت کر بیٹھنے والا۔ ﴿ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الضَّآلُّوْنَ ﴾ (3/ آل عمران: 90) ''اور وہ لوگ ہی گمراہ ہونے والے ہیں۔'' ﴿ وَ وَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ﴾ (93/ الضحیٰ: 7) ''اور اس نے پایا آپ ﷺ کو حق کی تلاش میں سرگرداں تو ہدایت دی۔''

(افعال) اِضْلَالًا گمراہ کرنا۔ ضائع کرنا۔ ﴿ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ ﴾ (4/ النساء: 113) ''اور وہ لوگ گمراہ نہیں کرتے مگر خود اپنے آپ کو۔'' ﴿ فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ ۝ سَيَهْدِيْهِمْ ﴾ (47/ محمد: 4-5) ''(تو وہ ہرگز ضائع نہیں کرے گا) ان کے اعمال کو (بلکہ) وہ ان کو ہدایت دے گا۔''

مُضِلٌّ اسم الفاعل ہے۔ گمراہ کرنے والا۔ ﴿ وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّضِلٍّ ﴾ (39/ الزمر: 37) ''اور جس کو اللہ ہدایت دے تو اس کو گمراہ کرنے والا کوئی نہیں ہے۔''

(تفعیل) تَضْلِيْلًا ضائع کر دینا۔ برباد کر دینا۔ ناکام بنا دینا۔ ﴿ اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ ﴾ (105/ الفیل: 2) ''کیا اس نے نہیں کر دیا ان کی خفیہ تدبیر کو برباد۔''

ترکیب غَيْرِ مضاف ہے اور اس کی جر بتا رہی ہے کہ یہ اَلَّذِيْنَ کا بدل ہے یا اُس کی صفت ہے جو محلاً حالت جر میں ہے۔ اَلْمَغْضُوْبِ مضاف الیہ ہے عَلَيْهِمْ جار مجرور مل کر محلاً حالت رفع میں ہیں۔ اَلْمَغْضُوْبِ کا نائب الفاعل ہونے کی وجہ سے۔ وَ عطف کا ہے اور آگے لَا زائدہ نفی کی تاکید کے لیے ہے۔ اَلضَّآلِّيْنَ عطف ہے اَلْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ پر۔

ترجمہ

غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ	وَلَا الضَّآلِّيْنَ
جن پر غضب نہیں کیا گیا	اور جو گمراہ نہیں ہوئے

نوٹ: 1 سورۃ الفاتحہ کے مطالعہ سے دعا مانگنے کا سلیقہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے مانگنے سے پہلے اسکی حمد و ثناء کرنی چاہیے۔ متعدد احادیث میں حضور ﷺ کی تعلیم یہ ہے کہ پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کرو۔ پھر درود شریف پڑھو، اس کے بعد دعا مانگو۔

نوٹ: 2 آمین غیر عربی لفظ ہے۔ اکثریت کی رائے ہے کہ یہ عبرانی لفظ ہے جس کے معنی ہیں ''اِسْمَعْ وَاسْتَجِبْ'' یعنی یا اللہ تو ہماری دعا سن اور قبول فرما (حضرت عبداللہ بن عباسؓ)۔ یہ لفظ قرآن مجید کا حصہ نہیں۔ اس کا پڑھنا سنت سے ثابت ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ البقرہ

آیت: 1-2

﴿ الٓـمّٓ ۚ﴿۱﴾ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛۚ فِيْهِ ۛۚ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۙ﴿۲﴾ ﴾

الٓمّٓ یہ حروف مقطعات ہیں۔ یہ پڑھنے میں پوری آواز کے ساتھ ادا کیے جاتے ہیں۔ ہمارے بزرگوں نے اِن حروف پر کافی کچھ لکھا ہے جو کتب تفاسیر میں سے دیکھا جا سکتا ہے البتہ اِن حروف کے بارے میں حرف آخر یہ ہے کہ ھٰذَا سِرٌّ بَیْنَ اللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖ یہ وہ راز ہے جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے درمیان ہے۔ امام رازیؒ تفسیر کبیر میں فرماتے ہیں: اِنَّ ھٰذَا عِلْمٌ مَسْتُوْرٌ وَسِرٌّ مَحْجُوْبٌ اِسْتَأْثَرَ اللّٰہُ تَعَالٰی وَ تَبَارَكَ بِہٖ ''بے شک یہ چھپا ہوا علم ہے، اور حجاب میں راز ہے جو اللہ کے ساتھ خاص ہے۔'' حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم اور شعبیؒ، سفیان ثوریؒ، ربیع بن خثیمؒ وابوحاتمؒ وغیرہ سب کا یہی مذہب ہے۔ (قرطبی وابن کثیر، بحوالہ تفسیر ماجدیؒ)

ذٰلِكَ یہ اشارہ بعید ہے۔ اس آیت میں اس سے کیا مراد ہے وہ آگے نوٹ 1 میں دیکھیں۔

ک ت ب

(ن) **کَتْبًا اور کِتَابًا** کھال یا چمڑے کے دو ٹکڑوں کو باہم ملا کر سی دینا، جوڑ دینا۔ اسی بنیادی لغوی مفہوم سے پھر یہ لفظ مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ (۱) حروف کو باہم ملا دینا۔ یہ کام بذریعہ تقریر بھی ہوتا ہے۔ اسی لیے کلام اللہ کو اس وقت بھی کتاب کہا گیا جب قرآن مجید باقاعدہ ضبط تحریر میں نہیں آیا تھا۔﴿ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛۚ فِيْهِ ۛۚ ﴾(2/البقرۃ:2) اور یہ کام بذریعہ تحریر بھی ہوتا ہے جسے لکھنا کہتے ہیں۔﴿ وَ رُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُوْنَ ﴿۸۰﴾ ﴾(43/الزخرف:80)''اور ہمارے رسول یعنی فرشتے ان کے پاس لکھتے ہیں۔'' (۲) پختہ ارادہ کرنا۔ حتمی فیصلہ کرنا۔﴿ كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَ رُسُلِيْ ؕ ﴾(58/المجادلۃ:21)''اللہ تعالیٰ لکھ چکا ہے کہ بے شک میں اور میرے رسول ہی غالب رہیں گے۔'' (۳) لازم کرنا۔ فرض کرنا۔ ان معنوں میں علیٰ کا صلہ آتا ہے۔﴿ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۙ ﴾(6/الانعام:54)''لازم کیا تمہارے رب نے اپنے آپ پر رحمت کو۔''﴿ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ ﴾(2/البقرۃ:183)''فرض کیا گیا تم لوگوں پر روزہ۔'' (۴) جمانا، نقش کرنا، ثبت کرنا۔

کِتَابٌ ج: کُتُبٌ۔ اسم ذات بھی ہے۔ قرآن مجید میں یہ لفظ مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے مثلاً،

(۱) کتاب یا لکھی ہوئی چیز۔﴿ يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ ﴾(4/النساء:153) ''مطالبہ کرتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اہل کتاب کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اتروا دیں اُن پر کتاب آسمان سے۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)﴿ وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا وَ لَهَا كِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ ﴿۴﴾ ﴾(15/الحجر:4)''اور کوئی بستی ہم نے غارت نہیں کی مگر اُس کا وقت لکھا ہوا تھا مقرر۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)

(۲) قانون الٰہی۔﴿ وَ لَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ؕ ﴾(2/البقرۃ:235)''اور نہ ارادہ کرو نکاح کا یہاں تک کہ پہنچ جاوے عدت مقررہ اپنی انتہا کو۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)﴿ لَوْ لَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ

فِیۡمَاۤ اَخَذۡتُمۡ عَذَابٌ عَظِیۡمٌ ﴿۶۸﴾ ﴾(8/الانفال:68)''اگر اللہ ہی کا ایک قانون پہلے سے نہ ہوتا تو جو امر تم نے اختیار کیا اُس کے بارہ میں تم پر کوئی سخت سزا نازل ہوتی۔''(ترجمہ ماجدیؒ)

(۳) اللہ تعالیٰ کا وہ رجسٹر جس میں ہر چیز محفوظ ہے یعنی لوحِ محفوظ۔﴿ وَ عِنۡدَنَا کِتٰبٌ حَفِیۡظٌ ﴿۴﴾ ﴾(50/قٓ:4)''اور ہمارے پاس تو (پورا) رجسٹر (ہی) محفوظ ہے۔''(ترجمہ ماجدیؒ)۔ تفسیر عثمانیؒ میں آیت کے اس حصے کی وضاحت یوں کی گئی ہے:''یعنی یہ نہیں کہ آج سے معلوم ہے بلکہ ہمارا علم قدیم ہے حتیٰ کہ اُن میں قبل وقوع ہی سب اشیاء کے سب حالات ایک کتاب میں جو''لوحِ محفوظ'' کہلاتی ہے لکھ دیئے تھے اور اب تک ہمارے پاس وہ کتاب موجود چلی آتی ہے۔''﴿ اِنَّ ذٰلِکَ فِیۡ کِتٰبٍ ؕ ﴾(22/الحج:70)''یہ سب لکھا ہوا ہے کتاب میں۔''اس آیت میں کتاب سے مراد لوحِ محفوظ ہے (عثمانیؒ)

(۴) خط اور پیغام۔﴿ قَالَتۡ یٰۤاَیُّهَا الۡمَلَؤُا اِنِّیۡۤ اُلۡقِیَ اِلَیَّ کِتٰبٌ کَرِیۡمٌ ﴿۲۹﴾ ﴾(27/النمل:29)''(بلقیس) نے کہا اے اہلِ دربار میرے پاس ایک معزز خط ڈالا گیا ہے۔''(ترجمہ ماجدیؒ)

(۵) احکامِ الٰہی، احکام۔﴿ رَبَّنَا وَ ابۡعَثۡ فِیۡهِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ یَتۡلُوۡا عَلَیۡهِمۡ اٰیٰتِکَ وَ یُعَلِّمُهُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَةَ وَ یُزَکِّیۡهِمۡ ؕ ﴾(2/البقرۃ:129)''اے ہمارے پروردگار اِن میں ایک پیغمبر اُنہی میں سے بھیج جو اُنہیں تیری آیتیں پڑھ کر سنائے اور اُنہیں کتاب (الٰہی) اور دانائی کی تعلیم دے اور اُنہیں پاک (وصاف) کرے۔''(ترجمہ ماجدیؒ)۔ اس آیت مبارکہ میں اور البقرۃ 151، آل عمران 164، الجمعہ آیت 2 میں کتاب سے عام طور پر احکام الٰہیہ مراد لیے گئے ہیں۔ واللہ اعلم۔﴿ فِیۡهَا کُتُبٌ قَیِّمَةٌ ؕ﴿۳﴾ ﴾(98/البینۃ:3)''جن میں لکھی ہوں سچی اور درست باتیں۔''(ترجمہ ضیاء القرآن)۔ علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ آیت میں کتاب سے مراد احکام ہیں۔(بحوالہ ضیاء القرآن)

(۶) لوگوں کے اعمال نامے۔﴿ وَ یَقُوۡلُوۡنَ یٰوَیۡلَتَنَا مَالِ هٰذَا الۡکِتٰبِ لَا یُغَادِرُ صَغِیۡرَةً وَّ لَا کَبِیۡرَةً اِلَّاۤ اَحۡصٰهَا ۚ ﴾(18/الکہف:49)''اور کہہ رہے ہوں گے کہ ہائے ہماری کم بختی! یہ کیسی کتاب ہے کہ ہماری کوئی چھوٹی بڑی حرکت ایسی نہیں رہی جو اس میں درج نہ ہوگئی ہو۔''(ترجمہ تفہیم القرآن)﴿ وَ وُضِعَ الۡکِتٰبُ وَ جِایۡٓءَ بِالنَّبِیّٖنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ قُضِیَ بَیۡنَهُمۡ بِالۡحَقِّ وَ هُمۡ لَا یُظۡلَمُوۡنَ ﴿۶۹﴾ ﴾(39/الزمر:69)''کتابِ اعمال لا کر رکھ دی جائے گی، انبیاء اور تمام گواہ حاضر کر دیے جائیں گے، لوگوں کے درمیان ٹھیک ٹھیک حق کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا اُن پر کوئی ظلم نہ ہوگا۔''(ترجمہ تفہیم القرآن)

(۷) اللہ تعالیٰ کا اتارا ہوا کلام۔ اس معنی کے لحاظ سے کبھی تو کتاب کا اطلاق بطور اسم جنس تمام آسمانی کتابوں پر ہوتا ہے جیسے فرمایا﴿ هٰۤاَنۡتُمۡ اُولَآءِ تُحِبُّوۡنَهُمۡ وَ لَا یُحِبُّوۡنَکُمۡ وَ تُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡکِتٰبِ کُلِّهٖ ۚ ﴾(3/آل عمران:119)''تم ان سے محبت رکھتے ہو مگر وہ تم سے محبت نہیں رکھتے، حالانکہ تم تمام کتبِ آسمانی کو مانتے ہو۔''(ترجمہ تفہیم القرآن) یا فرمایا﴿ اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ اُوۡتُوۡا نَصِیۡبًا مِّنَ الۡکِتٰبِ یُدۡعَوۡنَ اِلٰی کِتٰبِ اللّٰهِ لِیَحۡکُمَ بَیۡنَهُمۡ ﴾(3/آل عمران:23)''کیا آپ ﷺ نے اُن لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب الٰہی سے حصہ دیا گیا تھا اُنہیں کتاب اللہ کی طرف بلایا جاتا ہے کہ وہ اُن کے درمیان فیصلہ کرے۔''اس آیت میں اَلۡکِتٰبِ اور کِتٰبِ اللّٰهِ کی وضاحت کرتے ہوئے صاحب تفسیر ماجدیؒ فرماتے ہیں:''الکتاب یہاں بطور اسم جنس استعمال ہوا ہے۔ یعنی کتاب الٰہی اپنے عمومی وکلی مفہوم میں۔ اور اسی کا ایک جزء توریت ہے۔ کِتٰبِ اللّٰهِ اسی عمومی وکلی کتاب کا دوسرا جزء قرآن ہے اور وہی یہاں مراد ہے۔'' کبھی اس کا اطلاق تورات پر ہوتا ہے جیسے فرمایا﴿ وَ اِذۡ اٰتَیۡنَا مُوۡسَی الۡکِتٰبَ ﴾(2/البقرۃ:53)''اور جب ہم نے دی موسیٰ ؑ کو کتاب۔'' کبھی اس کا اطلاق انجیل پر ہوتا ہے جیسے فرمایا﴿ قَالَ اِنِّیۡ عَبۡدُ اللّٰهِ ۟ؕ اٰتٰنِیَ الۡکِتٰبَ وَ جَعَلَنِیۡ نَبِیًّا ﴿ۙ۳۰﴾ ﴾

(19/مریم:30)''وہ بولا میں بندہ ہوں اللہ کا مجھ کو اُس نے کتاب دی ہے اور مجھ کو اُس نے نبی کیا۔'' کبھی اِس کا اطلاق مجموعہ صحائف انبیاء بنی اسرائیل پر ہوتا ہے جیسے فرمایا﴿ وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ۪ وَّ قَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ ۙ وَّ هُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ ﴾(2/البقرۃ:113)''اور یہود کہتے ہیں کہ نصاریٰ کسی بنیاد پر نہیں اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ یہود کسی بنیاد پر نہیں درآنحالیکہ وہ سب (ایک ہی) کتاب (آسمانی) پڑھتے ہیں۔''تفسیر ماجدیؒ کے مطابق آیت میں الکتاب سے مراد مجموعہ صحائف انبیاء بنی اسرائیل مراد ہے جس کو آج عہد نامہ عتیق کہتے ہیں۔کبھی اِس کا اطلاق قرآن مجید سے پہلے نازل ہونے والی تمام کتب سماویہ پر ہوتا ہے جیسے فرمایا﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ الْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَ الْكِتٰبِ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ ﴾(4/النساء:136)''اے ایمان والو! اللہ اور اُس کے رسول ﷺ اور اُس کتاب پر ایمان لاؤ جو اُس نے اپنے رسول ﷺ پر نازل کی ہے اور اُس (جنس) کتاب پر بھی جو وہ اُس سے قبل نازل کر چکا ہے۔'' اس آیت میں وَ الْكِتٰبِ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ کی وضاحت کرتے ہوئے صاحب تفسیر ماجدیؒ فرماتے ہیں:''(الْكِتٰبِ) سے مراد یہاں جنس کتاب ہے۔یعنی ان کتابوں پر ایمان لایا جائے جو قرآن سے قبل نازل ہو چکی ہیں۔''اور کبھی اِس کا اطلاق قرآن مجید پر ہوتا ہے جیسے فرمایا﴿ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛۚ فِيْهِ ۛۚ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۙ۝۲ ﴾(2/البقرۃ:2)''یہ کتاب (کہ) کوئی شبہ اِس میں نہیں، ہدایت ہے اللہ سے ڈر رکھنے والوں کے لیے۔'' قرآن مجید کی اصطلاح میں اہل کتاب سے یہود اور نصاریٰ مراد ہیں۔یہود کو تورات دی گئی اور نصاریٰ کو انجیل دی گئی۔

(۸) تحریری معاہدہ یعنی مُکَاتَبَۃٌ۔﴿ وَ الَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ ﴾(24/النور:33)''اور تمہارے مملوکوں میں سے جو مکاتبت کی درخواست کریں ان سے مکاتبت کر لو۔''(ترجمہ تفہیم القرآن)

(۹) تقدیر کا لکھا یا قسمت میں جو کچھ لکھا ہے۔﴿ اُولٰٓئِكَ يَنَالُهُمْ نَصِيْبُهُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ ؕ ﴾(7/الاعراف:37)''اُنہیں مل جائے گا اُن کا حصہ جو اُن کی قسمت میں لکھا ہے۔''(ترجمہ ضیاء القرآن)

مَکْتُوْبٌ اسم المفعول ہے۔لکھا ہوا۔یعنی وہ عبارت جو ضبط تحریر میں لائی گئی یا وہ آواز جو ریکارڈ کی گئی۔﴿ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِيْلِ ﴾(7/الاعراف:157)''وہ لوگ پائیں گے اس کو لکھا ہوا اپنے پاس تورات اور انجیل میں۔''

کَاتِبٌ اسم الفاعل ہے۔لکھنے والا۔﴿ وَ لَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ ﴾(2/البقرۃ:282)''اور انکار نہ کرے کوئی لکھنے والا کہ وہ لکھے جیسا کہ اس کو سکھایا اللہ نے۔''

اُکْتُبْ فعل امر ہے۔تو لکھ۔﴿ اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ؕ ﴾(2/البقر:282)''جب بھی تم لوگ آپس میں کوئی ادھار کا معاملہ کرو ایک مقررہ مدت کے لیے تو اسے لکھ لو۔''

(مفاعلہ) **مُکَاتَبَۃً** باہم خط و کتابت کرنا۔تحریری معاہدہ کرنا۔مکاتبت کے لفظی معنی تو ہیں''لکھا پڑھی'' مگر اصطلاح میں یہ لفظ اس معنی میں بولا جاتا ہے کہ کوئی غلام یا لونڈی اپنی آزادی کے لیے اپنے آقا کو ایک معاوضہ ادا کرنے کی پیشکش کرے۔اور جب آقا اسے قبول کر لے تو دونوں کے درمیان شرائط کی لکھا پڑھی ہو جائے(تفہیم القرآن)۔معاوضہ کو'بدلِ کتابت' اور معاہدہ کرنے والے غلام کو مُکَاتَبٌ کہتے ہیں۔معاوضہ مال کی صورت میں بھی ہو سکتا ہے اور مالک کے لیے کوئی خاص خدمت سر انجام دینے کی صورت میں بھی ہو سکتا ہے۔

کَاتِبْ فعل امر ہے۔تو خط و کتابت کر۔تو تحریری معاہدہ کر۔﴿ فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا ۖۗ ﴾(24/النور:33)''تو تم

لوگ تحریری معاہدہ کروان سے، اگر تم لوگ جانتے ہو ان میں کوئی بھلائی۔''

(افتعال) اِکْتِتَابًا گھڑ کے لکھنا۔ کسی سے لکھوانا۔﴿ وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا ﴾(25/الفرقان:5)''اور کفار نے کہا یہ تو افسانے ہیں پہلے لوگوں کے، اس شخص نے لکھوالیا ہے انہیں۔''(ترجمہ ضیاء القرآن)

د ی ب

(ض) رَیْبًا کسی کا کسی کو شک میں ڈالنا۔

رَیْبٌ شک۔شبہ(یہ مصدر ہے لیکن بطور اسم ذات بھی استعمال ہوتا ہے)۔رَیْبٌ ایسے تردّد اور وہم کو کہتے ہیں جس کی کوئی بنیاد نہ ہو اور ذرا غور کرنے سے ختم ہوجائے۔وہ شک یا گمان جس کی حقیقت بعد میں اس کے برخلاف منکشف ہوجائے۔رَیْبٌ کا استعمال جب مَنُوْنٌ (زمانہ) کے ساتھ ہو تو اس سے گردش زمانہ یا حوادث زمانہ مراد ہوتا ہے۔کیونکہ زمانہ کی گردشوں کی تعین اوقات میں شک رہتا ہے کہ خدا جانے کب گردش کا وقت آجائے، اس لیے یہ معنی مراد لیے جاتے ہیں۔انسان کی زندگی کا سب سے بڑا حادثہ یا گردش، انسان کی موت ہوتی ہے اس لیے رَيْبَ الْمَنُوْنِ سے حادثہ موت بھی مراد لی جاتی ہے۔حادثہ موت میں رَیْبٌ یعنی شک سے یہ مراد نہیں کہ موت واقع ہونے میں شک وشبہ ہے بلکہ اس لحاظ سے رَیْبٌ کہا جاتا ہے کہ موت کا وقت طے نہیں، اس لیے انسان تردّد میں رہتا ہے کہ نہ جانے کب موت کا وقت آجائے۔عربی زبان میں رَيْبَ الْمَنُوْنِ کا محاورہ اس وقت استعمال ہوتا ہے جب کوئی شخص کسی دوسرے کے برے انجام کا منتظر ہو۔﴿ اَمْ يَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ ﴾(52/الطور:30)''کیا کہتے ہیں یہ شاعر ہے ہم منتظر ہیں اُس پر گردش زمانہ کے۔''(ترجمہ شیخ الہندؒ)۔پھر رَیْبٌ کا لفظ ذہنی اضطراب، تہمت یا سوءِظن کے معنوں میں بھی آتا ہے۔واللہ اعلم۔

رِیْبَۃٌ شک۔شبہ۔﴿ لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِيْ بَنَوْا رِيْبَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ ﴾(9/التوبۃ:110)''ہمیشہ رہے گا، ان کی عمارت سے جو انہوں نے بنائی، شبہ ان کے دلوں میں''

(افعال) اِرَابَۃً کسی کا کسی کو شک میں ڈالنا، تہمت لگانا، بےقرار کرنا، بےچین کرنا، الجھن میں ڈالنا۔

مُرِیْبٌ اسم الفاعل ہے۔(۱) شک کرنے والا (جو خود بھی شک میں مبتلا ہو اُسے بھی مریب کہتے ہیں) (۲) شک میں ڈالنے والا۔(۳) بےچین کرنے والا۔﴿ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ مُّرِيْبٍ ﴾(50/ق:25)''بھلائی سے روکنے والا، حد سے بڑھنے والا، شبہ ڈالنے والا''ضیاء القرآن کے مطابق اس آیت میں مریب دونوں معنوں میں استعمال ہوا ہے یعنی شک کرنے والا بھی اور شک میں ڈالنے والا بھی۔

(افتعال) اِرْتِیَابًا شک کرنا۔شبہہ میں پڑنا۔﴿ وَلٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ ﴾(57/الحدید:14)''لیکن تم لوگوں نے خود کو فتنہ میں مبتلا کیا، گومگو میں رہے اور شبہ میں پڑے۔''

مُرْتَابٌ اسم الفاعل ہے۔شک کرنے والا۔﴿ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُّرْتَابٌ ﴾(40/المؤمن:34)''اس طرح اللہ گمراہ کرتا ہے اس کو جو ہے اسراف کرنیوالا شک کرنے والا۔''

هُدًى (ہ د ی): الفاتحہ آیت 5 دیکھیں۔

و ق ی

(ض) وِقَايَۃً، وِقَاءً کسی کو تکلیف یا نقصان سے بچانا (یہ فعل ثلاثی مجرد میں متعدی ہے)۔﴿ وَوَقٰهُمْ رَبُّهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ﴾(52/الطور:18)''اور ان کو بچایا ان کے رب نے دوزخ کے عذاب سے۔''

تَقِ یہ واحد مذکر مخاطب میں مضارع تَتَّقِیْ تھا۔ مجزوم ہونے کی وجہ سے ''ی'' گر گئی۔ ﴿وَمَنْ تَقِ السَّیِّاٰتِ یَوْمَىِٕذٍ فَقَدْ رَحِمْتَهٗ ؕ﴾ (40/المؤمن:9) ''اور جس کو تو نے بچایا برائیوں سے اس دن تو یقیناً تو نے رحمت کی اس پر۔''

قِ فعل امر ہے۔ تو بچا۔ اس کی گردان قِ۔ قِیَا۔ قُوْا۔ قِیْ۔ قِیَا۔ قِیْنَ آتی ہے۔ ﴿وَ قِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝۲۰۱﴾ (2/البقرہ:201) ''اور تو بچا ہم کو آگ کے عذاب سے۔''

وَاقٍ اسم الفاعل ہے۔ بچانے والا۔ ﴿وَمَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ۝۳۴﴾ (13/الرعد:34) ''اور نہیں ہے ان کے لئے اللہ سے کوئی بھی بچانے والا۔''

(افتعال) **اِتِّقَاءً** نقصان یا تکلیف سے بچنا۔ پرہیز کرنا۔ اصطلاحاً ہر اس چیز سے بچنا جو اللہ کی ناراضگی کا باعث ہو۔ (یہ فعل باب افتعال میں لازم ہے)۔ ﴿وَالْاٰخِرَةُ خَیْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰی ۣ﴾ (4/النساء:77) ''اور آخرت بہتر ہے اس کے لئے جو اللہ کی ناراضگی سے بچا۔'' اِتَّقٰی فُلَانٌ بِکَذَا کا مطلب ہے کسی چیز کو کسی دوسری چیز سے بچنے کے لیے ذریعہ بنانا، جس چیز کو بچنے کا ذریعہ بنایا جائے اس پر 'بِ' کا صلہ داخل ہوتا ہے، جیسے الزمر آیت 24 میں فرمایا ﴿یَّتَّقِیْ بِوَجْهِهٖ﴾ یعنی وہ سخت عذاب سے بچنے کے لیے اپنے چہرے کو ڈھال بناتا ہے۔

یَتَّقِ مضارع مجزوم ہے شرط ہونے کی وجہ سے۔ ﴿وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۝۲ۙ﴾ (65/الطلاق:2) ''اور جو بچتا ہے اللہ کی ناراضگی سے تو اللہ بناتا ہے اس کے لئے نکلنے کا راستہ۔''

اِتَّقِ فعل امر ہے۔ تو بچ۔ ﴿وَ اِذَا قِیْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ﴾ (2/البقرہ:206) ''اور جب کہا جائے اس سے کہ تو بچ اللہ کی ناراضگی سے۔''

مُتَّقُوْنَ اسم الفاعل جمع کا صیغہ ہے۔ بچنے والے۔ ﴿وَ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝۱۷۷﴾ (2/البقرہ:177) ''اور وہ لوگ ہی بچنے والے ہیں اللہ کی ناراضگی سے۔''

اَتْقٰی افعل التفضیل ہے۔ دوسروں سے یا سب سے زیادہ اللہ کی ناراضگی سے بچنے والا۔ پرہیز گار۔ ﴿وَ سَیُجَنَّبُهَا الْاَتْقَی ۝۱۷ۙ﴾ (92/اللیل:17) ''اور دور کیا جائے گا اس سے یعنی آگ سے زیادہ پرہیز گار کو۔''

اَلتَّقْوٰی پرہیز گاری۔ بچنا۔ تقویٰ۔ اِتَّقٰی سے اسم ہے۔ لغت میں تو تقویٰ کے معنی ہیں نفس کو اس چیز سے بچانا اور حفاظت میں رکھنا کہ جس سے خوف ہو (جَعْلُ النَّفْسِ فِیْ وِقَایَةٍ مِّمَّا یَخَافُ)۔ عرف شرع میں ''تقویٰ'' نفس کو ہر اس چیز سے بچانے کا نام ہے جو گناہ کی طرف لے جائے۔ (لغات القرآن ج ۲ ص ۱۷۰)۔ مولانا عبدالماجد دریا بادیؒ لکھتے ہیں ''تقویٰ الٰہی سے مراد یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے احکام کی پابندی زندگی کے ہر ہر شعبہ میں بلا استثناء رکھی جائے۔'' تقویٰ پر مزید تفصیل آگے نوٹ 3 میں دیکھیں۔ ﴿وَ تَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَ التَّقْوٰی ۠ ﴾ (5/المآئدہ:2) ''اور باہم تعاون کرو نیکی اور پرہیز گاری میں۔''

تُقَاةٌ (۱) اسم ذات ہے۔ پرہیز گاری۔ ﴿اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ﴾ (3/آل عمران:102) ''تم لوگ اللہ کی ناراضگی سے بچو جیسا کہ حق ہے اس کی ناراضگی سے بچنے کا۔'' (۲) وَقٰی یَقِیْ کا مصدر بھی استعمال ہوتا ہے۔

تَقِیٌّ صفت مشبہ کا صیغہ ہے۔ باب افتعال میں فاکلمہ کی ''و'' کو 'ت' میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ اس لئے فَعِیْلٌ کے وزن پر وَقِیٌّ کے بجائے تَقِیٌّ اسم الفاعل کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ ہمیشہ اور ہر حال میں اللہ کی ناراضگی سے بچنے والا۔ ﴿تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِیْ نُوْرِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِیًّا ۝۶۳﴾ (19/مریم:63) ''یہ وہ جنت ہے جس کا ہم وارث

بنائیں گے اپنے بندوں میں سے اس کو جو تقویٰ پر دوام کرنے والا تھا۔‘‘

لَا رَیْبَ سورۃ الفاتحہ میں آپ لفظ اَلْحَمْدُ میں لام استغراق پڑھ چکے ہیں، جو مذکورہ چیز کی تمام جنس اور ہر شکل وصورت کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے۔ اب نوٹ کریں کہ رَیْبَ کے ساتھ جو لَا ہے یہ لائے نفی جنس ہے، جو مذکورہ چیز کی تمام جنس اور شکل وصورت کی نفی کرتا ہے۔ اس کی پہچان یہ ہے کہ اپنے اسم کو نصب دیتا ہے اور اس کی تنوین کو ختم کرتا ہے اور واحد آتا ہے۔ اس لئے لَا رَیْبَ میں ہر قسم کے شک کی نفی شامل ہے۔

ترکیب آیت نمبر 2 کی ایک سے زیادہ ترکیبیں ممکن ہیں اور کی بھی گئی ہیں۔ اس کی ایک سادہ اور عام فہم ترکیب یہ ہے کہ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ مرکب اشاری اور مبتداء ہے، لَا رَیْبَ فِیْهِ، پورا جملہ اس کی خبر اوّل ہے۔ اس میں لَا، لائے نفی جنس ہے اور رَیْبَ اس کا اسم اور فِیْهِ قائم مقام خبر ہے۔ آگے هُدًى خبر ثانی ہے اور لِلْمُتَّقِیْنَ متعلق خبر ہے۔ هُدًى مصدر ہے اور یہاں بمعنی هَادٍ (ہدایت دینے والا) ہے۔ واللہ اعلم۔

لِلْمُتَّقِیْنَ ②	هُدًى	لَا رَیْبَ ۚۖ فِیْهِ ۚ	ذٰلِكَ الْكِتٰبُ	الٓمّٓ ۚ ①	ترجمہ
تقویٰ اختیار کرنے والوں کیلئے	ہدایت ہے	کوئی شک نہیں ہے اس میں	یہ کتاب	الف لام میم	البقرۃ:1-2

نوٹ۔1 ذٰلِكَ اشارہ بعید ہے۔ اس لحاظ سے ذٰلِكَ الْكِتٰبُ کا ترجمہ ’’وہ کتاب‘‘ ہونا چاہیے۔ لیکن عام طور پر اس کا ترجمہ ’’یہ کتاب‘‘ کیا جاتا ہے۔ اس کی وضاحت حضرت عبدالماجد دریابادیؒ ان الفاظ میں کرتے ہیں ’’ذٰلِكَ اسم اشارہ ہے۔ اور اشارۂ بعید کا ترجمہ اردو میں ’’وہ‘‘ سے کیا جاتا ہے۔ لیکن بُعد ہمیشہ بُعد مکان یا بُعد زمان ہی نہیں ہوتا۔ بُعد منزلت وعلوئے مرتبت بھی بُعد ہی کی قسمیں ہیں۔ اور هٰذَا کے مقابلہ میں ذٰلِكَ اسی بلندیٔ منزلت کے اظہار کے لیے آتا ہے۔‘‘ (تفسیر ماجدیؒ، ص ۶)۔ پیر کرم شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں ’’ذٰلِكَ اگرچہ عام طور پر اُس مشارٌ الیہ کے لیے استعمال ہوتا ہے جو دُور ہو لیکن ایسے مشارٌ الیہ کے لیے بھی یہ استعمال ہوتا ہے جو حساً تو نزدیک ہو لیکن اپنی شان اور رُتبہ کے اعتبار سے بہت بلند اور دسترس سے دُور ہو۔ اس لیے ترجمہ میں قربِ حسی اور بُعدِ رتبی دونوں کا لحاظ رکھتے ہوئے ترجمہ کیا گیا ہے ’’یہ ذی شان کتاب‘‘ (ضیاء القرآن، ج۱، ص ۲۹)

رُتبہ کی بلندی ظاہر کرنے کے لئے اشارہ بعید کے استعمال کی قرآن مجید میں ذٰلِكَ الْكِتٰبُ کے علاوہ اور بھی متعدد مثالیں ہیں۔ جیسے ﴿ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ؕ﴾ (2/البقرۃ:187) ﴿ تِلْكَ اٰیٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَیْكَ بِالْحَقِّ ؕ﴾ (2/البقرۃ:252) ﴿ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ﴾ (29/العنکبوت:43) لیکن سورۃ یوسف کی آیات (31-32) میں اس کا فوری تقابل سامنے آتا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے متعلق عزیز مصر کی بیوی کے رویہ کی جب شہرت ہوئی اور شہر کی خواتین نے اس پر ملامت کی، تو اس نے خواتین کو بلایا اور یوسف علیہ السلام کو ان کے سامنے کیا۔ ان کی شکل وصورت کی خوبی کی تعریف میں انہوں نے کہا یہ کوئی بشر نہیں ہے۔ لیکن چونکہ وہ یوسف علیہ السلام کے کردار کی بلندی سے واقف نہ تھیں، اس لئے ان کے قول میں اشارہ قریب استعمال ہوا۔ مَا هٰذَا بَشَرًا۔ عزیز مصر کی بیوی نے جواب میں کہا کہ یہ ہے جس کے متعلق تم مجھے ملامت کرتی ہو۔ چونکہ اسے یوسف علیہ السلام کی عظمت کا تجربہ تھا، اس لیے اس کے قول میں اشارہ بعید آیا۔ فَذٰلِكُنَّ الَّذِیْ لُمْتُنَّنِیْ فِیْهِ۔ مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں ’’لفظ ذٰلِكَ کسی دُور کی چیز کی طرف اشارے کے لیے آتا ہے اور کِتَابٌ سے مراد قرآن کریم ہے، رَیْبَ کے معنی شک وشبہ، معنی یہ ہیں کہ یہ کتاب ایسی ہے جس میں کوئی شک وشبہ نہیں، یہ موقع بظاہر اشارۂ بعید کا نہیں تھا، کیونکہ اِسی قرآن کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے جو لوگوں کے سامنے ہے، مگر اشارۂ بعید سے اس کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ سورۂ فاتحہ میں جس صراطِ مستقیم کی درخواست کی گئی تھی یہ سارا قرآن اس درخواست کا جواب بصورتِ قبولیت اور صراطِ مستقیم کی تشریح وتفصیل ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ ہم نے یہ دعا سن لی اور قرآن بھیج دیا، جو ہدایت کا آفتاب ہے، جو شخص ہدایت چاہتا ہے وہ اس کو پڑھے، سمجھے اور اس کے مقتضیٰ پر عمل کرے۔ (معارف القرآن، ج۱، ص ۱۰۷)

نوٹ۔2 قرآن کو ﴿ هُدًى لِّلنَّاسِ ﴾ (2/البقرۃ:185) کہا گیا ہے یعنی قرآن تمام انسانوں کے لئے ہدایت ہے۔ لیکن یہاں اسے هُدًى لِّلْمُتَّقِیْنَ کہا گیا ہے۔ یعنی قرآن صرف متقی لوگوں کیلئے ہدایت ہے۔ اس وجہ سے کچھ لوگوں کے ذہن میں الجھن پیدا ہوتی ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ قرآن میں بالقوہ (Potentially) ہدایت موجود ہے جو ہر شخص کیلئے ہے۔ لیکن اس سے بالفعل ہدایت صرف وہ لوگ حاصل کرتے ہیں جن کے دل میں اللہ کی

ناراضگی سے بچنے کا جذبہ ہوتا ہے۔ یہ بات ایسے ہی ہے جیسے پنجاب یونیورسٹی کے دروازے ہر شخص کیلئے کھلے ہوئے ہیں لیکن اس میں داخلہ کے لئے بی۔اے ہونا ضروری ہے۔ پھر داخلہ ملنے کے بعد بھی یہاں سے علم صرف وہ حاصل کرتا ہے جو فیس ادا کرے اور نظم کی پابندی کرے، ورنہ داخلہ ملنے کے بعد بھی محروم رہتا ہے۔(از محترم جناب لطف الرحمٰن خان صاحب)۔''قرآن حکیم کے ایک طرف ھدی للعالمین اور ھدی للناس ہونے اور دوسری طرف ھدی للمتقین یا للمومنین ہونے پر ایک عالم کی بات بہت اچھی لگی کہ پہلی تعبیر میں استحقاق بتانا مقصود ہے جبکہ دوسری تعبیر میں افادیت بتانا مقصود ہے کہ استحقاق سب کا ہے لیکن افادیت مومنین و متقین کے حق میں ظاہر ہوگی جیسے کسی گاؤں یا کالونی میں بجلی کے کھمبے لگ کر بجلی کی سپلائی ہو جانے پر اس سے فائدہ اٹھانے کا استحقاق سب کا ہے لیکن افادیت اسی کے حق میں ظاہر ہوگی جو میٹر لگوا کر کنکشن حاصل کرے گا۔(مفتی سعید صاحب)

نوٹ۔3 **تقویٰ:** تقویٰ کا لفظ ہماری دین کی بنیادی اصطلاحات میں سے ہے۔ اللہ کے نزدیک اس کی کتنی اہمیت ہے وہ مندرجہ ذیل آیت سے واضح ہوتی ہے ﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ﴾ (49/الحجرات:13)''لوگو، ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔''

تقویٰ کی تعریف: ''تقویٰ کی تعریف متعدد تعبیرات سے کی گئی، لیکن سب سے زیادہ جامع تعریف وہ ہے جو حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سوال کرنے پر فرمائی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا تھا کہ تقویٰ کیا ہے؟ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ امیر المؤمنین! کبھی آپ کا ایسے راستہ پر بھی گزر ہوا ہوگا جو کانٹوں سے پُر ہو، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا، کئی بار ہوا ہے، حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا، ایسے موقع پر آپ نے کیا کیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ دامن سمیٹ لیا اور نہایت احتیاط سے چلا، حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بس تقویٰ اسی کا نام ہے، یہ دنیا ایک خارستان ہے، گناہوں کے کانٹوں سے بھری پڑی ہے، اس لیے دنیا میں اس طرح چلنا اور زندگی گزارنا چاہیے کہ دامن گناہوں کے کانٹوں سے نہ اُلجھے، اسی کا نام تقویٰ ہے۔''(معارف القرآن، ج ۲،ص ۲۴۱)۔قرآن مجید میں جو بار بار آتا ہے اِتَّقُوا اللّٰهَ تو اس کے معنی حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ یوں بیان کرتے ہیں:''بہر حال پہلے فرمایا کہ ڈرتے رہو اللہ سے لیکن یہ ڈر ایسا نہیں جیسے آدمی سانپ بچھو یا شیر بھیڑیئے سے ڈر کر دور بھاگتا ہے۔ بلکہ اس بات سے ڈرنا کہ کہیں اس کی خوشنودی اور رحمت سے دور نہ جا پڑو۔''(تفسیر عثمانی،ص ۱۵۰)

حقِ تقویٰ کیا ہے: سورۂ آل عمران، آیت 102 میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ ﴾''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے۔''حقِ تقویٰ کی تفسیر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور ربیعؒ اور قتادہؒ اور حسن بصریؒ نے یہ فرمائی ہے جو مرفوعاً خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی منقول ہے: حَقَّ تُقٰتِهٖ هُوَ اَنْ يُّطَاعَ فَلَا يُعْصٰى وَ يُذْكَرَ فَلَا يُنْسٰى وَ يُشْكَرَ فَلَا يُكْفَرُ (بحر محیط)''حقِ تقویٰ یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت ہر کام میں کی جائے کوئی کام اطاعت کے خلاف نہ ہو اور اس کو ہمیشہ یاد رکھیں کبھی بھولیں نہیں اور اس کا شکر ہمیشہ ادا کریں کبھی ناشکری نہ کریں۔''(معارف القرآن، ج ۲،ص:۱۲۷)

تقویٰ کے درجات: ''تقویٰ کے کئی درجات ہیں، ادنیٰ درجہ کفر و شرک سے بچنا (اور ایمان لانا ہے)۔ اس معنی کے لحاظ سے ہر مسلمان کو متقی کہا جا سکتا ہے، اگرچہ گناہوں میں مبتلا ہو، اس معنی کے لیے بھی قرآن میں کئی جگہ لفظ متقین اور تقویٰ استعمال ہوا ہے۔ دوسرا درجہ جو اصل میں مطلوب ہے وہ ہے اس چیز سے بچنا جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نزدیک پسندیدہ نہیں، تقویٰ کے فضائل و برکات جو قرآن و حدیث میں آئے ہیں وہ اسی درجہ پر موعود ہیں۔ تیسرا درجہ تقویٰ کا اعلیٰ مقام ہے جو انبیاء علیہم السلام اور ان کے خاص نائبینِ اولیاء اللہ کو نصیب ہوتا ہے، کہ اپنے قلب کو ہر غیر اللہ سے بچانا اور اللہ کی یاد اور اس کی رضا جوئی سے معمور رکھنا۔(معاف القرآن، ج ۲،ص ۱۲۷)

تقویٰ کے انعامات: تقویٰ کے انعامات خود قرآن مجید نے سورۃ الطلاق کی آیت نمبر 2،3،4،5 میں بیان کر دیے ہیں۔ ﴿ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۝۲ ﴾''جو کوئی اللہ سے ڈرتے ہوئے کام کرے گا اللہ اس کے لیے مشکلات سے نکلنے کا کوئی راستہ پیدا کر دے گا۔''﴿ وَّ يَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ؕ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ؕ ﴾''اور اسے ایسے راستے سے رزق دے گا جدھر اُس کا گمان بھی نہ جاتا ہو۔ جو اللہ پر بھروسا کرے اس

کے لیے وہ کافی ہے۔'' ﴿ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ يُسْرًا ۝ ﴾ ''جو شخص اللہ سے ڈرے اس کے معاملہ میں وہ سہولت پیدا کر دیتا ہے۔'' ﴿ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُعْظِمْ لَهٗٓ اَجْرًا ۝ ﴾ ''جو اللہ سے ڈرے گا اللہ اُس کی برائیوں کو اُس سے دُور کر دے گا اور اس کو بڑا اجر دے گا۔'' اسی طرح الانفال کی آیت 29 میں فرمایا: ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّيُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ ﴾ ''اے ایمان والو! اگر تم اللہ سے ڈرتے رہو گے تو وہ تمہیں ایک فیصلہ کی چیز دے دے گا اور تم سے دور کر دے گا تمہارے گناہ اور تمہیں بخش دے گا۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)

<u>روزہ، تقویٰ کے حصول کا ذریعہ:</u> اللہ تعالیٰ سورۃ البقرۃ کی آیت 183 میں فرماتے ہیں ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ ﴾ ''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو تم پر روزے فرض کر دیے گئے جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے تاکہ تم تقویٰ اختیار کرو۔''

<u>تقویٰ سے قریب اعمال:</u> قرآن مجید میں دو کاموں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ تقویٰ سے قریب ہیں (۱) سورۃ البقرۃ کی آیت نمبر 237 میں فرمایا ﴿ وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۭ ﴾ ''اور (اے اہل حق) تمہارا (اپنے حقوق کو) معاف کر دینا (بہ نسبت وصول کرنے کے) تقویٰ سے زیادہ قریب ہے (کیونکہ معاف کرنے سے ثواب ملتا ہے، اور ثواب کا کام کرنا ظاہر ہے کہ تقویٰ کی بات ہے) (ترجمہ، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ) (۲) سورۃ المائدۃ کی آیت نمبر 8 میں فرمایا ﴿ اِعْدِلُوْا ۣ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ﴾ ''انصاف کرتے رہو (کہ) وہ تقویٰ سے بہت قریب ہے۔'' (ترجمہ، حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ)

<u>تقویٰ کی جگہ:</u> تقویٰ کی جگہ سینہ یعنی دل ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے اپنے سینے کی طرف تین دفعہ اشارہ کر کے فرمایا، اَلتَّقْوٰى هٰهُنَا یعنی پرہیزگاری اس جگہ ہے۔ (پوری حدیث مبارکہ کے لیے ملاحظہ ہو مظاہر حق جدید، شرح مشکوٰۃ شریف، ج ۴، ص ۴۹۳، حدیث نمبر ۱۳)

آیت: 3

﴿ اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ ﴾

ء م ن سب سے پہلے یہ وضاحت ضروری ہے کہ ڈکشنری المنجد کے مطابق مادہ ''ء م ن'' اگر باب سَمِعَ سے آئے تو معنی ہوتے ہیں ''مطمئن ہونا''، اور اگر باب ضَرَبَ سے آئے تو معنی ہوتے ہیں ''بھروسہ کرنا، اعتبار کرنا۔'' لیکن قرآن مجید میں یہ مادہ تینوں معانی میں باب سمع سے آیا ہے، اس لئے تینوں معانی باب سمع کے تحت دیئے گئے ہیں۔ (واللہ اعلم)

(س) اَمَنَةً۔ اَمْنًا۔ اَمْنًا۔ اَمَانًا

(1) مطمئن ہونا۔ امن میں ہونا (لازم)۔ ﴿ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ ۣ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ ﴾ (2/البقرۃ:196) ''پس جب تم امن میں ہو تو جس نے فائدہ اُٹھایا عمرہ کا حج تک تو (اس پر واجب ہے) جو میسر ہو قربانی کے جانور میں سے۔''

(2) کسی معاملہ میں کسی پر بھروسہ کرنا (متعدی)۔ ﴿ وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ ۚ ﴾ (3/آل عمران:75) ''اور اہلِ کتاب میں وہ بھی ہے کہ اگر تو بھروسہ کرے اس پر ڈھیروں (چیز یا امانت) کے بارے میں تو وہ ادا کرے گا اس کو تیری طرف۔''

(3) کسی کی بات کا اعتبار کرنا۔ ﴿ قَالَ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَيْهِ اِلَّا كَمَآ اَمِنْتُكُمْ عَلٰٓي اَخِيْهِ مِنْ قَبْلُ ۭ ﴾ (12/یوسف:64) ''اس نے یعنی یعقوبؑ نے کہا کیا میں اعتبار کروں تم لوگوں کا اس کے بارے میں سوائے اس کے کہ جیسے میں نے اعتبار کیا تم لوگوں کا اس کے بھائی کے بارے میں اس سے پہلے۔''

(4) کسی چیز سے نڈر رہنا۔ بے خوف ہونا۔ بے فکر ہونا۔ ﴿ ءَاَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَاۗءِ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمُ الْاَرْضَ ﴾ (67/الملک:16) ''کیا تم اس سے نڈر ہو گئے ہو کہ جو آسمان میں ہے وہ کہیں تم کو زمین میں دھنسا نہ دے۔''

﴿ اَفَاَمِنَ اَهۡلُ الۡقُرٰٓى اَنۡ يَّاۡتِيَهُمۡ بَاۡسُنَا بَيَاتًا وَّ هُمۡ نَآئِمُوۡنَ ﴾ (7/الاعراف:97) ''تو کیا بستیوں والے اس سے بے خوف ہو گئے ہیں کہ ہماری سختی آئے اُن پر رات کے وقت اس حال میں کہ وہ سوئے ہوں؟''

اَمَنَةً — مصدر کے علاوہ اسم بھی ہے مطلب ہے امن۔ چین۔ ﴿ ثُمَّ اَنۡزَلَ عَلَيۡكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ الۡغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغۡشٰى طَآئِفَةً مِّنۡكُمۡ ﴾ (3/آل عمران:154) ''اس غم کے بعد پھر اللہ نے تم میں سے کچھ لوگوں پر ایسی اطمینان کی سی حالت طاری کردی کہ وہ اونگھنے لگے۔''

مَاْمُوۡنٌ — اسم المفعول ہے۔ جس سے بے خوف ہوا جائے، نڈر ہوا جائے۔ ﴿ اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمۡ غَيۡرُ مَاۡمُوۡنٍ ﴾ (70/المعارج:28) ''بے شک اُن کے رب کا عذاب ایسی چیز نہیں ہے کہ جس سے کوئی بے خوف ہو۔''

اٰمِنٌ — ج: اٰمِنُوۡنَ۔ مونث: اٰمِنَةٌ۔ اسم الفاعل ہے۔ امن والا۔ پُر امن۔ ﴿ وَ اِذۡ قَالَ اِبۡرٰهٖمُ رَبِّ اجۡعَلۡ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا ﴾ (2/البقرہ:126) ''اور جب کہا ابراہیمؑ نے اے میرے رب! تو بنا دے اس کو امن والا شہر''، یعنی پُر امن شہر۔

مَاْمَنٌ — مَفۡعَلٌ کے وزن پر اسم الظرف ہے۔ امن کی جگہ۔ ﴿ ثُمَّ اَبۡلِغۡهُ مَاۡمَنَهٗ ﴾ (9/التوبۃ:6) ''پھر تم پہنچا دو اس کو، اس کے امن کی جگہ۔''

(ک) اَمَانَةً — امانت دار ہونا۔

اَمَانَةٌ — ج: اَمَانَاتٌ۔ امانت۔ ﴿ اِنَّا عَرَضۡنَا الۡاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَالۡجِبَالِ ﴾ (33/الاحزاب:72) ''بیشک ہم نے پیش کیا اس امانت کو آسمانوں پر اور زمین پر اور پہاڑوں پر۔'' ﴿ وَالَّذِيۡنَ هُمۡ لِاَمٰنٰتِهِمۡ وَعَهۡدِهِمۡ رٰعُوۡنَ ﴾ (23/المؤمنون:8) ''اور وہ لوگ جو اپنی امانتوں کی اور اپنے عہد کی حفاظت کرنے والے ہیں۔''

اَمِيۡنٌ — فَعِيۡلٌ کے وزن پر صفت ہے۔ امانتدار۔ امن والا۔ ﴿ اِنِّىۡ لَـكُمۡ رَسُوۡلٌ اَمِيۡنٌ ﴾ (26/الشعراء:107) ''بیشک میں تم لوگوں کے لئے امانتدار رسول ہوں۔''

(افعال) اِيۡمَانًا — یہ فعل لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ لازم ہو تو معنی ہوتے ہیں امن میں ہونا۔ مطمئن ہونا۔ بے خوف ہو جانا۔ ایمان لانا۔ کسی کی بات کی تصدیق کرنا (تصدیق کرنے سے اختلاف ختم ہو جاتا ہے اور امن ہو جاتا ہے) ﴿ اِنَّ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَالَّذِيۡنَ هَادُوۡا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـئِيۡنَ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمۡ اَجۡرُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ ﴾ (2/البقرۃ:62) ''یقین جانو کہ نبی عربی ﷺ کو ماننے والے ہوں یا یہودی، عیسائی ہوں یا صابی، جو بھی اللہ اور روزِ آخر پر ایمان لائے گا اور نیک عمل کرے گا، اُس کا اجر اس کے ربّ کے پاس ہے۔'' اگر متعدی ہو تو معنی ہوتے ہیں کسی کو امن دینا۔ جیسے فرمایا ﴿ الَّذِىۡۤ اَطۡعَمَهُمۡ مِّنۡ جُوۡعٍ وَّاٰمَنَهُمۡ مِّنۡ خَوۡفٍ ﴾ (106/قریش:4) ''جس نے اُن کو بھوک میں کھانے کو دیا اور اُنہیں خوف سے امن دیا۔'' اٰمَنَ يُؤۡمِنُ کے ساتھ عموماً ''لِ'' اور ''بِ'' کا صلہ بھی آتا ہے اٰمَنَ لِ کا مطلب ہے کسی بات کو تسلیم کر لینا خواہ اس میں دلی یقین شامل نہ ہو۔ جبکہ اٰمَنَ بِ کا مطلب ہے دلی یقین سے کسی کی بات کو تسلیم کرنا۔ البتہ قرآنِ مجید میں اس قاعدے کا استثناء بھی ہے۔ سورۃ العنکبوت، آیت 26 میں فرمایا: ﴿ فَاٰمَنَ لَهٗ لُوۡطٌ ﴾ پھر لوطؑ نے اُن (حضرت ابراہیمؑ) کی تصدیق کی۔ یہاں آیت کا سیاق وسباق بتا رہا ہے کہ یہاں قلبی یقین کے ساتھ حضرت لوطؑ کا حضرت ابراہیمؑ پر ایمان لانے کا ذکر ہے (واللہ اعلم)۔

اِيۡمَانٌ — اسم ذات بھی ہے۔ ایمان۔ قلبی تصدیق۔ ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوۡۤا اٰبَآءَكُمۡ وَاِخۡوَانَكُمۡ اَوۡلِيَآءَ اِنِ اسۡتَحَبُّوا الۡـكُفۡرَ عَلَى الۡاِيۡمَانِ ﴾ (9/التوبۃ:23) ''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اپنے باپوں اور بھائیوں کو بھی اپنا رفیق نہ بناؤ اگر وہ ایمان پر کفر کو ترجیح دیں۔'' یہ لفظ بھی ہمارے دین کی بنیادی اصطلاحات میں سے ہے۔ کسی چیز کی دل سے تصدیق کرنا ایمان ہے۔ ایمان کا محل قلب ہے۔ حقیقی ایمان اس وقت معتبر ہے جب زبان سے اقرار بھی ہو اور دل

سے تصدیق بھی۔ اگر دل میں تصدیق ہے لیکن زبان سے اقرار نہیں تو معتبر نہیں اسی طرح زبان سے تصدیق کا اظہار یا فرمانبرداری کا اقرار اس وقت معتبر نہیں جب تک دل میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی تصدیق نہ ہو۔ اسی لیے ایمان مجمل کی تعریف ہے۔ ''اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ کَمَا ھُوَ بِاَسْمَائِہٖ وَ صِفَاتِہٖ وَ قَبِلْتُ جَمِیْعَ اَحْکَامِہٖ اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ وَ تَصْدِیْقٌ بِالْقَلْبِ'' میں ایمان لایا اللہ پر جیسے وہ اپنے ناموں اور صفات سے ظاہر ہے اور میں نے قبول کیے اُس کے تمام احکام زبان سے اقرار کرتے ہوئے اور دل سے تصدیق کرتے ہوئے۔'' حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ ان الفاظ میں ''ایمان'' کی شرح کرتے ہیں ''لغت میں کسی کی بات کو کسی کے اعتماد پر یقینی طور سے مان لینے کا نام ایمان ہے، اسی لیے محسوسات و مشاہدات میں کسی کے قول کی تصدیق کرنے کو ایمان نہیں کہتے، مثلاً کوئی شخص سفید کپڑے کو سفید یا سیاہ کو سیاہ کہہ رہا ہے اور دوسرا اس کی تصدیق کرتا ہے اس کو تصدیق کرنا تو کہیں گے ایمان لانا نہیں کہا جائے گا، کیونکہ اس تصدیق میں قائل کے اعتماد کو کوئی دخل نہیں بلکہ یہ تصدیق مشاہدہ کی بنا پر ہے اور اصطلاح شرع میں خبر رسول ﷺ کو بغیر مشاہدہ کے محض رسول ﷺ کے اعتماد پر یقینی طور سے مان لینے کا نام ایمان ہے۔'' پھر آگے فرماتے ہیں: ''اس تعریف میں ماننے کا نام ایمان بتلایا گیا ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ محض جاننے کو ایمان نہیں کہتے، کیونکہ جہاں تک جاننے کا تعلق ہے وہ تو ابلیس و شیطان اور بہت سے کفار کو بھی حاصل ہے کہ ان کو آنحضرت ﷺ کے صدق کا یقین تھا، مگر اس کو مانا نہیں اس لیے وہ مومن نہیں۔'' (معارف القرآن، ج ۱ص: ۱۰۹)۔ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ تفسیر عثمانی میں فرماتے ہیں: ''ایمان شرعی دو چیزوں کا نام ہے صحیح معرفت اور تسلیم وانقیاد (بات ماننا، تابعدار رہنا) یعنی خدا اور رسول ﷺ کے جملہ ارشادات کو صحیح صادق سمجھ کر تسلیم و قبول کے لیے اخلاص سے گردن جھکا دینا۔ اس تسلیمی جزء کے لحاظ سے ایمان فی الحقیقت تمام قوانین و احکام الٰہیہ کے ماننے اور جملہ حقوق ادا کرنے کا ایک مضبوط عہد و اقرار ہے۔'' (تفسیر عثمانیؒ، ص ۱۳۹)۔

<u>ایمان اور اطمینان میں فرق:</u> ایمان اور اطمینان کا فرق واضح کرتے ہوئے حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ سورۃ البقرۃ کی آیت نمبر 260 (اس آیت مبارکہ میں حضرت ابراہیمؑ اللہ تعالیٰ سے درخواست کرتے ہیں کہ اے اللہ آپ مُردوں کو کس طرح زندہ کریں گے۔ جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ کیا آپؑ کو اس پر ایمان نہیں تو حضرت ابراہیمؑ اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ ایمان تو ہے لیکن یہ درخواست اس لیے کر رہا ہوں کہ میرے دل کو اطمینان حاصل ہو جائے) کے تحت لکھتے ہیں: ''انسان کی فطرت ہے کہ جو چیز اس کے مشاہدہ میں نہ ہو اس کی کیفیات کی کھوج لگانے کی فکر میں رہا کرتا ہے، اس میں اس کا خیال مختلف راہوں پر چلتا ہے، جس میں ذہنی انتشار کی تکلیف بھی برداشت کرتا ہے، اس ذہنی انتشار کو رفع کر کے قلب کو سکون مل جانے ہی کا نام اطمینان ہے، اسی کے لیے حضرت خلیل اللہؑ نے یہ درخواست پیش فرمائی تھی۔ اسی سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ایمان اور اطمینان میں کیا فرق ہے، ایمان اس اختیاری یقین کا نام ہے جو انسان کو رسول ﷺ کے اعتماد پر کسی غیب کی بات کے متعلق حاصل ہو جائے اور اطمینان سکونِ قلب کا نام ہے۔ بعض اوقات نظروں سے غائب کسی چیز پر یقین کامل تو ہوتا ہے، مگر قلب کو سکون اس لیے نہیں ہوتا کہ اس کی کیفیات کا علم نہیں ہوتا، یہ سکون صرف مشاہدہ سے حاصل ہو سکتا ہے، حضرت خلیل اللہؑ کو بھی حیات بعد الموت پر تو کامل ایمان و یقین تھا، سوال صرف کیفیت احیاء کے متعلق تھا۔''

<u>ایمان اور یقین میں فرق:</u> حضرت مولانا امین احسن اصلاحیؒ ایمان اور یقین میں فرق واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''ایمان اور ایقان کے درمیان تھوڑا سا فرق ہے جس کو سمجھ لینا چاہیے۔ ایمان کے معنی تصدیق کرنے اور مان لینے کے ہیں۔ اس کا ضد کفر و انکار اور تکذیب ہے۔ ایقان کے معنی یقین کرنے کے ہیں۔ اس کا ضد گمان اور شک ہے جس طرح کسی شے پر یقین رکھنے کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ آدمی اس پر ایمان بھی رکھتا ہو (حضرت موسیٰ علیہ السلام

نے جو نشانیاں دکھائیں فرعون کو پورا یقین تھا کہ یہ خدا کی طرف سے ہیں لیکن اس یقین کے باوجود وہ ان پر ایمان نہیں لایا) اسی طرح کسی چیز پر ایمان رکھنے کے لیے اس پر یقین کرنا شرط نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ آدمی کا ایمان محض گمان غالب پر مبنی ہو اور وہ آہستہ آہستہ گمان کی منزل سے نکل کر یقین کی منزل تک پہنچے اور اس طرح اس کے ایمان کی تکمیل ہو جائے۔'' (تدبر قرآن، ج ا، ص ۹۳)

اٰمِنْ ج: اٰمِنُوْا۔ فعل امر ہے۔ تو ایمان لا۔ ﴿ وَيْلَكَ اٰمِنْ ۖ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ۚ ﴾ (46/الاحقاف:17) ''تیرے لئے تباہی ہے۔ تو ایمان لا۔ یقینا اللہ کا وعدہ حق ہے۔'' ﴿ وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَاۤ اٰمَنَ النَّاسُ ﴾ (2/البقرہ:13) ''اور جب کہا جاتا ہے ان سے کہ تم لوگ ایمان لاؤ جیسے لوگ (صحابہؓ) ایمان لائے۔''

مُؤْمِنٌ ج: مُؤْمِنُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ یہ لفظ جب انسان کے لیے بولا جائے تو اس کے دو معنی لیے جاتے ہیں (۱) اصطلاحی معنی یعنی ایمان لانے والا۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے کلام کی تصدیق کرنے والا مثلاً ﴿ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّ مِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ؕ ﴾ (64/التغابن:2) ''وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا، پھر تم میں سے کوئی کافر ہے اور کوئی مومن۔'' (۲) عام معنی یعنی یقین کرنے والا۔ مثلاً ﴿ وَ مَاۤ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَ لَوْ كُنَّا صٰدِقِيْنَ ﴾ (12/یوسف:17) ''اور آپ ہماری بات کا یقین نہ کریں گے چاہے ہم سچے ہی ہوں۔''

یہ لفظ جب اللہ تعالیٰ کے لیے بولا جائے تو اس کا مطلب ہوتا ہے امن دینے والا اور یہ لفظ اسمائے حسنیٰ میں سے ہے مثلاً ﴿ هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ ﴾ (59/الحشر:23) ''کوئی الٰہ نہیں سوائے اس کے جو بادشاہ ہے، پاک ہے، سلامتی ہے، امن دینے والا ہے۔''

مُؤْمِنَةٌ ج: مُؤْمِنَاتٌ۔ ایمان لانے والی۔ ﴿ وَ لَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّ لَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ ﴾ (2/البقرۃ:221) ''بے شک مسلمان لونڈی بہتر ہے (آزاد) مشرک عورت سے اگرچہ وہ پسند آئے تمہیں۔'' ﴿ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ ﴾ (9/التوبۃ:71) ''اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے مددگار ہیں۔''

(افتعال) **اِيْتِمَانًا** کسی کو امانت دار بنانا۔ کسی کو امین بنانا۔ کسی کا اعتبار کرنا۔

اُؤْتُمِنَ ماضی مجہول واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ وہ جس کو امین بنایا گیا۔ جس پر اعتبار کیا گیا۔ ﴿ فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ ﴾ (2/البقرۃ:283) ''پس چاہیے کہ ادا کرے وہ جس پر اعتبار کیا گیا اُس کی امانت کو۔''

غ ی ب

(ض) **غَيْبًا** پوشیدہ ہونا۔ غیر حاضر ہونا۔ کسی چیز کا انسان کے علم و احساس سے بالاتر ہونا۔

غَيْبٌ ج غُيُوْبٌ۔ اسم ذات ہے۔ حواس سے پوشیدہ چیز یا بات۔ لفظ غیب پورے قرآن مجید میں بصورت نکرہ کہیں نہیں آیا، مضموم بھی آیا ہے، مفتوح بھی اور مکسور بھی مگر ہر جگہ معرفہ ہے۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں: ''قرآن میں لفظ غیب سے وہ تمام چیزیں مراد ہیں جن کی خبر رسول اللہ ﷺ نے دی ہے اور ان کا علم بداہت عقل (یعنی عقل کی فوری رسائی) اور حواسِ خمسہ کے ذریعہ نہیں ہوسکتا، اس میں اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات بھی آجاتی ہیں، تقدیری امور، جنت و دوزخ کے حالات، قیامت اور اس میں پیش آنے والے واقعات بھی، فرشتے، تمام آسمانی کتابیں اور تمام انبیاء سابقینؑ بھی۔'' (معارف القرآن، ج ا، ص ۱۰۹)۔ ﴿ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴾ (5/المآئدہ:116) ''بیشک تو ہی تمام غیبوں کا خوب جاننے والا ہے۔''

غَائِبٌ ج: غَائِبُوْنَ۔ مونث: غَائِبَةٌ۔ اسم الفاعل ہے۔ غائب ہونے والا یعنی غائب۔ ﴿ وَ مَا مِنْ غَآئِبَةٍ فِي السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴾ (27/النمل:75) ''اور نہیں ہے کوئی بھی غائب ہونے والی چیز آسمانوں میں اور زمین میں مگر وہ ایک واضح کتاب میں ہے۔''

غَیَابَۃٌ — اسم ذات ہے۔ پستی۔ گہرائی۔ تاریکی۔ نشیبی زمین۔ ''ہر وہ چیز جو کسی چیز کو چھپا لے اور غائب کر دے۔ اس لیے قبر کو بھی غَیَابَۃٌ کہا جاتا ہے۔'' (معارف) ﴿ قَالَ قَآئِلٌ مِّنۡهُمۡ لَا تَقۡتُلُوۡا یُوۡسُفَ وَ اَلۡقُوۡهُ فِیۡ غَیٰبَتِ الۡجُبِّ ﴾ (12 / یوسف:10) ''کہا ان میں سے ایک کہنے والے نے قتل مت کرو یوسفؑ کو اور اس کو ڈال دو کنویں کی گہرائی میں۔''

(افتعال) اِغۡتِیَابًا — پیٹھ پیچھے کسی کا عیب بیان کرنا اس طرح کہ اگر وہ اُسے سنتا تو اُسے برا لگتا۔ غیبت کرنا۔ چغلی کرنا۔ صاحب تفہیم القرآن فرماتے ہیں: ''غیبت کی تعریف یہ ہے کہ'' آدمی کسی شخص کے پیٹھ پیچھے اس کے متعلق ایسی بات کہے جو اگر اسے معلوم ہو تو اس کو ناگوار گزرے۔'' یہ تعریف خود رسول اللہ ﷺ سے منقول ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے جسے مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور دوسرے محدثین نے نقل کیا ہے، اس میں حضور ﷺ نے غیبت کی یہ تعریف بیان فرمائی ہے: ذِکۡرُكَ اَخَاكَ بِمَا یَکۡرَہُ۔ قِیۡلَ اَفَرَاَیۡتَ اِنۡ کَانَ فِیۡ اَخِیۡ مَا اَقُوۡلُ؟ قَالَ اِنۡ کَانَ فِیۡهِ مَا تَقُوۡلُ فَقَدِ اغۡتَبۡتَهٗ وَ اِنۡ لَّمۡ یَکُنۡ فِیۡهِ مَا تَقُوۡلُ فَقَدۡ بَهَتَّهٗ۔ غیبت یہ ہے کہ ''تو اپنے بھائی کا ذکر اس طرح کرے جو اسے ناگوار ہو۔'' عرض کیا گیا کہ اگر میرے بھائی میں وہ بات پائی جاتی ہو جو میں کہہ رہا ہوں تو اس صورت میں آپ کا کیا خیال ہے؟ فرمایا اگر اس میں وہ بات پائی جاتی ہو تو، تو نے اس کی غیبت کی، اور اگر اس میں وہ موجود نہ ہو تو تو نے اس پر بہتان لگایا۔'' ایک دوسری روایت جو امام مالک نے مؤطا میں حضرت مُطّلِب بن عبداللہ سے نقل کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں: اِنَّ رَجُلًا سَئَلَ رَسُوۡلَ اللّٰهِ ﷺ مَا الۡغِیۡبَۃُ؟ فَقَالَ اَنۡ تَذۡکُرَ مِنَ الۡمَرۡءِ مَا یَکۡرَہُ اَنۡ یَّسۡمَعَ۔ قَالَ یَا رَسُوۡلَ اللّٰهِ وَ اِنۡ کَانَ حَقًّا؟ قَالَ اِذَا قُلۡتَ بَاطِلًا فَذٰلِكَ الۡبُهۡتَانُ۔ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا غیبت کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا ''یہ کہ تو کسی شخص کا ذکر اس طرح کرے کہ وہ سنے تو اسے ناگوار ہو۔'' اس نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اگر چہ میری بات حق ہو؟ آپ ﷺ نے جواب دیا اگر تیری بات باطل ہو تو یہی چیز پھر بہتان ہے۔'' ان ارشادات سے معلوم ہوا کہ کسی شخص کے خلاف اس کے پیچھے جھوٹا الزام لگانا بہتان ہے اور اس کے واقعی عیوب بیان کرنا غیبت۔ (تفہیم القرآن، ج ۵، ص ۹۰)

لَا یَغۡتَبۡ — فعل نہی ہے۔ ﴿ وَلَا یَغۡتَبۡ بَّعۡضُکُمۡ بَعۡضًا ؕ ﴾ (49 / الحجرات:12) ''تم میں سے کوئی غیبت نہ کرے کسی کی۔''

یُقِیۡمُوۡنَ (ق و م): الفاتحہ آیت 5 دیکھیں۔

ص ل و

(ن) صَلَوًا — پیٹھ کے درمیان میں مارنا۔ نرم ہونا (ثلاثی مجرد سے قرآن مجید میں استعمال نہیں ہوا)۔

(تفعیل) صَلَاۃً — (اس کا مصدر خلافِ قاعدہ صَلَاۃً استعمال ہوتا ہے) دعا کرنا۔ دعا دینا۔ تحسین و تعظیم کرنا۔ نشو و نما دینا۔ بڑھانا۔ نماز پڑھنا (نماز کی اصل دعا ہی ہے)۔ چنانچہ محاورہ ہے صَلَّیۡتُ عَلَیۡهِ میں نے اسے دعا دی، نشو و نما دی اور بڑھایا۔ اسی طرح حدیث میں آتا ہے اِذَا دُعِیَ اَحَدُکُمۡ اِلٰی طَعَامٍ فَلۡیُجِبۡ وَاِنۡ کَانَ صَائِمًا فَلۡیُصَلِّ کہ ''جب کسی کو کھانے پر بلایا جائے تو اسے چاہیے کہ قبول کرلے اور اگر روزہ دار ہے تو وہ ان کے لیے دعا کر کے واپس چلا آئے۔'' اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں کے لیے دعا (صلاۃٌ) کرنے کے معنی ہوتے ہیں ان کو نشو و نما دینا، بڑھانا، ان پر اپنی رحمت کا نزول کرنا۔ جب دعا (صلاۃٌ) کی نسبت بندوں کی طرف ہو، خواہ فرشتے ہوں یا انسان تو اس کے معنی نزول رحمت کی دعا اور استغفار یعنی دعائے مغفرت کے ہوتے ہیں۔ یعنی فرشتے اور انسان اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ جن کے حق میں ہم دعا کر رہے ہیں تو ان پر اپنا فضل فرما اور انہیں اپنی عنایات سے نواز۔ ﴿ اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِکَتَهٗ یُصَلُّوۡنَ عَلَی النَّبِیِّ ؕ ﴾ (33 / الاحزاب:56) ''اللہ اور اس کے ملائکہ نبی ﷺ پر درود بھیجتے ہیں۔'' یعنی اللہ رحمت نازل فرماتا ہے اور فرشتے نزولِ رحمت کی دعا کرتے ہیں۔

صَلٰوۃٌ اسم ذات بھی ہے۔اس لفظ کا قرآنی املا صَلٰوۃٌ ہے اور اس کی جمع صَلَوٰتٌ ہے۔نماز، شفقت و رحمت، عبادت گاہ، دعا۔ اصطلاح شرع میں وہ خاص عبادت صَلٰوۃٌ کہلاتی ہے جس کو نماز کہا جاتا ہے۔اس کی اصل بھی دعا ہی ہے، اسی لیے اسے صَلٰوۃٌ کہا جاتا ہے۔اور عربی زبان کا یہ اسلوب ہے کہ کسی چیز کے جزء ہی کو اس چیز کا نام دے دیا جاتا ہے۔اسے تَسْمِیَۃُ الشَّیْءِ بِاِسْمِ الْجُزْءِ کہتے ہیں۔ ﴿حٰفِظُوْا عَلَی الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوۃِ الْوُسْطٰی ق﴾ (2/البقرۃ:238) ''پابندی کرو سب نمازوں کی اور خصوصاً درمیانی نماز کی۔'' ﴿اُولٰٓئِكَ عَلَیْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رَحْمَةٌ قف﴾ (2/البقرۃ:157) ''یہی وہ خوش نصیب ہیں جن پر اُن کے رب کی طرح طرح کی نوازشیں اور رحمت ہے۔''

قرآن مجید میں جہاں بھی لفظ صلوٰۃ کی اضافت ضمیر بنی آدم کی طرف ہے وہاں یہ الف کے ساتھ لکھا ہوا ہے۔جو لام سے ملا ہوا ہے۔مثلاً صَلَاتُكَ، صَلَاتِیْ، صَلَاتُهُمْ وغیرہ۔البتہ دو جگہ ضمیر مخاطب کی طرف اضافت کے باوجود واؤ ہی کے ساتھ لکھا ہوا ہے جو لام سے ملا ہوا ہے۔(ا) ﴿اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ط﴾ (9/التوبۃ:103) (ب) ﴿قَالُوْا یٰشُعَیْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ﴾ (11/ھود:87)۔اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دو قرأتیں ہیں اس لیے یہاں اس لفظ کو یوں لکھا جاتا ہے۔(واللہ اعلم)۔کبھی عبادت گاہ کو بھی صَلَاۃٌ کہہ دیا جاتا ہے۔چنانچہ قرآن میں کَنَائِس یعنی یہود کی عبادت گاہوں کو صَلَوٰتٌ کہا گیا ہے۔مثلاً ﴿لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَ بِیَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ﴾ (22/الحج:40) ''تو راہبوں کے صومعے، عیسائیوں کے گرجے اور یہود کے عبادت خانے اور مسلمانوں کی مسجدیں ویران ہو چکی ہوتیں۔'' قرآن مجید میں صَلَاۃٌ کی نسبت تمام جہان کی طرف بھی کی گئی ہے۔مثلاً ﴿كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَ تَسْبِیْحَهٗ ط﴾ (24/النور:41) ''ہر ایک کو معلوم ہے اپنی اپنی دعا اور اپنی تسبیح۔'' حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اس آیت کے تحت لکھتے ہیں: ''یاد رہے کہ لفظ صلوٰۃ کچھ اصطلاحی نماز کے ساتھ مخصوص نہیں، قرآن نے ملائکہ اور بشر سے گزر کر تمام جہان کی طرف صلوٰۃ کی نسبت کی ہے (النور۔41) اور یہ بھی بتلا دیا کہ ہر چیز کی تسبیح و صلوٰۃ کا حال اللہ ہی جانتا ہے کہ کس کی صلوٰۃ و تسبیح کس رنگ کی ہے۔'' (تفسیر عثمانی ص ۴۱۰)۔حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ صلوٰۃ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''صلوٰۃ کے لفظی معنی دعا کے ہیں۔اصطلاح شریعت میں ایک مخصوص ہیئت کی معروف عبادت کا نام ہے۔اور یہ نام بھی اسی سے پڑا کہ دعا ہی اس عبادت کا جزوِ اعظم ہے۔محققین نے کہا ہے کہ نماز تو یکسر دعا ہے۔دعا زبان سے بھی، دل سے بھی، اعضائے ظاہری سے بھی۔یعنی دعا قولی، دعا قلبی، دعا فعلی کا مجموعہ۔(تفسیر ماجدی، ص ۷)

صَلِّ ج: صَلُّوْا۔فعل امر ہے۔تو دعا کر۔نماز پڑھ۔﴿فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ﴿۲﴾ ط﴾ (108/الکوثر:2) ''پس آپ ﷺ نماز پڑھیں اپنے رب کے لئے اور قربانی دیں۔'' ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْهِ﴾ (33/الاحزاب:56) ''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو تم لوگ دعا کرو ان کے لئے یعنی درود بھیجو۔''

مُصَلٍّ ج: مُصَلُّوْنَ، مُصَلِّیْنَ۔اسم الفاعل کا صیغہ ہے۔نماز پڑھنے والا۔﴿قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّیْنَ ﴿۴۳﴾ لا﴾ (74/المدثر:43) ''ان لوگوں نے کہا ہم نہیں تھے نماز ادا کرنے والوں میں سے۔''

مُصَلًّی اسم المفعول ہے جو بطور اسم الظرف استعمال ہوتا ہے۔نماز کی جگہ۔﴿وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّی ط﴾ (2/البقرۃ:125) ''اور تم لوگ بنا لو ابراہیمؑ کے کھڑے ہونے کی جگہ میں سے نماز ادا کرنے کی جگہ۔''

مِمَّا مرکب ہے۔اصل میں 'مِنْ' اور 'مَا' تھا۔مِنْ حرف جر اور مَا اسم موصولہ یا زائدہ یا مصدریہ یا استفہامیہ ہو سکتا ہے۔اگر مَا استفہامیہ ہو تو اس کے الف کو اکثر حذف کر دیا جاتا ہے اور یوں لکھا جاتا ہے مِمَّ۔یاد کر لیں کہ 'مَا' بھی کئی قسم کا ہے۔مَا پہلے دو قسموں میں تقسیم ہوتا ہے (۱) حرفیہ (۲) اسمیہ۔پھر حرفیہ کی چار قسمیں ہیں: نافیہ عاملہ، نافیہ غیر عاملہ، مصدریہ، زائدہ۔اور ما اسمیہ کی تین قسمیں ہیں: استفہامیہ، موصولہ، ظرفیہ۔مزید تفصیل کے لیے عربی کا معلم، ج ۴، ص ۵۹ دیکھیں۔

ر ز ق

(ن) رِزْقًا　معاوضہ کے بغیر کوئی چیز دینا پھر دیتے رہنا۔عطیہ جاریہ دینا۔ روزی دینا۔عطا کرنا۔﴿ اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ﴾ (30/الروم:40) ''اللہ وہ ہی ہے جس نے تم لوگوں کو پیدا کیا پھر اس نے تم لوگوں کو روزی دی، پھر وہ تم لوگوں کو موت دے گا پھر وہ تم لوگوں کو زندہ کرے گا۔''

رِزْقٌ　ج: اَرْزَاقٌ۔اسم ذات ہے۔وہ چیز جو عطیہ جاریہ کے طور پر دی جائے۔ جو چیز ایک مرتبہ دی جائے اسے رِزْقَةٌ کہتے ہیں۔ پیر کرم شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں: ''اَلرِّزْقُ فِی اللُّغَةِ النَّصِيْبُ وَالْعَطَاءُ وَ يُطْلَقُ عَلَى الْحِسِّيِ وَالْمَعْنَوِيّ۔یعنی لغت میں رزق کہتے ہیں حصہ اور بخشش کو خواہ حسی ہو یا معنوی۔ مال، اولاد، علم و معرفت اسی لحاظ سے سب رزق ہیں۔'' (ضیاء القرآن، ج ا،ص ۳۱)۔صاحبؒ تفہیم القرآن فرماتے ہیں: ''رزق عربی زبان میں محض خوارک تک محدود نہیں بلکہ عطا، نصیب اور بخشش کے معنی میں عام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ بھی انسان کو دیا ہے حتیٰ اولاد تک، اس کا رزق ہے۔مشہور دعا ہے۔ اَللّٰهُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَهٗ یہاں رزق سے مراد توفیق ہے۔'' (واللہ اعلم) (تفہیم القرآن)۔صاحبؒ تفسیر ماجدی لکھتے ہیں: ''رزق کا لفظ کلام عرب میں بڑے وسیع معنی رکھتا ہے۔اس کے اندر ہر قسم کی نعمتیں آ جاتی ہیں خواہ ظاہری و مادی ہوں، مثلاً مال، صحت و اولاد، یا معنوی و روحانی ہوں، مثلاً علم و حکمت، فہم سلیم وغیرہ۔'' (تفسیر ماجدیؒ،ص ۸)۔عربی محاورے میں بولا جاتا ہے رُزِقْتُ عِلْمًا مجھے علم دیا گیا۔امام راغبؒ نے اس لفظ کی بہت عمدہ وضاحت کی ہے۔ اب اس کا خلاصہ پیش خدمت ہے۔فرماتے ہیں: اَلرِّزْقُ۔ وہ عطیہ جو جاری ہو۔ پھر یہ مندرجہ ذیل معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

(۱) دنیوی عطاء: اس کے اندر سب نعمتیں آ جاتی ہیں خواہ ظاہری ہوں جیسے مال و دولت، صحت، اولاد وغیرہ، خواہ روحانی ہوں جیسے، علم و حکمت، فہم اور تدبر وغیرہ۔ مثلاً ﴿ وَ اَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ ﴾ (63/المنافقون:10) ''جو رزق ہم نے تمہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرو۔'' اور ﴿ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴾ (2/البقرۃ:3) ''اور جو رزق ہم نے ان کو دیا ہے، اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔'' اِن دونوں آیات میں رزق اسی وسیع اور عام معنوں میں استعمال ہوا ہے۔﴿ قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَ رَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ﴾ (11/ھود:88) ''آپؑ نے کہا اے میری قوم! بھلا یہ تو بتاؤ اگر میں روشن دلیل پر ہوں اپنے رب کی طرف سے اور اس نے عطا بھی کی ہو مجھے اپنی جناب سے عمدہ روزی۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔ یہاں رزقًا حسنًا سے مراد علم وحی ہے۔

(۲) اخروی عطاء: مثلاً ﴿ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ﴾ (3/آل عمران:169) ''وہ تو حقیقت میں زندہ ہیں، اپنے رب کے پاس رزق پا رہے ہیں۔'' اور ﴿ وَ لَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيْهَا بُكْرَةً وَّ عَشِيًّا ﴾ (19/مریم:62) ''اور انہیں اُس میں اُن کا رزق صبح و شام ملتا رہے گا۔'' ان دونوں آیات میں رزق سے انعامات اخروی مراد ہیں۔

(۳) حصہ: مثلاً ﴿ وَ تَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ ﴾ (56/الواقعۃ:82) ''اور اس نعمت میں اپنا حصہ تم نے یہ رکھا ہے کہ اسے جھٹلاتے ہو؟۔'' اس آیت میں رزق سے مراد حصہ ہے اور مطلب یہ کہ نعمت الٰہی کی تکذیب کو تم نے اپنا حصہ بنا لیا ہے۔

(۴) طعام (کھانا): مثلاً: ﴿ فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ ﴾ (18/الکھف:19) ''چاہیے کہ وہ وہاں سے تمہارے لیے کچھ کھانے کے لیے لائے۔'' آیت میں رزق سے مراد کھانا ہے جو انسانی غذا بنتا ہے۔

(۵) بارش: مثلاً: ﴿ وَفِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ ﴾ (51/الذاریات:22) ''آسمان ہی میں ہے تمہارا رزق بھی اور وہ چیز بھی جس کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے۔'' اس آیت میں عام طور پر مفسرین نے رزق سے مراد بارش لی ہے اس لیے کہ

وہ زمین سے حاصل ہونے والے رزق وغذائیات کا سبب ہے۔(واللہ اعلم)۔

اُرْزُقْ — فعل امر ہے۔تو عطا کر۔ ﴿وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ﴾ (14/ابراہیم:37)''اور تو انہیں عطا کر پھلوں میں سے شائد کہ وہ لوگ شکر ادا کریں۔''

رَازِقٌ — ج: رَازِقُوْنَ- اسم الفاعل ہے۔عطا کرنے والا۔ یہ لفظ اللہ تعالیٰ اور انسانوں دونوں کے لیے بولا جاتا ہے۔﴿وَ اِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ﴾ (22/الحج:58)''اور یقیناً اللہ ہی سب سے بہتر عطا کرنے والا ہے۔''
﴿وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِيْنَ﴾ (15/الحجر:20)''اور اس میں معیشت کے اسباب فراہم کیے،تمہارے لیے بھی اور اُن بہت سی مخلوقات کے لیے بھی جن کے رازق تم نہیں ہو۔''

رَزَّاقٌ — فَعَّالٌ کے وزن پر اسم مبالغہ ہے۔ یہ لفظ صرف اللہ تعالیٰ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔﴿اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ﴾ (51/الذّٰریٰت:58)''یقیناً اللہ ہی بہت زیادہ عطا کرنے والا ہے۔''

ن ف ق

(ن-س) نَفَقًا، نُفُوْقًا، نَفَاقًا — (۱)خرچ ہوجانا۔ختم ہوجانا۔کچھ باقی نہ رہنا۔(۲)چیزوں کا خوب لین دین ہونا۔مال بکنا۔بازار کا پررونق ہوجانا،اس معنی کے لحاظ سے یہ لفظ کَسَاد کی ضد ہے جیسے اردو میں کساد بازاری کہہ دیتے ہیں یعنی مندا۔نَفَقَ الشَّیْءُ کا مطلب ہے وہ چیز چلی گئی،ختم ہوگئی۔نَفَقَتِ الدَّرَاهِمُ کا مطلب ہے روپیہ پیسہ ختم ہوگیا۔نَفَقَتِ الدَّابَّةُ کا مطلب ہے گھوڑا مر گیا۔(قرآن مجید میں ثلاثی مجرد سے فعل استعمال نہیں ہوا)

نَفَقَةٌ — ج: نَفَقَاتٌ-اسم ذات ہے۔خرچہ۔خرچ ہونے والی چیز۔﴿وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ﴾ (2/البقرہ:270)''اور جو تم لوگ خرچ کرو کسی خرچہ میں سے یا منت مانگو کسی منت میں سے تو یقیناً اللہ اس کو جانتا ہے۔''

نَفَقٌ — سرنگ۔سرنگ کے بھی دو منہ ہوتے ہیں۔﴿فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ﴾ (6/الانعام:35)''تو اگر آپ ﷺ میں استطاعت ہے کہ آپ ﷺ تلاش کرلیں کوئی سرنگ زمین میں۔''

(افعال) اِنْفَاقًا — خرچ کرنا۔﴿لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ﴾ (57/الحدید:10)برابر نہیں ہے تم میں سے وہ جس نے خرچ کیا الفتح سے پہلے (یعنی فتح مکہ سے پہلے) اور قتال کیا۔''

اَنْفِقْ — ج: اَنْفِقُوْا-فعل امر ہے۔تو خرچ کر۔﴿وَ اَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ﴾ (63/المنافقون:10)اور تم لوگ خرچ کرو اس میں سے جو ہم نے تم کو عطا کیا اس سے پہلے کہ آئے تم میں سے کسی ایک کو موت۔''

مُنْفِقٌ — ج: مُنْفِقُوْنَ-اسم الفاعل ہے۔خرچ کرنیوالا۔﴿وَ الْمُنْفِقِيْنَ وَ الْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ﴾ (3/آل عمران:17)''اور خرچ کرنے والے اور مغفرت مانگنے والے راتوں کے پچھلے پہر میں۔''

(مفاعلہ) مُنَافَقَةً و نِفَاقًا — دورُخا ہونا۔دوغلا ہونا۔﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نَافَقُوْا يَقُوْلُوْنَ لِاِخْوَانِهِمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ (59/الحشر:11)''کیا آپ ﷺ نے دیکھا نہیں ان لوگوں کو جو دورُخے ہوئے ، وہ لوگ کہتے ہیں اپنے بھائیوں سے جنہوں نے کفر کیا۔''نَافِقَاءُ اور نُفَقَةٌ، گوہ (زمین پر رینگ کر چلنے والا ایک بڑے سائز کا جانور) کے بھٹ (کھوہ، بل) کو کہتے ہیں جس کے کم از کم دو منہ ہوتے ہیں ایک دہانے سے گوہ داخل ہوتی ہے اور شکاری اس سوراخ کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو دوسرے سوراخ سے باہر نکل جاتی ہے۔نفاق اور منافقت اصطلاح قرآنی میں اسی دورُخی کا نام ہے،بظاہر زبان سے آدمی

مؤمن ہونے کا اقرار کرتا ہے اور دکھاوے کی نمازیں بھی پڑھتا ہے لیکن دل میں کافر رہتا ہے اسلام کے خلاف عقیدہ رکھتا ہے ایسے آدمی کو عرفِ شریعت میں منافق کہا جاتا ہے لیکن اگر عقیدہ مومنانہ ہو اور عمل کافرانہ تو دورُخی کی یہ بھی ایک شکل ہوتی ہے ایک دروازہ (عقیدہ) سے آدمی اسلام کے دائرہ میں داخل ہوتا ہے اور دوسرے (عمل کے) راستہ سے خارج ہوتا ہوا نظر آتا ہے لیکن قرآنی اصطلاح میں ایسے آدمی کو منافق نہیں کہا جاتا بلکہ فاسق اور عاصی کہا جاتا ہے۔ (البتہ حدیث پاک میں ایسے شخص کو بھی منافق کا نام دیا گیا ہے یعنی ''عملی منافق'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''منافق کی تین علامتیں ہیں اس کے بعد مسلمؒ نے اپنی روایت میں اتنا اضافہ کیا'' اگرچہ وہ نماز پڑھے اور روزہ رکھے اور مسلمان ہونے کا دعویٰ بھی کرے۔ اس کے بعد بخاریؒ و مسلمؒ دونوں متفق ہیں (وہ تین علامتیں یہ ہیں) جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو اس کے خلاف کرے اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔'' (متفق علیہ، بحوالہ مظاہر حق جدید، ج ا، ص: ۱۳۴، از مفتی سعید صاحب)

مُنَافِقٌ ج: مُنَافِقُوْنَ۔ مونث: مُنَافِقَةٌ۔ ج: مُنَافِقَاتٌ۔ اسم الفاعل ہے۔ دورُخا ہونے والا یعنی منافق۔ ﴿ يَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُوْرَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ﴾ (9/التوبۃ:64) ''ڈرتے ہیں منافق کہ نازل کردی جائے ان کے بارے میں کوئی سورت جو جتلا دے ان کو وہ، جو ان کے دلوں میں ہے۔'' ﴿ اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْ بَعْضٍ ﴾ (9/التوبۃ:67) ''منافق مرد اور منافق عورتیں، ان کے بعض، بعض سے ہیں یعنی سب ایک جیسے ہیں۔''

ترکیب اَلَّذِيْنَ اسم موصول ہے۔ يُؤْمِنُوْنَ فعل مضارع ہے اور اس میں شامل ضمیر اس کا فاعل، آگے بِالْغَيْبِ جار مجرور متعلق ہیں يُؤْمِنُوْنَ سے۔ جملہ فعلیہ يُؤْمِنُوْنَ اپنے متعلق سے مل کر صلہ ہے اَلَّذِيْنَ کا اور صلہ اور موصولہ مل کر صفت ہیں اَلْمُتَّقِيْنَ کی اسی لیے محلاً حالت جر میں ہیں۔ 'وَ' عطف کا ہے اور آگے جملہ فعلیہ يُقِيْمُوْنَ عطف ہے يُؤْمِنُوْنَ پر اور الصَّلٰوةَ مفعول بِهٖ ہے۔ یہ جملہ بھی صفت ہے اَلْمُتَّقِيْنَ کی۔ 'وَ' عطف کا ہے اور مِمَّا، مِنْ حرف جارہ اور 'ما' موصول کا مرکب ہے۔ رَزَقْنَا فعل + فاعل اور هم ضمیر اس کا مفعول، پورا جملہ فعلیہ صلہ ہے 'ما' موصول کا اور جار مجرور متعلق ہیں آگے جملہ فعلیہ يُنْفِقُوْنَ سے۔ يُنْفِقُوْنَ بھی عطف ہے يُقِيْمُوْنَ پر اور یہ جملہ بھی صفت ہے اَلْمُتَّقِيْنَ کی۔ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ کو اصل فعل يُنْفِقُوْنَ سے پہلے لا کر اس حقیقت میں تاکید اور زور پیدا کیا گیا ہے کہ انسان کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ہے۔

ترجمہ
البقرۃ:3

اَلَّذِيْنَ	يُؤْمِنُوْنَ	بِالْغَيْبِ	وَيُقِيْمُوْنَ	الصَّلٰوةَ
وہ لوگ جو	ایمان لاتے ہیں	غیب پر	اور جو لوگ قائم رکھتے ہیں	نماز کو

وَمِمَّا	رَزَقْنٰهُمْ	يُنْفِقُوْنَ ۝۳
اور اس میں سے جو	ہم نے عطا کیا ان کو	وہ لوگ خرچ کرتے ہیں

نوٹ۔1 قرآن مجید میں صلوٰۃ کے ساتھ اکثر وبیشتر اقامت کا لفظ آیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم کردہ نماز کو اس کے ظاہری نظام اور باطنی روح کے ساتھ ادا کرنے کی تاکید ہے۔ جبکہ آیت فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى (نہ اس نے تصدیق کی اور نہ اس نے نماز پڑھی) (القیامۃ:31) میں وَلَا صَلّٰى سے مراد ہے کہ اس نے رسمی نماز بھی نہیں پڑھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ رسمی نماز پڑھنا بھی فائدہ سے خالی نہیں ہے۔ ایک روایت میں ہے اِنَّ الْمُصَلِّيْنَ كَثِيْرٌ وَالْمُقِيْمِيْنَ لَهَا قَلِيْلٌ (نماز پڑھنے والے بہت ہیں جبکہ اس کو قائم کرنے والے کم ہیں)۔

نوٹ۔2 قرآن مجید میں انفاق سے مراد انفاق فی سبیل اللہ ہی ہوتا ہے خواہ فی سبیل اللہ کے الفاظ ساتھ نہ بھی لکھے ہوں۔ جس طرح صرف ایمان کا ذکر ہو تب بھی اس سے مراد وہ ایمان ہوتا ہے جو قرآن وسنت کے مطابق ہو۔ مولانا مودودیؒ سورۃ الحج کی آیت 35 کے تحت ''انفاق'' کی وضاحت

کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''اللہ نے کبھی حرام وناپاک مال کو اپنا رزق نہیں فرمایا ہے۔ اس لیے آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو پاک رزق ہم نے انہیں بخشا ہے اور جو حلال کمائیاں ان کو عطا کی ہیں ان میں سے وہ خرچ کرتے ہیں۔ پھر خرچ سے مراد بھی ہر طرح کا خرچ نہیں ہے بلکہ اپنی اور اپنے اہل وعیال کی جائز ضروریات پوری کرنا، رشتہ داروں اور ہمسایوں اور حاجت مند لوگوں کی مدد کرنا، رفاہِ عام کے کاموں میں حصہ لینا، اور اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے مالی ایثار کرنا مراد ہے۔ بے جا خرچ، اور عیش وعشرت کے خرچ اور ریا کارانہ خرچ وہ چیز نہیں ہے جسے قرآن ''انفاق'' قرار دیتا ہو۔ بلکہ یہ اس کی اصطلاح میں اسراف اور تبذیر ہے۔ اسی طرح کنجوسی اور تنگ دلی کے ساتھ جو خرچ کیا جائے کہ آدمی اپنے اہل وعیال کو بھی تنگ رکھے اور خود بھی اپنی حیثیت کے مطابق اپنی ضرورتیں پوری نہ کرے، اور خلق خدا کی مدد بھی اپنی استطاعت کے مطابق کرنے سے جی چرائے، تو اس صورت میں اگرچہ آدمی خرچ تو کچھ نہ کچھ کرتا ہی ہے، مگر قرآن کی زبان میں اس خرچ کا نام ''اِنفاق'' نہیں ہے۔ وہ اس کو ''بخل'' اور ''شُحِّ نفس'' کہتا ہے۔ (تفہیم القرآن، ج ۳، ص ۲۲۶)

آیت: 4

﴿ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝۴ ﴾

يُؤْمِنُوْنَ (ء م ن): البقرۃ آیت 3 دیکھیں۔

بِمَآ ''ب'' حرف جارہ ہے اور ''ما'' استفہامیہ، مصدریہ یا موصولہ ہوسکتا ہے۔ 'ما' استفہامیہ ہونے کی صورت میں الف حذف کر دیا جاتا ہے اور بِمَ لکھا جاتا ہے تاکہ 'ما' استفہامیہ اور 'ما' موصولہ میں فرق ہو سکے۔

ن ز ل

(ض) **نُزُوْلًا** اُترنا۔ بلندی سے کسی چیز کا نیچے آنا۔ اس کی ضد صعود اور عروج دونوں ہیں۔ ﴿ وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا ۭ ﴾ (57/الحدید:4) ''اور جو کچھ آسمان سے اُترتا ہے اور جو کچھ اُس میں چڑھتا ہے۔'' ﴿ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ۙ ﴾ (57/الحدید:16) ''اور جو اُترا حق میں سے۔''

مَنْزِلٌ ج: مَنَازِلُ۔ اسم الظرف ہے۔ اُترنے کی جگہ۔ ٹھہرنے کی جگہ۔ ﴿ هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَاۗءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ ﴾ (10/یونس:5) ''وہ ہے جس نے بنایا سورج کو روشن اور چاند کو نور اور اس کے لئے طے کر دیں منزلیں۔''

نَزْلَةً نَزَلَ کا اسم مرۃ ہے۔ ایک بار کا نزول۔ ایک مرتبہ اُترنا۔ ﴿ وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ۝۱۳ ﴾ (53/النجم:13) ''اور انہوں ﷺ نے اس (فرشتہ) کو ایک بار اور بھی اترتے دیکھا ہے۔''

نُزُلٌ اسم ذات ہے۔ وہ چیز جو مہمان کے سواری سے اُترتے ہی یعنی آتے ہی اصل دعوت سے پہلے پیش کی جائے۔ ابتدائی مہمان نوازی۔ حضرت مفتی شفیعؒ فرماتے ہیں: ''نُزُلٌ اصلاً مہمان کی اس خاطر تواضع کو کہا جاتا ہے جو اصل دعوت سے پہلے کی جائے۔ بعد کے کھانے کو ضیافة یا مأدبة کہتے ہیں۔'' (معارف القرآن، ج ۷، ص ۷۷۳) ﴿ اِنَّآ اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ نُزُلًا ۝۱۰۲ ﴾ (18/الکہف:102) ''یقیناً ہم نے تیار کیا جہنم کو کافروں کے لئے ابتدائی مہمان نوازی کے طور پر۔''

(افعال) **اِنْزَالًا** اُتارنا۔ اتارنے کے لیے انزال کا لفظ عام ہے۔ یہ لفظ کسی چیز کو مکمل طور پر ایک ہی دفعہ اتارنے کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔ ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ ﴾ (2/البقرۃ:174) ''بیشک وہ لوگ چھپاتے ہیں اس کو جو اُتارا اللہ نے الکتاب میں سے۔'' قرآن مجید میں لباس، مویشی اور لوہے کے اتارنے کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے مثلاً ﴿ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ۭ ﴾ (7/الاعراف:26) ''اے اولادِ آدمؑ کی ہم نے اتاری تم پر پوشاک جو ڈھانکے تمہاری شرمگاہیں اور اتارے آرائش کے کپڑے۔'' حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اس آیت میں اَنْزَلْنَا کے لفظ کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''اتارنے سے مراد اُس کا مادہ وغیرہ پیدا کرنا اور اُس

کے تیار کرنے کی تدبیر بتلانا ہے۔ گو اتارنے کا لفظ اکثر اس موقع پر بولتے ہیں جہاں ایک چیز کو اوپر سے نیچے لایا جائے۔ مگر بہت دفعہ اس سے مکانی فوق وتحت مراد نہیں ہوتا۔ بلکہ جو مرتبہ کے اعتبار سے اُونچا ہو، اس کی طرف سے کوئی چیز نیچے والوں کو عطا کیے جانے پر بھی یہ لفظ اطلاق کیا جاتا ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿وَ اَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ﴾ (39/الزمر:6) یا ﴿وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ﴾ (57/الحدید:25) (تفسیر عثمانی، ص ۲۰۴)۔ اِنْزَالٌ کا لفظ خَلْقٌ (پیدا کرنا) کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ حضرت مولانا عبدالماجد دریا بادیؒ الاعراف 26 میں اَنْزَلْنَا کے لفظ کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''اَنْزَلْنَا کے لفظی معنی تو اتارنے کے ہیں۔ یہاں خَلَقْنَا کا مرادف قرار دیا گیا ہے۔ لفظ انزال میں اس کی برکتوں کی طرف اشارہ ہے کہ گویا وہ آسمان سے اُترا ہوا ہے۔ غور کیا جائے تو ہر لباس اپنی تیاری کے لیے اسباب آسمانی ہی کا محتاج نظر آئے گا۔ ریشم، اُون، سوت، سب کی پیداوار کے آخری، ظاہری اسباب جا کر بارش ہی پر ٹھہرتے ہیں۔ (تفسیر ماجدی، ص ۳۶۷)۔ چنانچہ حضرتؒ آیت کا ترجمہ کرتے ہیں: ''اے بنی آدم ہم نے تمہارے لیے لباس پیدا کیا ہے جو تمہارے پردہ والے بدن کو چھپاتا ہے اور موجب زینت بھی ہے۔'' اسی طرح سورۃ الزمر آیت 6 میں بھی انزل کے لفظ کا ترجمہ پیدا کیے سے ہی کرتے ہیں۔ ''اور تمہارے لیے اُس نے چار پایوں کے آٹھ (تعداد میں) جوڑے پیدا کیے۔'' پیر کرم شاہ صاحبؒ الاعراف 26 کے تحت فرماتے ہیں: ''اَنْزَلْنَا کا لفظی معنی تو اُوپر سے نیچے اتارنا ہے۔ یہاں لباس کے لیے اس کا استعمال بطور مجاز (مجاز یعنی کہ ظاہری معنی کے علاوہ جو معنی لیے جاتے ہیں) ہے یعنی بارش جو کپاس وغیرہ کی روئیدگی اور حیوانات (جن کی اُون سے گرم کپڑے بنتے ہیں) کی زندگی کا سبب ہے۔ وہ کیونکہ اُوپر سے نازل ہوتی ہے تو گویا لباس بھی اُوپر سے ہی نازل ہوا۔ تَسْمِيَةُ الْمُسَبَّبِ بِاسْمِ السَّبَبِ (مسبب کا نام سبب والا رکھنا، یہاں مسبب لباس ہے اور سبب بارش) اور بعض علما نے کہا انزل بمعنی خلق ہے۔ اور یہ استعمال بھی عام ہے۔ جیسے ﴿وَ اَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ﴾ (39/الزمر:6) (ضیاء القرآن، ج۲، ص: ۲۲)۔ اس وضاحت سے معلوم ہوا کہ انزال کا لفظ اتارنے کے لیے عام ہے۔ مرتبہ کے اعتبار سے جو اونچا ہو، اس کی طرف سے نیچے والوں کو کوئی چیز ملے تو اس پر بھی اس لفظ کا اطلاق ہوتا ہے اور خلق (پیدا کرنا) کے معنوں میں بھی اس کا استعمال عام ہے۔ (واللہ اعلم)

مُنْزِلٌ ج: مُنْزِلُوْنَ- اسم الفاعل ہے۔ اُتارنے والا۔ میزبان۔ مہمان نواز۔ ﴿اَلَا تَرَوْنَ اَنِّيْٓ اُوْفِي الْكَيْلَ وَ اَنَا خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ ۝۵۹﴾ (12/یوسف:59) ''کیا تم لوگ دیکھتے نہیں کہ میں پورا ناپتا ہوں پیمانے کو اور میں سب سے بہتر ہوں اُتارنے والوں میں یعنی بہترین مہمان نواز ہوں۔''

مُنْزَلٌ ج: مُنْزَلُوْنَ- اسم المفعول ہے۔ اُتارا ہوا۔ ﴿اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓىِٕكَةِ مُنْزَلِيْنَ ۝۱۲۴﴾ (3/آل عمران:124) ''کہ تم لوگوں کی مدد کرے تمہارا رب تین ہزار فرشتوں سے جو اُتارے گئے۔''

(تفعیل) **تَنْزِيْلًا** کسی چیز کو بتدریج اُتارنا۔ رفتہ رفتہ اتارنا۔ ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ﴾ (2/البقرۃ:176) ''یہ اس لئے کہ اللہ نے بتدریج اُتارا الکتاب کو حق کے ساتھ۔'' ﴿وَ نُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (17/بنی اسرائیل:82) ''اور ہم بتدریج اُتارتے ہیں قرآن میں سے جو شفاء ہے اور رحمت ہے مومنوں کیلئے۔''

مُنَزِّلٌ اسم الفاعل ہے۔ بتدریج اُتارنے والا۔ رفتہ رفتہ اتارنے والا۔ ﴿قَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ﴾ (5/المآئدۃ:115) ''کہا اللہ نے کہ میں بتدریج اُتارنے والا ہوں اس کو تم لوگوں پر۔''

مُنَزَّلٌ اسم المفعول ہے۔ بتدریج اُتارا ہوا۔ ﴿وَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ﴾ (6/الانعام:114) ''اور جن لوگوں کو ہم نے دی الکتاب وہ لوگ جانتے ہیں کہ وہ (یعنی قرآن) بتدریج اُتارا ہوا ہے

آپ ﷺ کے رب کی جانب سے حق کے ساتھ۔''

(تفعّل) تَنَزُّلًا ٹھہر ٹھہر کر اُترنا۔ اُترتے رہنا۔ ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ﴾ (41/حٰمٓ السجدہ:30) ''بیشک جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر وہ لوگ ڈٹے رہے (یعنی اپنے قول پر) تو اُترتے رہتے ہیں ان لوگوں پر فرشتے۔'' امام راغبؒ فرماتے ہیں: ''جو کلام افتراء اور جھوٹ ہو یا شیاطین کی طرف سے القاء کیا گیا ہو اسکے متعلق صرف تَنَزُّلٌ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اس لیے کہ باب تفعّل میں تکلّف اور بناوٹ کی خاصیت ہوتی ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ ﴾ (26/الشعراء:210) ''اور اس قرآن کو شیطان لے کر نازل نہیں ہوئے۔'' (مفردات القرآن)

قَبْلُ (مادہ ق ب ل، تفصیل سے انشاء اللہ اسی سورہ کی آیت 48 کے تحت آئے گا۔ یہاں آیت کی مناسبت سے صرف قَبْلُ لکھا جارہا ہے)۔

قَبْلُ (پہلے)، ظرف زمان بھی ہے اور ظرف مکان بھی۔ اس کی ضد بَعْدُ ہے۔ قَبْلُ چار طرح استعمال ہوتا ہے۔ (1) تقدم مکانی یعنی کسی مقام کا دوران سفر پہلے آنا اور دوسرے کا اس کے بعد آنا جیسے فیصل آباد سے گوجرانوالہ جاتے ہوئے مانوالہ، شیخوپورہ سے پہلے آتا ہے اور گوجرانوالہ سے فیصل آباد آتے ہوئے شیخوپورہ، مانوالہ سے پہلے آتا ہے۔ (2) تقدم زمانی یعنی کسی انسان کا زمانہ کسی دوسرے انسان کے زمانے سے پہلے ہونا۔ جیسے عَبْدُ الْمَلِكِ قَبْلَ الْمَنْصُوْرِ کہ عبدالملک کا زمانہ منصور سے پہلے کا ہے۔ (3) تقدم بلحاظ مرتبہ یعنی مرتبے میں کسی سے بڑا ہونا جیسے عَبْدُ الْمَلِكِ قَبْلَ الْحَجَّاجِ کہ عبدالملک حجاج سے پہلے ہے یعنی مرتبہ میں بڑا ہے۔ (4) ترتیب تعلیمی میں ایک چیز کا دوسری سے پہلے ہونا جیسے کہا جاتا ہے کہ تَعَلُّمُ الْهِجَاءِ قَبْلَ تَعَلُّمِ الْخَطِّ کہ حروف ہجاء کی تعلیم کتابت سیکھنے سے پہلے دی جاتی ہے۔ ان چار استعمالات کے علاوہ قبل سے مراد ''بغیر'' بھی ہوتا ہے مثلاً ﴿ قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ﴾ (7/الاعراف:123) ''فرعون بولا تم ایمان لے آئے بغیر اس کے کہ میں تمہیں اجازت دوں۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔ اسی آیت کے تحت حضرت مولانا عبدالماجد دریا بادیؒ فرماتے ہیں: ''قبل سے مراد ہمیشہ پیشتر ہی نہیں ہوتا۔ ''بغیر'' بھی مراد ہوتا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید کی ایک دوسری آیت میں آیا ہے لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ (کہف۔ ۱۰۹) یا اس حدیث میں وارد ہوا ہے۔ اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِيْ عَيْنَيْنِ هَطَّالَتَيْنِ تَسْقِيَانِ الْقَلْبَ بِذُرُوْفِ الدَّمْعِ مِنْ خَشْيَتِكَ قَبْلَ اَنْ تَكُوْنَ الدُّمُوْعُ دَمًا وَالْاَضْرَاسُ جَمْرًا ''اے اللہ مجھے عطا فرمائیے ایسی زیادہ آنسو بہانے والی آنکھیں جو دل کو سیراب کریں آنسوؤں کے موتیوں کے ساتھ آپ کے خوف سے نہ یہ کہ (یا اس سے پہلے کہ) آنسو خون بن جائیں اور داڑھیں انگارہ بن جائیں۔'' قَبْلُ ہمیشہ اضافت کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ (ا) اگر اس کا مضاف الیہ مذکور ہو (یعنی ذکر کیا جائے) اور اس پر حرف جر بھی داخل ہو تو پھر قَبْلُ زیر قبول کرتا ہے جیسے مِنْ قَبْلِهِمْ، مِنْ قَبْلِكُمْ وغیرہ۔ (ب) اگر اس کا مضاف الیہ مذکور نہ ہو اور اس پر حرف جر داخل ہو تو پھر قَبْلُ پیش کے ساتھ لکھا جاتا ہے جیسے هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ (البقرۃ:25) (ج) اگر اس پر حرف جر داخل نہ ہو تو پھر یہ زبر کے ساتھ لکھا جاتا ہے جیسے ﴿ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا ﴾ (طٰہٰ:130)۔

ء خ ر

(x) x ثلاثی مجرد سے فعل استعمال نہیں ہوتا۔

(تفعیل) تَاْخِيْرًا پیچھے کرنا۔ موخر کرنا۔ مہلت دینا۔ ڈھیل دینا۔ ﴿ يُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍۭ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ ﴾ (75/القیامۃ:13) ''جتلا دیا جائے گا اس دن انسان کو جو اس نے آگے کیا اور جو اس نے پیچھے کیا۔'' ﴿ وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا ﴾ (63/المنافقون:11) ''اور اللہ ہرگز پیچھے نہیں کرے گا (یعنی ہرگز مہلت نہیں دے گا) کسی نفس کو جب آجائے گی اس کی اجل (یعنی موت)۔''

(تفعّل) تَاَخُّرًا پیچھے رہنا۔ ﴿ نَذِيْرًا لِّلْبَشَرِ ۝ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّتَقَدَّمَ اَوْ يَتَاَخَّرَ ﴾ (74/المدثر:36-37) ''وارننگ ہے ہر اس شخص کے لئے جو چاہے تم میں سے کہ وہ آگے رہے یا پیچھے رہے۔''

(استفعال) **اِسۡتِئۡخَارًا** پیچھے ہونا۔ ﴿فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمۡ لَا يَسۡتَاۡخِرُوۡنَ سَاعَةً وَّ لَا يَسۡتَقۡدِمُوۡنَ ﴾ (7/الاعراف:34) ''توجب آجائے گی ان لوگوں کی اجل تو نہ وہ لوگ پیچھے ہوں گے ایک گھڑی اور نہ آگے ہوں گے۔''

مُسۡتَاۡخِرٌ اسم الفاعل ہے۔ پیچھے رہنے والا اور وہ جو ابھی پیدا نہیں ہوا۔ ﴿وَ لَقَدۡ عَلِمۡنَا الۡمُسۡتَقۡدِمِيۡنَ مِنۡكُمۡ وَ لَقَدۡ عَلِمۡنَا الۡمُسۡتَاۡخِرِيۡنَ ﴾ (15/الحجر:24) ''اور ہم نے جان رکھا ہے آگے بڑھنے والوں کو تم میں سے اور جان رکھا ہے پیچھے رہنے والوں کو۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)۔ ''پہلے جو لوگ تم میں سے ہو گزرے ہیں اُن کو بھی ہم نے دیکھ رکھا ہے، اور بعد کے آنے والے بھی ہماری نگاہ میں ہیں۔'' (ترجمہ تفہیم القرآن)

آخِرٌ فاعل کا وزن ہے۔ آخری۔ ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّقُوۡلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَ مَا هُمۡ بِمُؤۡمِنِيۡنَ ۘ﴾ (2/البقرہ:8) ''اور لوگوں میں سے وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں ہم ایمان لائے اللہ پر اور آخری دن پر حالانکہ وہ لوگ مومن نہیں ہیں۔''

اٰخِرَةٌ یہ ضد ہے دنیا کی۔ دنیا مشتق ہے دُنُوٌّ سے جس کے معنی قریب ہونا کے ہیں خواہ یہ قرب ذاتی، حکمی، مکانی، زمانی یا بلحاظ مرتبہ کے ہو۔ چونکہ وہ حال کے بہت ہی قریب ہے اس لیے اسے دنیا کہتے ہیں۔ اسی طرح آخرت کو اس کے متاخر اور پیچھے ہونے کی وجہ سے آخرت کہتے ہیں۔ اصل میں دنیا اور آخرت دونوں دو صفتیں تھیں اب ان پر اسمیت غالب آئی اور استعمال میں دنیا و آخرت اسم کہلائے جانے لگے۔ اصل میں آخرت کا معنی دار البقا ہے یعنی مرنے کے بعد انسانوں کو دوسرے جہان میں جو دائمی زندگی حاصل ہوگی اور اس زندگی میں رُوح اور جسم دونوں کا کلی طور پر اتصال ہوگا اور نیک اور بدکار لوگوں کو اپنے اپنے اعمال کے بدلے میں جنت یا دوزخ میں داخل کیا جائے گا۔ اسی لحاظ سے آخرت کی ضد عاجلۃ، دنیا، ادنیٰ، اُولیٰ سب قرآن میں استعمال ہوئی ہیں۔ مولانا عبدالماجد دریا بادیؒ فرماتے ہیں: ''اَلۡاٰخِرَةُ سے مراد ہے دارالآخرت یا عالم آخرت۔ یعنی وہ عالم جو موجودہ زندگی کے بعد شروع ہوگا۔ اُسے آخرۃ کہا ہی اسی لحاظ سے جاتا ہے کہ وہ اِس زندگی کے خاتمہ کے بعد پیش آئے گا۔ قرآن مجید میں اس کا ذکر کہیں دارالآخرہ سے آیا ہے اور کہیں صرف آخرۃ سے۔ جزاوسزا کے لیے ایک مستقل آئندہ عالم پر یقین رکھنا دین صحیح کے لوازم میں سے ہے۔'' (تفسیر ماجدی، ص۸)۔ مولانا مودودیؒ نے اس لفظ کی بہت خوبصورت وضاحت کی ہے وہ آگے نوٹ 2 میں دیکھیں۔

آخَرُ ج: اٰخَرُوۡنَ، اٰخَرِيۡنَ۔ اَفۡعَلُ کا وزن ہے۔ دوسرا۔ ﴿الَّذِيۡنَ يَجۡعَلُوۡنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ ۚ﴾ (15/الحجر:96) ''وہ لوگ جو بناتے ہیں اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود۔'' ﴿كَمَاۤ اَنۡشَاَكُمۡ مِّنۡ ذُرِّيَّةِ قَوۡمٍ اٰخَرِيۡنَ ؕ﴾ (6/الانعام:133) ''جس طرح اُس نے تمہیں کچھ اور لوگوں کی نسل سے اُٹھایا ہے۔''

اُخۡرٰى فُعۡلٰى کے وزن پر اٰخَرُ کا مونث ہے۔ دوسری۔ اس کی جمع فُعَلٌ کے وزن پر اُخَرٌ آنی چاہیے تھی لیکن خلاف قاعدہ اُخَرُ (غیر منصرف) آتی ہے۔ ﴿وَ اُخۡرٰى تُحِبُّوۡنَهَا ؕ﴾ (61/الصف:13) ''اور دوسری، تم لوگ پسند کرتے ہو جس کو۔'' ﴿فَعِدَّةٌ مِّنۡ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ﴾ (2/البقرہ:184) ''تو گنتی ہے دوسرے دنوں میں۔'' کبھی اس کا معنی ''پیچھے سے، پچھلی طرف سے'' ہوتا ہے جیسے فرمایا ﴿وَّ الرَّسُوۡلُ يَدۡعُوۡكُمۡ فِىۡۤ اُخۡرٰٮكُمۡ﴾ (3/آل عمران:153) ''اور رسول ﷺ پکارتا تھا تم کو تمہارے پیچھے سے۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ) کبھی اس سے مراد ''بعد والا یا بعد والی'' ہوتا ہے جیسے فرمایا: ﴿حَتّٰۤى اِذَا ادَّارَكُوۡا فِيۡهَا جَمِيۡعًا ۙ قَالَتۡ اُخۡرٰٮهُمۡ لِاُوۡلٰٮهُمۡ رَبَّنَا هٰٓؤُلَاۤءِ اَضَلُّوۡنَا فَاٰتِهِمۡ عَذَابًا ضِعۡفًا مِّنَ النَّارِ ۙ﴾ (7/الاعراف:38) ''حتیٰ کہ جب سب وہاں جمع ہو جائیں گے تو ہر بعد والا گروہ پہلے گروہ کے حق میں کہے گا کہ اے ربّ! یہ لوگ تھے جنہوں نے ہم کو گمراہ کیا لہٰذا انہیں آگ کا دوہرا عذاب دے۔'' اس آیت کے تحت صاحبؒ احسن البیان

فرماتے ہیں: ''اُخْرٰی (پچھلے) سے مراد بعد میں داخل ہونے والے اور اُوْلیٰ (پہلے) سے مراد ان سے پہلے داخل ہونے والے ہیں۔'' اور کبھی اُخْرٰی مطلقاً ''دوسرے'' کے معنی میں بھی آتا ہے جس میں مقدم اور مؤخر کا مفہوم نہیں ہوتا چنانچہ فرمایا: ﴿وَ لَقَدْ مَنَنَّا عَلَیْكَ مَرَّةً اُخْرٰۤی﴾ (20/طٰہٰ:37) ''اور احسان کیا تھا ہم نے تجھ پر ایک بار اور بھی۔'' حضرت مفتی محمد شفیعؒ اس آیت میں اُخْرٰی کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''یہ نعمتیں جن کا ذکر آگے آتا ہے زمانہ وقوع کے اعتبار سے پہلی ہیں یہاں جو اُن کو اُخْرٰی کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ نعمتیں اس کے بعد کی ہیں بلکہ لفظ اُخْرٰی کبھی مطلقاً دوسرے کے معنی میں بھی آتا ہے جس میں مقدم مؤخر کا کوئی مفہوم نہیں ہوتا یہاں بھی یہ لفظ اسی معنی میں ہے۔'' (معارف القرآن، ج ۶ ص ۸۲)

ی ق ن

(س) **یَقْنًا** روشن و ثابت ہونا۔ قرآن مجید میں ثلاثی مجرد سے فعل استعمال نہیں ہوا۔

یَقِیْنٌ فَعِیْلٌ کے وزن پر صفت ہے۔ کسی چیز کا ثبوت کے ساتھ ہمیشہ کے لئے سمجھ میں آجانا۔ یقین آنا۔ یقین، زوالِ شک کو کہتے ہیں۔ یقین اس چیز کو بھی کہتے ہیں جس کا ہونا یقینی ہو اسی لیے عربی میں یقین بمعنی موت بھی استعمال ہوتا ہے۔ ﴿وَ كُنَّا نُكَذِّبُ بِیَوْمِ الدِّیْنِ ۝ حَتّٰۤی اَتٰىنَا الْیَقِیْنُ﴾ (74/المدثر:46-47) ''اور ہم جھٹلایا کرتے تھے بدلے کے دن کو یہاں تک کہ آیا ہم کو یقین۔'' اس آیت میں اکثر مفسرین نے یقین سے موت مراد لی ہے۔
(ایمان اور یقین میں فرق کے لیے البقرۃ آیت 3 دیکھیں)۔

(افعال) **اِیْقَانًا** یقین کرنا۔ ﴿قَدْ بَیَّنَّا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ﴾ (2/البقرہ:118) ''ہم واضح کر چکے ہیں نشانیوں کو ایسی قوم کے لئے جو یقین کرتے ہیں۔''

مُوْقِنٌ ج: مُوْقِنُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ یقین کرنے والا۔ ﴿وَ كَذٰلِكَ نُرِیْۤ اِبْرٰهِیْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لِیَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِیْنَ﴾ (6/الانعام:75) ''اور اس طرح ہم نے دکھائی ابراہیمؑ کو زمین اور آسمانوں کی بادشاہت اور اس لئے کہ وہ ہو جائے یقین کرنے والوں میں سے۔''

(استفعال) **اِسْتِیْقَانًا** یقین حاصل کرنا۔ یقین کے ساتھ جان لینا۔ واضح طور پر جان لینا۔ ﴿وَ مَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ اِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوْا ۙ لِیَسْتَیْقِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ﴾ (74/المدثر:31) ''اور ہم نے نہیں بنایا ان کی گنتی کو مگر آزمائش ان لوگوں کے لئے جنہوں نے کفر کیا، تاکہ یقین حاصل کریں وہ لوگ جنہیں دی گئی کتاب۔''

مُسْتَیْقِنٌ ج: مُسْتَیْقِنُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ یقین حاصل کرنے والا۔ ﴿قُلْتُمْ مَّا نَدْرِیْ مَا السَّاعَةُ ۙ اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّ مَا نَحْنُ بِمُسْتَیْقِنِیْنَ﴾ (45/الجاثیہ:32) ''تم لوگوں نے کہا ہم نہیں جانتے قیامت کیا ہے، ہم گمان نہیں کرتے مگر ایک گمان یعنی کچھ گمان سا ہوتا ہے اور ہم یقین حاصل کرنے والے نہیں ہیں۔''

ترکیب یہ پوری آیت بھی آیت 2 میں اَلْمُتَّقِیْنَ کی صفت ہے۔ 'وَ' عطف کا ہے اور اَلَّذِیْنَ عطف ہے آیت 3 کے اَلَّذِیْنَ پر۔ یُؤْمِنُوْنَ اس کا صلہ ہے۔ بِمَا میں 'مَا' اسم موصول ہے اور اُنْزِلَ اس کا صلہ۔ اُنْزِلَ ماضی مجہول کا صیغہ ہے اور اس میں شامل ضمیر ''ھُوَ'' اس کا نائب الفاعل ہے۔ اِلَیْكَ متعلق ہے اُنْزِلَ سے۔ آگے 'وَمَا' میں 'وَ' عطف کا ہے اور 'مَا'، بِمَا کے 'مَا' پر عطف ہے۔ اُنْزِلَ اس کا صلہ ہے۔ مِنْ قَبْلِكَ متعلق ہے اُنْزِلَ سے۔ بِالْاٰخِرَةِ، جار مجرور متعلق ہیں یُوْقِنُوْنَ سے اور 'هُمْ' مبتدا ہے اور یُوْقِنُوْنَ اس کی خبر۔ بِالْاٰخِرَةِ کو تاکید اور حصر کے لیے مقدم کیا گیا ہے اور اَلْاٰخِرَةِ صفت ہے۔ اس کا موصوف محذوف ہے۔ اَلْاٰخِرَةِ مونث ہے اس لئے اس کا موصوف مذکر نہیں ہو سکتا لازماً مونث ہوگا جیسے وَبِالسَّاعَةِ الْاٰخِرَةِ یعنی آخری گھڑی پر۔ (واللہ اعلم)۔

ترجمہ
البقرۃ:4

وَالَّذِیۡنَ	یُؤۡمِنُوۡنَ	بِمَاۤ	اُنۡزِلَ	اِلَیۡکَ	وَمَاۤ	اُنۡزِلَ
اور وہ لوگ جو	ایمان لاتے ہیں	اس پر جو	اُتارا گیا	آپ ﷺ کی طرف	اور جو	اُتارا گیا
مِنۡ قَبۡلِکَ ۚ	وَبِالۡاٰخِرَۃِ	ھُمۡ	یُوۡقِنُوۡنَ ؕ۴			
آپ ﷺ سے پہلے	اور آخرت پر	وہ لوگ	یقین کرتے ہیں			

نوٹ:1 اِنۡزَالٌ اور تَنۡزِیۡلٌ دونوں کے معنی ہیں اُتارنا۔ جبکہ ان میں فرق یہ ہے کہ اِنۡزَالٌ میں زیادہ تر کسی چیز کو ایک دفعہ اُتارنے کا مفہوم ہوتا ہے۔ اور تَنۡزِیۡلٌ میں کسی چیز کو رفتہ رفتہ اُتارنے کے معنی ہوتے ہیں۔ نزولِ قرآن کے لئے اِنۡزَالٌ اور تَنۡزِیۡلٌ، دونوں کے مختلف صیغے استعمال ہوئے ہیں۔ اس کو سمجھنے میں ایک حدیث سے مدد ملتی ہے جس کا مفہوم ہے کہ قرآن پاک پہلے لوحِ محفوظ سے ایک ہی دفعہ آسمانِ دنیا پر نازل ہوا (انزال) پھر وہاں سے رفتہ رفتہ نازل ہوتا رہا (تنزیل)۔

نوٹ:2 آخرت: آخرت ایک جامع لفظ ہے جس کا اطلاق بہت سے عقائد کے مجموعے پر ہوتا ہے۔ اس میں حسب ذیل عقائد شامل ہیں:

(۱) یہ کہ انسان اس دُنیا میں غیر ذمہ دار نہیں ہے بلکہ اپنے تمام اعمال کے لیے خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔

(۲) یہ کہ دُنیا کا موجودہ نظام ابدی نہیں ہے بلکہ ایک وقت پر، جسے صرف خدا ہی جانتا ہے، اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔

(۳) یہ کہ اس عالم کے خاتمے کے بعد خدا ایک دوسرا عالم بنائے گا اور اس میں پوری نوعِ انسانی کو جو ابتدائے آفرینش سے قیامت تک زمین پر پیدا ہوئی تھی، بیک وقت دوبارہ پیدا کرے گا، اور سب کو جمع کر کے ان کے اعمال کا حساب لے گا، اور ہر ایک کو اس کے کیے کا پورا پورا بدلہ دے گا۔

(۴) یہ کہ خدا کے اس فیصلے کی رُو سے جو لوگ نیک قرار پائیں گے وہ جنت میں جائیں گے اور جو لوگ بد ٹھہریں گے وہ دوزخ میں ڈالے جائیں گے۔

(۵) یہ کہ کامیابی و ناکامی کا اصلی معیار موجودہ زندگی کی خوشحالی و بدحالی نہیں ہے، بلکہ درحقیقت کامیاب انسان وہ ہے جو خدا کے آخری فیصلے میں کامیاب ٹھہرے، اور ناکام وہ ہے جو وہاں ناکام ہو۔

عقائد کے اِس مجموعے پر جن لوگوں کو یقین نہ ہو وہ قرآن سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھا سکتے، کیونکہ ان باتوں کا انکار تو درکنار، اگر کسی کے دل میں ان کی طرف سے شک اور تذبذب کی کیفیت بھی ہو، تو وہ اس راستہ پر نہیں چل سکتا جو انسانی زندگی کے لیے قرآن نے تجویز کیا ہے۔ (تفہیم القرآن، ج ۱ ص ۵۱)

آیت:5

﴿ اُولٰٓئِکَ عَلٰی ھُدًی مِّنۡ رَّبِّھِمۡ ٭ وَ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ۵ ﴾

ھُدًی (ھ د ی): الفاتحہ آیت 5 دیکھیں۔ رَبٌّ (ر ب ب): الفاتحہ آیت 1 دیکھیں۔

ف ل ح

(ن) فَلَحًا پھاڑنا۔ زمین میں ہل چلانا۔ عربی میں کہا جاتا ہے اَلۡحَدِیۡدُ بِالۡحَدِیۡدِ یُفۡلَحُ۔ لوہا، لوہے کو کاٹتا ہے۔ پھر فَلَّاحٌ کسان کو کہتے ہیں کیونکہ وہ زمین کو پھاڑتا ہے (بیج بونے کے لیے)۔ ثلاثی مجرد سے فعل یا اسم قرآنِ مجید میں استعمال نہیں ہوا۔

(افعال) فَلَاحًا اس کا مصدر اِفۡلَاحٌ کے بجائے فَلَاحٌ استعمال ہوتا ہے۔ کامیاب ہونا۔ مراد پالینا۔ مشکلات اور رکاوٹوں کو پھاڑ کے یعنی عبور کر کے اپنا مطلوب حاصل کر لینا۔ (فعل لازم ہے)۔ فلاح ایسی کامیابی کو کہتے ہیں جو کسی کی اپنی محنت اور عمل کے نتیجے میں ہو۔ یہ لفظ خُسران کی ضد ہے جس کا معنی نقصان اور گھاٹا ہے۔ امام راغبؒ فرماتے ہیں، فَلَاحٌ کے معنی کامیابی کے ہیں۔ اس کی دو قسمیں ہیں (۱) دنیوی (۲) اُخروی۔ دنیوی فلاح ان سعادتوں کو حاصل کر لینے کا نام ہے جن

سے دنیاوی زندگی خوشگوار ہوتی ہے یعنی بقاء مال اور عزت و دولت۔ اخروی فلاح چار چیزوں کو حاصل کرنے کا نام ہے۔ (ا) بقا بلا فنا (ب) غنا بلا فَقْرٌ (ج) عزت بلا ذلت (د) علم بلا جہالت۔ اسی لیے کہا گیا ہے لَا عَيْشَ اِلَّا عَيْشَ الْاٰخِرَةِ۔ یعنی آخرت کی زندگی ہی اصل زندگی ہے۔ (مفردات القرآن۔تلخیصاً)۔ حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ فرماتے ہیں: ''فلاح عربی میں بڑے ہی وسیع معنی میں آتا ہے۔ دنیا و آخرت کی ساری خوبیوں کا جامع ہے۔ اس لیے المفلحون کا پورا ترجمہ ''کامیاب'' ''بامراد'' وغیرہ کسی اُردو لفظ سے ہونا دشوار ہی ہے۔ امام لغت زبیدی کا قول ہے کہ ائمۂ لسان کا اس پر اتفاق ہے کہ کلام عرب میں جامعیت خیر کے لیے فلاح سے بڑھ کر کوئی لفظ موجود نہیں۔ لَيْسَ فِيْ كَلَامِ الْعَرَبِ كُلِّهٖ اَجْمَعُ مِنْ لَفْظَةِ الْفَلَاحِ لِخَيْرَيِ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ كَمَا قَالَ اَئِمَّةُ اللِّسَانِ (تاج)۔'' (تفسیر ماجدی، ص ۸)۔ یہی بات پیر کرم شاہ صاحبؒ نے اِن الفاظ میں بیان کی ہے: ''فلاح کسی ادھوری اور جزوی کامیابی کو نہیں کہتے بلکہ فلاح اس مکمل کامیابی کو کہا جاتا ہے جس کے دامن میں دنیا و آخرت کی ساری سعادتیں اور برکتیں سمٹ آئی ہوں۔ لیس فی کلام ... ائمة اللسان (تاج)۔'' ائمہ لغت نے تصریح کی ہے کہ عربی زبان میں فلاح کے لفظ سے زیادہ اور کوئی لفظ نہیں جو دنیا و آخرت دونوں کی خیرات و برکات پر دلالت کرتا ہو'' (ضیاء القرآن، ج ا، ص ۳۲)۔

مُفْلِحٌ ج: مُفْلِحُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ مراد پانے والا'' قرآن مجید میں مفلحون کا لفظ صرف انہی لوگوں کے لیے استعمال کیا گیا ہے جو آخرت میں فلاح پانے والے (ہیں)۔ اخروی کامیابی کے دروازے جن کے لیے کھول دیئے جائیں گے، ہاں اَفْلَحَ کا لفظ ایک جگہ فرعون و موسیٰ کے قصہ میں دنیوی کامیابی کے لیے استعمال کیا گیا وہ بھی اللہ کا مقولہ نہیں ہے بلکہ دوسروں کا مقولہ اللہ نے نقل کیا ہے، فرمایا ہے ﴿وَقَدْ اَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنِ اسْتَعْلٰى ۝۶۴﴾ (20/طٰہٰ:64) ''آج جو غالب آئے گا وہی کامیاب ہوگا۔'' (لغات القرآن)

ترکیب

اُولٰٓىِٕكَ کا اشارہ گذشتہ آیت نمبر 2 میں اَلْمُتَّقِيْنَ کی طرف ہے۔ نیز اس آیت میں اُولٰٓىِٕكَ مبتداء ہے اور اس کی خبر محذوف ہے۔ عَلٰى هُدًى قائم مقام خبر ہے۔ هُدًى نکرہ موصوفہ ہے اور مِّنْ رَّبِّهِمْ اس کی صفت ہے۔ آگے اُولٰٓىِٕكَ مبتدا ہے اَلْمُفْلِحُوْنَ اس کی خبر اور درمیان میں هُمْ ضمیر فاصل ہے جو حصر کا مفہوم پیدا کر رہی ہے۔

ترجمہ	اُولٰٓىِٕكَ	عَلٰى هُدًى	مِّنْ رَّبِّهِمْ ۙ	وَاُولٰٓىِٕكَ	هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝
البقرۃ:5	یہی لوگ	ہدایت پر ہیں	اپنے رب کی طرف سے	اور یہ لوگ	ہی مراد پانے والے ہیں

آیت:6

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَاۗءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۶﴾

ك ف ر

(ن) **كُفْرًا، كُفُوْرًا، كُفْرَانًا** کسی چیز کو دبا دینا، کسی چیز کو اس طرح چھپا دینا کہ اس کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے۔ پھر اس بنیادی مفہوم کے ساتھ یہ الفاظ قرآن مجید میں شکر اور ایمان کے مقابلے میں استعمال ہوتے ہیں۔ چنانچہ اِن کا مفہوم ہے:
(ا) ناشکری کرنا یا نا قدری کرنا۔ ناشکری کو بھی کفر اس لیے کہا جاتا ہے کہ ناشکرا محسن کے احسانات کو چھپاتا ہے۔ (ب) ایمان لانے سے انکار کرنا۔ دراصل اللہ تعالیٰ کی معرفت، اسکی وحدانیت، نیکی بدی کا شعور، جذبہ شکر وغیرہ انسان کی فطرت میں ڈال کر اسے دنیا کی امتحان گاہ میں بھیجا جاتا ہے۔ یہ چیزیں جب اس کے اندر سے

ابھر کرشعور کی سطح پر آنا چاہتی ہیں تو کچھ لوگ اسے دبا دیتے ہیں یا چھپا لیتے ہیں۔ اسکے بعد ہی وہ اس قابل ہوتے ہیں کہ ناشکری کریں یا انکار کریں۔ کُفْرٌ زیادہ تر دین سے انکار کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ کُفْرَانٌ زیادہ تر نعمت کے انکار اور ناقدری کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اور کُفُوْرٌ دونوں قسموں کے انکار پر بولا جاتا ہے۔ اصطلاح شریعت میں جن چیزوں پر ایمان لانا فرض ہے ان میں سے کسی چیز کے انکار کا نام کفر ہے۔ ﴿وَمَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿۱۲﴾﴾ (31/لقمان:12) ''اور جو شکر کرے تو کچھ نہیں سوائے اسکے کہ وہ شکر کرتا ہے اپنے ہی لئے اور جس نے ناشکری کی تو بیشک اللہ بے نیاز، حمد کیا ہوا ہے۔''

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ ۚ﴾ (3/آل عمران:90) ''یقیناً وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ایمان لانے کے بعد پھر بڑھتے چلے گئے کفر میں، ہرگز قبول نہیں کی جائے گی ان کی توبہ۔''

﴿وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ۡ فَاَبٰٓى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿۸۹﴾﴾ (17/بنی اسرائیل:89) ''ہم نے مختلف پیرایوں میں بیان کی ہے لوگوں کیلئے اس قرآن میں ہر طرح کی مثال، تو نہ مانا لوگوں کی اکثریت نے مگر ناشکری کرتے ہوئے۔''

﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ ۚ﴾ (21/الانبیاء:94) ''تو جو عمل کرے نیکیوں میں سے اس حال میں کہ وہ مومن رہے تو کسی قسم کی کوئی ناقدری نہیں ہے اسکی کوشش کے لئے۔'' کُفْرٌ کا لفظ بطور اسم ذات بھی استعمال ہوتا ہے بمعنی کفر، انکار۔ ﴿وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴿۱۰۸﴾﴾ (2/البقرۃ:108) ''اور جو بدل لیتا ہے کفر کو ایمان سے تو وہ بھٹک گیا سیدھے راستے سے۔''

اُكْفُرْ ج: اُكْفُرُوْا۔ فعل امر ہے۔ تو کفر کر۔ ﴿كَمَثَلِ الشَّيْطٰنِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسَانِ اكْفُرْ ۚ﴾ (59/الحشر:16) ''شیطان کی مثال کی مانند جب اس نے کہا انسان سے کہ تو ناشکری کر یا انکار کر۔''

كَافِرٌ ج كَافِرُوْنَ، كُفَّارٌ اور كَفَرَةٌ۔ اسم الفاعل ہے (مذکر)۔ کفر کرنے والا، انکار کرنے والا، ناشکری کرنے والا۔ ﴿وَيَقُوْلُ الْكٰفِرُ يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا ﴿۴۰﴾ ع﴾ (78/النبا:40) ''اور کہے گا انکار کرنے والا اے کاش میں مٹی ہوتا۔'' ﴿قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا بِالَّذِيْٓ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۷۶﴾﴾ (7/الاعراف:76) ''وہ متکبر لوگ کہنے لگے ہم تو اُس چیز کے منکر ہیں جس پر تم ایمان لا چکے ہو۔''

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ﴾ (2/البقرہ:161) ''بیشک جن لوگوں نے انکار کیا اور وہ لوگ مر گئے اس حال میں کہ وہ لوگ انکار کرنے والے ہی رہے، ان لوگوں پر اللہ کی لعنت ہے۔'' ﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ﴿۴۲﴾ ع﴾ (80/عبس:42) ''یہی لوگ تو ہیں کافر فاجر۔''

کسان کو بھی كَافِرٌ کہتے ہیں کیونکہ وہ بیج کو زمین میں دبانے اور چھپانے والا ہوتا ہے۔ ﴿كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ﴾ (57/الحدید:20) بارش کی مثال کی مانند جو بھلی لگی کسانوں کو۔''

رات کو بھی کافر کہتے ہیں کیونکہ وہ سب چیزوں کو چھپا لیتی ہے۔

كَافِرَةٌ ج: كَوَافِرُ۔ اسم الفاعل ہے (مؤنث)۔ انکار کرنے والی۔ ناشکری کرنے والی۔ ﴿وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ ۭ﴾ (3/آل عمران:13) ''اور دوسری فوج کافروں کی ہے دیکھتے ہیں یہ اُن کو اپنے سے دو چند صریح آنکھوں سے۔'' ﴿وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ﴾ (60/الممتحنۃ:10) ''اور تم کافر عورتوں کے تعلقات کو باقی مت رکھو۔''

كَفَّارٌ فَعَّالٌ کے وزن پر اسم مبالغہ ہے۔ بہت ناشکرا، بہت انکار کرنے والا۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ ﴾(39/الزمر:3)''یقیناً اللہ ہدایت نہیں دیتا اس کو جو بہت زیادہ انکار کرنے والا جھوٹا ہے۔''

كَفُوْرٌ فَعُوْلٌ کے وزن پر اسم مبالغہ ہے۔ دل کھول کر ناشکری کرنے والا، انکار کرنے والا۔ ﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ ﴾ (22/الحج:66)''بیشک انسان دل کھول کر ناشکری کرنے والا ہے۔''

مَآ اَكْفَرَهٗ صیغہ تعجب ہے جو اظہار تعجب کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ﴿قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ ﴾(80/عبس:17)''(کافر) انسان پر اللہ کی مار، وہ کیسا ناشکرا ہے۔''

(تفعیل) **تَكْفِيْرًا** کسی کی ناپسندیدہ چیز کو اس سے دور کرنا، کسی چیز کو اس طرح چھپانا اور ڈھانپنا کہ گویا وہ کبھی تھی ہی نہیں۔ غلطی کا جرمانہ ادا کر کے اس کی سزا کو دور کرنا۔ کفارہ ادا کرنا۔ ﴿كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ ﴾(47/محمد:2)''اس نے یعنی اللہ نے دور کیا ان کی برائیوں کو ان سے اور اس نے اصلاح کی ان کی حالتوں کی۔'' (نوٹ: جوہریؒ فرماتے ہیں کہ ثواب مٹ جائے تو اس کے لیے 'احباط' کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور اگر گناہ معاف کر دیے جائیں تو ان کے لیے 'تکفیر' کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اَلتَّكْفِيْرُ فِي الْمَعَاصِي كَالْاِحْبَاطِ فِي الثَّوَابِ)۔ (بحوالہ ضیاء القرآن، ج ۵، ص ۳۰۴)

كَفِّرْ فعل امر ہے۔ تو دور کر۔ ﴿رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ﴾ (3/آل عمران:193)''اے ہمارے رب تو بخش دے ہمارے لئے ہمارے گناہوں کو اور تو دور کر دے ہم سے ہماری برائیوں کو اور تو موت دے ہم کو نیک لوگوں کے ساتھ۔''

كَفَّارَةٌ کفارہ کے لغوی معنی ہیں ''چھپانے والی چیز'' جو چیز گناہ کو دور کر دے اور اسے چھپا دے، کفارہ کہلاتی ہے یعنی گناہ کا شرعی اتار۔ کسی نیکی کو گناہ کا ''کفارہ'' قرار دینے کا مطلب ہوتا ہے کہ یہ نیکی اس گناہ پر چھا جائے اور اسے ڈھانپ لے، جیسے کسی دیوار پر داغ لگ جائے اور اس پر سفیدی پھیر کر اسے مٹا دیا جائے۔ نوٹ: کفارہ گناہ سے متعلق ہوتا ہے۔ جبکہ فِدْيَةٌ، عبادت میں کوتاہی سے متعلق ہوتا ہے۔ (واللہ اعلم) ﴿ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ﴾ (5/المائدۃ:89)''یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے جب کہ تم قسم کھا کر توڑ دو۔''

س و ی

(س) **سَوِيَ، سَوَاءً** ہموار ہونا۔ حالت یا مقدار میں برابر ہونا۔ درمیان میں ہونا۔ درست ہونا۔ قرآن مجید میں ثلاثی مجرد سے فعل استعمال نہیں ہوا۔ البتہ اس کا مصدر سَوَاءٌ آیت زیر مطالعہ میں استعمال ہوا ہے۔

سَوَاءٌ مصدر کے علاوہ اسم ذات بھی ہے۔ (۱) برابر۔ ﴿وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً﴾(4/النساء:89) ''یہ لوگ تو دل سے چاہتے ہیں کہ تم بھی کفر کرو جیسے یہ لوگ کفر کر رہے ہیں تا کہ تم (سب) برابر ہو جاؤ۔'' (ترجمہ ماجدیؒ) ﴿قُلْ يٰاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ ﴾(3/آل عمران:64)''تو کہہ اے اہل کتاب آؤ ایک بات کی طرف جو برابر ہے ہم میں اور تم میں۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ) ﴿فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ﴾ (8/الانفال:58)''تو پھینک دے ان کا عہد ان کی طرف ایسی طرح پر کہ ہو جاؤ تم اور وہ برابر۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ) (۲) کسی چیز کا درمیان یا وسط۔ ﴿وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴾(2/البقرہ:108)''اور جو تبدیل کرتا ہے کفر کو ایمان کے بدلے تو وہ بھٹک گیا ہے راستہ کے درمیان سے یعنی سیدھے راستے سے۔'' ﴿فَاطَّلَعَ فَرَاٰهُ فِيْ سَوَآءِ الْجَحِيْمِ ﴾(37/الصافات:55)''پس اس نے جھانکا تو اس نے دیکھا اس کو بھڑکتی آگ کے وسط میں۔'' (۳) پورا، تمام۔ ﴿وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِيْهَا وَقَدَّرَ فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا فِيْٓ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ سَوَآءً

لِّلسَّآىِٕلِيْنَ ﴿١٠﴾ ﴾(41/حم السجدۃ:10)''اور اُسی نے زمین کے اوپر پہاڑ بنادیے اور اُس (زمین) میں فائدے کی چیزیں رکھ دیں اور اُسی میں اُس (پر رہنے والوں) کی غذائیں رکھ دیں (یہ سب) چار دن میں پورے ہیں پوچھنے والوں کے لیے۔''(ترجمہ ماجدیؒ)۔ اور حضرت شیخ الہندؒ سَوَآءً لِّلسَّآىِٕلِيْنَ کا ترجمہ کرتے ہیں ''پورا ہوا پوچھنے والوں کو'' اور پھر حاشیے میں فرماتے ہیں: ''یعنی یہ سب کام چار دن میں ہوا۔ دو روز میں زمین پیدا کی گئی اور دو روز میں اس کے متعلقات کا بندوبست ہوا۔ جو پوچھے یا پوچھنے کا ارادہ رکھتا ہے اُسے بتلا دو کہ یہ سب مل کر پورے چار دن ہوئے بدون کسر اور کمی وبیشی کے۔ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: یعنی (پوچھنے والوں کا) جواب پورا ہوا'' نوٹ: نہ اِس کا تثنیہ بنایا جاتا ہے اور نہ جمع۔

سَوِیٌّ — **فَعِيْلٌ** کے وزن پر صفت ہے۔ ہر لحاظ سے کمی یا زیادتی سے پاک۔ سیدھا۔ کامل۔ درمیانی۔ ﴿ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا ﴿١٠﴾ ﴾(19/مریم:10)''اس نے یعنی اللہ تعالیٰ نے کہا تیری نشانی ہے کہ تو کلام نہیں کرے گا لوگوں سے تین کامل راتیں یعنی تین رات اور دن۔'' یا ''(اللہ نے) فرمایا تمہارے لیے نشان یہ ہے کہ تم لوگوں سے تین راتیں نہ بول سکو گے درآنحالیکہ تم تندرست ہو گے۔''(ترجمہ ماجدیؒ)

سُوًی — صاف، ہموار، درمیانی۔ جس چیز کی دونوں طرفیں برابر ہوں۔ یہ صفت بھی ہے، ظرف بھی ہے اور مصدر بھی۔ ﴿ فَلَنَاْتِيَنَّكَ بِسِحْرٍ مِّثْلِهٖ فَاجْعَلْ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكَ مَوْعِدًا لَّا نُخْلِفُهٗ نَحْنُ وَ لَاۤ اَنْتَ مَكَانًا سُوًى ﴿٥٨﴾ ﴾ (20/طٰہٰ:58)''سو ہم بھی لائیں گے تیرے مقابلے میں ایک ایسا ہی جادو سو ٹھہرا لے ہمارے اور اپنے بیچ میں ایک وعدہ نہ ہم خلاف کریں گے اُس کا اور نہ تو ایک میدان صاف میں۔''(ترجمہ شیخ الہندؒ)۔ آیت میں مَكَانًا سُوًى کے بارے میں صاحبؒ احسن البیان لکھتے ہیں: ''صاف ہموار جگہ، جہاں ہونے والے مقابلے کو ہر شخص آسانی سے دیکھ سکے یا ایسی برابر کی جگہ، جہاں فریقین سہولت سے پہنچ سکیں۔''(احسن البیان، ص ۸۶۳)

(تفعیل) **تَسْوِيَةٌ** — کسی چیز کو کمی یا زیادتی سے پاک کرنا۔ ہر لحاظ سے مناسب وموزوں بنانا یعنی نوک پلک درست کرنا۔ ہموار یا برابر کرنا۔ ﴿ الَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى ﴿٢﴾ ﴾ (87/الاعلیٰ:2)''جس نے پیدا کیا پھر نوک پلک درست کی۔'' ﴿ رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا ﴿٢٨﴾ ﴾(79/النٰزعٰت:28)''اس نے بلند کیا اس کی یعنی آسمان کی چھت کو پھر اسے درست کیا۔'' ﴿ اِذْ نُسَوِّيْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٩٨﴾ ﴾(26/الشعراء:98)''جب ہم تم کو برابر کرتے تھے پروردگار عالم کے۔''(ترجمہ شیخ الہندؒ)

تُسَوّٰى — مضارع مجہول کا صیغہ ہے۔ ﴿ يَوْمَىِٕذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ عَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ ﴾ (4/النساء:42)''جن لوگوں نے کفر کیا ہے اور پیغمبر کی نافرمانی کی ہے وہ اُس روز تمنا کریں گے کہ کاش زمین اُن پر برابر کر دی جائے۔''(ترجمہ ماجدیؒ)

(مفاعلہ) **مُسَاوَاةٌ** — دو یا زیادہ چیزوں کو برابر کرنا۔ ﴿ حَتّٰۤى اِذَا سَاوٰى بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ قَالَ انْفُخُوْا ﴾(18/الکہف:96)''یہاں تک کہ جب اس نے برابر کر دیا پہاڑوں کے دونوں کناروں کے درمیان کو، تو اس نے کہا تم لوگ پھونکو۔''

(افتعال) **اِسْتِوَاءٌ** — (1) استویٰ کے بعد اگر دو ''فاعل'' آئیں (یعنی اگر معطوف علیہ اور معطوف مل کر فاعل ہو) تو اس کے معنی ہوتے ہیں دونوں میں برابری کرنا۔ ﴿ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَ الْبَصِيْرُ اَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمٰتُ وَ النُّوْرُ ﴾ (13/الرعد:16)''آپ ﷺ کہیے کیا برابر ہوتے ہیں اندھا اور بصیرت والا یا کیا برابر ہوتے ہیں اندھیرے اور نور۔''
(2) اگر دو فاعل نہ ہوں، یعنی ایک ہی فاعل ہو، تو پھر اس کے معنی سنبھلنے، درست ہونے اور سیدھا ہونے کے ہوتے ہیں

جیسے فرمایا: ﴿ ذُوْ مِرَّةٍ ؕ فَاسْتَوٰى ۙ وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ؕ ﴾ (53/النجم:6،7) ''زورآور نے، پھر سیدھا بیٹھا اور وہ تھا اونچے کنارہ پر آسمان کے۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ) یا فرمایا: ﴿ وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰٓى ﴾ (28/القصص:14) ''اور جب پہنچ گیا اپنے زور پر اور سنبھل گیا۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)

(3) اِسْتَوٰى اِلٰى ۔ ارادہ کرنا۔ متوجہ ہونا۔ قصد کرنا۔ ﴿ ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ ﴾ (41/حٰمٓ السجدہ:11) ''پھر وہ متوجہ ہوا آسمان کی طرف اس حال میں کہ وہ دھواں تھا۔''

(4) اِسْتَوٰى عَلٰى ۔ غالب آنا۔ قرار پکڑنا۔ قائم ہونا۔ جم کر بیٹھنا۔ ﴿ اِۨلَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۚ ﴾ (25/الفرقان:59) ''جس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے، چھ دنوں میں پھر وہ قائم ہوا عرش پر۔'' جب اللہ تعالیٰ کے لیے استوی علی استعمال ہو تو مطلب ہوتا ہے کہ تخت حکومت پر اس طرح قابض ہونا کہ اس کا کوئی حصہ اور گوشہ اقتدار سے باہر نہ رہے اور قبضہ اور تسلط میں کسی قسم کی مزاحمت اور گڑ بڑی نہ پائی جائے۔ سب کام اور انتظام برابر ہو۔ (تلخیص از تفسیر عثمانی، ص ۲۰۹)۔ ﴿ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ ﴾ (11/ھود:44) ''اور قرار پکڑا اُس کشتی نے جودی پہاڑ پر یعنی وہ کشتی جودی پہاڑ پر ٹھہر گئی۔'' 'جم کر بیٹھنے' کے معنوں میں یہ آیت ہے۔ ﴿ لِتَسْتَوٗا عَلٰى ظُهُوْرِهٖ ثُمَّ تَذْكُرُوْا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ اِذَا اسْتَوَيْتُمْ عَلَيْهِ ﴾ (43/الزخرف:13) ''تاکہ تم اُن کی پیٹھ پر جم کر بیٹھو پھر جب تم اُس پر جم کر بیٹھ چکو تو اپنے پروردگار کی اِس نعمت کو یاد کرو۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)

ن ذ ر

(ض۔ن) نَذْرًا: کسی حادثے کی وجہ سے کسی غیر واجب چیز کو اپنے اوپر واجب کر لینا۔ منت ماننا (امام راغبؒ)۔ ﴿ اِنِّيْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا ﴾ (19/مریم:26) ''میں نے منت مانی رحمٰن کے لئے ایک روزے کی۔''

نَذْرٌ: ج: نُذُوْرٌ ۔ اسم ذات ہے۔ منت۔ نذر۔ ''نذر یہ ہے کہ آدمی اپنی کسی مراد کے برآنے پر کسی ایسے خرچ یا کسی ایسی خدمت کو اپنے اُوپر لازم کر لے، جو اس کے ذمے فرض نہ ہو۔ اگر یہ مراد کسی حلال و جائز امر کی ہو، اور اللہ سے مانگی گئی ہو، اور اس کے برآنے پر جو عمل کرنے کا عہد آدمی نے کیا ہے، وہ اللہ ہی کے لیے ہو تو ایسی نذر اللہ کی اطاعت میں ہے اور اس کا پورا کرنا اجر و ثواب کا موجب ہے۔ اگر یہ صورت نہ ہو تو ایسی نذر کا ماننا معصیت اور اس کا پورا کرنا موجب عذاب ہے۔'' (تفہیم القرآن، ج ا ص ۲۰۸) ﴿ وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ ؕ ﴾ (2/البقرہ:270) ''اور جو تم لوگ انفاق کرو کسی خرچے میں سے یا جو تم لوگ منت مانو کسی منت میں سے تو یقیناً اللہ اس کو جانتا ہے۔'' ﴿ ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ۝ ﴾ (22/الحج:29) ''پھر ان لوگوں کو چاہیے کہ اتاریں اپنے میل کچیل اور پوری کریں اپنی منتیں اور طواف کریں قدیم گھر کا یعنی خانہ کعبہ کا۔''

(س) نَذَرًا: کسی متوقع خطرہ سے خبردار ہونا۔ چوکنا ہونا۔ باب سمع سے فعل قرآن مجید میں استعمال نہیں ہوا۔

(افعال) اِنْذَارًا، نُذُرًا، نُذْرًا: کسی متوقع خطرے سے خبردار کرنا۔ وارننگ دینا۔ ''ایسی خبر دینا جس سے خوف پیدا ہو۔ اردو میں اس کا ترجمہ ڈرانے سے کیا جاتا ہے لیکن مطلقاً ڈرانے کو انذار نہیں کہتے۔ بلکہ ایسا ڈرانا جو شفقت اور رحمت کی بناء پر ہو۔ جیسے والدین اولاد کو

آگ سے، سانپ وغیرہ سے ڈراتے ہیں۔ اس میں شفقت اور ہمدردی کا پہلو ہوتا ہے۔ جبکہ ڈاکو اور چور جو انسانوں کو ڈراتے ہیں اس میں شفقت کا پہلو نہیں ہوتا اس لیے ان کے ڈرانے کو انذار اور ان لوگوں کو نذیر نہیں کہا جاتا۔ جبکہ انبیاء کو خصوصیت کے ساتھ نذیر کا لقب دیا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ آئندہ آنے والے مصائب سے از راہِ شفقت لوگوں کو ڈراتے ہیں۔'' (معارف القرآن)۔ پیر کرم شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں: ''نَذر کے مادہ کا اطلاق اس ڈرانے پر ہوتا ہے جس میں کم از کم دو خصوصیتیں ہوں۔ ایک تو وہ ڈرانا بروقت ہو۔ یوں نہیں کہ جب پتھر آسمان سے برسنے شروع ہو جائیں تو خطرہ کا الارم بجنے لگے۔ دوسری بات یہ ہے کہ انذار سے مقصد صرف عذاب کی خبر دینا نہیں ہوتا بلکہ اصل مقصد اس شخص کی خیر خواہی ہوتا ہے کہ وہ اپنے بچاؤ کا انتظام کرلے۔ لسان العرب میں ہے کہ عرب کہتے ہیں: اَنْذَرْتُ الْقَوْمَ مَسِيْرَ الْعَدُوِّ اِلَيْهِمْ فَنَذَرُوْا اَىْ عَلَّمْتُهُمْ ذٰلِكَ فَعَلِمُوْا وَ تَحَرَّزُوْا یعنی میں نے قوم کو دشمن کے حملے سے خبردار کیا۔ پس اُنہوں نے اپنا بچاؤ کر لیا۔'' (ضیاء القرآن، ج ۴،ص ۳۳۵)۔ ﴿وَ اُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَ مَنْۢ بَلَغَ﴾ (6/الانعام:19) ''اور وحی کیا گیا میری طرف یہ قرآن تاکہ میں خبردار کروں تم لوگوں کو اس کے ذریعہ سے اور اس کو جس کو وہ پہنچے۔''

اَنْذِرْ ج: اَنْذِرُوْا۔ فعل امر ہے۔ تو خبردار کر۔ ﴿وَ اَنْذِرِ النَّاسَ يَوْمَ يَاْتِيْهِمُ الْعَذَابُ﴾ (14/ابراہیم:44) ''اور خبردار کیجئے لوگوں کو اس دن سے جب آئے گا ان کے پاس عذاب۔''

مُنْذِرٌ ج: مُنْذِرُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ خبردار کرنے والا۔ ڈرانے والا۔ صاحبؒ لغات القرآن فرماتے ہیں: ''ہر پیغمبر عذابِ الٰہی سے سرکشوں اور نافرمانوں کو ڈراتا ہے اس لیے ہر پیغمبر کو منذر کہا جاتا ہے اور چونکہ ہر پیغمبر کے ڈرانے کا اصل مقصد ہدایت کرنا ہوتا ہے اس لیے بعض ترجمہ کرنے والوں نے منذر کا ترجمہ ہادی بھی کیا ہے۔'' (لغات القرآن، ج ۵،ص: ۴۵۶) ﴿اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّ لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ﴾ (13/الرعد:7) ''کچھ نہیں سوائے اس کے کہ آپ ﷺ ایک خبردار کرنے والے ہیں اور ہر ایک قوم کیلئے ایک ہدایت دینے والا ہے۔''

مُنْذَرٌ اسم المفعول ہے۔ جس کو خبردار کیا گیا۔ جو ڈرایا گیا یعنی جس کو سرکشی اور نافرمانی کی سزا سے ڈرایا گیا۔ ﴿وَ اَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ﴾ (10/یونس:73) ''اور ہم نے ڈبو یا ان لوگوں کو جنہوں نے جھٹلایا ہماری نشانیوں کو، تو دیکھ کیسا تھا خبردار کئے جانے والوں کا انجام۔''

نَذِيْرٌ ج: نُذُرٌ۔ فَعِيْلٌ کا وزن ہے اسم الفاعل کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ لیکن اس کے معنی خبردار ہونے والا کے بجائے خبردار کرنے والا، ڈرانے والا ہیں۔ نوٹ: صاحبؒ لغات القرآن فرماتے ہیں: ''یاد رکھو کہ قرآن مجید میں ہر جگہ نذیر یعنی ڈرانے والے سے مراد ہے نافرمانوں کو اللہ کے عذاب سے ڈرانے والا۔'' (لغات القرآن، ج:۶،ص: ۴۰) ﴿وَ مَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا﴾ (34/سبا:28) ''اور ہم نے نہیں بھیجا آپ ﷺ کو مگر تمام انسانوں کے لئے خوشخبری دینے والا اور خبردار کرنے والا ہوتے ہوئے۔'' ﴿وَ قَدْ خَلَتِ النُّذُرُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖٓ﴾ (46/الاحقاف:21) ''اور گزر چکے ہیں خبردار کرنے والے ان کے سامنے اور ان کے پیچھے۔''

اَمْ حرف عطف ہے اس کی دو قسمیں ہیں: (۱) متصل (۲) منقطع۔

(۱) متصل: وہ ہے جس سے پہلے ہمزۂ تسویہ (سَوَاءٌ کا ہمزہ) آئے جیسے سَوَآءٌ عَلَيۡهِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَهُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡهُمۡ ۔ایسی صورت میں 'اَ' کے معنی 'خواہ' یا 'چاہے' کے ہوتے ہیں۔ اور اَمۡ کے معنی 'یا' کے ہوتے ہیں۔ کسی جملہ میں ءَ کے بعد اگر اَمۡ لانا ہو تو، زیادہ تر ءَ کے بعد فعل ماضی لاتے ہیں اور اَمۡ کے بعد فعل مضارع لاتے ہیں۔ پھر مضارع میں ماضی کا مفہوم پیدا کرنے کے لئے اس پر لَمۡ داخل کرتے ہیں۔ یا اس سے پہلے ایسا ہمزہ استفہام آتا ہے جس کو اَمۡ کے ساتھ ملانے سے کسی چیز کا تعین مقصود ہو۔ جیسے أَزَيۡدٌ عِنۡدَكَ اَمۡ عَمۡرٌو۔ ایسی صورت میں اَمۡ کے معنی اَوۡ (یا) کے ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے اسے متصل کہتے ہیں کیونکہ اِس سے ماقبل اور مابعد آپس میں ملے ہوتے ہیں۔

(۲) منقطع: یعنی وہ جو متصل کے خلاف ہو۔ اس صورت میں اَمۡ کے وہ معنی جو اِس سے کبھی جدا نہیں ہوتے 'اِضۡرَابٌ' ہے یعنی پہلی بات سے اعراض کرنا تبھی یہ منقطع کہلاتا ہے۔ ایسے اَمۡ کے کئی معنی ہوتے ہیں مثلاً، یا، خواہ، کیا، بَلۡ (بلکہ)۔ بَلۡ اور ہمزہ (بَلۡ اَ) استفہام کے لیے آتا ہے۔ عموماً اس سے پہلے کوئی سوال ہوتا ہے۔ جس کو چھوڑ کر اَمۡ (بمعنی بَلۡ اَ) سے کوئی دوسرا سوال پوچھا جاتا ہے مثلاً ﴿ اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تَدۡخُلُوا الۡجَنَّةَ ﴾ یا ﴿ اَمۡ حَسِبۡتَ اَنَّ اَصۡحٰبَ الۡكَهۡفِ وَالرَّقِيۡمِ ۙ كَانُوۡا مِنۡ اٰيٰتِنَا عَجَبًا ۝ ﴾۔ اَمۡ بعض دفعہ زائدہ بھی آتا ہے۔

يُؤۡمِنُوۡنَ (ء م ن): البقرۃ آیت 3 دیکھیں۔

ترکیب اِنَّ حرف مشبہ بالفعل۔ الَّذِيۡنَ، اسم موصول اور كَفَرُوۡا، اس کا صلہ۔ صلہ اور موصول مل کر اسم ہوئے اِنَّ کے۔ آگے جملہ اسمیہ سَوَآءٌ عَلَيۡهِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَهُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡهُمۡ تک خبر اوّل ہے اِنَّ کی۔ اس میں سَوَآءٌ مبتدا ہے اور عَلَيۡهِمۡ جار مجرور متعلق ہیں سَوَآءٌ سے۔ اَ۔ ہمزہ تسویہ ہے۔ اَنۡذَرۡتَ فعل اور اس میں شامل ضمیر اُس کا فاعل اور هُمۡ اس کا مفعول بہ۔ اَمۡ حرف عطف ہے اور جملہ لَمۡ تُنۡذِرۡهُمۡ عطف ہے اَنۡذَرۡتَهُمۡ پر اور جملہ ءَاَنۡذَرۡتَهُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡهُمۡ، سَوَآءٌ کی خبر ہے اور محلاً حالت رفع میں ہے۔ آگے جملہ فعلیہ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ خبر ثانی ہے اِنَّ کی۔ اس میں لَا نفی کا ہے۔ اس آیت کی اور تراکیب بھی کی گئی ہیں۔

ترجمہ
البقرۃ:6

ءَاَنۡذَرۡتَهُمۡ	سَوَآءٌ عَلَيۡهِمۡ	الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا	اِنَّ
خواہ آپ ﷺ خبردار کریں ان کو	برابر ہے ان پر	جن لوگوں نے انکار کیا	یقیناً

لَا يُؤۡمِنُوۡنَ ۝	اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡهُمۡ
وہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے	یا آپ ﷺ خبردار نہ کریں ان کو

نوٹ:1 کفر: حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ ''کفر'' کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''کفر کے لفظی معنی چھپانے کے ہیں، ناشکری کو بھی کفر اس لیے کہتے ہیں کہ محسن کے احسان کو چھپانا ہے (مطلب انسان اپنے محسن کے احسان کو چھپاتا ہے)۔ اصطلاح شریعت میں جن چیزوں پر ایمان لانا فرض ہے ان میں سے کسی چیز کے انکار کا نام کفر ہے، مثلاً ایمان کا خلاصہ یہ ہے کہ رسول کریم ﷺ جو کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لائے ہیں اور اس کا ثبوت قطعی و یقینی ہے اُن سب چیزوں کی دل سے تصدیق کرنا، اور حق سمجھنا، اس لیے جو شخص رسول کریم ﷺ کی اُن تعلیمات میں سے جن کا ثبوت یقینی اور قطعی ہے کسی ایک کو بھی حق نہ سمجھے اور اس کی تصدیق نہ کرے وہ کافر کہلائے گا'' (معارف القرآن، ج ۱، ص ۱۱۷)۔

حضرت مولانا مودودیؒ نے ''کفر'' کی وضاحت نہایت خوبصورت انداز میں کی ہے، فرماتے ہیں: ''کفر کے اصلی معنی چھپانے کے ہیں۔ اسی سے انکار کا مفہوم پیدا ہوا اور یہ لفظ ایمان کے مقابلے میں بولا جانے لگا۔ ایمان کے معنی ہیں ماننا، قبول کرنا، تسلیم کر لینا۔ اس کے برعکس کفر کے معنی ہیں نہ ماننا، رد کر دینا، انکار کرنا۔ قرآن کی رُو سے کفر کے رویہ کی مختلف صورتیں ہیں:

ایک یہ کہ انسان سرے سے خدا ہی کو نہ مانے، یا اُس کے اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم نہ کرے اور اس کو اپنا اور ساری کائنات کا مالک اور معبود ماننے سے انکار کر دے، یا اسے واحد مالک اور معبود نہ مانے۔

دوسرے یہ کہ اللہ کو تو مانے مگر اُس کے احکام اور اُس کی ہدایات کو واحد منبع علم و قانون تسلیم کرنے سے انکار کر دے۔

تیسرے یہ کہ اُصولاً اس بات کو بھی تسلیم کر لے کہ اسے اللہ ہی کی ہدایت پر چلنا چاہیے، مگر اللہ اپنی ہدایات اور اپنے احکام پہنچانے کے لیے جن پیغمبروں کو واسطہ بناتا ہے، انہیں تسلیم نہ کرے۔

چوتھے یہ کہ پیغمبروں کے درمیان تفریق کرے اور اپنی پسند یا اپنے تعصّبات کی بنا پر ان میں سے کسی کو مانے اور کسی کو نہ مانے۔

پانچویں یہ کہ پیغمبروں نے خدا کی طرف سے عقائد، اخلاق اور قوانینِ حیات کے متعلق جو تعلیمات بیان کی ہیں اُن کو یا اُن میں سے کسی چیز کو قبول نہ کرے۔

چھٹے یہ کہ نظریے کے طور پر تو ان سب چیزوں کو مان لے مگر عملاً احکامِ الٰہی کی دانستہ نافرمانی کرے اور اس نافرمانی پر اصرار کرتا رہے، اور دنیوی زندگی میں اپنے رویے کی بنا اطاعت پر نہیں بلکہ نافرمانی ہی پر رکھے۔

یہ سب مختلف طرزِ فکر و عمل اللہ کے مقابلے میں باغیانہ ہیں اور ان میں سے ہر ایک رویے کو قرآن کفر سے تعبیر کرتا ہے۔ اس کے علاوہ بعض مقامات پر قرآن میں کفر کا لفظ کفرانِ نعمت کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے اور شکر کے مقابلے میں بولا گیا ہے۔ شکر کے معنی یہ ہیں کہ نعمت جس نے دی ہے انسان اس کا احسان مند ہو، اس کے احسان کی قدر کرے، اس کی دی ہوئی نعمت کو اسی کی رضا کے مطابق استعمال کرے، اور اُس کا دل اپنے محسن کے لیے وفاداری کے جذبے سے لبریز ہو۔ اس کے مقابلے میں کفر یا کفرانِ نعمت یہ ہے کہ آدمی یا تو اپنے محسن کا احسان ہی نہ مانے اور اسے اپنی قابلیت یا کسی غیر کی عنایت یا سفارش کا نتیجہ سمجھے، یا اُس کی دی ہوئی نعمت کی ناقدری کرے اور اسے ضائع کر دے، یا اُس کی نعمت کو اس کی رضا کے خلاف استعمال کرے، یا اس کے احسانات کے باوجود اس کے ساتھ غدر اور بے وفائی کرے۔ اس نوع کے کفر کو ہماری زبان میں بالعموم احسان فراموشی، نمک حرامی، غداری اور ناشکرے پن کے الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ (تفہیم القرآن، ج ۱، ص ۱۲۹)

آیت:7

﴿ خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوۡبِہِمۡ وَ عَلٰی سَمۡعِہِمۡ ؕ وَ عَلٰۤی اَبۡصَارِہِمۡ غِشَاوَۃٌ ۫ وَّ لَہُمۡ عَذَابٌ عَظِیۡمٌ ٪﴾ ⑦

خ ت م

(ض) خَتۡمًا (1) مہر لگانا تاکہ اندر کی چیز باہر اور باہر کی چیز اندر نہ جاسکے یعنی محفوظ کر لینا، بند کر دینا۔ اس کے ساتھ عَلٰی کا صلہ استعمال ہوتا ہے۔ ﴿ اَلۡیَوۡمَ نَخۡتِمُ عَلٰۤی اَفۡوَاہِہِمۡ ﴾ (36/یٰسین:65) ''اس دن ہم مہر لگا دیں گے ان کے مونہوں پر۔''
(2) کسی کام سے فارغ ہونا، ختم کرنا۔
(3) کسی چیز کے آخر تک پہنچ جانا۔ اسی معنی میں ختم قرآن بولتے ہیں یعنی قرآن کو آخر تک پڑھ لینا۔

حضرت مولانا مودودیؒ ''ختم'' کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''عربی لغت میں محاورے کی رو سے ''ختم'' کے معنی مہر لگانے، بند کرنے، آخر تک پہنچ جانے اور کسی کام کو پورا کر کے فارغ ہو جانے کے ہیں۔ خَتَمَ الۡعَمَلَ کے معنی میں فَرَغَ مِنَ الۡعَمَلِ ''کام سے فارغ ہو گیا''۔ خَتَمَ الۡاِنَاءَ کے معنی ہیں ''برتن کا منہ بند کر دیا اور اس پر مہر لگا دی تاکہ نہ کوئی چیز اس میں سے نکلے اور نہ کچھ اس کے اندر داخل ہو''۔ خَتَمَ الۡکِتَابَ کے معنی ہیں ''خط بند کر کے اس پر مہر لگا دی تاکہ خط محفوظ ہو جائے''۔ خَتَمَ عَلَی الۡقَلۡبِ ''دل پر مہر لگا دی کہ نہ کوئی بات اس کی سمجھ میں آئے، نہ پہلے سے جمی ہوئی کوئی بات اس میں سے نکل سکے''۔ خِتَامُ کُلِّ مَشۡرُوۡبٍ ''وہ مزا جو کسی چیز کو پینے کے بعد آخر میں محسوس ہوتا ہے''۔ خَاتِمَۃُ کُلِّ شَیۡءٍ، عَاقِبَتُہٗ وَ اٰخِرَتُہٗ، ''ہر چیز کے خاتمہ سے مراد ہے اس کی عاقبت اور آخرت''۔ خَتَمَ الشَّیۡءَ،

بَلَغَ اٰخِرَہٗ''کسی چیز کوختم کرنے کا مطلب ہے اس کے آخر تک پہنچ جانا۔''اسی معنی میں ختم قرآن بولتے ہیں اور اسی معنی میں سورتوں کی آخری آیات کو خواتیم کہا جاتا ہے۔ خَاتَمُ الْقَوْمِ، اٰخِرُھُمْ''خاتم القوم سے مراد ہے قبیلے کا آخری آدمی۔'' (ملاحظہ ہو لسان العرب، قاموس اور اقرب الموارد) (تفہیم القرآن، ج ۴، ص ۱۳۹)

خِتَامٌ اسم ذات ہے۔وہ چیز جس سے مہر لگائی جائے جیسے لاکھ، گیلا آٹا، گیلی مٹی وغیرہ۔ ﴿يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ ۝ خِتٰمُهٗ مِسْكٌ ۭ وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ ۝﴾(83/المطففین:25-26)''ان کو پلائی جائے گی خالص شراب مہر لگی ہوئی۔اس کی مہر مشک ہے اور چاہیے کہ اس میں جان کھپائیں جان کھپانے والے۔''

خَاتَمٌ اس کے تین معنی ہیں (۱) مہر (۲) ختم کرنے والا (۳) آخری۔ ﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ۭ﴾(33/الاحزاب:40)''اور نہیں ہیں محمد ﷺ کسی ایک کے باپ، تمہارے مردوں میں سے، اور لیکن اللہ کے رسول ہیں اور نبیوں کے سلسلہ کو ختم کرنے والے ہیں۔''اس آیت میں خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ کے عام طور پر تین طرح سے ترجمے کیے گئے ہیں مثلاً (۱) حضرت شیخ الہندؒ فرماتے ہیں:''اور مہر سب نبیوں پر۔''یعنی آپ ﷺ کی تشریف آوری سے نبیوں کے سلسلے پر مہر لگ گئی۔ اب کسی کو نبوت نہیں دی جائے گی۔ بس جس کو ملنی تھی مل چکی۔ یا دوسرے لفظوں میں حضور ﷺ کی تشریف آوری کے بعد انبیاء کی آمد کا سلسلہ بند ہو گیا اور اس پر مہر لگا دی گئی تاکہ کوئی کذّاب، دجّال اس میں داخل نہ ہو سکے۔ (۲) تفسیر احسن البیان میں اس کا ترجمہ''تمام نبیوں کے ختم کرنے والے'' سے کیا گیا ہے۔ یعنی انبیاء کے سلسلے کو ختم کرنے والے۔ (۳) حضرت مولانا عبدالماجد دریا بادیؒ فرماتے ہیں:''اور (سب) نبیوں کے ختم پر ہیں'' خَاتَمٌ اور خَاتِمٌ، دونوں کے معنی لغت میں آخر کے ہیں۔قوم کے آخری فرد کو خِتَام، خَاتَم اور خَاتِم کہا جاتا ہے۔کسی چیز کے آخر کو خاتمۃ الشئ کہتے ہیں۔اسی مناسبت سے حضور ﷺ کو خاتم النبین کہا جاتا ہے۔کہ وہ تمام نبیوں سے آخر میں تشریف لائے۔(واللہ اعلم)

مَخْتُوْمٌ اسم المفعول ہے۔جس پر مہر لگا دی جائے۔مہر لگا ہوا۔ ﴿يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ ۝﴾(83/المطففین:25)''اُن کو پلائی جائے گی خالص شراب مہر لگی ہوئی۔''

ق ل ب

(ض) **قَلْبًا** کسی چیز کو ایک حالت یا رخ سے دوسری طرف پھیرنا، پلٹنا یا موڑنا۔ ﴿وَاِلَيْهِ تُقْلَبُوْنَ ۝﴾(29/العنکبوت:21)''اور اس کی طرف ہی تم لوگ پلٹائے جاؤ گے۔''عربی زبان میں قَلْبُ الْاَمْرِ کا مطلب ہوتا ہے کسی معاملے کو الٹ پلٹ کر دیکھنا اور جانچنا کہ اس کا ہر پہلو صاف ظاہر ہو جائے۔

قَلْبٌ ج: قُلُوْبٌ۔ اسم ذات ہے۔دل (کیونکہ یہ ہر لحہ ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف پلٹتا رہتا ہے۔) مولانا عبدالماجد دریا بادیؒ فرماتے ہیں:''دل سے مراد سینہ کے اندر کا وہ مضغۂ گوشت نہیں جو طبی اصطلاح میں دل کہلاتا ہے۔بلکہ وہ دل مراد ہے جو محاورۂ زبان میں احساس، عقل، ارادہ سب کا مرکز ہے۔انسانی بول چال میں دل اسی کو کہا جاتا ہے اور افعال ارادی کا صدور اسی سے ہوتا ہے۔توریت، انجیل اور دوسرے صحیفے سب میں یہی محاورہ استعمال کیا گیا ہے۔'' ﴿وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ ۭ﴾(64/التغابن:11)''اور جو ایمان لاتا ہے اللہ پر تو وہ ہدایت دیتا ہے اس کے دل کو۔'' ﴿لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا﴾(7/الاعراف:179)''ان کے دل ہیں (لیکن) وہ لوگ سمجھتے نہیں ان سے۔''

(تفعیل) تَقْلِيْبًا کسی چیز کو بار بار پلٹنا (اس میں مبالغے کا مطلب ہوتا ہے)۔﴿وَ نُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَ ذَاتَ الشِّمَالِ﴾ (18/الکھف:18) ''اور ہم بار بار پلٹتے ہیں ان کو دائیں جانب اور بائیں جانب یعنی ہم ان کی کروٹیں بدلتے رہتے ہیں۔''

(تفعّل) تَقَلُّبًا کسی چیز کا خود بار بار پلٹنا، گھومنا پھرنا۔﴿قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ﴾ (2/البقرہ:144) ''ہم نے دیکھ لیا ہے آپ ﷺ کے چہرے کا بار بار پلٹنا آسمان میں۔'' ﴿لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ ﴾ (3/آل عمران:196) ''ہرگز دھوکا نہ دے آپ ﷺ کو شہروں میں ان لوگوں کا گھومنا پھرنا جنہوں نے کفر کیا۔''

مُتَقَلَّبٌ اسم المفعول ہے جو بطور اسم ظرف استعمال ہوتا ہے۔ گھومنے پھرنے کی جگہ۔﴿وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ مُتَقَلَّبَكُمْ وَ مَثْوٰىكُمْ ﴾ (47/محمد:19) ''اللہ جانتا ہے تمہارے گھومنے پھرنے کی جگہ کو اور تمہارے واپس ہونے کی جگہ کو۔''

(انفعال) اِنْقِلَابًا کسی چیز کا خود ایک حالت یا رخ سے دوسری طرف پھرنا یا پلٹنا۔﴿اَفَا۟ئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ﴾ (3/آل عمران:144) ''تو کیا اگر وہ یعنی حضور ﷺ انتقال کر جائیں یا قتل کئے جائیں تو تم لوگ الٹے پھر جاؤ گے اپنی ایڑیوں کے بل۔''

مُنْقَلِبٌ ج: مُنْقَلِبُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ پھرنے والا۔ پلٹنے والا۔﴿قَالُوْۤا اِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ﴾ (7/الاعراف:125) ''ان لوگوں نے کہا بیشک ہم اپنے رب کی طرف پلٹنے والے ہیں۔''

مُنْقَلَبٌ اسم المفعول ہے جو بطور اسم ظرف استعمال ہوتا ہے پلٹنے کی جگہ۔﴿وَ سَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْۤا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ﴾ (26/الشعراء:227) ''اور جان لیں گے وہ لوگ جنہوں نے ظلم کیا کہ کون سی پلٹنے کی جگہ وہ لوگ پلٹیں گے۔''

س م ع

(س) سَمَاعًا ، سَمْعًا سننا۔ کسی بات کو سن کر سمجھنا۔﴿رَبَّنَاۤ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ﴾ (3/آل عمران:193) ''اے ہمارے رب بیشک ہم نے سنا ایک ندا دینے والے کو کہ وہ ندا دیتا ہے ایمان کیلئے۔''

نوٹ: سَمْعٌ مصدر بھی ہے اور اسم بھی۔ بطور مصدر استعمال ہو تو مطلب ہوتا ہے سننا۔ بطور اسم یہ لفظ ''سننے کی قوت'' اور ''کان'' دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ سَمْعٌ بمعنی کان، واحد اور جمع دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

اِسْمَعْ ج: اِسْمَعُوْا۔ فعل امر ہے۔ تو سن۔﴿خُذُوْا مَاۤ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّ اسْمَعُوْا﴾ (2/البقرہ:93) ''تم لوگ پکڑو جو ہم نے دیا تم لوگوں کو مضبوطی سے اور تم لوگ سنو۔''

سَمِيْعٌ فَعِيْلٌ کا وزن ہے اسم الفاعل کے معنی میں۔ سننے والا۔﴿اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴾ (2/البقرہ:127) ''یقیناً تو ہی سننے والا جاننے والا ہے۔''

سَمَّاعٌ فَعَّالٌ کے وزن پر اسم المبالغہ ہے۔ بہت زیادہ سننے والا۔ کان دھرنے والا۔ خوب کان لگا کر سننا کبھی تو جاسوسی کے لیے ہوتا ہے، اور کبھی قبول کرنے اور ماننے کے لیے، چنانچہ سَمَّاعٌ کا استعمال جاسوس اور مطیع (ماننے والا) دونوں کے لیے ہوتا ہے۔﴿سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِيْنَ﴾ (5/المائدۃ:41) ''جاسوسی کرتے ہیں جھوٹ بولنے کے لیے، وہ جاسوس ہیں دوسری جماعت کے۔'' حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اس آیت میں سَمّٰعُوْنَ کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''سَمّٰعُوْنَ کے معنی ہیں بہت زیادہ سننے والے اور کان دھرنے والے، پھر ''بہت زیادہ سننا'' کبھی تو

جاسوسی پر اطلاق کیا جاتا ہے اور کبھی اس کے معنی ہوتے ہیں ''بہت زیادہ قبول کرنے والا'' جیسے ''سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ'' میں سننے کے معنی قبول کرنے کے ہیں۔ مترجم رحمہ اللہ نے یہاں پہلے معنی مراد لیے ہیں۔ لیکن ابن جریرؒ وغیرہ محققین نے دوسرے معنی پر حمل کیا ہے۔ ''سمّاعون للکذب'' یعنی جھوٹ اور باطل کو بہت زیادہ ماننے اور قبول کرنے والے سمّاعون لقوم اٰخرین یعنی دوسری جماعت جس نے ان کو بھیجا اور خود تمہارے پاس نہیں آئی ان کی بات بہت زیادہ ماننے والے۔'' (تفسیر عثمانیؒ ص ۱۵۱)

(افعال) اِسْمَاعًا کسی کو سنانا۔ ﴿ فَاِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ ﴾ (30/الروم:52) ''یقینا آپ ﷺ نہیں سناتے مردوں کو اور آپ ﷺ نہیں سناتے بہروں کو پکار۔''

مُسْمِعٌ اسم الفاعل ہے۔ سنانے والا۔ ﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ ﴾ (35/فاطر:22) ''بیشک اللہ سناتا ہے اسکو جس کو وہ چاہتا ہے۔ اور آپ ﷺ سنانے والے نہیں ہیں ان کو جو قبروں میں ہیں۔''

مُسْمَعٌ اسم المفعول ہے۔ جس کو سنایا جائے۔ ﴿ وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ ﴾ (4/النساء:46) ''اور سنو اور تمہیں سنوایا نہ جائے۔''

نوٹ: اِسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ: یہ محاورہ دو طرح سے بولا جاتا ہے (۱) بطور بددعا۔ یعنی تم سنو اور بہرے ہو جاؤ اور کچھ نہ سن سکو۔ (۲) بطور دعا۔ یعنی سنو اور تمہیں کوئی بری بات نہ سننی پڑے اور تو ہمیشہ غالب اور معزّز رہے۔

(تفعّل) تَسَمُّعًا سننے کی کوشش کرنا۔ کان لگانا۔ ﴿ لَا يَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ الْاَعْلٰى ﴾ (37/الصافات:8) ''وہ لوگ کان نہیں لگا سکتے عالم بالا کی طرف۔'' (يَسَّمَّعُوْنَ، اصل میں يَتَسَمَّعُوْنَ تھا۔ 'ت' 'س' سے بدل گئی اور پھر دونوں 'س' کا ادغام ہو گیا۔ یاد رہے کہ اس خصوصی قاعدے کا تعلق باب تفعّل اور تفاعل سے ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ اگر باب تفعّل اور تفاعل کے 'ف' کلمہ پر اگر مندرجہ ذیل دس حروف میں سے کوئی حرف آجائے تو ان ابواب کی 'ت' تبدیل ہو کر وہی حرف بن جاتی ہے جو 'ف' کلمہ پر آیا ہو۔ اس کے بعد ان پر ادغام کے قواعد کا اطلاق ہوتا ہے۔ وہ دس حروف یہ ہیں: ''ث، د، ذ، ز، س، ش، ص، ض، ط، ظ۔'' (اس قاعدے کی تفصیل کے لیے ''آسان عربی گرامر'' از لطف الرحمٰن خان صاحب، حصہ سوم، صفحہ ۶۴ دیکھیں)۔

(افتعال) اِسْتِمَاعًا دھیان سے سننا۔ غور سے سننا۔ ﴿ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ ؕ ﴾ (39/الزمر:18) ''جو لوگ دھیان سے سنتے ہیں بات کو پھر پیروی کرتے ہیں اس کی اچھی طرح۔''

اِسْتَمِعْ ج: اِسْتَمِعُوْا۔ فعل امر ہے۔ دھیان سے سنو۔ ﴿ وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا ﴾ (7/الاعراف:204) ''اور جب قرآن پڑھا جائے تو دھیان سے سنو اس کو اور خاموش رہو۔''

مُسْتَمِعٌ ج: مُسْتَمِعُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ دھیان سے سننے والا۔ ﴿ فَاذْهَبَا بِاٰيٰتِنَآ اِنَّا مَعَكُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ ﴾ (26/الشعراء:15) ''پس تم دونوں جاؤ ہماری نشانیوں کے ساتھ۔ بیشک ہم تمہارے ساتھ ہیں پوری طرح سننے والے ہیں۔''

ب ص ر

(ک) بَصَارَةً دیکھنا۔ دیکھ کر سمجھنا اور جاننا۔ ﴿ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ ﴾ (20/طٰہٰ:96) ''میں نے دیکھ کر سمجھا اسے جو وہ لوگ نہیں سمجھے۔''

بَصَرٌ ج: اَبْصَارٌ۔ اسم ذات ہے۔(۱) آنکھ۔(۲) دیکھنے کی قوت (بینائی) بینائی دل کی ہو یا آنکھ کی دونوں کے لیے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔(۳) دیکھ کر سمجھنے کی حس۔﴿ اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ط﴾ (45/الجاثیۃ:23)’’تو کیا آپ ﷺ نے دیکھا اس کو جس نے بنایا معبود اپنی خواہش کو اور گمراہ کیا اسکو اللہ نے علم کے باوجود اور اس نے مہر لگادی اس کی سماعت پر اور اس کے دل پر اور اس نے بنایا اس کی بصارت پر ایک پردہ۔‘‘

بَصِيْرَةٌ ج: بَصَائِرُ۔ اس کا لفظی مطلب ہے بینائی لیکن یہ صرف دل کی بینائی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یعنی دل کی وہ روشنی یا نور جس سے انسان چیزوں کی حقیقت سے آگاہ ہوتا ہے۔ پھر یہ لفظ سمجھنے کی صلاحیت، نشان عبرت، سمجھ میں آنے والی دلیل اور حجت کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔﴿ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ط﴾ (12/یوسف:108)’’یہ میری راہ ہے بلاتا ہوں اللہ کی طرف سمجھ بوجھ کر میں اور جو میرے ساتھ ہے۔‘‘(ترجمہ شیخ الہندؒ) ﴿ قَدْ جَاۗءَكُمْ بَصَاۗىِٕرُ مِنْ رَّبِّكُمْ ج﴾ (6/الانعام:104)’’اب تمہارے پاس روشن دلائل تمہارے پروردگار کے پاس سے پہنچ چکے ہیں۔‘‘﴿ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ۝۱۴﴾ (75/القیامۃ:14) اس آیت کا ترجمہ حضرت شیخ الہندؒ یہ کرتے ہیں،’’بلکہ آدمی اپنے واسطے آپ دلیل ہے۔‘‘ اور حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اس آیت کا ترجمہ کرتے ہیں:’’بلکہ اصل یہ ہے کہ انسان خود ہی اپنی حالت پر خوب مطلع ہوگا۔‘‘ اس آیت میں بَصِيْرَةٌ سے اکثر بزرگوں نے ’’حجت‘‘ مراد لی ہے۔

بَصِيْرٌ فَعِيْلٌ کا وزن ہے۔ اسم الفاعل کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ دیکھنے والا۔﴿ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ۝۹۶ ع﴾ (2/البقرہ:96) اور اللہ دیکھنے والا ہے اس کو جو یہ لوگ کرتے ہیں۔‘‘

(افعال) **اِبْصَارًا** دیکھنا اور دکھانا (لازم اور متعدی)۔ سمجھ بوجھ رکھنا۔﴿ اَفَسِحْرٌ هٰذَآ اَمْ اَنْتُمْ لَا تُبْصِرُوْنَ ۝۱۵ ج﴾ (52/الطور:15)’’تو کیا یہ بھی سحر ہے یا تمہیں نظر نہیں آتا۔‘‘

اَبْصِرْ فعل امر ہے۔ تو دیکھ۔﴿ وَّاَبْصِرْهُمْ فَسَوْفَ يُبْصِرُوْنَ ۝۱۷۵﴾ (37/الصافات:175)’’اور آپ ﷺ انہیں دیکھتے رہیے سو عنقریب وہ بھی دیکھ لیں گے۔‘‘

مُبْصِرٌ ج: مُبْصِرُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ دیکھنے والا، دکھانے والے، سمجھانے والا، چیزوں کو واضح کرنے والا۔ جو خود واضح ہو وہ بھی مُبْصِرٌ ہے اور جو دوسرے کو واضح اور روشن کردے وہ بھی مُبْصِرٌ ہے۔ دن خود بھی روشن ہے اور دوسری چیزوں کو بھی روشن کرنے والا ہے۔﴿ هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ط﴾ (10/یونس:67)’’وہ وہی (اللہ) تو ہے جس نے تمہارے لیے رات بنائی کہ تم اس میں چین پاؤ اور دن کو (بنایا) دکھلانے والا۔‘‘ حضرت شیخ الہندؒ نے بھی اس آیت میں ’’مُبْصِرٌ‘‘ کا ترجمہ ’’دکھلانے والا‘‘ سے کیا ہے۔

مُبْصِرَةٌ ﴿ وَاٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا ط﴾ (17/بنی اسرائیل:59)’’اور ہم نے دی ثمود کو اونٹنی اُن کے سمجھانے کو پھر ظلم کیا اُس پر۔‘‘(ترجمہ شیخ الہندؒ)۔’’اور ہم نے (قوم) ثمود کو اُونٹنی دی تھی بصیرت کے ذریعے کے طور پر لیکن اُنہوں نے (بڑا) ظلم اُس کے ساتھ کیا۔‘‘(ترجمہ ماجدیؒ)۔’’مُبْصِرَةٌ‘‘ کے معنی ایک تو خود روشن چیز کے ہیں اور دوسرے اس چیز کو

بھی کہتے ہیں جس سے دوسری چیزوں پر روشنی پڑے۔'' (تفسیر ماجدیؒ)

(تفعیل) تَبۡصِرَۃً تَفۡعِلَۃٌ باب تفعیل کے مصدر کا دوسرا وزن ہے، تَبۡصِرَۃٌ اسی وزن پر ہے۔ دکھانا اور سمجھانا۔ ﴿وَ اَنۡۢبَتۡنَا فِیۡہَا مِنۡ کُلِّ زَوۡجٍۭ بَہِیۡجٍ ۙ﴿۷﴾ تَبۡصِرَۃً وَّ ذِکۡرٰی﴾ (50/قٓ:7-8) ''اور اُ گائی اُس نے ہر ہر قسم کی رونق کی چیز سمجھانے کو اور یاد دلانے کو۔''

یُبَصَّرُوۡنَ مضارع مجہول کا صیغہ ہے۔ اُنہیں دکھائے جائیں گے۔ ﴿یُّبَصَّرُوۡنَہُمۡ ؕ﴾ (70/المعارج:11) ''حالانکہ وہ انہیں دکھا بھی دیے جائیں گے۔''

(استفعال) اِسۡتِبۡصَارًا بصیرت طلب کرنا۔ سوچ بچار کرنا۔

مُسۡتَبۡصِرٌ ج: مُسۡتَبۡصِرُوۡنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ سوچ بچار کرنے والا۔ ﴿وَ زَیَّنَ لَہُمُ الشَّیۡطٰنُ اَعۡمَالَہُمۡ فَصَدَّہُمۡ عَنِ السَّبِیۡلِ وَ کَانُوۡا مُسۡتَبۡصِرِیۡنَ ﴿ۙ۳۸﴾﴾ (29/العنکبوت:38) ''اور مزین کیا ان کے لئے شیطان نے ان کے اعمال کو پس اس نے روک دیا ان کو راستہ سے حالانکہ وہ لوگ تھے غور و فکر کرنے والے۔''

نوٹ: دیکھنے کے لیے قرآن مجید میں 'ب ص ر' کے علاوہ 'ر ء ی' اور 'ن ظ ر' کے مادے بھی استعمال ہوئے ہیں۔ تینوں میں کچھ بنیادی فرق ہے۔ 'رَا ی' کا لفظ دیکھنے کے لیے عام ہے۔ چاہے آنکھوں سے دیکھنا ہو، غور و فکر کے لیے دیکھنا ہو، یا خواب میں دیکھنا ہو۔ 'نَظَرَ' کا لفظ بھی دونوں طرح کے دیکھنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ آنکھوں سے یا غور و فکر کے لحاظ سے۔ لیکن عام طور پر اس کا استعمال آنکھوں سے دیکھنے کے لیے ہوتا ہے۔ اور 'بَصَرَ' کا لفظ اگرچہ ہر طرح کے دیکھنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ لیکن عام طور پر دل سے دیکھنے اور سمجھنے بوجھنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں سورۃ الاعراف کی آیت 198 میں تینوں الفاظ ایک ساتھ استعمال ہوئے ہیں۔ ﴿وَ اِنۡ تَدۡعُوۡہُمۡ اِلَی الۡہُدٰی لَا یَسۡمَعُوۡا ؕ وَ تَرٰىہُمۡ یَنۡظُرُوۡنَ اِلَیۡکَ وَ ہُمۡ لَا یُبۡصِرُوۡنَ ﴿۱۹۸﴾﴾ ''اور اگر تم اُنہیں کوئی بات بتلانے کو پکارو تو وہ سن نہ سکیں اور آپ ﷺ اُنہیں دیکھیں گے کہ گویا آپ ﷺ کی طرف نظر کر رہے ہیں درانحالیکہ اُنہیں کچھ نہیں سوجھ رہا ہے۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔ اس میں تَرٰی کا لفظ خیال کرنے کے لیے، نَظَرَ کا لفظ آنکھوں سے دیکھنے کے لیے اور بَصَرَ کا لفظ دیکھنے اور سمجھنے کے لیے استعمال ہوا ہے۔ (واللہ اعلم)۔

غ ش و

(س) غَشَاوَۃً کسی کا کسی پر چھا جانا۔ ڈھانپ لینا۔

غِشَاوَۃٌ اسم ذات ہے۔ پردہ۔ ﴿وَّ عَلٰۤی اَبۡصَارِہِمۡ غِشَاوَۃٌ ۫﴾ (2/البقرۃ:7) ''اور ان کی بصارت پر ایک پردہ ہے۔''

غَاشِیَۃٌ ج: غَوَاشٍ۔ اسم الفاعل ہے، واحد مؤنث کا صیغہ۔ ڈھانپنے والی، چھا جانے والی۔ ﴿ہَلۡ اَتٰىکَ حَدِیۡثُ الۡغَاشِیَۃِ ؕ﴿۱﴾﴾ (88/الغاشیۃ:1) ''کیا پہنچی تجھ کو چھا جانے والی کی خبر۔'' یہ لفظ بطور اسم ذات بھی استعمال ہوتا ہے یعنی اوڑھنے والی چیز، اوڑھنا۔ ﴿لَہُمۡ مِّنۡ جَہَنَّمَ مِہَادٌ وَّ مِنۡ فَوۡقِہِمۡ غَوَاشٍ ؕ﴾ (7/الاعراف:41) ''ان کے لیے آتش دوزخ کا بچھونا ہوگا اور ان کے اوپر اسی کا اوڑھنا ہوگا۔''

مَغۡشِیٌّ اسم المفعول ہے۔ جس پر ڈھانپا گیا۔ ﴿رَاَیۡتَ الَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ مَّرَضٌ یَّنۡظُرُوۡنَ اِلَیۡکَ نَظَرَ الۡمَغۡشِیِّ عَلَیۡہِ مِنَ الۡمَوۡتِ ؕ﴾ (47/محمد:20) ''تو تم نے دیکھا کہ جن کے دلوں میں بیماری تھی وہ تمہاری طرف اس طرح دیکھ رہے ہیں جیسے کسی پر موت چھا گئی ہو۔''

(افعال) اِغْشَاءً ایک چیز کو دوسری چیز سے ڈھانپ دینا۔ ﴿ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ ﴾ (7/الاعراف:54) ’’وہ ڈھانپ دیتا ہے رات کو دن سے۔‘‘

(تفعیل) تَغْشِيَةً بتدریج کسی پر کسی چیز کو چھا دینا۔ ڈھانپ دینا۔ ﴿ فَغَشّٰهَا مَا غَشّٰى ﴾ (53/النجم:54) ’’پس ان پر چھا گیا جو چھا گیا۔‘‘ (ترجمہ ضیاء القرآن)

(تفعّل) تَغَشٍّ بتکلف کسی پر چھا جانا۔ ڈھانپ لینا۔ ﴿ فَلَمَّا تَغَشّٰهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيْفًا ﴾ (7/الاعراف:189) ’’پھر جب اس نے ڈھانپ لیا اس کو تو اس نے اٹھایا ایک ہلکا حمل۔‘‘

(استفعال) اِسْتِغْشَاءً کسی چیز سے خود کو ڈھانپنا۔ ﴿ حِيْنَ يَسْتَغْشُوْنَ ثِيَابَهُمْ ﴾ (11/ھود:5) ’’جس وقت وہ لوگ خود کو ڈھانپتے ہیں اپنے کپڑوں سے۔‘‘

ترکیب

خَتَمَ فعل اور اللہ فاعل ہے۔ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ پہلا اور عَلٰى سَمْعِهِمْ دوسرا متعلق فعل ہے۔ سَمْعٌ مصدر ہے اور مصادر جمع کی صورت میں نہیں لائے جاتے اس لیے سَمْعٌ مفرد لایا گیا ہے جب کہ قُلُوْبٌ اور اَبْصَارٌ جمع ہیں۔ عَلٰى اَبْصَارِهِمْ کو اگر خَتَمَ کا تیسرا متعلق فعل مانا جائے تو اگلا لفظ غِشَاوَةٌ بے معنی ہو جاتا ہے۔ اس طرح معلوم ہو گیا کہ پہلا جملہ عَلٰى سَمْعِهِمْ پر مکمل ہو گیا ہے۔ اسی لیے یہاں وقف مطلق کی علامت ’’ط‘‘ بھی ہے جو کہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہاں ٹھہرنا چاہیے۔ وَعَلٰى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ سے دوسرا جملہ شروع ہوتا ہے۔ اس میں وٗ استئنافیہ ہے۔ عَلٰى اَبْصَارِهِمْ قائم مقام خبر مقدم ہے اور غِشَاوَةٌ مبتداء مؤخر نکرہ ہے جبکہ خبر محذوف ہے۔ اسی طرح سے لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ میں لَهُمْ قائم مقام خبر مقدم ہے اور مرکب توصیفی عَذَابٌ عَظِيْمٌ مبتداء مؤخر نکرہ ہے اور خبر محذوف ہے۔

ترجمہ البقرۃ:7

خَتَمَ	اللّٰهُ	عَلٰى قُلُوْبِهِمْ	وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ط	وَعَلٰى اَبْصَارِهِمْ
مہر لگا دی	اللہ نے	ان کے دلوں پر	اور ان کی سماعت پر	اور ان کی بصارتوں پر

غِشَاوَةٌ ز	وَّلَهُمْ	عَذَابٌ عَظِيْمٌ ع
ایک پردہ ہے	اور ان کیلئے	ایک عظیم عذاب ہے

نوٹ: 1 <u>ختمِ قلوب کی حقیقت:</u> دلوں پر مہر لگ جانے کے مفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے حضرت مولانا عبدالماجدی دریابادیؒ فرماتے ہیں:

’’اللہ کی طرف سے مہر لگ جانے کا یہ فعل بندہ کے کفر اختیاری کے بعد ہوتا ہے نہ کہ اس کے قبل۔ اس کا نتیجہ ہوتا ہے نہ کہ اس کا سبب۔ فطرتِ سلیم ہر انسان کو عطا ہوئی ہے، اور اس میں دلائل حق پر غور و فکر کی استعداد بھی شامل ہے۔ لیکن انسان جب اپنے ارادہ و عقل کا غلط استعمال کرنے لگتا ہے، اور آسمانی ہدایتوں اور خداوندی نشانیوں سے مسلسل منہ موڑے ہوئے قانونِ شیطانی پر چلنے کی ٹھان لیتا ہے تو سلسلۂ غضبی کے تحت میں آ جاتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے سلسلۂ رحمت سے خارج ہو جاتا ہے، اور نصرتِ الٰہی اس کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ اب ہر روشنی اسے تاریک اور ہر تاریکی اسے روشن نظر آنے لگتی ہے۔ اس نے اپنے لیے جو کچھ اختیار کیا، وہی اللہ تعالیٰ اسے بحیثیت علت العلل و مسبب الاسباب اپنے قانونِ تکوینی (نہ کہ قانونِ رضا) کے ماتحت دینے لگتا ہے۔ اور یہی معنی ہیں انسان کے عقل و حواس پر مہر لگ جانے کے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ یہ مہر خداوندی کوئی مادی چیز نہیں۔‘‘ (تفسیر ماجدی، ص ۹)۔

پیر کرم شاہ صاحبؒ سادہ الفاظ میں ختم قلوب کی حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں: ’’یہاں بھی بعض لوگوں کو یہ کہتے سنا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی اور آنکھوں پر پردے ڈال دیئے تو غریب کیونکر ایمان لاتے۔ اُن کی خدمت میں صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ انسان کے اعمال پر

کوئی نتیجہ اور اثر مرتب ہوتا ہے یا نہیں؟ اگر انسان جسمانی صحت کے اصولوں کو لگاتار توڑتا رہے تو اس کا بلانوش معدہ جو ہر چیز ہضم کر لیا کرتا تھا کیا غذا ہضم کرنے سے معذور نہیں ہو جاتا؟ کیا اس کا جگر خون پیدا کرنا چھوڑ نہیں دیتا؟ اگر ایسا ہے اور یقیناً ایسا ہی ہے تو رُوحانی صحت کے بھی چند اُصول ہیں جن کی پابندی سے رُوحانی قوتیں نشوونما پاتی ہیں۔ اور جن کی پیہم خلاف ورزیوں سے وہ قوتیں ناکارہ ہو کر رہ جاتی ہیں۔ دل سے حق و باطل میں تمیز کرنے کی صلاحیت سلب ہو جاتی ہے۔ آنکھیں دیکھتی تو ہیں لیکن عبرت حاصل نہیں کرتیں۔ کان سنتے تو ہیں لیکن نصیحت قبول نہیں کرتے۔ بس اسی کیفیت کا اللہ تعالیٰ نے اِس آیت میں ذکر فرمایا ہے۔ ان کفار کی پیہم نافرمانیوں سے، حق سمجھ لینے کے باوجود اس سے مسلسل انکار کرنے کی وجہ سے ان کے دل و دماغ اور دیدہ و گوش (دیکھنا اور سننا) کی ساری قوتیں ناکارہ ہو کر رہ گئی ہیں۔ تو ان کی یہ محرومیاں نتیجہ ہیں ان مسلسل نافرمانیوں کا۔ اور طبعی اثر ہے اُن کی ہٹ دھرمی اور تعصب کا۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ پہلے ہی انہیں ہوش و فہم سے محروم کر دیا گیا تھا تاکہ وہ حق کو سمجھ ہی نہ سکیں۔ اِس حقیقت کو قرآن کریم نے متعدد موقعوں پر اس قدر واضح فرمایا ہے کہ غلط فہمی کی گنجائش تک باقی نہیں چھوڑی۔ مثلاً ایک جگہ ارشاد ہے بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ (النساء:155) یعنی ان کے کفر و انکار کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اُن کے دلوں پر مہر لگا دی۔ یعنی پہلے سے ان کے دل مہر شدہ نہ تھے بلکہ ان کے کفر و انکار اور اس پر ان کے شدید اصرار کی پاداش میں انہیں اس نعمت سے محروم کر دیا گیا۔ ایک اور جگہ ارشاد ہے كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (المطففین:14) یعنی جو کرتوت وہ کیا کرتے تھے اِن کا میل اُن کے دلوں پر جم گیا ہے اور ان کے دلوں کا روشن آئینہ اس قدر مکدّر ہو گیا ہے کہ آفتاب ہدایت کی روشن کرنیں اس میں چمک پیدا نہیں کر سکتیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں حسن عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔'' (ضیاء القرآن، ج۱،ص ۳۳)

نوٹ:2 حق قبول کرنے کی صلاحیت کے ماند پڑ جانے یا ختم ہو جانے کے لیے قرآن مجید میں تین طرح کی اصطلاحات استعمال ہوئی ہیں۔ ان میں سے پہلا درجہ ہے دلوں پہ زنگ لگنے کا جس کو قرآن نے ﴿ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ ﴾ کہا ہے۔ اس سے اگلا درجہ دلوں پر مہر لگ جانے کا ہے۔ جس کے لیے قرآن نے ﴿ خَتَمَ اللّٰهُ ﴾ یا ﴿ طَبَعَ اللّٰهُ ﴾ کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ اور آخری اور سب سے سخت درجہ ہے دلوں پر تالے لگ جانے کا جس کو قرآن نے یوں فرمایا ﴿ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ﴾ چنانچہ حضرت مولانا ادریس کاندھلوی صاحبؒ اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مومن جب کوئی گناہ کرتا ہے تو ایک سیاہ نقطہ اس کے قلب پر لگ جاتا ہے پس اگر توبہ کر لی اور اس گناہ سے باز آ گیا تو دل کو صاف کر دیا جاتا ہے اور اگر کوئی اور گناہ کیا تو وہ نقطہ اور بڑھ جاتا ہے حتی کہ رفتہ رفتہ اس کے دل کو گھیر لیتا ہے اور یہی وہ رَین (زنگ) ہے جس کی حق تعالیٰ نے ﴿ كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴾ میں خبر دی ہے۔ (رواہ الترمذی وقال حدیث حسن صحیح، پوری حدیث کے لیے ملاحظہ ہو مظاہر حق جدید، شرح مشکوٰۃ شریف، ج۲،ص ۵۴۱)۔ پس جس طرح ہم ظاہری سیاہی اور سفیدی اور زنگ کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اس سے کہیں زائد ملائکہ اللہ قلوب بنی آدم کی سیاہی اور سفیدی اور زنگ کا معائنہ کرتے ہیں مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ رَین یعنی زنگ کا درجہ ختم اور طبع سے کم ہے اور ختم اور طبع کا درجہ اقفال سے کم ہے اور اقفال سب سے زائد سخت ہیں۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ﴾ کیا ان کے دلوں پر قفل ہیں۔'' (معارف القرآن، ج۱،ص ۷۰)

آیت:8

﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝ ﴾

انسان: اس کے مادے کے بارے میں اختلاف ہے۔

(1) پہلی رائے یہ ہے کہ انسان ''ء ن س'' (س) اِنِسَ یَاْنَسُ، سے ہے جس کے معنی ہیں مانوس ہونا۔ چنانچہ انسان کا مطلب ہو گا ایسی مخلوق جو آپس میں انس (پیار و محبت) رکھتی ہو اور ایک دوسرے سے جان پہچان رکھتی ہو۔ اس لحاظ سے اس کی ضد وحشی ہو گی۔ شعر:

مَا سُمِّيَ الْاِنْسَانُ اِلَّا لِاُنْسِهٖ وَالْقَلْبُ قَلْبٌ لِاَنَّهٗ يَتَقَلَّبُ

انسان کا نام اس کے انس ہی کی وجہ سے رکھا گیا ہے اور دل، دل ہے اس لیے کہ وہ بدلتا رہتا ہے۔

(2) دوسری رائے یہ ہے کہ انسان ''ء ن س'' (افعال) اِیۡنَاسٌ، سے ہے۔ اس کے معنی ہیں دور سے دیکھنا محسوس کرنا، کسی چیز کا ادراک کرنا۔ انسان کو اِنۡسٌ اس لیے کہتے ہیں کہ وہ بھی ظاہر ہے اور آنکھوں سے اس کا ادراک کیا جا سکتا ہے۔ اس لحاظ سے اس کی ضد جِنٌّ ہوگی جس کے معنی ہیں پوشیدہ، مخفی۔ اسی سے جِنٌّ (جن) بنا ہے کیونکہ وہ ہماری آنکھوں سے پوشیدہ ہے۔

(3) تیسری رائے یہ ہے کہ انسان ''ن س ی'' (س) نَسۡیًا، نِسۡیَانًا، سے ہے۔ جس کے معنی ہیں بھول جانا۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ انسان کو انسان یا اِنۡسِیًّا اس لیے کہا گیا کہ اس سے عہد لیا گیا تھا جسے وہ بھول گیا۔ مقولہ ہے اَوَّلُ النَّاسِ اَوَّلُ نَاسٍ تمام انسانوں میں سب سے پہلا انسان وہ ہے جو سب سے پہلے بھولا۔

(4) چوتھی رائے یہ ہے کہ انسان ''ن و س'' (ن) نَوۡسًا، سے ہے۔ جس کے معنی ہیں مضطرب ہونا، جھولنا، حرکت کرنا۔ اور انسان کو انسان اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس کی طبیعت میں اضطراب ہے اور اس کا مزاج بدلتا رہتا ہے۔

اِنۡسٌ اسم جنس ہے۔ واحد یعنی ایک شخص بھی مراد ہو سکتا ہے اور جمع یعنی تمام نوع انسانی (مذکر، مؤنث) بھی مراد ہو سکتی ہے۔ چنانچہ واحد اور جمع دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ﴿ فَيَوۡمَئِذٍ لَّا يُسۡـَٔلُ عَنۡ ذَنۡۢبِهٖۤ اِنۡسٌ وَّ لَا جَآنٌّ ۚ﴿۳۹﴾ ﴾ (55/الرحمٰن:39) ''تو اس دن نہیں پوچھا جائے گا اس کے گناہ کے بارے میں کسی انسان سے اور نہ ہی کسی جن سے۔'' ﴿ وَ كَذٰلِكَ جَعَلۡنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيۡنَ الۡاِنۡسِ وَ الۡجِنِّ ﴾ (6/الانعام:112) ''اور اسی طرح ہم نے بنایا ہر نبی کے لیے دشمن جنوں اور انسانوں کے شیطانوں کو'' واحد کے لیے اِنۡسِیٌّ بھی استعمال ہوتا ہے۔ ﴿ فَلَنۡ اُكَلِّمَ الۡيَوۡمَ اِنۡسِيًّا ۚ﴿۲۶﴾ ﴾ (19/مریم:26) ''تو میں ہرگز بات نہیں کروں گی آج کے دن کسی انسان سے۔''

اِنۡسَانٌ: یہ بھی اسم جنس ہے۔ یہ لفظ بول کر عموماً تمام بنی نوع انسان (مذکر مؤنث) مراد لیے جاتے ہیں۔ ''ال'' لگا دیں تو یہ اَلۡاِنۡسَانُ بن جائے گا۔ پھر ''ال'' جنس کا بھی ہو سکتا ہے، استغراق کا بھی، عہد خارجی یا عہد ذہنی کا بھی۔ ﴿ وَ خُلِقَ الۡاِنۡسَانُ ضَعِيۡفًا ﴿۲۸﴾ ﴾ (4/النساء:28) ''اور پیدا کیا گیا انسان کمزور۔'' یہاں 'ال' جنس کا ہے۔

اِنۡسَانٌ اور اِنۡسٌ کی جمع نَاسٌ، اُنَاسٌ اور اَنَاسِیُّ ہے۔

نَاسٌ اس میں عمومیت پائی جاتی ہے۔ اس پر ''ال'' داخل ہو تو یہ اَلنَّاسُ بن جائے گا۔ اَلنَّاسُ اسم جمع ہے یعنی جو کسی جماعت پر بولا جائے۔ معنوی لحاظ سے اس سے حال اور مستقبل کے سب انسان مراد ہوتے ہیں، خواہ مرد ہوں یا عورتیں، بچے ہوں یا بڑے، اچھے ہوں یا برے، مسلمان ہوں یا کافر، سب کے لیے یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ البتہ خطابی صورت میں ایک فرق ہے اور وہ یہ ہے خطابی صورتوں میں الناس سے وہی لوگ مراد ہوں گے جن میں مخاطب ہونے کی صلاحیت ہے یعنی عاقل اور بالغ۔ دیوانے اور بچے اگرچہ الناس میں لُغَۃً شامل ہیں لیکن خطابی شکل میں خطاب اُن کی طرف نہیں ہوتا۔ ﴿ فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا وَ لَنۡ تَفۡعَلُوۡا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيۡ وَقُوۡدُهَا النَّاسُ وَ الۡحِجَارَةُ ۖۚ ﴾ (2/البقرۃ:24) ''لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا، اور یقیناً کبھی نہیں کر سکتے، تو ڈرو اُس آگ سے، جس کا ایندھن بنیں گے انسان اور پتھر۔''

اُنَاسٌ عموماً انسانوں کے ایک بڑے گروہ کو کہا جاتا ہے۔ جو تقسیم کار، قبیلہ یا کسی وجہ سے ایک دوسرے سے مختلف ہوں۔ ﴿ قَدۡ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشۡرَبَهُمۡ ؕ ﴾ (2/البقرۃ:60) ''ہر قبیلے نے جان لیا کہ کون سی جگہ اس کے پانی لینے کی ہے۔''

اَنَاسِیُّ یہ بھی عموماً انسانوں کے ایک بڑے گروہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ﴿ لِّنُحۡیِۦَ بِهٖ بَلۡدَةً مَّيۡتًا وَّ نُسۡقِيَهٗ مِمَّا خَلَقۡنَاۤ اَنۡعَامًا وَّ اَنَاسِيَّ كَثِيۡرًا ﴿۴۹﴾ ﴾ (25/الفرقان:49) ''تاکہ ایک مُردہ علاقے کو اُس کے ذریعے زندگی بخشے اور اپنی مخلوق میں سے بہت سے جانوروں اور انسانوں کو سیراب کرے۔''

مَنۡ مَنۡ اسم ہے جو اکثر ذوی العقول (جو عقل رکھتے ہیں مثلاً انسان، جن اور فرشتے) کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ واحد، جمع، تثنیہ، مذکر، مؤنث سب کے لیے مَنۡ ہی استعمال ہوتا ہے۔ مَنۡ، شرطیہ، استفہامیہ، استفہامیہ انکاریہ، موصولہ اور موصوفہ ہو سکتا ہے۔ مَنۡ کے صلہ، صفت وغیرہ میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک ہی آیت میں کبھی تو اس کی ظاہری لفظی شکل کی رعایت کرتے ہوئے فعل کا صیغۂ واحد یا مفرد ضمیر عائد لائی جاتی ہے اور کبھی معنی کی رعایت

کرتے ہوئے فعل یا ضمیر کو جمع بھی لایا جاتا ہے، جیسے آیت زیر مطالعہ میں مَنْ کے بعد یَقُوْلُ واحد کا صیغہ لا کر اس کی لفظی رعایت کی گئی ہے (کیونکہ مَنْ اصلاً واحد لفظ ہے) اور آگے اٰمَنَّا جمع کا صیغہ لا کر اس کی معنوی رعایت کی گئی ہے کیونکہ مَنْ آیت میں جمع کے معنی میں آیا ہے۔ مَنْ کا ''ن'' ہمیشہ ساکن رہتا ہے اور اگر آگے ملانا ہو تو زیر دے کر ملایا جاتا ہے۔

ق و ل

(ن) **قَوْلًا** کہنا، بولنا۔ ﴿وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ﴾ (2/البقرہ:30) ''اور جب کہا آپ ﷺ کے رب نے بیشک میں بنانے والا ہوں زمین میں ایک خلیفہ۔'' قَالَ کا صلہ جب عَلٰی کے ساتھ آتا ہے تو اس کے معنی ہوتے ہیں کسی کے خلاف کوئی بات گھڑ لینا، کسی پر بہتان لگانا۔ (ماجدیؒ)

قِیْلَ ماضی مجہول ہے۔ کہا گیا۔ ﴿وَاِذَا قِیْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ ۙ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ﴿۱۱﴾﴾ (2/البقرۃ:11) ''اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ زمین پر فساد مت پھیلاؤ تو کہتے ہیں کہ ارے! ہم تو اصلاح کر رہے ہیں۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)

یُقَالُ مضارع مجہول ہے۔ کہا جاتا ہے۔ ﴿مَا یُقَالُ لَكَ اِلَّا مَا قَدْ قِیْلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ ؕ﴾ (41/حٰمٓ السجدۃ:43) ''نہیں کہا جاتا آپ ﷺ سے مگر جو کہا گیا ہے رسولوں سے آپ ﷺ سے پہلے۔''

قِیْلٌ اسم ذات ہے۔ بات۔ ﴿وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِیْلًا ﴿۱۲۲﴾﴾ (4/النساء:122) ''اور اللہ سے زیادہ سچا کون ہے بلحاظ بات کے۔''

قَوْلٌ ج: اَقْوَالٌ۔ جمع کی جمع: اَقَاوِیْلُ۔ اسم ذات ہے۔ بات۔ ﴿اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِیْمٍ ﴿۴۰﴾ ۙ وَّ مَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ؕ﴾ (69/الحاقۃ:40-41) ''یقیناً یہ ایک بزرگ رسول کا قول ہے اور یہ کسی شاعر کی بات نہیں ہے۔''

قُلْ ج: قُوْلُوْا۔ فعل امر ہے۔ تو کہہ۔ ﴿قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ؕ﴾ (2/البقرہ:140) ''آپ ﷺ کہیے تم لوگ زیادہ جانتے ہو یا اللہ۔''

قَآئِلٌ اسم الفاعل ہے۔ کہنے والا۔ ﴿قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ لَا تَقْتُلُوْا یُوْسُفَ﴾ (12/یوسف:10) ''کہا ان میں سے ایک کہنے والے نے تم لوگ قتل مت کرو یوسفؑ کو۔''

(تفعّل) **تَقَوُّلًا** بات گھڑنا۔ کسی کی طرف ایسی بات منسوب کرنا جو اس نے نہیں کہی۔ اپنی طرف سے جھوٹ گھڑ لینا۔ اس کے ساتھ بھی عام طور پر عَلٰی کا صلہ استعمال ہوتا ہے۔ ﴿وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَیْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِیْلِ ﴿۴۴﴾ ۙ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْیَمِیْنِ ﴿۴۵﴾ ۙ﴾ (69/الحاقۃ:44-45) ''اور اگر وہ غلط منسوب کرتے ہم پر باتوں میں کوئی تو ہم ضرور پکڑتے ان کو قوت کے ساتھ۔''

اٰمَنَّا اور مُؤْمِنِیْنَ (ء م ن): البقرۃ آیت 3 دیکھیں۔	اَللّٰه (ء ل ہ): آیت بسم اللہ دیکھیں۔
اَلْیَوْمِ: الفاتحہ آیت 3 دیکھیں۔	اَلْاٰخِرِ (ء خ ر): البقرۃ آیت 4 دیکھیں۔

ترکیب آیت زیر مطالعہ کی ترکیب پہلے ایک مثال سے سمجھ لیں۔ اگر ہم کہیں کہ مِنَ النَّاسِ کَافِرٌ تو اس میں مِنَ النَّاسِ قائم مقام خبر مقدم ہے جبکہ خبر مَوْجُوْدٌ محذوف ہے اور کَافِرٌ مبتداء موخر ہے۔ اس کا سادہ جملہ یوں ہوتا اَلْکَافِرُ مَوْجُوْدٌ مِنَ النَّاسِ اور اس کا مطلب ہوتا کہ کافر'' یعنی خاص کافر'' لوگوں میں موجود ہے۔ لیکن جب مبتداء کو موخر کر کے نکرہ کر دیا تو اب مِنَ النَّاسِ کَافِرٌ کا مطلب ہو گیا کہ لوگوں میں سے کوئی کافر ہے یعنی لوگوں میں سب کافر نہیں ہیں بلکہ کچھ کافر ہیں۔ یہ رعایت اردو میں لفظ ''بھی'' سے ادا ہوتی ہے۔ اس لئے اس جملہ کا ترجمہ ہو گا ''لوگوں میں کافر بھی ہیں''۔

چنانچہ وَمِنَ النَّاسِ میں ''وَ'' استینافیہ ہے اور مِنَ النَّاسِ قائم مقام خبر مقدم ہے۔ مِنْ تبعیضیہ ہے (یعنی لوگوں میں سے کچھ لوگ)۔ خبر مَوْجُوْدٌ محذوف ہے اور مَنْ مبتدا موخر ہے۔ اور اس مَنْ کو موصول یا نکرہ موصوفہ، دونوں مانا گیا ہے۔ موصول ہونے کی صورت میں اگلا جملہ فعلیہ یَقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ

بِالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ اس کا صلہ بنے گا۔نکرہ موصوفہ ماننے کی صورت میں یہ جملہ فعلیہ اس کی صفت بنے گا۔ یَقُوۡلُ کا صیغہ مَنۡ کی لفظی رعایت کے لحاظ سے لایا گیا ہے۔جبکہ معنوی لحاظ سے یہ جمع ہے۔ترجمہ ہوگا''وہ کہتے ہیں'' اور آگے اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وہ بات ہے جو وہ کہتے ہیں۔اس میں اٰمَنَّا فعل اور اس میں شامل ضمیر اس کا فاعل ہے اور اٰمَنَّا جمع کا صیغہ مَنۡ کی معنوی رعایت کے لحاظ سے لایا گیا ہے۔اور آگے بِاللّٰهِ وَ بِالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ متعلق فعل ہے۔ان کے درمیان ''وَ'' عطف کا ہے۔وَ مَا هُمۡ بِمُؤۡمِنِيۡنَ میں ''وَ'' حالیہ ہے۔'مَا' نافیہ ہے،هُمۡ مبتدا اور بِمُؤۡمِنِيۡنَ اس کی خبر۔'بِ' زائدہ تاکید کے لیے ہے۔حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اس اسلوب کے متعلق لکھتے ہیں''قرآن مجید میں یہ ترکیب جہاں جہاں بھی آئی ہے وہاں اس وصف کی نفی کامل مراد رہی ہے۔وَ مَا هُمۡ بِمُؤۡمِنِيۡنَ ان میں ایمان ذرا بھی نہیں۔وَ مَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلۡعَبِيۡدِ آپ ﷺ کا پروردگار بندوں کے حق میں ذرا سا بھی ظالم نہیں ہے۔''

ترجمہ	وَمِنَ النَّاسِ	مَنۡ	يَّقُوۡلُ	اٰمَنَّا
البقرۃ:8	اور لوگوں میں سے	وہ (بھی) ہیں جو	کہتے ہیں	ہم ایمان لائے

بِاللّٰهِ وَبِالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ	وَ	مَا هُمۡ بِمُؤۡمِنِيۡنَ ۘ﴿۸﴾
اللہ پر اور آخری دن پر	حالانکہ	وہ لوگ ہرگز ایمان لانے والے نہیں ہیں

نوٹ:1 وَمَا هُمۡ بِمُؤۡمِنِيۡنَ، آیت کے اِس حصے کی وضاحت کرتے ہوئے حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ فرماتے ہیں:''یعنی ان کے دل میں ایمان کا گز رذرّہ برابر بھی نہیں، ایمان انہیں چھو بھی نہیں گیا۔بِمُؤۡمِنِيۡنَ، حرف باء تاکید کے لیے ہے۔ظاہری سیاق کا تقاضا تھا کہ فعل ماقبل قَالُوۡۤا اٰمَنَّا کی تردید و تغلیط میں ما اٰمنوا یا اسی قسم کا کوئی اور فعل ماضی ہی لایا جاتا (اور فعل میں ماضی حال یا مستقبل کا مفہوم ہوتا ہے) لیکن یہاں تاکید اور زور کے لیے بجائے فعل کے اسم فاعل لایا گیا، کہ ان لوگوں سے نفی ایمان کی، ماضی، حال، مستقل ہر زمانہ سے متعلق نکل آئے۔(تفسیر ماجدیؒ)

نوٹ:2 واؤ کی اقسام: آیت زیر مطالعہ میں تین مختلف طرح کے واؤ آئے ہیں۔شروع میں 'وَ' استئنافیہ ہے۔اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ میں 'وَ' عطف کا ہے اور وَمَا هُمۡ بِمُؤۡمِنِيۡنَ میں 'وَ' حالیہ ہے۔نوٹ کرلیں کہ واؤ کی بھی کئی قسمیں ہیں جن میں سے مندرجہ ذیل چار قسمیں زیادہ استعمال ہوتی ہیں۔

(1) واؤ قسمیہ: (عامل)۔اس کے معنی ہیں''قسم ہے''۔اس کی پہچان یہ ہے کہ یہ صرف اسم پر داخل ہوتا ہے اور اپنے اسم کو جر دیتا ہے، جیسے وَالۡعَصۡرِ (قسم ہے زمانے کی)۔اس کے بعد دوبارہ واؤ آئے تو دوسرا واؤ عطف کا ہوگا۔جیسے وَالتِّيۡنِ وَالزَّيۡتُوۡنِ میں پہلا واؤ قسمیہ ہے اور دوسرا عطف کا ہے۔

(2) واؤ عاطفہ: (غیر عامل)۔اس کے معنی ہیں 'اور' یہ واؤ دو چیزوں کو ایک حکم میں جمع کرنے کے لیے آتا ہے۔یہ غیر عامل ہوتا ہے یعنی کوئی اعرابی تبدیلی نہیں لاتا۔

(3) واؤ حالیہ: (غیر عامل)۔اس کے معنی ہوتے ہیں''اس حال میں کہ یا حالانکہ''۔حال عام طور پر تو وہ نکرہ اسم ہوتا ہے جو فعل کے واقع ہونے کے وقت فاعل یا مفعول کی حالت کو بیان کرے۔یہ حالت نصب میں ہوتا ہے۔مثلاً جَاءَ الۡاَمِيۡرُ مَاشِيًا (سردار چلتا ہوا آیا) اس مثال میں مَاشِيًا حال ہے فاعل، اَلۡاَمِيۡرُ کا۔جس کا حال بیان کیا جائے اسے ذوالحال کہتے ہیں۔(قرآن مجید سے مثال: سورۂ آل عمران کی آیت 39 میں فرمایا: اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحۡيٰى مُصَدِّقًاۢ بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ سَيِّدًا وَّ حَصُوۡرًا وَّ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيۡنَ، اس آیت مبارکہ میں مُصَدِّقًا، سَيِّدًا، حَصُوۡرًا، نَبِيًّا، یہ سب حضرت یحییٰؑ کے حال ہیں)۔حال اسم کے علاوہ پورا جملہ (اسمیہ یا فعلیہ) بھی ہوسکتا ہے۔مثلاً جَاءَ الۡخَلِيۡلُ يَضۡحَكُ (خلیل ہنستا ہوا آیا)۔اس میں جملہ فعلیہ يَضۡحَكُ، خلیل کا حال ہے۔(قرآن مجید سے مثال: سورۃ البقرۃ کی آیت 15 میں فرمایا: وَ يَمُدُّهُمۡ فِىۡ طُغۡيَانِهِمۡ يَعۡمَهُوۡنَ، اس آیت مبارکہ میں جملہ فعلیہ يَعۡمَهُوۡنَ حال ہے يَمُدُّهُمۡ میں هُمۡ ضمیر کا)۔کبھی حال اور ذوالحال کے درمیان ایک رابط (جوڑنے والے) کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ رابط اکثر واؤ ہوتا ہے جسے واؤ حالیہ کہا جاتا ہے۔مثلاً جَاءَ الرَّشِيۡدُ وَهُوَ يَضۡحَكُ۔رشید اس حال میں آیا کہ وہ ہنس رہا تھا۔اس میں جملہ اسمیہ هُوَ يَضۡحَكُ، رشید کا حال ہے اور محلاً منصوب ہے۔درمیان میں 'وَ' حالیہ ہے۔(قرآن مجید سے مثال: سورۃ البقرۃ کی آیت زیر مطالعہ وَ مَا هُمۡ بِمُؤۡمِنِيۡنَ، میں 'وَ' حالیہ ہے اور جملہ مَا هُمۡ بِمُؤۡمِنِيۡنَ حال

ہے مَنۡ کا۔ حضور ﷺ کی ایک تعلیم کردہ دعا میں واوٗ حالیہ اور واوٗ عاطفہ کا فوری تقابل بہت واضح ہے۔ آپ ؐ نے فرمایا: اَللّٰھُمَّ اِنِّیۡ اَعُوۡذُبِکَ ۔ اے اللہ میں تیری پناہ میں آتا ہوں۔ اَنۡ اُشۡرِکَ بِکَ ۔ کہ میں (کسی کو) شریک کروں تیرے ساتھ۔ وَاَعۡلَمُ ۔ اس حال میں کہ (واوٗ حالیہ) میں جانتا ہوں۔ وَاَسۡتَغۡفِرُکَ ۔ اور (واوٗ عاطفہ) میں مغفرت مانگتا ہوں تجھ سے بِمَا لَا اَعۡلَمُ ۔ اس کی جو میں نہیں جانتا۔

(4) واوٗ استئنافیہ: (غیر عامل)۔ یہ وہاں استعمال ہوتا ہے جہاں پچھلی بات کو چھوڑ کر نئی بات شروع کرنی ہو۔ چنانچہ اس کے بعد اگر فعل مضارع آئے تو وہ حالت رفع میں آتا ہے مثلاً لِّنُبَیِّنَ لَکُمۡ ؕ وَنُقِرُّ فِی الۡاَرۡحَامِ مَا نَشَآءُ اس مثال میں 'و' عاطفہ نہیں ہے۔ ورنہ لِنُبَیِّنَ کی طرح نُقِرَّ بھی حالت نصب میں ہوتا۔ چنانچہ معلوم ہوا کہ اس واوٗ سے ایک نئی بات شروع کر دی گئی ہے جس کا پچھلی بات سے تعلق نہیں ہے۔ یہ واوٗ بھی غیر عامل ہے۔ (واوٗ کی اور بھی کئی قسمیں ہیں جو لغات القرآن حصہ ٦ سے دیکھی جاسکتی ہیں)۔

نوٹ: 3 مِنۡ کی اقسام: ترکیب میں بتایا گیا ہے کہ ''مِنَ النَّاسِ'' میں مِنۡ تبعیضیہ ہے۔ اب نوٹ کرلیں کہ مِنۡ ، جو حرف جر ہے، بھی کئی طرح سے استعمال ہوتا ہے۔

(1) مِنۡ تبعیضیہ: اس کا مطلب ہوتا ہے ''کسی چیز میں سے کچھ یا کل میں سے بعض''۔ جیسے وَمِمَّا رَزَقۡنٰھُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ اور جو رزق ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے وہ خرچ کرتے ہیں یا آیت زیر مطالعہ میں فرمایا وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ اور لوگوں میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں...... وغیرہ۔

(2) مِنۡ بیانیہ: یہ کسی چیز کی وضاحت اور بیان کے لیے آتا ہے۔ مثلاً البقرہ 155 میں فرمایا: وَلَنَبۡلُوَنَّکُمۡ بِشَیۡءٍ مِّنَ الۡخَوۡفِ وَالۡجُوۡعِ وَنَقۡصٍ مِّنَ الۡاَمۡوَالِ وَالۡاَنۡفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ ''ہم تمہیں آزمائیں گے کسی چیز سے۔ پھر ''کسی چیز'' کی وضاحت کے لیے مِنۡ بیانیہ آیا۔ یعنی وہ چیز ہے خوف، بھوک، الخ۔ اسی طرح الحج کی آیت 30 میں فرمایا: فَاجۡتَنِبُوا الرِّجۡسَ مِنَ الۡاَوۡثَانِ ''پس تم بچتے رہو گندگی سے پھر مِنۡ بیانیہ سے اس گندگی کی وضاحت کی کہ وہ گندگی بت ہیں۔ سو تم بتوں سے بچتے رہو۔ پھر اسی طرح سورہ الفتح کی آیت 29 میں فرمایا: وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنۡھُمۡ مَّغۡفِرَۃً وَّ اَجۡرًا عَظِیۡمًا یہاں بھی مِنۡھُمۡ میں مِنۡ بیانیہ ہے (بحوالہ تفسیر ماجدیؒ) مراد سارے ہی صحابہؓ ہیں۔ آل عمران کی آیت 172 میں فرمایا: لِلَّذِیۡنَ اَحۡسَنُوۡا مِنۡھُمۡ وَاتَّقَوۡا اَجۡرٌ عَظِیۡمٌ یہاں بھی مِنۡھُمۡ میں مِنۡ بیانیہ ہے یعنی تمام صحابہؓ ہی نیک اور متقی ہیں۔ (بحوالہ تفسیر ماجدیؒ)۔

(3) مِنۡ سببیہ: یہ کسی حکم کی وجہ اور سبب بتانے کے لیے استعمال ہوتا ہے مثلاً البقرۃ کی آیت 202 میں فرمایا اُولٰٓئِکَ لَھُمۡ نَصِیۡبٌ مِّمَّا کَسَبُوۡا ؕ ''انہی لوگوں کو بڑا حصہ ملے گا (دونوں جہانوں میں) بسبب اُن کی (نیک) کمائی کے'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔ اس آیت میں مِّمَّا میں مِنۡ سببیہ ہے۔ یا سورۃ البقرۃ کی آیت 19 میں فرمایا: یَجۡعَلُوۡنَ اَصَابِعَھُمۡ فِیۡۤ اٰذَانِھِمۡ مِّنَ الصَّوَاعِقِ ''ٹھونستے ہیں اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں کڑک کے سبب۔'' اس آیت میں بھی 'مِن' سببیہ ہے۔ یا سورۂ نوح کی آیت 25 میں فرمایا: مِمَّا خَطِیۡٓـٰٔتِھِمۡ اُغۡرِقُوۡا فَاُدۡخِلُوۡا نَارًا یہاں بھی مِنۡ سببیہ ہے (بحوالہ تفسیر ماجدیؒ) اور 'ما' تاکید کے لیے۔ مطلب ہے اپنے گناہوں کی وجہ سے وہ غرق کیے گئے اور وہ آگ میں داخل ہوئے۔

(4) مِنۡ زائدہ: مِنۡ کبھی زائدہ بھی ہوتا ہے۔ مِنۡ زائدہ یا تو تحسین کلام کے لیے آتا ہے یا عموم کا معنی پیدا کرنے کے لیے یا پھر تاکید کے لیے آتا ہے۔ جیسے الانعام کی آیت 59 میں فرمایا: وَمَا تَسۡقُطُ مِنۡ وَّرَقَۃٍ اس میں وَّرَقَۃٍ لفظاً مجرور ہے مِنۡ زائدہ کی وجہ سے لیکن محلاً مرفوع ہے تَسۡقُطُ کے فاعل ہونے کی وجہ سے۔ اگر ہوتا مَا تَسۡقُطُ وَرَقَۃٌ تو معنی ہونے تھے 'نہیں گرتا کوئی پتّا'...... لیکن مِنۡ زائدہ لگ جانے کی وجہ سے وَرَقَۃٌ میں تاکید اور عموم کے معنی پیدا ہوئے ہیں، اردو زبان میں اس کی ترجمانی ہوگی 'نہیں گرتا کوئی بھی پتّا'۔ اسی طرح سورۃ الانعام کی آیت 38 میں فرمایا: وَمَا مِنۡ دَآبَّۃٍ فِی الۡاَرۡضِ اس میں دَآبَّۃٍ لفظاً مجرور ہے مِنۡ زائدہ کی وجہ سے اور محلاً مرفوع ہے مبتدا ہونے کی وجہ سے، ترجمانی ہوگی 'نہیں ہے کوئی بھی چلنے والا زمین میں'۔ اسی آیت میں آگے فرمایا مَا فَرَّطۡنَا فِی الۡکِتٰبِ مِنۡ شَیۡءٍ ...... شَیۡءٍ لفظاً مجرور ہے مِنۡ زائدہ کی وجہ سے لیکن محلاً منصوب ہے فَرَّطۡنَا کے مفعول ہونے کی وجہ سے۔ ترجمانی ہوگی اور ہم نے نہیں چھوڑی لکھنے میں کوئی بھی چیز۔ اسی طرح کی اور کئی مثالیں قرآن مجید سے دیکھی جاسکتی ہیں۔ مِنۡ زائدہ ہونے کے لیے تین شرطیں ہیں۔ (١) اس سے پہلے نفی، نہی یا استفہام ہو۔ (٢) مجرور، نکرہ ہو۔ (٣) مجرور، فاعل، مفعول یا مبتدا ہو۔ (واللہ اعلم)

(5) مِنۡ بمعنی عَنۡ: یعنی مِنۡ کا استعمال عَنۡ کے معنوں میں جیسے فرمایا فَوَیۡلٌ لِّلۡقٰسِیَۃِ قُلُوۡبُھُمۡ مِّنۡ ذِکۡرِ اللّٰہِ ؕ (الزمر:22) یہاں مِن سے مراد ہے عَنۡ

ذِكْرِ اللّٰهِ- مطلب ہے اللہ کی یاد کو چھوڑ کر جن کے دل سخت پڑ گئے۔ ان کے لیے وَيْلٌ ہے یا فرمایا يٰوَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا (الانبیاء:97) یعنی ہائے اس کو چھوڑ کر ہم غفلت میں تھے۔ یہاں بھی مِنْ بمعنی عَنْ هٰذَا ہے۔

(6) مِنْ بمعنی 'بِ': یعنی مِنْ کا استعمال 'ب' کے معنوں میں۔ جیسے فرمایا يَنْظُرُوْنَ مِنْ طَرْفٍ خَفِيٍّ (الشوریٰ:45) وہ دیکھیں گے چوری کی نگاہ سے۔ مِنْ یہاں 'ب' کا ہم معنی ہے۔

(7) مِنْ بمعنی فِيْ: یعنی مِنْ کا استعمال فِيْ کے معنوں میں جیسے فرمایا يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ (الجمعہ:9) یہاں مِنْ، فِيْ کا ہم معنی ہے۔

(8) مِنْ بمعنی عَلٰى: یعنی مِنْ کا استعمال عَلٰى کے معنوں میں جیسے فرمایا وَنَصَرْنٰهُ مِنَ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا (الانبیاء:77) یہاں مِنَ الْقَوْمِ بمعنی عَلَى الْقَوْمِ ہے۔ (واللہ اعلم)

مِنْ کے اور بھی استعمالات ہیں جو کہ لغات القرآن حصہ پنجم سے دیکھے جا سکتے ہیں۔

آیت:9

﴿ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝ ﴾

خ د ع

(ف) خَدَعًا — دھوکا دینا۔ ﴿ وَاِنْ يُّرِيْدُوْٓا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ ﴾ (8/ الانفال:62) "اور اگر وہ لوگ ارادہ کریں کہ وہ لوگ آپ ﷺ کو دھوکا دیں تو بیشک آپ ﷺ کے لئے اللہ کافی ہے۔"

خَادِعٌ — اسم الفاعل ہے۔ دھوکا دینے والا۔ ﴿ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ﴾ (4/ النساء:142) "بے شک منافق (اپنے گمان میں) دھوکہ دے رہے ہیں اللہ کو اور اللہ تعالیٰ سزا دینے والا ہے انہیں (اس دھوکہ بازی کی)۔"

(مفاعلہ) خِدَاعًا — دوسرے کو دھوکا دینے کی کوشش کرنا۔ جو کچھ دل میں ہو اُس کے خلاف ظاہر کرنا۔ فریب دینا۔ آیت زیر مطالعہ۔

اَللّٰهُ (ء ل ہ): آیت بسم اللہ دیکھیں۔ اٰمَنُوْا (ء م ن): البقرۃ، آیت 3 دیکھیں۔

ن ف س

(ک) نَفَاسَةً — پسندیدہ ہونا۔ نفیس ہونا۔ قرآن مجید میں ثلاثی سے فعل استعمال نہیں ہوا۔

نَفْسٌ — ج: اَنْفُسٌ اور نُفُوْسٌ۔ عربی زبان میں یہ لفظ بہت وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً

(1) سانس کے لیے جو ناک اور منہ کے ذریعے بدن کے اندر جاتا ہے جس پر زندگی کا دارومدار ہے۔ (اس کے لیے نَفَسٌ بھی استعمال ہوتا ہے)۔

(2) زندگی یا حیات کے لیے۔

(3) ہر جان اور ہر جاندار کے لیے جیسے آل عمران۔185 میں فرمایا كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ "ہر جاندار کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔" (ترجمہ ماجدیؒ)

(4) انسانی وجود، آدمی، شخص کے لیے جیسے البقرۃ۔48 میں فرمایا وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا "اور ڈرو

اُس دن سے کہ کام نہ آئے کوئی شخص کسی کے کچھ بھی۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ) یا آیت 281 میں فرمایا وَ اتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ۗ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ''اور ڈرتے رہو اُس دن سے کہ جس دن لوٹائے جاؤ گے اللہ کی طرف پھر پورا دیا جائے گا ہر شخص کو جو کچھ اس نے کمایا اور ان پر ظلم نہ ہوگا۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ) یا آیت 44 میں فرمایا اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَ تَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ ''کیا تم دوسرے لوگوں کو تو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔آیت زیر مطالعہ میں بھی اَنْفُسٌ انہیں معنوں میں ہے۔

(5) روح کے لیے۔جیسے الانعام آیت۔93 میں فرمایا وَ لَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ ۚ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ اس آیت کا حضرت شیخ الہندؒ ترجمہ کرتے ہیں: ''اور اگر تو دیکھے جس وقت کہ ظالم ہوں موت کی سختیوں میں اور فرشتے اپنے ہاتھ بڑھا رہے ہیں کہ نکالو اپنی جانیں۔'' اور حاشیہ میں فرماتے ہیں: ''یعنی روح قبض کرنے اور سزا دینے کو ہاتھ بڑھا رہے ہیں۔'' اسی طرح حضرت عبدالماجد دریا بادیؒ اس آیت کا ترجمہ کرتے ہیں: ''کاش آپؐ اُس وقت دیکھیں جب (یہ) ظالم موت کی سختیوں میں ہوں گے اور فرشتے اپنے ہاتھ (اُن کی طرف) بڑھا رہے ہوں کہ اپنی جانیں (جلد) نکالو۔'' اور آگے حاشیہ میں فرماتے ہیں: ''اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ سے یہ بھی صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ انسان کی جان یا روح اس کے جسم سے الگ یا مغایر ایک چیز ہے۔'' صاحبؒ مفردات القران نے بھی نفس بمعنی روح کے تحت یہی آیت حوالے کے طور پر لکھی ہے۔ یا فرمایا الزمر آیت۔42 میں اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَ الَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا ۚ فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَ يُرْسِلُ الْاُخْرٰٓى اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ اللہ ہی روحوں کو ان کی موت کے وقت اور جن کی موت نہیں آئی انہیں ان کی نیند کے وقت قبض کر لیتا ہے، پھر جن پر موت کا حکم لگا چکا ہے انہیں تو روک لیتا ہے اور دوسری (روحوں) کو ایک مقرر وقت تک کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔'' (ترجمہ احسن البیان)، حضرت پیر کرم شاہ صاحبؒ اس آیت کا ترجمہ یوں کرتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ قبض کرتا ہے جانوں کو موت کے وقت اور جن کی موت کا وقت ابھی نہیں آیا (ان کی روحیں) حالت نیند میں، پھر روک لیتا ہے ان روحوں کو جن کی موت کا فیصلہ کرتا ہے۔اور واپس بھیج دیتا ہے دوسری رُوحوں کو مقرر میعاد تک۔'' تفسیر معارف القرآن میں بھی حضرت مفتی محمد شفیعؒ نے اس آیت میں نفس سے روح ہی مراد لی ہے۔(واللہ اعلم)

(6) دل، جی کے لیے۔جیسے المائدۃ کی آیت۔116 میں فرمایا تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَ لَآ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ ؕ ''تو جانتا ہے جو کچھ میرے دل میں ہے اور میں نہیں جانتا جو کچھ تیرے دل میں ہے۔'' (ترجمہ ماجدیؒ) یا بنی اسراءیل کی آیت۔25 میں فرمایا: رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ ؕ ''تمہارا پروردگار خوب جانتا ہے اُس کو جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے۔'' (ترجمہ ماجدیؒ) ''تمہارا رب خوب جانتا ہے جو تمہارے جی میں ہے۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)

(7) نفس بمعنی ذات۔آل عمران کی آیت۔30 میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: وَ يُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ؕ ''اور اللہ تم کو اپنی ذات سے ڈراتا ہے۔'' اس آیت کی وضاحت کرتے ہوئے امام راغبؒ فرماتے ہیں: ''اس آیت میں نفس بمعنی ذات ہے۔اور یہاں نَفْسَهٗ کی اضافت اگرچہ لفظی لحاظ سے مضاف اور مضاف الیہ میں مغایرۃ کو چاہتی ہے لیکن من حیث المعنی دونوں سے ایک ہی ذات مراد ہے۔ کیونکہ ذات باری تعالیٰ ہر قسم کی دوئی سے پاک ہے۔'' (مفردات القرآن، ج ۲، ص: ۱۰۷) یا المائدۃ کی آیت۔116 میں فرمایا وَ لَآ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ ؕ اور میں نہیں جانتا جو کچھ تیرے دل میں ہے۔'' (ترجمہ ماجدیؒ) آگے حاشیہ میں حضرتؒ فرماتے ہیں: ''مَا فِيْ نَفْسِكَ بعض اہل باطل نے حق تعالیٰ کی تجسیم نکالنا چاہی ہے، اور

کہا ہے کہ نفس سے مراد شخص ہوتی ہے۔لیکن جیسا کہ امام رازیؒ نے فرمایا اوّل تو نفس و ذات مرادف ہیں۔شخصیت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔اور پھر نَفْسِیْ کے مقابلہ میں نَفْسِكَ لانا ہی بہ قاعدۂ مشاکلت عربی اسلوب بیان میں فصیح تر ہے۔'' (تفسیر ماجدیؒ۔۳۱۹)۔

نفس سے اگر روح اور جان مراد ہو تو مؤنث استعمال ہوتا ہے اور اگر شخص مراد ہو تو مذکر استعمال ہوتا ہے۔

نفس کی تین حالتیں: نفس مطمئنہ، نفس امّارہ، نفس لوّامہ: نفس کی تین حالتوں کی وضاحت کرتے ہوئے حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں: ''محققین نے لکھا ہے کہ آدمی کا نفس ایک چیز ہے لیکن اس کی تین حالتوں کے اعتبار سے تین نام ہو گئے ہیں۔اگر نفس عالم علوی کی طرف مائل ہوا اور اللہ کی عبادت و فرمانبرداری میں اس کو خوشی حاصل ہوئی اور شریعت کی پیروی میں سکون اور چین محسوس کیا اُس نفس کو ''مطمئنہ'' کہتے ہیں۔ يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَىِٕنَّةُ ○ ارْجِعِیْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً (الفجر۔27-28) اور اگر عالم سفلی کی طرف جھک پڑا اور دنیا کی لذات و خواہشات میں پھنس کر بدی کی طرف رغبت کی اور شریعت کی پیروی سے بھاگا اُس کو ''نفس امارہ'' کہتے ہیں کیونکہ وہ آدمی کو برائی کا حکم کرتا ہے۔ وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ ؕ (یوسف۔53) اور اگر کبھی عالم سفلی کی طرف جھکتا اور شہوت وغضب میں مبتلا ہوتا ہے اور کبھی عالم علوی کی طرف مائل ہو کر اُن چیزوں کو برا جانتا ہے اور اُن سے دُور بھاگتا ہے اور کوئی برائی یا کوتاہی ہو جانے پر شرمندہ ہو کر اپنے تئیں ملامت کرتا ہے اُس کو ''نفس لوامہ'' کہتے ہیں۔حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں'' آدمی کا جی اوّل کھیل میں اور مزوں میں غرق ہوتا ہے ہرگز نیکی کی طرف رغبت نہیں کرتا۔ایسے جی کو ''امارہ بالسّوء'' کہتے ہیں۔پھر ہوش پکڑا، نیک و بد سمجھا تو باز آیا کبھی (غفلت ہوئی تو) اپنی خو پر دوڑ پڑا پیچھے کچھ سمجھ آئی تو اپنے کیے پر پچھتانے اور ملامت کرنے لگا۔ایسا نفس (جی) ''لوامہ'' کہلاتا ہے پھر جب پورا سنور گیا، دل سے رغبت نیکی ہی پر ہو گئی بیہودہ کام سے خود بخود بھاگنے لگا اور بدی کے ارتکاب بلکہ تصور سے تکلیف پہنچنے لگی وہ نفس ''مطمئنہ'' ہو گیا۔'' (تفسیر عثمانیؒ۔۷۶۶)

(تفعّل) تَنَفُّسًا سانس لینا، ظاہر ہونا۔﴿ وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ ﴾ (81/التکویر:18) ''قسم ہے صبح کی جب وہ سانس لے یعنی ظاہر ہو۔''

(تفاعل) تَنَافُسًا اس کا معنی ہے کہ چند آدمیوں کا کسی خاص مرغوب و محبوب چیز کو حاصل کرنے کے لیے جھپٹنا اور دوڑنا تاکہ دوسروں سے پہلے وہ اس کو حاصل کر لے۔بطور مقابلہ رغبت کرنا۔کسی چیز کے لئے جان کھپانا۔﴿ وَفِیْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ ﴾ (83/المطففین:26) ''اور اس میں چاہیے کہ جان کھپائیں جان کھپانے والے۔''

مُتَنَافِسٌ ج: مُتَنَافِسُوْنَ۔اسم الفاعل ہے۔جان کھپانے والا۔اوپر آیت 26 دیکھیں سورۂ المطففین کی۔

ش ع ر

(ن) شَعْرًا کسی چیز میں بال بھرنا یا لگانا۔

شُعُوْرًا، شِعْرًا بال کی طرح باریک علم حاصل کرنا۔''حواس'' سے کسی محسوس چیز کا ادراک حاصل کرنا۔شعور حاصل کرنا۔حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ فرماتے ہیں: ''شعور عربی میں علم حسی کو کہتے ہیں۔اور اسی کا نام اُردو میں احساس ہے اور مَشَاعِرُ انسان کے آلاتِ حواس کو کہتے ہیں۔''﴿ اِنْ حِسَابُهُمْ اِلَّا عَلٰى رَبِّیْ لَوْ تَشْعُرُوْنَ ﴾ (26/الشعراء:113) ''نہیں ہے ان کا حساب مگر میرے رب کے ذمہ، کاش تم لوگ شعور سے کام لیتے۔''

علم لطیف میں کلام کرنا یعنی شعر کہنا۔

شَعْرٌ ج: اَشْعَارٌ۔اسم ذات ہے۔ بال۔ ﴿وَمِنْ اَصْوَافِهَا وَ اَوْبَارِهَا وَ اَشْعَارِهَآ اَثَاثًا﴾(16/النحل:80)''اور(اسی نے بنائے ہیں) بھیڑوں کی صوف اوراونٹوں کی اون اور بکریوں کے بالوں سے مختلف گھریلوسامان۔''(ترجمہ ضیاء القرآن)

شِعْرٌ ج:اَشْعَارٌ۔اسم ذات ہے۔موزوں (مناسب، درست، وزن میں ہونا) کلام۔شعر۔شعراصل میں لطیف علم کا نام ہے لیکن عرف عام میں موزوں اور مقفّٰی کلام کوشعر کہا جانے لگا۔یعنی وہ کلام جس کا وزن بھی ہو اور قافیہ بھی۔اورشعر کہنے والے کوشاعر کہا جاتا ہے۔کفار حضورؐ کوشاعر اورقرآن مجید کوشعر کہا کرتے تھے۔لیکن بعض حقیقت شناس لوگوں نے کہا ہے کہ حضورؐ پر شاعر ہونے کی تہمت لگانے سے کفار کا مقصد موزوں اور مقفّٰی کلام بنانے کی تہمت لگانا نہیں تھا کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ قرآن اسلوب شعری سے بہت بلند ہے اور اس حقیقت کو عجمی عوام بھی سمجھ سکتے ہیں پھرفصحاء عرب کا کیا ذکر ہے۔ بلکہ وہ تو آپؐ پر (نعوذ باللہ) جھوٹ کی تہمت لگاتے تھے کیونکہ عربی زبان میں شعر بمعنی کذب (جھوٹ) اورشاعر بمعنی کاذب (جھوٹا) استعمال ہوتا ہے حتی کہ جھوٹے دلائل کو اَدِلَّةٌ شِعْرِيَةٌ کہا جاتا ہے۔اسی لیے قرآن نے شعراء کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ اورشاعروں کی پیروی گمراہ لوگ کیا کرتے ہیں اورشعر چونکہ جھوٹ کا پلندہ ہوتا ہے اس لیے مقولہ مشہور ہے کہ اَحْسَنُ الشِّعْرِ اَكْذَبُهٗ۔سب سے بہتر شعروہ ہے جوسب سے زیادہ جھوٹ پر مشتمل ہو۔اسی لیے قرآن مجید میں فرمایا گیا﴿وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ﴾ (36/یٰسین:69)''اور ہم نے تعلیم نہیں دی انؐ کوشاعری کی اور یہ شایان شان بھی نہیں ہے انؐ کے۔''

شَاعِرٌ ج: شُعَرَآءُ ۔اسم الفاعل ہے۔شعر کہنے والا۔ ﴿وَّ مَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ﴾(69/الحاقۃ:41)''اور یہ کسی شعر کہنے والے کا کلام نہیں ہے۔''﴿وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ﴾(26/الشعراء:224) ''اورشاعرلوگ،ان کی پیروی کرتے ہیں گمراہ لوگ۔''

شَعِيْرَةٌ ج: شَعَائِرُ۔اسم ذات ہے۔علامت یانشان۔﴿اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ﴾(2/البقرہ:158)''بیشک صفااورمروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔''شعائر اللہ سے وہ مقامات عبادت، زمانے، اوقات، اعمال یامخصوص اشیاء مراد ہیں،جن کواللہ تعالیٰ نے دین کی علامتیں قرار دیا ہے۔مقامات عبادت میں کعبۃ اللہ،عرفہ،مزدلفہ،منٰی، جمرات ثلاثہ، صفا،مروہ،اورتمام مساجد شامل ہیں۔زمانے یااوقات میں ماہ رمضان، حج کے ایام،عیدین، اشھر حرم، ایام تشریق اور جمعہ شامل ہیں۔اعمال میں اذان، اقامت، باجماعت نماز اورنمازعیدین شامل ہیں۔مخصوص اشیاء میں قربانی کے جانور، احرام، کتب سماویہ، یہاں تک کہ تمام حدود وفرائض شامل ہیں۔حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ فرماتے ہیں:''شَعَآئِرِ اللّٰهِ یعنی اللہ کے دین کی نشانیاں یا علامتیں، دین الٰہی کے وہ شعائر جو طاعتوں میں بطورعلم کام دیں۔ شَعَآئِرِ جمع ہے **شعیرہ** کی اوراس کے معنی ہیں علامت کے۔ اصطلاح میں مرادمناسک حج کی علامتیں ہیں۔''حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ حصہ اول باب ۷،شعائر اللہ کی تعظیم واحترام میں فرماتے ہیں:''شعائر الٰہیہ سے ہماری مراد وہ ظاہری ومحسوس اموراوراشیاء ہیں جن کا تقرر اسی لیے ہوا ہے کہ ان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جائے۔ان اموروا شیاء کوخدا کی ذات سے ایسی مخصوص نسبت ہے کہ ان کی عظمت وحرمت کولوگ خوداللہ تعالیٰ کی عظمت وحرمت سمجھتے ہیں۔اوران کے متعلق کسی قسم کی کوتاہی کوذات الٰہی کے متعلق کوتاہی سمجھتے ہیں۔''پھرآگے چل کرفرماتے ہیں:''بڑے بڑے شعائر الٰہیہ چار ہیں،قرآن حکیم، کعبۃ اللہ، نبی کریمؐ اور نماز۔''شعائر اللہ کی مزید وضاحت، اگر اللہ نے چاہا،تواسی سورہ مبارکہ کی آیت 158 کے تحت کی جائے گی۔

مَشْعَرٌ (1) نشانی یا علامت۔
(2) اسم الظرف ہے۔ شعور حاصل کرنے کی جگہ۔ ﴿ فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ﴾ (2/البقرۃ:198) ''پس جب تم لوگ فارغ ہو عرفات سے تو یاد کرو اللہ کو شعور حاصل کرنے کی محترم جگہ کے پاس۔''
اَلْمَشْعَرُ الْحَرَامُ: مشعر حرام ایک پہاڑ کا نام ہے، جو مزدلفہ میں واقع ہے، مشعر کے معنی شعار اور علامت کے ہیں اور حرام بمعنی محترم و مقدس کے ہے، معنی یہ ہیں کہ یہ پہاڑ شعار اسلام کے اظہار کے لیے ایک مقدس مقام ہے، اس کے آس پاس کے میدان کو مزدلفہ کہتے ہیں۔ (معارف القرآن، ج ۱، ص ۴۸۸) ''مشعر کے لفظی معنی نشانی یا علامت کے ہیں۔ اور حرام یعنی محترم یا مقدس اس کی تعظیمی صفت ہے۔ نام اُس خاص مقام کا بھی ہے، جو مزدلفہ کی دو پہاڑیوں کے درمیان ہے، اور خود سارے مزدلفہ کو بھی المشعر الحرام ہی کہتے ہیں۔'' (تفسیر ماجدیؒ۔ ۱۰۳)

(افعال) اِشْعَارًا خبر دینا۔ شعور دینا۔ آگاہ کرنا۔ ﴿ فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ وَلْيَتَلَطَّفْ وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ اَحَدًا ﴾ (18/الکہف:19) ''پس اسے چاہیے کہ وہ تمہارے لیے لائے اس میں سے کچھ کھانا اور چاہیے کہ وہ نرمی کرے اور ہرگز اطلاع نہ دے تمہاری کسی ایک کو۔''

ترکیب يُخٰدِعُوْنَ فعل، اس میں جمع مذکر غائب کی ضمیر فاعل ہے۔ لفظ اَللّٰهَ منصوب ہونے کی وجہ سے مفعول اول ہے اور وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مفعول ثانی ہے۔ آگے 'وَ' حالیہ ہے اور 'مَا' نافیہ ہے۔ مَا يَخْدَعُوْنَ منفی جملہ ہے جس کا استثنیٰ آگے اِلَّا سے بیان ہوا ہے اور یہ تاکید کے لیے ہے۔ یہ بھی بات میں زور پیدا کرنے کا ایک انداز ہے۔ مثلاً اگر ہم کہیں کہ اللہ ہے، تو یہ ایک سادہ سی خبر ہے۔ مگر جب ہم کہتے ہیں کہ کوئی الٰہ نہیں ہے سوائے اللہ کے تو خبر وہی رہتی ہے لیکن بات کا لہجہ بالکل تبدیل ہو جاتا ہے۔ نوٹ کریں کہ یہاں يَخْدَعُوْنَ اَنْفُسَهُمْ (وہ لوگ اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں)، کہنے کے بجائے مَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ (وہ لوگ دھوکا نہیں دیتے مگر اپنے آپ کو) کہا گیا ہے۔ اَنْفُسَهُمْ مفعول بِہٖ ہے يَخْدَعُوْنَ کا۔ آگے 'وَ' عطف کا ہے اور مَا يَشْعُرُوْنَ عطف ہے جملہ مَا يَخْدَعُوْنَ پر۔ اس 'وَ' کو استئنافیہ اور حالیہ بھی مانا گیا ہے۔

ترجمہ	يُخٰدِعُوْنَ	اللّٰهَ	وَالَّذِيْنَ	اٰمَنُوْا
البقرۃ:9	وہ لوگ دھوکہ دینے کی کوشش کرتے ہیں	اللہ کو	اور ان لوگوں کو جو	ایمان لائے

وَ	مَا يَخْدَعُوْنَ	اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ	وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿٩﴾
حالانکہ	وہ لوگ دھوکہ نہیں دیتے	مگر اپنے آپ کو	اور نہ ہی وہ لوگ سمجھتے ہیں

نوٹ: 1 يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ: ''مخادعت کے معنی ہیں دھوکا دینے کی کوشش کرنا عام اس سے کہ وہ دھوکا کامیاب ہو سکے یا نہ ہو سکے۔ یہاں مخادعت کا لفظ بھی استعمال فرمایا ہے اور خدع کا لفظ بھی استعمال فرمایا ہے، جہاں لفظ کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے وہاں تو مخادعت استعمال ہوا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو دھوکا دینے کی خواہش تو کوئی شخص اپنی حماقت کے سبب سے کر سکتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس کو دھوکا دے نہیں سکتا۔ برعکس اس کے خود ان کے لیے خدع کا لفظ استعمال ہوا ہے کیونکہ جو شخص خدا کو دھوکا دینے کا ارادہ کرتا ہے وہ اپنی اس کوشش میں تو ناکام رہتا ہے لیکن خود اپنے آپ کو وہ ضرور دھوکے میں ڈال دیتا ہے۔'' (تدبر قرآن، ج ۱، ص ۱۱۸)

نوٹ: 2 وَمَا يَشْعُرُوْنَ: ''شعور کا لفظ کسی محسوس چیز کے ادراک کے لیے آیا کرتا ہے۔ یہاں اس لفظ کا استعمال اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ اگرچہ خدا کو دھوکہ دینے کی کوشش میں خود دھوکا کھا جانا ایک محسوس ہونے والی چیز ہے لیکن یہ برخود غلط لوگ ہوشیاری و چالاکی کے زعم کے باوجود اتنے غبی

ہیں کہ اس حقیقت کا احساس نہیں کر رہے ہیں کیونکہ ابھی اس کا نتیجہ ان کے سامنے نہیں آیا ہے۔'' (تدبر قرآن، ج ا، ص ١١٩)

آیت: 10

﴿ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۢ ۙ بِمَا كَانُوْا یَكْذِبُوْنَ ۝١٠ ﴾

قُلُوْبٌ (ق ل ب): البقرۃ آیت 7 دیکھیں۔

م ر ض

(س) مَرَضًا: بیمار ہونا۔ ﴿ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ ۝٨٠ ﴾ (26/الشعراء:80) ''اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہ مجھے شفا دیتا ہے۔''

مَرَضٌ اور مَرْضٌ: اسم ذات ہے۔ بیماری۔ اس کی دو قسمیں ہیں (ا) مرض جسمانی: مثلاً ﴿ وَّلَا عَلَی الْمَرِیْضِ حَرَجٌ ﴾ ''اور نہ بیمار آدمی پر الزام ہے۔'' (ب) مرض اخلاقی: مرض کا لفظ اخلاق کے بگڑنے پر بھی بولا جاتا ہے اس سے برے اخلاق مراد ہوتے ہیں مثلاً: شک، بزدلی، جہالت، حسد، نفاق وغیرہ۔ جس طرح جسمانی مرض انسان کے بدن کو کمزور کرتے ہیں اسی طرح برے اخلاق انسان کے دین کو کمزور کرتے ہیں مثلاً: آیت زیر مطالعہ اور ﴿ وَاِذْ یَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اِلَّا غُرُوْرًا ۝١٢ ﴾ (33/الاحزاب:12) ''اور جب کہا منافقوں نے اور ان لوگوں نے جن کے دلوں میں مرض ہے، ہم سے وعدہ نہیں کیا اللہ نے اور اس کے رسول نے مگر فریب کا۔'' حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ 'مرض' کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''مرض اور بیماری اس کیفیت کو کہتے ہیں جس سے انسان اپنے اعتدال مناسب سے نکل جائے، اور اس کے افعال میں خلل پیدا ہو جائے، جس کا آخری نتیجہ ہلاکت اور موت ہوتا ہے۔ قرآن و حدیث کی اصطلاح میں اُن نفسانی کیفیات کو بھی مرض کہا جاتا ہے جو نفس انسانی کے کمال میں خلل انداز ہوں، اور جن کی وجہ سے انسان اپنے انسانی اعمال سے محروم ہوتا چلا جائے جس کا آخری نتیجہ روحانی موت و ہلاکت ہے۔'' (معارف القرآن، ج ا، ص: ١٢٤)۔ صاحبؒ تدبر قرآن فرماتے ہیں: ''مرض کا لفظ قرآن میں عموماً دو معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ایک کینہ اور حسد کے معنی میں۔ دوسرے نفاق کے معنی میں۔ جن مقامات میں یہ لفظ نفاق کے ساتھ استعمال ہوا ہے وہاں تو یہ واضح طور پر کینہ اور حسد کے معنی میں ہے لیکن جن مقامات میں یہ تنہا استعمال ہوا ہے۔ وہاں یا تو دونوں معانی اس کے اندر جمع ہیں یا قرینہ اس کے دونوں معانی میں سے کسی ایک معنی کو متعین کرتا ہے۔'' (تدبر قرآن، ج ا، ص ١١٩)۔

مَرِیْضٌ: ج: مَرْضٰی - فَعِیْلٌ کے وزن پر صفت ہے۔ بیمار۔ ﴿ وَمَنْ كَانَ مَرِیْضًا اَوْ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ ؕ ﴾ (2/البقرۃ:185) ''اور جو مریض ہو یا سفر پر ہو تو گنتی ہے یعنی شمار پورا کرنا ہے دوسرے دنوں میں۔'' ﴿ وَلَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ اِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًی مِّنْ مَّطَرٍ اَوْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤی اَنْ تَضَعُوْۤا اَسْلِحَتَكُمْ ۚ ﴾ (4/النساء:102) ''اور کوئی گناہ نہیں ہے تم لوگوں پر اگر تم میں ہوں کچھ لوگ تکلیف میں بارش کے سبب سے، یا تم ہو بیمار، کہ تم کھول دو اپنے ہتھیار۔''

ز ی د

(ض) زِیَادَةً، زَیْدًا، مَزِیْدًا: (1) بڑھنا، زیادہ ہونا (لازم)۔ ﴿ وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰی مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ یَزِیْدُوْنَ ۝١٤٧ ﴾ (37/الصافات:147) ''اور ہم نے بھیجا اُنؑ کو ایک لاکھ لوگوں کی طرف یا وہ لوگ زیادہ ہوں گے۔''

(2) کسی چیز کے پورا ہونے پر اس میں اضافہ کرنا، بڑھانا، زیادہ کرنا (متعدی)۔ ﴿ اِنَّهُمْ فِتْیَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَ

زِدۡنٰھُمۡ ھُدًی ﴿۱۳﴾﴾ (18/الکہف:13) ''بیشک وہ کچھ نوجوان تھے جو ایمان لائے اپنے رب پر اور ہم نے بڑھایا ان کو بلحاظ ہدایت کے۔'' ﴿وَّ ادۡخُلُوا الۡبَابَ سُجَّدًا وَّ قُوۡلُوۡا حِطَّۃٌ نَّغۡفِرۡ لَکُمۡ خَطٰیٰکُمۡ ؕ وَ سَنَزِیۡدُ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴿۵۸﴾﴾ (2/البقرہ:58) ''اور تم لوگ داخل ہو دروازے میں سجدہ کرنے والوں کی حالت میں اور کہتے ہوئے کہ گناہ معاف ہوں تو ہم بخش دیں گے تمہارے لئے تمہاری خطاؤں کو اور ہم زیادہ دیں گے احسان کرنے والوں کو۔''

نَزِدۡ مضارع مجزوم ہے۔ ﴿مَنۡ کَانَ یُرِیۡدُ حَرۡثَ الۡاٰخِرَۃِ نَزِدۡ لَہٗ فِیۡ حَرۡثِہٖ ۚ﴾ (42/الشوریٰ:20) ''جو ارادہ کرتا ہے آخرت کی کھیتی کا تو ہم اضافہ کرتے ہیں اس کے لئے اس کی کھیتی میں۔''

لَا تَزِدۡ فعلِ نہی ہے۔ تو مت بڑھا۔ ﴿وَ لَا تَزِدِ الظّٰلِمِیۡنَ اِلَّا ضَلٰلًا ﴿۲۴﴾﴾ (71/نوح:24) ''اور تو مت بڑھا ظالموں کو مگر گمراہی میں۔''

زِدۡ فعلِ امر ہے۔ تو بڑھا۔ ﴿اَوۡ زِدۡ عَلَیۡہِ وَ رَتِّلِ الۡقُرۡاٰنَ تَرۡتِیۡلًا ؕ﴿۴﴾﴾ (73/المزمل:4) ''یا آپ ﷺ اضافہ کریں اس پر اور ترتیل سے پڑھیں قرآن کو جیسا کہ ترتیل کا حق ہے۔'' ﴿وَ قُلۡ رَّبِّ زِدۡنِیۡ عِلۡمًا ﴿۱۱۴﴾﴾ (20/طٰہٰ:114) ''اور آپؐ کہیے اے میرے رب تو بڑھا مجھ کو بلحاظ علم کے۔''

زِیَادَۃٌ اسم ذات ہے۔ اضافہ، زیادتی۔ ﴿اِنَّمَا النَّسِیۡٓءُ زِیَادَۃٌ فِی الۡکُفۡرِ﴾ (9/التوبۃ:37) ''بیشک مہینے پیچھے کرنا اضافہ ہے کفر میں۔''

مَزِیۡدٌ اسم ذات ہے۔ اضافی چیز۔ ﴿لَہُمۡ مَّا یَشَآءُوۡنَ فِیۡہَا وَ لَدَیۡنَا مَزِیۡدٌ ﴿۳۵﴾﴾ (50/قٓ:35) ''ان کے لئے اس میں ہے جو وہ لوگ چاہیں گے اور ہمارے پاس اور بھی چیزیں ہیں۔''

(افتعال) **اِزۡدِیَادًا** بڑھنا، زیادہ ہونا۔ ﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بَعۡدَ اِیۡمَانِہِمۡ ثُمَّ ازۡدَادُوۡا کُفۡرًا لَّنۡ تُقۡبَلَ تَوۡبَتُہُمۡ ۚ﴾ (3/آل عمران:90) ''بیشک جن لوگوں نے ناشکری کی اپنے ایمان کے بعد پھر وہ لوگ زیادہ ہوئے بلحاظ ناشکری کے تو ہرگز قبول نہیں کی جائے گی ان کی توبہ۔'' (نوٹ: 'ز ی د' مادہ جب باب افتعال میں استعمال ہوتا ہے تو افتعال کی 'ت' تبدیل ہو کر 'د' میں بدل جاتی ہے۔ اور یہ ایک استثنائی صورت ہے۔ باب افتعال کے خصوصی قواعد میں سے ایک قاعدہ یہ ہے کہ باب افتعال کے 'ف' کلمہ پر اگر د، ذ، ز آجائے تو باب کی 'ت' تبدیل ہو کر وہی حرف بن جاتی ہے۔ چنانچہ اس قاعدے کے لحاظ سے 'ت' کو 'ز' میں تبدیل ہونا چاہیے تھا لیکن خلاف قاعدہ 'ت'، 'د' میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس قاعدہ کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو آسان عربی گرامر از لطف الرحمٰن خان صاحب۔ حصہ سوم، صفحہ ۶۳)

اَللّٰہُ (ء ل ہ): آیت بسم اللہ دیکھیں۔

ع ذ ب

(ض) **عَذۡبًا** پیاس کی شدت کی وجہ سے کچھ کھانے کے قابل نہ رہنا۔ روکنا۔

(س) **عَذَبًا** پانی کا کائی دار ہونا۔

(ک) **عُذُوۡبَۃً** پانی کا میٹھا اور خوشگوار ہونا۔ (ثلاثی مجرد سے کوئی فعل قرآن مجید میں استعمال نہیں ہوا)۔

عَذۡبٌ صفت ہے۔ خوشگوار پانی۔ میٹھا پانی۔ ﴿وَ ہُوَ الَّذِیۡ مَرَجَ الۡبَحۡرَیۡنِ ہٰذَا عَذۡبٌ فُرَاتٌ وَّ ہٰذَا مِلۡحٌ اُجَاجٌ ۚ﴾ (25/الفرقان:53) ''اور وہی ہے جس نے ملائے دو سمندر، یہ خوشگوار شیریں ہے اور یہ نمکین تلخ ہے۔''

عَذَابٌ اسم ذات ہے۔ ہر وہ چیز جو انسان کو تکلیف دے، مشقت میں ڈالے۔ عذاب۔ ﴿لَہُمۡ فِی الدُّنۡیَا خِزۡیٌ وَّ لَہُمۡ فِی

الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۱۴﴾ (2/البقرہ:114) ''ان کے لیے ہے دنیا میں رسوائی اور ان کے لیے ہے آخرت میں عظیم عذاب۔''

(تفعیل) **تَعْذِيْبًا** کسی کو تکلیف دینا۔عذاب دینا۔﴿وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَاِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ؕ﴾(9/التوبہ:106) ''اور کچھ دوسرے لوگ موقوف رکھے گئے اللہ کے فیصلے کے لیے، چاہے وہ عذاب دے ان کو اور یا وہ توبہ قبول کرے ان کی۔''

مُعَذِّبٌ ج: مُعَذِّبُوْنَ۔اسم الفاعل ہے۔ عذاب دینے والا۔ ﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ﴿۳۳﴾﴾ (8/الانفال:33) ''اور نہیں ہے اللہ ان کو عذاب دینے والا اس حال میں کہ وہ لوگ مغفرت طلب کرتے ہیں۔''

ء ل م

(س) **اَلَمًا** دکھی ہونا، تکلیف اٹھانا۔﴿وَلَا تَهِنُوْا فِي ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ ؕ اِنْ تَكُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ فَاِنَّهُمْ يَاْلَمُوْنَ كَمَا تَاْلَمُوْنَ ۚ وَتَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ ؕ﴾(4/النساء:104) ''اور تم لوگ سستی مت کرو اس قوم یعنی کافروں کی تلاش میں۔اگر تم لوگ تکلیف اٹھاتے ہو تو یقیناً وہ لوگ بھی تکلیف اٹھاتے ہیں جیسے تم لوگ تکلیف اٹھاتے ہو۔اور تم لوگ امید رکھتے ہو اللہ سے جس کی وہ لوگ امید نہیں رکھتے۔''

اَلِيْمٌ فَعِيْلٌ کا وزن ہے۔دردناک، تکلیف دینے والا۔عَذَابٌ اَلِيْمٌ (دردناک عذاب)۔

ك و ن

(ن) **كَوْنًا** کسی چیز کا اپنا وجود پانا۔کسی نئی بات کے وجود میں آنے کی خبر دینا۔واقع ہونا۔ہو جانا (مصدری معنی)۔ کَانَ فعل ناقص بھی ہے اور فعل تام بھی۔فعل ناقص کی صورت میں جملہ اسمیہ پر داخل ہوتا ہے۔مبتدا حالت رفع میں ہی رہتا ہے جبکہ خبر حالت نصب میں آجاتی ہے۔مبتدا کو اس کا اسم اور خبر کو کَانَ کی خبر کہتے ہیں۔فعل تام کی صورت میں اس کا صرف اسم ہوتا ہے اور خبر نہیں ہوتی۔ایسی صورت میں کَانَ فعل ہوتا ہے اور اسم دراصل اس کا فاعل ہوتا ہے۔فعل اور فاعل مل کر بات مکمل کر دیتے ہیں۔ایسی صورت میں اس کا معنی ہوتا ہے ''موجود ہونا'' یا ''پایا جانا۔''

<u>کَانَ کے معنوی استعمالات</u>: (1) ماضی: کَانَ سے ماضی مراد لیا جاتا ہے۔مثلاً ﴿اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً﴾ ''یقیناً حضرت ابراہیمؑ اپنی ذات میں ایک پوری امت تھے۔'' کبھی اس سے ماضی بعید مراد لیا جاتا ہے جیسے فرمایا: ﴿كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً﴾ ''ابتدا میں سب لوگ ایک ہی طریقے پر تھے۔'' (یاد کر لیجئے کہ فعل ماضی پر کَانَ داخل کرنے سے بھی ماضی بعید کے معنی پیدا ہوتے ہیں)۔کبھی اس سے ماضی استمراری (یعنی ماضی میں کسی کام کا مسلسل ہوتے رہنا) مراد لیا جاتا ہے۔ایسی صورت میں کَانَ کا مضارع پر داخل ہونا ضروری ہے۔جیسے آیت زیر مطالعہ میں فرمایا:﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ﴾۔ماضی قریب کے لیے بھی کَانَ استعمال ہوتا ہے یہاں تک کہ بات کرتے ہوئے ایک لمحہ پہلے کے وقت کے لیے بھی اس کا استعمال جائز ہے۔جیسے فرمایا﴿كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا﴾ ''ہم کیسے گفتگو کریں اس سے جو (ایک سیکنڈ پہلے) جھولے میں بچہ تھا۔'' کبھی کَانَ ''ماضی غیر منقطع'' کے لیے استعمال ہوتا ہے یعنی ایک چیز جو ماضی میں تھی اس کا وجود یا حیثیت حال میں بھی ویسے ہی ہے۔مثلاً﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ﴾ اس کے معنی ہیں كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ فِي عِلْمِ اللّٰهِ یعنی تم اللہ تعالیٰ کے علم میں پہلے ہی سے بہترین

امت تھے اور اب بھی بہترین امت ہو۔

(2) کَانَ کا استعمال جب اللہ تعالیٰ کی صفات کے ساتھ ہو تو اس سے دوام اور ازلیت کے معنی لیے جاتے ہیں یعنی وہ صفت ہمیشہ سے ہے، اب بھی ہے اور ہمیشہ رہے گی بالکل اسی طرح جیسے اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے ہے، اب بھی ہے اور ہمیشہ رہے گا: ﴿وَ کَانَ اللّٰہُ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمًا﴾ ''اللہ تعالیٰ ہر چیز سے ازلاً ابداً خوب واقف ہے۔'' ﴿وَ کَانَ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرًا﴾ ''اللہ کی ازلی ابدی قدرت ہر چیز کو محیط ہے۔''

(3) کَانَ کا استعمال جب کسی چیز کی ایسی صفت سے متعلق ہو جو اس میں موجود ہو تو معنی ہوتے ہیں کہ وہ صفت اس چیز کے ساتھ لازم و ملزوم ہے اور بہت ہی کم اس سے جدا ہوتی ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿وَ کَانَ الۡاِنۡسَانُ کَفُوۡرًا﴾، ﴿وَ کَانَ الۡاِنۡسَانُ قَتُوۡرًا﴾، ﴿وَ کَانَ الۡاِنۡسَانُ اَکۡثَرَ شَیۡءٍ جَدَلًا﴾ ان آیات میں انسان کی جن صفات کا ذکر کیا گیا ہے ان سے مراد ہے کہ اکثر انسانوں کی یہ لازمی صفات ہیں اور شاذ و نادر ہی ان سے الگ ہوتی ہیں۔ اسی طرح شیطان کے متعلق فرمایا: ﴿وَ کَانَ الشَّیۡطٰنُ لِلۡاِنۡسَانِ خَذُوۡلًا﴾، ﴿وَ کَانَ الشَّیۡطٰنُ لِرَبِّہٖ کَفُوۡرًا﴾ یعنی یہ دونوں صفات خذول اور کفور، شیطان کی لازمی صفات میں سے ہیں۔ اسی طرح باطل کے متعلق فرمایا ﴿اِنَّ الۡبَاطِلَ کَانَ زَہُوۡقًا﴾ یعنی باطل ہمیشہ مٹ جاتا ہے اور کبھی قائم اور دائم نہیں رہتا۔

(4) ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل ہونے کے لیے بھی کَانَ کا استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً: ﴿وَ کَانَ مِنَ الۡکٰفِرِیۡنَ﴾ اکثر بزرگوں نے اس آیت کے معنی یہ بیان کیے ہیں کہ ابلیس انکار اور تکبر کر کے کافروں میں سے ہو گیا۔ ﴿فَاَتۡبَعَہُ الشَّیۡطٰنُ فَکَانَ مِنَ الۡغٰوِیۡنَ﴾ ''تب پیچھے لگ گیا اس کے شیطان تو وہ ہو گیا گمراہوں میں سے۔'' (واللہ اعلم)

(5) کَانَ کبھی مستقبل کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا: ﴿یَوۡمًا کَانَ شَرُّہٗ مُسۡتَطِیۡرًا﴾ ''وہ دن جس میں شر عمومی ہوگا (یعنی قیامت کا دن)۔'' (تلخیص از مفردات القرآن ولغات القرآن)

کَائِنٌ اسم الفاعل ہے۔ واحد مذکر۔ ہو جانے والا۔

کَائِنَۃٌ ج: کَائِنَاتٌ۔ اسم الفاعل ہے۔ واحد مؤنث۔ ہو جانے والی۔ کائنات سے مراد ہے اللہ تعالیٰ کے امر کُنۡ کے نتیجے میں ہو جانے والی تمام چیزیں۔

کُنۡ فعل امر ہے۔ تو ہو جا۔ ﴿وَ کُنۡ مِّنَ الشّٰکِرِیۡنَ ﴿۱۴۴﴾﴾ (7/الاعراف:144) ''اور تو ہو جا شکر کرنے والوں میں سے۔''

مَکَانٌ مَفۡعَلٌ کے وزن پر اسم الظرف ہے۔ واقع ہونے کی جگہ۔ پھر مطلقاً جگہ۔ ٹھکانہ وغیرہ کے معانی میں آتا ہے۔ ﴿وَ اِذَا بَدَّلۡنَاۤ اٰیَۃً مَّکَانَ اٰیَۃٍ ۙ﴾ (16/النحل:101) ''اور جب ہم بدلتے ہیں کسی آیت کو کسی آیت کی جگہ۔'' ﴿اُولٰٓئِکَ شَرٌّ مَّکَانًا﴾ (5/المائدہ:60) ''وہ لوگ زیادہ برے ہیں ٹھکانے کے لحاظ سے۔''

مَکَانَۃٌ مَفۡعَلَۃٌ کا وزن ہے۔ یہ بھی اسم ظرف کا وزن ہے۔ لفظی معنی ہیں مقام، جگہ۔ مجازاً (یعنی کسی لفظ کے غیر حقیقی معنی) اس سے ''حالت'' اور ''طریقہ'' مراد لیا جاتا ہے۔ ﴿قُلۡ یٰقَوۡمِ اعۡمَلُوۡا عَلٰی مَکَانَتِکُمۡ﴾ (6/الانعام:135) ''آپ کہہ دیجیے اے میری قوم والو! عمل کرتے رہو اپنے طریقے پر۔'' (ترجمہ ماجدیؒ) ''تو کہہ دے اے لوگو! تم کام کرتے رہو اپنی جگہ پر۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ) ''آپ فرما دیجیے کہ اے میری قوم تم اپنی حالت پر عمل کرتے رہو۔'' (ترجمہ احسن البیان) یا فرمایا: ﴿وَ قُلۡ لِّلَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ اعۡمَلُوۡا عَلٰی مَکَانَتِکُمۡ ؕ﴾ (11/ھود:121) ''اور آپ اُن لوگوں سے کہہ دیجیے جو ایمان نہیں لاتے کہ تم اپنی حالت پر عمل کرتے رہو۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔

مَكِيْنٌ فَعِيْلٌ کے وزن پر صفت مشبہ کا صیغہ ہے کَوْنٌ مصدر سے۔ اس سے بھی مختلف معنی مراد لیے جاتے ہیں مثلاً معزز، مرتبہ والا، مضبوط، محفوظ اور مکان میں رہنے والا۔ ﴿ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ﴾ (23/مومنون:13) ''پھر ہم نے اُسے نطفہ بنایا ایک محفوظ مقام میں۔'' (ترجمہ ماجدیؒ) ﴿ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ﴾ (81/التکویر:20) ''جو قوت والا ہے عرش والے (اللہ) کے نزدیک بلند مرتبہ ہے۔'' (ترجمہ احسن البیان) ﴿ قَالَ اِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِيْنٌ اَمِيْنٌ ﴾ (12/یوسف:54) ''تو اُن سے کہا گیا کہ تم آج سے ہمارے ہاں (ہر طرح) معزز اور معتبر ہو۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)

(استفعال) اِسْتِكَانَةً وجود چاہنا۔ عاجزی کرنا۔ جھک جانا۔ ﴿ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ﴾ (3/آل عمران:146) ''اور نہ وہ کمزور ہوئے اور نہ وہ جھکے۔''

ك	ذ	ب

(ض) كِذْبًا، كَذِبًا جانتے بوجھتے کسی کو غلط خبر دینا۔ جھوٹ بولنا۔ دل اور زبان کی ہم آہنگی نہ ہونا۔ ﴿ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ تَرَى الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلَى اللّٰهِ وُجُوْهُهُمْ مُّسْوَدَّةٌ ﴾ (39/الزمر:60) ''اور قیامت کے دن تو دیکھے گا ان لوگوں کو جنہوں نے جھوٹ کہا اللہ پر کہ ان کے چہرے کالے ہیں۔'' كِذْبٌ، صِدْقٌ کی ضد ہے۔ کذب (جھوٹ)، قول (بات) میں بھی ہوتا ہے، فعل میں بھی اور عقیدے میں بھی۔ کوئی بات اگر حقیقت کے مطابق نہ ہو تو وہ جھوٹ ہے۔ اسی طرح اس کا استعمال افعال جوارح (جارحہ کی جمع۔ انسان کے ہاتھ پاؤں اور دیگر اعضاء) کے لیے بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ جب کوئی شخص جنگ کا حق ادا کردے اور جو کچھ اس پر واجب تھا وہ کر دکھائے تو کہا جاتا ہے صَدَقَ فِي الْقِتَالِ یعنی وہ جنگ میں سچا رہا اور اگر اس کے خلاف ہو تو کہا جاتا ہے كَذَبَ فِي الْقِتَالِ وہ جنگ میں جھوٹا رہا یعنی بودا (بزدل، کمزور، پھُس پھُسا) ثابت ہوا۔ اسی طرح کذب کا استعمال ایسی بات کے لیے بھی ہوتا ہے جو بظاہر تو صحیح ہو لیکن عقیدے کے مطابق نہ ہو۔ جیسے فرمایا: ﴿ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ﴾ بے شک منافق جھوٹے ہیں۔ منافق حضورؐ کی نبوت کی زبانی گواہی تو دیتے تھے لیکن چونکہ دل سے آپؐ کو اللہ کا رسول تسلیم نہیں کرتے تھے اسی لیے ان کو جھوٹا کہا گیا۔

كَذِبٌ اسم ذات ہے۔ جھوٹ، جھوٹی بات۔ ﴿ وَاِنْ يَّكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهٗ ﴾ (40/المومن:28) ''اور اگر وہ جھوٹ بولنے والا ہے تو اس پر ہے اس کا جھوٹ۔''

كَاذِبٌ اسم الفاعل ہے۔ جھوٹ بولنے والا، جھوٹا۔ اوپر آیت المومن:28 دیکھیں۔

مَكْذُوْبٌ اسم المفعول ہے بمعنی جھوٹ۔ لفظی معنی ہے جو جھوٹ بولا گیا۔ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ کا معنی ہے جھوٹ کے بغیر۔ ﴿ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ ﴾ (11/ھود:65) ''یہ وعدہ جھوٹا نہیں ہے۔''

كَذَّابٌ فَعَّالٌ کا وزن ہے۔ اسم المبالغہ۔ بہت زیادہ جھوٹ بولنے والا۔ بہت بڑا جھوٹا۔ ﴿ وَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ﴾ (38/صٓ:4) ''اور کہا انکار کرنے والوں نے کہ یہ بڑا جھوٹا جادوگر ہے۔''

(تفعیل) تَكْذِيْبًا، كِذَّابًا كِذَّابًا بھی باب تفعیل میں بطور مصدر استعمال ہوتا ہے۔ جھٹلانا۔ کسی کو جھوٹا قرار دینا چاہے وہ حقیقت میں سچا ہو یا واقعی جھوٹا ہو، دونوں حالتوں میں اس کا استعمال ہوتا ہے البتہ قرآن مجید میں اس کا استعمال اللہ تعالیٰ، اُس کے انبیاء اور اُن کی بتائی ہوئی باتوں اور اللہ تعالیٰ کی آیات کی تکذیب کے لیے یہ استعمال ہوا ہے۔ ﴿ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ﴾ (2/البقرۃ:39) ''اور جن لوگوں نے انکار کیا اور جھٹلایا ہماری نشانیوں کو، وہ لوگ آگ والے ہیں۔'' ﴿ وَّكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كِذَّابًا ﴾ (78/النباء:28) ''اور ہماری آیتوں کو انہوں نے بالکل جھٹلا دیا۔''

مُکَذِّبٌ ج: مُکَذِّبُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے ۔جھٹلانے والا۔﴿فَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا کَیْفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الْمُکَذِّبِیْنَ ﴾ (3/آل عمران:137)''تو سیر کروزمین کی، پس دیکھو کیسا تھا انجام جھٹلانے والوں کا۔''

ترکیب فِیْ قُلُوْبِھِمْ قائم مقام خبر مقدم ہے، خبر مَوْجُوْدٌ محذوف ہے اور مَرَضٌ مبتداء مؤخر نکرہ ہے ۔فَزَادَ میں 'ف' نتیجہ ظاہر کرنے کے لیے ہے اور فعل زَادَ کا مفعول ھُمْ کی ضمیر ہے جبکہ مَرَضًا تمیز ہے ۔لَھُمْ قائم مقام خبر مقدم ہے، خبر وَاجِبٌ محذوف ہے اور مرکب توصیفی عَذَابٌ اَلِیْمٌ مبتداء مؤخر نکرہ ہے ۔بِمَا میں 'ب' سببیہ ہے اور 'ما' موصول ہے۔کَانُوْا یَکْذِبُوْنَ ماضی استمراری ہے اور یہ پورا جملہ صلہ ہے 'ما' کا اور صلہ اور موصول مجرور ہیں 'ب' سببیہ کی وجہ سے اور جار مجرور مل کر متعلق خبر ہیں۔

ترجمہ	فِیْ قُلُوْبِھِمْ	مَّرَضٌ	فَزَادَ	ھُمُ	اللہُ
البقرۃ:10	ان کے دلوں میں	ایک مرض ہے	تو بڑھایا	ان کو	اللہ نے

مَرَضًا	وَلَھُمْ	عَذَابٌ اَلِیْمٌ	بِمَا	کَانُوْا یَکْذِبُوْنَ ﴿۱۰﴾
مرض کے لحاظ سے	اور ان کیلئے	ایک دردناک عذاب ہے	اس سبب سے جو	وہ لوگ جھوٹ کہتے تھے

نوٹ:1 ''حضور کریم ﷺ کے خلاف منافقین کے دل میں عداوت کے جو جذبات پرورش پارہے تھے اور حسد اور غصہ کی جو چنگاریاں چیخ رہی تھیں ان کو قرآن نے مرض سے تعبیر فرمایا ہے۔جب وہ حضور کریم ﷺ اور اسلام کی روز افزوں عزت اور ترقی کو دیکھتے تو حسد وعناد کے شعلے بھڑک اُٹھتے۔ اللہ تعالیٰ اُنہیں تنبیہ فرماتا ہے کہ اگر اُنہوں نے اس مرض کو یونہی بڑھنے دیا اور اس کا علاج نہ کیا تو جس طرح جسمانی بیماریاں جسمانی موت کا باعث بنتی ہیں اسی طرح ان کا یہ مرض ان کے قلب وروح کا گلا گھونٹ کر رکھ دے گا۔'' (ضیاءالقرآن، ج۱،ص:۳۵)

نوٹ:2 حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ فَزَادَھُمْ میں 'ف' کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''فَزَادَھُمْ میں حرف 'ف' بہت اہم ہے۔یہ گویا اس کا اعلان ہے کہ آگے جس فعل کا ذکر آرہا ہے وہ محض بطور ثمرہ یا نتیجہ کے پیدا ہوا ہے۔حق تعالیٰ کی جانب اس قسم کے افعال کا انتساب صرف مجازی حیثیت رکھتا ہے۔یعنی یہ نہیں کہ اللہ نے خواہ مخواہ ان سے یہ افعال کرا چھوڑے۔اس نے تو صرف وہ حالات واسباب پیدا کردیئے، جن سے ان بدنصیبوں نے اپنے مرض کے بڑھانے کا کام لیا، ورنہ اگر وہ اپنی عقل وارادہ کا صحیح استعمال کرتے تو انہیں اسباب وحالات سے ہدایت بھی پاسکتے تھے۔ یہ سزا بھی جو کچھ ملی ٹھیک جرم کے مناسب حال ہی ملی ہے۔اس قسم کے افعال کا حق تعالیٰ کی جانب انتساب، قدیم صحیفوں کا بھی ایک محاورۂ عام ہے۔ ''اسرائیل نے مجھے نہ چاہا تب میں نے انہیں ان کے دلوں کی سرکشی کے بس میں چھوڑ دیا۔'' (زبور۸:۱۰،۱۱)''بس خدا نے منہ موڑ کر انہیں چھوڑ دیا کہ آسمانی فوج کو پوجیں'' (اعمال۷: ۴۲)''خدا نے ان کے دلوں کی خواہشوں کے مطابق اُنہیں ناپاکی میں چھوڑ دیا کہ ان کے بدن آپس میں بے حرمت کیے جائیں۔'' (رومیون۱: ۲۴)۔(تفسیر ماجدیؒ،ص۔۱۰)۔

اور مولانا امین احسن اصلاحیؒ صاحب فرماتے ہیں: ''یہاں حسد کے بڑھانے کے فعل کو اللہ تعالیٰ نے جو اپنی طرف منسوب فرمایا ہے تو یہ درحقیقت اس سنت کو اس نے اپنی طرف منسوب فرمایا ہے جس کے تحت یہ فعل انجام پاتا ہے۔اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے سینہ کو ایمان و اسلام کی جلوہ گاہ بنانے کے بجائے اس کو بغض وحسد ہی کی پرورش گاہ بنائے رکھنا چاہتا ہے تو اس کے سامنے اسی طرح کے حالات وواقعات ظاہر ہوتے ہیں جو اس کی اسی بس بھری فصل کی آبیاری کرتے ہیں۔یہود کو مسلمانوں پر حسد تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اسلام کی نعمت کیوں دے دی۔نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام اور اس کی برکتوں کی روز افزوں ترقی نے ان کے اس حسد کے اسباب میں اور زیادہ اضافہ کیا اور یہ اضافہ برابر ہوتا ہی رہا یہاں تک کہ اس چیز نے ان کو بالکل تباہ کرکے چھوڑا۔(تدبر قرآن، ج۱،ص۔۱۱۹)

آیت: 11-12

﴿وَ اِذَا قِیۡلَ لَهُمۡ لَا تُفۡسِدُوۡا فِی الۡاَرۡضِ ۙ قَالُوۡۤا اِنَّمَا نَحۡنُ مُصۡلِحُوۡنَ ﴿۱۱﴾ اَلَاۤ اِنَّهُمۡ هُمُ الۡمُفۡسِدُوۡنَ وَ لٰکِنۡ لَّا یَشۡعُرُوۡنَ ﴿۱۲﴾﴾

اِذَا یہ ظرف زمان ہے یعنی اس میں کام کرنے یا ہونے کے ''وقت'' کا مفہوم ہوتا ہے۔ عام طور پر اس کا ترجمہ ''جب، جب کبھی، اس وقت، اچانک، ناگہاں'' سے کیا جاتا ہے۔ اِذَا کے ترجمے میں عموماً مستقبل کا مفہوم ہوتا ہے خواہ وہ ماضی پر آیا ہو جیسے فرمایا: ﴿اِذَا السَّمَآءُ انۡشَقَّتۡ﴾ ''جب آسمان پھٹ جائے گا۔'' قسم کے بعد آئے تو حال کے لیے بھی آتا ہے جیسے فرمایا: ﴿وَالنَّجۡمِ اِذَا هَوٰی﴾ ''اور قسم ہے ستارے کی جب وہ گرنے لگے۔ اِذَا میں شرط کا مفہوم بھی ہوتا ہے۔ اِذَا شرطیہ کے بعد ہمیشہ فعل آتا ہے۔ اِذَا بعض دفعہ مفاجات یعنی کسی چیز کے اچانک پیش آنے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اس وقت اس کے بعد اسم کا آنا ضروری ہوتا ہے۔ اسے اِذَا اَلۡفُجَائِیَّۃُ کہتے ہیں۔ جیسے فرمایا: ﴿فَاِذَا هِیَ حَیَّۃٌ تَسۡعٰی﴾ ''پس اچانک وہ دوڑتا ہوا سانپ بن گیا۔''

قِیۡلَ اور **قَالُوۡۤا** (ق و ل): البقرۃ آیت 8 دیکھیں۔

ف س د

(ن۔ض) **فَسَادًا** کسی چیز کا نظم بگڑ جانا، کسی چیز کا حد اعتدال سے تجاوز کر جانا، خراب ہونا۔ یہ صَلاحٌ کی ضد ہے۔ ﴿وَ لَوۡ لَا دَفۡعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعۡضَهُمۡ بِبَعۡضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ الۡاَرۡضُ﴾ (2/البقرۃ: 251) ''اور اگر نہ ہوتا اللہ کا دفع کرنا لوگوں کو، ان کے بعض کو بعض سے، تو زمین بگڑ جاتی یعنی اجتماعی نظام کا توازن بگڑ جاتا۔''

فَسَادٌ اسم ذات ہے۔ نظم کی خرابی یا بگاڑ۔ ﴿ظَهَرَ الۡفَسَادُ فِی الۡبَرِّ وَ الۡبَحۡرِ بِمَا کَسَبَتۡ اَیۡدِی النَّاسِ﴾ (30/الروم: 41) ''ظاہر ہوئی نظم کی خرابی خشکی اور تری میں بسبب اس کے جو کمایا لوگوں کے ہاتھوں نے۔''

(افعال) **اِفۡسَادًا** کسی چیز کا نظم بگاڑنا، کسی چیز کا توازن بگاڑنا، خراب کرنا۔ ﴿وَ قَالَ الۡمَلَاُ مِنۡ قَوۡمِ فِرۡعَوۡنَ اَتَذَرُ مُوۡسٰی وَ قَوۡمَهٗ لِیُفۡسِدُوۡا فِی الۡاَرۡضِ﴾ (7/الاعراف: 127) ''اور کہا سرداروں نے فرعون کی قوم میں سے، کیا تو چھوڑتا ہے موسیٰؑ اور ان کی قوم کو تاکہ وہ لوگ فساد مچائیں زمین میں۔''

مُفۡسِدٌ ج: مُفۡسِدُوۡنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ نظم بگاڑنے والا۔ ﴿اِنَّ یَاۡجُوۡجَ وَ مَاۡجُوۡجَ مُفۡسِدُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ﴾ (18/الکھف: 94) ''بیشک یاجوج اور ماجوج نظام بگاڑنے والے ہیں زمین میں۔''

ء ر ض

(ن) **اَرۡضًا** کسی جگہ کا سرسبز اور خوش منظر ہونا۔

اَلۡاَرۡضُ اسم ذات ہے۔ زمین۔ ''ارض ہر اُس چیز کو کہتے ہیں جو انسان کے قدموں کے نیچے ہو۔'' (ماجدیؒ)

اِنَّمَا اِنَّمَا ایک لفظ ہے اس میں اِنَّ حرف مشبہ بالفعل ہے اور 'مَا' کافّہ ہے۔ جو اِنَّ کے عمل کو روک دیتا ہے۔ یہ حصر کا مفہوم دیتا ہے اور اس کے معنی ہیں۔ ''کچھ نہیں سوائے اس کے کہ'' یا ''بات اتنی ہے بس کہ'' اسی طرح اَنَّمَا ہے یعنی اَنَّ حرف مشبہ بالفعل اور 'مَا' کافّہ جو اَنَّ کے عمل کو روک دیتا ہے۔ اب ایک اہم بات نوٹ کریں اِنَّ اور مَا (یعنی اِنَّ مَا) دو لفظ ہیں۔ اس میں 'مَا' موصولہ ہے اور اِنَّ کا اسم ہے۔ اس کے معنی ہیں ''بے شک وہ جو کہ'' قرآن مجید

میں کہیں کہیں اِنَّ مَا کو "اِنَّمَا" بھی لکھا گیا ہے لیکن عبارت میں فرق صاف پتہ چل جاتا ہے۔ مثلاً: ﴿اِنَّمَا تُوۡعَدُوۡنَ لَوَاقِعٌ﴾ (المرسلات:7) ''جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے وہ ضرور واقع ہونے والی ہے۔'' یہاں 'مَا' موصولہ ہے اور اِنَّ کا اسم ہے۔ اسی طرح اَنَّ مَا کو بھی اکٹھا "اَنَّمَا" لکھا گیا ہے۔ مثلاً: ﴿وَ لَا یَحۡسَبَنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اَنَّمَا نُمۡلِیۡ لَہُمۡ خَیۡرٌ لِّاَنۡفُسِہِمۡ ؕ﴾ (آل عمران:178) ''اور جو لوگ کفر کر رہے ہیں وہ یہ خیال نہ کریں کہ ہم جو اُنہیں مہلت دے رہے ہیں یہ اُن کے حق میں بہتر ہے۔'' یہاں بھی مَا کو موصولہ یا مصدریہ مانا گیا ہے۔ یا فرمایا: ﴿وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّمَا غَنِمۡتُمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ﴾ (الانفال:41) ''اور جان لو کہ جو غنیمت بھی تم حاصل کرو۔'' یہاں بھی 'مَا' اسم موصول ہے اور اَنَّ کا اسم ہے۔ (واللہ اعلم)

ص ل ح

(ف) صَلَاحًا: نظم کا ٹھیک ہونا، درست ہونا، نیک ہونا۔ صلاح کا لفظ کبھی فساد کے مقابلے میں استعمال ہوتا ہے اور کبھی سَیِّئَۃٌ (برائی) کے مقابلے میں۔ ﴿جَنّٰتُ عَدۡنٍ یَّدۡخُلُوۡنَہَا وَ مَنۡ صَلَحَ مِنۡ اٰبَآئِہِمۡ وَ اَزۡوَاجِہِمۡ وَ ذُرِّیّٰتِہِمۡ﴾ (13/الرعد:23) ''عدن کے باغات، وہ لوگ داخل ہوں گے اس میں اور ان کے باپ دادوں اور بیویوں اور ان اولادوں میں سے بھی جو نیکوکار ہوں گے۔''

صَالِحٌ: ج: صَالِحُوۡنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ نیک، اچھا، بھلا، اللہ تعالیٰ کے ایک پیغمبر کا نام جو قوم ثمود کی طرف بھیجے گئے تھے۔ مولانا مودودیؒ فرماتے ہیں: ''صَالح سے مراد وہ شخص ہے جو اپنے خیالات اور عقائد میں، اپنی نیت اور ارادوں میں اور اپنے اقوال و افعال میں راہِ راست پر قائم ہو اور فی الجملہ اپنی زندگی میں نیک رویہ رکھتا ہو''۔ ﴿فَمَنۡ کَانَ یَرۡجُوۡا لِقَآءَ رَبِّہٖ فَلۡیَعۡمَلۡ عَمَلًا صَالِحًا﴾ (18/الکھف:110) ''پس جو امید رکھتا ہے اپنے رب سے ملاقات کی، تو اسے چاہیے کہ وہ نیک عمل کرے۔'' ﴿وَ اِلٰی ثَمُوۡدَ اَخَاہُمۡ صٰلِحًا﴾ (7/الاعراف:73) ''اور ثمود کی طرف ہم نے اُن کے بھائی صالحؑ کو بھیجا۔''

صَالِحَۃٌ: ج: صَالِحَاتٌ۔ صَالِحٌ کا مونث۔ قرآن مجید میں صرف صَالِحَاتٌ استعمال ہوا ہے۔ یعنی نیکیاں، اچھے کام، نیک عورتیں۔ مولانا عبدالرشید نعمانیؒ فرماتے ہیں: ''قرآن مجید میں صرف ایک مقام پر لفظ صَالِحَاتٌ نیک عورتوں کے لیے استعمال ہوا ہے ارشاد ہے ﴿فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ﴾ ''پھر جو عورتیں نیک ہیں سو تابعدار ہیں۔'' اور باقی سب جگہ پر نیکیوں کے لیے آیا ہے۔ (لغات القرآن، ج ۴، ص ۱۳)

صُلۡحٌ: صلح۔ امام راغبؒ فرماتے ہیں: ''اَلصُّلۡحُ کا لفظ خاص کر لوگوں سے باہمی نفرت کو دور کر کے امن و سلامتی پیدا کرنے پر بولا جاتا ہے چنانچہ اِصۡطَلَحُوۡا وَ تَصَالَحُوۡا کے معنی باہم امن و سلامتی سے رہنے کے ہیں قرآن میں ہے: ﴿اَنۡ یُّصۡلِحَا بَیۡنَہُمَا صُلۡحًا ؕ وَ الصُّلۡحُ خَیۡرٌ ؕ﴾ (4/النساء:128) ''کہ آپس میں کسی قرار داد پر صلح کر لیں اور صلح ہی بہتر ہے۔'' (مفردات القرآن، ج ۲، ص ۵۹۰)

(افعال) اِصۡلَاحًا: نظم کو درست کرنا، نظم کی خرابی کو دور کرنا، اصلاح کرنا، صلح کرانا، نیک ہونا، سنورنا۔ ﴿اِلَّا الَّذِیۡنَ تَابُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِکَ وَ اَصۡلَحُوۡا ۚ﴾ (24/النور:5) ''سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے توبہ کی اس کے بعد، اور (اپنی) اصلاح کی۔'' ﴿ثُمَّ تَابَ مِنۡۢ بَعۡدِہٖ وَ اَصۡلَحَ﴾ (6/الانعام:54) ''پھر اُس کے بعد توبہ کر لے اور نیک ہو جائے۔'' امام راغبؒ فرماتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ کے کسی بندے کی اصلاح کرنا کے کبھی تو یہ معنی ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اسے فطرۃً صالح بنایا اور کبھی اس کے معنی اس سے خرابی اور نقص کو دور کرنے کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے: ﴿وَ اَصۡلَحَ بَالَہُمۡ﴾ ''اور ان کی حالت

سنوار دی۔'' ﴿ يُّصۡلِحۡ لَكُمۡ اَعۡمَالَكُمۡ ﴾ ''وہ تمہارے لیے تمہارے اعمال درست کر دے گا۔'' ﴿ وَ اَصۡلِحۡ لِیۡ فِیۡ ذُرِّیَّتِیۡ ﴾ ''اور میرے لیے میری اولاد میں صلاح پیدا کر۔'' اور آیت کریمہ: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُصۡلِحُ عَمَلَ الۡمُفۡسِدِیۡنَ ﴾ ''بے شک اللہ تعالیٰ شریروں کے کام سنوارا نہیں کرتا''، کے معنی یہ ہیں کہ مفسد لوگ چونکہ عملی طور پر اللہ تعالیٰ کی مخالفت کر کے خرابیاں پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس کے برعکس ذات باری تعالیٰ ہر کام میں اصلاح کو پسند کرتی ہے۔ لہٰذا یہ ناممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے شخص کے اعمال کو درست قرار دے۔'' (مفردات القرآن، ج۲، ص۵۹۰)

مُصۡلِحٌ

ج: مُصۡلِحُوۡنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ نظم کی خرابی دور کرنے والا۔ اصلاح کرنے والا۔ نیک۔ ﴿ وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهۡلِكَ الۡقُرٰى بِظُلۡمٍ وَّ اَهۡلُهَا مُصۡلِحُوۡنَ ﴾ (11/ھود:117) ''اور نہیں ہے تیرا رب کہ وہ ہلاک کرے بستیوں کو ظلم کے ساتھ، اس حال میں کہ ان کے لوگ اصلاح کرنے والے ہوں۔''

اَلَا

یہ حروف تنبیہ میں سے ہے۔ یہ وہ حروف ہیں جن کے ذریعے سے کسی کو خبردار کیا جاتا ہے۔ عام طور پر اس کا ترجمہ ''خبردار ہو جاؤ''، ''آگاہ ہو جاؤ''، ''سنو'' اور ''جان لو'' سے کیا جاتا ہے۔ اَلَا تخصیص کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے حروف تخصیص وہ ہوتے ہیں جن سے کسی کو ترغیب دلائی جائے اور کسی کام پر آمادہ کیا جائے۔ اس صورت میں اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے ''کیوں نہیں'' اور یہ ہمیشہ فعل کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ اَلَا، استفتاح یعنی کلام کے شروع کرنے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ کبھی حرف استفہام ''اَ'' اور ''لَا'' نافیہ ساتھ آتے ہیں تب بھی اَلَا ہی بنتا ہے۔ جس کے معنی ہوتے ہیں ''کیا نہیں''۔ اِن دونوں میں فرق عبارت کے مفہوم سے کیا جاتا ہے۔ مثلاً: ﴿ اَلَا يَتَّقُوۡنَ ﴾ (الشعراء:11) ''کیا وہ پرہیزگاری نہ کریں گے۔'' یا فرمایا ﴿ اَلَا تَسۡتَمِعُوۡنَ ﴾ (الشعراء:25) کیا تم سن نہیں رہے۔'' یا فرمایا: ﴿ اَلَا تُحِبُّوۡنَ اَنۡ يَّغۡفِرَ اللّٰهُ لَكُمۡ ﴾ (النور:22) ''کیا تم پسند نہیں کرتے کہ اللہ تمہارے قصور معاف کر دے۔'' (واللہ اعلم)

لٰكِنۡ اور لٰكِنَّ

لٰكِنَّ حروف مشبہ بالفعل سے ہے۔ لٰكِنۡ اور لٰكِنَّ کے معنی میں کوئی فرق نہیں ہے اور دونوں کے معنی ہیں ''لیکن''۔ البتہ ان کے استعمال میں فرق ہے۔ لٰكِنۡ اسم اور فعل دونوں پر آتا ہے اور غیر عامل ہے یعنی یہ اپنے اسم یا فعل مضارع میں کوئی اعرابی تبدیلی نہیں لاتا۔ جبکہ لٰكِنَّ فعل پر نہیں آتا بلکہ صرف اسم پر آتا ہے اور یہ اپنے اسم کو نصب دیتا ہے۔

يَشۡعُرُوۡنَ (ش ع ر): البقرۃ آیت 9 دیکھیں۔

ترکیب

'وَ' استئنافیہ ہے۔ اِذَا ظرف زمان اور شرطیہ ہے۔ قِيۡلَ ماضی مجہول ہے اور لَهُمۡ جار مجرور مل کر اس کا نائب الفاعل ہے۔ لَا تُفۡسِدُوۡا فعل نہی ہے اور فِی الۡاَرۡضِ اس کا متعلق فعل ہے۔ قَالُوۡا فعل وفاعل اور یہ جملہ جواب شرط ہے۔ نَحۡنُ مبتداء ہے اور اسم الفاعل مُصۡلِحُوۡنَ اس کی خبر ہے۔ اَلَا حرف تنبیہ ہے۔ اِنَّهُمۡ میں هُمۡ کی ضمیر اِنَّ کا اسم ہے۔ اس کی خبر اَلۡمُفۡسِدُوۡنَ معرف باللام ہے اس لئے درمیان میں ضمیر فاصل هُمۡ لائی گئی ہے۔ لٰكِنۡ مخفف ہے لٰكِنَّ سے اور غیر عامل ہے۔ لَا يَشۡعُرُوۡنَ مضارع منفی ہے۔

ترجمہ

البقرۃ: 11-12

وَاِذَا قِيۡلَ	لَهُمۡ	لَا تُفۡسِدُوۡا	فِی الۡاَرۡضِ
اور جب بھی کہا جاتا ہے	ان لوگوں سے	تم لوگ فساد مت پھیلاؤ	زمین میں

قَالُوۡۤا	اِنَّمَا نَحۡنُ	مُصۡلِحُوۡنَ ﴿۱۱﴾	اَلَاۤ
وہ لوگ کہتے ہیں	ہم تو بس	اصلاح کرنے والے ہیں	آگاہ ہو جاؤ

اِنَّهُمۡ	هُمُ الۡمُفۡسِدُوۡنَ	وَلٰكِنۡ	لَّا يَشۡعُرُوۡنَ ﴿۱۲﴾
بے شک وہ لوگ	ہی فساد پھیلانے والے ہیں	اور لیکن	وہ لوگ سمجھتے نہیں

نوٹ: فسادفی الارض: حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ فرماتے ہیں: ''اس سے معلوم ہوا کہ قانون شریعت کے علاوہ کسی دین جاہلی پر قائم رہنا، اس کے طور طریقوں کی اشاعت کرنا فسادفی الارض کے مرادف ہے۔ امن عالم ونظام اقوام قائم جب ہی رہ سکتا ہے جب عملدرآمد قانون شریعت پر رہے۔ اس راہ سے انحراف، بلکہ سرمو تجاوز کرنا بھی دنیا کو بدنظمی، ابتری، کشت وخون اور ہرقسم کی طبقاتی جنگ وکشمکش کو دعوت دینا ہے۔ چنانچہ دنیا عملاً اس کا تجربہ بارہا کر چکی ہے، اور اس وقت بھی کر رہی ہے۔ اسلام کے اس پہلو پر کہ وہ نظام عالم کا بہترین ضامن ہے، اللہ مراتب میں اضافہ کرے، ہمارے زمانہ میں اقبال نے شاعرانہ زبان میں خوب ہی لکھ دیا ہے۔'' (تفسیر ماجدیؒ، ص ۱۱)

حضرت مولانا امین احسن اصلاحیؒ فرماتے ہیں: ''فسادفی الارض قرآن مجید کی ایک اصطلاح ہے جس کا مفہوم اس نظام حق کو بگاڑنا یا اس کو بگاڑنے کی کوشش کرنا ہے جو اللہ واحد کی عبادت اور اس کے احکام وقوانین کی اطاعت پر مبنی ہوتا ہے اور جس کی دعوت انبیائے کرامؑ لے کر آتے ہیں۔ قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ جس طرح اس کائنات کا نظام تکوینی اس وجہ سے قائم ہے کہ اس کے اندر ایک ہی رب قدیر وقہار کا ارادہ کارفرما ہے، اگر اس کے اندر کسی اور کا زور واختیار بھی چلتا ہوتا تو یہ آن کے آن میں درہم برہم ہو کے رہ جاتا اسی طرح اس کے نظام تشریعی کے اندر اگر کسی اور کی عبادت واطاعت کے جواز یا دخل کو تسلیم کر لیا جائے تو اس سے اس کا مزاج بالکل ہی بگڑ کے رہ جاتا ہے اور یہ بگاڑ سارے نظام تمدن کو خراب کر کے رکھ دیتا ہے۔ اس وجہ سے ہر وہ کوشش قرآن کے نزدیک فساد فی الارض کے حکم میں داخل ہے جو اس بگاڑ کا دروازہ کھولے اگرچہ یہ کوشش بظاہر اصلاح کے نیک ارادہ ہی کے ساتھ کیوں نہ کی جائے۔'' (تدبر قرآن، ج ۱، ص ۱۱۹)

آیت 13:

﴿ وَاِذَا قِیۡلَ لَہُمۡ اٰمِنُوۡا کَمَاۤ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوۡۤا اَنُؤۡمِنُ کَمَاۤ اٰمَنَ السُّفَہَآءُ ؕ اَلَاۤ اِنَّہُمۡ ہُمُ السُّفَہَآءُ وَ لٰکِنۡ لَّا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۳﴾ ﴾

اِذَا: البقرۃ آیت 11 دیکھیں۔ قِیۡلَ اور قَالُوۡا (ق و ل): البقرۃ آیت 8 دیکھیں۔
اٰمِنُوۡا (ء م ن) اور دوسرے متعلقہ صیغوں کے لیے: البقرۃ آیت 3 دیکھیں۔

کَمَاۤ مرکب ہے۔ کَ تشبیہ وجر ہوتا ہے اور 'مَا' کو موصول یا مصدریہ مانا جاتا ہے۔ 'مَا' موصول ہونے کی صورت میں اگلا جملہ صلہ ہوتا ہے اور صلہ اور موصول مل کر محلاً حالت جر میں ہوتے ہیں۔ 'مَا' مصدریہ ہونے کی صورت میں 'مَا' اگلے فعل کے ساتھ مل کر مصدری معنی پیدا کر دیتا ہے اور محلاً حالت جر میں ہوتا ہے۔ کَمَا سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ مخاطب کو کسی کام کے کرنے پر آمادہ کیا جائے۔

اَلنَّاسُ: البقرۃ آیت 8 دیکھیں۔

س ف ہ

(س) **سَفَاھَۃً ، سَفَھًا** جسم کا ہلکا ہونا، بے وقوف ہونا، احمق ہونا، پست اخلاق والا ہونا۔ ﴿ وَمَنۡ یَّرۡغَبُ عَنۡ مِّلَّۃِ اِبۡرٰہٖمَ اِلَّا مَنۡ سَفِہَ نَفۡسَہٗ ؕ ﴾ (2/البقرۃ:130) ''اور کون منہ پھیرتا ہے ابراہیمؑ کے دین سے مگر وہ جو بے وقوف ہوا بلحاظ اپنے نفس کے۔''

سَفَاھَۃٌ اسم ذات ہے۔ بے وقوفی، حماقت، بے عقلی۔ ﴿ اِنَّا لَنَرٰىکَ فِیۡ سَفَاہَۃٍ ﴾ (7/الاعراف:66) ''بیشک ہم خیال کرتے ہیں تم کو بے وقوفی میں۔''

سَفِیۡہٌ ج: سُفَھَاءُ۔ فَعِیۡلٌ کے وزن پر صفت ہے۔ بے وقوف، کم عقل، جسے اپنے نفع ونقصان کی پوری تمیز نہ ہو۔ ﴿ فَاِنۡ کَانَ الَّذِیۡ عَلَیۡہِ الۡحَقُّ سَفِیۡہًا اَوۡ ضَعِیۡفًا ﴾ (2/البقرۃ:282) ''پس اگر جس پر حق ہے وہ بے وقوف ہو یا ضعیف ہو۔''

﴿سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ﴾(2/البقرہ:142) ''کہیں گے لوگوں میں سے بے وقوف لوگ، کس چیز نے پھیر دیا ان لوگوں کو ان کے قبلہ سے۔''

اَلَآ: البقرۃ آیت 12 دیکھیں۔ لٰكِنْ: البقرۃ آیت 12 دیکھیں۔ يَعْلَمُوْنَ(ع ل م): الفاتحہ آیت 1 دیکھیں۔

ترکیب 'وَ' عطف کا ہے۔ اِذَا ظرف زمان اور شرطیہ ہے۔ قِيْلَ، ماضی مجہول ہے۔ اور لَهُمْ جار مجرور مل کر اس کا نائب الفاعل ہے۔ اٰمِنُوْا فعل امر ہے اور اس کا فاعل اس میں شامل ضمیر (اَنْتُمْ) ہے۔ كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ متعلق فعل ہے اور اٰمَنَ کا فاعل النَّاسُ ہے۔ اَلنَّاسُ پر 'ال' عہد خارجی ہے یعنی ایسے لوگوں کی بات ہو رہی ہے جو کہنے اور سننے والے کے ذہنوں میں موجود ہیں۔ یعنی صحابہؓ۔ اگلا جملہ قَالُوْٓا.....السُّفَهَآءُ تک جواب شرط ہے۔ اَنُؤْمِنُ میں اَ استفہامیہ ہے اور نُؤْمِنُ کا فاعل اس میں شامل ضمیر ہے اور كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ متعلق فعل ہے۔ اَلسُّفَهَآءُ فاعل ہے اٰمَنَ کا اور اس پر بھی 'ال' عہد خارجی ہے۔ یہاں بھی صحابہؓ ہی مراد ہیں۔ یعنی کفار صحابہؓ کو بے وقوف کہتے تھے (معاذ اللہ)۔ اَلَآ حرف تنبیہ ہے۔ اِنَّهُمْ میں هُمْ، اِنَّ کا اسم ہے اور اس کے بعد والا هُمْ ضمیر فاصل ہے، کیونکہ اِنَّ کی خبر اَلسُّفَهَآءُ معرف باللام ہے۔ لٰكِنْ مخفف ہے لٰكِنَّ سے اور غیر عامل ہے، آگے لَا يَعْلَمُوْنَ، مضارع منفی ہے۔

ترجمہ البقرۃ:13

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ	اٰمِنُوْا	كَمَآ	اٰمَنَ النَّاسُ
اور جب بھی کہا جاتا ہے ان لوگوں سے	تم لوگ ایمان لاؤ	جیسا کہ	ایمان لائے یہ لوگ (یعنی صحابہؓ)

قَالُوْٓا	اَنُؤْمِنُ	كَمَآ	اٰمَنَ السُّفَهَآءُ
وہ لوگ کہتے ہیں	کیا ہم ایمان لائیں	جیسے کہ	ایمان لائے یہ بیوقوف لوگ

اَلَآ	اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ	وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ﴿١٣﴾
آگاہ ہو جاؤ!	یقیناً وہ لوگ ہی بیوقوف ہیں	اور لیکن وہ جانتے نہیں ہیں

نوٹ:1 قَالُوْا فعل ماضی ہے۔ لیکن چونکہ بات اِذَا سے شروع ہوئی ہے۔ اس لئے قِيْلَ کی طرح قَالُوْا کا ترجمہ بھی حال میں کیا گیا ہے۔

نوٹ:2 حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ آیت کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''چھٹی آیت میں (یعنی آیت زیر مطالعہ میں) منافقین کے سامنے صحیح ایمان کا ایک معیار رکھا گیا کہ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ 'یعنی ایمان لاؤ جیسے ایمان لائے اور لوگ' اس میں لفظ ''ناس'' سے مراد باتفاق مفسرین صحابہ کرامؓ ہیں، کیونکہ وہی حضرات ہیں جو نزولِ قرآن کے وقت ایمان لائے تھے، کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف وہی ایمان معتبر ہے جو صحابہ کرامؓ کے ایمان کی طرح ہو، جن چیزوں میں جس کیفیت کے ساتھ ان کا ایمان ہے اسی طرح کا ایمان دوسروں کا ہوگا تو ایمان کہا جائے گا، ورنہ نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرامؓ کا ایمان ایک کسوٹی ہے، جس پر باقی ساری امت کے ایمان کو پرکھا جائے گا، جو اس کسوٹی پر صحیح نہ ہو اس کو شرعاً ایمان اور ایسا کرنے والے کو مومن نہ کہا جائے گا، اس کے خلاف کوئی عقیدہ اور عمل خواہ ظاہر میں کتنا ہی اچھا نظر آئے اور کتنی ہی نیک نیتی سے کیا جائے اللہ کے نزدیک ایمان معتبر نہیں، ان لوگوں نے صحابہ کرامؓ کو سفہاء یعنی بیوقوف کہا، اور یہی ہر زمانے کے گمراہوں کا طریقہ رہا ہے، کہ جو اُن کو صحیح راہ بتلائے اس کو بیوقوف جاہل قرار دیتے ہیں، مگر قرآن کریم نے بتلا دیا کہ درحقیقت وہ خود ہی بیوقوف ہیں کہ ایسی کھلی نشانیوں پر ایمان نہیں رکھتے۔'' (معارف القرآن، ج ا، ص:۱۲۵)

آیت:14

﴿وَ اِذَا لَقُوا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا قَالُوۡۤا اٰمَنَّا ۚۖ وَ اِذَا خَلَوۡا اِلٰی شَیٰطِیۡنِہِمۡ ۙ قَالُوۡۤا اِنَّا مَعَکُمۡ ۙ اِنَّمَا نَحۡنُ مُسۡتَہۡزِءُوۡنَ ﴿۱۴﴾﴾

اِذَا: البقرۃ آیت 11 دیکھیں۔

ل ق ی

(س) لِقَاءً: کسی کے سامنے آنا، ملنا، کسی کو پالینا، کسی چیز کا حس اور بصیرت سے ادراک کر لینا۔ ﴿وَ اِذَا لَقُوۡکُمۡ قَالُوۡۤا اٰمَنَّا ۚۖ وَ اِذَا خَلَوۡا عَضُّوۡا عَلَیۡکُمُ الۡاَنَامِلَ مِنَ الۡغَیۡظِ ؕ﴾ (3/آل عمران:119) ''اور جب بھی تمہارے سامنے آتے ہیں کہتے ہیں ہم ایمان لائے اور جب تنہا ہوتے ہیں تو انگلیاں چباتے ہیں تم پر غصہ سے۔'' ﴿اَضَاعُوا الصَّلٰوۃَ وَ اتَّبَعُوا الشَّہَوٰتِ فَسَوۡفَ یَلۡقَوۡنَ غَیًّا ﴿ۙ۵۹﴾﴾ (19/مریم:59) ''ان لوگوں نے ضائع کیا نماز کو اور پیروی کی خواہشات کی تو عنقریب وہ ملیں گے گمراہی سے۔'' ﴿بَلۡ ہُمۡ بِلِقَآیِٔ رَبِّہِمۡ کٰفِرُوۡنَ ﴿۱۰﴾﴾ (32/السجدہ:10) ''بلکہ وہ لوگ اپنے رب سے ملنے کا انکار کرنے والے ہیں۔''

یَلۡقَ: مضارع مجزوم ہے۔ ﴿وَ مَنۡ یَّفۡعَلۡ ذٰلِکَ یَلۡقَ اَثَامًا ﴿ۙ۶۸﴾﴾ (25/الفرقان:68) ''اور جو یہ کرے گا تو وہ ملے گا عذاب سے۔''

لَاقٍ: اسم الفاعل ہے۔ ملنے والا۔ ﴿اَفَمَنۡ وَّعَدۡنٰہُ وَعۡدًا حَسَنًا فَہُوَ لَاقِیۡہِ﴾ (28/القصص:61) ''تو کیا وہ جس سے وعدہ کیا ہم نے، ایک اچھا وعدہ، اور وہ ملنے والا ہے اس سے۔''

(افعال) اِلۡقَاءً: کسی کو کسی کے سامنے کرنا۔ کسی چیز کو اس طرح ڈالنا کہ وہ دوسرے کو سامنے سے نظر آئے۔ زمین پر پھینکنا۔ ﴿وَ لَا تَقُوۡلُوۡا لِمَنۡ اَلۡقٰۤی اِلَیۡکُمُ السَّلٰمَ لَسۡتَ مُؤۡمِنًا ۚ﴾ (4/النساء:94) ''اور تم لوگ مت کہو اس سے جس نے ڈالا تمہاری طرف سلام یعنی سلام کیا کہ تو مومن نہیں ہے۔'' ﴿قَالَ اَلۡقُوۡا ۚ فَلَمَّاۤ اَلۡقَوۡا سَحَرُوۡۤا اَعۡیُنَ النَّاسِ﴾ (7/الاعراف:116) ''موسیٰ نے کہا تم لوگ ڈالو۔ پس جب ان لوگوں نے ڈالا تو انہوں نے جادو کیا لوگوں کی آنکھوں پر۔'' ﴿سَنُلۡقِیۡ فِیۡ قُلُوۡبِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوا الرُّعۡبَ﴾ (3/آل عمران:151) ''ہم ڈال دیں گے ان کے دلوں میں جنہوں نے کفر کیا رعب کو۔'' ﴿وَ مَا کُنۡتَ لَدَیۡہِمۡ اِذۡ یُلۡقُوۡنَ اَقۡلَامَہُمۡ﴾ (3/آل عمران:44) ''اور آپ ﷺ ان کے پاس نہیں تھے جس وقت وہ لوگ ڈال رہے تھے اپنے قلم یعنی قلم کے ذریعہ قرعہ نکال رہے تھے۔'' اس میں یُلۡقُوۡنَ مضارع ہے لیکن اِذۡ کی وجہ سے ماضی میں ترجمہ ہوگا۔

اَلۡقٰی اِلٰی ــــ قَوۡلًا کا مطلب ہے کسی سے بات کرنا جیسے فرمایا: ﴿فَاَلۡقَوۡا اِلَیۡہِمُ الۡقَوۡلَ﴾ (16/النحل:86) ''تو وہ اُن سے کہیں گے۔''

اَلۡقٰی اِلٰی ــــ سَلَمًا کا مطلب ہے کسی کے سامنے عاجزی ظاہر کرنا، اطاعت کا اقرار کرنا۔ جیسے فرمایا: ﴿وَ اَلۡقَوۡا اِلَی اللّٰہِ یَوۡمَئِذِ اِۨالسَّلَمَ﴾ (16/النحل:87) ''اور آ پڑیں اللہ کے آگے اُس دن عاجز ہو کر۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)

اَلۡقٰی اِلٰی ــــ مَوَدَّۃً کا مطلب ہے کسی سے دوستی بڑھانا۔ جیسے فرمایا: ﴿تُلۡقُوۡنَ اِلَیۡہِمۡ بِالۡمَوَدَّۃِ﴾ (60/الممتحنۃ:1) ''تم اُن کو دوستی کا پیغام بھیجتے ہو۔''

اُلْقِيَ ماضی مجہول ہے۔﴿ فَلَوْ لَآ اُلْقِيَ عَلَيْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ ﴾(43/الزخرف:53)''تو کیوں نہیں ڈالے گئے انؑ پر کنگن سونے کے۔''

اَلْقِ فعل امر ہے۔تو ڈال۔﴿وَاَلْقِ مَافِيْ يَمِيْنِكَ﴾(20/طٰہٰ:69)''اور تو ڈال جو تیرے داہنے ہاتھ میں ہے۔''۔اس کی جمع اَلْقُوْا آتی ہے۔اوپر دیکھیں الاعراف:116۔

فَلْيُلْقِ فعل امر غائب ہے۔چاہیے کہ وہ ڈالے۔﴿ اَنِ اقْذِفِيْهِ فِي التَّابُوْتِ فَاقْذِفِيْهِ فِي الْيَمِّ فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ ﴾(20/طٰہٰ:39)''کہ تو (یعنی موسیٰؑ کی والدہ) رکھ دے انؑ کو تابوت میں، پھر تو رکھ دے اس کو دریا میں، پھر دریا کو چاہیے کہ وہ ڈال دے اس کو ساحل پر۔''نوٹ کرلیں کہ فَلْيُلْقِ میں لام امر ساکن ہوگیا ہے۔جبکہ لام کَیْ ساکن نہیں ہوتا۔

مُلْقٍ ج: مُلْقُوْنَ، مُلْقِيْنَ۔اسم الفاعل ہے۔ڈالنے والا۔﴿ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰى اَلْقُوْا مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ﴾(26/الشعراء:43)''کہا ان سے موسیٰؑ نے کہ تم لوگ ڈالو جو تم ڈالنے والے ہو۔''

مُلْقِيَةٌ ج: مُلْقِيَاتٌ۔ مُلْقٍ کی مؤنث ہے۔ڈالنے والی۔﴿ فَالْمُلْقِيٰتِ ذِكْرًا ﴾(77/المرسلت:5)''پھر (دلوں میں خدا کی) یاد ڈالتی ہیں۔''(ترجمہ تفہیم القرآن)

(تفعیل) **تَلْقِيَةٌ** کسی کے سامنے پھینکنا۔دینا۔اللہ تعالیٰ کے لیے استعمال ہو تو معنی ہوتے ہیں کسی کو وحی کرنا اور عطا کرنا۔﴿ فَوَقٰهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ وَ لَقّٰهُمْ نَضْرَةً وَّ سُرُوْرًا ﴾(76/الدھر:11)''تو بچایا ان کو اللہ نے اس دن کے شر سے اور عطا کی ان کو تازگی اور سرور۔''

يُلَقّٰى مضارع مجہول ہے۔﴿وَ مَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ﴾(41/حٰمٓ السجدہ:35)''اور نہیں دی جاتی (یہ صفت) مگر بڑے نصیبے والوں کو۔''

(مفاعلہ) **مُلَاقَاةٌ اور لِقَاءٌ** ایک دوسرے کے سامنے آنا۔ایک دوسرے سے ملنا۔ملاقات کرنا۔﴿ فَذَرْهُمْ حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ فِيْهِ يُصْعَقُوْنَ ﴾(52/الطور:45)''تو آپؐ چھوڑ دیں ان کو یہاں تک کہ وہ لوگ ملاقات کریں اپنے اس دن سے جس میں وہ بے ہوش ہوں گے۔''

مُلَاقٍ ج: مُلَاقُوْنَ۔اسم الفاعل ہے۔ملاقات کرنے والا۔﴿ اِنِّيْ ظَنَنْتُ اَنِّيْ مُلٰقٍ حِسَابِيَهْ ﴾(69/الحاقۃ:20)''بیشک مجھے گمان تھا کہ میں ملاقات کرنے والا ہوں اپنے حساب سے۔''﴿ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ ﴾(2/البقرہ:223)''اور بچو اللہ سے یعنی اس کی ناراضگی سے اور جان لو کہ تم لوگ ملاقات کرنے والے ہو اس سے۔''

تِلْقَاءٌ تِفْعَالٌ کا وزن ہے۔علمائے کرام نے بتایا ہے کہ اس وزن پر عربی میں دو ہی الفاظ آتے ہیں، ایک تِبْيَانٌ اور دوسرا تِلْقَاءٌ۔ تِلْقَاءٌ کے متعلق ایک رائے یہ ہے کہ یہ لَقِيَ يَلْقٰى کے متعدد مصادر میں سے ایک مصدر ہے۔دوسری رائے یہ ہے کہ یہ باب مفاعلہ کا ظرف ہے یعنی ملاقات کی جگہ یا سمت۔صاحبؒ لغات القرآن فرماتے ہیں: تِلْقَاء طرف، لِقَاءٌ سے، جس کے معنی ملاقات کرنے کے ہیں۔اسم ہے۔ملاقات کرنے اور آمنے سامنے ہونے کی جگہ کو تِلْقَاء کہتے ہیں اور اسی اعتبار سے طرف اور جہت کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے۔(لغات القرآن، ج۲،ص:۱۸۰)''﴿ تِلْقَآءَ اَصْحٰبِ النَّارِ ﴾(7/الاعراف:47)''آگ والوں کی طرف۔''﴿ وَ لَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَآءَ مَدْيَنَ ﴾(28/القصص:22)''اور جب موسیٰؑ مدین کی طرف ہو لیے۔''فَعَلَ الْاَمْرَ مِنْ تِلْقَاءِ نَفْسِهٖ کا مطلب ہوتا ہے کہ اس نے اس کام کو خود بخود، بغیر کسی کے مجبور کیے ہوئے، اپنے جی سے کیا۔جیسے فرمایا:﴿ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ﴾(10/یونس:15)''آپؐ کہہ دیجیے میں یہ نہیں کرسکتا کہ اس میں اپنے جی سے ترمیم کردوں۔''(ترجمہ ماجدیؒ)

(تفعّل) **تَلَقِّیْ** بتکلّف کسی کے سامنے آنا۔شوق اور رغبت کے ساتھ کسی کا استقبال کرنا اور اُس کو قبول کرنا (معارف القرآن)۔ بتکلّف کسی سے کچھ حاصل کرنا۔سیکھنا۔﴿ فَتَلَقّٰۤی اٰدَمُ مِنۡ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ ﴾(2/البقرۃ:37)''تو سیکھے آدمؑ نے اپنے رب سے کچھ کلمات۔''﴿ لَا يَحۡزُنُهُمُ الۡفَزَعُ الۡاَكۡبَرُ وَتَتَلَقّٰٮهُمُ الۡمَلٰٓٮِٕكَةُ ؕ ﴾(21/الانبیاء:103)''ان لوگوں کو غمگین نہیں کرے گی بڑی گھبراہٹ اور استقبال کریں گے ان کا فرشتے۔''

مُتَلَقِّیْ اسم الفاعل ہے۔ لینے والا۔اس کا تثنیہ مُتَلَقِّیَانِ (دو لینے والے) قرآن مجید میں استعمال ہوا ہے۔﴿ اِذۡ يَتَلَقَّى الۡمُتَلَقِّيٰنِ عَنِ الۡيَمِيۡنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيۡدٌ ﴾(50/ق:17)''جس وقت دو لینے والے جا لیتے ہیں ایک دائیں طرف اور ایک بائیں طرف بیٹھا ہوا ہے۔''(ترجمہ احسن البیان)

تُلَقّٰی مضارع مجہول ہے۔اصل میں تُتَلَقّٰی تھا۔ایک 'ت' حذف ہوگئی۔مطلب ہے اُسے سکھایا جاتا ہے۔﴿ وَاِنَّكَ لَتُلَقَّى الۡقُرۡاٰنَ مِنۡ لَّدُنۡ حَكِيۡمٍ عَلِيۡمٍ ﴾(27/النمل:6)''بے شک آپ ﷺ کو اللہ حکیم وعلیم کی طرف سے قرآن سکھایا جارہا ہے۔''(ترجمہ احسن البیان)

نوٹ: باب تفعیل میں مضارع مجہول کی بھی یہی شکل ہوتی ہے یعنی تُلَقّٰی لیکن ان معنوں میں یعنی کسی سے کچھ سیکھنا یا حاصل کرنا باب تفعّل سے ہی استعمال ہوتا ہے۔

(افتعال) **اِلۡتِقَاءً** اہتمام سے ملنا۔﴿ اِنَّ الَّذِيۡنَ تَوَلَّوۡا مِنۡكُمۡ يَوۡمَ الۡتَقَى الۡجَمۡعٰنِ ۙ ﴾(3/آل عمران:155)''بیشک جن لوگوں نے منہ موڑا تم میں سے جس دن ملیں دو فوجیں۔''﴿ مَرَجَ الۡبَحۡرَيۡنِ يَلۡتَقِيٰنِ ۙ بَيۡنَهُمَا بَرۡزَخٌ لَّا يَبۡغِيٰنِ ۚ ﴾(55/الرحمٰن:19-20)''اس نے بہایا دو سمندروں کو وہ دونوں ملتے ہیں،ان کے مابین ایک پردہ ہے،وہ حد سے نہیں بڑھتے۔''

(تفاعل) **تَلَاقِ** ایک دوسرے سے ملاقات کرنا۔باہم جمع ہونا۔اس کا مصدر تَلَاقِ قرآن مجید میں استعمال ہوا ہے۔﴿ يُلۡقِى الرُّوۡحَ مِنۡ اَمۡرِهٖ عَلٰى مَنۡ يَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِهٖ لِيُنۡذِرَ يَوۡمَ التَّلَاقِ ۙ ﴾(40/مومن:15)''وہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے وہی نازل فرماتا ہے۔تاکہ وہ ملاقات کے دن سے ڈرائے۔''(ترجمہ احسن البیان)

اٰمَنُوۡا (ء م ن) اور دوسرے متعلقہ صیغوں کے لیے البقرۃ آیت 3 دیکھیں۔ قَالُوۡا (ق و ل): البقرۃ آیت 8 دیکھیں۔

خ ل و

(ن) **خَلَاءً** اور **خَلۡوَةً** کسی چیز،جگہ یا زمانہ کا خالی ہونا۔تنہا ہونا۔علیحدہ ہونا۔یہ لفظ ظرف زمان اور مکان دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے اور زمانہ میں چونکہ گزرنے کا مفہوم ہوتا ہے اس لیے یہ گزرے ہوئے زمانے،گزرنے،ہوچکنے اور چھوڑ کر چلے جانے کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔﴿ تِلۡكَ اُمَّةٌ قَدۡ خَلَتۡ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتۡ وَلَـكُمۡ مَّا كَسَبۡتُمۡ ۚ ﴾(2/البقرۃ:134)''وہ ایک امت تھی جو گزر چکی۔اس کے لئے جو اس نے کمایا اور تمہارے لئے ہے جو تم نے کمایا۔''﴿ وَلَمَّا يَاۡتِكُمۡ مَّثَلُ الَّذِيۡنَ خَلَوۡا مِنۡ قَبۡلِكُمۡ ؕ ﴾(2/البقرۃ:214)''اور ابھی آیا نہیں تم لوگوں کے پاس ان لوگوں کی طرح یعنی ان کے جیسے حالات جو گزرے تم سے پہلے۔'' یہ فعل جب اِلٰی کے ساتھ آتا ہے تو معنی ہوتے ہیں تنہائی میں ملنا۔﴿ وَاِذَا خَلَا بَعۡضُهُمۡ اِلٰى بَعۡضٍ ﴾(2/البقرۃ:76)''اور جب تنہائی میں ملتے ہیں ان کے بعض،بعض سے۔''

خَالٍ اسم الفاعل ہے گزرنے والا۔گزشتہ۔اس کی مؤنث خَالِيَةٌ آتی ہے اور اَيَّامٌ خَالِيَةٌ کا مطلب ہوتا ہے گزشتہ دن،

گزشتہ ایام۔ ﴿ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِي الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ ﴾ (69/الحاقۃ:24) ''کھاؤ اور پیو مزے کے ساتھ اُن اعمال کے بدلے میں جو تم گزشتہ ایام میں کر چکے ہو۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)

(تفعیل) تَخْلِيَةً کسی کو گزرنے دینا۔ آزاد چھوڑنا۔ چھوڑ دینا۔

خَلُّوْا فعل امر کا صیغہ ہے۔ جمع مذکر حاضر۔ تم چھوڑ دو۔ ﴿ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ﴾ (9/التوبۃ:5) ''پس اگر وہ لوگ توبہ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو تم لوگ چھوڑ دو ان کا راستہ۔''

(تفعّل) تَخَلِّ بتکلّف خالی ہونا۔ ﴿ وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ ۝ وَاَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَتَخَلَّتْ ۝ ﴾ (84/الانشقاق:3-4) ''اور جب زمین دراز کی جائے گی اور وہ ڈال دے گی جو اس میں ہے اور وہ خالی ہو جائے گی۔''

شَيٰطِيْنُ (ش ط ن) (ش ی ط): اَعُوْذُ بِاللّٰهِ دیکھیں۔ اِنَّمَا: البقرۃ آیت 11 دیکھیں۔

ھ ز ء

(ف-س) هُزُوًا ، هُزُءًا مذاق اُڑانا۔ کسی کا مذاق بنانا۔

هُزُوٌ اسم ذات بھی ہے۔ مذاق۔ ہنسی۔ مذاق کا ذریعہ۔ ﴿ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ﴾ (2/البقرۃ:231) ''اور تم لوگ مت بناؤ اللہ کی آیات کو مذاق کا ذریعہ۔''

(استفعال) اِسْتِهْزَاءً کسی سے مذاق کرنا۔ کسی چیز کو خلاف عقل اور عجیب سمجھ کر مذاق اُڑانا۔ ﴿ اَبِاللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ ﴾ (9/التوبۃ:65) ''کیا اللہ اور اس کی آیات اور اس کے رسولؐ سے تم لوگ مذاق کرتے ہو۔''

مُسْتَهْزِءٌ ج: مُسْتَهْزِءُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ مذاق کرنے والا۔ آیت زیر مطالعہ۔

ترکیب وَ عطف کا ہے۔ اِذَا ظرف زمان اور شرطیہ ہے۔ فعل لَقُوْا کا فاعل اس میں شامل ضمیر هُمْ ہے اور اَلَّذِيْنَ اسم موصول اور آگے جملہ فعلیہ اٰمَنُوْا اس کا صلہ۔ صلہ اور موصول مل کر مفعول ہیں لَقُوْا کے۔ جملہ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بطور جواب شرط ہے اِذَا کا۔ اسی طرح سے فعل خَلَوْا کا فاعل بھی اس میں شامل ضمیر هُمْ ہے اور اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ متعلق فعل کہلائے گا۔ اِنَّ حرف مشبہ بالفعل ہے اور نَا اس کا اسم۔ اس کی خبر محذوف ہے۔ اور مَعَكُمْ ظرف ہے اور اِنَّ کی محذوف خبر سے متعلق ہے۔ اِنَّمَا کلمہ حصر ہے۔ نَحْنُ، مبتدا ہے۔ مُسْتَهْزِءُوْنَ اسم الفاعل ہے اور نَحْنُ کی خبر ہے۔

ترجمہ
البقرۃ:14

وَاِذَا	لَقُوا	الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	قَالُوْٓا
اور جب کبھی	وہ لوگ ملتے ہیں	ان لوگوں سے جو ایمان لائے	تو وہ کہتے ہیں

اٰمَنَّا	وَاِذَا	خَلَوْا اِلٰى	شَيٰطِيْنِهِمْ	قَالُوْٓا
ہم ایمان لائے	اور جب بھی	تنہائی میں ملتے ہیں	اپنے شیطانوں سے	تو کہتے ہیں

اِنَّا	مَعَكُمْ	اِنَّمَا نَحْنُ	مُسْتَهْزِءُوْنَ ۝
بیشک ہم	تمہارے ساتھ ہیں	ہم تو بس	مذاق کرنے والے ہیں

نوٹ آیت میں لفظ شَيٰطِيْنُ کے بارے میں حضرت مولانا عبدالماجد دریا بادیؒ فرماتے ہیں: ''شیطان کا لفظ عربی میں بڑا وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ ہر سرکش اور ہر بھڑکانے والے کو شیطان کہتے ہیں۔ انسان، جنات، حیوانات سب پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ یہاں شیاطین سے مراد رؤساء یہود و منافقین لیے گئے ہیں جو اپنی سرکشی و طغیان کے لحاظ سے خود ہی شیطان بنے ہوئے تھے۔ نیز اُن کے کاہن جن کے یہ لوگ بہت معتقد تھے۔''

آیت:15

﴿ اَللّٰهُ يَسۡتَهۡزِئُ بِهِمۡ وَيَمُدُّهُمۡ فِىۡ طُغۡيَانِهِمۡ يَعۡمَهُوۡنَ ﴾

اَللّٰهُ (ء ل ہ): آیت بسم اللہ دیکھیں۔ يَسۡتَهۡزِئُ (ھ ز ء): البقرۃ آیت 14 دیکھیں۔

م د د

(ن) مَدَدًا مدد دینا۔

مَدًّا دراز کرنا، مہلت دینا، پھیلانا، کسی چیز کو لمبائی میں کھینچنا اور بڑھانا۔ اسی سے عرصۂ دراز کو مدت کہتے ہیں۔ ﴿ اَلَمۡ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيۡفَ مَدَّ الظِّلَّ ﴾ (25/الفرقان:45) ''کیا آپ ﷺ نے دیکھا نہیں اپنے رب (کی قدرت) کو کہ اس نے کیسے دراز کیا سائے کو۔'' ﴿ سَنَكۡتُبُ مَا يَقُوۡلُ وَنَمُدُّ لَهٗ مِنَ الۡعَذَابِ مَدًّا ﴾ (19/مریم:79) ''ہم لکھ لیں گے جو وہ کہتا ہے اور ہم دراز کریں گے اس کے لئے عذاب جیسا کہ دراز کرنے کا حق ہے۔'' جب آنکھوں کے لیے اس کا استعمال ہو تو مطلب ہوتا ہے نظر اٹھا کر کسی کی طرف دیکھنا۔ ﴿ لَا تَمُدَّنَّ عَيۡنَيۡكَ اِلٰى مَا مَتَّعۡنَا بِهٖۤ اَزۡوَاجًا مِّنۡهُمۡ ﴾ (15/الحجر:88) ''مت ڈال اپنی آنکھیں اُن چیزوں پر جو برتنے کو دیں ہم نے اُن میں سے کئی طرح کے لوگوں کو۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)۔ لَا تَمُدَّنَّ فعل نہی کا صیغہ ہے اور یاد کر لیں کہ نّ ثقیلہ کا استعمال فعل نفی اور فعل نہی میں سے، فعل نہی کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔

مَدَدٌ مصدر کے علاوہ اسم ذات بھی ہے۔ مدد۔ ﴿ وَلَوۡ جِئۡنَا بِمِثۡلِهٖ مَدَدًا ﴾ (18/الکہف:109) ''اور اگر ہم لے آئیں اس کے جیسا بطور مدد کے۔''

مُدَّةٌ اسم ذات ہے۔ معین عرصہ۔ مدت۔ ﴿ فَاَتِمُّوۡۤا اِلَيۡهِمۡ عَهۡدَهُمۡ اِلٰى مُدَّتِهِمۡ ﴾ (9/التوبۃ:4) ''تو تم لوگ پورا کرو ان سے کیا ہوا وعدہ ان کی مدت تک۔''

مِدَادٌ اسم ذات ہے۔ سیاہی۔ روشنائی۔ ﴿ لَوۡ كَانَ الۡبَحۡرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّىۡ لَنَفِدَ الۡبَحۡرُ قَبۡلَ اَنۡ تَنۡفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّىۡ ﴾ (18/الکہف:109) ''اگر ہوتا سمندر سیاہی میرے رب کے فرمانوں کے لئے تو ختم ہو جاتا سمندر قبل اس کے کہ ختم ہوتے میرے رب کے فرمان۔''

مَمۡدُوۡدٌ اسم المفعول ہے۔ دراز کیا ہوا۔ بڑھایا ہوا۔ کثیر۔ ﴿ وَجَعَلۡتُ لَهٗ مَالًا مَّمۡدُوۡدًا ﴾ (74/المدثر:12) ''اور میں نے بنایا اس کے لے بڑھایا ہوا مال (یعنی کثرت سے مال دیا)۔''

(افعال) اِمۡدَادًا مدد کرنا۔ بوقت ضرورت دینا۔ حسب خواہش دینا۔ وقتاً فوقتاً دینا۔ ﴿ اَمَدَّكُمۡ بِاَنۡعَامٍ وَّبَنِيۡنَ ﴾ (26/الشعراء:133) ''اس نے مدد کی تمہاری چوپایوں سے اور بیٹوں سے۔'' ﴿ وَاَمۡدَدۡنٰهُمۡ بِفَاكِهَةٍ وَّلَحۡمٍ مِّمَّا يَشۡتَهُوۡنَ ﴾ (52/الطور:22) ''اور ہم ان کو ہر طرح کے پھل اور گوشت جس چیز کو بھی اُن کا جی چاہے گا، خوب دیے چلے جائیں گے۔'' (ترجمہ تفہیم القرآن)

مُمِدٌّ اسم الفاعل ہے۔ مدد کرنے والا۔ ﴿ اَنِّىۡ مُمِدُّكُمۡ بِاَلۡفٍ مِّنَ الۡمَلٰٓئِكَةِ ﴾ (8/الانفال:9) ''کہ میں مدد کرنے والا ہوں تمہاری ایک ہزار فرشتوں سے۔''

(تفعیل) تَمۡدِيۡدًا کسی چیز کو پھیلانا۔

مُمَدَّدَۃٌ اسم المفعول ہے۔ پھیلایا ہوا۔﴿ فِیْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ﴾(104/الھمزۃ:9)’’پھیلائے ہوئے ستونوں میں (یعنی بڑے بڑے لمبے ستونوں میں)۔‘‘

| ط غ ی |

(ف) طُغْیَانًا نافرمانی میں حد سے گزرنا۔ سرکشی کرنا۔ طَغَی الْمَآءُ کا مطلب ہے پانی میں طغیانی آجانا یعنی پانی کا بلند ہو کر اپنے کناروں سے باہر آجانا۔﴿ اِذْهَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰی ﴾(20/طٰہٰ:24)’’آپؑ جائیں فرعون کی طرف بیشک اس نے سرکشی کی۔‘‘﴿ كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓی ﴾(96/العلق:6)’’بیشک انسان سرکشی کرتا ہے۔‘‘

طَاغٍ ج: طَاغُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ واحد مذکر۔ سرکشی کرنے والا۔ حد سے گزرنے والا۔﴿ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ ﴾(51/الذریات:53)’’بلکہ وہ لوگ سرکشی کرنے والی قوم ہیں۔‘‘

طَاغِیَةٌ اسم الفاعل ہے۔ واحد مؤنث۔ سرکشی کرنے والی۔ حد سے گزرنے والی۔﴿ فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَاُهْلِكُوْا بِالطَّاغِيَةِ ﴾(69/الحاقۃ:5)’’سو ثمود تو ایک زور کی آواز سے ہلاک کر دیئے گئے۔‘‘

لَا تَطْغَ فعل نہی ہے۔ تو سرکشی مت کر۔ حد سے تجاوز مت کر۔﴿ اَلَّا تَطْغَوْا فِی الْمِيْزَانِ ﴾(55/الرحمٰن:8)’’کہ تم لوگ حد سے تجاوز مت کرو ترازو میں یعنی تول میں۔‘‘

طُغْیَانٌ اسم ذات بھی ہے۔ حد سے بہت زیادہ تجاوز۔ بہت زیادہ سرکشی۔﴿ فَنَذَرُ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا فِیْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴾(10/یونس:11)’’تو ہم چھوڑ دیتے ہیں ان لوگوں کو جو امید نہیں رکھتے ہماری ملاقات کی کہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں۔‘‘

طَغْوٰی طُغْیَانٌ سے اسم ہے۔ سرکشی، نافرمانی۔﴿ كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰىهَآ ﴾(91/الشمس:11)’’قوم ثمود نے اپنی سرکشی کی بنا پر تکذیب کی۔‘‘

طَاغُوْتٌ سرکشی کا ذریعہ۔ واحد، جمع، مذکر، مؤنث سب کے لیے استعمال ہوتا ہے۔﴿ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ﴾(16/النحل:36)’’اور ہم نے بھیجا ہے ہر امت میں ایک رسول کہ تم لوگ عبادت کرو اللہ کی اور تم لوگ بچو سرکشی کے ذریعوں سے۔‘‘ امام راغبؒ لفظ ’طاغوت‘ کی وضاحت کرتے ہوئے مفردات القرآن میں فرماتے ہیں: ’’طاغوت سے مراد ہر وہ شخص ہے جو حدود شکن ہو (یعنی حدود اللہ کو توڑنے والا ہو) اور ہر وہ چیز جس کی اللہ کے سوا پرستش کی جائے اسے طاغوت کہا جاتا ہے۔‘‘ صاحبؒ مترادفات القرآن اسی لفظ کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں ’’طاغوت ہر وہ چیز ہے جس کی اللہ کے سوا غلامی اختیار کی جائے خواہ یہ کوئی نظام ہو یا کوئی شخصیت۔‘‘ (مترادفات القرآن۔ ۵۸۷)۔ مولانا عبدالماجد دریا بادیؒ فرماتے ہیں: ’’طاغوت کا صحیح ترجمہ مشکل ہی ہے۔ اُردو میں اس کے لیے قریب ترین لفظ شیطان کا ہوسکتا ہے۔ اپنے عام و وسیع معنی میں عربی میں اس کا اطلاق ہر معبود باطل اور ہر سرکش پر ہوتا ہے۔‘‘ (تفسیر ماجدیؒ ص:۱۳۸)۔ چنانچہ معلوم ہوا کہ ہر وہ شخص جو اللہ کی نافرمانی میں حد سے گزرنے والا ہو وہ طاغوت ہے۔ اس اعتبار سے اس کا اطلاق کاہن اور غیب جاننے کا جھوٹا دعویٰ کرنے والے پر ہوتا ہے جو اپنے جھوٹے دعووں سے لوگوں کو فریب دیتے ہیں۔ اس کا اطلاق ساحر پر بھی ہوتا ہے۔ اس کا اطلاق شیطان پر بھی ہوتا ہے کیونکہ اس نے سب سے پہلے اللہ کے احکام کی نافرمانی کی۔ اور وہ سب سے بڑا سرکش ہے۔ اس کا اطلاق بتوں اور تمام معبودان باطل پر بھی ہوتا ہے کیونکہ اِن کے ذریعے سے لوگ گمراہ ہوتے ہیں۔ اس کا اطلاق ہر اس شخص پر بھی ہوتا

ہے جو کسی گمراہ مذہب، غلط نظریے اور کسی بُرے عمل کا بانی اور کرتا دھرتا ہو۔ گویا تمام سرکشی کے ذرائع، طاغوت ہیں۔'' کسی کو طاغی (سرکش) کہنے کی بجائے اگر طاغوت (سرکشی) کہا جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ انتہا درجے کا سرکش ہے۔ مثال کے طور پر کسی کو حسین کے بجائے اگر یہ کہا جائے کہ وہ حسن ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ خوبصورتی میں درجۂ کمال کو پہنچا ہوا ہے۔'' (تفہیم القرآن، ج ۴، ص: ۳۶۵)۔ مولانا مودودیؒ نے اس لفظ کی بہت خوبصورت تشریح کی ہے فرماتے ہیں: ''طاغوت لغت کے اعتبار سے ہر اُس شخص کو کہا جائے گا جو اپنی جائز حد سے تجاوز کر گیا ہو۔ قرآن کی اصطلاح میں طاغوت سے مراد وہ بندہ ہے جو بندگی کی حد سے تجاوز کر کے خود آقائی و خداوندی کا دم بھرے اور خدا کے بندوں سے اپنی بندگی کرائے۔ خدا کے مقابلے میں ایک بندے کی سرکشی کے تین مرتبے ہیں۔ پہلا مرتبہ یہ ہے کہ بندہ اُصولاً اس کی فرمانبرداری ہی کو حق مانے، مگر عملاً اس کے احکام کی خلاف ورزی کرے۔ اس کا نام فسق ہے۔ دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ وہ اس کی فرمانبرداری سے اُصولاً منحرف ہو کر یا تو خود مختار بن جائے یا اس کے سوا کسی اور کی بندگی کرنے لگے۔ یہ کفر ہے۔ تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ وہ مالک سے باغی ہو کر اس کے ملک اور اس کی رعیت میں خود اپنا حکم چلانے لگے۔ اس آخری مرتبے پر جو بندہ پہنچ جائے، اسی کا نام طاغوت ہے اور کوئی شخص صحیح معنوں میں اللہ کا مومن نہیں ہو سکتا، جب تک کہ وہ اس طاغوت کا منکر نہ ہو۔'' (تفہیم القرآن، ج ۱، ص: ۱۹۶)۔ اب قرآن مجید کی یہ آیت پڑھیے: ﴿ اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ یَزۡعُمُوۡنَ اَنَّہُمۡ اٰمَنُوۡا بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ وَ مَاۤ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلِکَ یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یَّتَحَاکَمُوۡۤا اِلَی الطَّاغُوۡتِ وَ قَدۡ اُمِرُوۡۤا اَنۡ یَّکۡفُرُوۡا بِہٖ ؕ ﴾ (4/ النساء:60) ''اے نبیؐ! آپؐ نے دیکھا نہیں ان لوگوں کو جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں اس کتاب پر جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے اور ان کتابوں پر جو تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں، مگر چاہتے یہ ہیں کہ اپنے معاملات کا فیصلہ کرانے کے لیے طاغوت کی طرف رجوع کریں، حالانکہ انہیں طاغوت کا انکار کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔'' اس آیت مبارکہ سے آپ کو طاغوت کی ایک اور قسم بھی معلوم ہوگئی یعنی وہ بھی طاغوت ہے جو احکام الٰہی کے خلاف اپنے وضع کردہ قوانین کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلے کرے۔ مولانا مودودیؒ اس آیت یعنی النساء 60 کے تحت فرماتے ہیں: ''یہاں صریح طور پر ''طاغوت'' سے مراد وہ حاکم ہے جو قانون الٰہی کے سوا کسی دوسرے قانون کے مطابق فیصلہ کرتا ہو، اور وہ نظام عدالت ہے جو نہ تو اللہ کے اقتدارِ اعلیٰ کا مطیع ہو اور نہ اللہ کی کتاب کو آخری سند مانتا ہو۔'' مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اسی آیت میں طاغوت کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''(طاغوت سے) یہاں مراد ہر غیر اللہ کی حکومت واقتدار ہے۔'' طاغوت کے لفظ کی مندرجہ بالا وضاحت کے بعد اب قرآن مجید کی یہ آیت پڑھیے: ﴿ فَمَنۡ یَّکۡفُرۡ بِالطَّاغُوۡتِ وَ یُؤۡمِنۡۢ بِاللّٰہِ فَقَدِ اسۡتَمۡسَکَ بِالۡعُرۡوَۃِ الۡوُثۡقٰی ٭ لَا انۡفِصَامَ لَہَا ؕ ﴾ (2/ البقرۃ:256) ''اب جو کوئی طاغوت کا اِنکار کر کے اللہ پر ایمان لے آئے تو، اُس نے ایک ایسا مضبوط سہارا تھام لیا، جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں۔''

(افعال) اِطْغَاءً سرکشی پر اکسانا، ابھارنا، آمادہ کرنا۔ ﴿ رَبَّنَا مَاۤ اَطۡغَیۡتُہٗ وَ لٰکِنۡ کَانَ فِیۡ ضَلٰلٍۭ بَعِیۡدٍ ﴿۲۷﴾ ﴾ (50/ قٓ:27) ''اے ہمارے رب میں نے سرکشی پر نہیں اکسایا اس کو بلکہ وہ تھا دور کی گمراہی میں۔''

ع م ہ

(ف۔س) عَمَهًا فقدان بصیرت کی وجہ سے بھٹکنا۔ دل کا اندھا ہونا۔ حیران ہونا۔ حیرانگی کی وجہ سے تردّد میں پڑھنا۔ حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ فرماتے ہیں: ''عمہ اُس کیفیت کو کہتے ہیں کہ انسان کو راستہ سجھائی نہ دے اور وہ اِدھر اُدھر اندھوں کی طرح ٹٹولتا اور ہاتھ پاؤں مارتا پھرے۔ وحی الٰہی کی روشنی سے محرومی کے بعد انسان کی واقعی یہی حالت ہو جاتی ہے۔'' (تفسیر ماجدیؒ، ص ۱۱)۔ آیت زیرِ مطالعہ۔

ترکیب لفظ اَللّٰہُ مبتداء اور یَسْتَھْزِئُ بِھِمْ جملہ فعلیہ اس کی خبر ہے۔ ''وَ'' عطف کا ہے اور یَمُدُّھُمْ جملہ فعلیہ عطف ہے یَسْتَھْزِئُ پر۔ فِیْ طُغْیَانِھِمْ، یَمُدُّھُمْ کا متعلق فعل ہے۔ جملہ فعلیہ یَعْمَھُوْنَ حال ہے یَمُدُّھُمْ میں ھُمْ ضمیر کا۔

ترجمہ	اَللّٰہُ یَسْتَھْزِئُ بِھِمْ	وَ	یَمُدُّھُمْ
البقرۃ:15	اللہ مذاق کرتا ہے اُن سے یعنی اللہ سزا دے رہا ہے اُنہیں اس مذاق کی	اور	وہ ڈھیل دیتا ہے ان کو

فِیْ طُغْیَانِھِمْ	یَعْمَھُوْنَ ﴿۱۵﴾
ان کی سرکشی میں	اور حالت یہ ہے کہ عقل کے اندھے ہیں

نوٹ:1 **آیت مبارکہ کے تراجم اور قاعدۂ مشاکلت:** آیت زیر مطالعہ میں یَسْتَھْزِئُ کا ترجمہ ہمارے بعض بزرگوں نے تو اس لفظ کا ظاہری معنی (ہنسی، مذاق) لے کر کیا ہے اور بعض بزرگوں نے اس کا ترجمہ عربی کے ایک خاص اسلوب کی مناسبت سے کیا ہے جو اس آیت مبارکہ میں استعمال ہوا ہے۔ جن بزرگوں نے اس کا لفظی ترجمہ کیا ہے وہ یوں ترجمہ کرتے ہیں: ''اللہ ہنسی کرتا ہے اُن سے۔'' (شیخ الہندؒ)، ''اللہ بھی ان سے مذاق کرتا ہے۔'' (احسن البیان)، ''اللہ ان سے مذاق کرتا ہے۔'' (تفہیم القرآن) اور جن بزرگوں نے اس خاص اسلوب کی مناسبت سے ترجمہ کیا ہے وہ یوں ترجمہ کرتے ہیں: ''اللہ سزا دے رہا ہے انہیں اس مذاق کی'' (ضیاء القرآن)۔ معلوم ہوا کہ ہمارے بزرگوں نے دونوں طرح سے اس آیت مبارکہ کا ترجمہ کیا ہے۔ یہاں یہ بھی ضروری ہے کہ اس خاص اسلوب کی وضاحت کر دی جائے کیونکہ جن بزرگوں نے اس لفظ کا ظاہری ترجمہ کیا ہے انہوں نے بھی حاشیے میں اس اسلوب کی طرف اشارہ کیا ہے مثلاً ترجمہ شیخ الہندؒ کے حاشیے میں لکھا ہے ''تمسخر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس تمسخر کا بدلہ اور سزا اُن کو دے گا۔'' اور اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اس اسلوب کی دوسری آیات پڑھتے وقت سمجھنے میں دشواری نہ ہو۔ چنانچہ اس اسلوب کو ''مشاکلت'' کہتے ہیں۔ اس کی سادہ الفاظ میں وضاحت کرتے ہوئے صاحبِ ضیاء القرآن اسی آیت کے تحت فرماتے ہیں: ''اہل عرب میں یہ عام محاورہ ہے کہ جب کوئی کام کسی فعل کی سزا دینے کے لیے کیا جائے تو اس کی تعبیر بھی اسی لفظ سے کر دیتے ہیں جس لفظ سے اس فعل کی تعبیر کی گئی ہو جس پر سزا یا عتاب کیا جا رہا ہے مثلاً ﴿ وَ جَزٰٓؤُا سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ مِّثْلُھَا ﴾ یعنی بُرے فعل کی جزاء بھی اسی طرح بُری ہوا کرتی ہے۔ حالانکہ سزا جو عدل وانصاف کا عین تقاضا ہوتا ہے بُری نہیں ہوتی۔ یا ﴿ نَسُوا اللّٰہَ فَنَسِیَھُمْ ﴾ اُنہوں نے خدا کو بھلا دیا اور خدا نے اُن کو بھلا دیا۔ حالانکہ خدا کی ذات بھول سے پاک ہے لیکن ان کے بھلانے پر جو سزا دی گئی اُس کو بھلانے سے تعبیر کیا گیا۔ اسی طرح اِستہزاء پر منافقین کو جو سزا دی گئی اُس کو بھی استہزاء سے بیان کر دیا۔ کیونکہ یہ استعمال محاورۂ عرب کے عین مطابق تھا۔ اس لیے کفار جو قرآن پر اعتراض کرنے کے لیے کسی ادنیٰ سے بہانے کے متلاشی رہتے تھے اِس استعمال پر کوئی اعتراض نہ کر سکے۔'' اسی طرح حضرتؒ سورہ آل عمران کی آیت 54 ﴿ وَ مَکَرُوْا وَ مَکَرَ اللّٰہُ ط ﴾ کے تحت فرماتے ہیں: ''عربی میں کسی برے اور ناپسندیدہ فعل پر جو سزا دی جاتی ہے اسے اسی لفظ سے تعبیر کر دیتے ہیں اگرچہ وہ سزا کتنی مناسب اور قرین انصاف کیوں نہ ہو۔ مثلاً ﴿ وَ جَزٰٓؤُا سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ مِّثْلُھَا ﴾ یعنی برائی کا بدلہ برائی ہے اسی طرح حالانکہ برائی کی سزا برائی نہیں ہوتی بلکہ عین انصاف ہوا کرتی ہے یا مثلاً ﴿ فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْہِ ﴾ یعنی جو تم پر زیادتی کرے تم اس پر زیادتی کر لو۔ حالانکہ زیادتی اور تعدی کی روک تھام کرنا زیادتی اور ظلم نہیں بلکہ دین اور اخلاق کے تمام ضابطے اس کے درست ہونے کی تائید کرتے ہیں۔ اسی طرح یہاں بھی (آل عمران۔ 54) حضرت مسیحؑ کے قتل کرنے کی جو مکارانہ سازش ان یہودیوں نے کر رکھی تھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو ناکام بنانے کی جو تدبیر کی گئی اُسے مکر سے تعبیر فرما دیا اور اس میں کوئی نقص نہیں۔''

حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ البقرہ کی آیت 193 ﴿ فَاِنِ انْتَھَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَی الظّٰلِمِیْنَ ﴾ کے تحت لکھتے ہیں: ''عُدْوَانَ، اس کے لفظی معنی زیادتی کے ہیں۔ یہاں سزا اور سزائے قتل کے معنی میں ہے۔ عربی اسلوب بیان میں ایک دستور یہ بھی ہے کہ جزاءِ عمل کے موقع پر بعینہٖ وہی لفظ بول دیا جاتا ہے جو خود اس عمل کے لیے ہوتا ہے۔ مثلاً مکر کے مقابلہ میں مکر ہی کا لفظ، کید کی سزا کے موقع پر لفظ کید کا استعمال، استہزاء کے معاوضہ میں لفظ استہزاء وقس علیٰ ہذا۔ اس صنعت کا نام مشاکلت ہے اور قرآن مجید نے عربی بلاغت کی دوسری صنعتوں کی طرح اس کا بھی بار بار استعمال کیا ہے، چنانچہ یہاں سزائے عدوان کے موقع پر

خود لفظ عدوان کا لانا اسی طرز پر ہے۔‘‘ اور اسی طرح سورہ آل عمران کی آیت 54 ﴿ وَ مَكَرُوْا وَ مَكَرَ اللّٰهُ ؕ ﴾ کے تحت فرماتے ہیں: ’’عربی زبان میں ایک قاعدہ مشاکلت کا ہے۔ یعنی کسی فعل کی سزا یا جواب کو بھی بجنسہٖ اسی فعل کے لفظ سے ادا کیا جاتا ہے اور اس طرز ادا میں مطلق کوئی عیب نہیں سمجھا جاتا۔ مثلاً کسی نے زید پر حملہ کیا، اور زید نے اس کا جواب دیا۔ تو عربی محاورہ میں یوں کہیں گے کہ اس نے زید پر حملہ کیا اور زید نے اس پر حملہ کیا حالانکہ زید کا ’’حملہ‘‘ مطلق نہ ہو گا۔ بلکہ صرف سزائے حملہ ہوگی یا زیادہ سے زیادہ ’’جوابی حملہ‘‘ یا کوئی مجھے ٹھگ لے اور میں اس سے انتقام لوں تو عربی میں پیرایہ ادا یہ ہوگا کہ اس نے مجھے ٹھگا۔ اور میں نے بھی اسے ٹھگ لیا۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ میری طرف سے ٹھگنے کی سزا ہی ملے گی۔ اس اصل کو ذہن نشین کر لینے کے بعد قرآن مجید کی اس قسم کی آیتوں سے کہ (۱) ﴿ وَ مَكَرُوْا وَ مَكَرَ اللّٰهُ ؕ ﴾ انہوں نے مکر کیا اور اللہ نے بھی ’’مکر‘‘ کیا۔ (۲) ﴿ اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا ۙ وَّ اَكِيْدُ كَيْدًا ۝ ﴾ وہ ’’کید‘‘ سے کام لیتے ہیں اور میں بھی ’’کید‘‘ سے کام لیتا ہوں۔ (۳) ﴿ وَ جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ﴾ ’’برائی‘‘ کی سزا ویسی ہی ایک ’’برائی‘‘ ہے۔ (۴) ﴿ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ۝ اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ ﴾ وہ کہتے ہیں کہ ہم تو محض ہنسی کرتے ہیں۔ اللہ ان سے ’’ہنسی‘‘ کرتا ہے۔ (۵) ﴿ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ ﴾ جو تم پر زیادتی کرتا ہے، تم اس پر ’’زیادتی‘‘ کرو۔ (اسی اسلوب کی النساء کی 142 آیت بھی ہے۔ ﴿ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَ هُوَ خَادِعُهُمْ ﴾ (مرتب)۔ جو اشکال محض ترجمہ کی بنا پر پیدا ہوتا ہے وہ از خود ساقط ہو جاتا ہے۔ ان تمام مثالوں میں جوابی اور سزائی ’’مکر‘‘ نہ مکر ہے، نہ ’’کید‘‘ کید ہے۔ نہ ’’سیئہ‘‘ سیئہ ہے، نہ ’’استہزاء‘‘ استہزاء، نہ ’’زیادتی‘‘ زیادتی ہے۔ بلکہ ہر موقع پر مراد صرف سزائے مکر، سزائے کید، سزائے سیئہ، سزائے استہزاء، اور سزائے اعتداء ہے۔ تو اس جوابی و تعزیری مکر اللہ پر کوئی سوال ہی نہیں عائد ہوتا۔ لیکن اس کے علاوہ عربی میں مکر میں کوئی ذم کا پہلو لازمی طور پر ہے بھی نہیں۔ مکر محمود بھی ہو سکتا ہے۔ اور مکر مذموم بھی۔ اصل معنی صرف خفیہ تدبیر، گہری تدبیر یا انگریزی میں Plan کے ہیں۔ پس جس کسی ہندی نے اردو کے مکر و فریب پر قیاس کر کے مکر اللہ پر حرف گیری کی ہے، اس نے خود اپنی جہالت کا پردہ فاش کیا ہے۔‘‘ (تفسیر ماجدیؒ۔ 169)

نوٹ:2 آیت زیرِ مطالعہ کی ترکیب میں بتایا گیا ہے کہ فِيْ طُغْيَانِهِمْ، يَمُدُّهُمْ سے متعلق ہے۔ اس کو يَعْمَهُوْنَ سے متعلق ماننے کی گنجائش بھی ہے۔ اس سے معنی میں جو باریک فرق پڑتا ہے اُسے پہلے سمجھ لیں۔ فِيْ طُغْيَانِهِمْ کو اگر يَمُدُّهُمْ کے ساتھ مانیں تو مطلب ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ان کو ان کی سرکشی میں ڈھیل دیتا ہے تاکہ وہ بھٹکتے رہیں۔ اور اگر اسے ہم يَعْمَهُوْنَ کے ساتھ مانیں تو مطلب ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ان کو ڈھیل دیتا ہے تاکہ وہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں۔ لیکن حضرت شیخ الہندؒ فرماتے ہیں: ’’جاننا چاہیے کہ آیت میں فی طُغْيَانِهِمْ فعل يَمُدُّهُمْ کے متعلق ہے مگر تراجم دہلویہ جدیدہ میں اس کو يَعْمَهُوْنَ کے متعلق کر دیا (جس سے معنی بگڑ کر معتزلہ کے موافق اور اہل سنت کے خلاف اور استعمال اہل عرب کے مخالف ہو گئے) جو غلط ہے اور جاننے والے اس کو خوب جانتے ہیں۔ (تفسیر عثمانیؒ، ص ۵)۔ اسی طرح کی سورۂ اعراف کی آیت 186 بھی ہے جس میں فرمایا: ﴿ وَ يَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۝۱۸۶ ﴾ (الاعراف:186) ’’اور اللہ چھوڑے رکھتا ہے اُن کو اُن کی شرارت میں سرگرداں۔‘‘

نوٹ:3 اندھے پن کے لیے قرآن مجید میں عَمِیَ (ع م ی) عَمِهَ (ع م ہ) اور اَكْمَهُ (ک م ہ) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اندھا پن بھی دو طرح کا ہے۔ ایک ظاہری آنکھوں کا اندھا پن ہے اور دوسرا دل یا بصیرت کا اندھا پن ہے۔ اس مناسبت سے ان تینوں الفاظ میں کچھ بنیادی فرق ہیں۔ عَمِیَ کا لفظ ظاہری آنکھوں اور بصیرت، دونوں قسم کے اندھے پن کے کے لیے بولا جاتا ہے۔ مثلاً ظاہری آنکھوں کے اندھے پن کے لیے فرمایا: ﴿ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ؕ ﴾ (عبس:2) ’’اس بات پر کہ اُنؐ کے پاس نابینا آیا۔‘‘ یا فرمایا ﴿ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَ الْبَصِيْرُ ۙ ﴾ (الرعد:16) ’’آپؐ کہیے کیا اندھا اور آنکھوں والا برابر ہو سکتا ہے۔‘‘ (ترجمہ ماجدیؒ) اور بصیرت کے اندھے پن کے لیے فرمایا ﴿ وَ حَسِبُوْٓا اَلَّا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ فَعَمُوْا وَ صَمُّوْا ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ عَمُوْا وَ صَمُّوْا كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ ؕ ﴾ (المائدۃ:71) ’’اور گمان یہی کرتے رہے کہ وبال کچھ نہ پڑے گا سو اندھے اور بہرے ہو گئے پھر اللہ نے اُن پر رحمت سے توجہ فرمائی پھر بھی اُن میں کے بہت سے اندھے اور بہرے ہی رہے۔‘‘ (ترجمہ ماجدیؒ)۔ حاشیے میں حضرتؒ فرماتے ہیں: ’’عَمُوْا عَنِ الْهُدٰى وَ صَمُّوْا عَنْ سَمَاعِ الْحَقِّ‘‘ یعنی ہدایت سے اندھے ہو گئے اور حق سننے سے بہرے ہو گئے۔‘‘ یا فرمایا: ﴿ وَ مَآ اَنْتَ بِهٰدِي الْعُمْيِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ؕ ﴾ (النمل:81) ’’اور آپؐ اندھوں کو اُن کی گمراہی سے راستہ دکھانے والے نہیں۔‘‘ (ترجمہ ماجدیؒ)۔ بلکہ الحج کی آیت 46 میں بصارت اور دل، دونوں کے لیے تَعْمَى کا

لفظ استعمال ہوا ہے ﴿ فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ ﴾ (الحج:46) ''اصل یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوجایا کرتیں بلکہ دل جو سینوں میں ہیں وہ اندھے ہوجایا کرتے ہیں۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔ قرآن مجید میں جہاں کہیں اَلْعَمٰی کی مذمت آئی ہے وہاں بصیرت کا اندھا پن مراد لیا گیا ہے، اور بصیرت کے اندھے پن سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص حق کو نہ پہنچانے اور شک اور شبہ میں مبتلا ہوجائے۔ (واللہ اعلم)۔

عَمِہَ کا لفظ خاص دل یا بصیرت کے اندھے پن کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اور بصیرت کی کمی کا لازمی نتیجہ حیرانی اور بھٹکنا ہے اس لیے یہ لفظ حیران ہونا اور بھٹکنا کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ آیت زیر مطالعہ۔

اَکْمَہَ کا لفظ پیدائشی اندھے پن کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ﴿ وَتُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ بِاِذْنِيْ ﴾ (المائدۃ:110) ''اور تم مادرزاد اندھے اور کوڑھی کو میرے حکم سے اچھا کردیتے تھے۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔

آیت:16

﴿ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى ۠ فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴾

ش ر ی

(ض) شِرَاءً سوداگری کرنا۔ خرید وفروخت کرنا۔ ''گو شِرَاءٌ کے معنی خریدنے اور بیچنے دونوں کے ہیں لیکن بیشتر اس کا استعمال بیچنے ہی کے لیے ہوتا ہے۔'' (لغات القرآن، ج۳،ص ۲۷۴)۔ ﴿ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ ۭ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴾ (2/البقرۃ:102) ''اور کتنا برا ہے جوان لوگوں نے سودا کیا اپنے آپ کا۔ کاش وہ لوگ جانتے ہوتے۔''

(افتعال) اِشْتِرَاءً اشتراء کا لفظ لغات اضداد میں سے ہے یعنی یہ لفظ دو متضاد معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کا مطلب خریدنا بھی ہے اور بیچنا بھی۔ قرآن مجید میں عام طور پر خریدنے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے مثلاً آیت زیر مطالعہ میں خریدنے کے معنوں میں ہے یا فرمایا: ﴿ وَقَالَ الَّذِي اشْتَرٰىهُ مِنْ مِّصْرَ ﴾ (12/یوسف:21) ''اور کہا اُس نے جس نے خریدا اُس کو مصر سے۔'' اس کے علاوہ بیچنے کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے مثلاً ﴿ بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ ﴾ (2/البقرۃ:90) ''بری ہے وہ چیز جس کے عوض میں انہوں نے اپنی جانوں کو بیچ ڈالا۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔ حاشیے میں حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ فرماتے ہیں: ''اشترا لغات اضداد میں سے ہے۔ خریدنے اور فروخت کرنے دونوں کے معنی میں آتا ہے۔ یہاں بیچنے کے معنی میں ہے الاشتراء ھٰھنا بمعنی البیع (معالم) معناہ باعوا (بیضاوی)''۔ ان معنوں کے علاوہ اشتراء کا لفظ ایک کام کے بدلے دوسرے کام کو اختیار کرنے اور ایک چیز کو دوسری چیز سے بدل لینے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

> الضَّلٰلَةَ (ض ل ل): الفاتحہ آیت 7 دیکھیں۔ اَلْهُدٰى اور مُهْتَدِيْنَ (ھ د ی): الفاتحہ آیت 5 دیکھیں۔

ر ب ح

(س) رَبْحًا نفع بخش ہونا۔ یہ فعل لازم ہے۔ آیت زیر مطالعہ۔

ت ج ر

(ض) (ن) تِجَارَةً سوداگری کرنا۔

تِجَارَةٌ اسم ذات بھی ہے۔ سوداگری۔ سرمایہ۔ بیوپار۔ آیت زیر مطالعہ۔

> كَانُوْا (ک و ن): البقرۃ آیت 10 دیکھیں۔

ترکیب أُولٰٓئِكَ مبتداء ہے۔ اَلَّذِيْنَ موصول اور اِشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى ، جملہ فعلیہ اس کا صلہ ہے۔ موصول اور صلہ مل کر پورا جملہ أُولٰٓئِكَ کی خبر ہے۔ رَبِحَتْ (واحد مونث غائب کا صیغہ) فعل اور تِجَارَتُهُمْ اس کا فاعل ہے، آیت مبارکہ کے اس حصے کا ترجمہ ''اُن کی تجارت نے اُن کو نفع نہ دیا'' کرنا غلط ہے کیونکہ اس کی عربی یہ ہوتی فَمَا رَبِحَتْهُمْ تِجَارَتُهُمْ ۔ یہ عربی جملہ غلط ہے کیونکہ رَبِحَتْ فعل لازم ہے اور اس کے ساتھ مفعول هُمْ نہیں آ سکتا چنانچہ صحیح ترجمہ ہوگا اُن کی تجارت نفع بخش نہ ہوئی (واللہ اعلم)۔ 'ما' نافیہ ہے اور كَانُوْا میں شامل هُمْ کی ضمیر كَانَ کا اسم ہے اور مُهْتَدِيْنَ اس کی خبر ہے اس لئے حالت نصب میں ہے۔ اِشْتَرَوُا دراصل اِشْتَرَوْا ہے۔ آگے ملانے کے لئے واو پر ضمہ (پیش) آئی ہے۔

ترجمہ	أُولٰٓئِكَ	الَّذِيْنَ	اشْتَرَوُا	الضَّلٰلَةَ	بِالْهُدٰى ۖ	فَمَا رَبِحَتْ
البقرۃ:16	یہ لوگ ہیں	جن لوگوں نے	خریدا	گمراہی کو	ہدایت کے بدلے	تو نفع بخش نہ ہوئی

تِّجَارَتُهُمْ	وَمَا كَانُوْا	مُهْتَدِيْنَ ⑯
ان کی تجارت	اور وہ لوگ نہیں تھے	ہدایت پانے والے

نوٹ:1 **صلہ اور اس کا استعمال:** عربی میں مفعول کے ساتھ صلہ کے استعمال کے متعلق ایک ابتدائی بات سمجھ لیں۔ آپ نے نوٹ کیا ہوگا کہ متعلق خبر اور متعلق فعل زیادہ تر مرکب جاری بن کر آتے ہیں۔ جیسے اَلرَّجُلُ جَالِسٌ فِي الْمَسْجِدِ۔ اس میں مرکب جاری فِي الْمَسْجِدِ متعلق خبر ہے۔ ضَرَبْتُ زَيْدًا بِالسَّوْطِ اس میں مرکب جاری بِالسَّوْطِ متعلق فعل ہے۔

اب نوٹ کریں کہ یہی حروف جارہ کبھی مفعول کے ساتھ آتے ہیں تو انہیں صلہ کہتے ہیں۔ جو مفعول صلہ کے بغیر آتے ہیں انہیں مفعول بنفسہٖ کہتے ہیں۔ مفعول پر صلہ آنے کی وجہ سے معنی میں کچھ فرق پڑتا ہے۔ اس بات کو اب چند مثالوں سے سمجھ لیں۔ سَئَلْتُ زَيْدًا۔ اس میں زَيْدًا مفعول ہے۔ اور بنفسہٖ آیا ہے۔ اس کا مطلب ہے میں نے زید سے پوچھا۔ سَئَلْتُ عَنْ زَيْدٍ۔ اب زید کے ساتھ عَنْ کا صلہ آیا ہے۔ اور اب مطلب ہوگا میں نے زید کے بارے میں پوچھا۔ قرآن مجید میں ہے۔ ﴿وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ﴾ (2/البقرہ:186) اس میں جس سے پوچھا جا رہا ہے، اس کیلئے ضمیر مفعولی ''ک'' بنفسہٖ آئی ہے۔ اور جس کے بارے میں پوچھا جا رہا ہے اس کے لئے ضمیر مفعولی ''نِيْ'' ''عَنْ'' کے صلہ کے ساتھ آئی ہے۔ جبکہ عِبَادِيْ فاعل ہے۔ ترجمہ: ''اور جب میرے بندے آپ ﷺ سے میرے بارے میں پوچھیں۔''

غَفَرْتُ لِلْوَلَدِ كَذِبَهٗ۔ اس میں جس کو معافی دی جا رہی ہے وہ اَلْوَلَدَ ہے اور اس کے ساتھ لام کا صلہ آیا ہے اور جو غلطی معاف کی جا رہی ہے وہ كَذِبَهٗ ہے۔ اور یہ بنفسہٖ آیا ہے۔ اس کا مطلب ہے میں نے لڑکے کے لئے اس کا جھوٹ معاف کیا۔ قرآن مجید میں ہے ﴿اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ؕ﴾ (39/الزمر:53) اس میں جو غلطی معاف کی جا رہی ہے۔ وہ اَلذُّنُوْبَ ہے جو بنفسہٖ آئی ہے۔ جَمِيْعًا (کل کے کل) حرف تاکید ہونے کی وجہ سے نصب میں ہے۔ دوسری جگہ ہے۔ ﴿يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ﴾ (61/الصف:12) ''اس میں جس کو معافی دی جا رہی ہے اس کے لئے ضمیر مفعولی ''كُمْ'' کے ساتھ لام کا صلہ آیا ہے۔ اور جو غلطی معاف کی جا رہی ہے وہ ذُنُوْبَكُمْ ہے جو بنفسہٖ ہے۔ اس کا مطلب ہے وہ معاف کر دے گا تم لوگوں کے لئے تمہارے گناہ۔ ایک اور جگہ ہے۔ ﴿يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ﴾ (71/نوح:4) ''اب مطلب ہو گیا کہ وہ معاف کر دے گا تمہارے لئے تمہارے گناہوں میں سے کچھ۔''

نوٹ:2 کوئی مفعول کب بنفسہٖ آتا ہے اور کب کس صلہ کے ساتھ آتا ہے۔ اس بات کا علم ہمیں ڈکشنری سے ہوتا ہے۔ فعل اِشْتَرٰى - يَشْتَرِيْ (افتعال) کے متعلق نوٹ کر لیں کہ خریدی جانے والی چیز کا ذکر اس میں بنفسہ آتا ہے۔ اور قیمت کے طور پر جو چیز دی جاتی اس پر بِ کا صلہ آتا ہے۔ آیت زیر مطالعہ میں اَلضَّلٰلَةَ بنفسہٖ آیا ہے۔ اس لئے یہ چیز ہے جو خریدی گئی یعنی حاصل کی گئی۔ جبکہ اَلْهُدٰى پر بِ کا صلہ آیا ہے۔ اس لئے یہ وہ قیمت ہے جو ادا کی گئی۔ (واللہ اعلم)

آیت:17

﴿مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّآ أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُورِهِمْ وَ تَرَكَهُمْ فِي ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُونَ ﴿١٧﴾﴾

م ث ل

(ن) مَثْلًا — کسی کے جیسا ہونا۔ مانند ہونا۔

(ض) مُثْلَةً — مثالی سزا دینا۔ قتل کے بعد ناک کان وغیرہ اعضاء کاٹ دینا۔

(ک) مُثُوْلًا — فضیلت والا ہونا۔ کسی کے سامنے سیدھا کھڑا ہونا۔ ((مَنْ اَحَبَّ اَنْ يَّمْثُلَ لَهُ الرِّجَالُ فَلْيَتَبَوَّءْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ)) (حدیث)۔ ''جو پسند کرتا ہے کہ کھڑے رہیں اس کے لئے لوگ، تو اسے چاہیے کہ وہ بنالے اپنا ٹھکانہ آگ میں۔''

مِثْلٌ — اسم صفت ہے۔ مانند۔ مشابہ۔ ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ﴾ (2/البقرہ:275) ''یہ اس لئے کہ ان لوگوں نے کہا کچھ نہیں سوائے اس کے کہ خرید وفروخت سود کی مانند ہے۔''

مَثَلٌ — ج: اَمْثَالٌ۔ اسم ذات ہے۔ اس سے مراد ہے ایسی بات جو کسی دوسری بات سے ملتی جلتی ہو اور ان میں سے کسی ایک کے ذریعے دوسری کا مطلب واضح ہو جاتا ہو۔ مثل مندرجہ ذیل معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

(1) مثال یا مشابہت بیان کرنے کے لیے: ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ۭ﴾ (22/الحج:73) ''اے لوگو ایک مثال دی جاتی ہے تو دھیان سے سنو اس کو۔'' ﴿وَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿٢٥﴾﴾ (14/ابراہیم:25) ''اور اللہ مثالیں دیتا ہے لوگوں کے لئے شاید وہ لوگ یاد دہانی حاصل کریں۔''

(2) حالت، صفت یا کیفیت بیان کرنے کے لیے۔ مثلاً: ﴿لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ مَثَلُ السَّوْءِ ۚ﴾ (16/النحل:60) ''بری حالت ہے اُن لوگوں کی جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔'' (ترجمہ ماجدیؒ) ''جو نہیں مانتے آخرت کو اُن کی بری مثال ہے۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ) ''اُن لوگوں کے لیے جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے بری صفتیں ہیں۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔ یا فرمایا: ﴿مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ۭ﴾ (47/محمد:15) ''جس جنت کا متقیوں سے وعدہ کیا جاتا ہے اُس کی کیفیت یہ ہے کہ۔'' (ترجمہ ماجدیؒ) ''احوال اُس بہشت کا جس کا وعدہ ہوا ہے ڈرنے والوں سے۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)

(3) مَثَلٌ جب معرف باللّام ہو تو اس سے ''عظیم الشان صفت'' یا ''شان'' مراد لی جاتی ہے۔ قرآن مجید میں ایسا صرف دو جگہ ہے اور دونوں جگہ یہ اللہ تعالیٰ کے لیے استعمال ہوا ہے: ﴿وَ لِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى ۭ﴾ (16/النحل:60) ''اور اللہ کے لیے اعلیٰ صفات ثابت ہیں۔'' (ترجمہ ماجدیؒ) ﴿وَ لَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ﴾ (30/الروم:27) ''اور اُس کی شان سب سے اُوپر ہے آسمان اور زمین میں۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ) ''اور آسمانوں اور زمین میں اُس کی شان سب سے اعلیٰ ہے'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔

نوٹ: اللہ تعالیٰ کے لیے مَثَلٌ کا لفظ استعمال ہو سکتا ہے البتہ مِثْلٌ کا لفظ استعمال نہیں ہوتا۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں: ''لفظ مَثَلٌ بفتح میم وثاء ہر ایسی چیز کے لیے بولا جاتا ہے جو دوسرے سے کچھ مماثلت اور مناسبت رکھتی ہو بالکل اس جیسی ہونا اس کے مفہوم میں داخل نہیں اسی لیے حق تعالیٰ کے لیے

مَثَلٌ ہونا تو قرآن میں کئی جگہ آیا ہے، ایک یہیں (یعنی سورۂ الروم آیت 27) دوسرے فرمایا ﴿مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ﴾ لیکن مِثْل اور مثال سے حق تعالیٰ کی ذات پاک اور وراء الوراء ہے۔'' (واللہ اعلم) (معارف القرآن، ج ۶ ص ۳۸۷)۔ اسی طرح حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ فرماتے ہیں: ''مَثَلٌ (بفتحتین) جس کے معنی مثال کے ہیں، اور معنی میں شریک فی الوصف کے ہے اس کا اللہ کے لیے لانا جائز ہے۔ اور اللہ کے مِثْل (بہ کسرہ میم) کا بیان کرنا، جس کے معنی شریک فی النوع کے ہیں، ناجائز۔ (تفسیر ماجدیؒ ص ۸۳۷)۔ اسی لیے قرآن مجید میں فرمایا گیا ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾ (42/ الشوریٰ:11) ''اُس جیسی کوئی چیز نہیں۔'' اس آیت کی وضاحت کرتے ہوئے امام راغبؒ فرماتے ہیں: ''اب رہا یہ سوال کہ اگر یہاں مِثْل بمعنی مشابہ ہے تو پھر کاف تشبیہ کیوں لایا گیا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ ان دونوں کو تاکید نفی کی غرض سے یک جا لایا گیا ہے یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ کے حق میں نہ تو مِثْل کا استعمال صحیح ہے اور نہ ہی کاف کا اس لیے یکبارگی دونوں کی نفی کر دی ہے۔'' (مفردات القرآن، ج ۲ ص:۹۸۵)

مَثُلَةٌ ج: مَثُلٰتٌ۔ مصدر کے علاوہ اسم ذات بھی ہے۔ عبرتناک سزا۔ ایسی سزا جو انسان کو سب کے سامنے رسوا کر دے اور جس سے دوسرے عبرت حاصل کریں۔ یہی معنی نَكَالٌ کے بھی ہیں۔ ﴿وَقَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلٰتُ﴾ (13/ الرعد:6) ''اور گزر چکی ہیں ان سے پہلے عبرتناک سزائیں۔''

اَمْثَلُ مونث: مُثْلٰی۔ اسم التفضیل ہے۔ زیادہ فضیلت والا۔ افضل واعلیٰ۔ خوب روشن، خوب واضح۔ ﴿اِذْ يَقُوْلُ اَمْثَلُهُمْ طَرِيْقَةً اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا يَوْمًا﴾ (20/ طٰہٰ:104) ''جب بولے گا اُن میں اچھی راہ روش والا تم نہیں رہے مگر ایک دن۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)۔ ﴿يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى﴾ (20/ طٰہٰ:63) ''یہ دونوں چاہتے ہیں کہ نکال دیں تم لوگوں کو تمہاری زمین سے اپنے جادو سے اور لے جائیں تمہارے اعلیٰ طور طریقوں کو۔''

تِمْثَالٌ ج: تَمَاثِيْلُ۔ اسم جامد ہے اور اسم ذات ہے۔ تصویر۔ کسی چیز کا مجسمہ۔ مورتی۔ تمثال کی وضاحت کرتے ہوئے صاحب تفہیم القرآنؒ فرماتے ہیں: ''تمثال عربی زبان میں ہر اُس چیز کو کہتے ہیں جو کسی قدرتی شے کے مشابہ بنائی جائے، قطع نظر اس سے کہ وہ کوئی انسان ہو یا حیوان، کوئی درخت ہو یا پھول یا دریا یا کوئی دوسری بے جان چیز۔'' (تفہیم القرآن، ج ۳ ص ۱۸۰)۔ ﴿مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ﴾ (21/ الانبیاء:52) ''کیا ہیں یہ مجسمے جن کیلئے تم لوگ اعتکاف کرتے ہو۔''

نوٹ: تَمْثَالٌ، ت کی زبر کے ساتھ مصدر ہے اور تِمْثَالٌ، ت کی زیر کے ساتھ تصویر کو کہا جاتا ہے۔ (معارف القرآن)

(تفعّل) **تَمَثُّلًا** کسی کے جیسا ہو جانا۔ کسی دوسرے کی صورت جیسا ہونا۔ مشابہ ہو جانا۔ کسی دوسرے کا سا کردار ادا کرنا۔ ﴿فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا﴾ (19/ مریم:6) ''تو وہ اس کے لئے مکمل آدمی جیسا ہو گیا۔''

و ق د

(ض) **وُقُوْدًا اور وَقْدًا** آگ کا بھڑکنا۔ چمکنا۔ جلنا۔

وَقُوْدٌ اسم ذات ہے۔ ایندھن، جس سے آگ جلائی جاتی ہے۔ Fuel۔ ﴿فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۖ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ﴾ (2/ البقرہ:24) ''تو بچو اس آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں۔''

(افعال) **اِيْقَادًا** آگ کو بھڑکانا یا جلانا۔ کسی چیز کو چمکانا۔ ﴿كُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ﴾ (5/ المائدہ:64) ''جب کبھی وہ لوگ بھڑکاتے ہیں آگ لڑائی کے لیے تو بجھا دیتا ہے اس کو اللہ۔''

يُوْقَدُ مضارع مجہول ہے۔ جس کو بھڑکایا جاتا ہے یا جس کو جلایا جاتا ہے۔ ﴿ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ ﴾ (24/النور:35) ''گویا ایک چمک دار ستارہ ہے، چراغ روشن کیا جاتا ہے ایک نہایت مبارک درخت یعنی زیتون سے۔''

اَوْقِدْ فعل امر ہے۔ تو جلا۔ تو بھڑکا۔ ﴿ فَاَوْقِدْ لِيْ يٰهَامٰنُ عَلَى الطِّيْنِ ﴾ (28/القصص:38) ''تو اے ہامان میرے لیے مٹی کو آگ میں پکا۔''

مُوْقَدٌ اسم المفعول ہے۔ واحد مذکر۔ بھڑکایا ہوا۔

مُوْقَدَةٌ اسم المفعول ہے۔ واحد مؤنث۔ بھڑکائی ہوئی۔ ﴿ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۙ﴾ (104/الھمزۃ:6) ''وہ اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے۔''

(استفعال) اِسْتِيْقَادًا آگ جلانا۔ سلگانا۔ آیت زیرِ مطالعہ۔

ن	و	ر

(ن) نَوْرًا روشن ہونا۔

نُوْرٌ ج: اَنْوَارٌ۔ اسم ذات ہے۔ پھیلنے والی روشنی جو اشیاء کو دیکھنے اور سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ نور۔ امام راغبؒ فرماتے ہیں کہ نور کی دو قسمیں ہیں ایک ہے دنیاوی نور اور دوسرا ہے اُخروی نور۔ دنیاوی نور کی پھر دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جس کا تعلق بصیرت سے ہے یعنی جو بصیرت سے دیکھا جاتا ہے جیسے عقل کا نور، علم کا نور، قرآن کا نور وغیرہ۔ اور دوسرا وہ جس کا تعلق نظر سے ہے یعنی جو آنکھوں سے دیکھا جاتا ہے جیسے ستاروں، سورج اور چاند کا نور۔ چنانچہ وہ نور جس کا تعلق بصیرت سے ہے اس کے متعلق فرمایا: ﴿ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۙ﴾ (5/المائدۃ:15) ''بے شک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک روشنی اور واضح کتاب آ چکی ہے۔'' (ترجمہ ماجدی)۔ حاشیے میں حضرت مولانا عبدالماجد دریا بادیؒ فرماتے ہیں: ''نُوْرٌ سے اشارہ ہے رسالت محمدؐ کی جانب اور كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ سے قرآن مجید کی جانب۔'' یا فرمایا: ﴿ اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّ نُوْرٌ ۚ﴾ (5/المائدہ:44) ''بیشک ہم نے نازل کیا تورات کو اس میں ہدایت اور نور ہے۔'' یا فرمایا: ﴿ اَوَ مَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَ جَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ؕ﴾ (6/الانعام:122) ''کیا جو شخص مردہ تھا پھر ہم نے اُس کو زندہ کر دیا اور ہم نے اُس کے لیے ایک نور بنا دیا کہ اُس کے ساتھ وہ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے وہ اُس کی طرح ہوسکتا ہے جو تاریکیوں میں پڑا ہے (اور) اُن سے نکلنے نہیں پاتا۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔ حاشیے میں حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ فرماتے ہیں: ''نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ۔ ضمیر اس نور کی طرف ہے اور نور سے مراد نورِ ایمان اور نورِ ہدایت ہے۔'' یا فرمایا: ﴿ اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ﴾ (39/الزمر:22) ''اب کیا وہ شخص جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا اور وہ اپنے رب کی طرف سے ایک روشنی پر چل رہا ہے۔ (اس شخص کی طرح ہوسکتا ہے جس نے ان باتوں سے کوئی سبق نہ لیا؟)۔'' (ترجمہ تفہیم القرآن)۔ اور وہ نور جس کا تعلق ظاہری آنکھوں سے دیکھنے سے ہے اُس کے متعلق فرمایا: ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ جَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَ النُّوْرَ ؕ﴾ (6/الانعام:1) ''تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے زمین اور آسمان بنائے، روشنی اور تاریکیاں پیدا کیں۔'' (ترجمہ تفہیم القرآن) یا فرمایا: ﴿ هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّ الْقَمَرَ نُوْرًا ﴾ (10/یونس:5) ''وہ اللہ وہی ہے جس نے آفتاب کو چمکتا ہوا بنایا اور چاند کو روشن۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔ اور اُخروی نور کے متعلق فرمایا: ﴿ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ بِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَ اغْفِرْ لَنَا ۚ﴾

(66/التحریم:8)''اُن کا نور دوڑ رہا ہوگا اُن کے سامنے اور اُن کے داہنے اور وہ کہہ رہے ہوں گے اے ہمارے پروردگار تو پورا کردے ہمارے لیے ہمارے نور کو اور تو بخش دے ہمیں۔''

نَارٌ — اسم ذات ہے۔ آگ۔ جہنم۔ ﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ﴾ (2/البقرہ:39)''اور جن لوگوں نے انکار کیا اور جھٹلایا ہماری نشانیوں کو، وہ لوگ آگ والے ہیں۔'' ﴿اَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِيْ تُوْرُوْنَ ﴾ (56/الواقعہ:71)''اچھا پھر یہ بتلاؤ کہ جس آگ کو تم سلگاتے ہو۔''

(افعال) اِنَارَةً — روشن ہونا، چمکنا (لازم)۔ روشن کرنا۔ روشنی دینا۔ کسی چیز کو واضح کرنا۔ (متعدی)۔ درخت پر پھول آنا۔ خوبصورت ہونا۔

مُنِيْرٌ — اسم الفاعل ہے۔ خود بھی روشن اور دوسروں کو روشن کرنے والا۔ ﴿وَّ دَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَ سِرَاجًا مُّنِيْرًا ﴾ (33/الاحزاب:46)''اور اللہ کی طرف بلانے والا ہوتے ہوئے اس کی اجازت سے اور روشن کرنے والا چراغ ہوتے ہوئے۔''

ض و ء

(ن) ضِيَاءً ، ضَوْءً — روشن ہونا۔

ضَوْءٌ — ج: ضِيَاءٌ۔ اسم ذات بھی ہے۔ روشنی۔ ﴿مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِضِيَآءٍ ؕ﴾ (28/القصص:71)''کون معبود ہے اللہ کے سوا جو لاتا ہے تم لوگوں کے لئے روشنیاں۔''

(افعال) اِضَاءَةً — روشن ہونا۔ روشن کرنا۔ (لازم ومتعدی) ﴿يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ﴾ (24/النور:35)''قریب ہے کہ اس کا تیل روشن ہوجائے۔''

ضِيَاءٌ اور نُوْرٌ کا فرق آگے نوٹ 2 میں دیکھیں۔

لَمَّا (1) حرفِ جازم ہے لَمْ کی طرح فعل مضارع پر داخل ہوتا ہے اور اس کو جزم دیتا ہے اور مضارع کو ماضی منفی کے معنی میں کر دیتا ہے جیسے ﴿وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ﴾ (الحجرات:14)''ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔''

(2) حرف شرط ہے۔ ماضی کے دو جملوں پر آتا ہے۔ پہلا جملہ شرط اور دوسرا جزاء ہوتا ہے۔ لَمَّا کی جزاء کا فعل ماضی ہونا بالاتفاق صحیح ہے بلکہ جمہور کے نزدیک شرط ہے جیسے ﴿فَلَمَّا نَجّٰىكُمْ اِلَى الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ ؕ﴾ (بنی اسرائیل:67)''جب اُس نے بچا کر تم کو خشکی تک پہنچا دیا تو تم نے روگردانی کی۔'' کبھی لَمَّا کی جزاء کے مقام پر ایسا جملہ اسمیہ واقع ہوتا ہے جس کا آغاز اِذَا فُجَائِيَّه سے ہوتا ہے جیسے فرمایا: ﴿فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ ﴾ (العنکبوت:65)''جب اُس نے ان کو بچا کر خشکی تک پہنچا دیا تو ایک دم وہ شرک کرنے لگے۔'' یا اس کے شروع میں فاء ہوتی ہے جیسے ﴿فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ فَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ؕ﴾ (لقمان:32)''جب اس نے ان کو بچا کر خشکی تک پہنچا دیا تو ان میں سے کچھ لوگ سیدھی چال پر رہے۔'' اور کبھی لَمَّا کی جزاء پر فعل مضارع آتا ہے جیسے ﴿فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرٰهِيْمَ الرَّوْعُ وَ جَآءَتْهُ الْبُشْرٰى يُجَادِلُنَا فِيْ قَوْمِ لُوْطٍ ﴾ (ھود:74)''جب ابراہیم کے دل سے خوف جاتا رہا اور خوشخبری پہنچ گئی تو ہمارے فرشتوں سے قوم لوط کے بارے میں جھگڑنے لگے۔

(3) کبھی لَمَّا استثنائیہ بھی آتا ہے، اِلَّا کا ہم معنی، جیسے فرمایا: ﴿اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ ﴾ (الطارق:4)''کوئی نفس نہیں مگر اس پر نگران (فرشتہ) مامور ہے۔''

(4) بعض لوگ قائل ہیں کہ لَمًّا مصدر ہے اصل میں لَمًّا تھا جس کی تنوین گرادی گئی۔ اس کا معنی ہے جَمْعًا ''جمع کرنا۔'' (واللہ اعلم)

ح و ل

(ن) حَوْلًا: کسی چیز کا متغیر ہونا یعنی ایک حالت سے دوسری حالت میں بدلنا۔ دوسری چیزوں سے الگ ہونا۔ دو چیزوں کے درمیان حائل ہونا یا آڑ بن جانا۔ دو چیزوں کے درمیان حائل کرنا، جدائی ڈالنا۔ ﴿وَحَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ﴾ (11/ھود:43)''اور حائل ہوئی ان دونوں کے درمیان موج۔ ﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ﴾ (8/الانفال:24)''اور جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ آدمی کے اور اس کے قلب کے درمیان آڑ بن جایا کرتا ہے۔'' (ترجمہ احسن البیان)

حِيْلَ: ماضی مجہول ہے۔ حائل کیا گیا۔ ﴿وَحِيْلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُوْنَ﴾ (34/سبا:54)''اور حائل کی گئی یعنی رکاوٹ ان کے اور جو وہ چاہتے تھے اس کے درمیان۔''

حَوْلٌ: اسم ظرف ہے۔ (1) کسی کے ارد گرد کی جگہ۔ ماحول۔ ﴿قَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗٓ اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ ۝﴾ (26/الشعراء:25)''اس نے کہا ان سے جو اس کے ارد گرد تھے کیا تم لوگ غور سے سنتے نہیں ہو؟'' (2) ایک سال۔ کیونکہ اس عرصہ میں زمین سورج کے ارد گرد اپنی حرکت یعنی گردش مکمل کرتی ہے۔ ﴿وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ﴾ (2/البقرہ:233)''اور مائیں دودھ پلائیں اپنی اولاد کو پورے دو سال۔''
(3) حَوْلٌ کا لفظ مالی، بدنی اور جسمانی تینوں قسم کی قوت پر بھی بولا جاتا ہے۔ چنانچہ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ کا مطلب ہے اللہ کے سوا کچھ حیلہ اور قوت نہیں۔ (مفردات)

حِوَلٌ: مصدر ہے۔ پھرنا۔ پلٹنا۔ جگہ بدلنا۔ ﴿خٰلِدِيْنَ فِيْهَا لَا يَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا ۝﴾ (18/الکھف:108)''ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور نہ وہ اُن سے کہیں اور نکلنا چاہیں گے۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)

حِيْلَةٌ: اسم ذات ہے۔ مقصد تک پہنچنے کیلئے پوشیدہ حرکت۔ خفیہ تدبیر اچھی ہو یا بری۔ حضرت مولانا عبدالماجد دریا بادیؒ فرماتے ہیں: ''حِيْلَةٌ عربی میں تدبیر کے لیے عام ہے۔ اردو کے ''بہانہ'' کے مرادف نہیں۔'' ﴿لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّلَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا ۝﴾ (4/النساء:98)''وہ لوگ استطاعت نہیں رکھتے کسی خفیہ تدبیر کی اور نہ کوئی راستہ پاتے ہیں۔''

(تفعیل) تَحْوِيْلًا: کسی چیز کو متغیر کرنا یعنی ایک حالت سے دوسری حالت میں بدلنا۔ تبدیل کرنا۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا۔ ﴿فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيْلًا ۝﴾ (17/بنی اسرائیل:56)''اور وہ لوگ اختیار نہیں رکھتے تکلیف کو دور کرنے کا تم لوگوں سے اور نہ ہی تبدیل کرنے کا۔''

ذ ھ ب

(ف) ذَهَابًا: جانا۔ ﴿ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ ۭ﴾ (11/ھود:10)''گئیں بُرائیاں مجھ سے۔'' ذَهَبَ فعل لازم ہے جب اس کے ساتھ 'ب' تعدیہ آتا ہے تو مطلب ہوتا ہے لے جانا۔ ﴿وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۭ﴾ (2/البقرۃ:20)''اور اگر چاہے اللہ تو لے جائے اُن کے سننے کی قوت اور اُن کی بینائی۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔ عربی محاورے میں ذَهَابُ نَفْسٍ سے موت مراد لی جاتی ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ ۭ﴾ (35/فاطر:8)''سو اُن پر افسوس کر کر کے کہیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جان نہ جاتی رہے۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)

اِذْهَبْ: فعل امر ہے۔ تو جا۔ ﴿اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ﴾ (20/طٰہٰ:24)''آپؑ جایئے فرعون کی طرف۔''

	ذَاهِبٌ	اسم الفاعل ہے۔ جانے والا۔ ﴿ اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ ﴾ (37/الصافات:99) ’’میں جانے والا ہوں اپنے رب کی طرف۔‘‘
	مَذْهَبٌ	اسم الظرف ہے۔ جانے کی جگہ یعنی راستہ۔ اعتقاد پر عمل کرنے کا طریقہ۔ قرآن مجید میں استعمال نہیں ہوا۔
(س)	ذَهَبًا	کان میں سونا دیکھ کر حیران ہونا۔ قرآن مجید میں فعل استعمال نہیں ہوا۔
	ذَهَبٌ	اسم ذات ہے۔ سونا۔ ﴿ يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِصِحَافٍ مِّنْ ذَهَبٍ ﴾ (43/الزخرف:71) ’’طواف کریں گے ان پر سونے کے پیالوں کے ساتھ۔‘‘
(افعال)	اِذْهَابًا	لے جانا۔ ﴿ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ؕ ﴾ (35/فاطر:34) ’’اللہ کا شکر ہے جو لے گیا ہم سے غم کو۔‘‘

لفظ اَللّٰہُ کے لیے آیت بسم اللہ دیکھیں۔

ت ر ك

(ن)	تَرْكًا	کسی چیز کو چھوڑ دینا۔ ﴿ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ ﴾ (4/النساء:7) ’’مردوں کے لیے ایک حصہ ہے اس میں سے جو چھوڑا والدین نے۔‘‘
	اُتْرُكْ	فعل امر ہے۔ تو چھوڑ۔ ﴿ وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا ؕ ﴾ (44/الدخان:24) ’’اور آپ چھوڑ دیں سمندر کو تھما ہوا۔‘‘
	تَارِكٌ	ج: تَارِكُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ چھوڑنے والا۔ ﴿ اَئِنَّا لَتَارِكُوْٓا اٰلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ ؕ ﴾ (37/الصّٰفّٰت:36) ’’کیا ہم لوگ اپنے خداؤں کو چھوڑنے والے ہیں ایک مجنون شاعر کے لیے۔‘‘
	يُتْرَكُ	مضارع مجہول ہے۔ اس کو چھوڑا جاتا ہے۔ وہ چھوڑا جائے گا۔ ﴿ اَتُتْرَكُوْنَ فِیْ مَا هٰهُنَآ اٰمِنِيْنَ ۙ ﴾ (26/الشعراء:146) ’’کیا چھوڑیں رکھیں گے تم کو یہاں کی چیزوں میں بےخوف۔‘‘

ظ ل م

(ض)	ظُلْمًا	اس کا اصل مفہوم ہے کسی چیز کو اس کے صحیح مقام پر نہ رکھنا خواہ کمی یا زیادتی کر کے یا اس کے صحیح وقت یا اصلی جگہ سے ہٹا کر۔ عربی میں اس کی تعریف یوں کی جاتی ہے۔ وَضْعُ الشَّیْءِ فِیْ غَیْرِ مَحِلِّهٖ۔ پھر ظلم کا لفظ حق سے تجاوز کرنے، زیادتی کرنے، کمی کرنے، گھٹانے اور نقصان اٹھانے کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ ﴿ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ؕ ﴾ (65/الطلاق:1) ’’اور جو تجاوز کرتا ہے اللہ کی حدود سے تو اس نے ظلم کیا اپنے آپ پر۔‘‘ ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ ﴾ (4/النساء:40) ’’بیشک اللہ ظلم نہیں کرتا ذرہ بھر بھی۔‘‘ ﴿ كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْـًٔا ۙ ﴾ (18/الکھف:33) ’’دونوں باغ اپنا پورا پھل دیتے تھے اور کسی کی پیداوار میں ذرا کمی نہ رہتی۔‘‘ (ترجمہ ماجدیؒ)۔ اس آیت مبارکہ میں یہ لفظ کمی کرنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ (ظلم کی مزید تشریح آگے نوٹ 3 میں دیکھیں)۔
	ظُلْمٌ	اسم ذات بھی ہے۔ زیادتی۔ ظلم۔ نقصان۔ خسارہ۔ ﴿ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴾ (31/لقمان:13) ’’بیشک شرک ایک عظیم ظلم ہے۔‘‘
	ظَالِمٌ	اسم فاعل ہے۔ ظلم کرنے والا۔ نا انصاف۔ نقصان اٹھانے والا۔ ﴿ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴾ (2/البقرۃ:229) ’’اور جو تجاوز کرتے ہیں اللہ کی حدود سے تو وہ لوگ ہی ظلم کرنے والے ہیں۔‘‘ مولانا

مودودیؒ فرماتے ہیں: ''ظالم کا لفظ نہایت معنی خیز ہے ''ظلم'' دراصل حق تلفی کو کہتے ہیں۔ ظالم وہ ہے جو کسی کا حق تلف کرے جو شخص خدا کی نافرمانی کرتا ہے، وہ درحقیقت تین بڑے بنیادی حقوق تلف کرتا ہے۔ اولاً خدا کا حق، کیونکہ وہ اس کا مستحق ہے کہ اس کی فرمانبرداری کی جائے۔ ثانیاً اُن تمام چیزوں کے حقوق جن کو اس نے اس نافرمانی کے ارتکاب میں استعمال کیا اس کے اعضائے جسمانی، اس کے قوائے نفس، اس کے ہم معاشرت انسان، وہ فرشتے جو اس کے ارادے کی تکمیل کا انتظام کرتے ہیں، اور وہ اشیاء جو اس کام میں استعمال ہوتی ہیں، ان سب کا اس پر یہ حق تھا کہ وہ صرف ان کے مالک ہی کی مرضی کے مطابق ان پر اپنے اختیارات استعمال کرے۔ مگر جب اس کی مرضی کے خلاف اس نے ان پر اختیارات استعمال کیے، تو درحقیقت ان پر ظلم کیا۔ ثالثاً خود اپنا حق، کیونکہ اس پر اس کی ذات کا یہ حق ہے کہ وہ اسے تباہی سے بچائے، مگر نافرمانی کر کے جب وہ اپنے آپ کو اللہ کی سزا کا مستحق بناتا ہے، تو دراصل اپنی ذات پر ظلم کرتا ہے، انہی وجوہ سے قرآن میں جگہ جگہ گناہ کے لیے ظلم اور گناہ گار کے لیے ظالم کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔'' (تفہیم القرآن ج۱، ص۶۶) ﴿وَ یٰۤاٰدَمُ اسۡکُنۡ اَنۡتَ وَ زَوۡجُکَ الۡجَنَّۃَ فَکُلَا مِنۡ حَیۡثُ شِئۡتُمَا وَ لَا تَقۡرَبَا ہٰذِہِ الشَّجَرَۃَ فَتَکُوۡنَا مِنَ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۱۹﴾﴾ (7/الاعراف:19) ''اور اے آدم! رہو تم اور تمہاری بیوی جنت میں اور کھاؤ جہاں سے چاہو اور مت نزدیک جانا اس (خاص) درخت کے ورنہ تم دونوں ہو جاؤ گے اپنا نقصان کرنے والوں سے۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔ اس آیت کے حاشیے میں حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں: ''میرے نزدیک یہاں فَتَکُوۡنَا مِنَ الظّٰلِمِیۡنَ کا ترجمہ اگر یوں کیا جاتا تو زیادہ موزوں ہوتا ''پھر ہو جاؤ گے نقصان اٹھانے والوں میں سے۔'' ظلم کے معنی نقصان اور کمی و کوتاہی کے آتے ہیں جیسا کہ ﴿وَ لَمۡ تَظۡلِمۡ مِّنۡہُ شَیۡئًا﴾ (الکہف:33) میں۔''

ظَلُوۡمٌ فَعُوۡلٌ کے وزن پر اسم المبالغہ ہے۔ بہت ظلم کرنے والا۔ ﴿اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَظَلُوۡمٌ کَفَّارٌ ﴿۳۴﴾﴾ (14/ابراہیم:34) ''بیشک انسان بہت ظلم کرنے والا بڑا ناشکرا ہے۔'' صاحبِ لغات القرآن فرماتے ہیں: ''واضح رہے کہ قرآن مجید میں ''ظلوم'' انسان کی صفت بیان ہوئی ہے اور انسان سے جنس انسان مراد ہے اور جب جنس کو مبالغہ کے صیغہ سے متصف کیا جائے تو یہ ضروری نہیں کہ وہ صفت اس جنس کے تمام افراد میں یا بعض میں مبالغہ ہی کے ساتھ پائی بھی جائے ہاں اگر پائی جائے تو بہتر ضرور ہے چنانچہ یہ بات یہاں بھی موجود ہے کہ اکثر افرادِ انسانی ظلم شدید کے مرتکب ہیں۔ تاہم یہ چیز ضروری اور لازمی نہیں ہے۔ اور روح المعانی میں ہے کہ شاید ''ظلوم جہول'' (جیسے سورۃ الاحزاب آیت 72 میں فرمایا اِنَّہٗ کَانَ ظَلُوۡمًا جَہُوۡلًا) سے یہ مراد ہو کہ جس کی شان ظلم کرنا اور جہالت ہو۔ اور شاہ ولی اللہ دہلویؒ حجۃ اللہ البالغہ میں رقمطراز ہیں: ''بلاشبہ ظلوم (وہ) ہے جو عادل نہ ہو اور اس میں عدل کی صلاحیت موجود ہو۔ اور جہول یہ ہے کہ جو عالم نہ ہو اور اس کی شان یہ ہو کہ وہ عالم بن سکے۔'' (لغات القرآن، ج۴، ص:۱۳۸)

ظَلَّامٌ فَعَّالٌ کے وزن پر اسم المبالغہ ہے۔ بہت زیادہ ظلم کرنے والا۔ ﴿وَ اَنَّ اللّٰہَ لَیۡسَ بِظَلَّامٍ لِّلۡعَبِیۡدِ ﴿۱۸۲﴾﴾ (3/آل عمران:182) ''اور یہ کہ اللہ ہرگز ظلم کرنے والا نہیں ہے بندوں پر۔'' صیغہ مبالغہ میں نفی کر کے معمولی ظلم کی بھی شدید نفی کی گئی ہے۔ صاحبِ لغات القرآن فرماتے ہیں: ''واضح رہے کہ آیت شریفہ وَ اَنَّ اللّٰہَ لَیۡسَ بِظَلَّامٍ لِّلۡعَبِیۡدِ ''اور اللہ ظلم نہیں کرتا بندوں پر'' اور اسی طرح دیگر آیات میں کہ جہاں حق تعالیٰ شانہ کی ذات عالی سے نفی ظلم کے سلسلہ میں مبالغہ کا صیغہ استعمال ہوا ہے اور ظَلَّامٌ کا لفظ لایا گیا تو ظَلَّامٌ میں مبالغہ کمیت کے اعتبار سے ہے نہ کہ کیفیت کے لحاظ سے یعنی ذرا سا بھی ظلم نہیں کرتا یہ مطلب نہیں کہ زیادہ ظلم نہیں کرتا اور تھوڑا کرتا ہے۔'' (لغات القرآن، ج۴، ص:۱۳۱)

	اَظۡلَمُ	اسم التفضیل ہے۔زیادہ ظالم۔﴿ وَ مَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنۡ ذُکِّرَ بِاٰیٰتِ رَبِّہٖ فَاَعۡرَضَ عَنۡہَا ﴾(18/الکہف:57)''اورکون زیادہ ظالم ہے اس سے جس کو یاددلائی گئیں اس کے رب کی آیات تو اس نے منہ موڑا ان سے۔''
(س)	ظَلَمًا	تاریک ہونا۔اندھیرا ہونا۔
	ظُلۡمَۃٌ	ج:ظُلُمٰتٌ۔اسم ذات ہے۔تاریکی۔اندھیرا۔جہالت،شرک،فسق وفجور۔محاورہ عرب میں یہ لفظ مصیبتوں،حادثات اور آفات کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔﴿ اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ۙ یُخۡرِجُہُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوۡرِ ۬ؕ ﴾(2/البقرۃ:257)''اللہ ولی ہے ان لوگوں کا جو ایمان لائے وہ نکالتا ہے ان کو اندھیروں سے نور کی طرف۔''
(افعال)	اِظۡلَامًا	اندھیرا چھا جانا۔اندھیرے میں ہونا۔﴿ وَ اِذَاۤ اَظۡلَمَ عَلَیۡہِمۡ قَامُوۡا ؕ﴾(2/البقرۃ:20)''اور جب اندھیرا چھا جاتا ہے ان پر تو کھڑے رہتے ہیں۔''
	مُظۡلِمٌ	ج:مُظۡلِمُوۡنَ۔اسم الفاعل ہے۔اندھیرے میں ہونے والا۔تاریکی میں پڑا ہوا۔﴿ وَ اٰیَۃٌ لَّہُمُ الَّیۡلُ ۚۖ نَسۡلَخُ مِنۡہُ النَّہَارَ فَاِذَا ہُمۡ مُّظۡلِمُوۡنَ ﴿ۙ۳۷﴾ ﴾(36/یٰسین:37)''اور نشانی ہے ان کے لئے رات،ہم کھینچ لیتے ہیں اس میں سے دن کو تو وہ اندھیرے میں ہونے والے ہیں۔''

یُبۡصِرُوۡنَ (ب ص ر): البقرہ آیت 7 دیکھیں۔

ترکیب

مَثَلُہُمۡ مبتداء ہے۔اس کی خبر محذوف ہے۔ک حرف تشبیہ ہے اور مَثَلِ اسم مجرور ہے اور مضاف ہے۔اَلَّذِیۡ اسم موصول ہے اور اِسۡتَوۡقَدَ نَارًا صلہ ہے۔صلہ اور موصول مل کر مضاف الیہ ہے مَثَل کا۔اور جار مجرور مل کر متعلق خبر ہے۔مَثَلُہُمۡ میں 'ہُمۡ' ضمیر گزشتہ آیات میں بیان کردہ کافر،یہود اور منافقوں کے اُس گروہ کے لیے ہے جو بالآخر ہدایت چھوڑ کر گمراہی اختیار کرتے ہیں۔(واللہ اعلم) کَمَثَلِ الَّذِیۡ میں اَلَّذِیۡ کے بارے میں ہمارے بزرگوں کی دو رائے ہیں اور اس کا ترجمہ بھی دونوں طرح کیا گیا ہے۔ایک رائے یہ ہے کہ اَلَّذِیۡ یہاں واحد استعمال ہوا ہے۔اس رائے کے مطابق جن بزرگوں نے ترجمہ کیا ہے وہ یہ ہیں:''ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے آگ جلائی۔''(حضرت شیخ الہندؒ)۔''ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے آگ روشن کی۔''(تفہیم القرآن)وغیرہ۔اور زیادہ تر ترجمہ اسی طرح کیا گیا ہے۔دوسری رائے یہ ہے کہ اَلَّذِیۡ یہاں بمعنی اَلَّذِیۡنَ استعمال ہوا ہے کیونکہ اس کے بعد ذَھَبَ اللّٰہُ بِنُوۡرِھِمۡ میں 'ھُمۡ' جمع کی ضمیر لائی گئی ہے۔اَلَّذِیۡ کا لفظ جمع کے معنوں میں قرآن مجید میں اور جگہ بھی استعمال ہوا ہے مثلاً: ﴿ وَ خُضۡتُمۡ کَالَّذِیۡ خَاضُوۡا ؕ﴾(التوبۃ:69)''اور تم لوگ بھی گھسے جیسے وہ لوگ گھسے تھے۔''اور﴿ وَ الَّذِیۡ جَآءَ بِالصِّدۡقِ وَ صَدَّقَ بِہٖۤ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُتَّقُوۡنَ ﴾(الزمر:33)''اور جو لوگ سچی بات لے کر آئے اور خود بھی اُس کو سچ جانا تو یہی لوگ تو پرہیزگار ہیں۔''دونوں جگہ اَلَّذِیۡ جمع کے معنوں میں ہے۔گویا آیت زیر مطالعہ ان معنوں میں ہے۔مَثَلُ قِصَّتِہِمۡ کَمَثَلِ قِصَّۃِ الَّذِیۡنَ اسۡتَوۡقَدُوۡا نَارًا(ابن کثیرؒ)۔ہمارے بزرگوں نے اس ترکیب کے لحاظ سے بھی ترجمہ کیا ہے۔مثلاً''ان کی(عجیب)مثال تو ان کی سی(عجیب)مثال ہے جنہوں نے آگ جلائی......''(ماجدیؒ)(واللہ اعلم)۔لَمَّا حرف شرط ہے اور اَضَآءَتۡ مَا حَوۡلَہٗ شرط ہے۔ذَھَبَ اللّٰہُ سے اخیر تک جواب شرط ہے۔اَضَآءَتۡ میں ضمیر فاعلی ھِیَ،نَارٌ یعنی آگ کے لئے ہے۔'مَا' اسم موصول ہے اور حَوۡلَہٗ اس کا صلہ اور دونوں مل کر مفعول بہ ہیں اَضَآءَتۡ کا۔حَوۡلَہٗ میں ضمیر 'ہٗ' اَلَّذِیۡ اسۡتَوۡقَدَ نَارًا کے لیے ہے یعنی وہ شخص جس نے آگ جلائی۔ذَھَبَ اللّٰہُ بِنُوۡرِھِمۡ میں ذَھَبَ فعل لازم ہے اور اَللّٰہُ اس کا فاعل۔بِنُوۡرِھِمۡ میں 'بِ' تعدیہ کا ہے جو فعل لازم کو متعدی کر دیتا ہے اس لیے ہم ترجمہ کریں گے کہ اللہ اُن کے نور کو لے گیا۔تَرَکَ میں ضمیر فاعلی ھُوَ،اللہ کے لئے ہے اور ھُمۡ اس کا مفعول۔فِیۡ ظُلُمٰتٍ متعلق فعل ہے۔لَا یُبۡصِرُوۡنَ پورا جملہ فعلیہ حال ہے جو مَثَلُھُمۡ میں ھُمۡ کی حالت بیان کر رہا ہے۔

ترجمہ
البقرۃ:17

مَثَلُهُمْ	كَمَثَلِ الَّذِي	اسْتَوْقَدَ نَارًا	فَلَمَّآ اَضَآءَتْ
ان لوگوں کی مثال	اس شخص کی مثال کی مانند ہے جس نے	جلایا آگ کو	پھر جب اس نے روشن کیا

مَا حَوْلَهٗ	ذَهَبَ اللّٰهُ	بِنُوْرِهِمْ	وَتَرَكَهُمْ
اس کو جو اس کے اردگرد تھا	تو اللہ لے گیا	ان کا نور	اور اس نے چھوڑ دیا ان کو

فِيْ ظُلُمٰتٍ	لَّا يُبْصِرُوْنَ ⑰
اندھیروں میں	اس حال میں کہ وہ لوگ نہیں دیکھتے

نوٹ:1 حضرت مولانا امین احسن اصلاحیؒ تشبیہ اور تمثیل کا فرق بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''تمثیل اگرچہ تشبیہ ہی کی نوعیت کی ایک چیز ہے لیکن تشبیہ اور تمثیل میں بڑا فرق ہے۔ ایک عام تشبیہ میں اصلی نگاہ مشبہ اور مشبہ بہ پر ہوتی ہے ان دونوں کے اجزا کو الگ الگ ایک دوسرے کے مقابل میں رکھ کے دیکھا جاتا ہے کہ ان میں باہم دگر کتنی مشابہت و مطابقت پائی جاتی ہے اور پھر اسی مطابقت و مشابہت کے لحاظ سے اس تشبیہ کا حسن و قبح متعین ہوتا ہے لیکن تمثیل میں اجزا کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہوتی بلکہ اس میں صورت واقعہ کو صورتِ واقعہ سے تشبیہ دی جاتی ہے اگر ایک صورت حال اور دوسری صورت حال میں پوری پوری مطابقت موجود ہے اور تمثیل صورت حال کی پوری تصویر نگاہوں کے سامنے پیش کر رہی ہے تو وہ تمثیل مکمل ہے، اگرچہ تشبیہ کے وہ تمام ضوابط اس پر منطبق نہ ہو رہے ہوں جو ایک تشبیہ کے مکمل ہونے کے لیے اہل فن نے ضروری قرار دیے ہیں۔ (تدبر قرآن، ج ۱، ص: ۱۲۹)

نوٹ۔2 **نور اور ضیاء میں فرق:** حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں: ''بعض کے نزدیک ''نور'' عام ہے ''ضیاء'' سے۔ ''ضیاء'' خاص اُس نور کو کہتے ہیں جو زیادہ تیز اور چمکدار ہو بعض نے کہا کہ جس کی روشنی ذاتی ہو، وہ ضیاء اور جس کی دوسرے سے مستفاد (کسی دوسرے سے فائدہ حاصل کرنا) ہو، وہ ''نور'' ہے سورج کی روشنی عالم اسباب میں کسی دوسرے کرہ سے حاصل نہیں ہوئی۔ چاند کی روشنی البتہ سورج سے مستفاد ہے۔ اور بعض محققین نے دونوں میں یہ فرق بتلایا ہے کہ ''نور'' مطلق روشنی کو کہتے ہیں ''ضیاء'' اور ''ضوء'' اُس کے انتشار (پھیلاؤ) کا نام ہے سورج کی روشنی کا پھیلاؤ چونکہ زیادہ ہے اس لیے ''ضیاء'' سے تعبیر فرمایا۔'' (واللہ اعلم) (تفسیر عثمانیؒ ص ۲۷۶)۔ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ فرماتے ہیں: ''ضیاء'' وہ روشنی ہے جو اپنی ذاتی، مستقل حیثیت رکھتی ہو۔ نور وہ روشنی ہے جو ضیاء سے مستعار (مانگا ہوا، ادھار لیا ہوا) ہو۔ اس کا انعکاس (عکس) ہو۔ قرآن مجید نے (چھٹی اور ساتویں صدی عیسوی کے عرب کے ایک امی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لائے ہوئے قرآن نے) دو لفظ الگ الگ لا کر جدید سائنس کے اس بیان پر مہر تصدیق لگا دی کہ چاند بذات خود بے نور ہے، اس میں چمک دمک جو کچھ ہے وہ سورج کے عکس سے ہے۔'' (تفسیر ماجدیؒ ص ۴۶۶)۔ پیر کرم شاہ صاحبؒ سورۂ یونس کی آیت 5 کے تحت فرماتے ہیں: ''یہاں ایک امر غور طلب ہے کہ سورج کی روشنی کے لیے ضیاء کا لفظ اور چاند کی روشنی کے لیے نور کا لفظ استعمال فرمایا اس کی حکمت یہ ہے کہ ضیاء اس روشنی کو کہتے ہیں جو ذاتی ہو اور نور اس کو کہتے ہیں جو ذاتی نہ ہو بلکہ کسی دوسری چیز سے حاصل ہو۔ کیونکہ سورج کی روشنی ذاتی ہے اس لیے اس کے لیے ضیاء کا لفظ استعمال کیا اور قمر کی روشنی سورج سے مستفاد ہے اس لیے اس کے لیے نور کا لفظ مستعمل ہوا۔'' (واللہ اعلم)۔ (ضیاء القرآن، ج ۲، ص: ۳۸۰)۔ ''ضیاء میں روشنی کے ساتھ تپش کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے اور نور ٹھنڈی روشنی کو کہتے ہیں۔'' (تدبر قرآن)۔

نوٹ:3 **ظلم:** جیسے کہ پہلے عرض کیا گیا کہ کسی چیز کو اس کے صحیح مقام پر نہ رکھنے یا اس کی مخصوص جگہ سے ناجائز طریقے سے ہٹا دینے کا نام ظلم ہے۔ اسی سے عربی کا محاورہ ہے، ظَلَمْتُ السِّقَآءَ یعنی میں نے مشکیزے کے دودھ کا بے وقت استعمال کیا۔ ''سقاء'' اس مشکیزہ کو کہتے ہیں جس میں پانی اور دودھ وغیرہ رکھا جائے۔ جب مشکیزے میں دودھ کو دہی جمانے کی غرض سے رکھا جائے اور دہی بننے سے پہلے ہی اس کو پی لیا جائے تو ایسے موقع پر یہ محاورہ بولتے ہیں۔ استعمال شدہ دودھ ظَلِيْمٌ کہلاتا ہے۔ اسی طرح عربی میں ظَلَمْتُ الْاَرْضَ کے معنی ہیں میں نے زمین کو ایسی جگہ سے کھودا جہاں سے کھودنا نہیں چاہیے تھا۔ وہ جگہ مَظْلُوْمَةٌ کہلاتی ہے اور جو مٹی اس زمین سے نکلتی ہے وہ بھی ظَلِيْمٌ کہلاتی ہے۔ ظلم کی ضد عدل ہے جو چیز بھی عدل و انصاف کے منافی ہوگی یا حق سے تجاوز ہوگی

وہ ظلم ہوگا۔ گویا ظلم کے لفظ کا دائرہ استعمال بہت وسیع ہے۔ چنانچہ کسی بھی چیز میں کمی وبیشی ہو اور اس کمی یا بیشی کی مقدار کم ہو یا زیادہ کسی بھی قسم کا حق سے تجاوز ہو خواہ تجاوز قلیل ہو یا کثیر، اس پر ظلم کا اطلاق ہوتا ہے۔ پھر یہ لفظ مادی اور معنوی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ مادی لحاظ سے اس کی مثال الکھف کی آیت 33 ہے۔ علمائے کرام نے ظلم کی تین قسمیں بیان کی ہیں۔ (1) وہ ظلم جو انسان اللہ تعالیٰ کے ساتھ کرتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی قسم شرک ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴾ (لقمان:13) ''شرک بہت بڑا ظلم ہے۔'' شرک کو اس لیے ظلم کہتے ہیں کیونکہ اس میں مشرک خالقِ حقیقی کو معبود بنانے کی بجائے مخلوق کو معبود ٹھہراتا ہے۔ گویا کسی شے کو اپنی اصل جگہ پر رکھنے کی بجائے غلط جگہ پر رکھنے کی یہ بدترین مثال ہے۔ اسی طرح کفر ونفاق اور اللہ پر جھوٹ باندھنا بھی وہ ظلم ہے جو انسان اللہ تعالیٰ سے کرتا ہے۔ (2) وہ ظلم جو انسان ایک دوسرے پہ کرتا ہے۔ مثلاً: ﴿ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَ يَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ﴾ (الشوریٰ:42) ''ملامت کے مستحق تو وہ ہیں جو دوسروں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق زیادتیاں کرتے ہیں۔'' ﴿ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا ﴾ (بنی اسرائیل:33) ''اور جو شخص مظلومانہ قتل کیا گیا ہو اس کے ولی کو ہم نے قصاص کے مطالبے کا حق عطا کیا ہے۔'' (3) وہ ظلم جو انسان خود اپنے آپ پر کرتا ہے۔ ﴿ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ﴾ (فاطر:32) ''اب کوئی تو ان میں سے اپنے نفس پر ظلم کرنے والا ہے۔'' ﴿ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْ لِيْ ﴾ (القصص:16) ''پھر وہ کہنے لگا: اے میرے رب، میں نے اپنے نفس پر ظلم کر ڈالا، مجھے معاف کر دے۔'' علمائے کرام نے وضاحت کی ہے کہ یہ تینوں قسم کے ظلم اصل میں وہ ظلم ہیں جو انسان اپنے آپ پر ہی کرتا ہے اسی لیے قرآن حکیم میں کئی جگہ فرمایا: ﴿ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴾ (النحل:33) ''اُن پر اللہ نے ذرا بھی ظلم نہیں کیا تھا بلکہ وہ اپنی ہی جانوں پر ظلم کرتے تھے۔'' ﴿ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴾ (البقرۃ:57) ''اور انہوں نے ہم پر زیادتی نہیں کی بلکہ اپنی ہی جانوں پر زیادتی کرتے تھے۔'' آخرت میں سزا کے لحاظ سے بھی ظلم کی تین قسمیں ہیں۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے حضرت مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں: ''ظلم کی ایک قسم وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ ہرگز نہ بخشیں گے، دوسری قسم وہ ہے جس کی مغفرت ہو سکے گی، اور تیسری قسم وہ ہے کہ جس کا بدلہ اللہ تعالیٰ لیے بغیر نہ چھوڑیں گے۔ پہلی قسم کا ظلم شرک ہے، دوسری قسم کا ظلم حقوق اللہ میں کوتاہی ہے، اور تیسری قسم کا ظلم حقوق العباد کی خلاف ورزی ہے۔'' (ابن کثیر بحوالہ مسند بزار، بحوالہ معارف القرآن، ج ۲ ص: ۵۵۰)۔

آیت:18

﴿ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴾

ص م م

(س) **صَمَمًا** اونچا سننا یا بالکل نہ سننا۔ بہرا ہونا۔ ﴿ وَ حَسِبُوْٓا اَلَّا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ فَعَمُوْا وَ صَمُّوْا ﴾ (5/المآئدہ:71) ''اور ان لوگوں نے گمان کیا کہ کوئی آزمائش نہ ہوگی تو وہ لوگ اندھے اور بہرے ہوئے۔''

اَصَمُّ ج: صُمٌّ - اَفْعَلُ الوان وعیوب ہے بطور صفت استعمال ہوتا ہے۔ بہرا۔ ﴿ مَثَلُ الْفَرِيْقَيْنِ كَالْاَعْمٰى وَ الْاَصَمِّ ﴾ (11/ھود:24) ''دونوں فریقوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک اندھا اور بہرہ۔'' ﴿ اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴾ (8/الانفال:22) ''بیشک جانداروں میں بدترین، اللہ کے نزدیک، بہرے گونگے ہیں جو عقل استعمال نہیں کرتے۔''

(افعال) **اِصْمَامًا** کسی کو بہرا کرنا۔ ﴿ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فَاَصَمَّهُمْ وَ اَعْمٰٓى اَبْصَارَهُمْ ﴾ (47/محمد:23) ''وہ یہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی پس اس نے انہیں بہرا کیا اور ان کی بصارت کو اندھا کیا۔''

ب ك م

(س) **بَكَمًا** گونگا ہونا۔

اَبۡکَمُ ج: بُکۡمٌ۔ اَفۡعَلُ الوان وعیوب ہے بطور صفت استعمال ہوتا ہے۔ گونگا۔ اوپر آیت نمبر (8/الانفال:22)

ع م ی

(س) **عَمِیَ** عَمِیَ کا لفظ ظاہری آنکھوں اور بصیرت، دونوں قسم کے اندھے پن کے لیے بولا جاتا ہے۔ مثلاً ظاہری آنکھوں کے اندھے پن کے لیے فرمایا: ﴿ اَنۡ جَآءَہُ الۡاَعۡمٰی ؕ﴾ (عبس:2) ''اس بات پر کہ اُنؐ کے پاس نابینا آیا۔'' یا فرمایا: ﴿ قُلۡ ہَلۡ یَسۡتَوِی الۡاَعۡمٰی وَ الۡبَصِیۡرُ ۬ۙ ﴾ (الرعد:16) ''آپؐ کہیے کیا اندھا اور آنکھوں والا برابر ہو سکتا ہے۔'' (ترجمہ ماجدیؒ) اور بصیرت کے اندھے پن کے لیے فرمایا: ﴿ وَ حَسِبُوۡۤا اَلَّا تَکُوۡنَ فِتۡنَۃٌ فَعَمُوۡا وَ صَمُّوۡا ثُمَّ تَابَ اللّٰہُ عَلَیۡہِمۡ ثُمَّ عَمُوۡا وَصَمُّوۡا کَثِیۡرٌ مِّنۡہُمۡ ؕ ﴾ (المائدۃ:71) ''اور گمان یہی کرتے رہے کہ وبال کچھ نہ پڑے گا سو اندھے اور بہرے ہوگئے پھر اللہ نے اُن پر رحمت سے توجہ فرمائی پھر بھی اُن میں کے بہت سے اندھے اور بہرے ہی رہے۔'' (ترجمہ ماجدیؒ) حاشیے میں حضرتؒ فرماتے ہیں: ''عَمُوۡا عَنِ الۡھُدٰی وَ صَمُّوۡا عَنۡ سَمَاعِ الۡحَقِّ'' یعنی ہدایت سے اندھے ہوگئے اور حق سننے سے بہرے ہوگئے۔'' یا فرمایا: ﴿ وَمَاۤ اَنۡتَ بِھٰدِی الۡعُمۡیِ عَنۡ ضَلٰلَتِہِمۡ ؕ ﴾ (النمل:81) ''اور آپؐ اندھوں کو اُن کی گمراہی سے راستہ دکھانے والے نہیں۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔ بلکہ الحج کی آیت 46 میں بصارت اور دل، دونوں کے لیے تَعۡمَی کا لفظ استعمال ہوا ہے ﴿ فَاِنَّہَا لَا تَعۡمَی الۡاَبۡصَارُ وَ لٰکِنۡ تَعۡمَی الۡقُلُوۡبُ الَّتِیۡ فِی الصُّدُوۡرِ ﴿۴۶﴾ ﴾ (الحج:46) ''اصل یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوجایا کرتیں بلکہ دل جو سینوں میں ہیں وہ اندھے ہوجایا کرتے ہیں۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔ قرآن مجید میں جہاں کہیں اَلۡعَمٰی کی مذمت آئی ہے وہاں بصیرت کا اندھا پن مراد لیا گیا ہے اور بصیرت کے اندھے پن سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص حق کو نہ پہچانے اور شک اور شبہ میں مبتلا ہوجائے۔ (واللہ اعلم)۔ عَمِیَ عَلَیۡہِ کے معنی ہیں کہ اس پر فلاں معاملہ اس طرح غیر واضح اور مشتبہ ہوگیا ہے کہ گویا وہ اس سے اندھا ہے اور اسے کچھ سجھائی نہیں دیتا یعنی اسے کچھ سمجھ نہیں آتی۔ ﴿ فَعَمِیَتۡ عَلَیۡہِمُ الۡاَنۡۢبَآءُ یَوۡمَئِذٍ ﴾ (28/القصص:66) ''تو اس روز ان پر تمام خبریں اندھی ہوجائیں گی۔''

عَمًی مصدر کے علاوہ اسم ذات کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے۔ مراد ہے اندھا پن۔ نابینائی۔ ﴿ وَ الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ فِیۡۤ اٰذَانِہِمۡ وَقۡرٌ وَّ ہُوَ عَلَیۡہِمۡ عَمًی ؕ ﴾ (41/حم السجدہ:44) ''اور جو یقین نہیں لاتے اُن کے کانوں میں بوجھ ہے اور یہ قرآن اُن کے حق میں اندھا پا ہے۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ) ''اور جو ایمان نہیں لاتے اُن کے کانوں میں تو بہرہ پن اور بوجھ ہے اور یہ اُن پر اندھا پن ہے۔'' (ترجمہ احسن البیان)

اَعۡمٰی ج: عُمۡیٌ اور عُمۡیَانٌ۔ اَفۡعَلُ الوان وعیوب ہے۔ بطور صفت استعمال ہوتا ہے۔ اندھا۔ ﴿ مَثَلُ الۡفَرِیۡقَیۡنِ کَالۡاَعۡمٰی وَ الۡاَصَمِّ وَ الۡبَصِیۡرِ وَ السَّمِیۡعِ ؕ ﴾ (11/ہود:24) ''دونوں فریقوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک اندھا اور بہرہ اور ایک دیکھنے والا اور سننے والا ہو'' عُمۡیٌ آیت زیر مطالعہ میں آیا ہے۔ ﴿ وَ الَّذِیۡنَ اِذَا ذُکِّرُوۡا بِاٰیٰتِ رَبِّہِمۡ لَمۡ یَخِرُّوۡا عَلَیۡہَا صُمًّا وَّ عُمۡیَانًا ﴿۷۳﴾ ﴾ (25/الفرقان:73) ''اور وہ لوگ کہ جب اُن کو سمجھایئے اُن کے رب کی باتیں، نہ پڑیں اُن پر بہرے اندھے ہو کر۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)۔

عَمٍ یا عَمِی ج: عَمُوۡنَ اور عَمِیۡنَ۔ اصل میں عَمِیٌ تھا۔ قاعدے کے اطلاق کے بعد عَمٍ ہوگیا (حالت رفع)۔ فَعِلٌ کے وزن پر صفت ہے۔ اندھا۔ ﴿ بَلۡ ہُمۡ مِّنۡہَا عَمُوۡنَ ﴿۶۶﴾ ﴾ (27/النمل:66) ''بلکہ یہ اس کی طرف سے اندھے بنے ہوئے ہیں۔'' ﴿ اِنَّہُمۡ کَانُوۡا قَوۡمًا عَمِیۡنَ ﴿۶۴﴾ ﴾ (7/الاعراف:64) ''بے شک وہ لوگ اندھے ہو رہے تھے۔'' (دونوں ترجمے تفسیر ماجدیؒ سے لکھے گئے ہیں)۔

(افعال) اِعْمَاءً اندھا کر دینا۔﴿ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فَاَصَمَّهُمْ وَ اَعْمٰٓى اَبْصَارَهُمْ ﴾(47/محمد:23)’’یہی لوگ تو ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی ہے سو اُنہیں بہرہ کر دیا اور اُن کی آنکھوں کو اندھا کر دیا۔‘‘ باب افعال کے پہلے صیغے میں مادہ ع م ی کی اصلی شکل اَعْمَیَ ہوتی ہے جو قاعدہ کے تحت تبدیل ہو کر اَعْمٰی ہو جاتی ہے۔ اَفْعَلُ کے وزن پر اس کی اصلی شکل اَعْمَیُ ہوتی ہے اور یہ بھی تبدیل ہو کر اَعْمٰی ہو جاتی ہے۔ ان میں تمیز عبارت کے سیاق وسباق سے ہوتی ہے۔

(تفعیل) تَعْمِيَةً اندھا کر دینا۔ چھپا دینا۔ کسی چیز کی حقیقت کو پوشیدہ کر دینا۔﴿ وَ اٰتٰىنِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ ﴾(11/ھود:28)’’اور اس نے یعنی اللہ نے دی مجھ کو رحمت اپنے پاس سے تو وہ پوشیدہ کر دی گئی تم لوگوں پر۔‘‘(نوٹ: اندھے پن کے لیے قرآن مجید میں جو مختلف الفاظ آئے ہیں، اس کے لیے آیت 15 کے تحت نوٹ 3 بھی دیکھ لیں)۔

ر ج ع

اس مادہ سے مندرجہ ذیل مصادر استعمال ہوئے ہیں۔

(ض) (ا) رُجُوْعًا (لازم) لوٹنا، پلٹنا، واپس ہونا۔﴿ وَ لَمَّا رَجَعَ مُوْسٰٓى اِلٰى قَوْمِهٖ ﴾(7/الاعراف:150)’’اور جب واپس ہوئے موسیٰؑ اپنی قوم کی طرف۔‘‘

(ب) رَجْعًا (متعدی) کسی کو لوٹانا، پلٹانا، واپس کرنا۔﴿ فَرَجَعْنٰكَ اِلٰٓى اُمِّكَ ﴾(20/طٰہٰ:40)’’اور ہم نے واپس کیا آپؑ کو آپؑ کی والدہ کی طرف۔‘‘

(ج) مَرْجِعًا (1) مصدر میمی ہے۔ لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ واپس ہونا۔ واپس کرنا۔ لوٹنا۔ لوٹانا۔﴿ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ ﴾(11/ھود:4)’’اللہ کی طرف ہے تم کو لوٹ کر جانا۔‘‘(2) یہ ظرف مکان بھی ہے مَفْعِلٌ کے وزن پر۔ مطلب ہے لوٹنے کی جگہ۔

(د) رُجْعٰی (لازم) یہ بھی مصدر ہے۔ پھرنا۔ لوٹنا۔ فُعْلٰی کے وزن پر بھی اکثر مصادر آتے ہیں۔ یہی وزن (فُعْلٰی) افعل التفضیل میں واحد مؤنث کا بھی ہے۔﴿ اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى ﴾(96/العلق:8)’’بے شک تیرے رب کی طرف پھر جانا ہے۔‘‘

رَجْعٌ اسم ذات ہے۔(۱) واپسی۔﴿ ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ ﴾(50/قٓ:3)’’وہ دور کی واپسی ہے۔ یعنی محال ہے۔‘‘(۲) بارش (کیونکہ سمندر کا پانی اس کی طرف واپس آتا ہے)۔’’رَجْعٌ کے لغوی معنی ہیں، لوٹنا۔ پلٹنا۔ بارش بھی بار بار اور پلٹ پلٹ کر ہوتی ہے، اس لیے بارش کو رَجْعٌ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ بادل، سمندروں سے ہی پانی لیتے ہیں اور پھر وہی پانی زمین پر لوٹا دیتے ہیں، اس لیے بارش کو رَجْعٌ کہا۔ بعض کہتے ہیں بطور تفاؤل عرب بارش کو رَجْعٌ کہتے تھے تا کہ وہ بار بار ہوتی رہے۔‘‘(فتح القدیر بحوالہ تفسیر احسن البیان، ص ۱۷۰۸)۔﴿ وَ السَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ﴾(86/الطارق:11)’’قسم ہے بارش والے آسمان کی۔‘‘ حضرت مولانا مودودیؒ فرماتے ہیں:’’آسمان کے لیے ذات الرجع کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ رَجع کے لغوی معنی تو پلٹنے کے ہیں، مگر مجازاً عربی زبان میں یہ لفظ بارش کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، کیونکہ وہ بس ایک ہی دفعہ برس کر نہیں رہ جاتی بلکہ بار بار اپنے موسم میں اور کبھی خلافِ موسم پلٹ پلٹ کر آتی ہے اور وقتاً فوقتاً برستی رہتی ہے۔ ایک اور وجہ بارش کو رَجع کہنے کی یہ بھی ہے کہ زمین کے سمندروں سے پانی بھاپ بن کر اٹھتا ہے اور پھر پلٹ کر زمین ہی پر برستا ہے۔‘‘(تفہیم القرآن، ج ۶، ص: ۳۰۵)

اِرْجِعْ ج: اِرْجِعُوْا۔ فعل امر ہے۔ تم واپس ہو۔ پلٹو۔﴿ وَ اِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا ﴾(24/النور:28)’’اور اگر کہا جائے تم لوگوں سے کہ واپس جاؤ تو واپس ہو جاؤ۔‘‘

رَاجِعٌ — ج: رَاجِعُوْنَ۔اسم الفاعل ہے۔واپس ہونے والا۔ پلٹنے والا۔﴿ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴾(2/البقرہ:156)
''ہم اللہ کے لئے ہیں اور ہم اس کی طرف ہی پلٹنے والے ہیں۔''

(تفاعل) تَرَاجُعًا — باہم مل جانا۔باہم رجوع کرنا۔اپنی اپنی جگہ واپس ہونا۔﴿ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ ﴾(2/البقرہ:230)
''تو کوئی گناہ نہیں ان دونوں پر کہ وہ باہم مل جائیں۔''

ترکیب صُمٌّ، بُكْمٌ اور عُمْيٌ یہ تینوں خبر ہیں اوران کا مبتداء هُمْ محذوف ہے۔ لَا يَرْجِعُوْنَ جملہ فعلیہ اپنے مبتداء فَهُمْ کی خبر ہے۔

ترجمہ	صُمٌّ	بُكْمٌ	عُمْيٌ	فَهُمْ	لَا يَرْجِعُوْنَ
البقرۃ:18	(وہ) بہرے ہیں	گونگے ہیں	اندھے ہیں	پس وہ لوگ	نہیں پلٹیں گے

آیت:19

﴿ اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ وَّ رَعْدٌ وَّ بَرْقٌ ۚ يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ۭ وَاللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴾

ص و ب

(ن) صَوْبًا — اوپر سے اترنا۔بارش برسنا (ٹھیک مقدار میں)

صَيِّبٌ — صَيِّبٌ دراصل صَوْبٌ (بارش) سے فَعِيْلٌ کے وزن پر مبالغہ کا صیغہ ہے۔زور کی بارش۔Rain Storm۔اصل میں صَوِيْبٌ تھا۔'و'، 'ی' میں تبدیل ہوگئی اور پھر ادغام ہوکر صَيِّبٌ بن گیا۔آیت زیر مطالعہ۔

(ض) صَيْبًا — ٹھیک جگہ اترنا۔نشانہ پر لگنا۔

صَوَابٌ — اسم ذات ہے۔ٹھیک بات۔﴿ لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَ قَالَ صَوَابًا ﴾(78/النبا:38)''وہ لوگ بات نہیں کریں گے سوائے اس کے جسے اللہ اجازت دے اور وہ ٹھیک بات کہے گا۔''

(افعال) اِصَابَةً — پالینا۔پکڑ لینا۔ارادہ کرنا۔ٹھیک نشانے پر لگنا۔ٹھیک جگہ پر پہنچنا۔(اس کا استعمال خیر اور شر، دونوں طرح کے اوپر سے ٹپک پڑنے والے حادثات و واقعات کے لئے ہوتا ہے)۔﴿ مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۡ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ۭ ﴾(4/النساء:79)''جو پہنچی تم کو کوئی بھلائی تو وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جو پہنچی تم کو کوئی برائی تو وہ تمہاری اپنی طرف سے ہے۔''اَصَابَ کے ساتھ جب 'ب' تعدیہ استعمال ہو تو مطلب ہوتا ہے کہ ٹھیک نشانے پر پہنچانا۔ڈالنا۔﴿ قَالَ عَذَابِيْٓ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَاۗءُ ۚ ﴾(7/الاعراف:156)''اللہ تعالیٰ نے فرمایا اپنا عذاب میں اُسی پر واقع کرتا ہوں جس کے لیے میں چاہتا ہوں۔''

يُصِبْ — مضارع مجزوم ہے۔﴿ اِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۚ ﴾(9/التوبۃ:50)''اگر پہنچتی ہے تم کو کوئی بھلائی تو ان لوگوں کو برا لگتا ہے۔''

مُصِيْبَةٌ — ج: مَصَائِبُ۔اسم الفاعل ہے۔اصل میں تو اس تیر کو کہتے ہیں جو ٹھیک نشانے پر جا کر بیٹھے۔عربی میں ایسے تیر کو سَهْمٌ مُصِيْبٌ کہتے ہیں۔اس کے بعد عرف عام میں ہر حادثہ اور واقعہ کے ساتھ یہ لفظ مخصوص ہوگیا۔ٹھیک نشانے پر لگنے

والی۔ ناگہانی آفت۔ غم۔ تکلیف۔ ﴿ مَآ اَصَابَ مِنۡ مُّصِیۡبَۃٍ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰہِ ﴾ (64/التغابن:11) ''نہیں پہنچتی کوئی آفت مگر اللہ کی اجازت سے۔'' فقہ کی اصطلاح میں غور و فکر اور اجتہاد کے نتیجے میں صحیح رائے تک پہنچنے والے کو مُصِیۡب اور غلط رائے پر پہنچنے والے کو مُخۡطِیٔ کہہ دیتے ہیں۔

اَلسَّمَآءِ (س م و): آیت بسم اللہ دیکھیں۔ ظُلُمٰتٌ (ظ ل م): البقرۃ آیت 17 دیکھیں۔

ر ع د

(ف۔ن) رَعۡدًا بادل کا گرجنا۔ کڑکنا۔

رَعۡدٌ اسم ذات ہے۔ بادل کی گرج۔ کڑک۔ Thunder۔ اس کا تعلق سننے سے ہے۔ 'رعد' اس فرشتے کا نام بھی ہے جو بارش برسانے پر مامور ہے۔

ب ر ق

(ن) بَرۡقًا چمکنا۔ کسی چیز کا جگمگانا۔

(س) بَرَقًا چندھیا جانا۔ حیران ہونا۔ ﴿ فَاِذَا بَرِقَ الۡبَصَرُ ﴾ (75/القیامۃ:7) ''تو جب چندھیا جائے گی آنکھ۔'' بَرۡقٌ کے معنی بجلی کے ہیں اور اسی اعتبار سے اس کے معنی 'چمکنے' کے آنے لگے۔ لیکن جب آنکھ کے ساتھ اس کا استعمال ہو (باب سمع میں) تو اس کے معنی خوف اور دہشت سے پتلیوں کے پھرنے، نظر کے چندھیا جانے اور خیرہ ہونے کے آتے ہیں۔

مولانا مودودیؒ سورۃ القیامۃ کی آیت 7 کے تحت فرماتے ہیں: ''اصل میں بَرِقَ الۡبَصَرُ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جن کے لغوی معنی بجلی کی چمک سے آنکھوں کے چندھیا جانے کے ہیں۔ لیکن عربی محاورے میں یہ الفاظ اسی معنی کے لیے مخصوص نہیں ہیں بلکہ خوف زدگی، حیرت، یا کسی اچانک حادثہ سے دوچار ہو جانے کی صورت میں اگر آدمی ہک دک رہ جائے اور اس کی نگاہ اُس پریشان کن منظر کی طرف جم کر رہ جائے جو اس کو نظر آ رہا ہو تو اس کے لیے بھی یہ الفاظ بولے جاتے ہیں۔'' (تفہیم القرآن، ج۶، ص۱۶۵)

بَرۡقٌ اسم ذات ہے۔ بجلی کی چمک۔ Lightening۔ اس کا تعلق دیکھنے سے ہے۔

اِبۡرِیۡقٌ ج: اَبَارِیۡقُ۔ اسم ذات ہے۔ جگ۔ ایسا برتن جس کا دستہ اور ٹوٹی ہو۔ آفتابہ (ماجدیؒ، ضیاء القرآن) ﴿ یَطُوۡفُ عَلَیۡہِمۡ وِلۡدَانٌ مُّخَلَّدُوۡنَ ﴿ۙ۱۷﴾ بِاَکۡوَابٍ وَّ اَبَارِیۡقَ ﴾ (56/الواقعۃ:17-18) ''طواف کریں گے ان پر ہمیشہ رہنے والے لڑکے آبخوروں اور آفتابوں کے ساتھ۔''

اِسۡتَبۡرَقٌ ریشم کا بنا ہوا موٹا کپڑا۔ گاڑھا ریشم۔ Thick Silk۔ اس کا ہمزہ، ہمزۃ القطع ہے۔ ﴿ وَّ یَلۡبَسُوۡنَ ثِیَابًا خُضۡرًا مِّنۡ سُنۡدُسٍ وَّ اِسۡتَبۡرَقٍ ﴾ (18/الکہف:31) ''اور وہ لباس پہنیں گے سبز کپڑے کے جو باریک ریشم کے اور گاڑھے ریشم کے ہوں گے۔''

ج ع ل

(ف) جَعۡلًا یہ لفظ ہر کام کرنے کے لیے بولا جا سکتا ہے اور 'فَعَلَ' اور 'صَنَعَ' وغیرہ افعال کی نسبت عام ہے۔ یہ پانچ طرح استعمال ہوتا ہے۔

(1) بمعنی صَارَ وَ طَفِقَ اس صورت میں متعدی نہیں ہوتا۔ (بلکہ فعل لازم ہوتا ہے) جیسے جَعَلَ زَیْدٌ یَقُوْلُ کَذَا یعنی زید یوں کہنے لگا۔

(2) بمعنی اَوْجَدَ (یعنی ایجاد اور پیدا کرنا) اس صورت میں یہ ایک مفعول کی طرف متعدی ہوتا ہے جیسے فرمایا: ﴿ وَ جَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَ النُّوْرَ ﴾ (6/الانعام:1) ''اور اس نے اندھیرے اور روشنی بنائی۔'' ﴿وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْـِٕدَةَ ﴾ (67/الملک:23) ''اور اس نے تمہارے لیے کان اور آنکھیں اور دل بنائے۔''

(3) ایک شے کو دوسری شے سے پیدا کرنا اور بنانا جیسے فرمایا: ﴿ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا ﴾ (16/النحل:72) ''اسی نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس کے جوڑے بنائے۔'' ﴿ وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَكْنَانًا ﴾ (16/النحل:81) ''اور اُس نے پہاڑوں میں تمہارے لیے غاریں بنائیں۔''

(4) بمعنی تصییر یعنی کسی شے کو ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل کر دینا اس صورت میں عام طور پر دو مفعول ہوتے ہیں جیسے فرمایا: ﴿ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا ﴾ (2/البقرۃ:22) ''وہ جس نے تمہارے لیے زمین کو بچھونا بنایا۔'' ﴿ اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِیًّا ﴾ (43/الزخرف:3) ''بے شک ہم نے اس کو عربی قرآن بنایا ہے۔''

(5) کسی چیز پر کسی چیز کا سچا یا جھوٹا حکم لگا دینا۔ حق کی مثال جیسے: ﴿ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَیْكِ وَ جَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ﴾ (28/القصص:7) ''ہم ان کو تمہارے پاس واپس پہنچا دیں گے اور (پھر) اسے پیغمبر بنا دیں گے۔'' اور باطل کی مثال جیسے: ﴿ وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَ الْاَنْعَامِ نَصِیْبًا ﴾ (6/الانعام:136) ''اور (یہ لوگ) خدا ہی کی پیدا کی ہوئی چیزوں یعنی کھیتی اور چوپایوں میں سے خدا کا بھی ایک حصہ مقرر کرتے ہیں۔'' ﴿ وَ یَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ الْبَنٰتِ ﴾ (16/النحل:57) ''اور یہ لوگ خدا کے لیے تو بیٹیاں تجویز کرتے ہیں۔'' (تلخیص از مفردات القرآن، ج ا، ص ۱۸۳)

اِجْعَلْ — ج: اِجْعَلُوْا۔ فعل امر ہے۔ تو بنا تو مقرر کر۔ ﴿ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّیْۤ اٰیَةً ﴾ (19/مریم:10) ''انہوں نے کہا اے میرے رب تو مقرر کر دے میرے لیے ایک نشانی۔''

لَا تَجْعَلْ — فعل نہی ہے۔ تو مت بنا۔ ﴿ لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ﴾ (17/بنی اسرائیل:22) ''تو مت بنا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود۔''

جَاعِلٌ — اسم الفاعل ہے۔ بنانے والا۔ مقرر کرنے والا۔ کرنے والا۔ ﴿ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ﴾ (2/البقرۃ:30) ''بیشک میں مقرر کرنے والا ہوں زمین میں ایک خلیفہ۔''

ص ب ع

(ف) صَبْعًا — انگلی سے اشارہ کر کے بتانا۔

اِصْبَعٌ — ج: اَصَابِعُ۔ اسم ذات ہے۔ انگلی۔ (اِصْبَعٌ عربی کے ان چند الفاظ میں سے ہے جس کی متعدد شکلوں کا استعمال جائز ہے۔ دراصل اس کا ہمزہ بھی اور عین کلمہ (ب) بھی تینوں حرکات کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ اس طرح دونوں حروف کی مختلف حرکات کے امتزاج سے جتنی شکلیں بنیں گی وہ سب جائز ہیں)۔

ء ذ ن

(س) اَذَنًا — کان لگانا۔ سننا۔ خبردار ہونا۔ جاننا۔ عام طور پر اس کے ساتھ 'اِلٰی' یا 'لِ' کا صلہ لگتا ہے۔ ﴿ وَ اَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَ

حُقَّتْ ﴿٥﴾ (84/الانشقاق:5) ''اور وہ سنے گی اپنے رب کے حکم کو اور اس پر واجب بھی ہے۔''

اِذْنًا — اجازت دینا۔ اس صورت میں بھی اس کے ساتھ عام طور پر 'لِ' کا صلہ آتا ہے۔ ﴿يَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ﴾ (20/طٰہٰ:109) ''اس دن نفع نہیں دے گی شفاعت سوائے اس کے جس کو اجازت دے گا رحمٰن۔''

نوٹ: اَذِنَ لِ: اگر اَذَنٌ مصدر سے ہو تب اس کے معنی ہوتے ہیں کان لگا کر کسی کی بات سننا اور حکم کی تعمیل کرنا اور اگر اِذْنٌ مصدر سے ہو تب اس کے معنی ہوتے ہیں اجازت دینا۔

اِيْذَنْ — فعل امر ہے۔ تو اجازت دے۔ یاد کر لیں اِيْذَنْ کو جب ماقبل سے ملا کر پڑھا جائے تو تبدیل شدہ ہمزہ واپس آ جاتا ہے جیسے فَ (اِيْذَنْ)۔ فَأْذَنْ۔ ﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ﴾ (9/التوبۃ:49) ''اور ان میں وہ بھی ہے جو کہتا ہے آپ ﷺ اجازت دیں مجھ کو۔''

اُذُنٌ — ج: اٰذَانٌ۔ اسم ذات ہے۔ کان۔ اُذُنٌ واحد، تثنیہ، جمع، مذکر، مؤنث سب کے لیے استعمال ہو جاتا ہے۔ ﴿لِنَجْعَلَهَا لَكُمْ تَذْكِرَةً وَّ تَعِيَهَآ اُذُنٌ وَّاعِيَةٌ ﴿١٢﴾﴾ (69/الحاقۃ:12) ''تاکہ ہم بنا دیں اس کو تمہارے لئے یاد دہانی اور یاد رکھے اس کو یاد رکھنے والا کان۔'' ﴿اَمْ لَهُمْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا﴾ (7/الاعراف:195) ''کیا ان کے کان ہیں وہ لوگ سنتے ہیں جس سے۔'' اِستعارہ کے طور پر ہر وہ شخص جو ہر ایک کی بات سن کر اسے مان لے اُسے اُذُنٌ کہہ دیتے ہیں۔ جیسے قرآن مجید میں فرمایا: ﴿وَ يَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ﴾ ''اور کہتے ہیں وہ نرا کان ہے۔'' یعنی ہر ایک کی بات سن کر مان لیتا ہے۔ مبالغے کا مفہوم پیدا کرنے کے لیے تمام وجود کو جسم کے ایک حصے کا نام دیا گیا۔ (اِستِعارہ: لفظی معنی ہیں کسی سے کچھ مانگ لینا۔ علم بیان کی اصطلاح میں اس سے مراد ہوتا ہے کسی لفظ کے غیر حقیقی معنی مراد لینا۔ یہ مجازی معنی کی ایک قسم ہے۔ فیروز اللغات۔٦١)

اَذَانٌ — اسم ذات ہے۔ اعلان۔ پکار۔ نماز کی اذان۔ ﴿وَ اَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖٓ﴾ (9/التوبۃ:3) ''اور اعلان ہے اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے۔''

اِذْنٌ — اسم ذات ہے۔ اجازت۔ ﴿وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ (2/البقرۃ:102) ''اور وہ تکلیف پہنچانے والے نہیں ہیں اس سے کسی ایک کو بھی مگر اللہ کی اجازت سے۔''

(افعال) اِيْذَانًا — سنانا۔ آگاہ کرنا۔ خبردار کرنا۔ ﴿فَقُلْ اٰذَنْتُكُمْ عَلٰى سَوَآءٍ وَ اِنْ اَدْرِيْٓ اَقَرِيْبٌ اَمْ بَعِيْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ ﴿١٠٩﴾﴾ (21/الانبیاء:109) ''تو آپ ﷺ کہہ دیجئے میں نے آگاہ کیا تم لوگوں کو پوری طرح اور میں نہیں جانتا آیا وہ قریب ہے یا دور ہے جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے۔''

(تفعیل) تَاْذِيْنًا — اعلان کرنا۔ خبر دینا۔ سنانا۔ پکارنا۔ اذان دینا۔ ﴿فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌ بَيْنَهُمْ اَنْ لَّعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿٤٤﴾﴾ (7/الاعراف:44) ''تو پکارا ایک پکارنے والے نے ان کے مابین کہ اللہ کی لعنت ہے ظالموں پر۔''

مُؤَذِّنٌ — اسم الفاعل ہے۔ پکارنے والا۔ اوپر الاعراف آیت 44 دیکھیں۔

اَذِّنْ — فعل امر ہے۔ تو پکار۔ ﴿وَ اَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ﴾ (22/الحج:27) ''اور آپؐ پکاریئے لوگوں کو حج کے لیے۔''

(تفعّل) تَاَذُّنًا — کان کھول کر سنا دینا۔ جتلا دینا۔ کسی فیصلے کا اعلان کرنا۔ اطلاع دینا۔ خبردار کرنا۔ نوٹس دینا۔ ﴿وَ اِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ﴾ (14/ابراہیم:7) ''اور جب سنا دیا تمہارے رب نے اگر تم لوگ شکر کرو گے تو میں لازماً زیادہ دوں گا تم کو۔''

(استفعال) اِسْتِئْذَانًا اجازت طلب کرنا۔﴿اِسْتَاْذَنَكَ اُولُوا الطَّوْلِ مِنْهُمْ﴾(9/التوبۃ:86)''اجازت طلب کی آپ ﷺ سے ان میں سے صاحبِ حیثیت لوگوں نے۔''

ص ع ق

(ف) صَاعِقَةً بجلی گرنا۔بجلی گرانا۔

(س) صَعْقًا، صَعْقًا ہولناک دھماکہ ہونا۔گرجنا۔گرج کی آواز سے مرنا۔بیہوش ہونا۔زوردار آواز سن کر عقل کا خراب ہونا۔﴿وَ نُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ؕ﴾(39/الزمر:68)''اور پھونکا جائے گا صور میں تو مر جائیں گے جو بھی آسمانوں میں ہیں اور جو بھی زمین میں ہیں مگر جس کو اللہ چاہے۔''

صَعِقٌ صفت ہے۔مردہ۔بیہوش۔﴿فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّ خَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ۚ﴾(7/الاعراف:143) ''پس جب تجلی ڈالی اس کے رب نے پہاڑ پر تو کر دیا اس کو پاش پاش اور گر پڑے موسیٰؑ بیہوش ہو کر۔''

صَاعِقَةٌ ج:صَوَاعِقُ۔اسم ذات ہے۔صَاعِقَةٌ کے اصل معنی بیہوش کرنے والی چیز کے ہیں پھر یہ لفظ آسمان سے گرنے والی بجلی جو ہلاک کر دے۔چیخ۔عذاب اور کڑک کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔﴿فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ﴾ (2/البقرۃ:55)''تو پکڑا تم کو زوردار چیخ نے۔''

ح ذ ر

(س) حَذَرًا آنے والے خطرے سے ہوشیار رہنا۔محتاط رہنا۔بچنا۔ڈرنا۔﴿يَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُوْرَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ؕ﴾(9/التوبۃ:64)''ڈرتے ہیں منافق کہ اتاری جائے ان پر کوئی سورت جو خبر دے ان کو اس کی جو ان کے دلوں میں ہے۔''نظم و نثر میں کسی چیز سے محتاط و ہوشیار رہنے کی دعوت دیتے ہوئے تکرار کے ساتھ بولا جاتا ہے:اَلْحَذَرَ اَلْحَذَرَ۔

اِحْذَرْ ج: اِحْذَرُوْا۔ فعل امر ہے۔تم بچو۔﴿اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَ اَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ ۚ﴾ (64/التغابن:14)''بیشک تمہارے جوڑوں میں اور تمہاری اولاد میں تمہارے دشمن ہیں بس تم لوگ ان سے محتاط رہو۔''

لِيَحْذَرْ امر غائب ہے۔ چاہیے کہ وہ بچے۔﴿فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ﴾ (24/النور:63)''پس چاہیے کہ وہ لوگ ڈریں جو خلاف کرتے ہیں اس کے حکم سے کہ ان کو پہنچے کوئی آزمائش۔''

حَاذِرٌ ج: حَاذِرُوْنَ۔اسم الفاعل ہے۔(1) خطرے سے بچنے والا۔ہتھیار بند۔مسلح۔(2) ڈرنے والا۔خطرہ رکھنے والا۔﴿وَ اِنَّا لَجَمِيْعٌ حٰذِرُوْنَ ؕ﴾(26/الشعراء:56)''اور ہم سب کو اُن سے خطرہ ہے۔''(ترجمہ ماجدیؒ)۔''اور یقیناً ہم بڑی جماعت ہیں اُن سے چوکنا رہنے والے۔''(ترجمہ احسن البیان)

حَذَرٌ اسم ذات ہے۔ڈر۔خوف۔﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَ هُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ ۪﴾ (2/البقرۃ:243)''کیا آپ ﷺ نے نہیں دیکھا ان لوگوں کو جو نکلے اپنے گھروں سے اور وہ ہزاروں تھے،موت کے ڈر سے۔''

حِذْرٌ اسم ذات ہے۔ذریعہ بچاؤ۔ہر وہ چیز جس کے ذریعے بچاؤ کیا جائے۔ہتھیار۔اسلحہ۔﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ﴾(4/النساء:71)''اے لوگو جو ایمان لائے ہو تم لوگ پکڑو اپنے ہتھیار۔''

مَحْذُوْرٌ اسم المفعول ہے۔وہ چیز جس سے بچا جائے۔ڈرنے کی چیز۔قابل خوف۔﴿ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا ﴾ (17/بنی اسرائیل:57)''بیشک تیرے رب کا عذاب بچنے کی چیز ہے۔''

(تفعیل) **تَحْذِیْرًا** محتاط رہنے کی تلقین کرنا۔ڈرانا۔﴿ وَیُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ﴾ (3/آل عمران:28)''اور اللہ تم کو محتاط رہنے کی تلقین کرتا ہے اپنے نفس سے۔''

م و ت

یہ مادہ باب (ن)(س)(ض) تینوں ابواب سے استعمال ہوتا ہے کیونکہ سورۂ مریم کی آیت 23 میں مِتُّ کا صیغہ استعمال ہوا ہے (واحد متکلم) جو کہ باب (ض) یا باب (س) سے ہوسکتا ہے۔اور باب (ن) سے یہ مُتُّ بنتا ہے۔اسی طرح فعل امر مُوْتُوْا (واحد: مُتْ) باب (ن) سے استعمال ہوا ہے۔(واللہ اعلم)

(ن) (س) (ض) **مَوْتًا** آگ کا بجھنا۔کسی جاندار چیز کا بے جان ہونا۔مرنا۔﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ اُولٰٓئِكَ عَلَیْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ ﴾ (2/البقرۃ:161)''بیشک جن لوگوں نے کفر کیا اور وہ مرے اس حال میں کہ وہ کافر تھے، تو یہ لوگ ہیں جن پر اللہ کی لعنت ہے۔''

تَمُتْ مضارع مجزوم ہے۔﴿ اَللّٰهُ یَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِهَا ﴾ (39/الزمر:42)''اللہ قبض کر لیتا ہے جان کو اسکی موت کے وقت اور اس کو بھی جو نہیں مرتی ہے اپنی نیند میں۔''

مُتْ ج: مُوْتُوْا۔فعل امر ہے۔تو مرجا۔﴿ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ﴾ (2/البقرۃ:243)''تو کہا ان لوگوں سے اللہ نے کہ تم لوگ مرجاؤ۔''

مَیِّتٌ ج: مَیِّتُوْنَ۔اَمْوَاتٌ۔اسم صفت ہے۔وہ چیز جس میں پہلے جان تھی اب نہیں ہے۔مردہ۔﴿ وَتُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ ﴾ (3/آل عمران:27)''اور تو نکالتا ہے زندہ کو مردہ سے۔'' مَیِّتٌ اس شخص کو بھی کہتے ہیں جو آئندہ مرنے والا ہو۔جیسے فرمایا: ﴿ اِنَّكَ مَیِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّیِّتُوْنَ ﴾ (39/الزمر:30)''بیشک تم کو مردہ ہونا ہے اور ان لوگوں کو بھی مردہ ہونا ہے۔'' ﴿ كَیْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْیَاكُمْ ﴾ (2/البقرۃ:28)''تم لوگ کیسے انکار کرتے ہو اللہ کا حالانکہ تم لوگ مردہ تھے تو اس نے زندہ کیا تم لوگوں کو۔''

مَیْتٌ اور مَیْتَةٌ ج: مَوْتٰی۔اسم صفت ہے۔بے جان چیز۔مردہ۔﴿ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا لِّنُحْیِیَ بِهٖ بَلْدَةً مَّیْتًا ﴾ (25/الفرقان:48-49)''اور ہم نے نازل کیا آسمان سے پاک پانی تاکہ ہم زندہ کریں اس سے کسی مردہ شہر کو۔'' ﴿ وَاٰیَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَیْتَةُ اَحْیَیْنٰهَا ﴾ (36/یٰسین:33)''اور ایک نشانی ہے ان کے لیے مردہ زمین، ہم نے زندہ کیا اس کو۔'' ﴿ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی ﴾ (2/البقرۃ:260)''اور جب کہا ابراہیمؑ نے اے میرے رب تو دکھا دے مجھے کہ تو کیسے زندہ کرے گا مردوں کو۔''

مَوْتٌ اور مَوْتَةٌ اسم ذات ہے۔بے جان ہونے کی کیفیت۔موت۔﴿ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ﴾ (3/آل عمران:185)''ہر جان موت کو چکھنے والی ہے۔'' ﴿ لَا یَذُوْقُوْنَ فِیْهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰی ﴾ (44/الدخان:56)''وہ لوگ نہیں چکھیں گے اس میں موت کو سوائے پہلی موت کے۔''

مَمَاتٌ اسم ظرف زمان ہے۔مردہ رہنے کا عرصہ۔زمانۂ موت۔﴿ اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ اجْتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ

كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَ مَمَاتُهُمْ ؕ﴾ (45/الجاثیہ:21) ''کیا گمان کیا ان لوگوں نے جنہوں نے ارتکاب کیا برائیوں کا، کہ ہم ان کو بنا دیں گے ان لوگوں کی طرح جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک کام کیے، تاکہ برابر کر دیں ان کا عرصۂ حیات اور ان کا زمانۂ موت۔'' مَمَاتٌ کا لفظ مصدر میمی کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے، مطلب ہوتا ہے ''مرنا''۔﴿ قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶۲﴾ ﴾ (6/الانعام:162) ''آپؐ فرما دیجئے کہ بے شک میری نماز اور میری ساری عبادتیں اور میرا جینا اور میرا مرنا، سب کچھ اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔''

(افعال) اِمَاتَةً کسی کو موت دینا۔ مردہ کرنا۔﴿ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ؕ﴾ (2/البقرہ:259) ''تو موت دی اس کو اللہ نے ایک سو برس تک پھر اٹھایا اسکو۔'' کوئی اگر کسی اور کو مارے تو کوئی اور فعل استعمال ہوگا (مثلاً: اَهْلَكَ)۔ لیکن اَمَاتَ، يُمِيْتُ صرف اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے۔ اسی سے اَلْمُمِيْتُ (اسم الفاعل بمعنی موت دینے والا) اللہ کا صفاتی نام ہے۔

اَللّٰهُ (ء ل ہ): آیت بسم اللہ دیکھیں۔

ح و ط

(ن) حَوْطًا حفاظت کرنا۔ دیکھ بھال کرنا۔

(افعال) اِحَاطَةً چاروں طرف سے گھیرنا۔ احاطہ کرنا۔ کسی شے پر اس طرح چھا جانا، گھیر لینا یا قابو پانا کہ وہ فرار نہ ہو سکے۔ اس کے ساتھ 'ب' کا صلہ آتا ہے۔ عربی میں یوں نہیں کہتے اَحَاطَهٗ بلکہ یوں کہتے ہیں اَحَاطَ بِهٖ۔﴿ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ﴾ (2/البقرہ:255) ''اور وہ لوگ احاطہ نہیں کرتے کسی چیز کا اس کے علم میں سے مگر جو وہ چاہے۔''

مُحِيْطٌ اسم الفاعل ہے۔ واحد مذکر۔ گھیرنے والا۔ آیت زیر مطالعہ۔

مُحِيْطَةٌ اسم الفاعل ہے۔ واحد مؤنث۔ گھیرنے والی۔﴿ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿۵۴﴾ ﴾ (29/العنکبوت:54) ''یقیناً جہنم چاروں طرف سے گھیرنے والی ہے کافروں کو۔''

كٰفِرِيْنَ (ک ف ر): البقرۃ آیت 6 دیکھیں۔

ترکیب

'اَوْ' حرفِ عطف ہے بمعنی 'یا'۔ دو چیزوں میں برابری بیان کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً جَالِسِ الْحَسَنَ اَوِابْنَ سیرین چاہے تو حسن کے پاس بیٹھ یا ابن سیرین کے۔ دونوں کے پاس بیٹھنا برابر ہے۔ یہاں اَوْ سے مراد ہے کہ منافقوں کو خواہ آگ جلانے والوں سے تشبیہ دو چاہے مینہ سے بھاگنے والوں سے، دونوں برابر ہیں۔ (حقانیؒ)۔ كَصَيِّبٍ، آیت 17 میں كَمَثَلِ پر عطف ہے۔ اور صَيِّبٍ سے پہلے مضاف محذوف ہے۔ سادہ جملہ یوں ہوتا۔ اَوْ مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ اَصْحَابِ صَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ (حقانیؒ)۔ مَثَلُهُمْ مبتدا محذوف ہے۔ كَصَيِّبٍ، محذوف خبر کے متعلق ہے۔ مِّنَ السَّمَآءِ، صَيِّبٍ کی صفت ہے۔ یعنی ان کی مثال بارش میں گھرے ہوئے لوگوں کی مثال کی مانند ہے۔ تفسیر عثمانیؒ کے حاشیے میں حضرتؒ فرماتے ہیں: ''دوسری مثال ان منافقین کی ان ''لوگوں'' کی سی ہے کہ ان پر آسمان سے مینہ شدت کے ساتھ پڑ رہا ہو'' آگے ظُلُمٰتٌ، رَعْدٌ، اور بَرْقٌ مبتدا مؤخر نکرہ ہیں۔ ان کی خبر موجودٌ محذوف ہے اور فِيْهِ قائم مقام خبر مقدم ہے۔ فِيْهِ میں ضمیر صَيِّبٌ کے لیے ہے، السَّمَآءِ کے لیے نہیں کیونکہ السَّمَآءِ کے لیے 'ھا' آتی ہے۔ (واللہ اعلم)۔ يَجْعَلُوْنَ فعل ہے۔ اس کا فاعل اس میں شامل ضمیر هُمْ ہے۔ اَصَابِعَهُمْ اس کا مفعول ہے۔ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ متعلق فعل ہے۔ مِّنَ الصَّوَاعِقِ میں مِنْ سببیہ ہے۔ یعنی کڑک کے سبب سے اور حَذَرَ الْمَوْتِ، مفعول لہٗ ہے يَجْعَلُوْنَ کا۔ یعنی موت کے ڈر کی وجہ سے۔ مطلب یہ ہے کہ کڑک کے سبب سے

وہ اپنی انگلیاں کانوں میں ڈال لیتے ہیں۔ اور یہ سارا فعل اس لیے کرتے ہیں کہ انہیں موت کا خوف ہے۔ گویا کانوں میں انگلیاں ڈالنے کی دو وجہیں ہیں۔ کڑک اور موت کا خوف۔ (واللہ اعلم)

حَذَرَ الْمَوْتِ میں یہ بات نوٹ کر لیں کہ حَذَرَ ماضی کا پہلا صیغہ نہیں ہے۔ یہ اسم حَذَرٌ ہے جو منصوب ہونے کی وجہ سے حَذَرًا ہوا۔ پھر مضاف ہونے کی وجہ سے تنوین ختم ہوئی تو حَذَرَ استعمال ہوا۔ اَللّٰهُ مبتداء، مُحِيْطٌ خبر اور بِالْكٰفِرِيْنَ متعلق خبر ہے۔

ترجمہ	اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ	فِيْهِ	ظُلُمٰتٌ	وَّ رَعْدٌ
البقرۃ:19	یا آسمان سے بارش کی مانند ہے	اس میں	اندھیرے ہیں	اور بادل کی گرج ہے

وَّ بَرْقٌ ۚ	يَجْعَلُوْنَ	اَصَابِعَهُمْ	فِيْٓ اٰذَانِهِمْ	مِّنَ الصَّوَاعِقِ
اور بجلی کی چمک ہے	وہ لوگ رکھتے ہیں	اپنی انگلیوں کو	اپنے کانوں میں	کڑک کے سبب سے

حَذَرَ الْمَوْتِ ؕ	وَاللّٰهُ مُحِيْطٌ	بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹﴾
موت کے ڈر سے	اور اللہ گھیرنے والا ہے	کافروں کو

آیت:20

﴿ يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ ؕ كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ ۙ وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَ اَبْصَارِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۰﴾ ﴾

ك و د

(س) كَوْدًا

(ا) یہ افعال مقاربہ میں سے ہے۔ ماضی اور مضارع دونوں استعمال ہوتے ہیں۔ کسی دوسرے فعل کے ساتھ بطور معاون فعل استعمال ہوتا ہے۔ بنیادی مفہوم ہے قریب ہونا۔ یہ دو طرح سے استعمال ہوتا ہے۔

(i) اگر جملہ مثبت ہو تو اس کے معنی ہوتے ہیں ''کام کرنے کے قریب ہونا لیکن نہ کرنا''۔ مثلاً: ﴿ يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ ؕ ﴾ ''قریب ہے کہ بجلی اچک لے اُن کی نظروں کو (لیکن اس نے ایسا نہیں کیا)۔ ﴿ اِنْ كَادَ لَيُضِلُّنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا لَوْ لَآ اَنْ صَبَرْنَا عَلَيْهَا ؕ ﴾ (25/الفرقان:42) ''قریب تھا کہ وہ ہمیں بہکا دے ہمارے خداؤں سے اگر نہ ہوتا کہ ہم ڈٹے رہتے ان پر۔'' ﴿ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ ﴾ (19/مریم:90) ''قریب ہے کہ آسمان پھٹ پڑیں اس سے۔''

(ii) اگر اس کے ساتھ حرف نفی آ جائے تو پھر اس کے معنی ہوتے ہیں ''قریب تھا کہ نہ کرے لیکن کر لیا'' یا ''لگتا نہیں تھا کہ کرے لیکن کر لیا''۔ مثلاً: ﴿ فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۱﴾ ﴾ (2/البقرہ:71) ''پس ان لوگوں نے ذبح کیا اس گائے کو اور لگتا نہیں تھا کہ وہ لوگ کریں گے۔'' یا فرمایا: ﴿ لَّا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ قَوْلًا ﴿۹۳﴾ ﴾ (18/الکہف:93) ''جو کوئی بات ہی نہیں سمجھتے تھے۔''

(ب) بعض بزرگوں نے اس کا معنی هَمَّ و اَرَادَ بھی کیے ہیں یعنی پختہ ارادہ کرنا۔ مثلاً ﴿ اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا ﴾ (20/طٰہٰ:15) ''یقیناً قیامت آنے والی ہے، میں ارادہ کرتا ہوں کہ میں خفیہ رکھوں اس کو۔''

افعال مقاربہ کی مزید تشریح عربی کا معلم حصہ سوم ص ۸۶ سے دیکھیں۔

اَلۡبَرۡقُ:(ب ر ق) البقرۃ آیت 19 دیکھیں۔

خ ط ف

(س) خَطْفَۃً، خَطْفًا اُچک لینا۔ ﴿وَمَنۡ یُّشۡرِكۡ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخۡطَفُهُ الطَّیۡرُ﴾ (22/الحج:31) ''اور جس نے شرک کیا اللہ کے ساتھ تو گویا کہ وہ گرا آسمان سے پس اچک لے جاتے ہیں اس کو پرندے۔''

اَلۡخَطۡفَۃُ اسم ذات بھی ہے۔ مراد ہے اُچکی ہوئی چیز۔ جسم کا وہ حصہ جس کو درندہ جھپٹا مار کر اُتار لے۔ (مصباح) ﴿اِلَّا مَنۡ خَطِفَ الۡخَطۡفَةَ فَاَتۡبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ ۝۱۰﴾ (37/الصافات:10) ''مگر جو کوئی ایک آدھ بات اچک لے بھاگے تو (فوراً ہی) اس کے پیچھے دہکتا ہوا شعلہ لگ جاتا ہے۔''

(تفعّل) تَخَطُّفًا کھینچ کر یا گھسیٹ کر لے جانا۔ اچک لینا۔ ﴿تَخَافُوۡنَ اَنۡ یَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ﴾ (8/الانفال:26) ''تم لوگ ڈرتے تھے کہ تم کو زبردستی لے جائیں گے لوگ۔''

اَبۡصَارٌ (ب ص ر): البقرۃ آیت 7 دیکھیں۔

ك ل ل

(ض) کَلاًّ، کَلاًّ تھکنا۔ والد اور اولاد کے بغیر ہونا۔

کَلٌّ اسم ہے۔ وہ شخص جس کا نہ باپ ہو نہ بیٹا۔ بیکار آدمی جس سے کسی فائدے کی امید نہ ہو۔ بوجھ۔ واحد، تثنیہ، جمع سب کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ﴿وَّ هُوَ كَلٌّ عَلٰی مَوۡلٰهُ ۙ﴾ (16/النحل:76) ''اور وہ ایک بوجھ ہے اپنے آقا پر۔'' (کَلٌّ قرآن مجید میں ایک ہی دفعہ استعمال ہوا ہے مندرجہ بالا آیت میں)۔

کَلَّا کَلَّا حرف الرّدع ہے۔ ردع کے معنی ہیں ''جھڑک دینا''، ''انکار کر دینا''۔ کَلَّا ماقبل کلام کی نفی کے لیے آتا ہے اور عام طور پر اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے' ہرگز نہیں'۔ مثلاً: ﴿اَفَرَءَیۡتَ الَّذِیۡ كَفَرَ بِاٰیٰتِنَا وَ قَالَ لَاُوۡتَیَنَّ مَالًا وَّ وَلَدًا ۝ؕ اَطَّلَعَ الۡغَیۡبَ اَمِ اتَّخَذَ عِنۡدَ الرَّحۡمٰنِ عَهۡدًا ۝ۙ كَلَّا ؕ﴾ (19/مریم:77-79) ''بھلا تم نے اُس شخص کو دیکھا جس نے ہماری آیتوں سے کفر کیا اور کہنے لگا (اگر میں دوبارہ زندہ ہوا بھی تو یہی) مال اور اولاد مجھے وہاں ملے گا کیا اُس نے غیب کی خبر پا لی ہے یا اللہ کے یہاں سے عہد لے لیا ہے، ہرگز نہیں۔'' اور اسی طرح کی اور بہت سی آیات ہیں۔ کَلَّا کبھی حَقًّا (بے شک، یقیناً) کے معنی میں بھی آتا ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿كَلَّاۤ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَیَطۡغٰۤی ۝ۙ﴾ (96/العلق:6) ''بے شک انسان سرکشی کرتا ہے۔'' اس آیت میں کَلَّا کی وضاحت کرتے ہوئے حضرت مولانا عبدالماجد دریا بادیؒ فرماتے ہیں: ''کَلَّا ہمیشہ تردید ہی کے معنی میں نہیں بلکہ کبھی زور و تاکید کے موقع پر یقیناً کے معنی میں بھی آتا ہے۔'' (تفسیر ماجدیؒ، ص ۱۱۷۸)

کُلٌّ کُلٌّ لفظاً واحد ہے اور معنی کے لحاظ سے جمع۔ مذکر کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور مؤنث کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ کُلٌّ ہمیشہ مضاف استعمال ہوتا ہے۔ اگر مضاف الیہ مذکور نہ ہو تو محذوف مانا جاتا ہے۔ کُلٌّ دو طرح کا ہوتا ہے، مجموعی اور افرادی۔ کُلٌّ افرادی ہمیشہ نکرہ، مفرد کی طرف مضاف ہوتا ہے جس کا ترجمہ ہوتا ہے ہر ایک، جیسے کُلُّ اِنۡسَانٍ (ہر انسان)، بِكُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ (ہر چیز کا علم رکھنے والا)، کُلُّ کِتَابٍ (ہر ایک کتاب)۔ کُلٌّ مجموعی معرف

باللام کی طرف مضاف ہوتا ہے یا اس ضمیر کی طرف مضاف ہوتا ہے جو معرف باللام کی طرف راجع ہوتی ہے، اس وقت مجموعہ افراد پر دلالت کرتا ہے اور ترجمہ ہوتا ہے سب، پورا۔ کُلُّ الْقَوْمِ (سب قوم، پوری قوم) فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ (سب فرشتوں نے سجدہ کیا)، لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (تاکہ سب مذہبوں پر اُس کو غالب کردے)۔ کبھی اس سے ایک چیز کے تمام اجزاء مراد ہوتے ہیں، جیسے كُلُّ الرُّمَّانِ (پورا انار یعنی اس کے سب اجزاء، چھلکا، دانہ، عرق وغیرہ)، كُلُّ الْكِتٰبِ (کل کی کل کتاب یعنی وہ پوری کتاب جس کی بات ہو رہی ہے)۔ كُلٌّ مجموعی اور افرادی کے علاوہ کبھی كُلٌّ بمعنی بعض بھی آتا ہے جیسے فرمایا: ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا (بعض پہاڑوں پر اُن کا ایک ایک حصہ رکھ دو)۔ یا فرمایا: قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ (ہم نے کہا کہ اس کشتی میں ہر قسم کے جوڑوں میں سے دو دو کو چڑھا لو) اس آیت کے حاشیے میں حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ فرماتے ہیں: ''اس كُلٍّ سے مراد یقیناً آبی اور ہوائی اور زمینی جانوروں کے سارے انواع واقسام نہیں ہو سکتے بلکہ مراد صرف خشکی ہی کے جانور ہیں اور ان میں بھی صرف وہ جو عادۃً انسان کے کام آتے رہتے ہیں۔ لفظ كُلٍّ کے اس محدود معنی میں استعمال کی مثالیں قرآن مجید ہی میں بہ کثرت مل جاتی ہیں۔'' (تفسیر ماجدیؒ، ص ۴۹۹)۔ قرآن پاک اور فصحائے عرب کے کلام میں کہیں بھی یہ لفظ معرّف باللام یعنی اَلْكُلُّ استعمال نہیں ہوا۔ (واللہ اعلم)

كُلَّمَا كُلَّمَا مرکب ہے۔ كُلَّ اور 'مَا' سے۔ یہ ظرف کے تکرار کا مفہوم دیتا ہے اور مطلب ہوتا ہے۔ جب کبھی بھی، جس جس وقت۔ اس میں ظرف کا مفہوم 'مَا' کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اس لیے اسے 'مَا مصدریہ ظرفیہ' کہتے ہیں۔ اور اسی ظرفیت کی وجہ سے كُلَّ ہمیشہ منصوب رہتا ہے۔۔ اکثر كُلَّمَا کے بعد فعل ماضی آتا ہے۔ جیسے ﴿كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ﴾ (4/النساء:56) ''جب کبھی بھی اُن کی جلدیں جل جائیں گی۔'' ﴿كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ﴾ (2/البقرۃ:20) ''جب کبھی چمکتی ہے اُن کے لیے۔'' ﴿كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ﴾ (71/نوحؑ:7) ''جب کبھی میں نے اُنہیں بلایا۔'' اس میں شرط کا مفہوم بھی ہوتا ہے۔

كَلٰلَةً لغوی معنی ہیں کمزور اور ضعیف۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ اس لفظ کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''صاحبؒ روح المعانی لکھتے ہیں کہ کلالہ اصل میں مصدر ہے جو کلال کے معنی میں ہے، اور کلال کے معنی ہیں تھک جانا، جو ضعف پر دلالت کرتا ہے (یعنی معنی ہوئے کمزور اور ضعیف) باپ بیٹے والی قرابت کے سوا قرابت کو کلالہ کہا گیا، اس لیے کہ وہ قرابت باپ بیٹے کی قرابت کی نسبت سے کمزور ہے۔ پھر کلالہ کا اطلاق اس مرنے والے (مرد یا عورت) پر بھی کیا گیا جس نے نہ اولاد چھوڑی اور نہ والد، اور اس وارث پر بھی اطلاق کیا گیا جو مرنے والے کا ولد (اولاد) اور والد نہ ہو، لغت کے اعتبار سے جو اشتقاق بتلایا اس کا تقاضا ہے کہ لفظ ''ذو'' مقدر ہو، اور کلالہ بمعنی ''ذو کلالہ'' ہوگا، یعنی ضعیف رشتہ والا، پھر اس مال موروث پر بھی اس کا اطلاق ہونے لگا، جو ایسی میت نے چھوڑا ہو جس کا کوئی ولد (اولاد) اور والد نہ ہو۔ (معارف القرآن، ج ۲، ص ۳۲۷) امام راغبؒ فرماتے ہیں: ''اَلْكَلَالَةُ باپ اور اولاد کے علاوہ جو وارث بھی ہو وہ كَلَالَةٌ ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے کہ كَلَالَةٌ ہر اس وارث کو کہتے ہیں جو اولاد کے علاوہ ہو۔ ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ''كَلَالَةٌ'' کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا: مَنْ مَّاتَ وَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَلَا وَالِدٌ کہ كَلَالَةٌ ہر اس میت کو کہتے ہیں جس کا باپ اور اولاد زندہ نہ ہوں۔ اس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود میت کو کلالہ قرار دیا ہے اور کلالہ کے یہ دونوں معنی صحیح ہیں کیونکہ ''كَلَالَةٌ'' مصدر ہے جو وارث اور موروث دونوں پر بولا جا سکتا ہے۔'' (مفردات القرآن، ج ۲، ص ۹۲۵)

کِلَا تاکید تثنیہ مذکر کے لیے آتا ہے۔ یعنی دونوں مذکر۔ یہ لفظ، لفظاً مفرد ہے لیکن معنی کے اعتبار سے تثنیہ ہے۔ اس لیے مفرد بھی استعمال ہوتا ہے اور تثنیہ بھی۔ بغیر مضاف الیہ کے استعمال نہیں ہوتا۔ اگر مضاف الیہ اسم ظاہر ہو تو رفع، نصب اور جرّ میں اس کا 'الف' باقی رہتا ہے۔ جیسے جَاءَ کِلَا الرَّجُلَانِ اور رَاَیْتُ کِلَا الرَّجُلَیْنِ اور مَرَرْتُ بِکِلَا الرَّجُلَیْنِ۔ مگر جب مضاف الیہ ضمیر ہو تو حالت رفع میں کِلَاھُمَا اور نصب جر میں کِلَیْھِمَا (ی کے ساتھ) آئے گا۔ جیسے رَاَیْتُ الرَّجُلَیْنِ کِلَیْھِمَا۔ قرآن مجید میں ہے: ﴿اِمَّا یَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَاۤ اَوْ كِلٰهُمَا﴾ (بنی اسراءیل:23) ''اگر تیری موجودگی میں اُن میں سے ایک یا یہ دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں۔''

كِلْتَا تاکید تثنیہ مؤنث کے لیے آتا ہے۔ یعنی دونوں مؤنث۔ اس کا استعمال بھی کِلَا کی طرح ہے۔ ان دونوں کی طرف (یعنی کِلَا اور کِلْتَا) جب ضمیر راجع ہو تو واحد کی ضمیر لائی جاتی ہے۔ جیسے ﴿كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا﴾ (الکہف:33) ''دونوں باغ خوب پھلے پھولے۔''

اَضَآءَ (ض و ء): البقرۃ آیت 17 دیکھیں۔

م ش ی

(ض) **مَشْیًا** قصد اور ارادہ سے چلنا۔ ﴿اَلَهُمْ اَرْجُلٌ يَّمْشُوْنَ بِهَاۤ﴾ (7/الاعراف:195) ''کیا ان کے پاؤں ہیں وہ لوگ چلتے ہیں جن سے۔'' 'ب' صلے کے ساتھ استعمال ہو تو مطلب ہوتا ہے کسی چیز کو لے کر چلنا۔ ﴿وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ﴾ (6/الانعام:122) ''اور ہم نے اُس کو ایک ایسا نور دے دیا کہ وہ اُس کو لیے ہوئے آدمیوں میں چلتا پھرتا ہے۔'' (ترجمہ احسن البیان)

اِمْشِ ج: اِمْشُوْا۔ فعل امر ہے۔ تو چل۔ ﴿هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِيْ مَنَاكِبِهَا﴾ (67/الملک:15) ''وہی ہے جس نے کر دیا تمہارے لئے زمین کو پست و مطیع، تو تم لوگ چلو اس کے راستوں میں۔''

مَشْیٌ اسم ذات ہے۔ چال۔ ﴿وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ﴾ (31/لقمان:19) ''اور تم میانہ روی کرو اپنی چال میں۔''

مَشَّاءٌ فَعَّالٌ کے وزن پر مبالغہ ہے۔ بہت زیادہ چلنے والا۔ ﴿هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۭ بِنَمِيْمٍ﴾ (68/القلم:11) ''بہت طعنے دینے والا، چغلی لیے پھرنے والا۔'' مَشَّاءٌ اصل میں مَشَّایٌ تھا جو قاعدے کے مطابق تبدیل ہو کر مَشَّاءٌ استعمال ہوتا ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ کسی اسم کے حرف علت (و، ی) کے ماقبل اگر الف زائدہ ہو تو اس و، ی کو ہمزہ میں بدل دیتے ہیں۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو آسان عربی گرامر از لطف الرحمٰن خان صاحب حصہ سوم ص ۹۲)

مَشِيَّةٌ ارادہ۔ قرآن مجید میں استعمال نہیں ہوا۔

اِذَا: البقرۃ آیت 11 دیکھیں۔ اَظْلَمَ (ظ ل م): البقرۃ آیت 17 دیکھیں۔ قَامُوْا (ق و م): الفاتحہ آیت 5 دیکھیں۔

لَوْ کئی طرح استعمال ہوتا ہے۔

(i) بطور حرف شرط۔ ماضی کے دو جملوں پر آتا ہے۔ پہلا جملہ شرط اور دوسرا جزا ہوتا ہے۔ جس طرح اِنْ مستقبل کے لیے آتا ہے اسی طرح لَوْ ماضی میں ایک غیر تکمیل شدہ شرط کے اظہار کے لیے آتا ہے۔ اِنْ کے ترجمے میں کہا جائے گا اگر ایسا ہو گا یا نہ ہو گا تو ایسا ہو گا یا نہ ہو گا۔ لَوْ کے ترجمے میں کہا جائے گا اگر ایسا ہو گیا ہوتا یا نہ ہوا ہوتا تو ایسا ہو جاتا یا نہ ہو جاتا۔ لَوْ کے جواب پر اکثر لام استعمال ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا ﴿لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا﴾ (الواقعہ:65) یا آیت زیر

مطالعہ میں فرمایا﴿ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ ﴾۔اور کبھی نہیں بھی آتا۔ جیسے فرمایا:﴿ لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا ﴾ (الواقعہ:70)۔اگر جملہ منفی ہوتب بھی لام نہیں آتا جیسے فرمایا:﴿ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ ﴾(الانعام:112)۔

(ii) لَوْ پر واوٴ بڑھا کر وَلَوْ پڑھیں تو مطلب ہوتا ہے ''اگرچہ'' اور اس کے بعد ہمیشہ فعل ماضی آتا ہے۔﴿ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ﴾(التوبۃ:33)''اگرچہ مشرک ناگوار سمجھیں۔''﴿ وَ لَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ ۚ ﴾(المائدۃ:100)''اگرچہ (اے مخاطب) تم کو ناپاک کی کثرت اچھی معلوم ہو۔'' وَلَوْ کے بعد جوابی جملہ نہیں آتا بلکہ ایک جملہ پہلے ہی آجاتا ہے۔

(iii) لَوْ کبھی اَنْ مصدریہ کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے لیکن فعل مضارع کو نصب نہیں دیتا۔ایسا اکثر اس وقت ہوتا ہے جب لَوْ، وَدَّ یَوَدُّ کے بعد آتا ہے۔ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ آپ ﷺ کے ڈھیلے پڑ جانے کو وہ دل سے چاہتے ہیں۔ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ہزار برس زندہ رہنے کو ان میں سے ہر ایک دل سے چاہتا ہے۔ وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ''ایمان کے بعد تمہارے کافر بنا دینے کے خواہش مند بکثرت اہل کتاب ہیں۔''

(iv) لَوْ کبھی کاش کے معنی بھی دیتا ہے۔جس سے جملہ میں ماضی تمنی کے معنی پیدا ہوجاتے ہیں۔اس کی پہچان یہ ہے کہ ایسی صورت میں جملے میں جواب شرط نہیں آتا۔جیسے لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ''کاش وہ لوگ جانتے ہوتے۔'' فَلَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً ''کاش ایک بار اور ہم کو دنیا میں جانا مل جاتا۔'' (لَوْ کے اور استعمالات بھی ہیں جو لغات القرآن، ج ۵ ص ۲۳۲ اور مصباح الغات ص ۷۹۵ سے دیکھے جاسکتے ہیں)۔

ش ی ء

(ف) شَيْئًا، مَشِيْئَةً چاہنا۔خواہش کرنا۔﴿ مَا شَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ۚ ﴾(18/الکہف:39)''جو چاہا اللہ نے، کوئی قوت ہے ہی نہیں مگر اللہ سے۔''

شَیْءٌ ج: اَشْيَآءُ۔اسم ذات ہے۔اللہ کی مشیئت کا ظہور یا وجود۔ہر وہ چیز جو جانی پہچانی جائے اور جس کی خبر دی جاسکے۔﴿ وَ هُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۠ ﴾ (2/البقرہ:29)''اور وہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔''﴿ لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ۚ ﴾(5/المائدہ:101)''تم لوگ مت پوچھو چیزوں کے بارے میں اگر وہ ظاہر کی جائیں تو تم کو بُری لگیں۔''

مَشِيْئَةٌ اسم ذات ہے۔خواہش۔چاہت۔قرآن مجید میں استعمال نہیں ہوا۔

اَللّٰهُ (ء ل ہ): آیت بسم اللہ دیکھیں۔ ذَهَبَ (ذ ھ ب): البقرۃ آیت 17 دیکھیں۔ سَمْعٌ (س م ع): البقرۃ آیت 7 دیکھیں۔

ق د ر

(ن-ض-س) (۱) قَدَرًا کسی چیز کا اندازہ کرنا، اس کی دیکھ بھال کرنا اور اسکی تدبیر کرنا۔اندازہ لگانا۔﴿ اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ۙ فَجَعَلْنٰهُ فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۙ اِلٰى قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ۙ فَقَدَرْنَا ۖ فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ ﴾(77/المرسلٰت:20-23)''کیا ہم نے پیدا نہیں کیا تم کو ایک بے وقعت پانی سے پھر ہم نے رکھا اس کو ایک محفوظ ٹھکانے میں ایک معلوم اندازے تک، پھر ہم نے اندازہ کیا تو ہم کیا ہی اچھا اندازہ کرنے والے ہیں۔'' جب یہ لفظ رزق کے متعلق استعمال ہو تو اس کے معنی رزق کی تنگی کے ہوتے ہیں اور اس کی ضد بسط آتی ہے۔مثلاً ﴿ اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يَقْدِرُ ۭ ﴾ (13/الرعد:26)''اللہ کشادہ کرتا ہے رزق کو جس کے لئے وہ چاہتا ہے اور اندازہ لگاتا ہے یعنی جس کو چاہتا ہے ناپ تول کر دیتا ہے۔'' عَلٰی کے صلے کے ساتھ بھی ''تنگ کرنا'' کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔پھر یہ تنگی یا تو رزق کی ہوسکتی ہے جیسے

فرمایا: ﴿ وَ مَنۡ قُدِرَ عَلَیۡہِ رِزۡقُہٗ ﴾ (65/الطلاق:7) ''اور جس پر اس کے رزق کی تنگی کی گئی ہو۔'' یا حالات کی جیسے فرمایا: ﴿ وَذَا النُّوۡنِ اِذۡ ذَّہَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنۡ لَّنۡ نَّقۡدِرَ عَلَیۡہِ ﴾ (21/الانبیاء:87) ''اور مچھلی والے پیغمبر کا بھی ذکر کیجئے جب کہ وہ خفا ہو کر چلے گئے اور یہ سمجھے کہ ہم اُن پر تنگی نہ کریں گے۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔ آگے حاشیے میں حضرتؒ فرماتے ہیں: ''قدر بمعنی استطاعت وقابو نہیں، ضیق وتنگی کے مفہوم میں ہے۔''

(۲) قُدۡرَۃً قابو یافتہ ہونا۔ قدرت رکھنا۔ طاقت رکھنا۔ ﴿ وَ ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا رَّجُلَیۡنِ اَحَدُہُمَاۤ اَبۡکَمُ لَا یَقۡدِرُ عَلٰی شَیۡءٍ ﴾ (16/النحل:76) ''اللہ ایک مثال دیتا ہے دو آدمیوں کی، ان میں کا ایک گونگا ہے وہ قدرت نہیں رکھتا کسی چیز پر۔'' علیٰ کے صلے کے ساتھ اس مصدر سے صیغہ استعمال ہو تو معنی ہوتے ہیں کسی کو قابو کرنا، کسی کو پکڑنا۔ ﴿ وَذَا النُّوۡنِ اِذۡ ذَّہَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنۡ لَّنۡ نَّقۡدِرَ عَلَیۡہِ ﴾ (21/الانبیاء:87) بعض بزرگوں نے اس آیت میں نَقۡدِرَ عَلَیۡہِ کا ترجمہ ''قابو کرنا، پکڑنا سے بھی کیا ہے مثلاً: ''اور مچھلی والے کو جب چلا گیا غصہ ہو کر پھر سمجھا کہ ہم نہ پکڑ سکیں گے اُس کو۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)۔ ''مچھلی والے حضرت یونسؑ کو یاد کرو جب کہ وہ غصے سے چل دیا اور خیال کیا کہ ہم اُسے نہ پکڑ سکیں گے۔'' (ترجمہ احسن البیان)

(۳) قَدۡرًا کسی کی عظمت کا ادراک کرنا۔ تعظیم کرنا۔ کسی کی عظمت کو پہچاننا۔ ﴿ وَمَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدۡرِہٖۤ ﴾ (6/الانعام:91) ''اور ان لوگوں نے تعظیم نہیں کی اللہ کی جیسا کہ اس کی تعظیم کا حق ہے۔''

قَدَرٌ اسم ذات ہے۔ (i) اندازہ۔ ﴿ وَالَّذِیۡ نَزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ ۚ ﴾ (43/الزخرف:11) ''اور جس نے نازل کیا آسمان سے پانی ایک اندازے سے۔'' ﴿ اِلٰی قَدَرٍ مَّعۡلُوۡمٍ ﴿۲۲﴾ ﴾ (77/المرسلات:22) ''ایک معلوم اندازے تک۔''

(ii) وہ قوانین فطرت جن کے تحت کوئی چیز وجود میں آتی اور ترتیب پاتی ہے اور یہ صفت اللہ تعالیٰ سے خاص ہے اور صرف اچھے معنوں میں استعمال ہوتی ہے۔ ﴿ اِنَّا کُلَّ شَیۡءٍ خَلَقۡنٰہُ بِقَدَرٍ ﴿۴۹﴾ ﴾ (54/القمر:49) ''ہم نے ہر چیز اندازہ مقررہ کے ساتھ پیدا کی ہے۔''

(iii) اصطلاح شرح میں لفظ قَدَرٌ بمعنی تقدیر الٰہی بھی استعمال ہوتا ہے۔ (معارف)۔

قَدۡرٌ اسم ذات ہے۔ (i) کسی چیز کی عظمت۔ ﴿ اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰہُ فِیۡ لَیۡلَۃِ الۡقَدۡرِ ۚ﴿۱﴾ ﴾ (97/القدر:1) ''اور ہم نے اتارا اس کو عظمت والی رات میں۔''

(ii) قدر و قیمت، اندازہ۔ ﴿ قَدۡ جَعَلَ اللّٰہُ لِکُلِّ شَیۡءٍ قَدۡرًا ﴿۳﴾ ﴾ (65/الطلاق:3) ''اللہ نے رکھا ہے ہر چیز کا اندازہ۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ) ''اللہ نے ہر شے کا ایک اندازہ مقرر کر رکھا ہے۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)

(iii) قَدۡرٌ کے دوسرے معنی تقدیر و حکم کے بھی آتے ہیں۔ (معارف)۔

قَادِرٌ ج: قَادِرُوۡنَ۔ فَاعِلٌ کے وزن پر اسم الفاعل ہے۔ قدرت رکھنے والا۔ اندازہ کرنے والا۔ قابو پانے والا۔ طاقت رکھنے والا۔ ﴿ اَلَیۡسَ ذٰلِکَ بِقٰدِرٍ عَلٰۤی اَنۡ یُّحۡیِۦَ الۡمَوۡتٰی ﴿۴۰﴾ ﴾ (75/القیامۃ:40) ''کیا وہ قدرت رکھنے والا نہیں ہے اس پر کہ وہ زندہ کرے مردہ کو'' صرف اللہ تعالیٰ کی ذات مبارک ایسی ہے کہ جو مکمل طور پر قدرت رکھنے والی ہے۔ اس لیے کسی انسان کو مطلقاً ھُوَ قَادِرٌ کہنا درست نہیں۔ البتہ یوں کہا جا سکتا ہے ھُوَ قَادِرٌ عَلٰی کَذَا یعنی وہ اس چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔

مَقۡدُوۡرٌ اسم المفعول ہے۔ مقرر کردہ۔ وہ جو ٹھہرایا جا چکا۔ ﴿ وَ کَانَ اَمۡرُ اللّٰہِ قَدَرًا مَّقۡدُوۡرَا ﴿۳۸﴾ ﴾ (33/الاحزاب:38) ''اور اللہ تعالیٰ کے کام اندازے پر مقرر کیے ہوئے ہیں۔''

قَدِیْرٌ فَعِیْلٌ کے وزن پر صیغۂ مبالغہ ہے۔اسم الفاعل کے معنی میں۔ ہر وقت قدرت رکھنے والا۔﴿ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُ ﴾ (22/الحج:39)''بیشک اللہ ان کی مدد پر ہر وقت قدرت رکھنے والا ہے۔'' قدیر اُس کو کہتے ہیں جو حکمت کے مطابق جو کچھ چاہے کرے اسی لیے اللہ کے سوا کسی مخلوق کو قدیر نہیں کہہ سکتے۔قرآن مجید یا حدیث میں کسی جگہ انسان، فرشتے، جن یا کسی مخلوق کو قدیر نہیں کہا گیا۔(واللہ اعلم)

قِدْرٌ ج: قُدُوْرٌ۔ ہانڈیاں۔دیگیں۔﴿ وَقُدُوْرٍ رّٰسِیٰتٍ ﴾(34/سبا:13)''اور چولھوں پر جمی ہوئی مضبوط دیگیں۔''

مِقْدَارٌ مِفْعَالٌ کے وزن پر اسم الآلہ ہے۔اندازہ کرنے کا پیمانہ۔مقدار۔﴿ ثُمَّ یَعْرُجُ اِلَیْهِ فِیْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ﴾(32/السجدہ:5)''پھر وہ چڑھ جاتا ہے اس کی طرف ایک ایسے دن میں، جس کی مقدار ایک ہزار سال ہے جس سے تم لوگ گنتی کرتے ہو۔''

(تفعیل) **تَقْدِیْرًا** کسی کو اندازہ یا قدر و قیمت یا قدرت دینا۔تجویز کرنا۔کسی چیز کو خاص اندازے پر بنانا۔مقرر کرنا۔حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں:''تقدیر کے معنی کسی چیز کو زمانہ یا مکان یا صفات کے اعتبار سے ایک مخصوص مقدار اور پیمانہ پر رکھنے کے ہیں۔رات اور دن کے اوقات کو ایک خاص پیمانہ پر رکھنے کے لیے قرآن کریم نے فرمایا وَاللّٰهُ یُقَدِّرُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ، مکانی فاصلے اور مسافت کو ایک خاص پیمانہ پر رکھنے کے لیے دوسری جگہ ملک شام اور سبا کی درمیانی بستیوں کے متعلق فرمایا وَقَدَّرْنَا فِیْهَا السَّیْرَ اور عام مقادیر کے متعلق فرمایا وَخَلَقَ کُلَّ شَیْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِیْرًا۔(معارف القرآن، ج۴،ص ۵۰۵)۔﴿ الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی ۝ وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی ﴾(87/الاعلیٰ:2-3)''جس نے پیدا کیا اور نوک پلک درست کی اور جس نے اندازہ کیا پھر ہدایت دی۔''﴿ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰی عَادَ کَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِیْمِ ﴾(36/یٰس:39)''اور چاند، ہم نے مقرر کیں اس کی منزلیں یہاں تک کہ وہ ہو گیا پرانے کھجور کی ٹہنی کی مانند۔''

تَقْدِیْرٌ یہ مصدر بطور اسم ذات بھی استعمال ہوتا ہے۔طے شدہ بات۔تقدیر۔اندازہ۔(Decree)۔﴿ وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ﴾(36/یٰس:38)''اور سورج وہ تیرتا ہے اپنے مدار پر۔یہ علم والے بالا دست کا طے شدہ امر ہے۔''

(افتعال) **اِقْتِدَارًا** اہتمام سے قابو حاصل کرنا۔

مُقْتَدِرٌ ج: مُقْتَدِرُوْنَ۔اسم الفاعل ہے۔ قابو پانے والا۔ قابو یافتہ۔﴿ وَکَانَ اللّٰهُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ مُّقْتَدِرًا ﴾(18/الکہف:45)''اور اللہ ہر چیز پر پوری طرح قابو یافتہ ہے۔''﴿ فَاِنَّا عَلَیْهِمْ مُّقْتَدِرُوْنَ ﴾(43/الزخرف:42)''سو ہم اُن پر بھی قدرت رکھتے ہیں۔''

ترکیب یَکَادُ فعل مقاربہ ہے۔اَلْبَرْقُ فاعل ہے۔اور یَخْطَفُ اصل فعل ہے۔اس میں شامل ضمیر 'ھُوَ' اس کا فاعل ہے جو کہ اَلْبَرْقُ کے لیے ہے۔اَبْصَارَهُمْ مفعول ہے فعل مضارع اپنے فاعل اور مفعول کے ساتھ مل کر جملہ فعلیہ ہو کر خبر ہے یَکَادُ کی اور یَکَادُ اپنے اسم اور خبر کے ساتھ مل کر جملہ فعلیہ ہوا۔کُلَّمَا بھی اِذَا کی طرح حرف شرط ہے۔اَضَاءَ لَهُمْ اس کی شرط اور مَشَوْا فِیْهِ جواب شرط ہے۔اسی طرح اِذَا کی شرط اَظْلَمَ عَلَیْهِمْ ہے اور قَامُوْا جواب شرط ہے۔لَوْ شَاءَ اللّٰهُ میں لو تمنی نہیں بلکہ شرطیہ ہے۔لَذَهَبَ جواب شرط ہے۔لَذَهَبَ کا صلہ بِ، سَمْعِهِمْ پر ظاہر ہے اور اَبْصَارِهِمْ میں محذوف ہے۔اسی لیے اَبْصَارِ حالت جر میں آیا ہے۔اِنَّ حرف مشبہ بالفعل ہے اور لفظ اَللّٰهَ اس کا اسم، عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ متعلق خبر اور قَدِیْرٌ خبر ہے۔عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ کو خبر سے مقدم کرنے کی وجہ سے حصر کا مفہوم پیدا ہوا ہے۔اَضَاءَ۔مَشَوْا۔اَظْلَمَ اور قَامُوْا ماضی کے صیغے ہیں لیکن کُلَّمَا اور اِذَا کی وجہ سے ان کا ترجمہ حال میں ہوگا۔

ترجمہ
البقرۃ:20

یَکَادُ	الْبَرْقُ	یَخْطَفُ	اَبْصَارَھُمْ ؕ	کُلَّمَآ	اَضَآءَ لَھُمْ
قریب ہے کہ	بجلی	اچک لے	ان کی بصارت کو	جب کبھی	چمکتی ہے اُن کے لیے

مَّشَوْا فِیْهِ ۙ	وَ اِذَآ	اَظْلَمَ عَلَیْهِمْ	قَامُوْا ؕ
وہ لوگ چلتے ہیں اس میں	اور جب کبھی	اندھیرا چھا جاتا ہے ان پر	وہ لوگ کھڑے رہتے ہیں

وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ	لَذَهَبَ	بِسَمْعِهِمْ	وَ اَبْصَارِهِمْ ؕ
اور اگر اللہ چاہتا	تو لے جاتا	ان کی سماعت	اور ان کی بصارت

اِنَّ اللّٰهَ	عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ	قَدِیْرٌ ۠ ﴿۲۰﴾
بیشک اللہ	ہر چیز پر	قدرت رکھنے والا ہے

نوٹ آیت نمبر۔17 اور 18 میں دی گئی پہلی مثال میں ہے کہ اللہ ان کے باطنی نور کو لے گیا۔اس سے معلوم ہوا کہ یہ مثال کافروں، یہودیوں اور منافقین میں سے اُن لوگوں کی ہے جنہوں نے اپنے ضعفِ ایمان کے مرض کا علاج نہیں کیا اور آخر کار کفر و نفاق میں مبتلاء ہو گئے۔اب وہ ایسے مقام پر ہیں جہاں سے واپسی ممکن نہیں ہے۔

جبکہ آیت نمبر۔19 اور 20 میں دی گئی دوسری مثال میں ہے کہ اگر اللہ چاہتا تو ان کی سماعت اور بصارت کو لے جاتا یعنی ان کی صلاحیتیں ابھی باقی ہیں۔اس سے معلوم ہوا کہ یہ مثال منافقوں میں سے ایسے لوگوں کی ہے جن کی مہلت ابھی باقی ہے اور ان کا مرض ابھی لاعلاج نہیں ہوا ہے۔جو چاہے اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر علاج کر لے۔(واللہ اعلم)

آیت:21

﴿ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۙ﴿۲۱﴾ ﴾

اَلنَّاسُ: البقرۃ آیت 8 دیکھیں۔ اُعْبُدُوْا (ع ب د): الفاتحہ آیت 4 دیکھیں۔ رَبٌّ (ر ب ب): الفاتحہ آیت 1 دیکھیں۔

خ ل ق

(ن) **خَلْقًا و خَلْقَةً** خلق کا لفظ کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔مثلاً

(i) کسی چیز کو بنانے کے لیے اس کا اندازہ لگانا، منصوبہ بنانا یا خاکہ تیار کرنا۔اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی انجینئر ایک عمارت بنانے سے پہلے یہ ارادہ کرتا ہے کہ اسے ایسی اور ایسی عمارت فلاں خاص مقصد کے لیے بنانی ہے اور اپنے ذہن میں اس کا نقشہ سوچتا ہے کہ اس مقصد کے لیے زیر تجویز عمارت کی تفصیلی صورت اور مجموعی شکل یہ ہونی چاہیے۔

(ii) خلق کا عام مفہوم یہ ہے کہ ایک چیز سے دوسری چیز بنائی جائے۔پہلے مادہ موجود ہو تو اس سے کوئی دوسری چیز ایجاد کی جائے۔جیسے ارشاد باری ہے: ﴿ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا ﴾ (4/النساء:1) ''لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اُسی جان سے اس کا جوڑا بنایا۔'' اس صورت میں اس کی نسبت غیر اللہ کی طرف بھی ہو سکتی ہے۔جیسے حضرت عیسیٰؑ سے اللہ تعالیٰ فرمائیں گے:

﴿وَ اِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ﴾ (5/المائدۃ:110) ''اور جب تو بناتا تھا گارے سے پرندے کی صورت۔''

(iii) کبھی خلق، اِبْدَاع کے معنی میں بھی آتا ہے۔قرآن کریم میں جیسے خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ آتا ہے، ایسے ہی بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بھی آتا ہے۔اس صورت میں اس کی نسبت غیر اللہ کی طرف نہیں ہوسکتی۔(ابداع یعنی مادہ اور سابقہ مثال کے بغیر بنانا)۔

(iv) عام لوگوں کے لیے خلق کا لفظ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔(ا) کسی چیز کو بنانے کے لیے اندازہ کرنا۔(ب) جھوٹ بولنا یا جھوٹ گھڑنا۔مثلاً﴿ اِنَّمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا وَّ تَخْلُقُوْنَ اِفْكًا ﴾(29/العنکبوت:17) ''تم تو پوجتے ہو اللہ کے سوائے یہی بتوں کے تھان اور بناتے ہو جھوٹی باتیں۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)

خَلْقٌ یہ لفظ مصدر کے علاوہ (1) اسم ذات بھی ہے بمعنی پیدائش۔﴿ وَ يَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾(3/آل عمران:191) ''اور وہ لوگ غور و فکر کرتے ہیں آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں۔''

(2) مخلوق کے معنی میں بھی آتا ہے۔﴿ هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ ﴾(31/لقمان:11) ''یہ اللہ کی مخلوق ہے۔''

(3) اور ہر وہ مقام جہاں خلق کا لفظ کلام کے متعلق استعمال ہوا ہے اس سے جھوٹ ہی مراد ہے۔اس بنا پر اکثر لوگ قرآن کے متعلق خلق کا لفظ استعمال نہیں کیا کرتے تھے۔(مفردات)

خَالِقٌ اسم الفاعل ہے۔ پیدا کرنے والا۔اندازہ کرنے والا۔منصوبہ بنانے والا۔﴿ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ﴾ (13/الرعد:16) ''آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہہ دیجئے کہ اللہ ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے۔''

خَلَّاقٌ فَعَّالٌ کے وزن پر اسم المبالغہ ہے۔بہت زیادہ پیدا کرنے والا۔﴿ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ﴾(15/الحجر:86) ''بیشک تیرا رب ہی سب کچھ پیدا کرنے والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔''

(س) **خَلِقًا** چکنا ہونا۔نرم ہونا۔قرآن مجید میں فعل استعمال نہیں ہوا۔

(ک) **خُلُوْقَةً** اچھے اخلاق والا ہونا۔قرآن مجید میں فعل استعمال نہیں ہوا

خُلُقٌ ج: اَخْلَاقٌ۔ عادت، خصلت، اخلاقی خوبیاں۔﴿ اِنْ هٰذَآ اِلَّا خُلُقُ الْاَوَّلِيْنَ ﴾(26/الشعراء:137) ''اور کچھ نہیں یہ باتیں عادت ہے اگلے لوگوں کی۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)۔﴿ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ﴾(68/القلم:4) ''اور بے شک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اخلاق کے اعلیٰ مرتبے پر ہیں۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔اس آیت میں خُلُقٌ کی وضاحت کرتے ہوئے پیر کرم شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں: ''پہلے یہ سمجھیے کہ خُلق کس کو کہتے ہیں۔امام فخر الدین رازیؒ اس کی تشریح کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔اَلْخُلُقُ مَلَكَةٌ نَفْسَانِيَّةٌ يَسْهَلُ عَلَى الْمُتَّصِفِ بِهَا الْاِتْيَانُ بِالْاَفْعَالِ الْجَمِيْلَةِ۔یعنی خلق، نفس کے اس ملکہ اور استعداد کو کہتے ہیں جس میں وہ پایا جائے، اس کے لیے افعال جمیلہ اور خصال حمیدہ پر عمل پیرا ہونا آسان اور سہل ہوجائے۔(کبیر)۔پھر فرماتے ہیں کسی اچھے اور خوبصورت فعل کا کرنا الگ چیز ہے، لیکن اس کو سہولت اور آسانی سے کرنا الگ چیز ہے۔کوئی کام خُلق اسی وقت کہلائے گا جب اس کے کرنے میں تکلف سے کام لینے کی نوبت نہ آئے (کبیر)۔یعنی جس طرح آنکھ بے تکلف دیکھتی ہے کان بے تکلف سنتے ہیں، زبان بے تکلف بولتی ہے اسی طرح سخاوت، شجاعت، حیا، حق گوئی، تقویٰ وغیرہ تجھ سے کسی تردّد اور توقّف کے بغیر صدور پذیر ہونے لگیں تو اس وقت ان امور کو تیرے اخلاق شمار کیا جائے گا۔'' (ضیاء القرآن، ج۵، ص۳۳۱)

خَلَاقٌ اسم ذات ہے۔بھلائی کا حصہ۔وہ فضیلت جو انسان اپنے اخلاق سے حاصل کرتا ہے۔﴿ اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ ﴾(3/آل عمران:77) ''وہ لوگ ہیں جن کے لئے بھلائی کا کوئی حصہ نہیں ہے آخرت میں۔''

(تفعیل) تَخْلِیْقًا شکل وصورت بنانا۔ کسی صورت کے ابتدائی نقش ونگار بنانا۔

مُخَلَّقَۃٌ اسم المفعول ہے۔ واحد مؤنث کا صیغہ۔ جس کی شکل بنائی گئی۔ شکل دیا ہوا۔ ﴿فَاِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَۃٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَۃٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَۃٍ مُّخَلَّقَۃٍ وَّ غَیْرِ مُخَلَّقَۃٍ﴾ (22/الحج:5) ''تو تمہیں معلوم ہو کہ ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا ہے، پھر نطفے سے، پھر خون کے لوتھڑے سے، پھر گوشت کی بوٹی سے جو شکل والی بھی ہوتی ہے اور بے شکل بھی۔'' (ترجمہ تفہیم القرآن)

(افتعال) اِخْتِلَاقًا جھوٹ گھڑنا۔ ﴿اِنْ ھٰذَآ اِلَّا اخْتِلَاقٌ ﴾ (38/ص:7) ''نہیں ہے یہ مگر جھوٹ گھڑنا۔''

قَبْلُ: البقرۃ آیت 4 دیکھیں۔

لَعَلَّ حرف مشبہ بالفعل ہے۔ ''شاید کہ''۔ عربی زبان میں لَعَلَّ وہاں استعمال ہوتا ہے جہاں کسی چیز کے حاصل ہونے کی توقع اور امید ہو لیکن یقین نہ ہو یا اس جگہ استعمال ہوتا ہے جہاں کسی چیز کا اندیشہ ظاہر کرنا ہو۔ اللہ تعالیٰ کے لیے جب یہ کلمہ استعمال ہو تو تعجب ہوتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ تو ہمیشہ سے ہر چیز کا جاننے والا ہے۔ لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ بندوں سے بندوں کے محاورے میں کلام کرتا ہے اور جس موقع پر بندے اس کلمہ کو استعمال کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ بھی اس موقع پر استعمال کرتا ہے۔ البتہ بندوں اور اللہ تعالیٰ کے استعمال میں فرق یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کے لیے یہ کلمہ استعمال ہو تو معنی میں قطعیت آجاتی ہے اور شک کی جگہ یقین کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید میں جہاں لَعَلَّ کے ساتھ کُمْ یا ھُمْ کی ضمیر لگا کر فعل مضارع آیا ہے، مثلاً تَتَّقُوْنَ۔ تَھْتَدُوْنَ۔ تَشْکُرُوْنَ وغیرہ۔ وہاں اس کا اصل مفہوم یہ ہوتا ہے کہ یہ کام کرنے کا ایک موقع فراہم کیا گیا ہے، اب جس کا جی چاہے فائدہ اٹھائے یا نہ اٹھائے۔ اردو محاورہ میں یہ مفہوم لفظ ''تاکہ'' سے صحیح طور پر ادا ہوتا ہے۔ حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ فرماتے ہیں: ''لَعَلَّ ہے تو اظہار شک اور امید وآرزو کے لیے۔ لیکن قرآن مجید میں جہاں حق تعالیٰ کی طرف سے ادا ہوا ہے، تو کسی فعل کی آرزو کی جگہ اس کے وقوع کا اور شک واحتمال کی جگہ یقین کا مفہوم پیدا ہو گیا ہے۔ اور اُردو ترجمہ ''تاکہ'' سے بھی جائز ہو گیا ہے۔'' (تفسیر ماجدیؒ ص ۱۳)

تَتَّقُوْنَ (و ق ی): البقرۃ آیت 2 دیکھیں۔

ترکیب یَا۔ حرف ندا ہے۔ اَیُّھَا النَّاسُ منادیٰ ہے۔ اَلنَّاسُ چونکہ معرف باللام ہے اور مذکر ہے اس لیے اس سے پہلے اَیُّھَا کا اضافہ ہوا ہے۔ اُعْبُدُوْا۔ فعل امر ہے۔ اس میں شامل اَنْتُمْ کی ضمیر اس کا فاعل ہے۔ رَبَّکُمْ مفعول ہے۔ اَلَّذِیْ اسم موصول ہے اور اگلہ جملہ خَلَقَکُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ اس کا صلہ ہے۔ اس میں اَلَّذِیْنَ عطف ہے خَلَقَکُمْ میں کُمْ ضمیر پر یعنی جس نے تمہیں پیدا کیا اور ان کو پیدا کیا جو تم سے پہلے تھے۔ موصول اور صلہ مل کر صفت ہے رَبَّکُمْ میں رَبَّ کی۔ لَعَلَّ حرف مشبہ بالفعل ہے کُمْ اس کا اسم ہے اور جملہ فعلیہ تَتَّقُوْنَ اس کی خبر ہے۔ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ کا ترجمہ عام طور پر ہمارے بزرگوں نے تَتَّقُوْنَ کے لفظ کا اصطلاحی مفہوم لے کر کیا ہے یعنی ''تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ''۔ البتہ کچھ بزرگوں نے اس کے لفظی مفہوم 'بچنا، محفوظ رہنا' سے بھی ترجمہ کیا ہے۔ مثلاً حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں: ''اے لوگو! عبادت اختیار کرو اپنے پروردگار کی جس نے تم کو پیدا کیا اور ان لوگوں کو بھی جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں عجب نہیں کہ تم دوزخ سے بچ جاؤ (شاہی محاورہ میں 'عجب نہیں' کا لفظ وعدہ کے موقع پر بولا جاتا ہے۔) اور صاحبؒ تدبر قرآن ترجمہ کرتے ہیں: ''اے لوگو! بندگی کرو اپنے اس خداوند کی جس نے تم کو بھی پیدا کیا اور ان کو بھی جو تم سے پہلے گزرے ہیں، تاکہ دوزخ کی آگ سے محفوظ رہو۔''

ترجمہ
البقرۃ:21

خَلَقَکُمْ	الَّذِیْ	رَبَّکُمْ	اعْبُدُوْا	یٰۤاَیُّھَا النَّاسُ
پیدا کیا تم لوگوں کو	جس نے	اپنے اُس رب کی	تم لوگ بندگی کرو	اے لوگو

تَتَّقُوْنَ	لَعَلَّکُمْ	مِنْ قَبْلِکُمْ	وَالَّذِیْنَ
پرہیزگار بن جاؤ	تاکہ تم لوگ	تم سے پہلے تھے	اور ان لوگوں کو بھی جو

آیت:22

﴿الَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمُ الۡاَرۡضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً ۪ وَّ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخۡرَجَ بِہٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزۡقًا لَّکُمۡ ۚ فَلَا تَجۡعَلُوۡا لِلّٰہِ اَنۡدَادًا وَّ اَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۲﴾﴾

جَعَلَ (ج ع ل): البقرۃ آیت 19 دیکھیں۔ اَلۡاَرۡضُ (ء ر ض): البقرۃ آیت 11 دیکھیں۔

ف ر ش

(ن۔ض) **فَرۡشًا و فِرَاشًا** کسی چیز کو بچھانا۔ کشادہ کرنا۔﴿وَالۡاَرۡضَ فَرَشۡنٰھَا فَنِعۡمَ الۡمٰھِدُوۡنَ ﴿۴۸﴾﴾(51/الذٰریات:48)''اور زمین، ہم نے بچھایا اس کو، تو ہم کیا ہی اچھا بچھانے والے ہیں۔''

فِرَاشٌ ج: فُرُشٌ۔ فِعَالٌ کے وزن پر اسم المفعول ہے۔ بچھائی ہوئی چیز۔ بچھونا۔ بستر۔﴿مُتَّکِـِٕیۡنَ عَلٰی فُرُشٍۭ بَطَآئِنُھَا مِنۡ اِسۡتَبۡرَقٍ ؕ﴾(55/الرحمٰن:54)''تکیہ لگانے والے بچھونوں پر، ان کا استر (یعنی اندر کا کپڑا) ہے موٹے ریشم کا۔''

فَرۡشٌ مصدر کے علاوہ اسم ذات بھی ہے۔ بچھونا۔ چوپایوں کے چھوٹے بچے جو زمین سے لگے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور جن پر بوجھ نہیں لادا جاتا۔﴿وَمِنَ الۡاَنۡعَامِ حَمُوۡلَۃً وَّ فَرۡشًا ؕ﴾(6/الانعام:142)''اور چوپایوں میں سے کچھ بوجھ اٹھانے والے اور کچھ زمین سے لگے ہوئے جانور۔''

فَرَاشَۃٌ ج: فَرَاشٌ۔ اسم ذات ہے۔ پروانہ۔ پتنگا۔﴿یَوۡمَ یَکُوۡنُ النَّاسُ کَالۡفَرَاشِ الۡمَبۡثُوۡثِ ۙ﴿۴﴾﴾(101/القارعۃ:4)''جس دن لوگ ہو جائیں گے پھیلائے ہوئے پتنگوں کی مانند۔''

اَلسَّمَآءُ (س م و): آیت بسم اللہ دیکھیں۔

ب ن ی

(ض) **بِنَاءً، بَنۡیًا** بنانا۔ تعمیر کرنا۔﴿وَالسَّمَآءَ بَنَیۡنٰھَا بِاَیۡىدٍ﴾(51/الذٰریات:47)''اور آسمان، ہم نے بنایا اس کو ہاتھوں سے۔''

اِبۡنِ فعل امر ہے۔ تو بنا۔ تو تعمیر کر۔﴿اِذۡ قَالَتۡ رَبِّ ابۡنِ لِیۡ عِنۡدَکَ بَیۡتًا فِی الۡجَنَّۃِ﴾(66/التحریم:11)''اور جب اس نے کہا اے میرے رب! تو بنا میرے لئے اپنے پاس ایک گھر جنت میں۔''

بِنَاءٌ فِعَالٌ کے وزن پر اسم المفعول ہے۔ جو چیز بنائی جائے۔ پھر یہ لفظ عمارت، چھت یا بلندی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ آیت زیر مطالعہ۔ اصل میں بِنَایٌ تھا۔ قاعدہ یہ ہے کہ کسی اسم کے حرف علت (و یا ی) کے ماقبل اگر الف زائدہ ہو تو اس و یا ی کو 'ء' سے بدل دیتے ہیں۔ اس لیے بِنَایٌ، بِنَاءٌ ہو گیا۔

مَبۡنِیَّۃٌ اسم المفعول ہے۔ واحد مونث۔ ناقص یائی کا اسم المفعول ''مَفۡعِیٌّ'' کے وزن پر آتا ہے۔ اور اس کی مؤنث کا وزن ہے مَفۡعِیَّۃٌ۔ اسی پر مَبۡنِیَّۃٌ ہے۔ مطلب ہے بنائی ہوئی، تیار کی ہوئی۔﴿لٰکِنِ الَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا رَبَّھُمۡ لَھُمۡ غُرَفٌ مِّنۡ فَوۡقِھَا غُرَفٌ مَّبۡنِیَّۃٌ ۙ﴾(39/الزمر:20)''البتہ جو لوگ اپنے پروردگار سے ڈرتے رہتے ہیں اُن کے لیے بالاخانے ہیں جن کے اوپر بنے بنائے (تیار) بالاخانے ہیں۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)

بُنْيَانٌ فُعْلَانٌ کا وزن ہے۔ بہت زیادہ بنا ہوا۔ عمارت۔ ﴿ فَقَالُوا ابْنُوْا عَلَيْهِمْ بُنْيَانًا ﴾ (18/الکہف:21) ''تو ان لوگوں نے کہا تم لوگ تعمیر کرو ان پر ایک عمارت۔'' ﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ﴾ (61/الصف:4) ''بے شک اللہ تعالیٰ اُن لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اُس کی راہ میں صف بستہ جہاد کرتے ہیں گویا وہ سیسہ پلائی ہوئی عمارت ہیں۔'' (ترجمہ احسن البیان)

بَنَّاءٌ فَعَّالٌ کے وزن پر اسم المبالغہ ہے۔ بہت زیادہ تعمیر کرنے والا۔ معمار۔ ﴿ وَ الشَّيٰطِيْنَ كُلَّ بَنَّآءٍ وَّ غَوَّاصٍ ﴾ (38/ص:37) ''اور شیاطین جو سب معمار اور غوطہ لگانے والے تھے۔'' یہ بھی اصل میں بَنَّايٌ تھا۔ 'ی' سے پہلے الف زائدہ ہونے کی وجہ سے 'ی'، 'ء' میں تبدیل ہوگئی۔

اَنْزَلَ (ن ز ل): البقرۃ آیت 4 دیکھیں۔

م و ہ

(ن) **مَوْهًا** پانی پلانا۔ دو چیزوں کو ملانا۔ قرآن مجید میں استعمال نہیں ہوا۔

مَاءٌ اسم ذات ہے۔ پانی۔ (یہ در اصل مَوَهٌ ہے جو قاعدے کے مطابق مَاهٌ کے بجائے مَاءٌ استعمال ہوتا ہے)۔

خ ر ج

(ن) **خُرُوْجًا** باہر نکلنا۔ ﴿ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ﴾ (2/البقرہ:149) ''اور جہاں سے بھی آپ ﷺ نکلیں تو رخ کریں اپنے چہرے کا مسجد حرام کی طرف۔'' ﴿ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِيْلٍ ﴾ (40/المومن:11) ''تو ہم نے اعتراف کیا اپنے گناہوں کا تو کیا نکلنے کیلئے کوئی راستہ ہے۔''

اُخْرُجْ فعل امر ہے۔ تو نکل۔ ﴿ فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ ﴾ (7/الاعراف:13) ''تو تیرے لئے نہیں تھا کہ تو تکبر کرے اس میں پس تو نکل جا۔''

خَارِجٌ اسم الفاعل ہے۔ نکلنے والا۔ ﴿ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ﴾ (2/البقرہ:167) ''اور وہ لوگ نکلنے والے نہیں ہیں آگ سے۔''

مَخْرَجٌ اسم الظرف ہے۔ نکلنے کی جگہ۔ نکلنے کا راستہ۔ ﴿ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ﴾ (65/الطلاق:2) ''اور جو تقویٰ کرتا ہے اللہ سے تو وہ بنا دیتا ہے اس کے لئے کوئی نکلنے کا راستہ۔''

خَرْجٌ اسم ذات ہے۔ سرمایہ۔ خرچ۔ محصول۔ ٹیکس۔ خراج وغیرہ۔ ﴿ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلٰٓى اَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَ بَيْنَهُمْ سَدًّا ﴾ (18/الکہف:94) ''تو کیا ہم مقرر کر دیں تیرے لئے کوئی سرمایہ اس بات پر کہ تو بنا دے ہمارے اور ان کے مابین ایک دیوار۔''

خَرَاجٌ اسم ذات ہے۔ مال۔ مزدوری۔ خراج۔ اجر و ثواب۔ عطا وغیرہ۔ خَرَاجٌ کا لفظ عموماً زمین کے لگان پر بولا جاتا ہے اور خَرَاجٌ اور خَرْجٌ دونوں تقریباً ہم معنی ہیں۔ (ضیاء القرآن) ﴿ اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ خَرْجًا فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَيْرٌ ﴾ (23/المومنون:72) ''کیا آپؐ طلب کرتے ہیں اُن سے کچھ معاوضہ (آپؐ کے لیے) تو آپؐ کے رب کی عطا بہتر ہے۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)

(افعال) **اِخْرَاجًا** باہر نکالنا۔ ﴿ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ ﴾ (7/الاعراف:32) ''آپ ﷺ کہہ دیجئے کس نے حرام کیا اللہ کی اس زینت کو جو اس نے نکالی اپنے بندوں کیلئے۔''

	اَخْرِجْ	ج: اَخْرِجُوْا۔ فعل امر ہے۔ تو نکال۔ ﴿ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ ﴾(4/النساء:75)''اے ہمارے رب! تو نکال ہم کو اس بستی سے۔''
	مُخْرِجٌ	اسم الفاعل ہے۔ نکالنے والا۔ ﴿ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴾(2/البقرہ:72)''اور اللہ نکالنے والا ہے جو تم لوگ چھپایا کرتے تھے۔''
	مُخْرَجٌ	اسم المفعول ہے۔ نکالا جانے والا یعنی جس کو نکالا جائے۔ ﴿ اَيَعِدُكُمْ اَنَّكُمْ اِذَا مِتُّمْ وَ كُنْتُمْ تُرَابًا وَّ عِظَامًا اَنَّكُمْ مُّخْرَجُوْنَ ﴾(23/المومنون:35)''کیا وہ وعدہ دیتا ہے تم کو کہ جب تم مردہ ہوگے اور ہو جاؤ گے مٹی اور ہڈیاں تو تم نکالے جانے والے ہو۔''
(استفعال)	اِسْتِخْرَاجًا	کسی چیز میں سے کچھ نکالنا۔ ﴿ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَآءِ اَخِيْهِ ﴾(12/یوسف:76)''پھر اس نے نکالا اس کو اپنے بھائی کے سامان میں سے۔'' کسی آیت یا حدیث سے کوئی مسئلہ نکالنا بھی استخراج یا استنباط کہلاتا ہے۔

ث م ر

(ن)	ثُمُوْرًا	پھل دار ہونا۔ پھل والا ہونا۔ قرآن مجید میں فعل استعمال نہیں ہوا۔
	ثَمَرٌ	اسم ذات ہے۔ پھل۔ پھلوں کے لیے یہ لفظ عام ہے۔ اس کی واحد ثَمَرَةٌ آتی ہے اور جمع ثَمَرَاتٌ اور ثِمَارٌ آتی ہے۔ ﴿ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ﴾(2/البقرۃ:25)''جب کوئی پھل انہیں کھانے کو دیا جائے گا'' ثَمَرَاتٌ آیت زیر مطالعہ میں آیا ہے۔ ﴿ اُنْظُرُوْٓا اِلٰى ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَ يَنْعِهٖ ﴾(6/الانعام:99)''تم لوگ دیکھو اُس کے پھل کی طرف جب وہ پھل دے اور اُس کے پکنے کی طرف۔'' حضرت مفتی محمد شفیعؒ ثمرۃ کے لفظ کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:'' ثَمَرَاتٌ، ثمرہ کی جمع ہے، ہر نفع آور چیز سے حاصل ہونے والے نتیجہ کو اس کا ثمرہ کہا جاتا ہے، اس لیے لفظ ثَمَرَاتٌ میں وہ تمام چیزیں بھی شامل ہیں جو انسان کی غذا بنتی ہیں، اور وہ چیزیں بھی جو اس کا لباس بنتی ہیں، اور وہ چیزیں بھی جو اس کے رہنے سہنے کا مکان بنتی ہیں۔''(معارف القرآن، ج۵،ص ۲۵۴)۔ حضرتؒ سورہ ابراہیم کی آیت 37 کے تحت فرماتے ہیں: ''ثَمَرَاتٌ، ثَمَرَةٌ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں پھل اور عادۃً ان پھلوں کو کہا جاتا ہے جو کھائے جاتے ہیں۔ اور کبھی لفظ ثمرہ نتیجہ اور پیداوار کے معنی میں بھی آتا ہے جو کھانے کی چیزوں سے زیادہ عام ہے، ہر نفع آور چیز کے نتیجہ اور حاصل کو اُس کا ثمرہ کہا جا سکتا ہے، مشینوں اور صنعتی کارخانوں کے ثمرات ان کی مصنوعات کہلائیں گی، ملازمت اور مزدوری کا ثمرہ وہ اُجرت اور تنخواہ کہلائے گی جو اس کے نتیجہ میں حاصل ہوئی۔''(معارف القرآن، ج۵،ص ۲۶۵) امام راغبؒ فرماتے ہیں:''مجازاً ہر چیز کے نفع پر ثمر کا لفظ بولا جاتا ہے جیسے کہا جاتا ہے ثَمَرَةُ الْعِلْمِ، اَلْعَمَلُ الصَّالِحُ کہ علم کا ثمرہ نیک عمل ہے وَثَمَرَةُ الْعَمَلِ الصَّالِحِ، اَلْجَنَّةُ۔ اور نیک عمل کا ثمرہ جنت ہے۔'' بطور کنایہ ثَمَرٌ کا لفظ مطلق مال و دولت یا کمائے ہوئے مال پر بھی بولا جاتا ہے۔ جیسے فرمایا ﴿ وَّ كَانَ لَهٗ ثَمَرٌ ﴾ (الکہف:34)۔ اس آیت کے تحت حضرت مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں:'' لفظ ثمر درختوں کے پھل کو بھی کہا جاتا ہے، اور مطلق مال و زر کو بھی، اس جگہ (الکہف۔34) حضرت ابن عباسؓ، مجاہدؒ، قتادہؒ سے یہی دوسرے معنی منقول ہیں (ابن کثیرؒ)۔ قاموس میں ہے کہ لفظ ثمرہ درخت کے پھل اور انواعِ مال و زر سب کو کہا جاتا ہے۔''(معارف القرآن، ج۵،ص ۵۹۲)۔ اولاد کو بھی والدین کا ثمر قرار دیا گیا ہے۔
(افعال)	اِثْمَارًا	پھل دینا۔ ﴿ كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ ﴾(6/الانعام:141)''تم لوگ کھاؤ اس کے پھل میں سے جب بھی وہ پھل دے۔''

رِزْقًا (ر ز ق) :البقرۃ آیت 3 دیکھیں۔ اَللّٰہُ (ء ل ہ) : آیت بسم اللہ دیکھیں۔

ن د د

(ض) نَدًّا کسی کا ہم پلہ ہونا۔ مدمقابل ہونا۔

نِدٌّ ج: اَنْدَادٌ ۔اسم صفت ہے۔ ہم پلہ۔ ہم سر۔ مدمقابل۔ برابر کا مخالف ۔Rival۔ آیت زیر مطالعہ۔ نِدٌّ عربی زبان میں اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی کے جیسی بھی ہو اور اس کے مخالف بھی۔ تفسیر ماجدیؒ میں ہے نِدٌّ عربی میں کہتے ہیں مثل ومشابہ کو بھی اور مخالف و مدمقابل کو بھی چنانچہ انداد کے معنی اضداد (مخالف ہونا) اور اشباہ (کسی کے جیسا ہونا) دونوں کیے گئے ہیں۔ (ص: ۱۴)۔ ''کسی کے جیسا ہونا'' کے لیے عربی میں مِثْلٌ اور نِدٌّ کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ مِثْلٌ عام ہے اور ہر طرح کی شرکت کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ جبکہ نِدٌّ خاص ہے اور اس کو کہتے ہیں جو کسی شے کی ذات اور جوہر میں شریک ہو اور یہ بھی مماثلت کی ایک قسم ہے۔ اس لیے ہر نِدٌّ کو مثل کہہ سکتے ہیں، لیکن ہر مثل کو نِدٌّ نہیں کہہ سکتے۔ اسی مفہوم کو واضح کرنے کے لیے ہمارے بزرگوں نے اس کا ترجمہ ''ہم سر اور مدمقابل'' سے کیا ہے۔ مثلاً صاحب تفہیم القرآنؒ، البقرۃ آیت 165 کا ترجمہ کرتے ہیں۔ ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اَنْدَادًا﴾ ''کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو اس کا ہمسر اور مدِّ مقابل بناتے ہیں۔'' اور بعض بزرگوں نے اس کا ترجمہ، ''برابر کا مخالف''، ''شریک وہم سر''، وغیرہ الفاظ سے کیا ہے۔ انگلش کا لفظ ''Rival'' اس لفظ کے مفہوم کے صرف ایک جز ''مخالف'' کی ترجمانی کرتا ہے۔ (واللہ اعلم)۔ اس وضاحت کے بعد اب نوٹ کیجئے کہ کسی کو اللہ تعالیٰ کا نِدٌّ بنانے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے اندر ویسی ہی صفات ماننا جیسی کہ اللہ تعالیٰ کی ہیں اور جو حقوق اللہ تعالیٰ کے بندوں پر ہیں ان میں سے سب یا بعض اس بناوٹی معبود کو دینا۔ البقرہ آیت 165 کے تحت مولانا مودودیؒ ''انداد'' کے اسی مفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''یعنی خدائی کی جو صفات اللہ کے لیے خاص ہیں اُن میں سے بعض کو دوسروں کی طرف منسوب کرتے ہیں، اور خدا ہونے کی حیثیت سے بندوں پر اللہ تعالیٰ کے جو حقوق ہیں، وہ سب یا اُن میں سے بعض حقوق یہ لوگ اُن دوسرے بناوٹی معبودوں کو ادا کرتے ہیں۔ مثلاً سلسلہ اسباب پر حکمرانی، حاجت روائی، مشکل کشائی، فریادرسی، دعائیں سننا اور غیب وشہادت ہر چیز سے واقف ہونا، یہ سب اللہ کی مخصوص صفات ہیں۔'' اور آگے فرماتے ہیں: ''جو شخص خدا کی اِن صفات میں سے کسی صفت کو بھی کسی دوسرے کی طرف منسوب کرتا ہے، اور اُس کے ان حقوق میں سے کوئی ایک حق بھی کسی دوسرے کو دیتا ہے وہ دراصل اُسے خدا کا مدمقابل اور ہمسر بناتا ہے۔ اور اسی طرح جو شخص یا جو ادارہ اِن صفات میں سے کسی صفت کا مدعی ہو اور ان حقوق میں سے کسی حق کا انسانوں سے مطالبہ کرتا ہو، وہ بھی دراصل خدا کا مدمقابل اور ہمسر بنتا ہے خواہ زبان سے خدائی کا دعویٰ کرے یا نہ کرے۔'' نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے ایک صحابی نے ایسے ہی کہہ دیا: ''مَاشَاءَ اللّٰہُ وَمَا شِئْتَ'' یعنی جو اللہ چاہے اور جو آپؐ چاہیں۔'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں فوراً ٹوک دیا اور فرمایا: ((اَجَعَلْتَنِیْ لِلّٰہِ نِدًّا؟ مَا شَاءَ اللّٰہُ وَحْدَہٗ)) ''کیا تو نے مجھے اللہ کا مدمقابل بنا دیا ہے؟ (بلکہ وہی ہوگا) جو تنہا اللہ چاہے۔'' (ان الفاظ میں یہ حدیث علامہ محمد بن عبدالوہاب نے ''کتاب التوحید'' میں نسائی کے حوالے سے درج کی ہے۔ مسند احمد میں الفاظ وارد ہوئے ہیں: ((اَجَعَلْتَنِیْ وَاللّٰہَ عَدْلًا؟)) ''کیا تو نے مجھے اور اللہ کو برابر کر دیا؟''۔ صوفیاء کرام نے ''انداد'' کی تفسیر یہ فرمائی

ہے: ''ہر وہ چیز جو انسان کو اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل کر دے اور اس کے اِحکام کی تعمیل سے روک دے وہ ''انداد'' سے ہے۔ خواہ وہ بت ہوں، گمراہ رئیس ہوں، مال و دولت ہو، فرزند و زن ہوں یا علم و فن ہر چیز جو اللہ تعالیٰ سے دور کرنے والی ہو وہ ''نِدٌّ'' ہے اور پاش پاش کر دینے کے لائق ہے۔'' (ضیاء القرآن، ج ۱، ص: ۱۱۳)۔ تفسیر ابن جریر طبریؒ میں متعدد صحابہ کرامؓ سے آیت زیر مطالعہ میں انداد کے حوالے سے روایت کیا ہے کہ یہاں انداد سے مراد وہ حکام ہیں جن کی اطاعت خدا کی نافرمانی میں کی جاتی ہو گویا اللہ کی نافرمانی کرتے ہوئے غیر اللہ کی اطاعت کرنا، غیر اللہ کی پرستش کی طرح شرک ہے۔ (بحوالہ فی ظلال القرآن، ج ۱، ص ۱۳۴)

نِدٌّ اور ضِدٌّ کا فرق بھی ذہن میں رہے۔ ضِدٌّ ان دو چیزوں کو کہا جاتا ہے جو ایک جنس کے تحت ہوں مگر ان میں سے ہر ایک اپنی خاص صفات اور خصوصیات کی وجہ سے دوسری سے مخالف ہو اور ان میں انتہائی دوری ہو اور کبھی جمع نہ ہو سکتی ہوں۔ مثلاً سیاہی اور سفیدی، دونوں کی جنس رنگ ہے لیکن دونوں کبھی جمع نہیں ہو سکتے ہیں اور دونوں کی متضاد خصوصیات بھی ہیں۔ اسی طرح، خیر اور شر ہے یا دن اور رات وغیرہ۔ جب کہ نِدٌّ میں دونوں چیزوں کی صفات اور خصوصیات کو ایک جیسا بھی مانا جاتا ہے اور ایک دوسرے کے مخالف بھی مانا جاتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ لَا نِدَّ لَهٗ وَلَا ضِدَّ لَهٗ۔ یعنی نہ اس کا کوئی نِدٌّ ہے (یعنی جو اللہ تعالیٰ جیسی صفات رکھتا ہو اور اللہ تعالیٰ کے مدمقابل بھی ہو) اور نہ اس کا کوئی ضِدٌّ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی جنس کی کوئی اور چیز ہے ہی نہیں اس لیے ضِدٌّ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مختصراً: ایک جیسی صفات کے ساتھ ہم پلہ، ہم سر اور مخالف نِدٌّ ہے اور مخالف صفات کے ساتھ مدمقابل ضِدٌّ ہے۔ (واللہ اعلم)۔

تَعْلَمُوْنَ (ع ل م): الفاتحہ آیت 1 دیکھیں۔

ترکیب اَلَّذِیْ گذشتہ آیت میں رَبَّكُمُ پر عطف ہے۔ اور پورا جملہ اس کی صفت ہے۔ جَعَلَ فعل، لَكُمُ متعلق فعل اور اَلْاَرْضَ مفعول ہے۔ فِرَاشًا کو جَعَلَ کا مفعول ثانی بھی مانا جا سکتا ہے اور اَلْاَرْضَ کا حال بھی۔ اَلسَّمَآءَ مفعول ہے جَعَلَ کا۔ بِنَآءً کو مفعول ثانی بھی مانا جا سکتا ہے اور حال بھی۔ اَنْزَلَ کی ضمیر فاعلی اَلَّذِیْ یعنی رَبَّكُمُ کے لئے ہے۔ مِنَ السَّمَآءِ متعلق فعل ہے۔ مَآءً مفعول ہے۔ اَخْرَجَ کی ضمیر فاعلی رَبَّكُمُ کے لئے ہے۔ بِهٖ کی ضمیر مَآءً کے لئے ہے۔ مِنَ الثَّمَرٰتِ متعلق فعل، رِزْقًا مفعول بِهٖ ہے اور لَكُمُ متعلق ہے۔ دوسری ترکیب کے مطابق مِنَ الثَّمَرٰتِ کو مفعول مانا گیا ہے اور رِزْقًا لَّكُمْ کو مفعول لهٗ مانا گیا ہے۔ لَا تَجْعَلُوْا فعل نہی ہے۔ لِلّٰهِ متعلق فعل اور اَنْدَادًا مفعول ہے۔ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ کا واو حالیہ ہے۔ اَنْتُمْ مبتداء اور تَعْلَمُوْنَ جملہ فعلیہ بن کر اس کی خبر ہے۔

ترجمہ
البقرة:22

اَلَّذِیْ جَعَلَ	لَكُمُ	الْاَرْضَ	فِرَاشًا	وَّالسَّمَآءَ
جس نے بنایا	تمہارے لئے	زمین کو	بچھونا/فرش	اور آسمان کو

بِنَآءً ص	وَّاَنْزَلَ	مِنَ السَّمَآءِ	مَآءً	فَاَخْرَجَ
چھت	اور اس نے اتارا	آسمان سے	پانی کو	پھر اس نے نکالا

بِهٖ	مِنَ الثَّمَرٰتِ	رِزْقًا	لَّكُمْ ج	فَلَا تَجْعَلُوْا	لِلّٰهِ
اس سے	پھلوں میں سے	رزق کو	تمہارے لئے	پس تم لوگ مت بناؤ	اللہ کے

اَنۡدَادًا	وَّ	اَنۡتُمۡ	تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۲﴾
ہمسر اور مدمقابل	اس حال میں کہ	تم لوگ	جانتے ہو

نوٹ:1 ہدایت اور ضلالت کے اعتبار سے انسانوں کے تین گروہوں کے تذکرے کے بعد اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی عبادت کی دعوت تمام انسانوں کو دی جا رہی ہے۔ فرمایا کہ جب تمہارا اور کائنات کا خالق اللہ ہے، تمہاری تمام ضروریات کا مہیا کرنے والا وہی ہے، تو پھر تم اسے چھوڑ کر دوسروں کی عبادت کیوں کرتے ہو؟ دوسروں کو اس کا شریک کیوں ٹھہراتے ہو؟ اگر تم عذاب خداوندی سے بچنا چاہتے ہو تو اس کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ اللہ کو ایک مانو اور صرف اسی کی عبادت کرو، جانتے بوجھتے شرک کا ارتکاب مت کرو۔ (احسن البیان، ص ۱۳)

نوٹ۔2 حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اَلَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمُ میں جَعَلَ لَکُمُ کے متعلق فرماتے ہیں: ''آیت کے اس ٹکڑے کی جان یا اصل رُوح جَعَلَ لَکُمُ ہے۔ مقصود زمین یا آسمان کی ہیئت بیان کرنا، یا ان کی ارضیاتی یا فلکیاتی ماہیت بیان کرنا کسی درجہ میں بھی نہیں۔ بیان صرف یہ کرنا ہے کہ زمین ہو یا آسمان، کوئی بھی از خود نہیں بن گئے ہیں، بلکہ جو کچھ اور جیسے بھی کچھ ہیں، اللہ کے بنائے ہوئے، اور اسی قادر مطلق کے زیر فرمان ہیں۔ دوسری تعلیم ساتھ ہی ساتھ یہ ملی، کہ زمین و آسمان انسان کے لیے خلق ہوئے ہیں۔ انسان زمین و آسمان کے لیے خلق نہیں ہوا ہے۔ مقصود و مطلوب انسان ہے۔ زمین و آسمان دونوں، باذنِ الٰہی، اسی خلیفۃ اللہ کے خادم ہیں۔ پھر یہ کیسی شدید حماقت ہے کہ انسان اپنے ان خدائی خادموں کے آگے جھکنے لگے۔ اور اُلٹا انہیں کو معبود قرار دے کر اُن کی پرستش کرنے لگے۔'' (تفسیر ماجدیؒ، ص ۱۳)

آیت: 23

﴿وَ اِنۡ کُنۡتُمۡ فِیۡ رَیۡبٍ مِّمَّا نَزَّلۡنَا عَلٰی عَبۡدِنَا فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَۃٍ مِّنۡ مِّثۡلِہٖ ۪ وَ ادۡعُوۡا شُہَدَآءَکُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۲۳﴾﴾

اِنۡ

اِنۡ چار طرح استعمال ہوتا ہے۔

(1) اِنۡ شرطیہ: اِنۡ شرطیہ کے معنی ہیں ''اگر''۔ یہ حروف عاملہ میں سے ہے۔ مضارع کو جزم دیتا ہے۔ ﴿اِنۡ یَّنۡتَہُوۡا یُغۡفَرۡ لَہُمۡ مَّا قَدۡ سَلَفَ ۚ﴾ (8/الانفال:38) ''اگر وہ باز آجائیں تو معاف کردیے جائیں گے ان کے لیے جو گناہ پہلے ہوچکے۔'' یہی کثیر الاستعمال ہے۔

(2) اِنۡ مخففہ: جو اِنَّ ثقیلہ سے مخفف ہو کر اِنۡ بنتا ہے۔ یہ کبھی عمل کرتا ہے اور کبھی نہیں۔ یہ تحقیق اور ثبوت کے معنی دیتا ہے۔ اس کی خبر پر لام تاکید (لَ) لگا ہوتا ہے جیسے فرمایا: ﴿وَ اِنۡ کَانَ اَصۡحٰبُ الۡاَیۡکَۃِ لَظٰلِمِیۡنَ ﴿ۙ۷۸﴾﴾ (15/الحجر:78) ''بلاشبہ اصحاب الایکہ ظالم تھے۔'' اس لام تاکید کو لام فارقہ کہتے ہیں۔

(3) اِنۡ نافیہ: اِنۡ نافیہ کے معنی ہیں ''نہیں''۔ یہ غیر عامل ہے۔ یہ جملہ اسمیہ پر بھی آتا ہے اور جملہ فعلیہ پر بھی۔ جیسے الانعام کی آیت 116 میں فرمایا: ﴿اِنۡ یَّتَّبِعُوۡنَ اِلَّا الظَّنَّ﴾ (جملہ فعلیہ) ﴿وَ اِنۡ ہُمۡ اِلَّا یَخۡرُصُوۡنَ ﴿۱۱۶﴾﴾ (جملہ اسمیہ) ''سو کچھ نہیں مگر پیچھے پڑے ہیں اپنے خیال کے اور کچھ نہیں مگر قیاس آرائیاں کرتے ہیں۔'' ﴿اِنۡ ہٰذَاۤ اِلَّا قَوۡلُ الۡبَشَرِ ﴿ؕ۲۵﴾﴾ (74/المدثر:25) ''نہیں ہے یہ مگر بشر کا کلام۔'' اس کے بعد اکثر اِلَّا و لَمَّا آتا ہے۔ مگر ہر جگہ ضروری نہیں۔ مثلاً ﴿اِنۡ عِنۡدَکُمۡ مِّنۡ سُلۡطٰنٍۭ بِہٰذَا ؕ﴾ (10/یونس:68) ''تمہارے پاس کوئی بھی دلیل اس دعوے کی نہیں۔'' (ترجمہ ماجدیؒ) اس آیت مبارکہ میں اِنۡ نافیہ ہے۔ (ماجدیؒ)

(4) اِنۡ زائدہ: اِنۡ زائدہ جو مَا نافیہ کے بعد آتا ہے اور مَا نافیہ کی تاکید یا تحسین کلام کے معنی دیتا ہے۔ حضرت حسّان بن ثابتؓ کا ایک شعر ہے:

مَا اِنۡ مَدَحۡتُ مُحَمَّدًا بِمَقَالَتِیۡ   لٰکِنۡ مَدَحۡتُ مَقَالَتِیۡ بِمُحَمَّدٍ

''میں نے اپنے اشعار کے ذریعے سے محمد ﷺ کی تعریف نہیں کی بلکہ محمد ﷺ کے ذریعے میں نے اپنے اشعار کی تعریف کی۔''

اس میں مَا کے بعد اِنۡ زائدہ ہے اور تحسین کلام کے لیے آیا ہے۔ قرآن مجید میں اس کی مثال الاحقاف: 26 ہے۔ جس میں فرمایا ﴿وَ لَقَدۡ مَکَّنّٰہُمۡ

فِيْمَآ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ ﴾ ''اور ہم نے اُن لوگوں کو جو قدرت دی تھی وہ قدرت تم لوگوں کو نہیں دی۔'' اس آیت میں بھی مَا کے بعد اِنْ زائدہ ہے اور تحسین کلام کے لیے ہے۔

كُنْتُمْ (ك و ن): البقرۃ آیت 10 دیکھیں۔ رَيْبٌ (ر ی ب): البقرۃ آیت 2 دیکھیں۔ مِمَّا: البقرۃ آیت 3 دیکھیں۔
نَزَّلْنَا (ن ز ل): البقرۃ آیت 4 دیکھیں۔ عَبْدٌ (ع ب د): الفاتحہ آیت 1 دیکھیں۔

ء ت ی

(ض) **اِتْيَانًا** (1) کسی تک پہنچنا۔ آنا۔ خواہ کوئی خود آئے یا اُس کا حکم پہنچے یا اس کا نظم و نسق جاری ہو۔ خیر اور شر دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ فعل لازم ہے۔ ﴿ وَهَلْ اَتٰىكَ نَبَؤُا الْخَصْمِ ۘ ﴾ (38/ ص:21) ''کیا تم کو پہنچی جھگڑالو کی خبر۔'' ﴿ اَتَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۚ ﴾ (9/التوبۃ:70) ''ان کے پاس آئے ان کے رسول واضح دلیلوں کے ساتھ۔'' ﴿ اَتٰى اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ ؕ ﴾ (16/ النحل:1) ''آ گیا اللہ کا فیصلہ، اب اس کے لیے جلدی نہ مچاؤ۔'' 'بِ' کے صلے کے ساتھ متعدی ہو جاتا ہے۔ اَتٰی کا مطلب ہے آنا اور اَتٰی بِ کا مطلب ہے لانا اور کسی کو کوئی چیز دینا۔ قرآن مجید میں ہے ﴿ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ ﴾ (2/البقرۃ:25) ''اور ان کو ایک دوسرے کے ہم شکل پھل دیے جائیں گے۔'' اس سورت میں اس کا مجہول بھی استعمال ہوتا ہے جیسے کہ مندرجہ بالا آیت مبارکہ سے واضح ہے۔

(2) کوئی کام کرنا۔ کوئی حرکت یا کرتوت کرنا۔ ﴿ وَالّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآىِٕكُمْ ﴾ (4/النساء:15) ''تمہاری عورتوں میں سے جو بے حیائی کا کام کریں۔'' ﴿ وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ۝ ﴾ (27/النمل:54) ''اور لوطؑ کا (ذکر کر) جب اُنہوں نے اپنی قوم سے کہا کیا تم بدکاری کرتے ہو اس حال میں کہ تم سمجھ رکھتے ہو۔'' ﴿ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا ﴾ (3/آل عمران:188) ''وہ لوگ خوش ہوتے ہیں اُس پر جو اُنہوں نے کیا۔''

يَاْتِ مضارع مجزوم ہے۔ ﴿ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ ۝ ﴾ (14/ابراہیم:19) ''اگر وہ چاہے تو لے جائے تم لوگوں کو اور وہ ایک نئی مخلوق لے آئے۔'' ﴿ اِنَّهٗ مَنْ يَّاْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ ؕ ﴾ (20/طٰہٰ:74) ''بیشک جو پہنچا اپنے رب کے پاس اس حال میں کہ وہ مجرم ہے تو یقینا اس کے لئے جہنم ہے۔''

اِئْتِ فعل امر ہے۔ تو پہنچ۔ تو آ۔ 'بِ' کے صلے کے ساتھ مطلب ہوگا ''تو لا''۔ ﴿ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِيْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ ﴾ (2/البقرہ:258) ''بیشک اللہ سورج کو لاتا ہے مشرق سے، پس تو لے آ اس کو مغرب سے۔''

اٰتٍ اسم الفاعل ہے۔ آنے والا۔ ﴿ اِنَّ مَا تُوْعَدُوْنَ لَاٰتٍ ۙ ﴾ (6/الانعام:134) ''تم سے جس چیز کا وعدہ کیا جا رہا ہے وہ یقیناً آنے والی ہے۔'' ﴿ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ ؕ ﴾ (29/العنکبوت:5) ''پس اللہ کا ٹھہرایا ہوا وقت یقیناً آنے والا ہے۔'' یہ جب مضاف بنتا ہے تو اس کی شکل اٰتِیْ بن جاتی ہے۔ ﴿ اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ۝ ﴾ (19/مریم:93) ''آسمان اور زمین میں جو بھی ہیں سب کے سب اللہ کے غلام بن کر ہی آنے والے ہیں۔'' ﴿ وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ۝ ﴾ (19/مریم:95) ''یہ سارے کے سارے قیامت کے دن اکیلے اُس کے پاس حاضر ہونے والے ہیں۔'' نوٹ کر لیں مضارع میں واحد متکلم کے صیغے کی بھی یہی شکل ہوتی ہے اس لیے دونوں میں فرق سیاق و سباق سے ہوتا ہے۔ جب اس کے ساتھ 'بِ' کا صلہ لگتا ہے تو اس کے معنی ہوتے ہیں ''لانے والا''۔ ﴿ قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ ۚ ﴾ (27/النمل:39) ''کہا ایک دیو نے جنوں میں سے میں لاؤں گا آپؑ کے پاس اُس کو اس سے پہلے کہ آپؑ کھڑے ہوں اپنی جگہ سے۔''

اٰتِیَۃٌ اسم الفاعل ہے۔ مونث کا صیغہ۔ آنے والی۔﴿ وَ اِنَّ السَّاعَۃَ لَاٰتِیَۃٌ ﴾(15/الحجر:85)''اور بے شک قیامت کی گھڑی ضرور آنے والی ہے۔''

مَاْتِیٌّ ناقص یائی میں اسم المفعول کا وزن مَفْعِیٌّ ہوتا ہے۔ مَاْتِیٌّ اسی وزن پر بنا ہے۔ لیکن یہ اسم الفاعل کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور اس کا مطلب ہوتا ہے آنے والا۔ پورا ہو کر رہنے والا۔ (لغات القرآن، ج۵،ص ۲۶۲)۔﴿ کَانَ وَعْدُہٗ مَاْتِیًّا ﴾(19/مریم:61)''بے شک اُس کا وعدہ پورا ہونے والا ہی ہے۔''(ترجمہ احسن البیان)''بے شک اُس کا وعدہ پورا ہو کر رہنے والا ہے۔''(ترجمہ ماجدیؒ)

(افعال) **اِیْتَاءً** کسی تک پہنچانا۔ دینا۔ عطا کرنا۔﴿ وَ اَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَی الزَّکٰوۃَ ﴾(9/التوبۃ:18)''اور اس نے قائم کی نماز اور ادا کی زکوٰۃ۔''حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں:''قرآن مجید میں عموماً زکوٰۃ اور صدقاتِ واجبہ کا لفظ اِیْتَاء کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ لفظ اِیْتَاء لغت میں عطاء کرنے کے معنی میں آتا ہے، امام راغب اصفہانیؒ نے مفردات القرآن میں فرمایا وَالْاِیْتَاءُ الْاِعْطَاءُ وَ خُصَّ وَضْعُ الصَّدَقَۃِ فِی الْقُرْاٰنِ بِالْاِیْتَاءِ، یعنی ایتاء کے معنی عطاء فرمانے کے ہیں، اور قرآن میں صدقہ واجبہ ادا کرنے کو ایتاء کے لفظ کے ساتھ مخصوص فرمایا ہے۔''اور ظاہر ہے کہ کسی کو کوئی چیز عطاء کرنے کا مفہوم حقیقی یہی ہے کہ اس کو اس چیز کا مالک بنا دیا جائے۔ اور علاوہ زکوٰۃ و صدقات کے بھی لفظ ایتاء قرآن کریم میں مالک بنا دینے ہی کے لیے استعمال ہوا ہے، مثلاً اٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ، یعنی دے دو عورتوں کو ان کے مہر، ظاہر ہے مہر کی ادائیگی جب ہی تسلیم ہوتی ہے جب رقم مہر پر عورت کو مالکانہ قبضہ دیدے۔''(معارف القرآن، ج ۴،ص ۴۱۰)۔ حضرت مولانا مودودیؒ فرماتے ہیں:''عربی زبان میں''دینے''(ایتاء) کا لفظ صرف مال یا کوئی مادی چیز دینے ہی کے معنی میں استعمال نہیں ہوتا بلکہ معنوی چیزیں دینے کے معنی میں بھی بولا جاتا ہے مثلاً کسی شخص کی اطاعت قبول کر لینے کے لیے کہتے ہیں اُتیته من نفسی القبول کسی شخص کی اطاعت سے انکار کر دینے کے لیے کہتے ہیں اُتیته من نفسی الاباءۃ۔''(تفہیم القرآن، ج ۳،ص ۲۸۶)۔ عام طور پر اس کے دو مفعول ہوتے ہیں یعنی کس کو دیا اور کیا دیا۔ عربی محاورے میں اِیْتَاءٌ عَنِ الْیَمِیْنِ کا مطلب ہوتا ہے''کسی پر زور اور دباؤ ڈالنا''جیسے فرمایا:﴿ قَالُوْٓا اِنَّكُمْ كُنْتُمْ تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْیَمِیْنِ ﴿۲۸﴾ ﴾(37/الصافات:28)''(تابعین) کہیں گے کہ تمہاری ہی آمد ہم پر بڑے زور سے ہوا کرتی تھی۔''(ترجمہ ماجدیؒ) حاشیے میں حضرتؒ فرماتے ہیں:''ایتاء عن الیمین کے معنی محاورہ میں زور اور دباؤ ڈالنے کے آتے ہیں۔''یا اس محاورے سے مراد لی جاتی ہے''کسی کو نیکی اور بھلائی کے راستے سے روکنا۔''کیونکہ عربی میں یمین سے خیر اور برکت بھی مراد لی جاتی ہے۔ تفسیر عثمانیؒ میں یہ دونوں باتیں بیان کر دی گئیں ہیں۔ چنانچہ حضرت شیخ الہندؒ الصافات:28 کا ترجمہ کرتے ہیں:''بولے تم ہی تھے کہ آتے تھے ہم پر داہنی طرف سے۔''اور حاشیے میں حضرت شیخ الاسلامؒ فرماتے ہیں:''یمین''(داہنے ہاتھ) میں عموماً زور و قوت زائد ہوتی ہے یعنی تم ہی تھے جو ہم پر چڑھے آتے تھے بہکانے کو زور دکھلا کر اور مرغوب کر کے۔ یا یمین سے مراد خیر و برکت کی جانب لی جائے یعنی تم ہی تھے کہ ہم پر چڑھائی کرتے تھے بھلائی اور نیکی سے روکنے کے لیے۔''(تفسیر عثمانیؒ ص ۵۹۵)

یُؤْتِ مضارع مجزوم ہے۔﴿ وَ اٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ یُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۲۰﴾ ﴾(5/المآئدہ:20)''اور اس نے دیا تم لوگوں کو جو اس نے نہیں دیا کسی ایک کو تمام جہانوں میں سے۔''

اٰتِ ج: اٰتُوْا۔ فعل امر ہے۔ تو پہنچا۔ تو دے۔﴿ وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ ﴾(17/بنی اسرائیل:26)''اور تو پہنچا قرابت والوں کو ان کا حق۔''﴿ وَ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّكٰوۃَ ﴾(2/البقرۃ:43)''اور تم قائم کرو نماز اور تم دو زکوٰۃ۔''

اُوْتِیَ ماضی مجہول ہے۔ دیا گیا۔ ﴿وَمَآ اُوْتِیَ مُوْسٰی وَعِیْسٰی﴾(2/البقرہ:136)''اور جو دیا گیا موسیٰ اور عیسیٰ کو۔'' ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ لَیَعْلَمُوْنَ اَنَّہُ الْحَقُّ﴾(2/البقرہ:144)''بیشک جن لوگوں کو دی گئی کتاب وہ لوگ جانتے ہیں کہ یہ حق ہے۔''

س و ر

(ن) سَوْرًا دیوار پر چڑھنا۔

سُوْرٌ اسم ذات ہے۔ شہر پناہ۔ شہر کی چاردیواری کو سُوْرٌ کہتے ہیں۔ فصیل۔ دیوار۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع فرماتے ہیں: ''یہ لفظ دراصل شہر پناہ کے لیے بولا جاتا ہے، جو بڑے شہروں کے گرد غنیم (ڈاکو، دشمن) سے حفاظت کے لیے بڑی مضبوط اور مستحکم چوڑی دیوار سے بنایا جاتا ہے، ایسی دیواروں میں فوج کے حفاظتی دستوں کی کمین گاہیں بھی بنی ہوتی ہیں جو حملہ آوروں سے باخبر رہتے ہیں۔'' (معارف القرآن، ج۳،ص۵۶۷) ﴿فَضُرِبَ بَیْنَہُمْ بِسُوْرٍ﴾(57/الحدید:13)''تو بنادی گئی ان کے درمیان ایک فصیل۔''

سُوْرَۃٌ ج: سُوَرٌ۔ اسم ذات ہے۔ (1) فضیلت میں بلند۔ (2) شہر کی چاردیواری۔ (3) کسی چیز کا بقیہ اور بچا ہوا حصہ (4) قرآن مجید کی سورت۔ باقی تفصیل آیت بسم اللہ کے بعد دیکھیں۔ ﴿سُوْرَۃٌ اَنْزَلْنٰہَا﴾(24/النور:1)''یہ ایک سورت ہے، ہم نے اتارا اس کو۔'' ﴿فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِہٖ﴾(11/ھود:13)''تو تم لوگ لے آؤ اس کے جیسی دس سورتیں۔''

سِوَارٌ ج: اَسْوِرَۃٌ اور اَسَاوِرُ۔ اسم ذات ہے۔ کنگن۔ ﴿فَلَوْلَآ اُلْقِیَ عَلَیْہِ اَسْوِرَۃٌ﴾(43/الزخرف:53)''تو کیوں نہیں ڈالے گئے اس پر کنگن سونے کے۔'' ﴿یُحَلَّوْنَ فِیْہَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَہَبٍ﴾(18/الکھف:31)''وہ لوگ پہنائے جائیں گے اس میں سونے کے کنگن۔''

(تفعّل) تَسَوُّرًا دیوار پھلانگنا۔ ﴿اِذْ تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ ﴿۲۱﴾﴾(38/ص:21)''جب ان لوگوں نے پھلانگا محراب کو۔''

مِثْلُ (م ث ل): البقرۃ آیت 17 دیکھیں۔

د ع و

(ن) دُعَاءً، دَعْوَۃً، دَعْوٰی (1) کسی کو پکارنا، مانگنا یا دعا کرنا۔ ﴿وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّہٗ﴾(39/الزمر:8)''اور جب بھی چھوتی ہے انسان کو کوئی تکلیف تو وہ پکارتا ہے اپنے رب کو۔'' جب اس کے ساتھ 'ل' کا صلہ استعمال ہو تو معنی ہوتے ہیں کسی کے حق میں دعا کرنا جیسے دَعَا لَہٗ، اس نے اس کے حق میں دعا کی۔ جب اس کے ساتھ عَلٰی کا صلہ استعمال ہو تو مطلب ہوتا ہے کسی کو بددعا دینا۔ جیسے دَعَا عَلَیْہِ۔ اس نے اس کو بددعا دی۔

(2) کسی کو یاد کرنا۔ اس کا ذکر کرنا۔

(3) کسی کو کسی چیز کی طرف دعوت دینا۔ کسی کام یا مقصد کے لیے بلانا۔ ان معنوں میں اس کے ساتھ عام طور پر اِلٰی کا صلہ استعمال ہوتا ہے۔ ﴿وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَی اللّٰہِ﴾(41/حٰمٓ السجدہ:33)''اور کون زیادہ اچھا ہے، بلحاظ بات کے، اس سے جس نے بلایا اللہ کی طرف۔''

(4) کسی چیز کے بارے میں دعویٰ کرنا کہ یہ چیز یوں ہے۔ ﴿ اَنۡ دَعَوۡا لِلرَّحۡمٰنِ وَلَدًا ۚ﴾ (19/مریم:91) ''اس بات پر کہ لوگوں نے رحمان کے لیے اولاد ہونے کا دعویٰ کیا۔''

حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں: ''دعا کا لفظ قرآن میں دو معنی کے لیے استعمال ہوتا ہے، ایک اللہ کا ذکر، اس کی حمد و ثنا، تسبیح و تمجید کے ساتھ۔ دوسرے حاجات و مشکلات کے وقت اللہ تعالیٰ سے اپنی حاجت طلب کرنا اور مصائب و آفات سے نجات اور مشکلات کی آسانی کی درخواست کرنا'' (معارف القرآن، ج ۴، ص ۱۲۹) اور پیر کرم شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں: ''قرآن کریم کی وہ آیات جہاں دَعَا یَدۡعُوۡ کے فاعل مُشرک ہیں اور مفعول ان کے معبودانِ باطل ہیں۔ وہاں تمام متقدمین علماءِ تفسیر نے دعا یدعو کا معنی عَبَدَ یَعۡبُدُ (عبادت کرنا) کیا ہے۔'' (ضیاء القرآن، ج ۲، ص ۱۱۴)

دُعِیَ — ج: دُعُوۡا۔ ماضی مجہول ہے۔ بلایا گیا۔ پکارا گیا۔ ﴿ اِذَا دُعِیَ اللّٰهُ وَحۡدَهٗ كَفَرۡتُمۡ ۚ﴾ (40/مومن:12) ''جب بھی پکارا گیا اللہ واحد کو تو تم لوگوں نے انکار کیا۔'' ﴿ اِنَّمَا كَانَ قَوۡلَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اِذَا دُعُوۡۤا اِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوۡلِهٖ لِيَحۡكُمَ بَيۡنَهُمۡ اَنۡ يَّقُوۡلُوۡا سَمِعۡنَا وَ اَطَعۡنَا ؕ﴾ (24/النور:51) ''مومنوں کی بات تو بس یہ ہوتی ہے کہ جب بھی انہیں بلایا جاتا ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف تاکہ وہ فیصلہ کرے ان کے درمیان تو وہ کہتے ہیں کہ ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی۔''

یُدۡعٰی — ج: یُدۡعَوۡنَ۔ مضارع مجہول ہے۔ بلایا جاتا ہے۔ پکارا جاتا ہے۔ ﴿ وَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنِ افۡتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الۡكَذِبَ وَ هُوَ يُدۡعٰۤى اِلَى الۡاِسۡلَامِ ؕ﴾ (61/الصف:7) ''اور کون زیادہ ظالم ہے اس سے جس نے جھوٹ باندھا اللہ پر اس حال میں کہ اسے بلایا جاتا ہے اسلام کی طرف۔'' ﴿ يُدۡعَوۡنَ اِلٰى كِتٰبِ اللّٰهِ لِيَحۡكُمَ بَيۡنَهُمۡ ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيۡقٌ مِّنۡهُمۡ ﴾ (3/آل عمران:23) ''ان لوگوں کو بلایا جاتا ہے اللہ کی کتاب کی طرف تاکہ وہ فیصلہ کرے ان کے درمیان، تو منہ موڑتا ہے ان میں سے ایک فریق۔''

لَا تَدۡعُ — فعل نہی ہے۔ تو مت پکار۔ ﴿ فَلَا تَدۡعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَكُوۡنَ مِنَ الۡمُعَذَّبِيۡنَ ۚ﴾ (26/الشعراء:213) ''پس تو مت پکار اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو پھر تو ہو جائے گا عذاب دیئے ہوئے لوگوں میں سے۔''

اُدۡعُ — فعل امر ہے۔ تو پکار۔ تو بلا۔ تو مانگ۔ تو دعا کر۔ ﴿ فَادۡعُ لَنَا رَبَّكَ يُخۡرِجۡ لَنَا مِمَّا تُنۡۢبِتُ الۡاَرۡضُ ﴾ (2/البقرۃ:61) ''پس تو پکار ہمارے لئے اپنے رب کو کہ وہ نکالے ہمارے لئے اس میں سے جو اگاتی ہے زمین۔'' ﴿ اُدۡعُ اِلٰى سَبِيۡلِ رَبِّكَ بِالۡحِكۡمَةِ وَالۡمَوۡعِظَةِ الۡحَسَنَةِ ﴾ (16/النحل:125) ''تو بلا اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت سے اور اچھی نصیحت سے۔''

دَاعٍ — اسم الفاعل ہے۔ پکارنے والا۔ بلانے والا۔ ﴿ وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِىۡ عَنِّىۡ فَاِنِّىۡ قَرِيۡبٌ ؕ اُجِيۡبُ دَعۡوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ﴾ (2/البقرۃ:186) ''اور جب بھی تجھ سے پوچھیں میرے بندے میرے بارے میں تو یقیناً میں قریب ہوں، میں جواب دیتا ہوں پکارنے والے کی پکار کا جب بھی وہ پکارتا ہے مجھ کو۔''

دَعۡوَةٌ — اسم ذات بھی ہے۔ دعا۔ پکار۔ بلاوا۔ دعوت۔ اوپر آیت نمبر۔ (2/البقرۃ:186) دیکھیں

دُعَآءٌ — اسم ذات بھی ہے۔ پکار۔ بلاوا۔ دعا۔ ﴿ اِنَّكَ سَمِيۡعُ الدُّعَآءِ ﴾ (3/آل عمران:38) ''بیشک تو ہر وقت اور ہر حال میں دعا کا سننے والا ہے۔''

دَعۡوٰی — اسم ذات بھی ہے۔ پکار۔ دعا۔ ﴿ فَمَا كَانَ دَعۡوٰٮهُمۡ اِذۡ جَآءَهُمۡ بَاۡسُنَاۤ اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوۡۤا اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيۡنَ ۝ ﴾

(7/الاعراف:5)''تو نہیں تھی ان کی پکار جب آیا ان کے پاس ہمارا عذاب، سوائے اس کے کہ انہوں نے کہا کہ بیشک ہم ظالم تھے۔'' ﴿دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ۚ﴾ (10/یونس:10)''اُسی میں اُن کا قول ہوگا پاک ہے تو اے اللہ اور اُس میں اُن کی (باہمی) دعا ''سلام'' ہوگی۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔ حاشیے میں حضرتؒ فرماتے ہیں: ''دعویٰ یہاں دونوں موقعوں پر دعا یا پکار کے معنی میں لیا گیا ہے۔''

(افعال) اِدْعَاءً باپ کے علاوہ کسی اور سے منسوب کر کے پکارنا۔ منہ بولا بیٹا کہنا۔

دَعِیٌّ ج: اَدْعِيَاءُ۔ اسم ذات ہے۔ منہ بولا بیٹا۔ لے پالک۔ فَعِيْلٌ کا وزن ہے بمعنی مَفْعُوْلٌ۔ یعنی مَدْعُوٌّ۔ جس کو پکارا گیا۔ یعنی جس کو بیٹا کہہ کر پکارا گیا ہو۔ ﴿وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ ؕ﴾ (33/الاحزاب:4)''اور اس نے یعنی اللہ نے نہیں بنایا تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارے بیٹے۔''

(افتعال) اِدِّعَاءً طلب کرنا۔ مانگنا۔ ﴿لَهُمْ فِيْهَا فَاكِهَةٌ وَّ لَهُمْ مَّا يَدَّعُوْنَ ﴿۵۷﴾﴾ (36/یٰس:57)''ان کے لئے ہے وہاں میوہ اور ان کے لئے ہے جو وہ مانگیں گے۔''

ش ھ د

(س۔ک) (ا) شُهُوْدًا حاضر ہونا۔ موقع پر موجود ہونا۔ معائنہ کرنا۔ ﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ؕ﴾ (2/البقرہ:185)''تو جو موجود ہو اس مہینے میں یا دیکھے اس مہینہ کو تو اسے چاہیے کہ وہ روزے رکھے اس کے۔''

(ب) شَهَادَةً گواہی دینا۔ ﴿وَ تُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَ تَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ﴾ (36/یٰسین:65)''اور بات کریں گے ہم سے ان کے ہاتھ اور گواہی دیں گے ان کے پیر۔'' گواہی عینی بھی ہو سکتی ہے اور قلبی بھی۔ عینی گواہی وہ ہے جس کی بنیاد انسان کا اپنا مشاہدہ ہو یعنی جس معاملے کو انسان نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو۔ اور قلبی گواہی وہ ہے جس کی بنیاد بصیرت ہو۔ بصیرت، دل کی اس روشنی یا بینائی کو کہتے ہیں جس سے انسان چیزوں کی حقیقت سے آگاہ ہوتا ہے۔ مثلاً کلمہ شہادت، جو ہر مسلمان گواہی دیتا ہے۔ حالانکہ کسی مسلمان نے اللہ تعالیٰ کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا اور صحابہؓ کے علاوہ دوسرے مسلمانوں نے رسول اللہؐ کو بھی نہیں دیکھا۔ ہر مسلمان یہ گواہی بصیرت کی بنیاد پر دیتا ہے۔ پھر یہی قلبی گواہی اپنی ذات سے متعلق ہو تو معنی ہوتے ہیں ''اقرار کرنا'' مثلاً: ﴿قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰٓى اَنْفُسِنَا﴾ (6/الانعام:130)''اور وہ سب عرض کریں گے کہ ہم اپنے اوپر اقرار کرتے ہیں۔'' (ترجمہ احسن البیان)۔ کسی کے حق میں گواہی دینے سے وہ گواہی ایک طرح سے اس کی تقویت کا باعث بنتی ہے۔ اس لیے یہ لفظ کسی کے حق میں گواہی دے کر اس کی مدد کرنے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اسی لیے شہید کا ایک معنی ''مددگار'' بھی کیا گیا ہے۔ کبھی شہادت کے معنی ''فیصلہ کرنے'' کے بھی آتے ہیں۔ مثلاً: ﴿وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا ۚ﴾ (12/یوسف:26)''اور گواہی دی ایک گواہ نے جو اس عورت کے خاندان سے تھا۔'' اس آیت کے تحت علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں: ''یہاں شَهِدَ شَاهِدٌ، حَكَمَ حَاكِمٌ کے معنی میں ہے کہ ایک فیصلہ کرنے والے نے فیصلہ کر دیا۔ کیونکہ شہادت کے لیے شاہد کا موقع پر حاضر ہونا ضروری ہے اور جس نے یہ بات کہی وہ موقع پر موجود نہ تھا۔ (بحوالہ ضیاء القرآن، ج ۲، ص ۴۲۵)۔ 'شہادت' کا اصطلاحی معنی ہے ''اللہ کی راہ میں جان دینا''۔ گویا جان دینے والے کو عقیدہ آخرت اور جزا و سزا پر اتنا پختہ یقین ہوتا ہے کہ وہ اپنی جان دے کر اس کی گواہی پیش کرتا ہے۔ شَهِدَ کے ساتھ عَلٰی کا صلہ آئے تو عام طور پر اس کے معنی ہوتے ہیں کسی کے خلاف گواہی دینا اور اگر 'لِ' کا صلہ آئے تو معنی ہوتے ہیں کسی کے حق میں گواہی دینا۔ (واللہ اعلم)

مَشْهَدٌ (1) مصدر میمی ہے۔ حاضر ہونا۔ موجود ہونا۔

(2) اسم ظرف مکان یا زمان ہے۔ حاضری کی جگہ یا حاضری کا وقت۔ شہادت گاہ۔ ﴿فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ مَّشْهَدِ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴾ (19/مریم:37) ''پس کافروں کے لیے ''ویل'' ہے ایک بڑے سخت دن کی حاضری سے۔'' (ترجمہ احسن البیان)

اِشْهَدْ ج: اِشْهَدُوْا۔ فعل امر ہے۔ تو گواہی دے۔ تو گواہ رہ۔ ﴿وَاشْهَدُوْٓا اَنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴾ (11/ھود:54) ''اور تم لوگ گواہ رہو کہ میں بری ہوں اس سے جو تم لوگ شرک کرتے ہو۔''

شَاهِدٌ ج: شَاهِدُوْنَ۔ شُهُوْدٌ۔ اَشْهَادٌ۔ اسم الفاعل ہے۔ حاضر رہنے والا۔ گواہی دینے والا۔ ﴿وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا ﴾ (12/یوسف:26) ''اور گواہی دی ایک گواہی دینے والے نے اس کے گھر والوں میں سے۔'' ﴿اَمْ خَلَقْنَا الْمَلٰٓئِكَةَ اِنَاثًا وَّهُمْ شٰهِدُوْنَ ﴾ (37/الصافات:150) ''کیا ہم نے فرشتوں کو مؤنث پیدا کیا اور وہ دیکھ رہے تھے۔'' ﴿وَّجَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا ۙ وَّ بَنِيْنَ شُهُوْدًا ۙ﴾ (74/مدثر:13،14) ''اور میں نے بنایا اس کے لئے کثیر مال اور حاضر رہنے والے بیٹے۔'' ﴿وَيَقُوْلُ الْاَشْهَادُ هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ﴾ (11/ھود:18) ''اور کہیں گے گواہی دینے والے یہ ہیں وہ لوگ جنہوں نے جھوٹ کہا اپنے رب پر۔''

شَهِيْدٌ ج: شُهَدَاءُ۔ فَعِيْلٌ کا وزن ہے۔ ہمیشہ اور ہر حال میں گواہی دینے والا۔ کسی جگہ موجود ہونے والا۔ حاضر۔ نگران۔ مدد کرنے والا (ابن عباسؓ)۔ ﴿لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ﴾ (2/البقرہ:143) ''تاکہ تم لوگ ہو جاؤ گواہی دینے والے لوگوں پر اور ہو جائیں رسول ﷺ تم لوگوں پر گواہی دینے والے۔'' یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لیے استعمال ہو تو مطلب ہوتا ہے وہ ہستی جس کے علم سے کوئی چیز غائب نہ ہو۔ اور کبھی اس مفہوم کے ساتھ یہ معنی بھی شامل ہوتا ہے کہ وہ قیامت میں خلق پر گواہ ہوگا۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴾ (22/الحج:17) ''اللہ تعالیٰ ہر چیز پر گواہ ہے۔'' اصلاحِ شرع میں شہید وہ شخص ہے جو اللہ کی راہ میں قتل کیا گیا ہو۔ حضرت مولانا مودودیؒ فرماتے ہیں: ''شہید کے اصل معنی گواہ کے ہیں۔ اس سے مراد وہ شخص ہے جو اپنے ایمان کی صداقت پر اپنی زندگی کے پورے طرزِ عمل سے شہادت دے۔ اللہ کی راہ میں لڑ کر جان دینے والے کو بھی شہید اسی وجہ سے کہتے ہیں کہ وہ جان دے کر ثابت کر دیتا ہے کہ وہ جس چیز پر ایمان لایا تھا اسے واقعی سچے دل سے حق سمجھتا تھا اور اسے اتنا عزیز رکھتا تھا کہ اس کے لیے جان قربان کرنے میں بھی اس نے دریغ نہ کیا۔ ایسے راستباز لوگوں کو بھی شہید کہا جاتا ہے جو اس قدر قابلِ اعتماد ہوں کہ جس چیز پر وہ شہادت دیں اس کا صحیح و برحق ہونا بلا تامل تسلیم کر لیا جائے۔'' (تفہیم القرآن، ج ا، ص: ۳۷۰)۔ امام رازیؒ فرماتے ہیں: ''شہید کا وزن فعیل بمعنی فاعل ہے۔ وہ شخص جو کبھی نورِ برہان اور قوت بیان سے اور کبھی شمشیر و سنان سے دین الٰہی کی حقانیت کی شہادت دے، وہ شہید کہلاتا ہے اور راہِ خدا میں قتل ہونے والے کو اسی مناسبت سے شہید کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنی جان قربان کر کے دین کی حقانیت کی گواہی دی۔ اس کے معاً بعد امام رازیؒ لکھتے ہیں کہ وہی افراد جو دنیا میں دین کی صداقت کے شاہد رہے وہی قیامت کے روز لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ کے مصداق ہوں گے۔'' (بحوالہ ضیاء القرآن، ج ا، ص ۳۶۲)

مَشْهُوْدٌ اسم المفعول ہے۔ جسے حاضر کیا جائے۔ جو دکھلایا جائے۔ جس کا معائنہ کیا جائے۔ جس کے لیے گواہی دی جائے۔ ﴿ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ ۙ لَّهُ النَّاسُ وَذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ ﴾ (11/ھود:103) ''وہ جمع کیے جانے والا دن ہے لوگوں کو اور وہ حاضر کیے جانے والا دن ہے۔''

شَهَادَةٌ — ج: شَهَادَاتٌ۔ اسم ذات ہے۔ ظاہر یا حاضر چیز۔ گواہی، وہ بیان جو اس علم کی بنیاد پر ہو جو مشاہدہ بصیرت یا مشاہدہ بصر کے ذریعے حاصل ہو۔ ﴿وَ سَتُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ﴾ (9/توبہ:105) ’’اور تم لوگ لوٹائے جاؤ گے حاضر اور غائب کے جاننے والے کی طرف۔‘‘ ﴿وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ﴾ (2/البقرہ:140) ’’اور کون زیادہ ظالم ہے اس سے جس نے چھپایا گواہی کو جو اس کے پاس ہے اللہ کی طرف سے۔‘‘ ﴿فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهٰدٰتٍ﴾ (24/نور:6) ’’ان میں سے ایک کی گواہی چار گواہیاں ہیں۔‘‘

(افعال) اِشْهَادًا — کسی کو گواہ بنانا۔ ﴿وَ اِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْۤ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَ اَشْهَدَهُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ﴾ (7/اعراف:172) ’’اور جب نکالا تیرے رب نے آدمؑ کی اولاد کو ان کی پشتوں سے اور ان کو گواہ بنایا ان کے نفس پر۔‘‘

اَشْهِدْ — ج: اَشْهِدُوْا۔ فعل امر ہے۔ تو گواہ بنا۔ ﴿وَ اَشْهِدُوْۤا اِذَا تَبَايَعْتُمْ﴾ (2/البقرہ:282) ’’اور تم لوگ گواہ بناؤ جب خرید و فروخت کرو۔‘‘

(استفعال) اِسْتِشْهَادًا — گواہی کیلئے کہنا۔ گواہ طلب کرنا۔ گواہ بنانا۔

اِسْتَشْهِدْ — ج: اِسْتَشْهِدُوْا۔ فعل امر ہے۔ گواہ طلب کرو۔ ﴿فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ﴾ (4/النساء:15) ’’تو تم لوگ گواہ طلب کرو ان عورتوں پر اپنوں میں سے چار۔‘‘

دُوْنَ

دُوْنَ کا لفظ عربی زبان میں تین مختلف معنوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ایک، کسی اونچی چیز کے مقابلے میں نیچے ہونا۔ دوسرے، کسی افضل و اشرف چیز کے مقابلے میں کم تر ہونا۔ تیسرے، کسی چیز کے ماسوا یا اس کے علاوہ ہونا۔ (تفہیم القرآن، ج ۵ ص ۲۷۰)

اَللّٰهُ (ء ل ہ): آیت بسم اللہ دیکھیں۔

ص د ق

(ن) صِدْقًا — سچ بولنا۔ سچ کر دکھانا۔ سچائی کا مطلب ہے کہ (1) دل اور زبان میں ہم آہنگی ہو (2) بات واقعہ کے مطابق ہو اور (3) عمل قول کے مطابق ہو۔ ﴿هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ صَدَقَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ﴾ (33/الاحزاب:22) ’’یہ ہے وہ جو ہم سے وعدہ کیا اللہ نے اور اس کے رسول نے اور سچ کہا اللہ نے اور اس کے رسول نے۔‘‘ ﴿لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ﴾ (48/الفتح:27) ’’بیشک اللہ نے عملاً سچ کر دیا اپنے رسول کے خواب کو حق کے ساتھ۔‘‘ صِدْقٌ کی ضد کِذْبٌ ہے۔ (کذب کی لغت کے لیے آیت 10 دیکھیں) اصل میں صِدْقٌ اور کِذْبٌ، قول (بات) سے متعلق ہیں۔ کوئی بات سچ اس وقت ہوتی ہے جب دل اور زبان میں بھی ہم آہنگی ہو اور جس کے متعلق جو بات کہی گئی ہو وہ بھی حقیقت میں ویسا ہی ہو۔ اگر ان میں سے کوئی شرط پوری نہ ہو تو یہ ’’صدق تام‘‘ (یعنی مکمل سچ) نہ رہے گا۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ المنافقون کی آیت 1 میں منافقین کو جو جھوٹا قرار دیا ہے تو وہ اس وجہ سے ہے کہ منافقین زبان سے تو سچ بول رہے تھے اور حضورؐ کے بارے میں جو خبر دے رہے تھے (کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں) وہ بھی صحیح تھی لیکن دل میں اس کے خلاف عقیدہ رکھتے تھے اس لیے ان کی اس گواہی کو سچ نہیں مانا گیا۔ نیز صِدْق کا استعمال افعال جوارح (جارحہ کی جمع۔ انسان کے ہاتھ پاؤں اور دیگر اعضاء) کے لیے بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ جب کوئی شخص جنگ کا حق ادا کر دے تو کہا جاتا ہے صَدَقَ فِي الْقِتَالِ وہ جنگ میں سچا رہا یعنی جو کچھ اس پر لازم تھا اس نے کر دکھایا مطلب جان توڑ کر لڑا اور اپنے عمل سے بہادری ثابت کر دی اور اگر اس کے خلاف ہو تو کہا جاتا ہے کہ كَذَبَ فِي الْقِتَالِ وہ جنگ میں جھوٹا رہا یعنی

بزدل ثابت ہوا۔قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:﴿ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ﴾ (الاحزاب:23)''ایمان لانے والوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جنہوں نے اللہ سے کیے ہوئے عہد کو سچا کر دکھایا ہے۔''نیز اہل عرب کی یہ عادت ہے کہ جس چیز میں ظاہری یا باطنی فضیلت ہو یا جب وہ کسی چیز کی خوبی بیان کریں تو اسے صِدْقٌ کی طرف مضاف کر دیتے ہیں یعنی وہ چیز اتنی عمدہ ہے کہ اس سے بھلائی کی جو توقع کی جائے گی وہ چیز اس پر پوری اترے گی اور توقع کرنے والے کی تصدیق کر دے گی۔اسی لیے قرآن مجید میں قَدَمَ صِدْقٍ، اونچا مرتبہ، بلند مرتبہ (یونس:2)، مُبَوَّاَ صِدْقٍ، پسندیدہ جگہ (یونس:93)، مُدْخَلَ صِدْقٍ، سچا داخل کرنا، مُخْرَجَ صِدْقٍ، سچا نکالنا (بنی اسرائیل:80)، لِسَانَ صِدْقٍ، سچا بول، ذکر خیر (مریم:50، اور الشعراء:84) اور مَقْعَدِ صِدْقٍ، سچی بیٹھک، اعلیٰ مقام (القمر:55) کے الفاظ آئے ہیں۔یاد رہے کہ صَدَقَ کا تعدیہ کبھی دو مفعولوں کی طرف بھی ہوتا ہے جیسے فرمایا:﴿ وَ لَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ ﴾ (آل عمران:152)''بے شک اللہ نے (تائید و نصرت کا) جو وعدہ تم سے کیا تھا وہ اُس نے سچا کر دیا۔''

صَادِقٌ ج: صَادِقُوْنَ۔اسم الفاعل ہے۔سچ کہنے والا۔سچ کرنے والا۔سچا۔﴿ وَ اِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ ؕ﴾ (40/المومن:28)''اور اگر وہ ہوا سچ کہنے والا تو آن پہنچے گا اس میں سے بعض جس کا وہ وعدہ کرتا ہے تم سے۔'' ﴿ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ ۖؗ وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ۝۱۴۶﴾ (6/الانعام:146)''یہ ہم نے جزا دی ان کو ان کی سرکشی کے سبب سے اور یقیناً ہم سچ کہنے والے ہیں۔''

اَصْدَقُ اسم التفضیل ہے۔زیادہ سچا۔﴿ وَ مَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا ۝۱۲۲﴾ (4/النساء:122)''اور کون زیادہ سچا ہے اللہ سے، بلحاظ بات کے۔''

صِدْقٌ اسم ذات بھی ہے۔سچائی۔﴿ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَبَ عَلَى اللّٰهِ وَ كَذَّبَ بِالصِّدْقِ اِذْ جَآءَهٗ ؕ﴾ (39/الزمر:32)''اور کون زیادہ ظالم ہے اس سے جس نے جھوٹ کہا اللہ پر اور جھٹلایا سچائی کو جب وہ آئی اس کے پاس۔''

صَدِيْقٌ اسم ذات ہے۔دوست۔﴿ فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِيْنَ ۝۱۰۰ۙ وَ لَا صَدِيْقٍ حَمِيْمٍ ۝۱۰۱﴾ (26/الشعراء:100-101)''تو نہیں ہے ہمارے لئے کوئی شفاعت کرنے والا اور نہ کوئی گرم جوش دوست۔''

صِدِّيْقٌ فِعِّيْلٌ کے وزن پر مبالغے کا صیغہ ہے۔بہت سچا۔انتہائی سچا۔صِدِّيْقٌ وہ ہے جس سے کثرت سے سچائی ظاہر ہو اور وہ کبھی جھوٹ نہ بولے۔بعض علماء نے فرمایا ہے کہ صدیق وہ ہے جس کو سچائی کی عادت کی وجہ سے جھوٹ بولنا ہی نہ آتا ہو۔﴿ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ ۖۗ﴾ (57/الحدید:19)''اور جو لوگ ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسولوں پر وہ لوگ ہی کامل سچے ہیں۔''حضرت مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں:''لفظ صِدِّيْقٌ بکسر صاد قرآن کا ایک اصطلاحی لفظ ہے اس کے معنی اور تعریف میں علماء کے اقوال مختلف ہیں۔بعض نے فرمایا کہ جس شخص نے عمر میں کبھی جھوٹ نہ بولا ہو وہ صدیق ہے بعض نے فرمایا کہ جو شخص اعتقاد اور قول و عمل ہر چیز میں صادق ہو یعنی جو دل میں اعتقاد ہو ٹھیک وہی زبان پر ہو اور اس کا ہر فعل اور ہر حرکت و سکون اسی اعتقاد اور قول کے تابع ہو۔روح المعانی اور مظہری وغیرہ میں اسی آخری معنی کو اختیار کیا ہے اور پھر صدیقیت کے درجات متفاوت (مختلف، فرق والے) ہیں۔اصل صدیق تو نبی و رسول ہی ہو سکتا ہے اور ہر نبی و رسول کے لیے صدیق ہونا وصف لازم ہے مگر اس کا عکس نہیں کہ جو صدیق ہو اس کا نبی ہونا ضروری ہو بلکہ غیر نبی بھی جو اپنے نبی و رسول کے اتباع میں صدق کا یہ مقام حاصل کر لے وہ بھی صدیق کہلائے گا۔

حضرت مریم کو خود قرآن کریم نے اُمُّهٗ صِدِيقه کا خطاب دیا ہے حالانکہ جمہور اُمت کے نزدیک وہ نبی نہیں، اور کوئی عورت نبی نہیں ہوسکتی۔'' (معارف القرآن، ج۶ص ۳۴)

حضرت مولانا مودودیؒ اس لفظ کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''صِدِّيْقٌ سے مراد وہ شخص ہے جو نہایت راست باز ہو، جس کے اندر صداقت پسندی اور حق پرستی کمال درجہ پر ہو، جو اپنے معاملات اور برتاؤ میں ہمیشہ سیدھا اور صاف طریقہ اختیار کرے، جب ساتھ دے تو حق اور انصاف ہی کا ساتھ دے اور سچے دل سے دے، اور جس چیز کو حق کے خلاف پائے اس کے مقابلہ میں ڈٹ کر کھڑا ہو جائے اور ذرا کمزوری نہ دکھائے۔ جس کی سیرت ایسی ستھری اور بے لوث ہو کہ اپنے اور غیر کسی کو بھی اس سے خالص راست روی کے سوا کسی دوسرے طرزِ عمل کا اندیشہ نہ ہو۔'' (تفہیم القرآن، ج ۱ ص: ۳۷۰)۔ حضرت مولانا مودودیؒ نے اس لفظ کی مزید وضاحت تفہیم القرآن، ج ۵، ص ۳۱۶ پر بھی کی ہے۔ وہاں سے بھی ایک نظر دیکھ لیا جائے۔

صَدَقَةٌ

ج: صَدَقَاتٌ۔ اسم ذات ہے۔ خیرات۔ زکوۃ۔ یہ عملی سچائی کا مظہر ہے اور لفظ صدقہ فرض خیرات یعنی زکوٰۃ اور نفلی خیرات، دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ ﴿ يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَ يُرْبِي الصَّدَقٰتِ ﴾ (2/البقرۃ:276) ''اللہ بے برکت کرتا ہے سود کو اور بڑھاتا ہے خیرات کو۔'' حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں: ''صدقہ لغت میں مال کے اس جزء کو کہا جاتا ہے جو اللہ کے لیے خرچ کیا جائے (قاموس)۔ امام راغبؒ نے مفردات القرآن میں فرمایا کہ صدقہ کو صدقہ اس لیے کہتے ہیں کہ اس کا دینے والا گویا یہ دعویٰ کرتا ہے کہ میں اپنے قول و فعل میں صادق ہوں، اس کے خرچ کرنے کی کوئی غرض دنیوی نہیں، بلکہ صرف اللہ کی رضا کے لیے خرچ کر رہا ہوں، اسی لیے جس صدقہ میں کوئی نام و نمود یا دنیوی غرض شامل ہو جائے قرآن کریم نے اس کو کالعدم قرار دیا ہے۔ لفظ صدقہ اپنے اصلی معنی کی رُو سے عام ہے، نفلی صدقہ کو بھی کہا جاتا ہے، فرض زکوٰۃ کو بھی، نفل کے لیے اس کا استعمال عام ہے ہی، فرض کے لیے بھی قرآن کریم میں بہت جگہ یہ لفظ استعمال ہوا ہے، جیسے خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً اور آیت زیر بحث (توبہ:60) اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ وغیرہ، بلکہ قرطبیؒ کی تحقیق تو یہ ہے کہ قرآن میں جب مطلق لفظ صدقہ بولا جاتا ہے تو اس سے صدقۂ فرض ہی مراد ہوتا ہے، اور روایات حدیث میں لفظ صدقہ ہر نیک کام کے لیے بھی استعمال ہوا ہے، جیسے حدیث میں ہے کہ کسی مسلمان سے خوش ہو کر ملنا بھی صدقہ ہے، کسی بوجھ اٹھانے والے کا بوجھ اُٹھوا دینا بھی صدقہ ہے، کنویں سے پانی کا ڈول اپنے لیے نکالا اس میں سے کسی دوسرے کو دے دینا بھی صدقہ ہے، اس حدیث میں لفظ صدقہ مجازی طور پر عام معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔'' (معارف القرآن، ج۴، ص ۳۹۵)

حضرت مولانا مودودیؒ فرماتے ہیں: ''صَدَقَه اردو زبان میں تو بہت ہی برے معنوں میں بولا جاتا ہے، مگر اسلام کی اصطلاح میں یہ اُس عطیے کو کہتے ہیں جو سچے دل اور خالص نیت کے ساتھ محض اللہ کی خوشنودی کے لیے دیا جائے، جس میں کوئی ریا کاری نہ ہو، کسی پر احسان نہ جتایا جائے، دینے والا صرف اس لیے دے کہ وہ اپنے رب کے لیے عبودیت کا سچا جذبہ رکھتا ہے۔ یہ لفظ صدق سے ماخوذ ہے اس لیے صداقت عین اس کی حقیقت میں شامل ہے۔ کوئی عطیہ اور کوئی صَرفِ مال اُس وقت تک صدقہ نہیں ہوسکتا جب تک اس کی تہ میں انفاق فی سبیل اللہ کا خالص اور بے کھوٹ جذبہ موجود نہ ہو۔'' (تفہیم القرآن، ج ۵، ص ۳۱۵)

صَدُقَةٌ

ج: صَدُقَاتٌ۔ بیوی کا حق مہر۔ ﴿ وَ اٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ﴾ (4/النساء:4) ''اور عورتوں کے مَہر خوشدلی کے ساتھ ادا کرو۔'' حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں: ''صَدُقَة اور صُدَاق عورتوں کے مہر کو کہا جاتا ہے، ملا علی قاریؒ

مرقاۃ شرح مشکوٰۃ میں لکھتے ہیں: وَسُمِّیَ بِہٖ لِاَنَّہٗ یَظْھَرُ بِہٖ صِدْقُ مَیْلِ الرَّجُلِ اِلَی الْمَرْاَۃِ، یعنی مہر کو صُداق اور صَدُقہ اس لیے کہتے ہیں کہ ''صدق'' کے اس مادہ میں سچ کے معنی ہیں، اور مہر سے بھی چونکہ شوہر کا اپنی بیوی کی طرف سچا میلان ظاہر ہوتا ہے اس لیے اس مناسبت سے مہر کو صَداق کہنے لگے۔'' (معارف القرآن، ج ۲،ص ۲۹۹)

(تفعیل) تَصْدِیْقًا (1) کسی کو سچا قرار دینا، کسی کی تصدیق کرنا۔ (2) سچ کر دکھانا۔ ﴿وَالَّذِیْنَ یُصَدِّقُوْنَ بِیَوْمِ الدِّیْنِ﴾ (70/المعارج:26) ''اور جو لوگ سچا قرار دیتے ہیں یعنی تصدیق کرتے ہیں بدلے کے دن کی۔''

مُصَدِّقٌ اسم الفاعل ہے۔ تصدیق کرنے والا۔ ﴿یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَکُمْ﴾ (4/النساء:47) ''اے لوگو جن کو دی گئی کتاب، تم لوگ ایمان لاؤ اس پر جو ہم نے نازل کیا اس حال میں کہ وہ تصدیق کرنے والا ہے اس کی جو تمہارے پاس ہے۔''

(تفعّل) تَصَدُّقًا تَصَدَّقَ، اِصَّدَّقَ (ماضی) اور یَتَصَدَّقُ، یَصَّدَّقُ (مضارع)۔ اپنے حق سے دست بردار ہونا۔ دوسرے کو حق سے زیادہ دینا۔ خیرات کرنا۔ ﴿وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَیْرٌ لَّکُمْ﴾ (2/البقرہ:280) ''اور یہ کہ تم لوگ اپنا حق چھوڑ دو، بہتر ہے تمہارے لئے۔''

تَصَدَّقْ فعل امر ہے۔ تُو زیادہ دے۔ تُو خیرات کر۔ ﴿فَاَوْفِ لَنَا الْکَیْلَ وَتَصَدَّقْ عَلَیْنَا﴾ (12/یوسف:88) ''پس تو پورا بھر ہمارے لئے پیمانے کو اور زیادہ دے۔''

مُتَصَدِّقٌ اور مُصَّدِّقٌ اسم الفاعل ہے۔ خیرات کرنے والا۔ ﴿وَالْمُتَصَدِّقِیْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِیْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ﴾ (33/الاحزاب:35) ''اور خیرات کرنے والا اور خیرات کرنے والیاں اور روزے والے اور روزے والیاں''۔ ﴿اِنَّ الْمُصَّدِّقِیْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ﴾ (57/الحدید:18) ''بیشک خیرات کرنے والے اور خیرات کرنے والیاں۔''

ترکیب

'وَ' استئنافیہ ہے۔ یعنی اس سے نیا جملہ شروع ہو رہا ہے۔ اِنْ شرطیہ ہے اور آگے کُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ سے عَلٰی عَبْدِنَا تک پورا جملہ شرط ہے۔ اس میں کُنْتُمْ کا اسم اس میں شامل ضمیر ہے۔ اس کی خبر محذوف ہے اور فِیْ رَیْبٍ متعلق خبر ہے۔ مِمَّا میں مِنْ حرف جر ہے اور 'مَا' موصول ہے۔ اگلا جملہ فعلیہ نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا، صلہ ہے 'مَا' موصول کا۔ نَزَّلْنَا فعل ہے اور اس میں شامل ضمیر اس کا فاعل ہے۔ عَلٰی عَبْدِنَا، متعلق فعل ہے۔ صلہ اور موصول مل کر مجرور ہیں، مِنْ کی وجہ سے اور جار مجرور مل کر صفت ہیں رَیْبٍ کی۔ آگے فَاْتُوْا سے شروع ہونے والا جملہ جواب شرط ہے۔ اس میں 'فَ' جواب شرط کے لیے ہے اور اِئْتُوْا فعل امر ہے اور اس کا فاعل اس میں شامل ضمیر ہے۔ بِسُوْرَۃٍ متعلق فعل ہے۔ بِسُوْرَۃٍ میں 'بِ' تعدیہ کا ہے جس سے معنی ہو جائیں گے ''تم لے آؤ ایک سورۃ'' مِّنْ مِّثْلِہٖ صفت ہے سورت کی۔ اگر ہوتا بِسُوْرَۃٍ مِّثْلِہٖ تو مطلب ہوتا ''اس کے جیسی ایک سورۃ''۔ لیکن یہاں مِنْ کی وجہ سے معنی ہوں گے ''ایک سورۃ جو کسی بھی لحاظ سے یا کسی بھی پہلو سے اس کے جیسی ہو'' (مِنْ تبعیضیہ)۔ مزید یہ کیا گیا کہ سورہ پر 'ال' داخل نہیں کیا یعنی کوئی خاص سورت مراد نہیں لی گئی۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ قرآنِ مجید کی چھوٹی سے چھوٹی سورت بھی اس دعویٰ میں شامل ہوگئی۔ (واللہ اعلم)۔ وَادْعُوْا میں 'وَ' عطف کا ہے اور اُدْعُوْا عطف ہے فَاْتُوْا پر۔ اُدْعُوْا میں شامل ضمیر اس کا فاعل ہے آگے شُھَدَآءَکُمْ اس کا مفعول ہے اور مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ متعلق فعل ہے۔ اگلا جملہ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ پھر جملہ شرطیہ ہے۔ کُنْتُمْ کا اسم اس میں شامل ضمیر ہے اور صٰدِقِیْنَ اس کی خبر ہے۔ اس کا جواب شرط محذوف ہے جو کہ فَافْعَلُوْا ذٰلِکَ ہو سکتا ہے۔ (درویشؒ)۔

عَلٰی عَبْدِنَا	نَزَّلْنَا	مِمَّا	فِیْ رَیْبٍ	کُنْتُمْ	وَاِنْ	ترجمہ
اپنے بندے پر	ہم نے اتارا	اس کے بارے میں جو	کسی شک میں	تم لوگ ہو	اور اگر	البقرۃ:23

شُهَدَآءَكُمْ	وَادْعُوْا	مِّنْ مِّثْلِهٖ	بِسُوْرَةٍ	فَاْتُوْا
اپنے مددگاروں کو	اور تم لوگ بلاؤ	کسی طرح اس کے جیسی	ایک سورہ کے ساتھ	تو تم لوگ آؤ

صٰدِقِيْنَ ﴿۲۳﴾	اِنْ كُنْتُمْ	مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ
سچے	اگر تم لوگ ہو	اللہ کے علاوہ

نوٹ:1 حرف شرط اِنْ عام طور پر ماضی پر نہیں آتا۔لیکن اگر آئے تو پھر ماضی کا ترجمہ حال میں ہوتا ہے۔اس لئے اِنْ كُنْتُمْ کے معنی ہیں اگر تم لوگ ہو۔

نوٹ:2 اَتٰى (پہنچنا۔آنا) اور جَآءَ (آنا) ، یہ دو فعل ایسے ہیں جن کے ساتھ مفعول آتا ہے، حالانکہ یہ دونوں افعال لازم ہیں۔جیسے هَلْ اَتٰكَ (کیا وہ پہنچا/آیا تیرے پاس)۔اِذْ جَآءَ هُمْ (جب وہ آیا ان کے پاس) اس کو ایک استثناء کی صورت بھی کہہ سکتے ہیں۔لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں افعال کے مفعول سے پہلے عام طور پر لفظ عِنْدَ محذوف ہوتا ہے۔جیسے هَلْ اَتٰكَ دراصل هَلْ اَتٰى عِنْدَكَ ہے۔اور اِذْ جَآءَ هُمْ دراصل اِذْ جَآءَ عِنْدَهُمْ ہے۔اس طرح دراصل یہ مفعول نہیں بلکہ متعلق فعل ہوتا ہے۔جیسے جَلَسَ عَلَى الْكُرْسِيِّ (وہ بیٹھا کرسی پر) میں عَلَى الْكُرْسِيِّ متعلق فعل ہے۔(از لطف الرحمٰن خان صاحب)

آیت:24

﴿فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۚ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۴﴾﴾

اِنْ: البقرۃ آیت 23 دیکھیں۔

ف ع ل

(ف) **فَعْلًا** کرنا۔﴿فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ﴾ (2/البقرۃ:85) ''اُن کی سزا اس کے سوا اور کیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں ذلیل وخوار ہو کر رہیں۔'' ﴿اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا ۚ﴾ (7/الاعراف:155) ''کیا تو ہلاک کرے گا ہمیں بسبب اُس کے جو ہم میں سے بیوقوفوں نے کیا۔''

اِفْعَلْ فعل امر ہے۔تو کر۔﴿قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ﴾ (37/الصافات:102) ''اُس نے کہا، ''ابا جان، جو کچھ آپ کو حکم دیا جا رہا ہے اسے کر ڈالئے۔''

فَاعِلٌ اسم الفاعل ہے۔کرنے والا۔﴿وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَايْءٍ اِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ﴿۲۳﴾﴾ (18/الکہف:23) ''اور کسی چیز کے بارے میں کبھی یہ نہ کہا کیجیے کہ میں کل یہ کام کر دوں گا۔''

مَفْعُوْلٌ اسم المفعول ہے۔وہ کام جو کیا جائے۔﴿وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ﴿۴۷﴾﴾ (4/النساء:47) ''اور ہے اللہ کا کام کیا گیا۔''

فِعْلٌ ج: اَفْعَالٌ۔اسم ذات ہے۔کام۔﴿وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ﴾ (21/الانبیاء:73) ''اور ہم نے اُن کی طرف نیک کاموں کے کرنے کی وحی کی۔'' (بعض کے نزدیک فِعْلٌ بطور مصدر بھی استعمال ہوتا ہے)۔

فَعَّالٌ مبالغے کا صیغہ ہے۔بہت زیادہ کام کرنے والا۔وہ ہستی جو چاہے کر گزرے۔﴿اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ﴿۱۰۷﴾﴾ (11/ھود:107) ''یقیناً تیرا رب جو کچھ چاہے کر گزرتا ہے۔''

اِتَّقُوْا (و ق ی): البقرۃ آیت 2 دیکھیں۔ اَلنَّارُ (ن و ر): البقرۃ آیت 17 دیکھیں۔ وَقُوْدُ (و ق د): البقرۃ آیت 17 دیکھیں۔
اَلنَّاسُ: البقرۃ آیت 8 دیکھیں۔

ح ج ر

(ن) **حَجْرًا** منع کرنا۔ روک دینا۔ سخت ہونا۔ جب قاضی کسی کو اس کی بے وقوفی یا کم سنی کی وجہ سے اس کے اپنے مال کو خرچ کرنے سے روک دے تو کہتے ہیں حَجَرَ الْقَاضِیْ عَلٰی فُلَانٍ قاضی نے فلاں کو خرچ کرنے سے روک دیا۔ اس مادے کے تمام مشتقات میں بندش اور روک کا مفہوم لازمی ہوتا ہے۔

حِجْرٌ ج: حُجُوْرٌ۔ اسم ذات ہے۔ ممنوع۔ حفاظت۔ حرام چیز۔ گود۔ عقل۔ اصل میں جس جگہ کے اردگرد پتھروں سے احاطہ کیا گیا ہو اسے حِجْرٌ کہا جاتا ہے۔ اسی لیے حطیم کعبہ اور دیارِ ثمود کو حجر کہا گیا۔ حطیم کعبہ، خانہ کعبہ کا وہ حصہ ہے جسے قریشِ مکہ نے خانہ کعبہ میں شامل نہیں کیا تھا۔ اس لیے طواف کرنے والوں کے لیے اس کے اندر سے طواف کرنا منع ہے۔ طواف کرتے وقت اس کے بیرونی حصے سے گزرجانا چاہیے، جسے دیوار سے ممتاز کر دیا گیا ہے اور ثمود کے بارے میں فرمایا ﴿ وَلَقَدْ كَذَّبَ اَصْحٰبُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِيْنَ ۙ﴾ (حجر:80) ''اور حجر کے رہنے والوں نے بھی پیغمبروں کی تکذیب کی۔'' چونکہ پتھروں سے کسی جگہ کا احاطہ کرنے سے اصل مقصد حفاظت اور روک تھام ہوتی ہے اسی لیے انسانی عقل کو بھی حجر کہا جاتا ہے کیونکہ وہ نقصان دہ، غلط اور حرام چیزوں سے روکتی ہے (اس مفہوم کے اعتبار سے اسے نُهْيَةٌ بھی کہتے ہیں)۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ هَلْ فِيْ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِيْ حِجْرٍ ۭ﴾ (89/الفجر:5) ''کیا اس میں قسم ہے عقل والے کیلئے۔'' اور جس چیز سے روکا اور منع کیا جائے وہ بھی حجر کہلاتی ہے۔ ﴿ وَقَالُوْا هٰذِهٖٓ اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ ڰ﴾ (6/الانعام:138) ''اور ان لوگوں نے کہا یہ مویشی اور کھیتی ہیں جو منع ہے یعنی ان کو کھانا منع ہے۔'' گود کو بھی حجر اس لیے کہتے ہیں کہ گود میں بچے کی حفاظت ہوتی ہے۔ ﴿ وَرَبَاۗىِٕبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ ﴾ (4/النساء:23) ''اور تمہاری سوتیلی بیٹیاں جو تمہاری گودوں میں ہیں۔''

حَجَرٌ ج: حِجَارَةٌ۔ اسم ذات ہے۔ سخت مٹی۔ پتھر۔ ﴿ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۭ﴾ (2/البقرۃ:60) ''تو ہم نے کہا تم مارو اپنی لاٹھی کو اس پتھر پر۔'' ﴿ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِىَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ۭ﴾ (2/البقرۃ:74) ''پھر سخت ہو گئے تمہارے دل اسکے بعد تو وہ پتھروں کی مانند ہیں یا زیادہ شدید بلحاظ سختی کے۔''

حُجْرَةٌ ج: حُجُرَاتٌ۔ سخت مٹی کا بنایا ہوا کمرہ۔ حجرہ۔ ''اصل لغت میں حجرہ ایک چار دیواری سے گھرے ہوئے مکان کو کہتے ہیں جس میں کچھ صحن ہو کچھ مسقّف (جس پر چھت ڈالی گئی ہو) عمارت ہو۔'' (معارف القرآن)۔ ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَاۗءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝﴾ (49/الحجرات:4) ''بیشک جو لوگ پکارتے ہیں آپؐ کو حجروں کے باہر سے ان میں سے اکثر عقل نہیں کرتے۔''

مَحْجُوْرٌ اسم المفعول ہے۔ سخت کیا ہوا۔ منع کیا ہوا۔ مضبوط۔ ﴿ يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلٰۗىِٕكَةَ لَا بُشْرٰى يَوْمَىِٕذٍ لِّلْمُجْرِمِيْنَ وَيَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ۝﴾ (25/الفرقان:22) ''جس روز یہ لوگ فرشتوں کو دیکھیں گے اُس روز مجرموں کے لیے کوئی خوشی کی بات نہ ہوگی اور یہ (کفار) کہیں گے کہ پناہ پناہ۔'' (ترجمہ ماجدیؒ) ''جس روز وہ دیکھیں گے فرشتوں کو تو کوئی خوشی کی بات نہ ہوگی اُس روز مجرموں کے لیے اور فرشتے کہیں گے تمہارے لیے (جنت کا داخلہ) قطعاً حرام ہے۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔

حِجْرٌ مَحْجُوْرٌ: حِجْرًا مَحْجُوْرًا ایک محاورہ ہے۔ جاہلیت کا دستور تھا کہ جب کسی کے سامنے کوئی ایسا شخص آجاتا جس سے اسے اذیت کا خوف ہوتا تو وہ حِجْرًا مَحْجُوْرًا کہہ دیتا (یعنی ہم تمہاری پناہ چاہتے ہیں) یہ الفاظ سن کر دشمن

اسے کچھ نہ کہتا، تو قرآن نے یہاں بیان کیا کہ کفار بھی (عذاب کے) فرشتوں کو دیکھ کر (حسب عادت) یہ الفاظ کہیں گے کہ شاید عذاب سے پناہ مل جائے۔ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ فرماتے ہیں: ''حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ایک محاورہ ہے۔ عہد جاہلیت میں جب کسی کو کوئی بلا پیش آتی یا کوئی اپنے دشمن کو دیکھ پاتا اور خیال یہ ہوتا کہ وہ اس پر حملہ کرے گا تو یہی لفظ پکار کر کہتا۔ جیسے اردو محاورہ میں کہتے ہیں دور دور۔ (تفسیر ماجدیؒ ص ۷۵۳)۔ صاحبؒ ضیاء القرآن نے یَقُوْلُوْنَ کا فاعل فرشتے مراد لیا ہے۔ اس صورت میں حِجْرٌ موصوف ہوگا اور مَحْجُوْرٌ اس کی صفت برائے تاکید ہوگی۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ضیاء القرآن، ج ۳، ص ۳۵۹)

دو چیزوں کے درمیان مضبوط رکاوٹ یا آڑ کو بھی حِجْرٌ مَّحْجُوْرٌ کہتے ہیں۔ جیسے فرمایا: ﴿وَ جَعَلَ بَیْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴿۵۳﴾﴾ (25/الفرقان:53) ''اور اس نے بنایا ان دونوں کے مابین ایک پردہ اور ایک مضبوط رکاوٹ۔'' قرآن مجید میں حِجْرٌ مَّحْجُوْرٌ دو جگہ ہی استعمال ہوا ہے۔ ایک سورہ الفرقان کی آیت 22 میں جہاں یہ محاورے کے طور پر آیا ہے اور دوسرا سورہ الفرقان ہی کی آیت 53 میں جہاں یہ مضبوط رکاوٹ کے معنی میں آیا ہے۔ (واللہ اعلم)۔

ع د د

(ن) **عَدًّا**: شمار کرنا۔ گننا۔ ﴿ثُمَّ یَعْرُجُ اِلَیْهِ فِیْ یَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ﴿۵﴾﴾ (32/السجدہ:5) ''پھر وہ چڑھے گا اس کی طرف ایک دن میں، اس کی مقدار ہے ایک ہزار سال جس سے تم لوگ شمار کرتے ہو۔'' ﴿لَقَدْ اَحْصٰىهُمْ وَ عَدَّهُمْ عَدًّا ﴿۹۴﴾﴾ (19/مریم:94) ''اُس نے اُن کو احاطے میں لے رکھا ہے اور اُنہیں خوب شمار کر رکھا ہے۔''

عَادٌّ: ج: عَادُّوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ گننے والا۔ شمار کرنے والا۔ ﴿لَبِثْنَا یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ فَسْــَٔلِ الْعَآدِّیْنَ ﴿۱۱۳﴾﴾ (23/المومنون:113) ''ہم رہے ایک دن یا دن کا کوئی حصہ، تو پوچھ لو گننے والوں سے۔''

مَعْدُوْدٌ: اسم المفعول ہے (مذکر)۔ گنا ہوا۔ شمار کیا ہوا۔ ﴿وَ مَا نُؤَخِّرُهٗۤ اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ ﴿۱۰۴﴾﴾ (11/ھود:104) ''ہم اُسے ایک گنی ہوئی مدت کے لیے ملتوی کیے ہوئے ہیں۔''

مَعْدُوْدَةٌ: ج: مَعْدُوْدٰتٌ۔ اسم المفعول ہے (مؤنث)۔ گنی ہوئی۔ شمار کی ہوئی۔ ﴿لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّاۤ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَةً﴾ (2/البقرہ:80) ''ہرگز نہیں چھوئے گی ہم کو آگ مگر گنے ہوئے چند دن۔'' ﴿وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِیْۤ اَیَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ﴾ (2/البقرہ:203) ''اور تم لوگ یاد کرو اللہ کو گنے ہوئے دنوں میں۔''

عَدَدٌ: اسم ذات ہے۔ گنتی۔ شمار۔ ﴿فَسَیَعْلَمُوْنَ مَنْ اَضْعَفُ نَاصِرًا وَّ اَقَلُّ عَدَدًا ﴿۲۴﴾﴾ (72/الجن:24) ''تو وہ لوگ جان لیں گے کون زیادہ کمزور ہے بلحاظ مددگار کے اور زیادہ قلیل ہے بلحاظ گنتی کے۔''

عِدَّةٌ: اسم ذات ہے۔ گنی ہوئی چیز۔ گنتی۔ شمار۔ شمار کی ہوئی مدت۔ عورت کی عدت بھی اسی معنی میں ہے یعنی اس کے گنے ہوئے دن۔ شرعی اصطلاح میں اس مدت کو عدّت کہا جاتا ہے جس میں عورت ایک شوہر کے نکاح سے نکلنے کے بعد دوسرے نکاح سے ممنوع ہوتی ہے۔ یہ مدت گزر جانے کے بعد اس سے نکاح کرنا حلال ہو جاتا ہے۔ ﴿اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا﴾ (9/التوبۃ:36) ''بیشک مہینوں کی گنتی اللہ کے نزدیک بارہ مہینے ہیں۔'' ﴿قُلْ رَّبِّیْۤ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ﴾ (18/الکہف:22) ''آپ ﷺ کہیے میرا رب زیادہ جانتا ہے ان کی مدت کو۔'' ﴿یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَ اَحْصُوا الْعِدَّةَ﴾ (65/الطلاق:1) ''اے نبیؐ (اپنی امت

سے کہو کہ) جب تم اپنی بیویوں کو طلاق دینا چاہو تو اُن کی عدت (کے دنوں کے آغاز) میں اُنہیں طلاق دو اور عدت کا حساب رکھو۔'' (ترجمہ احسن البیان)

عُدَّةٌ ج: عُدَدٌ۔ ساز و سامان۔ مال۔ ہتھیار وغیرہ۔ ﴿ وَ لَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً ﴾ (9/توبہ:46) ''اگر اُن کا ارادہ جہاد کے لیے نکلنے کا ہوتا تو وہ ضرور اس سفر کے لیے سامان کی تیاری رکھتے۔''

(افعال) **اِعْدَادًا** تیار کرنا۔ ﴿ وَ اَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ﴾ (4/:93) ''اور اس نے تیار کیا اس کے لئے ایک عظیم عذاب۔''

اُعِدَّ ماضی مجہول ہے۔ تیار کیا گیا۔ ﴿ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴾ (3/آل عمران:133) ''اور جنت، جس کی چوڑائی آسمان اور زمین ہیں، وہ تیار کی گئی متقی لوگوں کیلئے۔''

اَعِدَّ ج: اَعِدُّوْا۔ فعل امر ہے۔ تو تیار کر۔ ﴿ وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ ﴾ (8/الانفال:60) ''اور تم لوگ تیار کرو ان کے لئے جو تم سے ہو سکے قوت میں سے۔''

(تفعیل) **تَعْدِيْدًا** کثرت سے گننا۔ بار بار گننا۔ ﴿ الَّذِيْ جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَهٗ ﴾ (104/الھمزۃ:2) ''جس نے جمع کیا مال کو اور بار بار گنا اس کو۔''

(افتعال) **اِعْتِدَادًا** اہتمام سے شمار کرنا۔ گننا۔ ﴿ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا ﴾ (33/الاحزاب:49) ''تو اُن پر تمہارا کوئی حق عدت کا نہیں جسے تم شمار کرو۔''

كٰفِرِيْنَ (ك ف ر): البقرۃ آیت 6 دیکھیں۔

ترکیب 'فَ' استئنافیہ ہے۔ یعنی اس سے نئی بات شروع ہو رہی ہے۔ اِنْ شرطیہ ہے اور جملہ لَّمْ تَفْعَلُوْا شرط ہے۔ لَمْ جوازمِ مضارع میں سے اور تَفْعَلُوْا مجزوم ہے۔ آگے 'وَ' اعتراضیہ ہے اور لَنْ تَفْعَلُوْا شرط اور جواب شرط کے درمیان، جملہ معترضہ ہے۔ لَنْ نواصب مضارع میں سے ہے اور یہ تَفْعَلُوْا منصوب ہے۔ فَاتَّقُوا النَّارَ میں 'فَ' جواب شرط کے لیے ہے۔ اور اِتَّقُوا النَّارَ جواب شرط ہے۔ اِتَّقُوْا فعل امر کا صیغہ ہے اور اس کا فاعل اس میں شامل ضمیر 'اَنْتُمْ' ہے اور اَلنَّارَ اس کا مفعول بہ ہے۔ فَاتَّقُوْا میں 'فَ' کے بارے میں حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ فرماتے ہیں: '''فَ' نتیجہ کو بتلا رہا ہے۔ یعنی جب قرآن کی پیش کی ہوئی دلیل کے جواب سے عاجز آ چکے ہو، اور اپنے انکار پر کوئی دلیل خود رکھتے نہیں ہو، تو اب انکارِ حق کیے چلے جانا بجز عناد و خبثِ نفس کے اور کس چیز کا نتیجہ ہو سکتا ہے؟ اور جہنم کا عذاب آتشیں اسی معاندانہ انکارِ حق کا لازمی اور قدرتی نتیجہ ہے۔'' اَلَّتِيْ اسم موصول ہے۔ وَقُوْدُهَا مرکب اضافی، مبتدا ہے۔ اَلنَّاسُ اس کی خبر۔ 'وَ' عطف کا ہے اور اَلْحِجَارَةُ عطف ہے اَلنَّاسُ پر۔ یہ سارا جملہ اسمیہ صلہ ہے، اَلَّتِيْ کا اور صلہ اور موصول مل کر صفت ہیں اَلنَّارَ کی۔ اُعِدَّتْ، ماضی مجہول کا صیغہ ہے۔ اس کا نائب الفاعل اس میں شامل ضمیر 'هِيَ' ہے جو کہ اَلنَّارَ کے لیے ہے۔ لِلْكٰفِرِيْنَ متعلق فعل ہے اور یہ جملہ حال ہے اَلنَّارَ کا۔

ترجمہ	فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا	وَلَنْ تَفْعَلُوْا	فَاتَّقُوا النَّارَ	الَّتِيْ وَقُوْدُهَا
البقرۃ:24	تو اگر تم لوگ نہ کر سکو	اور تم لوگ ہرگز نہ کر سکو گے	تو بچو اس آگ سے	جس کا ایندھن

النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ	اُعِدَّتْ	لِلْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۴﴾
انسان اور پتھر ہیں	جو تیار کی گئی ہے	کافروں کیلئے

نوٹ: 1 قرآن مجید اور نبی اکرمؐ کا انکار کرنے والوں کو جو ایک سورۃ بنانے کا چیلنج دیا گیا وہ کئی پہلوؤں سے تھا۔ ایک پہلو تو زبان کی فصاحت و بلاغت تھی۔ یعنی قرآنِ مجید کی زبان کی جو فصاحت اور بلاغت ہے اس جیسی یا اس سے ملتی جلتی کوئی ایک سورۃ بناؤ۔ دوسرا پہلو اس میں یہ بھی تھا کہ قرآنِ مجید انسانی زندگی کے مختلف حصوں کے بارے میں جو راہنمائی اپنی آیات میں پیش کر رہا ہے، اس سے بہتر کوئی ہدایت ہے تو لاؤ۔ ہمارے بزرگوں نے اپنی تفاسیر میں اس پہلو کی طرف بھی اشارہ کیا ہے مثلاً حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ آیتِ مبارکہ کا ترجمہ کرتے ہیں ''اور اگر تم (یہ) نہ کر سکو اور ہرگز نہ کر سکو گے'' پھر حاشیے میں فرماتے ہیں: ''(قیامت تک) اللہ اکبر! کس زور کی تحدی ہے اور وہ بھی ایک اُمّیؐ کی زبان سے اپنی عقل و حکمت، اپنے علوم و فنون پر ناز رکھنے والوں کو کیسا کیسا جوش اُس وقت بھی آیا ہوگا، اور آج بھی آ رہا ہے۔ ع لیکن خدا کی بات جہاں تھی وہیں رہی! کتنے نئے نئے مسلک روز پیدا ہو رہے ہیں، کیسی کیسی 'isms' ہر روز اُٹھ رہی ہیں، اور دنیا کو راہِ نجات دکھانے میں سب کی سب بیکار ہی ثابت ہو رہی ہیں۔ یہ سب گویا قرآن کے جوابات ہی ہیں۔ ہر جواب ناکام اور شرمناک حد تک ناکام!'' (تفسیر ماجدیؒ، ص ۱۵)

نوٹ: 2 ''اَلْحِجَارَۃُ'' کا لفظ اگرچہ عام ہے لیکن موقع کلام سے واضح ہے کہ اس سے مراد وہی تراشے ہوئے پتھر ہیں جن کی دیوی دیوتا کی حیثیت سے پرستش ہوتی ہے۔ ان کو دوزخ میں پھینکنے سے مقصود دراصل ان کو عذاب دینا نہیں بلکہ ان کے پرستاروں کے عذاب میں اضافہ کرنا ہوگا۔ اس طرح ان کو دکھایا جائے گا کہ جن کے آگے وہ دنیا میں ڈنڈوت کرتے رہے ہیں اور جن کی ضیافت کے لیے دودھ اور حلوے پیش کرتے رہے ہیں ان کی یہاں کیا گت بن رہی ہے۔'' (تدبر قرآن، ج ۱، ص ۱۳۹)

آیت: 25

﴿وَ بَشِّرِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِیْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَ اُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ وَ لَهُمْ فِیْهَاۤ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙۗ وَّ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ۲۵﴾

ب ش ر

بَشْرًا اور بَشَرًا (ن۔ض۔س) کھال کو چھیل کر اسے ظاہر کرنا۔ خوش ہونا۔ خوش کرنا۔ (کیونکہ خوشی میں چہرے کی جلد چمک اٹھتی ہے)۔

بُشْرٰی خوشخبری۔ بشارت، جس کو سن کر چہرے پر خوشی کے آثار ظاہر ہو جائیں۔ ﴿فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰی قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ وَ هُدًی وَّ بُشْرٰی لِلْمُؤْمِنِیْنَ ۹۷﴾ (2/البقرۃ:97) ''تو یقیناً انہوں نے یعنی جبرئیلؑ نے نازل کیا اس کو آپ ﷺ کے دل پر اللہ کے حکم سے تصدیق کرنے والا ہوتے ہوئے اس کی جو پہلے سے ہے اور ہدایت اور بشارت ہوتے ہوئے مومنوں کے لئے۔''

بَشِیْرٌ فَعِیْلٌ کا وزن ہے۔ خوش خبری دینے والا۔ ﴿اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا ۙ﴾ (2/البقرۃ:119) ''یقیناً ہم نے بھیجا آپ ﷺ کو حق کے ساتھ بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا ہوتے ہوئے۔''

بَشِیْرَۃٌ ج: بُشْرٌ۔ خوش خبری دینے والی۔ ﴿وَ هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ الرِّیٰحَ بُشْرًۢا بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ ۚ﴾ (25/الفرقان:48) ''اور وہی ہے جو باران رحمت سے پہلے خوش خبری دینے والی ہواؤں کو بھیجتا ہے۔''

بَشَرٌ — اسم ذات ہے۔ انسان۔کھال، جلد۔﴿ قُلۡ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثۡلُکُمۡ ﴾(18 /الکہف:110)’’آپ کہئے کہ کچھ نہیں سوائے اس کے کہ میں ایک بشر ہوں تم لوگوں کی مانند۔‘‘عربی زبان میں بَشَرَۃٌ، انسان کی جلد کی اوپر کی سطح کو کہتے ہیں اسی سے انسان کو بَشَرٌ کہتے ہیں کیونکہ اس کی جلد دوسرے حیوانات کے مقابلے میں اون، بالوں اور پشم وغیرہ سے کافی حد تک صاف ہوتی ہے جس کی وجہ سے جلد زیادہ ظاہر دکھائی دیتی ہے۔ بشر کا لفظ واحد، جمع، مذکر، مؤنث سب کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ البتہ اس کا تثنیہ بَشَرَیۡنِ استعمال ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿ فَقَالُوۡۤا اَنُؤۡمِنُ لِبَشَرَیۡنِ مِثۡلِنَا ﴾ (23 /المومنون:47)’’تو کہنے لگے کیا ہم اپنے جیسے دو شخصوں پر ایمان لائیں۔‘‘بشر کا استعمال اس وقت ہوتا ہے جب انسان کی جسمانی بناوٹ، اس کے ظاہری جسم، اس کے فطری تقاضے، ضروریات اور کمزوریوں کا ذکر کرنا مقصود ہو۔ جیسے اوپر المومنون کی آیت 47 سے واضح ہے۔ اور بشر کے مقابلے میں مَلَکٌ (بمعنی فرشتہ) کا لفظ ہے جو مادی پہلو، یعنی ظاہری جسم اور فطری ضروریات سے پاک ہوتا ہے۔ کفار کا ہمیشہ یہی اعتراض رہا کہ ہم اپنے ہی جیسے ایک بشر جو ہماری طرح پیدا ہوتا ہے اور مرتا ہے، کھاتا پیتا، بازاروں میں چلتا پھرتا اور اپنی ضروریات ہماری طرح ہی پوری کرتا ہے تو اس میں آخر کیا فوقیت ہے کہ اس پر ایمان لایا جائے۔ ہاں اگر کوئی فرشتہ ہوتا، جو ان ضروریات سے پاک ہوتا تو کوئی بات بھی تھی۔ درج ذیل آیات میں اللہ تعالیٰ نے اسی اعتراض کا جواب دیا ہے:﴿ وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنۡ یُّؤۡمِنُوۡۤا اِذۡ جَآءَہُمُ الۡہُدٰۤی اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوۡۤا اَبَعَثَ اللّٰہُ بَشَرًا رَّسُوۡلًا ﴿۹۴﴾ قُلۡ لَّوۡ کَانَ فِی الۡاَرۡضِ مَلٰٓئِکَۃٌ یَّمۡشُوۡنَ مُطۡمَئِنِّیۡنَ لَنَزَّلۡنَا عَلَیۡہِمۡ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَکًا رَّسُوۡلًا ﴿۹۵﴾ ﴾(17 /بنی اسرائیل:94، 95)’’اور جب لوگوں کے پاس ہدایت آ گئی تو ایمان لانے سے اس کے سوا کوئی چیز مانع نہ ہوئی کہ کہنے لگے کہ کیا اللہ نے آدمی کو پیغمبر بنا کے بھیجا ہے۔ آپ کہہ دیجئے کہ اگر فرشتے زمین میں آباد ہوتے جو چلتے پھرتے اور آرام کرتے تو ہم ان کے پاس آسمان سے فرشتہ ہی پیغمبر بنا کر بھیجتے۔‘‘ قرآن مجید میں بشر کا لفظ خاص جلد کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ فرمایا: ﴿ لَوَّاحَۃٌ لِّلۡبَشَرِ ﴿ۚ۲۹﴾ ﴾ (74 /المدثر:29)’’جلد کو جھلسا دینے والی۔‘‘

(افعال) اِبۡشَارًا — خوشخبری حاصل کرنا۔ بشارت لینا۔

اَبۡشِرۡ — ج: اَبۡشِرُوۡا۔ فعل امر ہے۔ تو بشارت لے۔﴿ وَ اَبۡشِرُوۡا بِالۡجَنَّۃِ ﴾(41 /حٰمٓ السجدہ:30)’’اور تم لوگ بشارت لو جنت کی۔‘‘

(تفعیل) تَبۡشِیۡرًا — خوش خبری سنانا۔ بشارت دینا۔ ایسی خوش خبری دینا کہ جس سے سرور پیدا ہو۔ بَشَّرَ۔ یُبَشِّرُ باب تفعیل میں دو مفعول کی طرف متعدی ہوتا ہے۔ جس کو بشارت دی جاتی ہے وہ بِنَفۡسِہٖ (براہِ راست بغیر صلہ کے) آتا ہے۔ اور جو بشارت دی جاتی ہے۔ اس پر کبھی بِ کا صلہ آتا ہے اور کبھی اَنۡ یا اَنَّ آتا ہے۔

بَشِّرۡ — فعل امر ہے۔ تو خوش خبری سنا۔ تو بشارت دے۔﴿ وَ بَشِّرِ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَہُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ ؕ ﴾(2 /البقرۃ:25)’’آپ خوش خبری دے دیجئے اُن لوگوں کو جو ایمان لائے اور اُنہوں نے نیک عمل کیے کہ اُن کے لیے ایسے باغات ہیں جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں۔‘‘ اور قرآن مجید میں یہ جو فرمایا﴿ فَبَشِّرۡہُمۡ بِعَذَابٍ اَلِیۡمٍ ﴿۲۱﴾ ﴾(3 /آل عمران:21)’’تو آپ بشارت دیں اُن لوگوں کو ایک دردناک عذاب کی۔‘‘ تو یہ اس لیے فرمایا کہ تبشیر کا لفظ بطور استعارہ کے کبھی کبھی غصے کے اظہار کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ امام راغبؒ فرماتے ہیں کہ تبشیر کے لفظ سے تنبیہ کی گئی ہے یعنی خبردار کیا گیا ہے اور آگاہ کیا گیا ہے کہ سب سے بہتر خوش خبری جو وہ سن سکتے ہیں وہ عذاب الیم کی ہے جس میں وہ قیامت کے دن مبتلا ہوں گے۔ عذاب کے متعلق بَشِّرۡ کا لفظ بطور تہکم (ڈانٹ) استعمال ہوتا ہے۔

حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ النساء کی آیت 138﴿ بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمَا ﴾ کے تحت فرماتے ہیں: ''تبشیر کے معنی ہمیشہ خوشخبری ہی کے نہیں ہوتے۔ لغت میں عام ہے ہر ایسی خبر کے لیے جس کا اثر چہرہ سے ظاہر ہونے لگے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بشارت یہاں طنز و زجر کے معنی میں ہو۔ اور عرب ایسے موقع پر ایسا ہی استعمال کرتے ہیں۔ اردو میں (بھی) تو طنزیہ موقع پر کہتے ہیں۔ لو، اب اپنا انعام لو۔ اب تو مزہ پایا۔ اب دیکھو اپنا تماشا'' (تفسیر ماجدیؒ ص ۲۵۶) اور صاحبؒ ضیاء القرآن بھی اسی آیت کے تحت فرماتے ہیں: ''بشارت کا عام استعمال تو خوشخبری کے معنی میں ہوتا ہے اور اس عذاب الیم کی خبر کو بشارت سے تعبیر کرنا بطور طنز ہے۔ اور علامہ قرطبیؒ نے لکھا ہے کہ ہر اس اچھی یا بری خبر کو بشارت کہتے ہیں جس کے سننے کے بعد اس کے اثرات چہرہ پر نمایاں ہو جائیں۔'' (ضیاء القرآن، ج ا ص ۴۰)

(مفاعلہ) مُبَاشَرَةً: باہم رہنا سہنا۔ مباشرت کرنا۔ ''مُبَاشَرَةً کے اصل معنی تو ایک کی جلد کو دوسرے کی جلد کے ساتھ ملانا کے ہیں مگر کنایۃً عورت سے مجامعت کرنا کے معنی میں آ جاتا ہے۔'' (مفردات القرآن)

بَاشِرْ: فعل امر ہے۔ تو مباشرت کر۔ ﴿ فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ ﴾ (2/البقرۃ:187) ''تو اب تم لوگ مباشرت کرو ان سے یعنی اپنی بیویوں سے۔''

(استفعال) اِسْتِبْشَارًا: خوش ہونا۔ خوشی منانا۔

اِسْتَبْشِرْ: ج: اِسْتَبْشِرُوْا۔ فعل امر ہے۔ تو خوش ہو جا۔ تو خوشی منا۔ ﴿ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمْ ﴾ (9/التوبۃ:111) ''پس تم لوگ خوشی مناؤ اپنے سودے کی۔''

مُسْتَبْشِرٌ: اسم الفاعل ہے۔ خوشی منانے والا۔ ﴿ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ﴾ (80/عبس:39) ''ہشاش بشاش اور خوش وخرم ہوں گے۔''

اٰمَنُوْا (ء م ن): البقرۃ آیت 3 دیکھیں۔

ع م ل

(س) عَمَلًا: کام کرنا۔ عمل ہر اس فعل کو کہتے ہیں جو کسی جاندار سے ارادۃً صادر ہو۔ عمل کا لفظ فعل سے خاص ہے۔ کیونکہ فعل کا لفظ حیوانات اور کبھی جمادات کی طرف بھی منسوب ہو جاتا ہے مگر عمل کا لفظ ان کی طرف بہت کم منسوب ہوتا ہے۔ عمل کا لفظ اچھے اور برے دونوں قسم کے افعال پر بولا جاتا ہے۔ ﴿ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ﴾ (2/البقرۃ:62) ''جو ایمان لایا اللہ پر اور آخری دن پر اور اُس نے نیک عمل کیا تو اُس کا اجر ہے اُس کے رب کے پاس۔'' اور برے کام کے لیے فرمایا: ﴿ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ ﴾ (4/النساء:123) ''جو بھی بُرائی کرے گا اُس کی جزا پائے گا۔''

عَمَلٌ: ج: اَعْمَالٌ۔ اسم ذات بھی ہے۔ کام۔ ﴿ فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّىْ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ﴾ (3/آل عمران:195) ''پس اُن کے رب نے اُن کی دعا قبول فرمائی کہ تم میں سے کسی کام کرنے والے کے کام کو خواہ وہ مرد ہو یا عورت میں ہرگز ضائع نہیں کرتا۔'' ﴿ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ﴾ (11/ھود:46) ''اس کے کام بالکل ہی ناشائستہ ہیں۔'' ﴿ وَلَهُمْ اَعْمَالٌ مِّنْ دُوْنِ ذٰلِكَ هُمْ لَهَا عٰمِلُوْنَ ﴾ (23/المومنون:63) ''اور اُن کے لیے اُس کے سوا بھی بہت سے اعمال ہیں جنہیں وہ کرنے والے ہیں۔''

اِعْمَلْ — ج: اِعْمَلُوْا۔ فعل امر ہے۔ تو کر۔ ﴿ فَاعْمَلْ اِنَّنَا عٰمِلُوْنَ ۝ ﴾ (41/حم السجدۃ:5) ''پس تو کر بے شک ہم بھی کرنے والے ہیں۔'' ﴿ قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّىْ عَامِلٌ ۚ ﴾ (6/الانعام:135) ''آپ ؐ کہہ دیجئے اے میری قوم تم اپنی جگہ پر عمل کرتے رہو بے شک میں بھی عمل کرنے والا ہوں۔''

عَامِلٌ — ج: عَامِلُوْنَ۔ عَامِلِيْنَ۔ کام کرنے والا۔ ﴿ فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّىْ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ ﴾ (3/آل عمران:195) ''پس اُن کے رب نے اُن کی دعا قبول فرمالی کہ تم میں سے کسی کام کرنے والے کے کام کو خواہ وہ مرد ہو یا عورت میں ہرگز ضائع نہیں کرتا۔'' ﴿ وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ۝ ﴾ (3/آل عمران:136) ''کتنا اچھا ہے بدلہ نیک عمل کرنے والوں کا۔'' ﴿ اِنَّا عٰمِلُوْنَ ۝ ﴾ (11/ھود:121) ''بے شک ہم بھی عمل کرنے والے ہیں۔''

عَامِلَةٌ — ج: عَامِلَاتٌ اور عَوَامِلُ۔ کام کرنے والی۔ ﴿ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ۝ ﴾ (88/الغاشیۃ:3) ''اور محنت کرنے والے تھکے ہوئے ہوں گے۔''

اَلصّٰلِحٰتِ (ص ل ح): البقرۃ آیت 11 دیکھیں۔

ج ن ن

(ن) (ا) جَنًّا — کسی چیز کو ڈھانپ کر چھپا دینا کہ وہ نظروں سے اوجھل ہو جائے۔ ڈھانپنا۔ چھپا دینا۔ ﴿ فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ ﴾ (6/الانعام:76) ''تو جب ڈھانپ دیا اس کو رات نے، اس نے دیکھا ایک تارا۔'' اس مصدر سے جِنٌّ (جن)، جِنَّةٌ (دیوانگی)، جُنَّةٌ (ڈھال)، جَنَّةٌ (جنت) مشتق ہیں۔

(ب) جُنُوْنًا — چھپی ہوئی عقل والا ہونا۔ دیوانہ ہونا۔

جِنٌّ — اسم ذات ہے۔ جن۔ انسانوں اور فرشتوں کے علاوہ ایک مخلوق جو آگ سے بنائی گئی اور ان کو جن اس لیے کہتے ہیں کہ یہ مخلوق ہم سے چھپی ہوئی ہے۔ ہماری طرح یہ بھی احکام شرعیہ کے مکلف ہیں ان میں توالد و تناسل کا سلسلہ بھی ہے اور نیک و بد بھی ہیں۔ ﴿ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ۭ ﴾ (18/الکھف:50) ''تو ان لوگوں نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے، وہ تھا جنوں میں سے تو وہ نکلا یعنی اس نے خلاف ورزی کی اپنے رب کے حکم کی۔''

جَآنٌّ — فَاعِلٌ کا وزن ہے۔ لیکن یہ لفظ زیادہ تر جن کے اسم جمع کے طور پر اور سانپ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ جس طرح ابوالبشر کا نام آدم ہے اسی طرح ابوالجن کا نام اَلْجَآنُّ ہے۔ صاحبؒ ضیاء القرآن فرماتے ہیں: ''جآنّ جنوں کے پہلے باپ کا نام ہے۔ جس طرح آدمؑ کی تخلیق مٹی سے ہوئی اسی طرح جآنّ کی تخلیق خالص آگ سے ہوئی۔ پھر جنوں کی نسل کو چلانے کے لیے ازدواج کا وہی نظام یہاں بھی جاری ہے جو انسانوں میں ہے۔'' (ضیاء القرآن، ج۵ص۷۰)۔ ﴿ وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ ۝ ﴾ (55/الرحمٰن:15) ''اور اس نے پیدا کیا جنوں کو آگ کی لو سے۔'' ﴿ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا ﴾ (28/القصص:31) ''تو جب اس نے دیکھا اس کو لہراتا ہوا گویا کہ وہ سانپ ہے تو وہ چلا پیٹھ پھیر کر۔''

جِنَّةٌ — اسم ذات ہے۔ جن۔ دیوانگی، چونکہ دیوانگی عقل کو چھپا دیتی ہے اس لیے اسے جِنَّةٌ کہتے ہیں۔ ﴿ الَّذِىْ يُوَسْوِسُ فِىْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۝ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ۝ ﴾ (114/الناس:5-6) ''جو وسوسہ اندازی کرتا ہے لوگوں کے سینوں میں، جنات اور انسانوں میں سے۔'' ﴿ مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ ۭ ﴾ (7/الاعراف:184) ''نہیں ہے ان کے صاحب کو کسی

قسم کی کوئی دیوانگی۔''

جُنَّةٌ ڈھال۔ کیونکہ اس سے انسان اپنے آپ کو چھپاتا ہے۔﴿ اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً ﴾(63/المنافقون:2)''اُنہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے۔''

جَنَّةٌ ج: جَنّٰتٌ۔ اسم ذات ہے۔ بہشت۔ جنت۔ درختوں والا ہر وہ باغ جس کے درخت زمین کو چھپالیں جنت کہلاتا ہے۔ اصطلاح شرع میں مراد وہ عظیم الشان باغ ہے جو بے شمار نعمتیں لیے ہوئے عالم آخرت میں نیک لوگوں کے لیے مخصوص ہے اور آج نظروں سے پوشیدہ ہے۔ امام راغبؒ فرماتے ہیں: ''بہشت کو جنت یا تو دنیوی باغات سے تشبیہ دے کر کہا گیا ہے، اگرچہ دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے اور یا اس لیے کہ بہشت کی نعمتیں ہم سے مخفی رکھی گئی ہیں جیسے سورہ السجدہ کی آیت 17 میں فرمایا:﴿ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ﴾''کوئی متنفس نہیں جانتا کہ اُن کے لیے کیسی آنکھوں کی ٹھنڈک چھپا رکھی گئی ہے۔'' حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جَنّٰتٍ جمع لانے کی وجہ یہ ہے کہ بہشت سات ہیں۔(۱) جَنَّةُ الْفِرْدوس (۲) جَنَّةُ عَدْنٍ (۳) جَنَّةُ النعیم۔ (۴) دَارُ الْخُلْدِ (۵) جَنَّةُ الْمَاْوٰی (۶) دَارُ السَّلَام (۷) عِلِّيِّيْن (بحوالہ مفردات القرآن، ج۱، ص ۱۹۴)۔﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ﴾ (2/البقرہ:82)''اور جو لوگ ایمان لائے اور عمل کیے نیک، وہ لوگ جنت والے ہیں۔''﴿ وَ مَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ﴾(9/التوبۃ:72)''اور پاکیزہ ٹھکانوں کا عدن کے باغات میں۔''

مَجْنُوْنٌ مَفْعُوْلٌ کا وزن ہے۔ اسم صفت کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ دیوانہ، پاگل۔﴿ اَئِنَّا لَتَارِكُوْٓا اٰلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ ﴾(37/الصافات:36)''کیا ہم چھوڑ دیں اپنے خداؤں کو ایک دیوانے شاعر کے لئے۔''

جَنِيْنٌ فَعِيْلٌ کا وزن ہے۔ فَعِيْلٌ کا وزن فاعل اور مفعول، دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ جَنِيْنٌ اگر مفعول کے معنوں میں ہو تو مراد ہوتا ہے چھپایا ہوا، ڈھانپا ہوا اور پھر اس سے وہ بچہ مراد ہوتا ہے جو ماں کے پیٹ میں ہو۔ اس صورت میں اس کی جمع اَجِنَّةٌ آتی ہے۔ جیسے فرمایا:﴿ وَاِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ ﴾(53/النجم:32) ''اور وہ وقت یاد کرو جب تم اپنی ماؤں کے پیٹ میں بچے تھے۔'' جَنِيْنٌ اگر فاعل کے معنی میں ہو تو مراد ہوتی ہے چھپانے والی۔ اور اس صورت میں یہ لفظ قبر کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ (واللہ اعلم)۔

ج ر ی

(ض) **جَرْيًا** بہنا۔ جاری ہونا۔ چلنا۔ تیزی سے گزر جانا (لازم)۔﴿ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ﴾(2/البقرۃ:25)''اور آپ خوشخبری دے دیجئے اُن لوگوں کو جو ایمان لائے اور اُنہوں نے نیک عمل کیے کہ اُن کے لیے ایسے باغات ہیں بہتی ہیں جن کے نیچے نہریں۔'' جَرٰی يَجْرِيْ کے ساتھ جب ''ب'' کا صلہ استعمال ہو تو مطلب ہوتا ہے لے کر چلنا۔ لے جانا۔﴿ وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ ﴾ (2:البقرۃ164)''اور کشتیوں کا لوگوں کو نفع دینے والی چیزوں کو لیے ہوئے سمندروں میں چلنا۔''

جَارٍ اسم الفاعل ہے۔ مذکر۔ بہنے والا۔

جَارِيَةٌ
ج: جَارِيَاتٌ اور جَوَارٍ- اسم الفاعل ہے۔ مؤنث۔ بہنے والی۔ کشتی۔﴿ فِيهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ ﴾(88/الغاشیہ:12) ''اس میں ہے بہنے والا چشمہ۔'' ﴿ اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَآءُ حَمَلْنٰكُمْ فِي الْجَارِيَةِ ﴾(69/الحاقۃ:11) ''بیشک جب پانی اونچا ہوا تو ہم نے سوار کیا تم لوگوں کو کشتی میں۔''﴿ وَ مِنْ اٰيٰتِهِ الْجَوَارِ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ ﴾ (42/الشوریٰ:32) ''اور اس کی نشانیوں میں سے کشتیاں ہیں سمندر میں پہاڑیوں کی مانند۔'' ﴿ فَالْجٰرِيٰتِ يُسْرًا ﴾ (51/الزاریات:3) ''پھر نرمی سے چلنے والی کشتیوں کی۔''

مَجْرٍ
مَفْعِلٌ کا وزن ہے۔(1) اسم الظرفِ زمان ہے، مطلب ہے بہنے کا وقت۔(2) اسم الظرفِ مکان ہے، مطلب ہے بہنے کی جگہ۔(3) مصدر میمی ہے، مطلب ہے بہنا یا چلنا۔﴿ وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا ﴾ (11/ھود:41) ''اور نوحؑ نے کہا آؤ اس میں سوار ہو جاؤ اللہ ہی کے نام سے اس کا چلنا ہے اور اس کا ٹھہرنا۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔ اس آیت کے حاشیے میں حضرت مولانا عبدالماجد دریا بادیؒ فرماتے ہیں: ''مَجْرٖىهَا عربی تلفظ میں ی کی آواز صرف یا معروف کی ہے چنانچہ قرآن مجید کے قاری بھی ہر جگہ اس قاعدہ کا لحاظ رکھتے ہیں۔ لیکن اس خاص موقع پر مجری کی ی کی آواز یائے مجہول کی نکلے گی اور اسے بجائے ''مجری'' کے ''مجرے'' ہی پڑھا جائے گا۔'' اس آیت کے تحت صاحبؒ ضیاء القرآن فرماتے ہیں: ''مجری و مرسی ظرف زمان اور ظرف مکان دونوں ہو سکتے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کا نام لیتا ہوں کشتی چلنے کے وقت اور اس کے ساحل پر لنگر انداز ہونے کے وقت۔ یا اس جگہ اللہ تعالیٰ کا نام لیتا ہوں جہاں وہ چلتی ہے اور جہاں وہ رکتی ہے یا یہ دونوں مصدر میمی ہیں یہاں پھر مضاف (وقت) محذوف ماننا پڑے گا۔ ای وقت جریھا و وقت ارسائھا۔'' (ضیاء القرآن، ج۲،ص ۳۶۲)

تَحْتَ

ج: تُحُوْتٌ۔ نیچے۔ اسم ظرف مکان ہے۔ یہ فوق (اوپر) کی ضد ہے۔ اس لفظ کے لیے اضافت لازم ہے اور جب مضاف الیہ محذوف ہو تو مبنی بر ضمہ استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے﴿ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ﴾(المائدۃ:66) ''تو وہ ضرور کھاتے اپنے اوپر سے بھی اور اپنے پاؤں کے نیچے سے بھی۔'' ﴿ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ﴾ (البقرۃ:25) ''(نعمت کے) باغ میں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں۔'' حدیث میں ہے لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى يَظْهَرَ التُّحُوْتُ کہ قیامت قائم نہیں ہوگی تاوقتیکہ کمینے لوگ غلبہ حاصل نہ کرلیں۔'' (تلخیص از مفردات القرآن)۔ تحت اور اسفل میں فرق یہ ہے کہ تحت اس چیز کو کہتے ہیں جو دوسری کے نیچے ہو مگر اسفل کسی چیز کے نچلے حصے کو کہتے ہیں جیسے اَلْمَالُ تَحْتَهٗ (مال اس کے نیچے ہے)۔ اَسْفَلُهٗ اَغْلَظُ مِنْ اَعْلَاهُ (اس کا نچلا حصہ اعلیٰ حصہ سے سخت ہے)۔

ن ھ ر

(ف) نَهَرًا
کسی کو جھڑکنا۔ پانی کا اپنے بہنے کے لئے راستہ بنانا۔

لَا تَنْهَرْ
فعل نہی ہے۔ تو مت جھڑک۔﴿ فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا ﴾(17/بنی اسرائیل:23) ''تو تم مت کہو ان دونوں سے اُف تک اور تم مت جھڑکو ان دونوں کو۔''

نَهَرٌ
ج: اَنْهَارٌ- اسم ذات ہے۔ دریا۔ نہر۔﴿ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ ﴾(2/البقرۃ:249) ''بیشک اللہ تم لوگوں کو آزمانے والا ہے ایک نہر سے۔''﴿ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا ﴾(71/نوح:12) ''اور وہ بنادے گا تمہارے لئے باغات اور وہ بنادے گا تمہارے لئے نہریں۔''

نَهَارٌ
اسم ذات ہے۔ دن۔﴿ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ ﴾(2/البقرۃ:274) ''جو لوگ خیرات کرتے ہیں اپنے مال رات میں اور دن میں۔''

كُلَّمَا: البقرۃ آیت 20 دیکھیں۔ رُزِقُوْا اور متعلقہ صیغے (ر ز ق): البقرۃ آیت 3 دیکھیں۔
ثَمَرَةٌ (ث م ر): البقرۃ آیت 22 دیکھیں۔ قَبْلُ: البقرۃ آیت 4 دیکھیں۔ اُتُوْا (ء ت ی): البقرۃ آیت 23 دیکھیں۔

ش ب ہ

ثلاثی مجرد سے فعل استعمال نہیں ہوتا۔

(تفعیل) تَشْبِيْهًا (1) کسی چیز کو کسی چیز کے مانند کرنا۔ ملتا جلتا کرنا۔ (2) شبہ یا شک میں ڈالنا (اتنا ملتا جلتا کرنا کہ فرق مشکل ہو جائے)

شُبِّهَ ماضی مجہول ہے۔ مانند کیا گیا۔ مشکوک کیا گیا۔ ﴿وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ؕ﴾ (4/النساء:157) ''اور انہوں نے انؑ کو قتل نہیں کیا اور نہ ہی انہوں نے انؑ کو سولی چڑھایا لیکن اُن پر شبہ ڈال دیا گیا۔''

(تفاعل) تَشَابُهًا ایک دوسرے کے مانند ہونا۔ ﴿اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا ؕ﴾ (2/البقرہ:70) ''بیشک تمام گائیں باہم ملتی جلتی ہوئیں ہم پر۔''

مُتَشَابِهٌ اسم الفاعل ہے۔ باہم مانند ہونے والا۔ ﴿وَّ الزَّيْتُوْنَ وَ الرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّ غَيْرَ مُتَشَابِهٍ ؕ﴾ (6/الانعام:99) ''اور زیتون اور انار، ملتے جلتے ہونے والے اور باہم مانند نہ ہونے والے۔'' اور آیت زیر مطالعہ۔

(افتعال) اِشْتِبَاهًا کسی کے مانند ہونا۔

مُشْتَبِهٌ اسم الفاعل ہے۔ کسی کے مانند ہونے والا۔ ﴿وَّ الزَّيْتُوْنَ وَ الرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّ غَيْرَ مُتَشَابِهٍ ؕ﴾ (6/الانعام:99) ''اور زیتون اور انار، ملتے جلتے ہونے والے اور باہم مانند نہ ہونے والے۔''

ز و ج

(ن) زَوْجًا بھڑکانا۔ ملانا۔

زَوْجٌ ج: اَزْوَاجٌ۔ اسم ذات ہے۔ بہت وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

(1) جوڑا اور جوڑے کا ہر فرد۔ جن حیوانات میں نر اور مادہ ہوتے ہیں ان میں سے ہر ایک دوسرے کا زوج ہے۔ مثلاً شوہر، بیوی کا زوج ہے اور بیوی، شوہر کی زوج ہے۔ اور میاں بیوی دونوں مل کر بھی ایک زوج ہیں۔ عورت کے لیے فرمایا: ﴿وَقُلْنَا يٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ﴾ (البقرۃ:35) ''اور ہم نے کہا اے آدمؑ آپ اور آپ کی بیوی جنت میں رہیں۔'' اور مرد کے لیے فرمایا: ﴿قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا﴾ (المجادلہ:1) ''یقیناً اللہ نے سُن لی اُس عورت کی بات جو اپنے شوہر کے معاملہ میں آپؐ سے تکرار کر رہی تھی۔'' عام طور پر بیوی کو زَوْجَةٌ (ۃ کے ساتھ) بھی کہہ دیتے ہیں۔

(2) حیوانات کے علاوہ دوسری چیزوں میں سے جفت (دو چیزوں) کو زوج کہا جاتا ہے۔ جیسے موزے اور جوتے وغیرہ۔

(3) بہت سے درختوں میں بھی نر و مادہ ہوتے ہیں ان کو اس مناسبت سے بھی زوج کہا جا سکتا ہے اور کبھی لفظ زوج ''ایک خاص قسم'' کے معنی میں بھی آتا ہے۔ اس معنی کے لحاظ سے درختوں کی ہر قسم کو زوج کہا جا سکتا ہے۔ مثلاً ﴿اَوَ لَمْ يَرَوْا اِلَى الْاَرْضِ كَمْ اَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ ۝﴾ (الشعراء:7) ''کیا نہیں دیکھتے وہ زمین کو کتنی اگائیں ہم نے

اُس میں ہر ایک قسم کی خاصی چیزیں۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ) ''کیا اُنہوں نے زمین کو نہیں دیکھا کہ ہم نے اُس میں کس قدر بوٹیاں عمدہ عمدہ قسم کی اگائی ہیں۔'' (ترجمہ ماجدیؒ) ''کیا اُنہوں نے زمین پر نظریں نہیں ڈالی کہ ہم نے اُس میں ہر طرح کے نفیس جوڑے کس قدر اگائے ہیں۔'' (ترجمہ احسن البیان) ﴿فَاَخۡرَجۡنَا بِهٖۤ اَزۡوَاجًا مِّنۡ نَّبَاتٍ شَتّٰى ۝﴾ (طٰہٰ:53) ''پھر نکالی ہم نے اُس سے طرح طرح کی سبزی۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ) ''پھر ہم نے اُس کے ذریعے سے مختلف قسم کے طرح طرح کے نباتات پیدا کیے۔'' (ترجمہ ماجدیؒ) ''پھر اُس برسات کی وجہ سے مختلف قسم کی پیداوار بھی ہم ہی پیدا کرتے ہیں۔'' (ترجمہ احسن البیان)

(4) کبھی زوج سے مراد ''ساتھی'' ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا ﴿اُحۡشُرُوا الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا وَ اَزۡوَاجَهُمۡ وَ مَا كَانُوۡا يَعۡبُدُوۡنَ ۝﴾ (37/ الصّٰفّٰت:22) ''جمع کرلو مشرکوں اور اُن کے ہم مشربوں کو اور ان کو جن کی وہ عبادت اللہ کو چھوڑ کر کیا کرتے تھے۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔ اس آیت کے حاشیے میں حضرتؒ لکھتے ہیں: ''زوج کے لفظی معنی ساتھی یا مقارن کے ہیں۔ یہاں ازواج بیویوں کے معنی میں نہیں بلکہ رفیقوں، ہم مشربوں کے مرادف ہے۔'' امام راغبؒ نے بھی اس آیت میں ازواج سے ساتھی مراد لیے ہیں۔ شاہ عبداللہ القادر دہلویؒ نے بھی آیت کریمہ میں ازواج کا ترجمہ ''ساتھیوں'' سے کیا ہے۔

(5) کبھی زوج سے مراد ''قسم'' یا ''گروہ'' ہوتا ہے۔ (جیسے اوپر نمبر 3 میں بھی بیان ہوا) ﴿وَّ كُنۡتُمۡ اَزۡوَاجًا ثَلٰثَةً ۝﴾ (56/ واقعہ:7) ''اور تم تین قسم کے ہو جاؤ گے۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔ حاشیے میں حضرتؒ فرماتے ہیں: ''زوج یہاں صِنف یا قسم کے معنی میں ہے۔'' یا فرمایا: ﴿وَلَا تَمُدَّنَّ عَيۡنَيۡكَ اِلٰى مَا مَتَّعۡنَا بِهٖۤ اَزۡوَاجًا مِّنۡهُمۡ زَهۡرَةَ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ۙ﴾ (طٰہٰ:131) ''اور اپنی نگاہیں ہرگز اُن چیزوں کی طرف نہ دوڑانا جو ہم نے اُن میں سے مختلف لوگوں کو آرائش دنیا کی دے رکھی ہیں۔'' (ترجمہ احسن البیان)۔ اس آیت کے حاشیے میں بھی حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ فرماتے ہیں: ''اَزۡوَاجًا مِّنۡهُمۡ سے مراد کافروں کی مختلف قسمیں ہیں۔ مثلاً یہود، نصاریٰ، مشرکین وغیرہا۔''

(6) زوج کا تثنیہ (زوجان، زوجین) جب استعمال ہو تو اس سے بھی مختلف معنی مراد لیے جاتے ہیں مثلاً (ا) کبھی اس سے ایک ہی جوڑے کے دونوں فرد، نر اور مادہ مراد ہوتے ہیں مثلاً: ﴿قُلۡنَا احۡمِلۡ فِيۡهَا مِنۡ كُلٍّ زَوۡجَيۡنِ اثۡنَيۡنِ﴾ (ھود:40) ''تو ہم نے نوحؑ کو فرمایا سوار کرلو کشتی میں ہر جنس سے نر اور مادہ دو۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔ پیر کرم شاہ صاحبؒ اس آیت کے حاشیے میں فرماتے ہیں: ''زوج جوڑے کے ہر فرد کو بھی کہتے ہیں جس طرح عورت کو بھی زوج کہا جاتا ہے اور مرد کو بھی زوج۔ قرآن کریم میں ہے ﴿وَّ خَلَقَ مِنۡهَا زَوۡجَهَا﴾ اس سے اس کا زوج پیدا کیا۔ اس لیے زوجین جب تثنیہ ہوگا تو اس سے جوڑے کے دونوں فرد نر اور مادہ مراد ہوں گے قرآن مجید میں ہے ﴿وَ اَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوۡجَيۡنِ الذَّكَرَ وَ الۡاُنۡثٰى ۙ﴾ اس نے زوجین یعنی نر اور مادہ پیدا کیے۔ (ضیاء القرآن، ج ۲، ص ۳۶۰) (ب) کبھی اس سے ''مقابل کی چیزیں'' مراد ہوتی ہیں۔ مثلاً ﴿وَمِنۡ كُلِّ شَىۡءٍ خَلَقۡنَا زَوۡجَيۡنِ لَعَلَّكُمۡ تَذَكَّرُوۡنَ ۝﴾ (الذاریات:49) ''اور ہم نے ہر چیز کو دو دو قسم کی بنایا تاکہ تم سمجھو۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔ حاشیے میں حضرتؒ فرماتے ہیں: ''زَوۡجَيۡنِ سے یہاں مراد مقابل کی چیزیں ہیں۔ مثلاً گرمی سردی، جوہر عرض، آسمان زمین، پستی بلندی، بڑی چھوٹی، الٹی سیدھی، وحدت کثرت، نور ظلمت و قس علیٰ ہذا۔ کائنات بھری پڑی ہے ایسی ہی اضداد یا متقابلات سے۔'' حضرت شیخ الہندؒ اس آیت کا ترجمہ کرتے ہیں: ''اور ہر چیز کے بنائے ہم نے جوڑے تاکہ تم دھیان کرو۔'' حاشیے میں حضرتؒ فرماتے ہیں: ''یعنی نر اور مادہ، جیسا کہ

ابن زید نے کہا۔ اور آج جدید حکماء اس کا اعتراف کر رہے ہیں کہ ہر ایک نوع میں نر اور مادہ کی تقسیم پائی جاتی ہے اور یا زوجین سے متقابل ومتضاد چیزیں مراد ہیں۔ مثلاً رات دن، زمین آسمان، اندھیرا اُجالا، سیاہی سفیدی، صحت ومرض، کفر وایمان وغیرذٰلک۔'' (ج) اور کبھی اس سے مراد ''دو قسمیں'' ہوتا ہے۔ مثلاً ﴿ فِيهِمَا مِن كُلِّ فَاكِهَةٍ زَوْجَانِ ﴾ (الرحمٰن:52) ''اور ان باغوں میں ہر میوہ کی دو دو قسمیں ہوں گی۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)

(7) قرآن مجید میں یہ لفظ اپنے ان تمام مفاہیم کے مجموعے کے ساتھ بھی استعمال ہوا ہے۔ مثلاً ﴿ وَالَّذِي خَلَقَ الْأَزْوَاجَ كُلَّهَا ﴾ (الزخرف:12) ''اور جس نے بنائے سب چیز کے جوڑے۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)۔ حاشیے میں حضرتؒ فرماتے ہیں: ''یعنی دنیا میں جتنی چیزوں کے جوڑے ہیں اور مخلوق کی جتنی قسمیں اور متماثل یا متقابل انواع ہیں سب کو اللہ ہی نے پیدا کیا۔'' صاحبؒ احسن البیان اس آیت کے حاشیے میں فرماتے ہیں: ''یعنی ہر چیز کو جوڑا جوڑا بنایا، نر اور مادہ، نباتات، کھیتاں، پھل، پھول اور حیوانات سب میں نر اور مادہ کا سلسلہ ہے۔ بعض کہتے ہیں اس سے مراد ایک دوسرے کی مخالف چیزیں ہیں جیسے روشنی اور اندھیرا، مرض اور صحت، انصاف اور ظلم، خیر اور شر، ایمان اور کفر، نرمی اور سختی وغیرہ۔ بعض کہتے ہیں ازواج، اصناف کے معنی میں ہے۔ تمام انواع واقسام کا خالق اللہ ہے۔''

(تفعیل) تَزْوِيجًا (1) کسی کو کسی کا جوڑا بنانا۔ نکاح کر دینا۔ ﴿ زَوَّجْنَاكَهَا لِكَيْ لَا يَكُونَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ حَرَجٌ فِي أَزْوَاجِ أَدْعِيَائِهِمْ ﴾ (33/الاحزاب:37) ''ہم نے جوڑا بنایا آپ ﷺ کا اس کو، تاکہ نہ رہے مومنوں پر کوئی گناہ اپنے منہ بولوں کی بیویوں میں۔''

(2) ساتھی بنا دینا۔ اکٹھا کر دینا۔ جمع کر دینا۔ ﴿ يَهَبُ لِمَن يَشَاءُ إِنَاثًا وَيَهَبُ لِمَن يَشَاءُ الذُّكُورَ ۝ أَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَإِنَاثًا ﴾ (42/الشوریٰ:50) ''جس کو چاہتا ہے بیٹیاں دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے بیٹے دیتا ہے یا اُنہیں جمع کر دیتا ہے بیٹے بھی اور بیٹیاں بھی۔'' اس آیت مبارکہ میں یُزَوِّجُ کا معنی ہے جمع کر دینا، اکٹھا کر دینا۔ اور اسی طرح فرمایا ﴿ وَإِذَا النُّفُوسُ زُوِّجَتْ ﴾ (81/التکویر:7) ''اور جب جانیں جسموں سے ملا دی جائیں گی۔''

ط ھ ر

(ن-ک) طُهْرًا اور طَهَارَةً پاک ہونا۔ ﴿ وَلَا تَقْرَبُوهُنَّ حَتَّىٰ يَطْهُرْنَ ﴾ (2/البقرہ:222) ''اور ان سے قربت مت کرو یہاں تک کہ وہ پاک ہو جائیں۔''

(ف) طَهْرًا گندگی دور کرنا۔ پاک کرنا۔

طَهُورٌ فَعُولٌ کے وزن پر اسم المبالغہ ہے۔ پاک کرنے والا۔ بہت پاک کیا ہوا۔ ﴿ وَسَقَاهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُورًا ﴾ (76/الدہر:21) ''اور پلائے گا ان کو، ان کا رب نہایت پاکیزہ شراب۔'' حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں: ''طہور کا لفظ عربی زبان میں مبالغہ کا صیغہ ہے۔ طہور اس کو کہا جاتا ہے جو خود بھی پاک ہو اور دوسری چیزوں کو بھی اس سے پاک کیا جا سکے۔'' (معارف القرآن، ج۶ ص ۴۸۴)۔ ﴿ وَأَنزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً طَهُورًا ﴾ (25/الفرقان:48) ''اور ہم آسمان سے پاک پانی برساتے ہیں۔'' اس آیت میں طہور کی وضاحت کرتے ہوئے امام راغبؒ فرماتے ہیں: ''لفظ طہور معنوی اعتبار سے تطہیر کو چاہتا ہے۔ کیونکہ طاہر (پاکیزہ) دو قسم پر ہوتا ہے ایک وہ جو خود تو پاک ہو مگر دوسری چیز کو بھی پاک کرنے کی اس میں صلاحیت نہ ہو جیسے کپڑا کہ گو یہ پاک ہے مگر دوسری چیز کو پاک نہیں کر سکتا۔ دوم وہ جو خود بھی پاک ہو اور دوسری چیز کو بھی پاک کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو جیسے پانی چنانچہ قرآن پاک نے پانی کو طہور کہہ کر اس

معنی کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔'' (مفردات القرآن، ج ۲، ص ۶۳۹)۔صاحبِ احسن البیان فرماتے ہیں: ''طَهُوْرٌ (بِفَتْحِ الطَّاءِ) فعول کے وزن پر آلے کے معنی میں ہے یعنی ایسی چیز جس سے پاکیزگی حاصل کی جاتی ہے۔جیسے وضو کے پانی کو وضو اور ایندھن کو وقود کہا جاتا ہے، اس معنی میں پانی طَاهِرٌ (خود بھی پاک) اور مُطَهِّرٌ (دوسروں کو پاک کرنے والا) بھی ہے۔حدیث میں بھی ہے ((اِنَّ الْمَآءَ طَهُوْرٌ لَا يُنَجِّسُهُ شَیْءٌ)) (ابوداود، ترمذی وغیرہ) ''پانی پاک ہے، اسے کوئی چیز ناپاک نہیں کرتی۔'' ہاں اگر اس کا رنگ یا بو یا ذائقہ بدل جائے تو ایسا پانی ناپاک ہے۔کما فی الحدیث۔'' (تفسیر احسن البیان، ص ۱۰۰۵)۔حدیث میں مٹی اور زمین کو بھی طهور کہا گیا ہے۔(مظاہر حق جدید ج ۱ ص ۳۸۵)

اَطْهَرُ — افعل التفضیل کا صیغہ ہے۔زیادہ پاک۔﴿ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَ اَطْهَرُ ؕ﴾ (2/البقرۃ:232) ''اس میں تمہاری بہترین صفائی اور پاکیزگی ہے۔''

(تفعیل) تَطْهِيْرًا — پاک کرنا۔کثرت سے یا بار بار پاک کرنا۔یہ لفظ ظاہری اور باطنی دونوں طرح کی نجاستوں سے پاکیزگی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔مثلاً: ظاہری نجاست کو دور کرنے کے لیے فرمایا: ﴿وَ رَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝۳ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۝۴﴾ (74/المدثر:3،4) ''اور اپنے پروردگار کی بڑھائی کرو اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھو۔'' اور باطنی برائیوں کو صاف کرنے کے لیے فرمایا: ﴿اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَ يُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ۝۳۳﴾ (33/الاحزاب:33) ''اے (پیغمبرؐ کے) اہل بیت! اللہ چاہتا ہے کہ تم سے ناپاکی کو دور کر دے اور تمہیں بالکل پاک صاف کر دے جیسا کہ پاکیزگی کا حق ہے۔''

طَهِّرْ — فعل امر ہے۔تو پاک کر۔تو پاک رکھ۔﴿وَّ طَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ﴾ (22/الحج:26) ''اور پاک رکھ میرے گھر کو طواف کرنے والوں کیلئے۔''

مُطَهِّرٌ — اسم الفاعل ہے۔پاک کرنے والا۔﴿وَ رَافِعُكَ اِلَيَّ وَ مُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ (3/آل عمران:55) ''اور میں اٹھانے والا ہوں آپؑ کو اپنی طرف اور پاک کرنے والا ہوں آپؑ کو ان سے جنہوں نے انکار کیا۔''

مُطَهَّرٌ — ج: مُطَهَّرُوْنَ۔اسم المفعول ہے۔مذکر۔خوب پاک کیا ہوا۔﴿لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۝۷۹﴾ (56/الواقعۃ:79) ''نہیں چھو سکتے اُس کو مگر پاک لوگ۔''

مُطَهَّرَةٌ — اسم المفعول ہے۔مؤنث۔خوب پاک کی ہوئی۔﴿وَلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙ﴾ (2/البقرۃ:25) ''اور اُن کے لیے بیویاں ہیں صاف ستھری۔''

(تفعّل) تَطَهُّرًا — کوشش کر کے خود کو پاک کرنا۔پاک ہونا۔پاک رہنا۔﴿فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ؕ﴾ (9/توبہ:108) ''اس میں ایسے لوگ ہیں جو پسند کرتے ہیں کہ پاک رہیں۔''

اِطَّهَّرْ — ج: اِطَّهَّرُوْا۔فعل امر ہے۔خود کو پاک کر۔پاک ہو۔﴿وَ اِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا ؕ﴾ (5/المائدہ:6) ''اور اگر تم لوگ ہو ناپاک تو خود کو پاک کرو۔''

مُتَطَهِّرٌ اور مُطَّهِّرٌ — ج: مُتَطَهِّرُوْنَ اور مُطَّهِّرُوْنَ۔اسم الفاعل ہے۔پاک ہونے والا۔خود کو پاک رکھنے والا۔﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَ يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ۝۲۲۲﴾ (2/البقرۃ:222) ''بیشک اللہ پسند کرتا ہے خوب توبہ کرنے والوں کو اور وہ پسند کرتا ہے خود کو پاک رکھنے والوں کو۔'' ﴿وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ۝۱۰۸﴾ (9/التوبہ:108) ''اور اللہ پسند کرتا ہے خود کو پاک رکھنے والوں کو۔''

خ ل د

(ن) **خُلُوْدًا**

کسی تبدیلی کے بغیر عرصہ دراز تک ایک حالت میں رہنا۔ ہمیشہ رہنا۔ صاحبؒ لغات القرآن فرماتے ہیں: ''کسی شے کے بربادی سے بچنے اور اپنی حالت پر باقی رہنے کا نام ''خلود'' ہے، اسی بنا پر اہل عرب عام طور پر خلود کا استعمال اس چیز کے لیے کرتے ہیں کہ جو دیر پا ہو، اور اس میں تغیر و فساد مدت کے بعد پیدا ہو، چنانچہ چولہے کے ان تین پتھروں کو جن پر دیگ چڑھائی جاتی ہے اسی لیے خَوَالِدُ کہتے ہیں کہ وہ دیر تک قائم رہتے ہیں، عالم آخرت کے لیے جہاں خُلُوْدٌ کا استعمال ہوتا ہے، وہاں اس کے اصلی معنی ہیں تمام اشیاء کا اپنی اپنی حالت پر برقرار رہنا۔'' (لغات القرآن، ج ۲، ص ۳۲۲)۔ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ فرماتے ہیں: ''خلود کے اصل معنی ہیں کسی چیز کا ایک حال پر قائم و برقرار رہنا اور اس کے اندر کوئی تغیر، کوئی خرابی نہ پیدا ہونا۔ اس سے ثانوی مفہوم دوام و ہمیشگی کا پیدا ہو گیا۔ خود قرآن مجید میں اس معنیٰ میں بہت صاف طور پر آیا ہے، جہاں خالد کو باقی کے معنیٰ میں لے کر فانی سے اس کا تقابل کیا ہے۔﴿وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ؕ اَفَاۡىِٕنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ ۝﴾ (الانبیا:34) ''اور خلود فی الجنۃ اور خلود فی النار سے مراد ہے جنت کی نعمتوں یا جہنم کے عذاب کا دوام اور اہل جنت اور اہل جہنم کا کبھی اپنے اپنے مقام سے باہر نہ نکلنا اہل جنت کے تنعم اور اہل جہنم کے عذاب کا دائم و غیر منقطع ہونا امت کے اجماعی مسلمات میں سے ہے۔'' (تفسیر ماجدی، ص ۲۳)۔ جنت بھی ہمیشہ رہے گی، جنتی بھی ہمیشہ رہے گا اور جنت کی نعمتیں بھی ہمیشہ رہیں گی۔﴿وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ ۝﴾ (26/الشراء:129) ''اور تم لوگ بناتے ہو قلعے شائد کہ تم لوگ ہمیشہ رہو گے۔'' ﴿ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُلُوْدِ ۝﴾ (50/قٓ:34) ''یہ دن ہمیشگی کا ہے۔''

خَالِدٌ

ج: خَالِدُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ ہمیشہ رہنے والا۔ ﴿اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝﴾ (2/البقرہ: 82) ''وہ لوگ جنت والے ہیں، وہ لوگ اس میں ہمیشہ ایک حالت میں رہنے والے ہیں۔''

خُلْدٌ

اسم ذات ہے۔ دوام۔ ہمیشگی۔ ﴿ثُمَّ قِيْلَ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ ۚ﴾ (10/یونس:52) ''پھر کہا جائے گا ان لوگوں سے جنہوں نے ظلم کیا تم لوگ چکھو ہمیشگی کا عذاب۔''

(افعال) **اِخْلَادًا**

یہ فعل لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کے معنیٰ ''سدا رہنا، ہمیشہ رہنا'' بھی ہیں اور ''کسی کو دوام بخشنا، ہمیشگی دینا'' بھی ہیں۔ جیسے قرآن مجید میں فرمایا: ﴿يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخْلَدَهٗ ۝﴾ (الھمزۃ:3) اس آیت مبارکہ میں اَخْلَدَهٗ کے دونوں طرح ترجمے کیے گئے ہیں مثلاً: ''خیال کرتا ہے کہ اس کا مال سدا کو رہے گا اس کے ساتھ۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ) ''وہ یہ خیال کر رہا ہے کہ اس کا مال اس کے پاس سدا رہے گا۔'' (ترجمہ ماجدیؒ) ''وہ یہ خیال کرتا ہے کہ اس کے مال نے اُسے لافانی بنا دیا ہے۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔ اس آیت کے حاشیے میں صاحبؒ احسن البیان فرماتے ہیں: ''اَخْلَدَهٗ کا زیادہ صحیح ترجمہ یہ ہے کہ ''اسے ہمیشہ زندہ رکھے گا'' یعنی یہ مال، جسے وہ جمع کر کے رکھتا ہے، اس کی عمر میں اضافہ کر دے گا اور اسے مرنے نہیں دے گا۔''

اس فعل کے ساتھ جب 'اِلٰی' کا صلہ استعمال ہو تو مطلب ہوتا ہے کسی کی طرف مائل ہونا۔ کسی ایک طرف جھک جانا۔ چنانچہ قرآن مجید میں فرمایا: ﴿وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗۤ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ﴾ (7/الاعراف:176) ''اور اگر ہم چاہتے تو بلند کر دیتے اُس کا رتبہ ان آیتوں کے باعث لیکن وہ تو جھک گیا پستی کی طرف اور پیروی کرنے لگا اپنی خواہش کی۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔ آگے حاشیے میں حضرتؒ فرماتے ہیں: ''اَخْلَدَ کا صلہ جب اِلٰی ہو تو اس کا معنی ہوتا ہے اس چیز کی طرف مائل ہونا۔''

(تفعیل) تَخْلِيْدًا کسی کو ہیشگی دینا۔ ہمیشہ کیلئے بنانا۔

مُخَلَّدٌ ج: مُخَلَّدُوْنَ۔اسم المفعول ہے۔ ہمیشہ کیلئے بنایا ہوا۔ ہیشگی دیا ہوا۔﴿ يَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ ﴾ (56/واقعہ:17)''طواف کریں گے ان پر ہیشگی دیئے ہوئے لڑکے۔''

ترکیب بَشِّرْ فعل امر ہے۔ آگے اَلَّذِيْنَ سے ملانے کے لئے اسے کسرہ دی گئی ہے۔ اَلَّذِيْنَ (موصول) اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (صلہ) یہ پورا جملہ، موصول اور صلہ مل کر، بَشِّرْ کا مفعول اول ہے۔ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ، وہ بشارت ہے جسے دینے کا حکم ہے۔ اس طرح یہ بَشِّرْ کا مفعول ثانی ہے۔

اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ میں جَنّٰتٍ مبتداء موخرنکرہ ہے اور اَنَّ کا اسم ہونے کی وجہ سے حالت نصب میں ہے۔ لَهُمْ قائم مقام خبر مقدم ہے۔ اس کی خبر ثَابِتٌ یا وَاجِبٌ محذوف ہے۔ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ، یہ جملہ جَنّٰتٍ کی صفت اول ہے۔ تَجْرِيْ فعل ہے، اَلْاَنْهٰرُ اس کا فاعل اور مِنْ تَحْتِهَا متعلق فعل ہے۔ تَحْتِهَا میں هَا کی ضمیر جَنّٰتٍ کے لئے ہے۔

كُلَّمَا حرف شرط ہے رُزِقُوْا سے لے کر رِزْقًا تک بیان شرط ہے اور قَالُوْا سے لے کر مُتَشَابِهًا تک جواب شرط ہے۔ یہ پورا جملہ شرطیہ جَنّٰتٍ کی دوسری صفت ہے۔

رُزِقُوْا ماضی مجہول ہے لیکن شرط ہونے کی وجہ سے اس کا ترجمہ مستقبل میں ہوگا۔ اس میں شامل ضمیر اس کا نائب الفاعل ہے۔ مِنْهَا میں هَا کی ضمیر جنت کے لئے ہے۔ مِنْ ثَمَرَةٍ متعلق ہے رِزْقًا سے اور رِزْقًا مفعول ثانی ہے رُزِقُوْا کا۔ دوسری صورت میں مِنْ ثَمَرَةٍ مفعول ثانی ہے رُزِقُوْا کا جو اصل میں ثَمَرَةً تھا، مِنْ تبعیضیہ کی وجہ سے حالت جر میں چلا گیا اس لیے محلاً منصوب ہے۔ اور رِزْقًا مفعول لَہٗ ہے۔ (واللہ اعلم)۔ آگے هٰذَا مبتدا ہے اور الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ موصول اور صلہ مل کر خبر ہے۔

اُتُوْا بِهٖ کو سمجھ لیں۔ اَتٰى۔ يَاْتِيْ (آنا) فعل لازم ہے جس کا مجہول نہیں آتا۔ لیکن جب اس کے ساتھ 'ب' کا صلہ آئے تو یہ متعدی استعمال ہوتا ہے اور اس کے معنی ہوتے ہیں کوئی چیز لانا یا کسی کو کوئی چیز دینا۔ اس صورت میں اس کا مجہول استعمال ہوجاتا ہے۔ یہاں پر اُتُوْا۔ ماضی مجہول کا صیغہ ہے اور اس میں شامل ضمیر اس کا نائب الفاعل ہے۔ بِهٖ جار مجرور اس کے متعلق ہیں اور 'ہ' ضمیر ثمرۃ کے لیے ہے اور متشابهًا، اس کا حال ہے۔ یعنی وہ پھل جو انہیں دیے جائیں گے وہ باہم ملتے جلتے ہوں گے۔ یہاں اُتُوْا بِهٖ ''دینا'' کے معنوں میں ہے اور ہمارے بزرگوں نے تراجم بھی اسی طرح کیے ہیں مثلاً ''اور دیے جائیں گے ان کو پھل ایک صورت کے'' (ترجمہ شیخ الہندؒ) ''اور انہیں وہ (واقعی) دیا ہی جائے گا ملتا جلتا ہوا'' (ترجمہ ماجدیؒ) ''اور دیا گیا اُنہیں پھل (صورت میں) ملتا جلتا۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن) وغیرہ۔

اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ یہ مرکب توصیفی مبتداء موخر نکرہ ہے۔ جبکہ لَهُمْ فِيْهَا قائم مقام خبر مقدم ہے۔ هُمْ مبتدا، فِيْهَا متعلق خبر اور خٰلِدُوْنَ خبر ہے۔

ترجمہ	وَبَشِّرِ	الَّذِيْنَ	اٰمَنُوْا	وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
البقرة:25	اور آپ ﷺ بشارت دیجئے	ان لوگوں کو جو	ایمان لائے	اور نیک عمل کیے

اَنَّ	لَهُمْ	جَنّٰتٍ	تَجْرِيْ	مِنْ تَحْتِهَا	الْاَنْهٰرُ
کہ	ان کیلئے	باغات ہیں	بہتی ہیں	جن کے نیچے سے	نہریں

كُلَّمَا	رُزِقُوْا	مِنْهَا	مِنْ ثَمَرَةٍ	رِّزْقًا	قَالُوْا
جب بھی	ان کو دیا جائے گا	اس میں	کوئی پھل	کھانے کو	وہ لوگ کہیں گے

هٰذَا الَّذِيْ	رُزِقْنَا	مِنْ قَبْلُ	وَاُتُوْا بِهٖ	مُتَشَابِهًا
یہ ہے جو	ہم کو دیا گیا	(اس) سے پہلے	اور انہیں دیا جائے گا وہ (پھل)	باہم ملتا جلتا

وَلَهُمْ فِيْهَآ	اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ	وَّهُمْ	فِيْهَا	خٰلِدُوْنَ ۝۲۵
اور ان کے لیے ہیں اس میں	پاک کیے ہوئے جوڑے	اور وہ لوگ	اس میں	ہمیشہ ایک حالت میں رہنے والے ہیں

نوٹ حروف اِنَّ - اَنَّ - اَنْ اور اِنْ کے متعلق چند باتیں ذہن نشین کرلیں:

(1) اِنَّ کے معنی ہیں ''بیشک'' جبکہ اَنَّ کے معنی ہیں ''کہ''۔ یہ دونوں حروف اسم پر داخل ہوتے ہیں اور دونوں اپنے اسم کو منصوب کرتے ہیں۔

(2) اِنَّ جملہ کے شروع میں آتا ہے جبکہ اَنَّ جملہ کے درمیان میں آتا ہے۔ البتہ قَالَ یا اس کے مشتقات سے شروع ہونے والے جملوں کے درمیان میں اِنَّ آتا ہے لیکن ایسی صورت میں اِنَّ کے معنی ''کہ'' ہوتے ہیں۔ اس کا دوسرا استثناء یہ ہے کہ اگر خبر پر لام تاکید (لام مزحلقہ) آ رہا ہو تو پھر جملے کے درمیان میں اَنَّ کی بجائے اِنَّ آتا ہے اور ایسی صورت میں بھی اس کا ترجمہ ''کہ'' کیا جاتا ہے۔ مثلاً سورۃ المنافقون کی پہلی آیت: ﴿اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۚ۝۱﴾۔

(3) اَنْ کے معنی ہیں ''کہ'' جبکہ اِنْ کے معنی ہیں ''اگر''۔ یہ دونوں حروف فعل پر داخل ہوتے ہیں۔ اَنْ مضارع کو منصوب کرتا ہے جبکہ اِنْ مضارع کو مجزوم کرتا ہے۔ اَنْ مفسّرہ ہمیشہ اس فعل کے بعد آتا ہے جس میں کہنے کے معنی پائے جائیں خواہ کہنے کے معنی پر اس فعل کی دلالت لفظی ہو جیسے کہ ﴿فَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ اَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ﴾ (المومنون:27) '''' پھر ہم نے اس کو حکم بھیجا یہ کہ تو کشتی بنا۔'' یا دلالت معنوی جیسے ﴿وَانْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا﴾ (ص:6) ''اور ان میں سے کئی سردار چل کھڑے ہوئے کہ چلو۔'' یعنی ان کے اٹھ کر چلنے کا مطلب گویا یہ کہنا ہے کہ تم بھی چلو۔

آیت: 26

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْىٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ؕ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ؕ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۙ۝۲۶﴾

اِنَّ: البقرۃ آیت 25 کے آخر میں نوٹ دیکھیں۔ اَللّٰهُ (ء ل ہ): آیت بسم اللہ دیکھیں۔

ح ی ی

(س) (ا) حَيَاءً شرمانا۔ حیا کرنا۔

(ب) حَيَاةً زندہ ہونا۔ زندہ رہنا۔ ﴿لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ ؕ﴾ (8/الانفال:42) ''تاکہ جو ہلاک ہو، دلیل پر ہلاک ہو اور جو زندہ رہے وہ بھی دلیل پر زندہ رہے۔'' ﴿فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ ؕ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى ۝۷۴﴾ (20/طٰہٰ:74) '''' تو یقیناً اس کے لئے جہنم ہے، نہ وہ مرے گا اس میں اور نہ زندہ رہے گا۔''

حَيٰوةٌ اسم ذات ہے۔ زندگی۔ ﴿الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ﴾ (67/الملک:2) ''جس نے پیدا کیا موت اور زندگی کو تاکہ وہ آزمائے تم لوگوں کو کہ تم میں سے کون زیادہ اچھا ہے بلحاظ عمل کے۔''

حَيَوَانٌ اسم ذات ہے۔ اصل زندگی۔ حقیقی زندگی جس کے بعد موت نہیں۔ یہ ح ی ی (س) کا مصدر بھی ہے اور حَيَاةً سے زیادہ

بلیغ اور پرزور بھی ہے۔ اصل میں فَعَلَانٌ کے وزن پہ حَيَيَانٌ تھا۔ یائے ثانی کو ؤ میں تبدیل کر دیا۔ یہ قرآن مجید میں صرف ایک مرتبہ استعمال ہوا ہے مندرجہ ذیل آیت میں۔﴿ وَ اِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ﴾ (29/العنکبوت:64)''اور دارِ آخرت کی زندگی ہی حقیقی زندگی ہے (جس کے بعد موت نہیں)۔''

حَيٌّ ج: اَحْيَاءٌ۔ اسم صفت ہے۔ زندہ۔ ﴿ وَ تُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ تُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ ﴾ (3/آل عمران:27) ''اور تو نکالتا ہے زندہ کو مردہ میں سے اور تو نکالتا ہے مردہ کو زندہ میں سے۔'' ﴿ وَمَا يَسْتَوِي الْاَحْيَآءُ وَ لَا الْاَمْوَاتُ ﴾ (35/فاطر:22)''اور برابر نہیں ہیں زندہ اور مردہ۔'' حَيٌّ جب اللہ تعالیٰ کے لیے استعمال ہو تو مطلب ہوتا ہے وہ ہستی جو ہمیشہ سے زندہ ہے، اب بھی زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گی اور جس کے متعلق موت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اَلْحَيُّ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ہے۔ ﴿ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ﴾ (2/البقرۃ:255)''اللہ، وہ زندۂ جاوید ہستی، جو تمام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے اُس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔''

حَيَّةٌ ج: حَيَّاتٌ۔ اسم جنس ہے۔ ہر قسم کا سانپ۔ مذکر اور مونث دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ﴿ قَالَ اَلْقِهَا يٰمُوْسٰى ﴿١٩﴾ فَاَلْقٰهَا فَاِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعٰى ﴿٢٠﴾ ﴾ (20/طٰہٰ:19-20)''اللہ تعالیٰ نے کہا تو ڈال دے لاٹھی کو اے موسیٰ، تو انہوں نے ڈالا اس کو، پھر اُسی وقت وہ لاٹھی سانپ بن گئی دوڑتی ہوئی۔''

مَحْيَا (1) اسم ظرف زمان ہے۔ زندہ رہنے کا زمانہ، عرصۂ حیات۔ (2) مصدر میمی ہے مطلب ہے ''جینا''۔ ﴿ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ ﴾ (45/الجاثیۃ:21)''کہ ہم بنا دیں گے ان کو ان کی مانند جو ایمان لائے اور نیکیاں کیں، برابر یعنی ایک جیسا، ان کا جینا اور اُن کا مرنا۔''

حَيَّ اسم فعل ہے۔ غفلت سے جاگو۔ متوجہ ہو۔ آؤ۔ قرآن مجید میں استعمال نہیں ہوا۔

يَحْيٰى اللہ تعالیٰ کے ایک پیغمبر کا نام۔ ﴿ وَ زَكَرِيَّا وَ يَحْيٰى وَ عِيْسٰى وَ اِلْيَاسَ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿٨٥﴾ ﴾ (6/الانعام:85)''اور زکریاؑ کو اور یحییٰؑ کو اور عیسیٰؑ کو اور الیاسؑ کو (ہم نے ہدایت دی) سب نیک لوگوں میں سے تھے۔''

(تفعیل) **تَحِيَّةٌ** کسی کو زندگی دینا۔ درازی عمر کی دعا دینا۔ سلام کرنا۔ وہ کلمہ جس کے ذریعے سے کسی آنے والے یا ملنے والے شخص کا استقبال کیا جاتا ہے جیسے سلام یا خوش آمدید یا اھلاً و سھلاً وغیرہ ﴿ وَاِذَا جَآءُوْكَ حَيَّوْكَ بِمَا لَمْ يُحَيِّكَ بِهِ اللّٰهُ ﴾ (58/المجادلہ:8)''اور جب آپؐ کے پاس آتے ہیں تو آپؐ کو اُن لفظوں سے سلام کرتے ہیں جن لفظوں سے اللہ تعالیٰ نے نہیں کہا۔'' حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ تَحِيَّةٌ کے لفظ کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''تحیہّ کے لفظی معنی ہیں کسی کو ''حَيَّاكَ اللّٰهُ'' کہنا، یعنی اللہ تم کو زندہ رکھے۔ قبل از اسلام عرب کی عادت تھی کہ جب آپس میں ملتے تو ایک دوسرے کو ''حیّاك اللّٰه'' یا ''اَنْعَمَ اللّٰهُ بِكَ عَيْنًا'' یا اَنْعِمْ صَبَاحًا وغیرہ الفاظ سے سلام کیا کرتے تھے، اسلام نے اس طرز تحیہ کو بدل کر اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ کہنے کا طریقہ جاری کیا، جس کے معنی ہیں ''تم ہر تکلیف اور رنج و مصیبت سے سلامت رہو۔'' (معارف القرآن، ج۲، ص۵۰۱)۔ پیر کرم شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں: ''تحیۃ باب تفعیل کا مصدر ہے۔ اس کا اصلی معنی زندگی کی درازی کی دعا دینا ہے۔ واصل التحیۃ الدعاء بالحیاۃ (قرطبیؒ) اور اس کا معنی ملک بھی ہے التحیات اللہ میں یہی معنی ملحوظ ہے۔'' (ضیاء القرآن، ج۱، ص۳۷۳)۔ علامہ عثمانیؒ سورہ ابراہیم، آیت 23 تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ کے تحت فرماتے ہیں: ''حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ دنیا میں 'سلام' دعاء ہے سلامتی مانگنے کی وہاں (یعنی جنت میں) 'سلام' کہنا مبارکباد ہے سلامتی ملنے پر۔''

حَيِّ — فعل امر ہے۔ تو دعا دے۔ تو سلام کر۔ ﴿وَ اِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا ط﴾ (4/النساء:86) ''اور جب سلام دیا جائے تمہیں کسی لفظ دعا سے تو سلام دو تم ایسے لفظ سے جو بہتر ہو اُس سے یا (کم از کم) دہرا دو وہی لفظ۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)

(افعال) اِحْيَاءً — زندہ کرنا۔ ﴿وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ط﴾ (16/النحل:65) ''اور اللہ نے نازل کیا آسمان سے پانی، پھر اس نے زندہ کیا اس سے یعنی پانی سے زمین کو اس کی موت کے بعد۔'' نوٹ کر لیجئے کہ مضارع معروف يُحْيِيْ کو قرآن مجید میں ایک 'ی' اور کھڑی زیر کے ساتھ يُحْيٖ لکھا جاتا ہے اور اسی طرح اس کے باقی صیغے لکھے جاتے ہیں مثلاً اُحْيٖ، نُحْيٖ وغیرہ۔ اگر آگے ملانا ہو تو ایک ی اور زیر کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔ جیسے يُحْيِ اللّٰهُ یا نُحْيِ الْمَوْتٰى وغیرہ۔ اگر اس کے بعد ضمیر ہو تو پھر دو 'ی' کے ساتھ لکھا جاتا ہے جیسے يُحْيِيْكُمْ۔ اور اگر مضارع منصوب ہو تو اصل شکل يُحْيِيَ بنتی ہے جس کو پھر يُحْيٖ ـَ لکھا جاتا ہے جیسے لِّنُحْيِيَ (الفرقان:49) (واللہ اعلم)

مُحْيِ — اسم الفاعل ہے۔ مذکر۔ زندہ کرنے والا۔ ﴿اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ج﴾ (30/الروم:50) ''بے شک وہی مردوں کو زندہ کرنے والا ہے۔''

(استفعال) اِسْتِحْيَاءً — زندہ رہنے دینا۔ کسی بات سے حیا کرنا۔ شرم کرنا۔ اِسْتِحْيَاءٌ اگر حَيَاةٌ سے مشتق ہو تو معنی ہوگا طَلَبُ الْحَيَاةِ زندگی چاہنا، زندہ رہنے دینا۔ اگر حَيَاءٌ سے مشتق ہو تو معنی ہوگا حیاء کرنا، شرمانا، شرم کا اظہار کرنا۔ قرآن مجید میں دونوں طرح استعمال ہوا ہے۔ ﴿يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَ يَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ ط﴾ (28/القصص:4) ''وہ ذبح کرتا ان کے بیٹوں کو اور زندہ رہنے دیتا ان کی عورتوں کو۔'' ﴿وَاللّٰهُ لَا يَسْتَحْيٖ مِنَ الْحَقِّ ط﴾ (33/الاحزاب:53) ''اور اللہ شرم نہیں کرتا حق بیان کرنے سے۔'' ﴿فَجَآءَتْهُ اِحْدٰىهُمَا تَمْشِيْ عَلَى اسْتِحْيَآءٍ﴾ (28/القصص:25) ''اتنے میں اُن دونوں عورتوں میں سے ایک اُن کی طرف شرم و حیاء سے چلتی ہوئی آئی۔''

اِسْتَحْيِ — ج: اِسْتَحْيُوْا۔ فعل امر ہے۔ تو زندہ رکھ۔ تو حیا کر۔ ﴿قَالُوا اقْتُلُوْٓا اَبْنَآءَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ وَاسْتَحْيُوْا نِسَآءَهُمْ ط﴾ (40/المومن:25) ''ان لوگوں نے کہا تم لوگ قتل کرو ان کے بیٹوں کو جو ایمان لائیں اس کے ساتھ اور زندہ رکھو ان کی عورتوں کو۔''

اَنْ: البقرۃ آیت 25 کے آخر میں نوٹ دیکھیں۔

ض ر ب

(ض) ضَرْبًا — عربی زبان کا یہ ایک کثیر المعانی لفظ ہے۔ اس کا بنیادی مفہوم ہے ''ایک چیز کو دوسری چیز پر واقع کرنا''۔ چونکہ اس کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں اس لیے مختلف موقعوں پر اس کے مختلف معانی آتے ہیں۔ مثلاً

(1) مارنا۔ ﴿يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَ اَدْبَارَهُمْ ج﴾ (8/الانفال:50) ''وہ یعنی فرشتے مارتے ہیں انکے چہروں پر اور ان کی پیٹھوں پر۔'' جس چیز کے ساتھ مارا جائے اس پر 'ب' کا صلہ آتا ہے جیسے فرمایا: ﴿فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ط﴾ (2/البقرۃ:60) ''تو ہم نے کہا آپ ماریں اپنی لاٹھی سے اس پتھر کو۔''

(2) چلنا۔ سفر کرنا، کیونکہ انسان چلتے وقت زمین پر پاؤں رکھتا ہے۔ اس صورت میں اس کے ساتھ عام طور پر ''فِيْ'' کا صلہ آتا ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿وَ اِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ ق﴾ (4/النساء:101) ''اور جب بھی تم لوگ سفر کرو زمین میں تو تم لوگوں پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ تم لوگ قصر کرو نماز میں۔'' ﴿لَا

﴿يَسۡتَطِيۡعُوۡنَ ضَرۡبًا فِي الۡاَرۡضِ﴾ (2/البقرة:273)''وہ زمین پر چلنے پھرنے کی قدرت نہیں رکھتے۔'' ﴿فَاضۡرِبۡ لَهُمۡ طَرِيۡقًا فِي الۡبَحۡرِ يَبَسًا﴾ (20/طٰہٰ:77)''اور اُن کے لیے دریا میں خشک راستہ بنا لیجئے۔''

(3) ایک چیز کو دوسری چیز پر لازم کر دینا، مسلط کر دینا، چسپاں کر دینا یا تھوپ دینا۔ اس صورت میں عموماً ''عَلٰی'' کا صلہ استعمال ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿وَضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ الذِّلَّةُ﴾ (2/البقرہ:61)''اور تھوپی گئی ان لوگوں پر ذلت۔'' ﴿وَضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ الۡمَسۡكَنَةُ﴾ (3/آل عمران:112)''اور ان پر محتاجی و مغلوبی مسلط کر دی گئی۔'' ﴿فَضَرَبۡنَا عَلٰۤى اٰذَانِهِمۡ فِي الۡكَهۡفِ سِنِيۡنَ عَدَدًا﴾ (18/الکہف:11)''سو ہم نے غار میں اُن کے کانوں پر سالہا سال تک (نیند کا) پردہ ڈالے رکھا۔'' یعنی اُن کے کانوں پر نیند کا پردہ مسلط کر دیا گیا اور اُن کے کان بند کر دیے تاکہ کوئی آواز اُن کی نیند میں خلل پیدا نہ کرے۔

(4) بنانا۔ ایک اینٹ کو دوسری اینٹ پر لگانا۔ ﴿فَضُرِبَ بَيۡنَهُمۡ بِسُوۡرٍ﴾ (57/الحدید:13)''تو بنا دی گئی ان کے مابین ایک دیوار۔''

(5) ضَرَبَ مَثَلًا کا مطلب ہے مثال دینا۔ بیان کرنا۔ کسی ایک بات سے دوسری بات کو واضح کرنا۔ ﴿وَيَضۡرِبُ اللّٰهُ الۡاَمۡثَالَ لِلنَّاسِ﴾ (24/النور:35)''اور اللہ بیان کرتا ہے مثالیں لوگوں کے لئے۔'' ضرب المثل مشہور لفظ ہے۔

(6) منہ پھیر لینا۔ نظر انداز کر دینا۔ اس صورت میں عام طور پر 'عَنۡ' کا صلہ استعمال ہوتا ہے۔ ضَرَبۡتُ عَنۡهُ کا مطلب ہے میں نے اسے چھوڑ دیا یا میں اس سے رُک گیا۔ ﴿اَفَنَضۡرِبُ عَنۡكُمُ الذِّكۡرَ صَفۡحًا اَنۡ كُنۡتُمۡ قَوۡمًا مُّسۡرِفِيۡنَ﴾ (43/الزخرف:5)''کیا پھیر دیں گے ہم تمہاری طرف سے یہ کتاب موڑ کر اس سبب سے کہ تم ہو ایسے لوگ کہ حد پر نہیں رہتے۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)۔ اس آیت کے تحت پیر کرم شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں: ''علامہ قرطبیؒ کہتے ہیں کہ جب کوئی شخص کسی چیز سے منہ پھیر لے اور اسے نظر انداز کر دے تو عرب کہتے ہیں ''قَدۡ ضَرَبۡتُ عَنۡهُ صَفۡحًا اِذَا اَعۡرَضۡتُ عَنۡهُ وَ تَرَكۡتُهٗ'' (قرطبیؒ) علامہ ابن منظور اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: اَیۡ نُهۡمِلُكُمۡ وَلَا نُعَرِّفُكُمۡ مَا يَجِبُ عَلَيۡكُمۡ لِاَنۡ كُنۡتُمۡ قَوۡمًا مُّسۡرِفِيۡنَ اَیۡ لِاَنۡ اَسۡرَفۡتُمۡ (لسان العرب) یعنی کیا ہم تم کو نظر انداز کر دیں گے اور تمہیں ان فرائض و واجبات سے مطلع نہیں کریں گے جن کی تعمیل تم پر لازمی ہے اور یہ اس لیے کہ تم اسراف کے خوگر ہو ''صفحًا'' کے متعلق علامہ آلوسیؒ لکھتے ہیں کہ یہ نَضۡرِبُ کا مفعول مطلق ہے جیسے قَعَدۡتُ جُلُوۡسًا۔ اسے مفعول لہٗ اور حال بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس وقت صَفۡحًا صَافِحِيۡنَ کے معنی میں ہوگا۔

(روح المعانی، بحوالہ ضیاء القرآن، ج ۴، ص ۴۰۱)۔

مَثَلًا (م ث ل): البقرۃ آیت 17 دیکھیں۔

ب ع ض

(س) بَعۡضًا مچھر سے تکلیف پہنچنا۔

بَعۡضٌ کسی چیز کا جز یا حصہ۔ ﴿فَقُلۡنَا اضۡرِبُوۡهُ بِبَعۡضِهَا﴾ (2/البقرہ:73)''تو ہم نے یعنی اللہ تعالیٰ نے کہا کہ تم لوگ مارو اس کو یعنی مقتول کو اس کے یعنی گائے کے ٹکڑے سے۔'' ﴿وَيَلۡعَنُ بَعۡضُكُمۡ بَعۡضًا﴾ (29/العنکبوت:25)''اور لعنت کریں گے تم میں سے کچھ لوگ کچھ لوگوں پر۔''

بَعُوْضٌ اسم جنس ہے۔ مچھر۔ بَعُوْضَۃٌ۔ ایک مچھر۔ مچھر کا بچہ۔ یہ بَعْضٌ سے مشتق ہے، چونکہ تمام حیوانات کی بہ نسبت اس کا جسم ذرا سا ہوتا ہے اس لیے اس کو ''بَعُوْضَۃٌ'' کہنے لگے۔

ف	و	ق

(ن) فَوْقًا بلند ہونا۔ اوپر ہونا۔

فَوْقٌ ظرف بھی ہے اور بطور صفت بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس کے مفاہیم بھی متعدد ہیں۔ (1) کسی کے اوپر ﴿وَ رَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ﴾ (2/البقرہ:63) ''اور ہم نے بلند کیا تمہارے اوپر طور کو''۔ اس صورت میں اس کی ضد تحت ہے جس کے معنی نیچے کے ہیں۔ جیسے فرمایا: ﴿قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ﴾ (6/الانعام:65) ''کہہ دو کہ وہ اس پر قدرت رکھتا ہے کہ تم پر اُوپر کی طرف سے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے عذاب بھیجے۔'' فَوْقَ اگر حالت جر میں ہو تو عموماً اس کے معنی ''اوپر یا اوپر سے'' مراد ہوتے ہیں جیسے: مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ، مِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ، مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ، وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا، عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ۔

(2) کسی جگہ سے بلند سطح یا بلندی کی جانب سے۔ ﴿اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَ مِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ﴾ (33/الاحزاب:10) ''جب وہ لوگ آئے تمہارے پاس تم سے بلند جگہ سے اور تم سے پست جگہ سے۔'' اس صورت میں اس کی ضد اسفل آتی ہے یعنی پستی کی جانب سے۔

(3) گنتی میں زیادہ۔ ﴿فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ﴾ (4/النساء:11) ''پھر اگر ان کی لڑکیاں دو سے زیادہ ہیں۔''

(4) جسامت کے لحاظ سے بڑا یا چھوٹا۔ جیسے آیت زیر مطالعہ میں فرمایا: ﴿بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا﴾ اس آیت مبارکہ میں فَوْقَهَا کے دونوں معنی بیان کیے گئے ہیں یعنی مچھر یا مچھر سے بڑی چیز (جیسے مکھی یا مکڑی) یا چھوٹی چیز (جیسے مچھر کا پر یا بازو جیسے بعض احادیث میں آیا بھی ہے)۔

(5) حقارت اور ذلت میں زیادہ۔ آیت زیر مطالعہ میں ﴿بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا﴾ میں فَوْقَهَا سے بعض بزرگوں نے ''حقارت میں زیادہ ہونا'' معنی مراد لیے ہیں۔ یعنی مچھر اور مچھر سے بھی زیادہ حقیر چیز۔ (واللہ اعلم)

(6) رُتبہ اور فضیلت میں زیادہ۔ ﴿وَ رَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ﴾ (43/الزخرف:32) ''اور ہم نے بلند کیا ان میں سے کچھ لوگوں کو رتبہ میں زیادہ کچھ لوگوں سے۔''

(افعال) اِفَاقَۃٌ (1) بے ہوشی یا غشی کے بعد ہوش میں آنا۔ مرض کے بعد قوت پانا۔ صحت یاب ہونا۔ ﴿وَخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ۚ فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ﴾ (7/الاعراف:143) ''اور گرے موسیٰ بے ہوش ہو کر پھر جب ہوش آیا تو کہا پاکی تیری ہے۔''

(2) دودھ دوہنے کے بعد دودھ کا پھر تھنوں میں لوٹ آنا۔

فَوَاقٌ درمیانی وقفہ۔ وہ وقفہ جو دو مرتبہ دودھ دوہنے کے درمیان ہوتا ہے۔ دوہنے والا ایک مرتبہ دودھ دوہنے کے بعد پھر بچے کو پینے کے لیے چھوڑ دیتا ہے، بچے کے پینے سے جانور کے تھنوں میں دوبارہ دودھ اُتر آتا ہے۔ اور دودھ دوہنے والا بچے کو ہٹا کر خود

دوبارہ دودھ لیتا ہے۔ اس درمیانی وقفے کا نام اصل لغت میں فواق ہے اور بعض کے نزدیک اس کے معنی سکون، راحت اور افاقہ کے ہیں (واللہ اعلم)۔﴿ وَمَا يَنْظُرُ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً مَّا لَهَا مِنْ فَوَاقٍ ﴾(38/صٓ:15) ''انہیں صرف ایک چیخ کا انتظار ہے جس میں کوئی توقف اور ڈھیل نہیں ہے۔'' یعنی صور پھونکنے کے بعد اتنا وقفہ بھی نہیں ملے گا جتنا دو مرتبہ دودھ دوہنے کے درمیان ہوتا ہے، بلکہ صور پھونکنے کی دیر ہوگی کہ قیامت کا زلزلہ برپا ہو جائے گا۔

اَمَّا اَمَّا حرف ہے جو کسی اجمال کی تفصیل کے لیے آتا ہے اور اَحَدُ الشَّيْئَيْنِ (دو چیزوں میں سے ایک) کے معنی دیتا ہے۔ یہ کلام میں دوبار استعمال ہوتا ہے۔ اس میں شرط کا مفہوم بھی ہوتا ہے اس لیے اس کے جواب پر کلمہ 'ف' آتا ہے۔ اَمَّا کے بعد جو اسم آتا ہے وہ مبتدا اور جس پر 'ف' آئے وہ خبر ہوتی ہے۔

اَمَّا کبھی کلام کی ابتداء کے لیے بھی آتا ہے جیسے اَمَّا بَعْدُ فَاِنَّهٗ كَذَا۔

اٰمَنُوْا (ء م ن): البقرۃ آیت 3 دیکھیں۔ يَعْلَمُوْنَ (ع ل م): الفاتحہ آیت 1 دیکھیں۔

ح ق ق

(ن۔ض) حَقًّا کسی چیز یا بات کا کسی چیز یا بات کے مطابق اور موافق ہونا۔ امام راغبؒ فرماتے ہیں: ''حق کے اصل معنی مطابقت اور موافقت کے ہیں۔ جیسا کہ دروازے کی چول اپنے گڑھے میں اس طرح فٹ آجاتی ہے کہ وہ استقامت کے ساتھ اس میں گھومتی رہتی ہے۔ اس بنیادی مفہوم کے ساتھ پھر یہ لفظ مختلف مفاہیم میں استعمال ہوتا ہے۔ (1) ثابت ہونا یعنی کسی چیز کا دعویٰ کے مطابق ہونا۔﴿ وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا ﴾(17/بنی اسرائیل:16) ''اور جب کبھی ہم ارادہ کرتے ہیں کہ ہم ہلاک کریں کسی بستی کو تو ہم حکم دیتے ہیں اس کے خوشحال لوگوں کو، پھر وہ حکم عدولی کرتے ہیں اس میں، تو ثابت ہوتی ہے بات اس بستی پر، تو ہم تباہ کرتے ہیں اس کو جیسے تباہ کرنے کا حق ہے۔'' (2) سچ ہونا یعنی کسی دعوے کا چیز کے مطابق ہونا۔﴿ فَحَقَّ عَلَيْنَا قَوْلُ رَبِّنَآ ۖ اِنَّا لَذَآئِقُوْنَ ﴾(37/الصافات:31) ''تو سچ ہوا ہم پر ہمارے رب کا فرمان، بیشک ہم چکھنے والے ہیں یعنی عذاب چکھنے والے ہیں۔''۔ (3) بامقصد ہونا یعنی کسی چیز کا اس کے مقصد کے مطابق ہونا۔ (4) واجب اور لازم ہونا۔ جو چیز ثابت ہو، سچ ہو اور بامقصد ہو، اسے لازم ہونا چاہیے۔ ﴿ اَفَمَنْ حَقَّ عَلَيْهِ كَلِمَةُ الْعَذَابِ ۭ ﴾ (39/الزمر:19) ''تو کیا جس پر لازم ہوا عذاب کا فرمان۔''﴿ وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ (30/الروم:47) ''اور ہم پر مومنوں کی مدد کرنا لازم ہے۔''

حُقَّتْ ماضی مجہول ہے۔ اُس پر لازم ہوا۔ اُس پر ثابت ہوا۔﴿ وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ﴾(84/الانشقاق:2) ''اور کان لگا کر سنے گا اپنے رب کا فرمان اور اُس پر فرض بھی یہی ہے۔''

حَقٌّ اسم ذات بھی ہے۔ امام راغبؒ فرماتے ہیں: ''اَلْحَقُّ لِلْفِعْلِ وَالْقَوْلِ: اَلْوَاقِعُ بِحَسْبِ مَا يُجِبُ وَ قَدْرِ مَا يَجِبُ وَ فِي الْوَقْتِ الَّذِيْ يَجِبُ۔ یعنی وہ قول یا عمل حق ہے جو اس طرح واقع ہو جس طرح اس کا ہونا ضروری ہے اور اسی مقدار اور اسی وقت میں ہو جس مقدار میں اور جس وقت میں اس کا ہونا واجب ہے جیسے قرآن مجید کے بارے میں خود قرآن میں فرمایا گیا:﴿ نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ﴾(آل عمران:3) ''اُتاری تجھ پر کتاب سچی۔'' اس آیت کے حاشیے میں علامہ عثمانیؒ فرماتے ہیں: ''یعنی قرآن کریم جو عین حکمت کے موافق، نہایت بروقت، سچائی اور انصاف کو اپنی آغوش میں لے کر اترا۔'' حضرت مولانا مودودیؒ فرماتے ہیں: ''حق کا لفظ باطل کی ضد ہے اور بالعموم یہ دو معنوں میں استعمال

ہوتا ہے۔ایک صحیح اور سچی اور مطابق عدل وانصاف اور مطابق حقیقت بات، خواہ وہ عقیدہ وایمان سے تعلق رکھتی ہو یا دنیا کے معاملات سے دوسرے، وہ حق جس کا ادا کرنا انسان پر واجب ہو، خواہ وہ خدا کا حق ہو یا بندوں کا حق یا خود اپنے نفس کا حق۔'' (تفہیم القرآن، ج۶،ص ۴۵۳)۔اس وضاحت سے معلوم ہوا کہ لفظ ''حق'' کئی طرح استعمال ہوتا ہے جس کی مختصر سی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

(1) ثابت شدہ حقیقت، ثابت شدہ سچائی، ٹھیک بات۔﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ﴾(2/البقرۃ:144)''اور جن کو ملی ہے کتاب وہ یقیناً جانتے ہیں کہ یہ ہی ٹھیک ہے اُن کے رب کی طرف سے۔''

(2) ہر وہ چیز جو با مقصد ہو اور حکمت کے تحت بنائی گئی ہو۔اس لیے اللہ تعالیٰ کا ہر کام حق ہے۔چنانچہ قرآن مجید میں فرمایا:﴿ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ ﴾(10/یونس:5)''نہیں پیدا کیں اللہ نے یہ چیزیں مگر با مقصد۔''﴿ وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ﴾(6/الانعام:73)''اور وہ وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا حق کے ساتھ۔'' یعنی یہ تخلیق پُرحکمت اور با مقصد ہے۔

(3) اللہ تعالیٰ کے لیے استعمال ہو تو مراد ہوتا ہے وہ ہستی جو حکمت کے تحت چیزوں کو ایجاد کرے۔اسی لیے اَلْحَقُّ اسمائے حسنیٰ میں سے ہے۔﴿ فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ﴾(10/یونس:32)''سو یہ اللہ ہے رب تمہارا سچا۔''﴿ ثُمَّ رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ ﴾(6/الانعام:62)''پھر وہ سب واپس لائے جائیں گے اپنے مالک حقیقی کے پاس۔''

(4) کسی چیز کے بارے میں اس طرح اعتقاد رکھنا جیسا کہ فی الحقیقت وہ ہے۔چنانچہ ہم کہتے ہیں کہ جزا وسزا، جنت و دوزخ کے متعلق فلاں کا اعتقاد حق ہے۔﴿ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ﴾(2/البقرۃ:213)''پھر ہدایت کی اللہ نے ایمان والوں کو اُس سچی بات کی جس میں وہ جھگڑ رہے تھے اپنے حکم سے۔''

(5) ثابت شدہ لازم چیز۔﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ ﴾(3/آل عمران:102)''اے لوگو تم لوگ تقویٰ کرو اللہ کا، جیسا اسکا تقویٰ لازم ہے۔''۔﴿ وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ ﴾(17/بنی اسرائیل:26)''اور تو دے قرابت والے کو اسکی ثابت شدہ لازم چیز یعنی اس کا حق۔''

حَقِيْقٌ سزاوار، لائق، ثابت، قائم۔حقٌّ سے بروزن فَعِيْلٌ صفت مشبہ کا صیغہ ہے۔﴿ حَقِيْقٌ عَلٰٓى اَنْ لَّآ اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ﴾(7/الاعراف:105)''قائم ہوں اس بات پر کہ نا کہوں اللہ کی طرف سے مگر جو سچ ہے۔''اس آیت کے تحت علامہ عثمانیؒ فرماتے ہیں:''اکثر مفسرین نے حقیق کے معنی جدیر (لائق) کے لیے ہیں۔اسی لیے ''علیٰ'' کو بمعنی ''با'' لینا پڑا ہے یعنی میری شان کے یہ ہی لائق ہے کہ خدا کی طرف سے کوئی ناحق اور غلط بات نہ کہوں بعض نے ''حقیق'' کو بمعنی ''حریص'' لیا ہے لیکن مترجم محقق رحمۃ اللہ نے ''حقیق'' کو ''قائم وثابت'' کے معنی میں لیا۔جس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں بدون ادنیٰ تزلزل اور تذبذب کے پوری مضبوطی اور استقلال کے ساتھ اس پر قائم ہوں کہ سچ کے سوا کوئی چیز زبان سے نہ نکالوں، خدا کا پیام بلا کم و کاست تم کو پہنچا دوں۔اور تمہاری تکذیب وتخویف کی وجہ سے ذرا بھی نہ ڈگمگاؤں۔''بعض قرأتوں میں حَقِيْقٌ عَلَيَّ بھی آیا ہے۔اس کے مطابق حقیق کا معنیٰ ''واجب'' ہوگا۔یعنی مجھ پر واجب ہے کہ سچی بات ہی کہوں۔چنانچہ بعض بزرگوں نے ترجمہ کیا ہے ''واجب ہے مجھ پر کہ میں نہ کہوں اللہ پر سوائے سچی بات کے۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔ قرآن مجید میں حقیق ایک ہی دفعہ استعمال ہوا ہے مندرجہ بالا آیت مبارکہ میں۔

حَاقٌّ فَاعِلٌ کے وزن پر اسم الفاعل۔ثابت، سچا، لازم ہونے والا۔

حَاقَّۃٌ حَاقٌّ کی مونث۔ ثابت، سچی، لازم ہونے والی۔ ﴿ اَلۡحَآقَّۃُ ۙ﴿۱﴾ مَا الۡحَآقَّۃُ ۚ﴿۲﴾ ﴾ (69/العنکبوت:1-2) ''ثابت ہونے والی، کیا ہے ثابت ہونے والی یعنی قیامت۔'' الحاقہ کی وضاحت کرتے ہوئے مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں: ''لفظ حاقہ کے معنی حق اور ثابت کے بھی آتے ہیں اور دوسری چیزوں کو حق ثابت کرنے والی چیز کو بھی حاقہ کہتے ہیں۔ قیامت پر یہ لفظ دونوں معنی کے استعمال سے صادق آتا ہے کیونکہ قیامت خود بھی حق ہے اور اس کا وقوع ثابت اور یقینی ہے اور قیامت مومنین کے لیے جنت اور کفار کے لیے جہنم ثابت اور مقرر کرنے والی بھی ہے۔'' (معارف القرآن، ج۸،ص ۵۴۵)۔

اَحَقُّ افعل التفضیل ہے۔ زیادہ حقدار۔ ﴿ وَنَحۡنُ اَحَقُّ بِالۡمُلۡکِ مِنۡہُ ﴾ (2/البقرہ:247) ''اور ہم اس سے زیادہ حقدار ہیں سلطنت کے۔''

(افعال) اِحۡقَاقًا ثابت کرنا۔ ﴿ وَیُحِقُّ اللّٰہُ الۡحَقَّ بِکَلِمٰتِہٖ وَلَوۡ کَرِہَ الۡمُجۡرِمُوۡنَ ﴿٨٢﴾ ﴾ (10/یونس:82) ''اور اللہ ثابت کرتا ہے سچ کو اپنے فرمانوں سے اگرچہ ناپسند کریں مجرم لوگ۔''

(استفعال) اِسۡتِحۡقَاقًا حق دار ہونا۔ مستحق ہونا۔ ﴿ فَاِنۡ عُثِرَ عَلٰۤی اَنَّہُمَا اسۡتَحَقَّاۤ اِثۡمًا فَاٰخَرٰنِ یَقُوۡمٰنِ مَقَامَہُمَا مِنَ الَّذِیۡنَ اسۡتَحَقَّ عَلَیۡہِمُ الۡاَوۡلَیٰنِ ﴾ (5/المائدۃ:107) ''پھر اگر پتہ چل جائے کہ وہ دونوں مستحق ہوئے گناہ کے تو دوسرے دو کھڑے ہوں اُن دونوں کی جگہ پر اُن لوگوں میں سے جن کا حق دبایا گیا جو زیادہ قریب ہوں میت کے۔''

رَبٌّ (ر ب ب): الفاتحہ آیت 1 دیکھیں۔ کَفَرُوۡا (ک ف ر): البقرۃ آیت 6 دیکھیں۔ یَقُوۡلُوۡنَ (ق و ل): البقرۃ آیت 8 دیکھیں۔

ر و د

(ن) رَوۡدًا نرمی کے ساتھ بار بار کسی چیز کی طلب میں گھومنا۔ چلنا پھرنا۔

رُوَیۡدٌ رُوَیۡدٌ دراصل اِرۡوَادٌ کی تصغیر ہے اور اس کے معنی ہیں ''کسی کو تھوڑی تھوڑی مہلت دیتے جانا۔'' یا ''آہستہ آہستہ، چپکے چپکے کسی کی رسی دراز کرتے جانا تاکہ وہ اپنے انجام کو پہنچ جائے۔'' ﴿ فَمَہِّلِ الۡکٰفِرِیۡنَ اَمۡہِلۡہُمۡ رُوَیۡدًا ﴿۱۷﴾ ﴾ (86/الطارق:17) ''سو ڈھیل دے منکروں کو، ڈھیل دے اُن کو تھوڑے دنوں۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)۔ ''پس آپؐ کفار کو تھوڑی سی مہلت اور دے دیں، کچھ وقت اُنہیں کچھ نہ کہیں۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔ اس آیت کے تحت صاحبؒ ضیاء القرآن فرماتے ہیں: ''رُوَیۡدٌ، اِرۡوَادٌ سے حروف زوائد کو حذف کر کے رُوَیۡدٌ اس کی تصغیر بنائی گئی ہے۔ اس کو تصغیر ترخیم کہتے ہیں یہ راودت الریح و تَرُوۡدُ رَوۡدًا سے ماخوذ ہے جب ہوا آہستہ آہستہ چلے اور یہ لفظ ہمیشہ مصغر ہی استعمال ہوتا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں دھمکی دی جا رہی ہے۔'' (ضیاء القرآن، ج۵،ص ۵۳۸)۔ اور رُوَیۡدٌ قرآن مجید میں صرف ایک ہی دفعہ مندرجہ بالا آیت مبارکہ میں استعمال ہوا ہے۔ (واللہ اعلم)

(افعال) اِرَادَۃً طلب کرنا۔ چاہنا۔ خواہش کرنا۔ ارادہ کرنا۔ ارادہ نام ہے اس قوت کا جس میں خواہش، ضرورت اور آرزو کے ملے جلے جذبات ہوں۔ اس کا مرکز دل ہے۔ صاحبؒ تدبر قرآن فرماتے ہیں: ''ارادہ کا لفظ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک تو قطعی فیصلہ اور حتمی ارادہ کے معنی میں، دوسرے چاہنے کے معنی میں جب پہلے معنی مراد ہوتے ہیں تو اس کے بعد 'لِ' آتا ہے اور جب مجرد چاہنے کے معنی میں آتا ہے تو اس کے بعد 'اَنۡ' آتا ہے مثلاً ﴿ اِنَّمَا یُرِیۡدُ اللّٰہُ لِیُذۡہِبَ عَنۡکُمُ الرِّجۡسَ اَہۡلَ الۡبَیۡتِ ﴾ (33/الاحزاب:33) ''اللہ کا ارادہ تو بس یہ ہے، اے اہل بیت نبی کہ تم سے ناپاکی کو دور کرے۔'' ﴿ اِنَّمَا یُرِیۡدُ اللّٰہُ لِیُعَذِّبَہُمۡ بِہَا فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ﴾ (9/التوبۃ:55) ''اللہ تو بس یہ ارادہ کیے ہوئے ہے کہ اس کے ذریعے سے ان کو دنیا کی زندگی میں عذاب دے۔'' ﴿ وَاللّٰہُ یُرِیۡدُ اَنۡ یَّتُوۡبَ عَلَیۡکُمۡ ﴾

(4/النساء:27)''ہاں، اللہ تو تم پر رحمت کے ساتھ توجہ کرنا چاہتا ہے۔''﴿وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ﴾(25/الفرقان:62)''اور وہ ہے جس نے بنایا رات کو اور دن کو ایک دوسرے کے پیچھے، اس کے لئے جو چاہے کہ وہ یاددہانی حاصل کرے۔'' اللہ تعالیٰ کے لیے جب یہ لفظ استعمال ہو تو مطلب ہوتا ہے کسی کام کا فیصلہ کرنا جیسے فرمایا:﴿اِنْ اَرَادَ بِكُمْ سُوْٓءًا اَوْ اَرَادَ بِكُمْ رَحْمَةً ۭ﴾(33/الاحزاب:17)''یعنی اگر اللہ تمہاری برائی کا فیصلہ کرے یا تم پر اپنا فضل و کرم کرنا چاہے۔'' یا کسی کام کا حکم دینا۔﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾(2/البقرۃ:188)''اللہ تمہارے ساتھ آسانی کرنا چاہتا ہے تمہارے ساتھ سختی نہیں کرنا چاہتا۔'' یعنی اللہ تعالیٰ آسان کاموں کا حکم دیتا ہے اور ایسے کاموں کا حکم نہیں دیتا جس سے تم سختی میں مبتلا ہو جاؤ۔ ارادہ کا لفظ حیوانات اور جمادات دونوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ جیسے قرآن مجید میں دیوار کے متعلق فرمایا:﴿فَوَجَدَا فِيْهَا جِدَارًا يُّرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ فَاَقَامَهٗ ۭ﴾(18/الکہف:77)''تو وہاں اُن دونوں نے ایک دیوار پائی جو گرا ہی چاہتی تھی۔ تو اس نے اسے ٹھیک کر دیا۔'' اور عربی زبان میں کہا جاتا ہے فَرَسِيْ تُرِيْدُ الْتِبْنَ میری گھوڑی بھوسہ کھانا چاہتی ہے۔(واللہ اعلم)

(مفاعلہ) رِوَادًا، مُرَاوَدَةً کسی کو پھسلانا، بہکانا۔ کسی کو ایسے کام کے لیے آمادہ کرنا جس کو کرنے کا وہ ارادہ نہ رکھتا ہو۔ عربی میں کہتے ہیں رَاوَدْتُّ فُلَانًا عَنْ كَذَا میں نے اس کو اس کام سے پھسلانے کی کوشش کی۔ عام طور پر اس کے ساتھ عَنْ کا صلہ آتا ہے۔ قرآن مجید میں فرمایا:﴿قَالَ هِيَ رَاوَدَتْنِيْ عَنْ نَّفْسِيْ﴾(12/یوسف:26)''یوسفؑ نے کہا: یہی مجھے پھسلانے کی کوشش کر رہی تھی۔''﴿وَلَقَدْ رَاوَدُوْهُ عَنْ ضَيْفِهٖ فَطَمَسْنَآ اَعْيُنَهُمْ﴾(54/القمر:37)''اور یقیناً انہوں نے پھسلایا اس کو یعنی حضرت لوطؑ کو ان کے مہمان کے بارے میں تو ہم نے مٹا دیا ان کی آنکھوں کو۔''

یُضِلُّ (ض ل ل): الفاتحہ آیت 7 دیکھیں۔

ک ث ر

(ک) كَثْرَةً تعداد اور مقدار میں زیادہ ہونا۔ فضیلت میں زیادہ ہونا۔﴿مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ ۭ﴾(4/النساء:7)''اس میں سے جو کم ہو اس میں یا زیادہ ہو۔''

كَثْرَةٌ اسم ذات بھی ہے۔ زیادتی۔ کثرت۔﴿لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ ۚ﴾(5/المآئدۃ:100)''برابر نہیں ہوتے خبیث اور پاکیزہ چاہے بھلی لگے تجھ کو خبیث کی کثرت۔''

اَكْثَرُ افعل التفضیل ہے۔ زیادہ تر۔ اکثریت۔﴿وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝﴾(7/الاعراف:187)''اور لیکن لوگوں کی اکثریت نہیں جانتی۔''

كَثِيْرٌ (ضد قَلِيْلٌ)۔ فَعِيْلٌ کے وزن پر صفت ہے۔ بمعنی زیادہ۔ مقدار اور تعداد دونوں صورتوں میں آتا ہے۔ اس کا استعمال عام ہے۔ مادی اور معنوی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً ارشاد باری تعالیٰ ہے:﴿وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ۭ﴾(2/البقرۃ:269)''اور جسے حکمت عطا کی گئی۔ اسے گویا بہت بھلائی دے دی گئی۔'' مذکورہ آیت میں كَثِيْرٌ کا استعمال مقدار کے لیے معنوی طور پر ہوا ہے اور درج ذیل آیت کے ٹکڑا میں اس کا استعمال حسّی طور پر ہے اور تعداد کے لیے ہے۔﴿فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ ۚ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝﴾(57/الحدید:27)''تو جو لوگ ان میں سے ایمان لائے انہیں ہم نے ان کا بدلہ دیا۔ اور زیادہ تو ان میں سے نافرمان ہی

تھے۔'' اوراسی طرح کی اور بہت سی آیات ہیں۔

کَثِیْرَۃٌ کَثِیْرٌ کا مونث۔﴿ مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَہٗ لَہٗۤ اَضْعَافًا کَثِیْرَۃً ﴾(2/البقرۃ:245) ''تم میں کون ہے جواللہ کوقرضِ حسن دے تا کہ اللہ اسے کئی گنابڑھاچڑھا کرواپس کرے۔''

کُثْرٌ کسی چیز کی بہتات۔ یہ لفظ قرآن مجید میں استعمال نہیں ہوا۔

کَوْثَرٌ کوثر، کُثْرٌ یا کَثْرَۃٌ سے مبالغے کا صیغہ ہے۔اس کا وزن فَوْعَلٌ ہے۔اس کے لغوی معنی ہیں کسی چیز کا اتنا کثیر ہونا کہ اس کا اندازہ نہ لگایا جاسکے۔جو چیز تعداد میں، قدر و قیمت میں اور اپنی اہمیت کے لحاظ سے بہت زیادہ ہواسے عرب کوثر کہتے ہیں۔﴿ اِنَّاۤ اَعْطَیْنٰكَ الْكَوْثَرَ ۝ ﴾(108/الکوثر:1)''بیشک ہم نے عطا کیا آپ کو بے انتہا۔''علمائے تفسیر نے الکوثر کی تفسیر میں متعدد اقوال نقل کیے ہیں جو کہ کتب تفاسیر میں سے دیکھے جاسکتے ہیں۔حضرت مولانا عبدالماجد دریا بادیؒ فرماتے ہیں:''کوثر کے لفظی معنی خیر کثیر کے ہیں اور یہ لفظ دنیا اور آخرت، دونوں کی ساری بھلائیوں کا جامع ہے۔''

(افعال) **اِکْثَارًا** زیادہ کرنا۔﴿ فَاَكْثَرُوْا فِیْهَا الْفَسَادَ ۝ ﴾(89/الفجر:12)''پھرانہوں نے زیادہ کیااس میں فساد کو۔''

(تفعیل) **تَکْثِیْرًا** بتدریج زیادہ کرنا۔﴿ وَاذْكُرُوْۤا اِذْ كُنْتُمْ قَلِیْلًا فَكَثَّرَكُمْ ﴾(7/الاعراف:86)''اور یاد کرو جب تم لوگ تھوڑے تھے تو اس نے زیادہ کیا تم لوگوں کو۔''

(تفاعل) **تَکَاثُرًا** تکاثر کے تین معنی ہیں:(1) زیادہ سے زیادہ کثرت حاصل کرنے کی کوشش کرنا۔کثرت میں تمام فوائد ومنافع، مال و دولت، سامان عیش، اسباب لذت، وسائل قوت واقتدار، اولاد، سب شامل ہیں۔
(2) کثرت کے حصول میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرنا۔
(3) کثرت پر فخر کرنا۔﴿ وَتَفَاخُرٌۢ بَیْنَكُمْ وَ تَكَاثُرٌ فِی الْاَمْوَالِ وَ الْاَوْلَادِ ﴾(57/الحدید:20)''اور ایک دوسرے پر فخر کرناتمہارے مابین اور ایک دوسرے سے زیادہ ہونے کی کوشش کرنا مال میں اور اولاد میں۔''

(استفعال) **اِسْتِکْثَارًا** کسی چیز کی کثرت چاہنا۔جمع کرنا۔﴿ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَیْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَیْرِ ﴾(7/الاعراف:188) ''اور اگر مَیں جانتا ہوتا غیب کو تو مَیں جمع کرتا بھلائی میں سے۔''

یَھْدِیْ (ھ د ی): الفاتحہ آیت 5 دیکھیں۔

ف س ق

(ن۔ک) **فِسْقًا** اور **فُسُوْقًا** فِسْقٌ کے لغوی معنی ہیں نکلنا۔جب چوہا اپنے بل سے نکلتا ہے تو عرب کہتے ہیں فَسَقَتِ الْفَاْرَۃُ مِنْ جُحْرِھَا۔اسی طرح کھجور جب اپنے چھلکے سے باہر نکل آتی ہے تو عرب کہتے ہیں فَسَقَ الرُّطَبُ عَنْ قِشْرِہٖ۔شریعت کی اصطلاح میں فسق کے معنی ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری سے گناہ کرکے خارج ہوجانا۔اطاعت کے دائرے سے باہر نکلنا۔نافرمانی کرنا۔اسلام سے پہلے فسق کا لفظ انسانوں کے لیے استعمال نہیں ہوتا تھا بلکہ صرف کھجور کا اپنے چھلکے سے باہر نکلنے کے لیے یہ لفظ بولا جاتا تھا۔انسانوں کے لیے فاسق کا لفظ قرآنِ کریم نے استعمال کیا۔(واللہ اعلم)۔﴿ فَسَجَدُوْۤا اِلَّاۤ اِبْلِیْسَ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ﴾(18/الکھف:50)''تو انہوں نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے۔وہ تھا جنوں میں سے تو وہ نکل گیا اپنے رب کے حکم سے۔''﴿ وَالَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا یَمَسُّهُمُ الْعَذَابُ بِمَا كَانُوْا یَفْسُقُوْنَ ۝ ﴾(6/الانعام:49)''اور جو لوگ ہماری آیتوں کو جھٹلائیں ان کو عذاب پہنچے گا اس وجہ سے کہ وہ نافرمانی کرتے ہیں۔''(اس لفظ کی مزید تشریح آگے نوٹ 2 میں دیکھیں)۔

فِسْقٌ	اسم ذات ہے۔ نافرمانی۔ ﴿وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ ط﴾ (6/ الانعام:121) ’’اور تم لوگ مت کھاؤ اس میں سے جس پر نہیں لیا گیا اللہ کا نام اور یقیناً یہ نافرمانی ہے۔‘‘
فُسُوْقٌ	یہ بھی اسم ذات ہے۔ نافرمانی۔ گناہ۔ ﴿وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ ط﴾ (49/ الحجرات:7) ’’اور اُس نے ناپسند بنا دیا تمہارے لیے کفر کو اور گناہ کو اور نافرمانی کو۔‘‘ ﴿بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ ج﴾ (49/ الحجرات:11) ’’ایمان کے بعد فسق برا نام ہے۔‘‘
فَاسِقٌ	ج: فَاسِقُوْنَ: اسم الفاعل ہے۔ نافرمانی کرنے والا۔ ﴿اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَاٍ﴾ (49/ الحجرات:6) ’’اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے۔‘‘ ﴿فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴾ (3/ آل عمران:82) ’’تو جو وعدہ سے پھرے اس کے بعد تو وہ لوگ ہی نافرمانی کرنے والے ہیں۔‘‘

ترکیب

اِنَّ حرف مشبہ بالفعل اور اللّٰہ اس کا اسم ہے۔ لَا يَسْتَحْيٖٓ سے لے کر فَمَا فَوْقَهَا تک پورا جملہ فعلیہ اس کی خبر ہے۔ اس میں لَا نفی کا ہے اور فعل مضارع يَسْتَحْيٖٓ کا فاعل اس میں شامل ضمیر هُوَ ہے جو اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ اَنْ حرف مصدریہ ہے جس نے اگلے فعل يَضْرِبَ کے ساتھ مل کر اس میں مصدری معنی پیدا کر دیے ہیں اور اَنْ نواصب مضارع میں سے بھی ہے اس لیے يَضْرِبَ حالت نصب میں ہے۔ مَثَلًا مفعول بِهٖ ہے يَضْرِبَ کا۔ اور یہ مصدر مؤوّل، مفعول بِهٖ ہے يَسْتَحْيٖٓ کا۔ مَثَلًا کے آگے جو 'مَا' ہے اسے ’’ما ابہامیہ‘‘ کہتے ہیں۔ جو نکرہ اسم کے عموم اور ابہام کو اور زیادہ کر دیتا ہے یعنی اس کے مفہوم کو اور غیر واضح کر دیتا ہے۔ مثلاً عربی میں اٰتِنِيْ كِتَابًا کا مطلب ہے تم مجھے ایک کتاب دو۔ اٰتِنِيْ كِتَابًا مَّا کا مطلب ہے تم مجھے کوئی سی بھی کتاب دے دو۔ چنانچہ مَثَلًا مَّا کا مطلب ہے کوئی سی بھی مثال۔ صاحبؒ تفسیر ماجدی فرماتے ہیں: ’’مَثَلًا کا لفظ خود نکرہ تھا، مَا کے اضافے نے اس کے وصفِ تنکیر کو اور بڑھا دیا۔‘‘ بَعُوْضَةً۔ یہ بدل ہے مَثَلًا کا۔ 'ف' عطف کا ہے اور 'مَا' نکرہ موصوفہ ہے۔ اور فَوْقَهَا اس کی صفت ہے اور یہ 'مَا'، بَعُوْضَةً پر عطف ہے۔ فَوْقَهَا میں 'هَا' ضمیر بَعُوْضَةً کے لیے ہے۔ فَوْقَهَا میں ’’فَوْقَ‘‘ کے عموماً دو مفہوم مراد لیے گئے ہیں۔ ایک جو مچھر سے حقارت میں بڑھ کر ہو جیسے مچھر کا پر یا بازو۔ دوسرے جو جسامت میں مچھر سے بڑھ کر ہو یعنی مکھی یا مکڑی (واللہ اعلم)۔ فَاَمَّا میں 'ف' استئنافیہ ہے اور اَمَّا حرف شرط و تفصیل ہے۔ اَلَّذِيْنَ موصول اور اٰمَنُوْا اس کا صلہ ہے۔ صلہ اور موصول مل کر مبتدا ہیں۔ اور آگے جملہ فعلیہ فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ خبر ہے۔ اس میں 'ف' جواب شرط کے لیے ہے۔ يَعْلَمُوْنَ فعل مضارع اور اس کا فاعل اس میں شامل ضمیر ہے۔ اَنَّ حرف مشبہ بالفعل ہے اور 'هٗ' ضمیر اس کا اسم جو کہ مثال کے لیے ہے۔ اور اَلْحَقُّ، اَنَّ کی خبر ہے مِنْ رَّبِّهِمْ متعلق خبر ہے۔ یہ جملہ اسمیہ مفعول ہے يَعْلَمُوْنَ کا۔ آگے 'ف' عطف کا ہے اور اَمَّا حرف شرط و تفصیل ہے۔ اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا، موصول اور صلہ مل کر مبتدا ہیں، اور فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ سے بِهٰذَا مَثَلًا تک خبر ہے۔ یاد کر لیجیے کہ اسمائے استفہام جملے میں مبتدا، فاعل، مفعول اور جن اسماء میں ظرفیت کے معنی پائے جاتے ہیں وہ خبر بن کر، استعمال ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہاں مَاذَآ، مفعول مقدم ہے اَرَادَ کا اور اللّٰهُ فاعل ہے۔ بِهٰذَا متعلق فعل ہے اور مَثَلًا تمیز ہے۔ يُضِلُّ کا فاعل اس میں شامل هُوَ کی ضمیر ہے جو اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ بِهٖ متعلق فعل ہے اور یہ ضمیر مثال کے لیے ہے یعنی اللہ تعالیٰ گمراہ کرتا ہے اس مثال سے۔ كَثِيْرًا مفعول ہے۔ 'وَ' عطف کا ہے اور يَهْدِيْ عطف ہے يُضِلُّ پر۔ آگے وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ میں 'وَ' استئنافیہ ہے اور 'مَا' نافیہ ہے۔ اِلَّا حصر کے لیے ہے۔ 'مَا' اور اِلَّا زور دار نفی پیدا کر رہے ہیں۔ اَلْفٰسِقِيْنَ، مفعول ہے يُضِلُّ کا۔ (واللہ اعلم)۔

ترجمہ
البقرۃ:26

اِنَّ اللّٰهَ	لَا يَسْتَحْيٖٓ	اَنْ يَّضْرِبَ	مَثَلًا مَّا	بَعُوْضَةً
بیشک اللہ	حیا نہیں کرتا	کہ وہ بیان کرے	کوئی سی بھی مثال	مچھر کے بچے کی

فَمَا فَوْقَهَا ط	فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	فَيَعْلَمُوْنَ
یا جو اس سے بڑھ کر ہے (حقارت میں یا جسم میں)	پس وہ لوگ جو ایمان لائے	وہ لوگ تو جانتے ہیں

اَنَّهُ الْحَقُّ	مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ	وَ اَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا	فَيَقُوْلُوْنَ
کہ یہ (مثال) صحیح ہے	ان کے رب کی طرف سے	اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا	تو وہ لوگ کہتے ہیں

مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ	بِهٰذَا	مَثَلًا ۘ	يُضِلُّ بِهٖ	كَثِيْرًا ۙ
اللہ نے کیا ارادہ کیا	اس سے	بطور مثال کے	وہ گمراہ کرتا ہے اس (مثال) سے	بہتوں کو

وَّ يَهْدِيْ بِهٖ	كَثِيْرًا ؕ	وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ
اور وہ ہدایت دیتا ہے اس (مثال) سے	بہتوں کو	اور وہ گمراہ نہیں کرتا اس (مثال) سے

اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۙ﴿۲۶﴾
مگر نافرمانی کرنے والوں کو

نوٹ۔1 اس آیت کا یہ شانِ نزول معروف ہے کہ قرآن مجید میں جب مکھی، مکڑی وغیرہ کی مثالیں دی گئیں تو مخالفین نے کہا کہ اللہ تعالیٰ اس سے اعلیٰ وارفع ہے کہ اتنی حقیر چیزوں کی مثال دے۔ اس لئے قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام نہیں ہوسکتا۔ ان کی اس بات کا جواب اس آیت میں دیا گیا۔

لیکن ایک رائے یہ بھی ہے کہ یہ آیت خود ایک مستقل مثال ہے جو دنیا کی دی گئی ہے۔ مچھر جب تک بھوکا یا کم خوراک ہوتا ہے زندہ رہتا ہے۔ جب زیادہ خوراک کی وجہ سے موٹا تازہ ہوجاتا ہے تو مرجاتا ہے۔ اسی طرح لوگ جب دنیا کو دل کھول کر حاصل کر لیتے ہیں تو ان کی پکڑ آجاتی ہے۔ (ابن کثیرؒ)

نوٹ۔2 **فِسْقٌ**: صاحبؒ تفسیر حقانی فرماتے ہیں: ''فسق نکلنے کو کہتے ہیں۔ عرب بولتے ہیں: فسقت الرطبة عن قشرھا کہ چھوہارا اپنے پوست (چھلکے) سے باہر ہوگیا اور عرفِ شرع میں فسق خدا کی فرمانبرداری سے گناہ کرکے خارج ہونے کو کہتے ہیں اور اس کے تین درجے ہیں:

(1) ایک فاسق وہ ہے جو نافرمانی کو برا سمجھتا ہے لیکن بشری تقاضے کے تحت کبھی نافرمانی کا ارتکاب ہوجاتا ہے اور اس کے متعلق فکر مند رہتا ہے۔

(2) ایک فاسق وہ ہے جو کسی نافرمانی کا عادی ہوجاتا ہے اور اس کے متعلق فکر مند بھی نہیں رہتا۔

(3) ایک فاسق وہ ہے جو کسی نافرمانی کو اچھا عمل سمجھ کر اختیار کرتا ہے اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے فرمان کو حقیقت نہیں سمجھتا۔

پہلے دو درجے تک فاسق مومن رہتا ہے کیونکہ تصدیق قلبی جو اصل ایمان ہے اس کے دل میں موجود ہے اور صرف تیسرے درجے میں کافر ہوتا ہے۔ (تفسیر حقانی، ج ۱،ص ۴۰۴، تلخیصاً)۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں: ''فسق کے لفظی معنی خروج اور باہر نکل جانے کے ہیں، اصطلاحِ شرح میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے نکل جانے کو فسق کہتے ہیں اور اطاعت الٰہیہ سے نکل جانا کفر وانکار کے ذریعہ بھی ہوتا ہے، اور عملی نافرمانی کے ذریعہ بھی، اس لیے لفظ فاسق کافر کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں بیشتر لفظ فاسقین، کافروں ہی کے لیے استعمال ہوا ہے اور مومن گناہگار کو بھی فاسق کہا جاتا ہے۔ فقہاء کی اصطلاح میں عموماً لفظ فاسق اسی معنی کے لیے استعمال ہوا ہے ان کی اصطلاح میں فاسق کو کافر کے بالمقابل اس کی قسم قرار دیا گیا ہے۔ جو شخص کسی کبیرہ گناہ کا ارتکاب کرے اور پھر اس سے توبہ بھی نہ کرے، یا صغیرہ گناہ پر اصرار کرے، اس کی عادت بنالے وہ فقہاء کی اصطلاح میں فاسق کہلاتا ہے، (مظہری) اور جو شخص یہ فسق کے کام اور گناہ علانیہ جرأت کے ساتھ کرتا پھرے اس کو فاجر کہا جاتا ہے۔ (معارف القرآن، ج ۱،ص ۱۶۸)۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ فرماتے ہیں: ''فسق کے اصل معنی خروج کے ہیں۔ یہاں یہ لفظ معروف سے منکر اور اطاعت سے نافرمانی کی طرف نکل جانے

کے لیے استعمال ہوا ہے۔ قرآن مجید میں ابلیس کے متعلق ہے: ﴿ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ﴾ (18/ الکھف:50) ''وہ جنات میں سے تھا پس اس نے اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی۔'' معروف سے منکر اور اطاعت سے نافرمانی کی طرف نکل جانے کے مختلف مدارج ہو سکتے ہیں۔ منکر چھوٹا بھی ہو سکتا ہے اور بڑا بھی، اسی طرح نافرمانی معمولی درجہ کی بھی ہو سکتی ہے اور بغاوت کے درجہ کی بھی۔ چنانچہ قرآن میں یہ لفظ عام منکرات سے لے کر کفر و بغاوت تک سب کے لیے استعمال ہوا ہے بلکہ زیادہ تر اس کا استعمال ان بڑی نافرمانیوں ہی کے لیے ہوا ہے جن کے ساتھ ایمان جمع نہیں ہوتا اس وجہ سے قرآن میں اس لفظ کو اس ہلکے معنی میں ہرگز نہیں لینا چاہیے جس معنی میں اس کو عام طور پر ہمارے فقہاء اور متکلمین نے لیا ہے۔ (تدبر قرآن، ج ۱ص ۱۴۲)۔

حضرت مولانا عبد الماجد دریا بادیؒ فرماتے ہیں: ''فسق کہتے ہیں احکام سے تجاوز کر جانے کو۔ اور فاسق وہ ہے جو دائرہ اطاعت سے باہر نکل جائے۔ ائمہ لغت نے کہا ہے کہ فاسق کے استعمال کی مثال عربی میں اسلام سے قبل، عہد جاہلی میں نہیں ملتی۔ فسق بہ حیثیت فعل، بے جان چیزوں کے سلسلہ میں ضرور استعمال میں تھا۔ لیکن بحیثیت اسم، فاسق کا استعمال انسان کے لیے کلام عرب میں نہیں ملتا۔ اس اصطلاحی معنی میں جس میں اس کا استعمال اب عربی بلکہ اردو میں عام ہے، یہ تمام تر ایک اسلامی لفظ ہے۔ اور ان چند لفظوں میں سے ہے، جو قرآن نے آ کر عربی زبان کو دیے۔'' (تفسیر ماجدیؒ ص ۱۷)۔

آیت: 27

﴿ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۠ وَ يَقْطَعُوْنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ يُّوْصَلَ وَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۲۷﴾ ﴾

ن ق ض

(ن) نَقْضًا — کسی بنی ہوئی چیز کو توڑنا۔ عمارت مسمار کرنا۔ رسی کا بل کھولنا۔ ﴿ وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِيْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا ؕ ﴾ (16/ النحل:92) ''اور تم لوگ مت ہو اس خاتون کی مانند جس نے توڑا اپنے سوت کو مضبوطی کے بعد ریزہ ریزہ کر کے۔'' نقض کا لفظ معنوی طور پر کسی چیز کو توڑنے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جیسے آیت زیر مطالعہ میں فرمایا الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ۔

لَا تَنْقُضُوْا — فعل نہی ہے۔ تم لوگ مت توڑو۔ ﴿ وَ لَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا ﴾ (16/ النحل:91) ''اور تم لوگ مت توڑو قسموں کو ان کی تاکید کے بعد۔''

(افعال) اِنْقَاضًا — بوجھل کرنا۔ بوجھ کی وجہ سے ٹوٹنے کے قریب کرنا یا توڑ دینا۔ کسی چیز کا لاغر اور دُبلا ہونا۔ ''ویسے لغتِ عرب میں جب اونٹ کی پُشت پر زیادہ بوجھ لادا جائے تو اس کی پسلیوں سے ایک قسم کی ''کڑ کڑ'' کی آواز نکلتی ہے اسے بھی انقاض کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔'' (ضیاء القران)۔ ﴿ وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ۙ﴿۲﴾ الَّذِيْۤ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۙ﴿۳﴾ ﴾ (94/ الانشراح:2-3) ''اور ہم نے اتارا آپ ﷺ سے آپ ﷺ کے بوجھ کو جس نے بوجھل کیا آپ ﷺ کی پیٹھ کو۔''

ع ھ د

(س) عَهْدًا — (1) مسلسل نگہداشت کرنا۔ وعدہ کرنا۔ ﴿ قَالُوْا يٰمُوْسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ۚ ﴾ (7/ الاعراف:134) ''انہوں نے کہا اے موسیٰ ہمارے لیے اپنے رب سے اس بات کی دعا کیجیے جس کا اُس نے آپ سے عہد کر رکھا ہے۔'' (2) کسی سے عہد لے کر اسے اس پر قائم رہنے کی تاکید کرنا۔ چنانچہ یہ لفظ تاکید کرنا۔ ذمہ دار بنانا۔ وعدہ لینا۔ کوئی کام کسی کے سپرد کرنا کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے اور عام طور پر ان معنوں میں اِلٰی کا صلہ استعمال ہوتا ہے۔

﴿وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ﴾(2/البقرۃ:125)''اور تاکید کی ہم نے ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ کو کہ وہ دونوں پاک رکھیں میرے گھر کو۔'' ﴿اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ﴾(36/یٰسین:60) ''کیا میں نے وعدہ نہیں لیا تم لوگوں سے اے آدمؑ کی اولاد کہ تم لوگ بندگی مت کرنا شیطان کی۔''

عَهْدٌ ج: عُهُوْدٌ۔ اسم ذات بھی ہے۔ ایسا وعدہ جس کی مسلسل نگہداشت کی جائے۔ عہد۔ ﴿وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ﴾(17/بنی اسرائیل:34)''اور تم لوگ پورا کرو وعدہ کو۔'' عام طور پر عہد ایسے معاہدے کو کہتے ہیں جو دو شخصوں کے درمیان طے ہو جائے اور وعدہ عموماً یک طرفہ ہوتا ہے۔ 'عہد' کی وضاحت کرتے ہوئے صاحبؒ تفسیر حقانیؒ فرماتے ہیں:''عہد لغت میں اس چیز کو کہتے ہیں جس کی حفاظت اور رعایت کی جاتی ہے۔ جیسا کہ وصیت، قسم اور گھر۔ گھر کو عرب عہد اس لیے کہتے ہیں کہ ہر طرف سے پھر کر انسان وہاں آتا ہے۔ اور اس کی طرف خیال رکھتا ہے۔ تاریخ کو بھی عہد اس لیے کہتے ہیں کہ اس کی محافظت ہوتی ہے۔''(تفسیر حقانی، ج ۱، ص ۴۰۴)۔ اور مولانا مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں:''لفظ عہد ان تمام معاملات و معاہدات کو شامل ہے جن کا زبان سے التزام کیا جائے یعنی اس کی ذمہ داری لی جائے خواہ اس پر قسم کھائے یا نہ کھائے، خواہ وہ کسی کام کے کرنے سے متعلق ہو یا نہ کرنے سے۔''(معارف القرآن، ج ۵ ص ۳۹۵)

(مفاعلہ) **مُعَاهَدَةً** باہم وعدہ کرنا۔ معاہدہ کرنا۔ ﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَىِٕنْ اٰتٰىنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ﴾(9/التوبۃ:75)''اور ان میں سے وہ بھی ہیں جنہوں نے معاہدہ کیا اللہ سے کہ اگر وہ دے گا ہم کو اپنے فضل میں سے تو ہم لازماً خیرات کریں گے۔''

اَللّٰهُ (ء ل ہ): آیت بسم اللہ دیکھیں۔

بَعْدُ	بعد۔ ظرف زمان ہے۔ قَبْلُ کی ضد ہے۔ اضافت اس کو لازمی ہے۔ اس کی اعرابی حالت وہی ہوتی ہے جو قَبْلُ کی ہوتی ہے۔

و ث ق

(ض) **ثِقَةً، وُثُوْقًا** اعتبار کرنا۔ بھروسہ کرنا۔

ثِقَةٌ قابل بھروسہ آدمی کو کہتے ہیں۔ واحد اور جمع دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے جیسے رَجُلٌ ثِقَةٌ اور قَوْمٌ ثِقَةٌ۔

(ک) **وَثَاقَةً** بہت مضبوط ہونا۔

وَثَاقٌ اسم ذات ہے۔ یہ وَثَاقٌ اور وِثَاقٌ دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ اس رسی یا زنجیر کو کہتے ہیں جس سے کسی چیز کو کس کر باندھ دیا جائے۔ بندھن، بندش۔ ﴿حَتّٰٓى اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ﴾(47/محمد:4)''یہاں تک کہ جب تم قتل کر چکو ان کو تو اب خوب مضبوط قید و بند سے گرفتار کرو۔'' ﴿وَّلَا يُوْثِقُ وَثَاقَهٗٓ اَحَدٌ ۝﴾(89/الفجر:26)''اور کوئی نہیں جکڑے گا اس کے جکڑ جیسی۔''

مَوْثِقٌ مَفْعِلٌ کا وزن ہے لیکن اسم الظرف کے بجائے اسم ذات کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ پختہ وعدہ۔ ﴿فَلَمَّآ اٰتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ ۝﴾(12/یوسف:66)''تو جب انہوں نے دیا ان کو یعنی یعقوبؑ کو اپنا پختہ وعدہ تو انہوں نے کہا اللہ ذمہ دار ہے اس کا جو ہم کہتے ہیں۔''

وُثْقٰى اسم التفضیل ہے۔ مونث۔ بہت مضبوط۔ ﴿فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى﴾(2/البقرۃ:256)''تو اس نے تھام لیا ایک مضبوط حلقہ۔''

مِیۡثَاقٌ — مِفۡعَالٌ کے وزن پر اسم الالہ ہے۔ جکڑنے کی زنجیر یا رسی۔ پھر جکڑی ہوئی چیز کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے اور مراد اس سے ہوتا ہے وہ پختہ عہد جس کو قسموں کے ساتھ مضبوط کیا گیا ہو یا لکھ کر فریقین کو معاہدہ کا پابند کر دیا گیا ہو۔ ﴿وَ اِذۡ اَخَذَ اللّٰہُ مِیۡثَاقَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ لَتُبَیِّنُنَّہٗ لِلنَّاسِ وَ لَا تَکۡتُمُوۡنَہٗ﴾ (3/آل عمران:187) ''اور جب لیا اللہ نے ان کا پختہ وعدہ جن کو کتاب دی گئی کہ تم لوگ لازماً واضح کرو گے اس کو لوگوں کے لئے اور اس کو نہیں چھپاؤ گے۔'' اور آیت زیر مطالعہ۔

(افعال) اِیۡثَاقًا — کسی کو جکڑنا۔ مضبوط باندھنا۔ ﴿وَّ لَا یُوۡثِقُ وَ ثَاقَہٗۤ اَحَدٌ ﴿ؕ۲۶﴾﴾ (89/الفجر:26) ''اور کوئی نہیں جکڑے گا اُس کے جکڑ جیسی۔''

(مفاعلہ) وِثَاقًا — باہم معاہدہ کرنا۔ کسی کو معاہدہ کا پابند کرنا۔ ایک دوسرے کو معاہدے میں جکڑنا۔ ﴿وَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَۃَ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ وَ مِیۡثَاقَہُ الَّذِیۡ وَاثَقَکُمۡ بِہٖۤ﴾ (5/المآئدہ:7) ''اور تم لوگ یاد کرو اللہ کی نعمت کو اپنے اوپر، اور اس کے پختہ عہد کو جس کا اُس نے پابند کیا تھا تم کو۔''

ق ط ع

(ف) قَطۡعًا — کاٹنا۔ کسی چیز کو کاٹ کر علیحدہ کر دینا۔ جدا کر دینا۔ یہ لفظ مادی طور پر بھی استعمال ہوتا ہے اور معنوی طور پر بھی۔ مثلاً مادی طور پر فرمایا: ﴿لَاُقَطِّعَنَّ اَیۡدِیَکُمۡ وَ اَرۡجُلَکُمۡ مِّنۡ خِلَافٍ﴾ (7/الاعراف:124) ''میں تمہارے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کٹوا دوں گا۔'' اور معنوی طور پر پھر یہ بہت سے محاوروں میں استعمال ہوتا ہے مثلاً

(1) قَطۡعُ الرَّحِمِ کا مطلب ہے رحمی رشتوں کو کاٹ دینا یعنی رشتے داروں سے حسن سلوک نہ کرنا۔ جیسے آیت زیر مطالعہ میں فرمایا: وَ یَقۡطَعُوۡنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰہُ بِہٖۤ اَنۡ یُّوۡصَلَ ''اور جس چیز (یعنی رشتہ، قرابت) کے جوڑنے کا اللہ نے حکم دیا ہے یہ اس کو کاٹ ڈالتے ہیں۔''

(2) قَطۡعُ السَّبِیۡلِ یا قَطۡعُ الطَّرِیۡقِ کا لفظی مطلب ہے راستہ کاٹنا۔ پھر اس کے دو معنی مراد لیے جاتے ہیں۔ (ا) راستہ طے کرنا۔ ان معنوں میں قرآن مجید کی یہ آیت ہے ﴿وَّ لَا یَقۡطَعُوۡنَ وَادِیًا اِلَّا کُتِبَ لَہُمۡ﴾ (9/التوبۃ:121) ''اور جتنے میدان اُن کو طے کرنے پڑے یہ سب بھی اُن کے نام لکھا گیا۔'' (ب) راہزنی کرنا۔ راستہ گزرتے لوگوں کو لوٹنا۔ راہزنی کی وجہ سے لوگ اس راستے پر چلنا چھوڑ دیتے ہیں اور راستہ بند ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید میں فرمایا: ﴿اَئِنَّکُمۡ لَتَاۡتُوۡنَ الرِّجَالَ وَ تَقۡطَعُوۡنَ السَّبِیۡلَ ۬ۙ﴾ (29/العنکبوت:29) ''ارے تم تو مردوں سے فعل کرتے ہو اور تم راہزنی کرتے ہو۔'' (ترجمہ ماجدیؒ) ''کیا تم بدفعلی کرتے ہو مردوں کے ساتھ اور ڈاکے ڈالتے ہو عام راستوں پر۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔ قَطۡعُ الطَّرِیۡقِ کے ایک معنی قطع نسل بھی کیے گئے ہیں۔ یعنی جو لوگ اپنی جنسی خواہش مردوں سے پوری کرتے ہیں وہ اپنی نسل بڑھنے کے سلسلے کو کاٹتے ہیں۔ حضرت شیخ الاسلام علامہ عثمانیؒ عنکبوت۔29 میں تَقۡطَعُوۡنَ السَّبِیۡلَ کا ترجمہ کرتے ہیں: ''راہ مارتے ہو'' اور حاشیے میں فرماتے ہیں: ''راہ مارنے سے مراد ممکن ہے ڈاکہ زانی ہو، یہ بھی اُن میں رائج ہوگی، یا اسی بدکاری سے مسافروں کی راہ مارتے تھے کہ ڈر کے مارے اُس طرف ہو کر نہ نکلیں یا تَقۡطَعُوۡنَ السَّبِیۡلَ کا مطلب یہ ہو کہ فطری اور معتاد راستہ کو چھوڑ کر توالد و تناسل کا سلسلہ منقطع کر رہے تھے۔''

(3) قَطۡعُ الدَّابِرِ کا مطلب ہے کسی چیز کی جڑ کاٹ دینا۔ کسی کو نیست و نابود کر دینا۔ جیسے فرمایا: ﴿وَ قَطَعۡنَا دَابِرَ الَّذِیۡنَ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا﴾ (7/الاعراف:72) ''اور کاٹا ہم نے ان لوگوں کی پیٹھ کو جو جھٹلاتے تھے ہماری نشانیوں کو۔''

(4) قَطۡعُ الۡاَمۡرِ کا مطلب ہے کسی کام کا حتمی فیصلہ کرنا گویا ایک شق پر فیصلہ کر کے دیگر شقوں اور احتمالات کو

کاٹ دیا۔ جیسے فرمایا: ﴿مَا كُنۡتُ قَاطِعَةً اَمۡرًا حَتّٰى تَشۡهَدُوۡنِ ۝﴾ (27/النمل:32) ''میں کسی معاملے کا فیصلہ نہیں کرتی جب تک تم میرے پاس موجود نہ ہو۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)

اِقۡطَعۡ ج: اِقۡطَعُوۡا۔ فعل امر ہے۔ تو کاٹ۔ ﴿وَالسَّارِقُ وَ السَّارِقَةُ فَاقۡطَعُوۡۤا اَيۡدِيَهُمَا﴾ (5/المآئدہ:38) ''اور مرد چور ہو اور عورت چور ہو تو تم لوگ کاٹو ان کے ہاتھ۔''

قَاطِعٌ اسم الفاعل ہے۔ کاٹنے والا۔ ﴿مَا كُنۡتُ قَاطِعَةً اَمۡرًا حَتّٰى تَشۡهَدُوۡنِ ۝﴾ (27/النمل:32) ''میں کاٹنے والی نہیں کوئی فیصلہ یعنی قطعی یا حتمی فیصلہ کرنے والی نہیں یہاں تک کہ تم لوگ موقع پر موجود ہو۔''

مَقۡطُوۡعٌ اسم المفعول ہے۔ کاٹا ہوا۔ روکا ہوا۔ ختم ہونے والا۔ ﴿وَّ فَاكِهَةٍ كَثِيۡرَةٍ ۝ لَّا مَقۡطُوۡعَةٍ وَّ لَا مَمۡنُوۡعَةٍ ۝﴾ (56/الواقعہ:32-33) ''اور کثیر میوے، نہ روکے ہوئے اور نہ منع کئے ہوئے۔''

قِطۡعٌ اسم ذات ہے۔ کسی چیز کا ٹکڑا۔ حصہ۔ یہ لفظ واحد ہے اس کی جمع اَقۡطَاعٌ ہے۔ ﴿فَاَسۡرِ بِاَهۡلِكَ بِقِطۡعٍ مِّنَ الَّيۡلِ﴾ (11/ھود:81) ''تو آپ یعنی لوطؑ سفر پر روانہ ہوں اپنے اہل کے ساتھ رات کے ایک حصے میں۔''

قِطَعٌ ٹکڑے۔ یہ لفظ جمع ہے۔ اس کی واحد قِطۡعَةٌ ہے۔ (لغات القرآن)۔ ﴿كَاَنَّمَاۤ اُغۡشِيَتۡ وُجُوۡهُهُمۡ قِطَعًا مِّنَ الَّيۡلِ مُظۡلِمًا ؕ﴾ (10/یونس:27) ''گویا کہ ڈھانک دیے گئے اُن کے چہرے اندھیری رات کے ٹکڑوں سے۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)۔ ﴿وَفِي الۡاَرۡضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ﴾ (13/الرعد:4) ''اور زمین میں (مختلف قسم کے) ٹکڑے ہیں جو قریب قریب ہیں۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)

(تفعیل) تَقۡطِيۡعًا ٹکڑے ٹکڑے کرنا۔ تقسیم کرنا۔ حسی اور معنوی دونوں چیزوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ ﴿وَسُقُوۡا مَآءً حَمِيۡمًا فَقَطَّعَ اَمۡعَآءَهُمۡ ۝﴾ (47/محمد:15) ''اور ان کو پلایا جائے گا کھولتا ہوا پانی تو وہ ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا ان کی آنتوں کو''۔ ﴿وَ قَطَّعۡنٰهُمُ اثۡنَتَيۡ عَشۡرَةَ اَسۡبَاطًا اُمَمًا ؕ﴾ (7/الاعراف:160) ''اور ہم نے تقسیم کیا ان کو بارہ نسلی گروہوں میں۔''

قُطِّعَتۡ ماضی مجہول کا صیغہ ہے۔ ﴿فَالَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا قُطِّعَتۡ لَهُمۡ ثِيَابٌ مِّنۡ نَّارٍ ؕ﴾ (22/الحج:19) ''ان میں سے وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا اُن کے لیے آگ کے لباس کاٹے جا چکے ہیں۔'' (ترجمہ تفہیم القرآن)

(تفعّل) تَقَطُّعًا ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا۔ ٹکڑے ٹکڑے کر دینا۔ (لازم و متعدی) ﴿اِذۡ تَبَرَّاَ الَّذِيۡنَ اتُّبِعُوۡا مِنَ الَّذِيۡنَ اتَّبَعُوۡا وَ رَاَوُا الۡعَذَابَ وَ تَقَطَّعَتۡ بِهِمُ الۡاَسۡبَابُ ۝﴾ (2/البقرہ:166) ''جب بیزاری ظاہر کریں گے وہ لوگ جن کی پیروی کی گئی ان لوگوں سے جنھوں نے پیروی کی، اور وہ لوگ دیکھیں گے عذاب کو تو ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے ان کے تعلقات۔''۔ ﴿وَ تَقَطَّعُوۡۤا اَمۡرَهُمۡ بَيۡنَهُمۡ ؕ﴾ (21/الانبیاء:93) ''اور ان لوگوں نے ٹکڑے ٹکڑے کیا اپنے کام کو اپنے مابین یعنی فرقے فرقے ہو گئے۔''

ء م ر

(ک) اِمَارَةً با اختیار ہونا۔ حاکم ہونا۔

(ن) اَمۡرًا کسی کو کسی کام کیلئے کہنا۔ (1) حکم دینا۔ ﴿قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسۡجُدَ اِذۡ اَمَرۡتُكَ ؕ﴾ (7/الاعراف:12) ''اس نے یعنی اللہ تعالیٰ نے کہا کس چیز نے منع کیا تجھ کو کہ تو سجدہ نہ کرے جب میں نے حکم دیا تجھ کو۔'' جب امر 'حکم' کے معنی میں آئے تو یہ ضروری نہیں کہ وہ امر ہی کے صیغے میں ہو بلکہ یہ حکم خبر یا اشارہ و کنایہ سے بھی دیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ جب حضرت ابراہیمؑ

نے حضرت اسمٰعیلؑ کو خواب میں اپنے ہاتھ سے ذبح کرتے ہوئے دیکھا تو معلوم ہوا کہ بچے کی قربانی کا حکم ہے، کیونکہ نبی کا خواب سچا ہوتا ہے اس لیے قرآن نے جب اس واقعے کو بیان کیا تو حضرت اسماعیلؑ کی زبانی اس کو امر قرار دیا۔ چنانچہ فرمایا قَالَ يٰۤاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ (الصافات۔102) ''ابا جان آپ کیجیے جس کا آپ کو حکم ہوا ہے۔'' (2) ترغیب دینا۔﴿ لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ ﴾ (4/النساء:114) ''کوئی خیر نہیں ہے ان کے اکثر مشوروں میں سوائے اسکے جو ترغیب دے خیرات کی یا بھلائی کی۔'' (3) مشورہ دینا ﴿ يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ ۚ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ﴾ (7/الاعراف:110) ''وہ یعنی موسیٰؑ ارادہ کرتا ہے کہ وہ نکالے تم لوگوں کو تمہاری زمین سے تو تم لوگ کیا مشورہ دیتے ہو۔''

اُؤْمُرْ، مُرْ فعل امر ہے۔ تو حکم دے۔ مہموز الفاء کا امر دونوں طرح آتا ہے۔﴿ وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ؕ ﴾ (20/طٰہٰ:132) ''اور تو حکم دے اپنے اہل کو نماز کا اور ثابت قدم رہ اس پر۔'' حدیث مبارک میں ہے: ''مُرُوْا اَوْلَادَكُمْ بِالصَّلَاةِ وَهُمْ اَبْنَاءُ سَبْعِ سِنِيْنَ اپنے بچوں کو سات سال کی عمر میں نماز کا حکم دو۔''

اٰمِرٌ ج: اٰمِرُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ حکم دینے والا۔﴿ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ﴾ (9/التوبۃ:112) ''اور ترغیب دینے والے بھلائی کی اور منع کرنے والے برائی سے۔''

اَمَّارٌ فَعَّالٌ کے وزن پر مبالغے کا صیغہ ہے۔ بطور اسم الفاعل استعمال ہوتا ہے۔ بار بار حکم دینے والا۔

اَمَّارَةٌ فَعَّالَةٌ کا وزن ہے۔ بار بار حکم دینے والی۔﴿ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ ﴾ (12/یوسف:53) ''بے شک نفس تو برائی پر ابھارنے والا ہی ہے۔''

اَمْرٌ اَمْرٌ کا لفظ عربی زبان میں بہت سے معنوں میں آتا ہے۔ مثلاً

(ا) بطور مصدر، جیسے اوپر لغت میں بیان کیا گیا۔ اس صورت میں اس کا مطلب ہوتا ہے حکم دینا۔

(ب) بطور اسم ذات بمعنی حکم۔ اس صورت میں اس کی جمع اَوَامِرُ آتی ہے جیسے فرمایا:﴿ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ؕ ﴾ (3/154:) ''آپ کہہ دیجئے کل کا کل حکم اللہ کے لیے ہی ہے۔'' اور اسی معنی کے لحاظ سے اولی الامر کا مطلب ہے ''حکم والے۔'' جیسے سورۃ النساء کی آیت 59 میں فرمایا: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ ''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول ﷺ کی اور اُن لوگوں کی جو تم میں سے صاحبِ امر ہوں۔''

(ج) اَمْرٌ کی جمع جب اُمُوْرٌ آئے تو بھی یہ بطور اسم ذات کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً

(1) ہر شاندار قول و فعل کو کہتے ہیں۔

(2) اختیار۔ جیسے فرمایا:﴿ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ؕ ﴾ (3/آل عمران:154) ''وہ لوگ کہتے ہیں کیا ہمارے لئے ہے اختیار میں سے کچھ بھی۔''

(3) فرائض۔ کام۔ جیسے فرمایا:﴿ وَ اَوْحٰى فِيْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا ؕ ﴾ (41/حٰمٓ السجدۃ:12) ''اور اس نے وحی کیا ہر آسمان میں اس کے مناسب احکام (یعنی اُن کے مخصوص کام)۔''﴿ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴾ (3/آل عمران:186) ''اور اگر تم لوگ ثابت قدم رہو اور تقویٰ اختیار کرو تو یقیناً یہ بڑے حوصلے کے کاموں میں سے ہے۔''

(4) معاملات:﴿ وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ ﴾ (11/ھود:123) ''اور اس کی طرف ہی لوٹائے جائیں گے کل کے

کل معاملات۔''

(5) اللہ تعالیٰ کی ایک مخصوص صفت کے لیے ہے جیسے فرمایا: ﴿اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ط﴾ (7/الاعراف:54) ''آگاہ ہوجاؤ، اُسی کے لیے ہے خلق اور امر۔'' اس آیت مبارکہ میں خلق اور امر کے دو مفہوم بیان کیے گئے ہیں پہلا مفہوم یہ کہ اس آیت مبارکہ میں خلق سے مراد ہے پیدا کرنا اور امر سے مراد ہے ان کی تدبیر کرنا اور ان کے لیے تکوینی اور تشریعی احکام دینا۔ دوسرے مفہوم کے اعتبار سے خلق سے مراد ''عالم خلق'' ہے یعنی زمین و آسمان اور جو کچھ اس میں شامل ہے اور امر سے مراد ''عالم امر'' ہے، جہاں نہ وقت درکار رہتا ہے اور نہ مادے کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہاں صرف ''کُنْ'' کہہ دیا جاتا ہے اور چیز وجود میں آجاتی ہے۔ فرشتوں، انسانی ارواح اور وحی کا تعلق اسی 'عالم امر' سے ہے۔ اسی لیے قرآن مجید میں فرمایا: ﴿قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ﴾ (17/بنی اسراءیل:85) ''آپؐ جواب دے دیجئے کہ روح میرے رب کے حکم سے ہے اور تمہیں بہت ہی کم علم دیا گیا ہے۔''

اِمْرٌ اسم ذات ہے۔ ناپسندیدہ یا بری بات۔ خلاف شرع اور خلاف عقل سلیم بات۔ ﴿لَقَدْ جِئْتَ شَيْـًٔا اِمْرًا ﴾ (18/الکہف:71) ''تو آیا ہے ایک ناپسندیدہ چیز کے پاس یعنی تو نے ایک بہت برا کام کیا ہے۔''

(افتعال) **اِئْتِمَارًا** مشورہ کرنا۔ سازش کرنا۔ ﴿قَالَ يٰمُوْسٰٓى اِنَّ الْمَلَاَ يَاْتَمِرُوْنَ بِكَ لِيَقْتُلُوْكَ﴾ (28/القصص:20) ''اس نے کہا اے موسیٰؑ بیشک سردار لوگ مشورہ کرتے ہیں آپؐ کے لئے کہ وہ لوگ آپؐ کو قتل کردیں۔''

و ص ل

(ض) **(ا) وَصْلًا** (1) ملنا (لازم)۔ ملانا، جوڑنا (متعدی)۔ ﴿وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ﴾ (13/الرعد:21) ''اور وہ لوگ جو جوڑتے ہیں اس کو جس کا حکم دیا اللہ نے کہ وہ جوڑا جائے۔''

(2) کسی سے تعلق رکھنا۔ ﴿اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ﴾ (4/النساء:90) ''سوائے ان لوگوں کے جو تعلق رکھتے ہیں ایک ایسی قوم سے تمہارے اور جس کے مابین معاہدہ ہے۔''

(ب) وُصُوْلًا پہنچنا۔ اِلٰی صلہ کے ساتھ استعمال ہوتا ہے جیسے وُصُوْل اِلَی اللّٰہِ۔ ﴿قَالُوْا يٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَّصِلُوْٓا اِلَيْكَ﴾ (11/ھود:81) ''انہوں نے کہا اے لوطؑ بیشک ہم آپ (یعنی لوطؑ) کے رب کے رسول ہیں، یہ لوگ ہرگز نہیں پہنچیں گے آپؑ تک۔''

وَصِيْلَةٌ اس کے معنی میں اختلاف ہے۔ بعض بزرگوں کے مطابق اس سے مراد وہ اونٹنی ہے جس سے پہلی مرتبہ بھی مادہ پیدا ہوا اور پھر دوبارہ بھی مادہ ہی پیدا ہو۔ اس معنی کے اعتبار سے اس اونٹنی کو وصیلہ اس لیے کہتے ہیں کہ ایک مادہ کے بعد دوسری مادہ مل گئی اور ان کے درمیان کسی نر سے تفریق نہیں ہوئی۔ اس اونٹنی کو وہ اپنے بتوں کے نام پر چھوڑ دیتے تھے۔ اور بعض بزرگوں کی رائے کے مطابق عربوں میں جو بکری مسلسل مادہ بچے دینے کے بعد کسی حمل میں نر اور مادہ بچے اکٹھے دے تو وہ اس مادہ بچے کی وجہ سے نر بچے کو ذبح نہ کرتے اور کہتے وَصَلَتِ الْاُنْثٰی اَخَاھَا پھر اس مادہ بکری کو نر بکرے کے ساتھ ملا کر بتوں کے نام پر چھوڑ دیتے۔ یہ مادہ بکری جو اپنے بھائی کے ساتھ مل کر بتوں کی نذر ہوتی اس کو وصیلہ کہتے تھے۔ (واللہ اعلم)۔ ﴿مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ﴾ (5/المائدۃ:103) ''اللہ نے نہ کوئی بحیرہ مقرر کیا ہے نہ سائبہ اور نہ وصیلہ۔''

(تفعیل) **تَوْصِيْلًا** ملانا۔ پہنچانا۔ رسی کے مختلف ٹکڑوں کو آپس میں جوڑنا اور اُسے مضبوط کرنا۔ عربی زبان میں تَوْصِيْلُ الْقَوْلِ کا مطلب

ہے کسی بات کو بار باراور مسلسل بیان کرتے رہنا۔ جیسے قرآن مجید میں فرمایا: ﴿وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴾ (28/القصص:51) ''اور ہم نے اس کلام کو اُن لوگوں کے لیے یکے بعد دیگرے بھیجا تا کہ یہ لوگ نصیحت مانیں۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔ اس آیت کے حاشیے میں مولانا ماجدیؒ فرماتے ہیں: ''توصیل قول کے معنی ہیں بات کو بار باراور مسلسل بیان کرتے رہنا۔ یہاں مراد یہ ہے کہ ہم قرآن کو تھوڑا تھوڑا کر کے مسلسل نازل کرتے رہے اوراس کے نظم کونہایت مرتبط رکھا۔''

يُفْسِدُوْنَ (ف س د): البقرۃ آیت 11 دیکھیں۔

خ س ر

(س) **خَسَارًا، خَسْرًا** راس المال میں کمی ہو جانا۔ خود نقصان اٹھانا۔ کسی کو نقصان یا گھاٹے میں ڈالنا۔ (لازم ومتعدی)۔ اس کی ضد رَبِحَ (نفع ہونا) ہے۔ ﴿قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَاۗءِ اللّٰهِ﴾ (10/یونس:45) ''گھاٹے میں رہے وہ لوگ جنہوں نے جھٹلایا اللہ سے ملنے کو۔'' ﴿وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ﴾ (7/الاعراف:9) ''اور جن کے ہلکے ہوئے تراز و تو یہ لوگ ہیں جنہوں نے گھاٹے میں ڈالا اپنے نفس کو۔'' اس کا استعمال مادی طور پر مال واسباب میں کمی کے لیے بھی ہوتا ہے اور معنوی طور پر صحت، عقل، ایمان وثواب میں نقصان کے لیے بھی ہوتا ہے۔ جن لوگوں نے دنیا میں کفر کیا اور کفر کی حالت میں ہی مر گئے وہ لوگ قیامت کے روز سب سے زیادہ نقصان میں ہوں گے۔ اس کو قرآن مجید نے اَلْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ کہا ہے۔ ﴿قُلْ اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَاَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اَلَا ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ﴾ (39/الزمر:15) ''آپؐ کہہ دیجئے کہ حقیقی نقصان اٹھانے والے وہ ہیں جو اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو قیامت کے دن نقصان میں ڈال دیں یادرکھو کھلم کھلا نقصان یہی ہے۔'' امام راغبؒ کے مطابق قران مجید میں جہاں خُسْرَان کا لفظ آیا ہے وہاں ایمان وثواب میں نقصان اٹھانا ہی مراد ہے، دنیاوی کاروبار و دیگر چیزوں میں نقصان اٹھانا مراد نہیں۔ (واللہ اعلم)۔

خَاسِرٌ ج: خَاسِرُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ نقصان اٹھانے والا۔ ﴿وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴾ (3/آل عمران:85) ''اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہے۔''

اَخْسَرُ ج: اَخْسَرُوْنَ۔ اسم التفضیل ہے۔ زیادہ گھاٹے میں ہونے والا۔ ﴿لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ﴾ (11/ھود:22) ''یقیناً یہی لوگ ہیں جو آخرت میں سب سے زیادہ نقصان اٹھانے والے ہوں گے۔'' ﴿قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ﴾ (18/الکھف:103) ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم کہیے کیا ہم خبر دیں تم لوگوں کو سب سے زیادہ گھاٹے میں ہونے والوں کی بلحاظ اعمال کے۔''

خُسْرَانٌ فُعْلَانٌ کے وزن پر اسم المبالغہ ہے۔ بے انتہا گھاٹا۔ ﴿اَلَا ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ﴾ (39/الزمر:15) ''سن لو یہ واضح طور پر بے انتہا گھاٹا ہے۔''

خُسْرٌ اسم ذات ہے۔ گھاٹا۔ نقصان۔ ﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ﴾ (103/العصر:2) ''یقینا تمام انسان خسارے میں ہیں۔''

خَسَارٌ اسم ذات ہے۔ گھاٹا۔ نقصان۔ ﴿وَلَا يَزِيْدُ الْكٰفِرِيْنَ كُفْرُهُمْ اِلَّا خَسَارًا ﴾ (35/فاطر:39) ''اور زیادہ نہیں کرتا کافروں کو ان کا کفر کرنا سوائے گھاٹے کے۔''

(افعال) اِخْسَارًا گھاٹا دینا۔ کمی کرنا۔ ﴿ وَلَا تُخۡسِرُوا الۡمِیۡزَانَ ۝ ﴾ (55/الرحمٰن:9) ’’اور تم لوگ کمی مت کرو ترازو میں یعنی تول میں۔‘‘

مُخْسِرٌ ج: مُخْسِرُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ کمی کرنے والا۔ ﴿ اَوۡفُوا الۡکَیۡلَ وَ لَا تَکُوۡنُوۡا مِنَ الۡمُخۡسِرِیۡنَ ۝ ﴾ (26/الشعراء:181) ’’تم لوگ پورا بھرو پیمانے کو اور مت ہو جاؤ کمی کرنے والوں میں سے۔‘‘

(تفعیل) تَخْسِیْرًا کسی کو گھاٹے میں ڈالنا۔ نقصان پہنچانا۔ ہلاک کرنا۔ ﴿ فَمَا تَزِیۡدُوۡنَنِیۡ غَیۡرَ تَخۡسِیۡرٍ ۝ ﴾ (11/ھود:63) ’’تم تو میرا نقصان ہی بڑھا رہے ہو۔‘‘

ترکیب اَلَّذِیْنَ اسم موصول ہے اور جملہ فعلیہ یَنْقُضُوْنَ عَھْدَ اللّٰہِ مِنْۢ بَعْدِ مِیْثَاقِہٖ اس کا صلہ ہے۔ صلہ اور موصول مل کر صفت ہے گزشتہ آیت کے آخری لفظ اَلْفٰسِقِیْنَ کی۔ اس لیے اَلَّذِیْنَ محلاً حالت نصب میں ہے کیونکہ اَلْفٰسِقِیْنَ، یُضِلُّ کا مفعول ہونے کی وجہ سے حالت نصب میں ہے۔ عَھْدَ اللّٰہِ، یَنْقُضُوْنَ کا مفعول ہونے کی وجہ سے حالت نصب میں ہے۔ مِیْثَاقِہٖ کی ضمیر عہد کے لیے ہے۔ یَقْطَعُوْنَ عطف ہے یَنْقُضُوْنَ پر۔ 'مَا' اسم موصول ہے اور مفعول ہے۔ اَمَرَ فعل ہے اور اَللّٰہُ اس کا فاعل۔ بِہٖ جار مجرور متعلق ہے اَمَرَ سے اس میں 'ہٗ' ضمیر اسم موصول 'مَا' کی ضمیر عائد ہے۔ اردو میں عام طور پر اسکے ترجمے کی ضرورت نہیں پڑتی کیونکہ اردو میں بیان کا یہ اسلوب رائج نہیں۔ آگے اَنْ یُّوْصَلَ میں اَنْ مصدریہ ہے جس نے اگلے فعل میں مصدری معنی پیدا کر دیے ہیں۔ یُوْصَلَ مضارع مجہول ہے اور اَنْ کی وجہ سے حالت نصب میں ہے اور اس کا نائب الفاعل اس میں شامل 'ھُوَ' ضمیر ہے۔ اور یہ مصدر مؤوّل بدل ہے۔ بِہٖ میں 'ہٗ' ضمیر کا یعنی وَیَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰہُ بِوَصْلِہٖ (درویشؒ) یعنی ’’اور وہ لوگ کاٹتے ہیں اُسے، حکم دیا اللہ نے جس کے جوڑنے کا۔‘‘ آگے یُفْسِدُوْنَ عطف ہے یَقْطَعُوْنَ پر فِی الْاَرْضِ متعلق فعل ہے۔ اُولٰٓئِکَ مبتدا۔ ھُمْ ضمیر فاصل ہے اور تاکید کے لیے ہے اور اَلْخٰسِرُوْنَ خبر ہے۔ (واللہ اعلم)۔

ترجمہ
البقرۃ:27

اَلَّذِیْنَ	یَنْقُضُوْنَ	عَھْدَ اللّٰہِ	مِنْۢ بَعْدِ مِیْثَاقِہٖ ص	وَیَقْطَعُوْنَ
وہ لوگ	توڑتے ہیں	اللہ کے وعدے کو	اُس کو مضبوط کرنے کے بعد	اور وہ لوگ کاٹتے ہیں

مَآ	اَمَرَ اللّٰہُ بِہٖٓ	اَنْ یُّوْصَلَ	وَیُفْسِدُوْنَ
اسے	حکم دیا اللہ نے	جس کے جوڑنے کا	اور وہ لوگ فساد کرتے ہیں

فِی الْاَرْضِ ط	اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝
زمین میں	وہ لوگ ہی نقصان اٹھانے والے ہیں

نوٹ:1 عَھْدُ اللّٰہِ سے مراد وہ ازلی عہد ہے جسے ’’عہد الست‘‘ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، جب اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کی ارواح کو، اس دنیا میں پیدا کرنے سے پہلے، جمع کر کے فرمایا تھا ’’اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ‘‘ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں۔ اس وقت سب نے یک زبان ہو کر کہا بَلٰی یعنی کیوں نہیں آپ ہی ہمارے رب ہیں۔ اس میں بڑی تاکید کے ساتھ اس بات کا اقرار ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی ہمارا رب اور پروردگار ہے اور اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اسکی ہی اطاعت کی جائے۔ یہ وہ ازلی عہد ہے جو انسان اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہو چکا۔ اب دنیا میں پیدا ہونے کے بعد تمام انبیاء اور آسمانی کتابیں اسی عہد کی یاد دہانی اور اس پر عمل کی تفصیلات بتانے کے لیے آئے۔ تقریباً تمام بزرگوں نے اس آیت مبارکہ میں عہد اللہ کی یہ ہی تفسیر کی ہے۔ مولانا مودودیؒ فرماتے ہیں: ’’بادشاہ اپنے ملازموں اور رعایا کے نام جو فرمان یا ہدایات جاری کرتا ہے، ان کو عربی محاورے میں عہد سے تعبیر کیا جاتا ہے، کیونکہ ان کی تعمیل رعایا پر واجب ہوتی ہے۔ یہاں عہد کا لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اللہ کے عہد سے مراد اس کا وہ مستقل فرمان ہے، جس کی رو سے تمام نوعِ انسانی صرف اسی کی بندگی، اطاعت اور پرستش کرنے پر مامور ہے ’’مضبوط باندھ لینے کے بعد‘‘ سے اشارہ اس طرف ہے کہ آدم کی تخلیق کے وقت تمام نوع انسانی سے اس فرمان کی پابندی کا اقرار لے لیا گیا تھا۔ سورۂ اعراف، آیت ۱۷۲ میں اس عہد و اقرار پر نسبتاً زیادہ تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔‘‘ (تفہیم القرآن، ج ۱، ص ۶۰)

نوٹ:2 آیت مبارکہ میں یہ جوفرمایا وَ یَقۡطَعُوۡنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰہُ بِہٖۤ اَنۡ یُّوۡصَلَ تو اس سے مراد ہے کہ وہ ان تمام تعلقات کوتوڑ ڈالتے ہیں جن کو جوڑنے کا اللہ نے حکم دیا۔ ان تعلقات میں وہ تعلق بھی داخل ہے جواللہ اور بندے کے درمیان ہے اور وہ تعلقات بھی شامل ہیں جو ایک انسان کے اپنے گھر والوں، عزیزوں، پڑوسیوں اور عام مسلمانوں کے ساتھ ہوتے ہیں۔ اِن تمام تعلقات کے حقوق ادا کرنے کا نام ہی اسلام ہے اور اِن میں کوتاہی کرنے سے ہی فساد برپا ہوتا ہے اسی لیے آگے فرمایا وَ یُفۡسِدُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ اور اس فساد مچانے کا لازمی نتیجہ ہے آخرت میں نقصان۔ اسی لیے آگے فرمایا اُولٰٓئِکَ ھُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ (واللہ اعلم)۔

آیت: 28

﴿ کَیۡفَ تَکۡفُرُوۡنَ بِاللّٰہِ وَ کُنۡتُمۡ اَمۡوَاتًا فَاَحۡیَاکُمۡ ۚ ثُمَّ یُمِیۡتُکُمۡ ثُمَّ یُحۡیِیۡکُمۡ ثُمَّ اِلَیۡہِ تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۲۸﴾ ﴾

کَیۡفَ کَیۡفَ اسمائے استفہام میں سے ہے اور کسی چیز کی حالت دریافت کرنے کے لیے آتا ہے۔ معنی ہوتا ہے کیسا یا کیسے۔ اسمائے استفہام جملے میں مبتداء، خبر، فاعل اور مفعول بن کر استعمال ہوتے ہیں۔ البتہ کیف کے متعلق بعض علماء کا قول ہے کہ یہ صرف خبر بنتا ہے، مبتدا نہیں بن سکتا کیونکہ اس میں ظرفیت کے معنی پائے جاتے ہیں۔ (واللہ اعلم)۔ کیف جملے میں بطور حال بھی آتا ہے جیسے فرمایا: فَکَیۡفَ اِذَا جِئۡنَا مِنۡ کُلِّ اُمَّۃٍۭ بِشَہِیۡدٍ تو اس وقت ان کا کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت میں سے ایک گواہی دینے والا لائیں گے۔ جہاں اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے متعلق کیف استعمال ہوتو وہاں اظہارِ تعجب یا مخاطب کو تنبیہ کرنا مقصود ہوتا ہے۔ جیسے آیت زیرِ مطالعہ میں فرمایا: کَیۡفَ تَکۡفُرُوۡنَ بِاللّٰہِ یا فرمایا: کَیۡفَ یَکُوۡنُ لِلۡمُشۡرِکِیۡنَ عَہۡدٌ عِنۡدَ اللّٰہِ وغیرہ۔

تَکۡفُرُوۡنَ (ک ف ر): البقرۃ آیت 6 دیکھیں۔ اَللّٰہُ (ء ل ہ): آیت بسم اللہ دیکھیں۔ کُنۡتُمۡ (ک و ن): البقرۃ آیت 10 دیکھیں۔
اَمۡوَاتًا اور یُمِیۡتُ (م و ت): البقرۃ آیت 19 دیکھیں۔ اَحۡیَا اور یُحۡیِیۡ (ح ی ی): البقرۃ آیت 26 دیکھیں۔
تُرۡجَعُوۡنَ (ر ج ع): البقرۃ آیت 18 دیکھیں۔

ترکیب کَیۡفَ اسم استفہام ہے۔ تَکۡفُرُوۡنَ فعل اور اس کا فاعل اس میں شامل ضمیر اَنۡتُمۡ ہے جو آیت 26 میں مذکور فاسقین کے لیے ہے اور بِاللّٰہِ متعلق فعل ہے۔ کَیۡفَ تَکۡفُرُوۡنَ بِاللّٰہِ جملہ استفہام ہے اور کَیۡفَ یہاں اظہار تعجب یا کافروں کو تنبیہ کے لیے آیا ہے۔ وَ کُنۡتُمۡ میں 'وَ' حالیہ ہے اور کُنۡتُمۡ کا اسم اس میں شامل ضمیر ہے اور اَمۡوَاتًا، کَانَ کی خبر ہے اسی لیے حالت نصب میں ہے اور یہ جملہ حال بیان کررہا ہے تَکۡفُرُوۡنَ کی ضمیر فاعلی کا۔ فَاَحۡیَاکُمۡ میں 'فَ' حرف عطف ہے اور اَحۡیَا فعل اور اس کا فاعل اس میں شامل ضمیر ہے جو اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اور کُمۡ اس کا مفعول ہے اس جملے کا عطف جملہ ماقبل پر ہے۔ ثُمَّ حرف عطف ہے اور یُمِیۡتُ فعل با فاعل اور کُمۡ ضمیر مفعولی ہے۔ یُمِیۡتُ کی ضمیر فاعلی بھی اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اور اس جملے کا عطف بھی جملہ ماقبل پر ہے۔ یہی ترکیب یُحۡیِیۡکُمۡ کی ہے۔ آگے ثُمَّ حرف عطف ہے۔ اِلَیۡہِ متعلق ہے تُرۡجَعُوۡنَ سے اور یہ حصر کا مفہوم پیدا کررہا ہے۔ تُرۡجَعُوۡنَ، مضارع مجہول ہے اور اس کا نائب الفاعل اس میں شامل ضمیر ہے۔ (واللہ اعلم)۔

ترجمہ البقرۃ:28

کَیۡفَ تَکۡفُرُوۡنَ بِاللّٰہِ	وَ کُنۡتُمۡ	اَمۡوَاتًا
تم لوگ کیسے انکار کرتے ہو اللہ کا	حالانکہ تم لوگ	مردہ تھے

فَاَحۡیَاکُمۡ ۚ	ثُمَّ یُمِیۡتُکُمۡ	ثُمَّ یُحۡیِیۡکُمۡ
تو اس (اللہ) نے زندہ کیا تم کو	پھر وہ موت دے گا تم کو	پھر وہ زندہ کرے گا تم کو

ثُمَّ اِلَیۡہِ	تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۲۸﴾
پھر اس ہی کی طرف	تم لوٹائے جاؤ گے

آیت: 29

﴿هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ۗ ثُمَّ اسْتَوٰۤی اِلَی السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ؕ وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۲۹﴾ ع﴾

خَلَقَ (خ ل ق): البقرۃ آیت 21 دیکھیں۔ اَلْاَرْضِ (ء ر ض): البقرۃ آیت 11 دیکھیں۔

ج م ع

(ف) **جَمْعًا** متفرق چیزوں کو باہم ملا دینا۔ اکٹھا کرنا۔ جمع کرنا۔ (متعدی)۔ ﴿فَكَیْفَ اِذَا جَمَعْنٰهُمْ لِیَوْمٍ لَّا رَیْبَ فِیْهِ ۫﴾ (3/آل عمران:25) ''تو کیسا ہوگا جب ہم اکٹھا کریں گے ان کو اس دن کے لئے جس میں کوئی شک نہیں ہے۔'' ﴿اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ﴿۱۷﴾ ۚ﴾ (75/القیامۃ:17) ''یقیناً ہم پر ہے اسکا یعنی قرآن کا جمع کرنا اور اسکا پڑھنا۔''

جَمْعٌ تثنیہ: جَمْعَانِ۔ مصدر کے علاوہ اسم ذات بھی ہے۔ جمع کی ہوئی چیز یعنی جماعت۔ ﴿سَیُهْزَمُ الْجَمْعُ وَیُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ ﴿۴۵﴾﴾ (54/القمر:45) ''شکست دی جائے گی اس جماعت کو اور وہ لوگ پیٹھ پھیریں گے۔'' ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ یَوْمَ الْتَقَی الْجَمْعٰنِ ۙ﴾ (3/آل عمران:155) ''تم میں سے جن لوگوں نے اُس دن پیٹھ دکھائی جس دن دو جماعتیں آمنے سامنے ہوئیں۔''

جَامِعٌ اسم الفاعل ہے۔ جمع کرنے والا۔ ﴿رَبَّنَاۤ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِیَوْمٍ لَّا رَیْبَ فِیْهِ ؕ﴾ (3/آل عمران:9) ''اے ہمارے رب بیشک تو لوگوں کو جمع کرنے والا ہے اس دن کے لئے جس میں کوئی شک نہیں ہے۔''

مَجْمُوْعٌ ج: مَجْمُوْعُوْنَ۔ اسم المفعول ہے۔ جمع کیا گیا۔ جمع کیا ہوا۔ ﴿ذٰلِكَ یَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ ۙ لَّهُ النَّاسُ﴾ (11/ھود:103) ''وہ دن جس میں سب لوگ جمع کیے جائیں گے۔'' ﴿اِنَّ الْاَوَّلِیْنَ وَالْاٰخِرِیْنَ ﴿۴۹﴾ لَمَجْمُوْعُوْنَ ۙ۬﴾ (56/الواقعہ:49-50) ''بیشک اگلے اور پچھلے یعنی سب جمع کیے جانے والے ہیں۔''

مَجْمَعٌ اسم الظرف ہے۔ جمع کرنے کی جگہ۔ ﴿لَاۤ اَبْرَحُ حَتّٰۤی اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَیْنِ﴾ (18/الکہف:60) ''میں نہیں ٹلوں گا یہاں تک کہ میں پہنچوں دو سمندروں کو ملانے کی جگہ۔''

جُمْعَةٌ اور **جُمُعَةٌ** دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ لفظی معنی ہے اجتماع۔ جمعہ کا دن، چونکہ اس دن سب نماز کے لیے ایک جگہ جمع ہوتے ہیں اس لیے جمعہ کہلاتا ہے۔ ﴿اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِكْرِ اللّٰهِ﴾ (62/الجمعۃ:9) ''جب ندا دی جائے نماز کے لئے جمعہ کے دن تو لپکو اللہ کی یاد کی طرف۔''

جَمِیْعٌ **فَعِیْلٌ** کے وزن پر صفت ہے۔ کُل کے کُل۔ سب کے سب۔ جماعت۔ ﴿قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِیْعًا ۚ﴾ (2/البقرۃ:38) ''ہم نے کہا تم لوگ اترو اس میں سے سب کے سب۔'' ﴿اَمْ یَقُوْلُوْنَ نَحْنُ جَمِیْعٌ مُّنْتَصِرٌ ﴿۴۴﴾﴾ (54/القمر:44) ''یا یہ کہتے ہیں کہ ہم غلبہ پانے والی جماعت ہیں۔''

اَجْمَعُ ج: اَجْمَعُوْنَ۔ **اَفْعَلُ** کے وزن پر صفت ہے۔ سب۔ تمام۔ ﴿فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ﴿۳۰﴾ ۙ﴾ (15/الحجر:30) ''چنانچہ تمام فرشتوں نے سجدہ کیا۔'' ﴿اُولٰٓئِكَ عَلَیْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ ﴿۱۶۱﴾ ۙ﴾ (2/البقرۃ:161) ''یہ لوگ ہیں جن پر اللہ کی لعنت ہے اور فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی۔''

(افعال) اِجْمَاعًا کسی بات یا کام پر جمع ہونا۔ اتفاق کرنا۔ پختہ ارادہ کرنا۔ اکٹھا کرنا۔ ﴿ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ ﴾ (12/ یوسف:102) ''اور آپ اُن کے پاس نہیں تھے جب وہ متفق ہو گئے تھے اس بات پر۔'' ﴿ فَلَمَّا ذَهَبُوْا بِهٖ وَ اَجْمَعُوْٓا اَنْ يَّجْعَلُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ ﴾ (12/ یوسف:15) ''اور متفق ہوئے کہ ڈالیں اُس کو گمنام کنویں میں۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ) ''اور پختہ ارادہ کر لیا کہ اُنہیں اندھیرے کنویں میں ڈال دیں۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔ اسی سے ''اجماع امت'' ہے جو کہ اصول اربعہ میں سے ایک مستقل اصول ہے یعنی قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس۔

اَجْمِعْ ج: اَجْمِعُوْا۔ فعل امر ہے۔ تو جمع کر۔ ﴿ فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَ شُرَكَآءَكُمْ ﴾ (10/ یونس:71) ''تو تم جمع کر لو اپنی تدبیر اور اپنے شریکوں کو۔''

(افتعال) اِجْتِمَاعًا لوگوں یا چیزوں کا جمع ہونا۔ (لازم)۔ ﴿ قُلْ لَّىِٕنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَ الْجِنُّ عَلٰۤى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ ﴾ (17/ بنی اسرائیل:88) ''آپ ﷺ کہیے کہ اگر اکٹھے ہوں تمام انسان اور تمام جن اس پر کہ وہ لے آئیں اس قرآن کی مانند تو وہ نہ لا سکیں گے اس جیسا۔''

مُجْتَمِعٌ ج: مُجْتَمِعُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ جمع ہونے والا۔ ﴿ وَّ قِيْلَ لِلنَّاسِ هَلْ اَنْتُمْ مُّجْتَمِعُوْنَ ﴾ (26/ الشعراء:39) ''اور کہا گیا لوگوں سے کیا تم لوگ جمع ہونے والے ہو۔''

> اِسْتَوٰٓى اور سَوّٰى (س و ی): البقرۃ آیت 6 دیکھیں۔ اَلسَّمَآءُ اور سَمٰوٰتٍ (س م و): آیت بسم اللہ دیکھیں۔
> كُلٌّ (ک ل ل): البقرۃ آیت 20 دیکھیں۔ شَیْءٍ (ش ی ء): البقرۃ آیت 20 دیکھیں۔ عَلِيْمٌ (ع ل م): الفاتحہ آیت 1 دیکھیں۔

ترکیب

هُوَ مبتدا ہے اور یہ ضمیر گذشتہ آیت میں مذکور لفظ اللہ کے لیے ہے۔ اَلَّذِیْ اسم موصول ہے۔ اور جملہ فعلیہ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا اس کا صلہ ہے۔ صلہ اور موصول مل کر خبر ہے هُوَ کی۔ خَلَقَ کا مفعول 'مَا' ہے جَمِيْعًا حال ہے اسم موصول 'مَا' کا۔ لَكُمْ، خَلَقَ سے متعلق ہے۔ ثُمَّ حرف عطف ہے۔ اِسْتَوٰٓى فعل اور اس میں شامل ضمیر ''هُوَ'' اس کا فاعل ہے جو اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ اِلَى السَّمَآءِ متعلق فعل ہے۔ فَسَوّٰىهُنَّ میں ف عطف کا ہے اور سَوّٰى فعل بافاعل اور هُنَّ اس کا مفعول ہے۔ ضمیر هُنَّ، اَلسَّمَآءِ کے لیے ہے جو کہ واحد اور جمع دونوں طرح استعمال ہوتا ہے اس لیے اس کے لیے ضمیر هُنَّ جائز ہے۔ اور بعض بزرگوں کے نزدیک ''اَلسَّمَآءِ'' یہاں اسم جنس کے طور پر آیا ہے اور معناً جمع ہے۔ اس لیے ''هُنَّ'' کی ضمیر آئی ہے۔ (ماجدیؒ)۔ سَبْعَ حال یا بدل ہے، هُنَّ ضمیر کا۔ اور سَمٰوٰتٍ مضاف الیہ اور تمیز ہے۔ هُوَ۔ مبتدا، بِكُلِّ شَیْءٍ متعلق خبر مقدم اور عَلِيْمٌ خبر ہے۔ (واللہ اعلم)۔

ترجمہ البقرۃ:29

هُوَ الَّذِيْ	خَلَقَ	لَكُمْ	مَّا فِي الْاَرْضِ	جَمِيْعًا	ثُمَّ
وہی (اللہ) ہے جس نے	پیدا کیا	تمہارے لئے	جو کچھ زمین میں ہے	کُل کا کُل	پھر

اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ	فَسَوّٰى	هُنَّ	سَبْعَ سَمٰوٰتٍ
وہ متوجہ ہوا آسمان کی طرف	تو اس نے ٹھیک ٹھیک بنا دیا	اُنہیں	سات آسمان

وَهُوَ	بِكُلِّ شَیْءٍ	عَلِيْمٌ
اور وہ	ہر چیز کو	جاننے والا ہے

نوٹ:1 لَكُمْ میں لام تملیک یعنی ملکیت ظاہر کرنے والا لام نہیں ہے۔ انسان اس زمین کی کسی بھی چیز کا مالک نہیں ہے۔ انسان خلیفہ ہے اور خلیفہ مالک نہیں ہوتا۔ لَكُمْ کا لام تمتع کا ہے یعنی فائدہ اٹھانے کے لئے ہے۔ اس لئے یہ مفہوم ''تمہارے لئے'' یا ''تمہاری خاطر'' کے ترجمہ سے ادا کیا جا سکتا ہے۔

نوٹ:2 اَلسَّمَآءُ کی لغوی بحث آپ آیت بسم اللہ کے تحت پڑھ چکے ہیں۔ یہاں آیت مبارکہ میں ''اَلسَّمَآءُ'' سے اَجرام عُلوی (یعنی سورج، چاند، ستارے) اسمتِ عُلوی (اوپر کی طرف یا بلندی) مراد لیا گیا ہے۔ تراجم میں عام طور پر اس کا ترجمہ ''آسمان'' سے ہی کیا گیا ہے۔ البتہ اس لفظ کے لغوی معنی سے بھی ترجمہ کیا گیا ہے۔ مثلاً صاحبؒ ضیاء القرآن فرماتے ہیں ''پھر توجہ فرمائی اوپر کی طرف۔'' اور صاحبِ تفہیم القرآن فرماتے ہیں: ''پھر اوپر کی طرف توجہ فرمائی۔'' صاحبؒ تفسیر حقانی اس آیت میں اَلسَّمَآءُ کے لفظ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں: ''اَلسَّمَآءُ کی ہمزہ، واؤ سے بدلی ہوئی ہے۔ پہلے واؤ تھا اور جو واؤ، الف کے بعد زائد ہو، بیشتر عرب اس کو ہمزہ سے بدل دیتے ہیں۔ لغت میں لفظ سماء کا چند معانی پر اطلاق ہوتا ہے۔ بادل کو بھی کہتے ہیں اور افق کو بھی اور اوپر کی جانب کو بھی اور اس نیلی چھت کو بھی کہ جو ایک گول گنبد سا نظر آتا ہے۔ قرآن میں جو جا بجا سماء کا ذکر ہے کہ ہم نے اس کو اپنے ہاتھ سے بنایا۔﴿ وَالسَّمَآءَ بَنَيۡنٰهَا بِاَيۡىدٍ ﴾ وغیرہ من الآیات۔ پس اس سے وہی آخری معنی مراد ہیں کہ جس کو ہماری زبان میں آسمان اور ہندی میں اکاش اور انبر کہتے ہیں اور ہر زبان میں اس کا نام ہے۔ (تفسیر حقانی ج۱ص۴۰۹، تلخیصاً)

آیت:30

﴿ وَاِذۡ قَالَ رَبُّكَ لِلۡمَلٰٓٮِٕكَةِ اِنِّىۡ جَاعِلٌ فِى الۡاَرۡضِ خَلِيۡفَةً ‌ؕ قَالُوۡٓا اَتَجۡعَلُ فِيۡهَا مَنۡ يُّفۡسِدُ فِيۡهَا وَيَسۡفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحۡنُ نُسَبِّحُ بِحَمۡدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ‌ؕ قَالَ اِنِّىۡٓ اَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۳۰﴾ ﴾

اِذۡ جب، جبکہ۔ اِذۡ ظرف زمان ہے یعنی اس میں کسی کام کے کرنے یا ہونے کے وقت کا مفہوم ہوتا ہے۔ اِذۡ اکثر زمانہ ماضی کے لیے آتا ہے اگرچہ مضارع پر داخل ہوا ہو۔ جیسے فرمایا:﴿ وَاِذۡ يَرۡفَعُ اِبۡرٰهٖمُ الۡقَوَاعِدَ مِنَ الۡبَيۡتِ وَاِسۡمٰعِيۡلُ ؕ ﴾ ''اور وہ وقت یاد کرو جب حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ بیت اللہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے۔'' اِذۡ کے بعد فعل بھی آسکتا ہے (جیسے اوپر آیت میں آیا) اور اسم بھی آسکتا ہے جیسے فرمایا اِذۡ هُمَا فِى الۡغَارِ ''جب وہ دونوں غار میں تھے۔'' قرآنِ مجید میں جہاں کہیں آیت کے شروع میں اِذۡ آیا ہے وہاں اُذۡكُرۡ یا اُذۡكُرُوۡا محذوف مانا جاتا ہے جیسے وَاِذۡ يَرۡفَعُ کے معنی ہیں ''اور وہ وقت یاد کرو جب''۔ مولانا امین احسن اصلاحیؒ اِذۡ کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''عربی زبان میں جب کلام کا آغاز ''اِذۡ'' سے ہوتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس سے پہلے خیال کرو۔ تصور کرو، یاد کرو یا ان کے ہم معنی کوئی فعل یہاں محذوف ہے۔ عموماً اس کے بعد کسی ایسی ہی سرگزشت یا واقعہ کا حوالہ آتا ہے جو یا تو مخاطب کے علم میں ہو، یا خود متکلم اس کی قطعیت پر اس درجہ مطمئن ہو کہ ایک معلوم و معروف حقیقت کی حیثیت سے اس کا حوالہ دے سکے۔'' (تدبر قرآن، ج۱ص۱۵۶)

قَالَ، قَالُوۡٓا (ق و ل): البقرۃ آیت 8 دیکھیں۔ رَبٌّ (ر ب ب): الفاتحہ آیت 1 دیکھیں۔ اَلۡمَلٰٓٮِٕكَةُ (م ل ك): الفاتحہ آیت 3 دیکھیں۔
جَاعِلٌ، تَجۡعَلُ (ج ع ل): البقرۃ آیت 19 دیکھیں۔ اَلۡاَرۡضُ (ء ر ض): البقرۃ آیت 11 دیکھیں۔

خ ل ف

(ن) خِلَافَةً کسی کا جانشین ہونا۔ کسی کا قائم مقام ہونا۔
خَلۡفًا کسی کے پیچھے آنا۔﴿ فَخَلَفَ مِنۡۢ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ ﴾ (7/الاعراف:169) ''پھر اُن کے پیچھے آئے ناخلف۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)﴿ فَخَلَفَ مِنۡۢ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ ﴾ (19/مریم:59) ''پھر اُن کے بعد بعض ایسے ناخلف جانشین ہوئے جنہوں نے نماز کو برباد کیا۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)﴿ قَالَ بِئۡسَمَا خَلَفۡتُمُوۡنِىۡ مِنۡۢ بَعۡدِىۡ ۚ ﴾ (7/الاعراف:150) ''تو (حضرت موسیٰ نے) فرمایا تم نے میرے بعد بڑی بری جانشینی کی۔'' (ترجمہ احسن البیان)

خَلْفٌ (1) جانشین۔ واحد اور جمع دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ خَلْفٌ اس نسل کو کہتے ہیں جو دوسری نسل کے بعد آئے۔ عربی زبان میں خَلَفٌ (لام کی زبر کے ساتھ) کے معنی بھی جانشین کے ہوتے ہیں۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ خَلْفٌ (لام کے سکون کے ساتھ) عام طور پر برے جانشین اور بری اولاد کے لیے استعمال ہوتا ہے اور خَلَفٌ (لام کی زبر کے ساتھ) اچھے جانشین اور اچھی اولاد کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ خَلْفٌ قرآن مجید میں دو مرتبہ آیا ہے (الاعراف۔169) اور (مریم۔59) اور دونوں جگہ مذمت ہی کے انداز میں ان کا ذکر ہوا ہے۔ خَلَفٌ کا لفظ قرآنِ مجید میں استعمال نہیں ہوا۔ (واللہ اعلم)

(2) خَلْفٌ، ظرف کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ مطلب ہوتا ہے ''پیچھے''۔ یعنی جہاتِ ستہ میں سے ہے (اَمَام۔ خَلْف) (یَمِیْن۔ شِمَال) (فَوْق۔ تَحْت) ﴿یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ ج﴾ (2/البقرۃ:255) ''وہ جانتا ہے جو ان کے سامنے ہے اور جو ان کے پیچھے ہے۔''

اُخْلُفْ فعل امر ہے۔ تو پیچھے رہ۔ تو جانشینی کر۔ ﴿وَ قَالَ مُوْسٰی لِاَخِیْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِیْ فِیْ قَوْمِیْ﴾ (7/الاعراف:142) ''اور کہا موسیٰؑ نے اپنے بھائی ہارونؑ کو، تو میرے پیچھے رہ میری قوم میں یا تو میری قوم میں میری جانشینی کر۔''

خَالِفٌ ج: خَالِفُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ پیچھے رہنے والا، خَلْفًا مصدر سے۔ ﴿فَاقْعُدُوْا مَعَ الْخٰلِفِیْنَ ﴿۸۳﴾﴾ (9/التوبۃ:83) ''تو تم لوگ بیٹھو پیچھے رہنے والوں کے ساتھ۔'' پیر کرم شاہ صاحبؒ اس آیت میں خٰلِفِیْنَ کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''خَالِفٌ کا ایک معنی تو یہ ہے پیچھے رہ جانے والا۔ لیکن علامہ قرطبیؒ نے فرمایا ہے کہ خلف بمعنی فسد کے ہے جس طرح کہتے ہیں خَلَفَ اللَّبَنُ دودھ خراب ہو گیا۔ یا عرب کہتے ہیں کہ فُلَانٌ خلافة اَهْلِ بَیْتِهٖ فلاں شخص اپنے سارے کنبہ سے فسادی ہے۔ اسی سے خُلُوْفُ فَمِ الصَّائِمِ ہے جبکہ منہ کی بو روزہ رکھنے سے خراب ہو جاتی ہے۔ اب آیت کا معنی یہ ہوگا فَاقْعُدُوْا مَعَ الْفَاسِدِیْنَ یعنی فساد برپا کرنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو۔'' (ضیاء القرآن، ج ۲، ص ۲۳۹)

خَالِفَةٌ ج: خَوَالِفُ۔ اسم الفاعل خَالِفٌ کا مؤنث ہے۔ پیچھے رہنے والی عورتوں کو کہتے ہیں جو مردوں کے جانے کے بعد گھروں میں رہتی ہیں۔ ﴿رَضُوْا بِاَنْ یَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ﴾ (9/التوبۃ:87) ''راضی ہوئے اس پر کہ وہ لوگ ہوں پیچھے رہنے والیوں کے ساتھ۔''

خَلِیْفَةٌ ج: خُلَفَاءُ اور خَلَائِفُ۔ جانشین۔ نائب۔ فَعِیْلٌ کے وزن پر خَلِیْفٌ تھا لیکن ۃ مبالغہ کا اضافہ کر کے خَلِیْفَةٌ بنایا گیا۔ ۃ مبالغے کے لیے بھی آتی ہے جیسے عَلَّامَةٌ، خَائِنَةٌ وغیرہ۔ خلیفہ وہ ہے جو کسی کے ملک میں اس کے نائب کی حیثیت سے اس کے احکام کے مطابق عمل کرائے۔ خلیفہ مالک نہیں ہوتا۔ بلکہ اصل مالک کا نائب ہوتا ہے۔ ﴿یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ﴾ (38/ص:26) ''اے داود بیشک ہم نے بنایا تم کو جانشین زمین میں۔'' ﴿اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ﴾ (7/الاعراف:69) ''جب اس نے بنایا تم لوگوں کو جانشین، نوحؑ کی قوم کے بعد۔'' ﴿هُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ ط﴾ (35/فاطر:39) ''وہ ہے جس نے بنایا تم لوگوں کو جانشین زمین میں۔''

خِلْفَةٌ کسی کے پیچھے پیچھے آنے والا۔ اصل میں مصدر ہے جس کا مطلب ہے لگاتار ایک دوسرے کے پیچھے آنا۔ ﴿وَ هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ خِلْفَةً﴾ (25/الفرقان:62) ''وہ ہے جس نے بنایا رات کو اور دن کو پیچھے پیچھے آنے والا ہوتے ہوئے۔''

(افعال) **اِخْلَافًا** (1) وعدہ کے خلاف کرنا۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادَ ﴿۹﴾ ع﴾ (3/آل عمران:9) ''بیشک اللہ وعدہ کے خلاف نہیں

کرتا۔''(2) کسی چیز کے بدلے میں کچھ دینا۔﴿ وَمَآ اَنۡفَقۡتُمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ فَھُوَ یُخۡلِفُہٗ ۚ﴾(34/سبا:39)''اور جو تم لوگ خرچ کرتے ہو، کوئی بھی چیز، تو وہ اس کے بدلے میں دے گا۔''

مُخۡلِفٌ اسم الفاعل ہے۔ وعدہ کے خلاف کرنے والا۔﴿ فَلَا تَحۡسَبَنَّ اللّٰہَ مُخۡلِفَ وَعۡدِہٖ رُسُلَہٗ ؕ﴾(14/ابراہیم:47)''تو ہرگز گمان مت کر اللہ کو اپنے وعدہ کے خلاف کرنے والا، اپنے رسولوں سے۔''

(تفعیل) **تَخۡلِیۡفًا** کسی کو پیچھے کر دینا۔ پیچھے چھوڑ دینا۔﴿ وَّ عَلَی الثَّلٰثَۃِ الَّذِیۡنَ خُلِّفُوۡا ؕ﴾(9/التوبۃ:118)''اور اُن تین شخصوں پر جن کو پیچھے رکھا تھا۔''(ترجمہ شیخ الہندؒ)۔ خُلِّفُوۡا ماضی مجہول کا صیغہ ہے۔

مُخَلَّفٌ ج: مُخَلَّفُوۡنَ۔ اسم المفعول ہے۔ پیچھے چھوڑ ہوا۔ یعنی جس کو چھوڑ دیا گیا ہو۔﴿ فَرِحَ الۡمُخَلَّفُوۡنَ بِمَقۡعَدِھِمۡ ﴾(9/التوبۃ:81)''خوش ہوئے پیچھے چھوڑے ہوئے لوگ اپنے بیٹھ رہنے پر۔''

(مفاعلہ) **مُخَالَفَۃً اور خِلَافًا** کسی کی مخالفت کرنا۔ کسی کے خلاف روش اختیار کرنا۔﴿ فَلۡیَحۡذَرِ الَّذِیۡنَ یُخَالِفُوۡنَ عَنۡ اَمۡرِہٖۤ ﴾(24/النور:63)''تو چاہیے کہ وہ لوگ ڈریں جو خلاف کرتے ہیں اُس کے حکم کے۔'' خِلَافٌ کے معنی ''بعد'' یا ''پیچھے'' کے بھی آتے ہیں جیسے فرمایا:﴿ فَرِحَ الۡمُخَلَّفُوۡنَ بِمَقۡعَدِھِمۡ خِلٰفَ رَسُوۡلِ اللّٰہِ ﴾(9/التوبۃ:81)''پیچھے رہ جانے والے لوگ رسول اللہؐ کے جانے کے بعد اپنے بیٹھے رہنے پر خوش ہیں۔''(ترجمہ احسن البیان)۔ اس آیت کے حاشیے میں صاحبِ احسن البیان فرماتے ہیں:''خلاف کے معنی ہیں، پیچھے یا مخالفت۔ یعنی رسول اللہؐ کے جانے کے بعد آپؐ کے پیچھے یا آپؐ کی مخالفت میں مدینہ میں بیٹھے رہے۔'' اسی طرح فرمایا:﴿ وَ اِذًا لَّا یَلۡبَثُوۡنَ خِلٰفَکَ اِلَّا قَلِیۡلًا ﴿۷۶﴾ ﴾(17/بنی اسرائیل:76)''اور اُس وقت نہ ٹھہریں گے وہ بھی تیرے پیچھے مگر تھوڑا۔''(ترجمہ شیخ الہندؒ)''اور اس حالت میں یہ بھی آپؐ کے بعد بہت کم ٹھہرنے پاتے۔''(ترجمہ ماجدیؒ)۔ اس آیت کے حاشیے میں مولانا عبدالماجدؒ فرماتے ہیں:''خلاف یہاں بَعۡد کے معنی میں ہے۔'' خلاف کے معنی ''مخالف جانب'' یا ''اُلٹی طرف سے'' کے بھی آتے ہیں، جیسے فرمایا:﴿ اَوۡ تُقَطَّعَ اَیۡدِیۡھِمۡ وَ اَرۡجُلُھُمۡ مِّنۡ خِلَافٍ ﴾(5/المائدۃ:33)''یا مخالف جانب سے اُن کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیے جائیں۔''(ترجمہ احسن البیان)

(تفعّل) **تَخَلُّفًا** پیچھے رہنا۔﴿ مَا کَانَ لِاَھۡلِ الۡمَدِیۡنَۃِ وَ مَنۡ حَوۡلَھُمۡ مِّنَ الۡاَعۡرَابِ اَنۡ یَّتَخَلَّفُوۡا عَنۡ رَّسُوۡلِ اللّٰہِ ﴾(9/التوبۃ:120)''مناسب نہیں تھا مدینہ والوں کیلئے اور جو ان کے گرد بدو ہیں کہ وہ لوگ پیچھے رہیں اللہ کے رسولؐ سے۔''

(افتعال) **اِخۡتِلَافًا** (1) کسی چیز یا رائے کے خلاف ہونا۔ مختلف ہونا۔﴿ وَ مِنۡ اٰیٰتِہٖ خَلۡقُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ اخۡتِلَافُ اَلۡسِنَتِکُمۡ وَ اَلۡوَانِکُمۡ ؕ﴾(30/الروم:22)''اور اس کی نشانیوں میں سے ہے زمین اور آسمانوں کی پیدائش اور مختلف ہونا تمہاری زبانوں کا اور تمہارے رنگوں کا۔''﴿ اِلَی اللّٰہِ مَرۡجِعُکُمۡ جَمِیۡعًا فَیُنَبِّئُکُمۡ بِمَا کُنۡتُمۡ فِیۡہِ تَخۡتَلِفُوۡنَ ﴿ۙ۴۸﴾ ﴾(5/المآئدہ:48)''اللہ ہی کی طرف تم سب کا پلٹنا ہے تو وہ جتادے گا تم کو وہ جس میں تم اختلاف کیا کرتے تھے۔''

(2) آنا جانا، اِلیٰ کے صلے کے ساتھ۔ عربی میں کہتے ہیں فُلَانٌ یَخۡتَلِفُ اِلَیۡنَا، فلاں ہمارے پاس آتا جاتا ہے۔

مُخۡتَلِفٌ اسم الفاعل ہے۔ مختلف ہونے والا۔ مختلف۔﴿ یَخۡرُجُ مِنۡۢ بُطُوۡنِھَا شَرَابٌ مُّخۡتَلِفٌ اَلۡوَانُہٗ ﴾(16/النحل:69)''اُس کے پیٹ کے اندر سے ایک مشروب نکلتا ہے اُس کی رنگتیں مختلف ہوتی ہیں۔''(ترجمہ ماجدیؒ)

(استفعال) **اِسۡتِخۡلَافًا** کسی کو جانشین مقرر کرنا۔ نائب بنانا۔﴿ اِنۡ یَّشَاۡ یُذۡھِبۡکُمۡ وَ یَسۡتَخۡلِفۡ مِنۡۢ بَعۡدِکُمۡ مَّا یَشَآءُ ﴾(6/الانعام:133)''اگر وہ چاہے تو لے جائے تم لوگوں کو اور جانشین مقرر کرے تمہارے بعد جسے چاہے۔''

مُسۡتَخۡلَفٌ ج: مُسۡتَخۡلَفُوۡنَ۔ اسم المفعول ہے۔ جس کو جانشین یا نائب بنایا گیا۔﴿ وَ اَنۡفِقُوۡا مِمَّا جَعَلَکُمۡ مُّسۡتَخۡلَفِیۡنَ فِیۡہِ ؕ﴾(57/الحدید:7)''اور جس مال میں اُس نے تم کو دوسروں کا جانشین بنایا ہے اُس میں سے خرچ کرو۔''

مَنۡ: البقرۃ آیت 8 دیکھیں۔ یُفۡسِدُ (ف س د): البقرۃ آیت 11 دیکھیں۔

س ف ك

(ض) سَفۡكًا خون ریزی کرنا۔ کسی چیز کو بہانا۔ ﴿ وَاِذۡ اَخَذۡنَا مِیۡثَاقَكُمۡ لَا تَسۡفِكُوۡنَ دِمَآءَكُمۡ ﴾(2/البقرۃ:84)''اور جب ہم نے لیا پختہ وعدہ تم سے کہ تم لوگ نہیں بہاؤ گے اپنوں کا خون۔''اسی سے انتہائی قاتل یا ظالم شخص کو سَفّاک اور ایسی کارروائی کو سفاکیت کہہ دیا جاتا ہے۔

د م ی

(س) دَمِیَ زخم سے خون نکلنا۔

دَمٌ ج: دِمَاءٌ۔ اسم ذات ہے۔ خون۔ ﴿ حُرِّمَتۡ عَلَیۡكُمُ الۡمَیۡتَةُ وَالدَّمُ ﴾(5/المآئدہ:3)''حرام کیا گیا تم پر مردار اور (بہنے والا) خون۔''﴿ لَنۡ یَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوۡمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا ﴾(22/الحج:37)''ہرگز نہیں پہنچتے اللہ کو ان کے گوشت اور نہ ہی ان کے خون۔''

س ب ح

(ف) (ا) سَبۡحًا پانی یا ہوا میں تیز رفتاری سے گزر جانا۔ اس بنیادی مفہوم کے ساتھ یہ لفظ آسمان میں ستاروں اور سیاروں کی گردش اور تیز رفتاری کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ عربی زبان میں وہ گھوڑا جو بہت تیز رفتار ہو اسے فَرَسٌ سَابِحٌ کہتے ہیں اور سَبَّاحٌ تیراک کو کہتے ہیں۔ چنانچہ ستاروں کے متعلق فرمایا: ﴿ وَهُوَ الَّذِیۡ خَلَقَ الَّیۡلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمۡسَ وَالۡقَمَرَ ؕ كُلٌّ فِیۡ فَلَكٍ یَّسۡبَحُوۡنَ ﴿۳۳﴾ ﴾(21/الانبیاء:33)''وہی ہے جس نے پیدا کیا رات کو اور دن کو اور سورج کو اور چاند کو، سب آسمان میں تیرتے ہیں۔'' پھر یہ لفظ کسی کام میں مشغول ہونے اور مصروف ہونے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا: ﴿ اِنَّ لَكَ فِی النَّهَارِ سَبۡحًا طَوِیۡلًا ؕ﴿۷﴾ ﴾(73/المزمل:7)''بیشک آپؐ کے لئے دن میں طویل مصروفیت ہے۔''

(ب) سُبۡحَانًا اپنے بلند مقام پر برقرار رہنا یعنی ہر نقص اور عیب، کمی اور کوتاہی سے پاک ہونا۔ یہ مصدر، مضاف، مضاف الیہ بن کر استعمال ہوتا ہے۔ کسی مفرد اسم کی طرف اس کی اضافت لازمی ہے خواہ وہ اسم ظاہر ہو جیسے سُبۡحَانَ اللّٰهِ (اللہ پاک ہے) یا سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی (پاک ہے وہ ذات جو لے گئی) یا ضمیر ہو، جیسے سُبۡحَانَهٗ (وہ پاک ہے) سُبۡحَانَكَ (تو پاک ہے) وغیرہ۔ اس کی نصب محذوف فعل کی وجہ سے آتی ہے۔ یعنی اُسَبِّحُ/ نُسَبِّحُ سُبۡحَانَهٗ میں یا ہم اس کی پاکی بیان کرتے ہیں۔ سُبۡحَانَ اس ترکیب میں مفعول مطلق ہوتا ہے۔ سُبۡحَانَ کا لفظ ایسے موقع پر بھی بولتے ہیں جہاں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں انسان کو حیرت میں ڈال دیں۔ ہماری زبان میں ''سبحان تیری قدرت'' ایسے ہی موقع پر بولتے ہیں۔ (واللہ اعلم)۔ ﴿ وَسُبۡحٰنَ اللّٰهِ وَمَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُشۡرِكِیۡنَ ﴿۱۰۸﴾ ﴾(12/یوسف:108)''اور اللہ پاک ہے اور میں نہیں ہوں شرک کرنے والوں میں سے۔''

سَابِحٌ مؤنث: سَابِحَةٌ ج: سَابِحَاتٌ۔ اسم الفاعل ہے۔ تیرنے والا۔ ﴿ وَّالسّٰبِحٰتِ سَبۡحًا ۙ﴿۳﴾ ﴾(79/النزعت:3)''قسم ہے تیرنے والیوں کی جیسا کہ تیرنے کا حق ہے۔''

(تفعیل) تَسۡبِیۡحًا کسی کو اس کی سطح پر برقرار رکھنا۔ تیرانا۔ ہر نقص و عیب سے اللہ تعالیٰ کی پاکیزگی بیان کرنا۔ اصل میں اس کے معنی عبادت الٰہی میں تیزی کرنا کے ہیں۔ پھر اس کا استعمال ہر فعل خیر پر ہونے لگا۔ پس تسبیح کا لفظ قولی، فعلی، قلبی ہر قسم کی عبادت پر بولا جاتا ہے۔ یہ سَبۡحٌ سے ہے جس کے معنی پانی یا ہوا میں تیز رفتاری سے گزر جانے کے ہیں۔ پھر استعارۃً فلک میں نجوم کی

گردش اور تیز رفتاری کے لیے استعمال ہونے لگا۔ پیر کرم شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں: ''تسبیح کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کو تمام ایسی چیزوں سے منزّہ اور پاک سمجھنا جو اس کے شایانِ شان نہیں۔ انسان کا اعتقاد بھی یہی ہو، وہ اپنے قول سے بھی اس کا اقرار کرے اور اس کا عمل بھی اس کی شہادت دے رہا ہو۔'' (ضیاء القران)۔ جس طرح تیرنے والا پانی میں ڈوبنے سے بچتا ہے اسی طرح تسبیح کرنے والا شرک سے نجات پاتا ہے۔ ﴿وَالْمَلٰٓئِكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ﴾ (42/الشوریٰ:5) ''اور فرشتے پاکی بیان کرتے ہیں اپنے رب کی حمد کے ساتھ۔'' ﴿كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَ تَسْبِيْحَهٗ ط﴾ (24/النور:41) ''ہر ایک کی نماز اور تسبیح اُسے معلوم ہے۔''

سَبِّحْ فعل امر ہے۔ تو پاکی بیان کر۔ ﴿وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّ سَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ع﴾ (3/آل عمران:41) ''اور یاد کر اپنے رب کو کثرت سے اور پاکی بیان کر رات اور صبح کو۔''

مُسَبِّحٌ ج: مُسَبِّحُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ پاکی بیان کرنے والا۔ ﴿ وَ اِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُوْنَ﴾ (37/الصافات:166) ''اور بیشک ہم پاکی بیان کرنے والے ہیں۔''

حَمْدٌ (ح م د): الفاتحہ آیت 1 دیکھیں۔

ق د س

(ک) **قُدْسًا، قُدُسًا** (1) تمام بری صفات سے پاک ہونا۔ اس میں محسوس نجاست کی بجائے معنوی نجاست سے پاک ہونے کا مفہوم ہے یعنی کسی خیال یا اندازے کی غلطی سے پاک ہونا یا شرک سے پاک ہونا وغیرہ۔
(2) بابرکت ہونا۔

قُدُسٌ اسم ذات بھی ہے۔ پاکیزگی۔ ﴿وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَ اَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ط﴾ (2/البقرہ:87) ''اور ہم نے دیں عیسیٰؑ بن مریم کو واضح نشانیاں اور ان کو تقویت دی پاکیزگی کی روح سے۔'' روح القدس حضرت جبریلؑ کا لقب ہے۔ انہی کو دوسرے مقام پر روح الامین بھی کہا گیا ہے۔

قُدُّوْسٌ صیغہ مبالغہ ہے۔ بہت پاک۔ بہت برکت والا۔ یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ میں سے ہے۔ ﴿هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ج اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ﴾ (59/الحشر:23) ''وہ اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ حقیقی بادشاہ ہے، نہایت پاک ہے۔'' مولانا مودودیؒ اس آیت میں قُدُّوْسٌ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''اصل میں لفظ قُدُّوس استعمال ہوا ہے جو مبالغہ کا صیغہ ہے۔ اس کا مادہ قدس ہے۔ قدس کے معنی ہیں تمام بری صفات سے پاکیزہ اور منزّہ ہونا۔ اور قُدُّوس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس سے بدرجہا بالا و برتر ہے کہ اس کی ذات میں کوئی عیب، یا نقص، یا کوئی قبیح صفت پائی جائے۔ بلکہ وہ ایک پاکیزہ ترین ہستی ہے جس کے بارے میں کسی برائی کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا۔'' (تفہیم القرآن، ج ۵، ص ۴۱۳)

(تفعیل) **تَقْدِيْسًا** کسی کو معنوی نجاستوں سے پاک کرنا۔ اگر اللہ تعالیٰ کے لئے استعمال ہو تو مطلب ہوتا ہے اس کی پاکیزگی کا اقرار کرنا۔ اس کی مثال زیرِ مطالعہ آیت ہے۔

مُقَدَّسٌ اسم المفعول ہے۔ مذکر۔ پاک کیا ہوا۔ ﴿اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى﴾ (20/طٰہٰ:12) ''بے شک آپؑ پاک میدان طویٰ میں ہیں۔''

مُقَدَّسَةٌ اسم المفعول ہے۔ مؤنث۔ پاک کی ہوئی۔ ﴿ يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ﴾ (5/المآئدہ:21) ''اے میری قوم تم لوگ داخل ہو جاؤ پاک کی ہوئی زمین میں جو اللہ نے لکھ دی ہے تمہارے لئے۔''

اَعۡلَمُ اور تَعۡلَمُوۡنَ (ع ل م): الفاتحہ آیت 1 دیکھیں۔

ترکیب

'وَ' استئنافیہ ہے اور اِذۡ ظرف زمان ہے اس سے پہلے اُذۡکُرۡ یا اُذۡکُرُوۡا محذوف ہے۔ قَالَ فعل، رَبُّكَ فاعل اور لِلۡمَلٰٓئِكَةِ متعلق فعل ہے۔ اگلا جملہ مقولہ ہے یعنی وہ بات جو کہی گئی۔ اس میں اِنِّیۡ میں شامل یائے متکلم کی ضمیر اِنَّ کا اسم ہے۔ جَاعِلٌ خبر ہے جبکہ فِی الۡاَرۡضِ متعلق خبر ہے۔ جَاعِلٌ اسم الفاعل ہونے کے ساتھ فعل کا بھی کام کر رہا ہے۔ اور خَلِیۡفَةً اس کا مفعول ہونے کی وجہ سے نصب میں ہے۔ اگلے جملے میں قَالُوۡا کا فاعل ھُمۡ کی ضمیر ہے جو فرشتوں کے لئے ہے اور تَجۡعَلُ کا فاعل اس میں شامل اَنۡتَ کی ضمیر ہے جو ربّ کے لئے ہے اور مَنۡ اسم موصول ہے۔ یُفۡسِدُ فِیۡهَا وَیَسۡفِكُ الدِّمَآءَ، یہ دونوں جملے مَنۡ کا صلہ ہیں۔ اور صلہ اور موصول مل کر مفعول ہیں فعل تَجۡعَلُ کا۔ فِیۡهَا میں ھَا کی ضمیر زمین کے لئے ہے۔ وَنَحۡنُ نُسَبِّحُ میں 'وَ' حالیہ ہے۔ نَحۡنُ مبتدا ہے۔ نُسَبِّحُ جملہ فعلیہ اس کی خبر ہے۔ اور بِحَمۡدِكَ، جار مجرور متعلق ہے نُسَبِّحُ کے۔ جملہ فعلیہ کو اگر جملہ اسمیہ میں تبدیل کیا جائے تو مبتدا پر زور دینا مقصود ہوتا ہے۔ وَنُقَدِّسُ میں 'وَ' عطف کا ہے اور نُقَدِّسُ عطف ہے نُسَبِّحُ پر۔ لَكَ جار مجرور متعلق ہے نُقَدِّسُ سے۔ قَالَ کا فاعل ھُوَ کی ضمیر ہے جو ربّ کے لئے ہے۔ اَعۡلَمُ مضارع میں واحد متکلم کا صیغہ ہے اور اسم موصول 'مَا' اس کا مفعول ہے۔ جملہ فعلیہ لَا تَعۡلَمُوۡنَ اس کا صلہ ہے۔ (واللہ اعلم)

ترجمہ

البقرۃ:30

وَاِذۡ قَالَ	رَبُّكَ	لِلۡمَلٰٓئِكَةِ	اِنِّیۡ جَاعِلٌ	فِی الۡاَرۡضِ
اور (وہ وقت یاد کرو) جب کہا	تیرے رب نے	فرشتوں سے	کہ میں بنانے والا ہوں	زمین میں

خَلِیۡفَةًؕ	قَالُوۡۤا	اَتَجۡعَلُ فِیۡهَا	مَنۡ	یُّفۡسِدُ فِیۡهَا
ایک جانشین/ نائب	ان فرشتوں نے کہا	کیا تو بناتا ہے اس میں	اس کو جو	فساد کرے گا اس میں

وَیَسۡفِكُ الدِّمَآءَۚ	وَ	نَحۡنُ نُسَبِّحُ	بِحَمۡدِكَ
اور بہائے گا خون	حالانکہ	ہم تسبیح کرتے ہیں	تیری حمد کے ساتھ

وَنُقَدِّسُ لَكَؕ	قَالَ	اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ	مَا
اور ہم تیری پاکیزگی بیان کرتے ہیں	اس (اللہ تعالیٰ) نے کہا	میں جانتا ہوں	وہ جو

لَا تَعۡلَمُوۡنَ ۳۰
تم لوگ نہیں جانتے

آیت: 31

﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمۡ عَلَی الۡمَلٰٓئِكَةِ ۙ فَقَالَ اَنۡۢبِـُٔوۡنِیۡ بِاَسۡمَآءِ هٰۤؤُلَآءِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ۳۱﴾

عَلَّمَ (ع ل م): الفاتحہ آیت 1 دیکھیں۔

ء	د	م

(س) اَدِمَ گندمی رنگ کا ہونا۔

اٰدَمُ اَفْعَلُ الوان وعیوب کے وزن پر یہ دراصل اَءْ دَمُ تھا جو قاعدہ کے مطابق تبدیل ہو کر اٰدَمُ بنا۔ گندمی رنگ والا۔ حضرت آدمؑ کا نام ہے۔

اَلْاَسْمَآءَ (س م و): آیت بسم اللہ دیکھیں۔ کُلَّ (ک ل ل): البقرۃ آیت 20 دیکھیں۔

ع ر ض

(ض) عَرْضًا پیش کرنا۔ سامنے لانا۔ ظاہر ہونا۔ لغات القرآن کے مطابق یہ لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ (لغات القرآن، ج ۴، ص ۲۷۳)۔ ﴿اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (33/الاحزاب:72) ''بیشک ہم نے پیش کیا اس امانت کو آسمانوں اور زمین پر۔''

عَارِضٌ اسم الفاعل ہے۔ سامنے آنے والی چیز۔ سامنے لانے والا۔ پھر یہ لفظ بادل کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ بادل کو عارض یا تو اس لیے کہتے ہیں کہ وہ اُفق آسمان پر ظاہر ہو کر چھا جاتا ہے یا اس لیے کہ بادل کا وجود قائم رہنے والا نہیں ہوتا اور جلد ختم ہو جاتا ہے۔ صاحبؒ مترادفات القرآن کے مطابق عارض وہ بادل ہیں جو گاڑھے اور پھیلے ہوئے ہوں اور جن سے بوندا باندی بھی شروع ہو جائے۔ (واللہ اعلم)۔ ﴿قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا﴾ (46/الاحقاف:24) ''ان لوگوں نے کہا یہ بادل ہے، برسے گا ہم پر۔''

عُرْضَةٌ اسم ذات ہے۔ آڑ، رکاوٹ۔ نشانہ، بہانہ۔ ﴿وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ﴾ (2/البقرہ:224) ''اور تم لوگ مت بناؤ اللہ کو نشانہ اپنی قسموں کیلئے۔'' اس آیت مبارکہ میں عُرْضَةً کی دو تفسیریں کی گئی ہیں ایک یہ کہ کسی اچھے کام کو نہ کرنے کے لیے اللہ کی قسم مت کھایا کرو یعنی جب کسی سے کوئی اچھا کام کرنے کے لیے کہا جائے تو وہ اللہ کی قسم کو آڑ بنا لے کہ میں نے تو قسم کھالی ہے اب یہ کام نہیں کر سکتا۔ دوسری تفسیر کے مطابق، اپنا مطلب نکالنے کے لیے بات بات پر اللہ کی قسم نہ کھایا کرو۔ اس صورت میں اللہ کا نام تمہاری قسموں کا نشانہ بن جائے گا۔ اور تم ہر وقت قسم کے ذریعے سے کام نکالنے کی فکر میں لگے رہو گے۔ اس تفسیر کے مطابق عُرْضَةً کا معنی نشانہ اور بہانہ ہو گا۔ (واللہ اعلم، تلخیص از لغات القرآن، ج ۴، ص ۲۷۶)

(س) عَرَضًا ناپائیدار ہونا۔ عارضی ہونا۔ جلد فنا ہو جانا۔

عَرَضٌ ہمیشہ نہ رہنے والی چیز۔ ہر وہ چیز جو جلدی فنا ہو جائے۔ عارضی سامان۔ لفظ عَرَضٌ، جوہر کے مقابلے پر بولا جاتا ہے۔ جب جوہر کے مقابلے پر آئے تو مطلب ہوتا ہے ناپائیدار چیز، وہ چیز جس کا اپنا کوئی مستقل وجود نہ ہو۔ اسی لیے بادل کو بھی عارض کہا جاتا ہے کیونکہ اس کا وجود قائم رہنے والا نہیں، جلد ختم ہو جاتا ہے۔ دنیاوی مال کو عَرَضٌ سے اس لیے تعبیر کرتے ہیں کہ دنیاوی مال کتنا ہی کیوں نہ ہو وہ عارضی اور ناپائیدار ہوتا ہے۔ ﴿تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ۖ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ؕ﴾ (8/الانفال:67) ''تم لوگ چاہتے ہو دنیا کا عارضی سامان اور اللہ چاہتا ہے آخرت۔''

(ک) عَرَاضَةً چوڑا ہونا۔

عَرْضٌ اسم ذات ہے۔ چوڑائی۔ وسعت۔ مولانا مودودیؒ عَرْضٌ کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''عربی زبان میں لفظ عرض صرف چوڑائی ہی کے لیے نہیں بولا جاتا جو طول کا مدمقابل ہے، بلکہ اسے مجرد وسعت کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔'' (تفہیم القرآن، ج ۵، ص ۳۱۹)۔ ﴿سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۙ﴾ (57/الحدید:21) ''بازی لے جاؤ اپنے رب کی مغفرت کی طرف اور جنت کی طرف، جس کی چوڑائی یا وسعت

زمین اور آسمان کی چوڑائی یا وسعت جیسی ہے۔''

عَرِيْضٌ — فَعِيْلٌ کے وزن پر صفت ہے۔ چوڑا۔ ﴿وَ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُوْ دُعَآءٍ عَرِيْضٍ ﴾ (41/ حٰمٓ السجدۃ:51) ''اور جب چھوتی ہے اس کو تکلیف تو لمبی چوڑی دعا کرنے والا بن جاتا ہے۔'' قاضی شوکانی فرماتے ہیں: ''عریض کے معنی کثیر کے ہیں، عرب طول وعرض کا استعمال مجازاً کثرت کے معنی میں کیا کرتے ہیں چنانچہ محاورہ ہے اَطَالَ فُلَانٌ فِي الْكَلَامِ وَ اَعْرَضَ فِي الدُّعَاءِ۔ یعنی فلاں نے کثرت سے باتیں کیں اور خوب دعائیں کیں۔'' (لغات القرآن، ج ۴، ص ۲۸۸)

(افعال) اِعْرَاضًا — منہ موڑ لینا۔ توجہ نہ دینا۔ بے رخی برتنا۔ درگزر کرنا۔ ان معنوں میں عام طور پر اس کے ساتھ ''عَنْ'' کا صلہ آتا ہے۔ ﴿وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ فَاَعْرَضَ عَنْهَا﴾ (18/ الکھف:57) ''اور کون زیادہ ظالم ہے اس سے جس کو یاد دلائی جائیں اس کے رب کی آیات تو وہ بے رخی برتے ان سے۔'' ﴿سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ اِذَا انْقَلَبْتُمْ اِلَيْهِمْ لِتُعْرِضُوْا عَنْهُمْ ؕ فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمْ ؕ﴾ (9/توبۃ:95) ''اب قسمیں کھائیں گے اللہ کی تمہارے سامنے جب تم پھر کر جاؤ گے اُن کی طرف تاکہ تم اُن سے درگزر کرو سو تم درگزر کرو اُن سے۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)۔ اس آیت کے تحت پیر کرم شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں: ''اعراض کا مادّہ آیت میں دوبار استعمال ہوا ہے۔ اور یہ دو مختلف معنوں میں مستعمل ہوتا ہے۔ (۱) عفو و درگزر۔ اور (۲) قطع تعلق۔ لِتُعْرِضُوْا میں پہلا معنی مطلوب ہے اور فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمْ میں دوسرا معنی مقصود ہے۔'' اگر اس کے ساتھ ''عَلٰی'' کا صلہ آئے تو مطلب ہوتا ہے پیش کرنا۔ اگر اس کے ساتھ ''ل'' کا صلہ آئے تو مطلب ہوتا ہے سامنے آنا۔ اَعْرَضَ لِيْ وہ میرے سامنے آیا۔

مُعْرِضٌ — ج: مُعْرِضُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ منہ پھیرنے والا۔ اعراض کرنے والا۔ ﴿ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَ اَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴾ (2/البقرۃ:83) ''پھر تم نے منہ موڑ لیا سوائے تھوڑے سے تم میں سے اور تم لوگ ہو ہی منہ پھیرنے والے۔''

اَعْرِضْ — فعل امر ہے۔ تو منہ پھیر لے۔ تو بے رخی کر۔ ﴿وَ اِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْۤ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ﴾ (6/الانعام:68) ''اور جب آپؐ دیکھیں ان لوگوں کو جو عیب جوئی کرتے ہیں ہماری آیات میں تو آپؐ منہ پھیر لیں ان سے۔''

(تفعیل) تَعْرِيْضًا — اشارے کنائے میں بات کرنا یعنی مبہم طور پر بغیر کھولے بات کرنا۔ ﴿وَ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ﴾ (2/البقرہ:235) ''اور کوئی گناہ نہیں تم پر اس میں جو تم اشارے کنائے میں پیغام دو خواتین کے نکاح کا۔''

اَلْمَلٰٓئِكَةِ (م ل ك): الفاتحہ آیت 3 دیکھیں۔ قَالَ (ق و ل): البقرۃ آیت 8 دیکھیں۔

ن ب ء

(ف) نَبَاَءَ — آہستہ آواز نکالنا۔ خبر دینا۔

نَبَاٌ — ج: اَنْبَاءٌ۔ اسم ذات ہے۔ عظیم خبر۔ حقیقت۔ عربی زبان میں نَبَاٌ اس خبر کو کہتے ہیں جس میں مندرجہ ذیل خصوصیات ہوں۔ (1) وہ نہایت مفید ہو۔ (2) اس سے صحیح علم اور یقین حاصل ہو۔ (3) اور وہ جھوٹ سے پاک ہو۔ یہ تین چیزیں جب کسی خبر میں ہوں، تب وہ نَبَاٌ کہلاتی ہے۔ عربی میں غیر اہم خبر کو نَبَاٌ نہیں کہتے۔ ﴿قُلْ هُوَ نَبَؤٌا عَظِيْمٌ ۙ اَنْتُمْ عَنْهُ مُعْرِضُوْنَ ﴾ (38/ص:67-68) ''آپؐ کہیے یہ ایک عظیم خبر ہے۔ تم لوگ جس سے بے رخی برتتے

والے ہو''۔﴿ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ﴾(3/آل عمران:44)''یہ غیب کی خبروں میں سے ہے،ہم وحی کرتے ہیں اسکو آپ ﷺ کی طرف''

(افعال)	اِنْۢبَاءً	کسی کو خبر دینا۔بتادینا۔﴿ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ﴾(2/البقرہ:33)''تو جب انہوںؑ نے بتادیا ان کو ان چیزوں کے نام۔''
	اَنْۢبِئْ	فعل امر ہے۔تو بتادے۔﴿ قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ﴾(2/البقرہ:33)''اللہ تعالیٰ نے کہا اے آدمؑ آپؑ بتا دیجئے ان کو ان چیزوں کے نام۔''
(تفعیل)	تَنْبِيْئًا	بتادینا۔جتادینا۔﴿ قَدْ نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ ﴾(9/التوبۃ:94)''ہم کو بتادی ہیں اللہ نے تمہاری خبریں۔''
	نَبِّئْ	فعل امر ہے۔تو بتادے۔﴿ نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴾(15/الحجر:49)''آپ ﷺ بتا دیجئے میرے بندوں کو کہ میں ہی غفور و رحیم ہوں۔''
(استفعال)	اِسْتِنْبَاءً	کسی سے خبر پوچھنا۔﴿ وَيَسْتَنْۢبِـُٔوْنَكَ اَحَقٌّ هُوَ ﴾(10/یونس:53)''اور وہ آپؑ سے پوچھتے ہیں کہ کیا عذاب واقعی سچ ہے۔''

صٰدِقِيْنَ(ص د ق):البقرۃ آیت 23 دیکھیں۔

ترکیب

''وَ'' استئنافیہ ہے اور عَلَّمَ کا فاعل اس میں شامل ھُوَ کی ضمیر ہے جو رب کے لئے ہے،اٰدَمَ اس کا مفعول اوّل اور اَلْاَسْمَآءَ مفعول ثانی ہے۔اَسْمَآءَ دراصل مضاف تھا لیکن اس پر لام جنس آنے کی وجہ سے اس کا مضاف الیہ اَلْاَشْيَآءِ محذوف ہوگیا۔كُلَّهَا لام جنس کی وضاحت اور تاکید کے لئے آیا ہے اور اَلْاَسْمَآءَ کا بدل ہے،اسی لئے كُلَّ حالتِ نصب میں ہے اور اس کے ساتھ هَا کی ضمیر اَلْاَشْيَآءِ کے لئے ہے۔

عَرَضَ کا فاعل بھی رب ہے اور اس کا مفعول هُمْ کی ضمیر ہے اور عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ متعلق فعل ہے۔عَرَضَهُمْ میں ''هُمْ ''ضمیر کے متعلق مولانا عبد الماجدؒ فرماتے ہیں:''سوال یہ ہے کہ کیا چیز اب فرشتوں کے سامنے پیش کی جا رہی ہے؟اگر چیزوں کے محض نام مراد ہوتے تو لفظ قرآنی عرضھا ہوتا۔ضمیر هُمْ ذوی العقول کے لیے ہے اور غیر ذوی العقول ضمناً و تبعاً اس میں شامل ہو جائیں گے۔یہ دلیل ہے اس پر کہ پیش صرف نام نہیں ہو رہے تھے بلکہ اصل موجودات۔گویا پہلے صورت مثالی سے حضرت آدمؑ کو تمام مخلوقات کے نام اور خواص سے اطلاع بخشی گئی،پھر خود ان مخلوقات و موجودات کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا گیا''۔اَنْۢبِئُوْا فعل امر ہے اور اس میں فاعل اَنْتُمْ کی ضمیر ہے جو کہ اَلْمَلٰٓئِكَةِ کے لئے ہے اور اس کا مفعول نِيْ کی ضمیر ہے جو کہ رب کے لئے ہے۔بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ میں اَسْمَآءِ مضاف ہے اور بِ کی وجہ سے مجرور ہے۔جبکہ هٰٓؤُلَآءِ مضاف/ مضاف الیہ ہے اور اس کے آگے اَلْاَشْيَآءِ محذوف ہے۔یعنی بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ الْاَشْيَآءِ۔اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ جملہ شرطیہ ہے۔اس سے پہلے کا جملہ اس کا جواب شرط ہے۔صٰدِقِيْنَ، كَانَ کی خبر کی وجہ سے حالت نصب میں ہے۔(واللہ اعلم)

ترجمہ البقرۃ:31

وَعَلَّمَ	اٰدَمَ	الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا	ثُمَّ عَرَضَهُمْ
اور اس نے تعلیم دی	آدمؑ کو	تمام (چیزوں) کے ناموں کی	پھر اس نے پیش کیا ان کو

عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ	فَقَالَ	اَنْۢبِئُوْنِيْ	بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ	اِنْ كُنْتُمْ
فرشتوں پر	تو کہا	تم لوگ بتاؤ مجھ کو	ان (چیزوں) کے نام	اگر تم لوگ ہو

صٰدِقِيْنَ ﴿۳۱﴾
سچے

نوٹ۔1 جب ہم کسی شخص کا کوئی نام رکھتے ہیں، جیسے آصف یا جمیل وغیرہ، تو اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس شخص کو دوسرے انسانوں سے ممتاز کیا جائے تاکہ اس کی شناخت میں آسانی ہو۔ اسی مقصد کے تحت پالتو جانوروں کے بھی نام رکھے جاتے ہیں۔ یہ آپ پڑھ چکے ہیں کہ ایسے اسماء کو اسم علم کہتے ہیں۔

اب نوٹ کریں کہ اسم علم سے کسی کی شناخت میں تو آسانی ہوتی ہے لیکن نام والے کی خصوصیات کا علم نہیں ہوتا۔ مثلاً آصف سے ہم سمجھ جاتے ہیں کہ کس انسان کی بات ہو رہی ہے لیکن یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کیسا انسان ہے؟ جبکہ اسماء جنس سے نام والے کی خصوصیات ذہن میں آتی ہیں۔ مثلاً انسان، گھوڑا، طوطا، درخت، پتھر وغیرہ۔ یہ سب اسمائے جنس ہیں۔ ان میں سے جس کا نام لیا جائے گا تو اس نام کے ساتھ اس جنس کی چیزوں کی خصوصیات بھی ذہن میں آتی ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اسم جنس کے علم کے بغیر اسم علم کی نہ تو ضرورت ہے اور نہ افادیت۔ اس حوالہ سے یہ بات ذہن نشین کر لیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کو اسماء جنس کی تعلیم دی گئی تھی جس میں اشیاء کی خصوصیات (PROPERTIES OF MATTER) کی تعلیم ازخود شامل ہے۔ واللہ اعلم (از لطف الرحمٰن خان صاحب)

آیت: 32

﴿ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۝۳۲ ﴾

قَالُوْا (ق و ل): البقرۃ آیت 8 دیکھیں۔ سُبْحٰنَكَ (س ب ح): البقرۃ آیت 30 دیکھیں۔
عِلْمَ، عَلَّمْتَ، اَلْعَلِيْمُ (ع ل م): الفاتحہ آیت 1 دیکھیں۔

ح ک م

(ن) **حُكْمًا** کسی چیز کا پختہ یا مضبوط ہونا۔ اس مفہوم کے ساتھ مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً پختہ فیصلہ کرنا۔ حکم دینا۔ ﴿ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ﴾ (2/البقرۃ:113) ''تو اللہ فیصلہ کرے گا ان کے درمیان قیامت کے دن۔''

اُحْكُمْ فعل امر ہے۔ تو فیصلہ کر۔ تو حکم دے۔ ﴿ اِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ؕ ﴾ (5/المآئدہ:42) ''اور اگر آپؐ فیصلہ کریں تو آپ ﷺ فیصلہ کریں ان کے درمیان انصاف سے۔''

حَاكِمٌ ج: حَاكِمُوْنَ۔ حُكَّامٌ۔ اسم الفاعل ہے۔ فیصلہ کرنے والا۔ حکم دینے والا۔ ﴿ وَ هُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ۝۸۷ ﴾ (7/الاعراف:87) ''اور وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔'' ﴿ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَ تُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ ﴾ (2/البقرۃ:188) ''اور نہ کھاؤ مال ایک دوسرے کا آپس میں ناحق اور نہ پہنچاؤ اُن کو حاکموں تک۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)

حَكَمٌ حُكْمٌ سے صفت مشبہ کا صیغہ ہے۔ ماہر حاکم۔ صحیح فیصلہ کرنے والا منصف۔ واحد اور جمع سب کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ امام راغبؒ فرماتے ہیں: ''حَكَمٌ (منصف) ماہر حاکم کو کہا جاتا ہے۔ اس لیے اس میں لفظ حاکم سے زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے۔'' ﴿ فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ ﴾ (4/النساء:35) ''تو تم لوگ کھڑا کرو ایک منصف مرد کے گھر والوں سے اور ایک منصف عورت کے گھر والوں سے۔'' ﴿ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا ﴾ (6/الانعام:114) ''(آپؐ اُن سے پوچھیے) کیا اللہ کے سوا میں تلاش کروں کوئی اور منصف۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔ اس آیت کے تحت پیر کرم شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں: ''حَكَمٌ اور حاکم کا ایک ہی معنی ہے فیصلہ کرنے والا۔ لیکن فرق یہ ہے کہ حاکم ہر فیصلہ کرنے والے کو کہتے ہیں صحیح کرے یا غلط۔ لیکن حَكَمٌ صرف صحیح فیصلہ کرنے والے کو کہتے ہیں۔'' (ضیاء القرآن، ج ۱، ص ۵۹۴)

اَحْكَمُ اَفْعَلُ التَّفْضِيْل ہے۔ زیادہ پختہ فیصلہ کرنے والا۔ ﴿ وَ اَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِيْنَ ۝۴۵ ﴾ (11/ھود:45) ''اور تو فیصلہ کرنے والوں میں سب سے پختہ فیصلہ کرنے والا ہے۔''

حُكْمٌ اسم ذات ہے اور قرآن مجید میں مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

(1) پختہ فیصلہ، حکم۔﴿وَّ لَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا﴾ (18/الکہف:26) ''اور وہ شریک نہیں کرتا اپنے فیصلے میں کسی ایک کو بھی۔''

(2) حکمت۔ حُكْمٌ کا لفظ حکمت کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ امام راغبؒ فرماتے ہیں: ''ہر حکمت کو حکم کہہ سکتے ہیں لیکن ہر حکم کو حکمت نہیں۔'' قرآن مجید میں کئی آیات میں حُكْمٌ کا ترجمہ ''حکمت'' سے کیا گیا ہے مثلاً:﴿مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ﴾ (3/آل عمران:79) ''کسی بشر سے یہ نہیں ہوسکتا کہ اللہ تو اُسے کتاب اور حکمت اور نبوت عطا کرے۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ﴾ (6/الانعام:89) ''یہ تو وہ لوگ ہیں جنہیں ہم نے کتاب اور حکمت اور نبوت عطا کی تھی۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔ وغیرہ۔ اور حدیث میں فرمایا گیا: ''اَلصَّمْتُ حُكْمٌ وَ قَلِيْلٌ فَاعِلُهٗ'' ''خاموشی حکمت ہے لیکن تھوڑے لوگ اس پر عمل کرتے ہیں۔''

(3) دنیاوی حکومت اور اقتدار۔﴿وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗٓ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا﴾ (12/یوسف:22) ''اور جب وہ اپنی پختگی کو پہنچے ہم نے اُنہیں حکومت اور علم عطا فرمایا۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔ اس آیت کے تحت مولانا عبدالماجدؒ فرماتے ہیں: ''حکم سے عام طور پر دنیوی قوت واقتدار اور علم سے مراد نبوت لی گئی ہے۔''

(4) سمجھ بوجھ، فہم، وحی، نبوت۔﴿يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ؕ وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا﴾ (19/مریم:12) ''اے یحییٰؑ کتاب کو مضبوط پکڑو اور ہم نے اُن کو لڑکپن ہی میں سمجھ دے دی تھی۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔ اس آیت کے تحت مولانا عبدالماجدؒ فرماتے ہیں: ''حکم کے معنی نبوت بھی ہو سکتے ہیں اور حکمت، شریعت، عقل وفہم بھی۔ بہرحال حکم کے تحت میں علمی و ذہنی کمالات آ گئے۔'' آگے لکھتے ہیں: ''فقیہ جلیل ابن العربی مالکیؒ نے لکھا ہے کہ حکم کے یہاں تین معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک وحی دوسرے نبوت، تیسرے اس کی معرفت اور اس پر عمل اور یہ تینوں معنی درست ہو سکتے ہیں، صغرسنی میں نزول وحی اور مکاشفہ ملائکہ جائز ہیں۔'' (احکام القرآن، بحوالہ تفسیر ماجدیؒ، ۶۵۱)

حِكْمَةٌ اسم ذات ہے۔ دانائی۔ صحیح بصیرت۔ صحیح قوتِ فیصلہ۔ حکمت کہتے ہیں عقل اور تَفَقُّہ کی اس پختگی کو جس سے انسان درست نتیجے یا صحیح رائے تک پہنچ جائے اور معاملات کا فیصلہ حق کے مطابق کرے۔ جس طرح معاملات کا فیصلہ حق کے مطابق کرنا، حکمت کے ثمرات میں سے ہے اسی طرح اخلاق کی پاکیزگی اور تہذیب بھی اس کے ثمرات میں سے ہے۔ چنانچہ اہل عرب حکمت کا لفظ انسان کی اس قوت وصلاحیت کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں جو عقل ورائے کی پختگی اور شرافت و اخلاق کی جامع ہوتی ہے۔﴿يُّؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ﴾ (2/البقرۃ:269) ''وہ عطا کرتا ہے دانائی جس کو وہ چاہتا ہے۔''﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ﴾ (2/البقرۃ:129) ''اور اے ربّ، ان لوگوں میں خود انہی کی قوم سے ایک رسول اٹھائیو، جو انہیں تیری آیات سنائے، ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کو پاک صاف کرے۔'' اس آیت مبارکہ میں تعلیم حکمت کے معنی پر مولانا امین احسن اصلاحیؒ فرماتے ہیں: ''یہاں یہ امر ملحوظ رکھنا چاہیے کہ حکمت چونکہ حکیمانہ بات کو بھی کہتے ہیں اور حکیمانہ بات کہنے کی صلاحیت کو بھی، اس وجہ سے تعلیم حکمت کے معنی جس طرح کسی کو کوئی حکیمانہ بات بتا دینے کے ہیں اسی طرح اس کے معنی لوگوں کے اندر حکمت کی صفت وصلاحیت پیدا کرنے کے بھی ہیں۔'' (تدبر قرآن، ج۱، ص۳۴۱) اور اسی آیت کے تحت پیر کرم شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں: ''حکمت کہتے ہیں وَضْعُ الْاَشْيَاءِ عَلٰى مَوَاضِعِهَا۔ ہر چیز کو اپنے محل اور موقع پر رکھنا۔

یہاں الحکمۃ کا لفظ جو مذکور ہے اس سے مراد احکامِ قرآنی کی ایسی تفصیل اور ان کا ایسا بیان ہے جسے جاننے کے بعد انسان ان احکام کی ایسی تعمیل کر سکے جیسے قرآن نازل کرنے والے خدا کا منشا ہے۔ اور نبی کے فرائض میں صرف یہی نہیں کہ قرآن سکھا دے بلکہ اس کا صحیح بیان اور تفصیل بھی سکھائے تاکہ قرآن پر اللہ تعالیٰ کی منشاء کے مطابق عمل ہو سکے اور اسی حکمت یعنی بیان قرآن کو سنت نبویؐ کہا جاتا ہے۔'' (ضیاء القرآن، ج ا، ص ۹۵)۔ مفتی محمد شفیعؒ حکمت کے لفظ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں: ''حکمت کا لفظ قرآنِ پاک میں کئی مرتبہ آیا ہے اور ہر جگہ اس کی تفسیر میں مختلف معنی بیان کیے گئے ہیں۔ جو کہ سب ٹھیک ہیں صرف تعبیرات کا فرق ہے۔ تفسیر بحر محیط میں ہے وَالْحِكْمَةُ وَضْعُ الْاُمُوْرِ فِیْ مَحَلِّهَا عَلَى الصَّوَابِ وَ كَمَالُ ذٰلِكَ اِنَّمَا يَحْصَلُ بِالنُّبُوَّةِ۔ یعنی حکمت کے اصل معنی ہر شے کو اس کے صحیح محل (جگہ) میں رکھنے کے ہیں اور اس کا کمال صرف نبوت سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اس مفہوم کی تعبیریں مختلف الفاظ میں کی گئی ہیں۔ مثلاً قرآن، حدیث وسنت، نبوت، عمل صالح، صحیح علم، عقل سلیم، تفقہ فی الدین اور کہیں خشیت الٰہی۔ آخری معنوں میں تو خود حدیث شریف میں فرمایا: رَأْسُ الْحِكْمَةِ خَشْيَةُ اللّٰهِ۔ یعنی اصل حکمت اللہ سے ڈرنا ہے۔ بہرحال حکمت سے مراد یہ سب چیزیں ہیں اور ظاہر یہی قول ہے۔ اور آیت کریمہ ﴿وَ مَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَيْرًا كَثِيْرًا﴾ سے بھی اس کی طرف اشارہ نکلتا ہے۔ (واللہ اعلم)۔ (معارف القرآن، ج ا، ص ۶۴۱ تلخیصاً)۔ قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حکمت بھی اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل کی گئی۔ چنانچہ فرمایا: ﴿وَّ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ﴾ (2/البقرۃ:231) ''اور یاد کرو اللہ کا احسان جو تم پر ہے اور اُس کو کہ جو اتاری تم پر کتاب اور علم کی باتیں کہ تم کو نصیحت کرتا ہے اُس کے ساتھ۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)۔ ﴿وَ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ﴾ (4/النساء:113) ''اور اللہ نے اتاری تجھ پر کتاب اور حکمت۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)

حَكِيْمٌ فَعِيْلٌ کے وزن پر صفت ہے۔ دانا۔ حکمت والا۔ ﴿اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ۝﴾ (6/الانعام:83) ''بیشک تیرا رب دانا علم والا ہے۔''

(افعال) **اِحْكَامًا** کسی چیز کو یوں پختہ کرنا کہ اُس میں نقص کا گمان تک نہ رہے۔ مضبوط کرنا۔ ﴿كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ﴾ (11/ھود:1) ''یہ ایک کتاب ہے، پختہ کیا گیا اس کی آیات کو۔''

مُحْكَمٌ اسم المفعول ہے۔ مذکر۔ مضبوط یا پختہ کیا ہوا۔

مُحْكَمَةٌ ج: مُحْكَمٰتٌ۔ اسم المفعول ہے۔ مؤنث۔ مضبوط یا پختہ کی ہوئی۔ ﴿فَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ﴾ (47/محمد:20) ''پھر جب کوئی صاف مطلب والی سورت نازل کی جاتی ہے۔'' ﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ﴾ (3/آل عمران:7) ''وہ ہے جس نے نازل کی آپ ﷺ پر کتاب، اس میں ہیں پختہ کی ہوئی آیات۔'' اس آیت کے تحت صاحبِ ضیاء القرآن فرماتے ہیں: ''محکم کی تعریف امام راغبؒ نے یہ کی ہے فَالْمُحْكَمُ مَا لَا يَعْرِضُ فِيْهِ شُبْهَةٌ مِّنْ حَيْثُ اللَّفْظِ وَلَا مِنْ حَيْثُ الْمَعْنٰی (مفردات) محکم آیت وہ ہے جس کا مفہوم واضح اور بیّن ہو اس کے لفظ یا معنی کے اعتبار سے اس پر کسی قسم کا شبہ نہ وارد ہو سکتا ہو'' (ضیاء القرآن، ج ا، ص ۲۰۹)۔ اصطلاح شرع میں محکم بمقابلہ منسوخ استعمال ہوتا ہے۔ (واللہ اعلم)۔

(تفعیل) **تَحْكِيْمًا** کسی کو حاکم تسلیم کرنا۔ ﴿فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ﴾ (4/النساء:65) ''پس نہیں! آپ ﷺ کے رب کی قسم، وہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے یہاں تک کہ وہ آپ ﷺ کو حاکم تسلیم کریں اس میں جس میں جھگڑتے ہیں باہم۔''

(تفاعل) تَحَاکُمًا باہمی جھگڑے کو کسی حاکم کے پاس فیصلے کے لیے لے جانا۔﴿ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَحَاکَمُوْٓا اِلَی الطَّاغُوْتِ ﴾(4/النساء: 60)''وہ لوگ چاہتے ہیں کہ فیصلے کیلئے جائیں طاغوت کے پاس۔''

ترکیب قَالُوْا کا فاعل اس میں شامل ھُمْ کی ضمیر ہے جو گذشتہ آیت میں اَلْمَلٰٓئِکَۃِ کے لئے ہے۔سُبْحٰنَکَ سے پہلے فعل محذوف ہے جو کہ نُسَبِّحُ ہوسکتا ہے اور سُبْحَانَ اس کا مفعول مطلق ہے اور ضمیر کَ اس کا مضاف الیہ ہے۔لَا عِلْمَ میں 'لَا' لائے نفی جنس ہے اور عِلْمَ اس کا اسم ہے۔اسی لئے عِلْمَ تنوین کے بغیر نصب میں ہے۔لَنَا متعلق ہے محذوف خبر کے۔آگے اِلَّا حرف استثناء ہے اور 'مَا' اسم موصول ہے اور جملہ فعلیہ عَلَّمْتَنَا اس کا صلہ ہے۔صلہ اور موصول مل کر مستثنیٰ ہیں۔ان کو لَا عِلْمَ کا بدل بھی مانا گیا ہے۔اِنَّکَ میں ضمیر کَ اِنَّ کا اسم ہے۔اِنَّ اپنے اسم کو نصب دیتا ہے اس لئے ضمیر مرفوعہ اَنْتَ کے بجائے ضمیر منصوبہ کَ آئی ہے۔اَنْتَ ضمیر فاصل ہے اور تاکید کے لیے ہے۔اَلْعَلِیْمُ خبر اوّل ہے اِنَّ کی اور اَلْحَکِیْمُ خبر ثانی ہے اِنَّ کی۔(واللہ اعلم)۔

ترجمہ	قَالُوْا	سُبْحٰنَکَ	لَا عِلْمَ لَنَآ	اِلَّا مَا
البقرۃ:32	اُن (فرشتوں) نے کہا	تو پاک ہے (ہر عیب سے)	ہمیں کوئی علم ہے ہی نہیں	مگر جو

عَلَّمْتَنَا ؕ	اِنَّکَ اَنْتَ	الْعَلِیْمُ الْحَکِیْمُ ۳۲
تو نے سکھایا ہم کو	بیشک تو ہی	جاننے والا، دانا ہے

آیت: 33

﴿ قَالَ یٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْھُمْ بِاَسْمَآئِہِمْ ۚ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَھُمْ بِاَسْمَآئِہِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّکُمْ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا کُنْتُمْ تَکْتُمُوْنَ ۳۳ ﴾

قَالَ اور متعلقہ صیغے (ق و ل): البقرۃ آیت 8 دیکھیں۔ اٰدَمُ (ء د م): البقرۃ آیت 31 دیکھیں۔
اَنْبِئْ اور اَنْبَاَ (ن ب ء): البقرۃ آیت 31 دیکھیں۔ اَسْمَآءُ (س م و): آیت بسم اللہ دیکھیں۔ لَمَّا: البقرۃ آیت 17 دیکھیں۔
اَعْلَمُ (ع ل م): الفاتحہ آیت 1 دیکھیں۔ غَیْبٌ (غ ی ب): البقرۃ آیت 3 دیکھیں۔ سَمٰوٰتٌ (س م و): آیت بسم اللہ دیکھیں۔
اَلْاَرْضِ (ء ر ض): البقرۃ آیت 11 دیکھیں۔

ب د و

(ن) بَدْوًا، بَدَاءً اور بَدَاوَۃً (1) کسی چیز کا ظاہر ہونا۔(2) صحرا میں رہنا (عمارت وغیرہ کی رکاوٹ نہ ہونے کی وجہ سے صحرا میں ہر چیز ظاہر ہوتی ہے۔چنانچہ صحرا میں رہنا بھی ظاہر ہونے کے مترادف ہے)۔اس کی ضد حَضَارَۃ ہے ایک دیہاتی صحابی زاہرؓ کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے: ''ھُوَ بَادِیَتُنَا وَ نَحْنُ حَاضِرُوْہُ۔ زاہر ہمارا دیہاتی یا صحرائی (دوست) ہے اور ہم اس کے شہری (دوست) ہیں۔''

(1)﴿ بَلْ بَدَا لَھُمْ مَّا کَانُوْا یُخْفُوْنَ مِنْ قَبْلُ ؕ ﴾(6/الانعام:28)''بلکہ ظاہر ہوا ان کے لئے وہ جو وہ لوگ چھپاتے تھے اس سے پہلے۔''(2) دوسرے مفہوم میں فعل استعمال نہیں ہوا۔

بَادٍ ج: بَادُوْنَ۔ فَاعِلٌ کے وزن پر اسم الفاعل ہے۔صحرا میں رہنے والا۔صحرا نشین ۔﴿وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِیْ جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ ۨ الْعَاكِفُ فِیْهِ وَ الْبَادِ ؕ﴾(22/الحج:25)''اور مسجد حرام جس کو بنایا ہم نے لوگوں کیلئے برابر ہے اس میں رہنے والا اور باہر سے آنے والا۔''﴿وَ اِنْ یَّاْتِ الْاَحْزَابُ یَوَدُّوْا لَوْ اَنَّهُمْ بَادُوْنَ فِی الْاَعْرَابِ﴾ (33/الاحزاب:20)''اور اگر آجاتے لشکر تو وہ لوگ آرزو کرتے کہ کاش وہ لوگ صحرا نشین ہوتے دیہاتوں میں۔''

بَدْوٌ اسم ذات ہے۔صحرا۔دیہات۔ ہر وہ مقام جہاں کی سب چیزیں ظاہر ہوں بَدْوٌ کہلاتا ہے۔﴿وَ جَآءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ﴾(12/یوسف:100)''اور وہ یعنی اللہ تعالیٰ لایا تم لوگوں کو صحرا سے۔''

(افعال) **اِبْدَاءً** ظاہر کرنا۔﴿قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِیْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ یَعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ﴾(3/آل عمران:29)''آپ ﷺ کہیے اگر تم لوگ خفیہ رکھو اس کو جو تمہارے سینوں میں ہے یا ظاہر کرو اس کو، جانتا ہے اس کو اللہ۔''

مُبْدٍ اسم الفاعل ہے۔ظاہر کرنے والا۔﴿وَ تُخْفِیْ فِیْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِیْهِ﴾(33/الاحزاب:37)''اور تم خفیہ رکھتے ہو اپنے جی میں وہ جو اللہ ظاہر کرنے والا ہے۔''

كُنْتُمْ (ك و ن): البقرۃ آیت 10 دیکھیں۔

ك ت م

(ن) **كِتْمَانًا** کوئی بات یا چیز چھپانا۔''کتمان کا اطلاق اس اخفاء (چھپانے) پر ہوتا ہے جو قصداً کیا جائے اور اس موقع پر جہاں اظہار ضروری ہو۔'' (ماجدیؒ)۔گویا حق بات کو جان بوجھ کر چھپانے کے لیے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔﴿وَ اِنَّ فَرِیْقًا مِّنْهُمْ لَیَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَ هُمْ یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۴۶﴾﴾(2/البقرہ:146)''اور بیشک ایک فریق ہے ان میں، وہ لوگ چھپاتے ہیں حق کو اس حال میں کہ وہ جانتے ہیں۔''

ترکیب

قَالَ کا فاعل اس میں شامل هُوَ کی ضمیر ہے جو رب کے لئے ہے۔یَا حرف ندا ہے اور اٰدَمُ ، مُنَادٰی۔ اَنْۢبِئْهُمْ میں اَنْۢبِئْ فعل امر ہے اور اس کا فاعل اس میں شامل اَنْتَ کی ضمیر ہے جو حضرت آدمؑ کے لیے ہے۔اور هُمْ ضمیر مفعولی، فرشتوں کے لئے ہے۔آگے بِاَسْمَآىِٕهِمْ متعلق فعل ہے۔اور یہ هِمْ ضمیر اشیاء کے لئے ہے۔اشیاء میں چونکہ عاقل اور غیر عاقل تمام مخلوقات شامل تھیں۔اس لئے اشیاء کے لئے هَا کے بجائے هُمْ ضمیر عاقل مخلوقات کی رعایت سے آئی ہے۔فَلَمَّا میں لَمَّا حرف شرط ہے جو ماضی کے دو جملوں پر آتا ہے یہاں جملہ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآىِٕهِمْ جملہ شرطیہ ہے اور قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ سے لے کر آخیر تک جواب شرط ہے۔ اَنْۢبَاَهُمْ میں اَنْۢبَاَ کی ضمیر فاعلی حضرت آدمؑ کے لیے ہے اور هُمْ ضمیر مفعولی، فرشتوں کے لیے ہے۔ بِاَسْمَآىِٕهِمْ متعلق فعل ہے۔قَالَ کی ضمیر فاعلی اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔آگے اَ۔استفہامیہ ہے اور لَمْ جوازم مضارع میں سے ہے اور اَقُلْ مضارع مجزوم ہے۔ لَكُمْ متعلق فعل ہے۔اِنِّیْ میں یِ ضمیر اِنَّ کا اسم ہے اور اگلا جملہ اِنَّ کی خبر ہے۔اِس میں اَعْلَمُ مضارع کا واحد متکلم کا صیغہ ہے اور غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اس کا مفعول ہے۔ 'وَ' عطف کا ہے۔اَعْلَمُ۔مضارع کا واحد متکلم کا صیغہ ہے۔'مَا' اسم موصول ہے اور جملہ فعلیہ تُبْدُوْنَ اس کا صلہ ہے اور صلہ اور موصول مل کر مفعول ہے اَعْلَمُ کا آگے 'وَ' عطف کا ہے اور 'مَا' اسم موصول ہے كُنْتُمْ میں كَانَ کا اسم اِس میں شامل ضمیر اَنْتُمْ ہے اور جملہ فعلیہ تَكْتُمُوْنَ، كَانَ کی خبر ہے اور یہ جملہ صلہ ہے 'مَا' کا اور اسم موصول اور صلہ عطف ہے جملہ ماقبل پر۔(واللہ اعلم)۔

ترجمہ

البقرۃ:33

قَالَ	یٰۤاٰدَمُ	اَنۡۢبِئۡهُمۡ	بِاَسۡمَآئِهِمۡ ۚ	فَلَمَّاۤ	اَنۡۢبَاَهُمۡ
اس (اللہ تعالیٰ) نے کہا	اے آدمؑ	آپؑ بتائیں ان (فرشتوں) کو	ان (چیزوں) کے نام	تو جب	انہوںؑ نے بتایا ان (فرشتوں) کو

بِاَسۡمَآئِهِمۡ ۙ	قَالَ	اَلَمۡ اَقُلۡ	لَّكُمۡ	اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ
ان (چیزوں) کے نام	اس (اللہ تعالیٰ) نے کہا	کیا میں نے نہیں کہا تھا	تم سے	کہ یقیناً میں جانتا ہوں

غَیۡبَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۙ	وَاَعۡلَمُ	مَا	تُبۡدُوۡنَ
آسمانوں اور زمین کے غیب کو	اور میں جانتا ہوں	وہ جو	تم لوگ ظاہر کرتے ہو

وَمَا	كُنۡتُمۡ تَكۡتُمُوۡنَ ﴿۳۳﴾
اور وہ جو	تم لوگ چھپایا کرتے ہو

آیت:34

﴿وَاِذۡ قُلۡنَا لِلۡمَلٰٓئِكَةِ اسۡجُدُوۡا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوۡۤا اِلَّاۤ اِبۡلِیۡسَ ؕ اَبٰی وَاسۡتَكۡبَرَ وَكَانَ مِنَ الۡكٰفِرِیۡنَ ﴿۳۴﴾﴾

اِذۡ: البقرۃ آیت 30 دیکھیں۔ قُلۡنَا (ق و ل): البقرۃ آیت 8 دیکھیں۔ اَلۡمَلٰٓئِكَةُ (م ل ك): الفاتحہ آیت 3 دیکھیں۔

س ج د

(ن) **سُجُوۡدًا** اس کے لفظی معنی ہیں جھکنا اور عاجزی اختیار کرنا۔ جھکنے کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں۔ کسی کے سامنے تعظیماً کمر کو خم دے کر سر کو جھکا دینا بھی جھکنا ہے، جیسے رکوع میں ہوتا ہے اور پیشانی اور ناک کو زمین پر رکھ دینا بھی جھکنا ہے، جسے سجدہ کہتے ہیں اور یہ جھکنے کی انتہا ہے۔ اصطلاحِ شرع میں اس سے مراد ہے اللہ تعالیٰ کی عظمت کے اعتراف میں، اس کی عبادت کی خاطر ناک اور پیشانی کو زمین پر رکھ دینا۔ سجدہ کرنا۔ نماز کا ایک اہم رکن ہے۔ ﴿فَسَجَدَ الۡمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمۡ اَجۡمَعُوۡنَ ﴿۳۰﴾﴾ (15/الحجر:30) ''چنانچہ تمام فرشتوں نے سجدہ کیا۔'' ﴿مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسۡجُدَ اِذۡ اَمَرۡتُكَ ؕ﴾ (7/الاعراف:12) ''کس چیز نے منع کیا تجھ کو کہ تو سجدہ نہ کرے جب میں نے حکم دیا تجھ کو۔'' سجدہ کرنا کسی کی تعظیم کے لیے بھی ہو سکتا ہے، جسے سجدۂ تعظیمی کہتے ہیں اور کسی کی عبادت کرنے کے لیے بھی جسے سجدۂ عبادت کہتے ہیں۔ سجدۂ تعظیمی، پہلے انبیاء کی شریعت میں بڑوں کی تعظیم کے لیے جائز تھا۔ ہماری شریعت مطہرہ میں یہ حرام ہے (نہ صرف سجدہ تعظیمی، بلکہ غیر اللہ کے لیے رکوع اور بہیئت نماز ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونے کو بھی ناجائز قرار دیا گیا ہے)۔ ہماری شریعت میں صرف سجدۂ عبادت ہے اور وہ بھی صرف اللہ تعالیٰ کے لیے۔ لغوی معنی کے لحاظ سے قرآن مجید میں یہ لفظ ساری مخلوق پر بھی بولا گیا ہے۔ مثلاً: ﴿اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یَسۡجُدُ لَهٗ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنۡ فِی الۡاَرۡضِ﴾ (22/الحج:18) ''کیا تو نے دیکھا نہیں کہ اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہیں سب، آسمانوں میں اور سب، زمین میں۔'' جس کو سجدہ کیا جائے اس پر ''لام'' کا صلہ آتا ہے۔ اس نے اللہ کو سجدہ کیا، اس جملے کی عربی سَجَدَ اللّٰهَ کرنا غلط ہے۔ صحیح عربی ہوگی سَجَدَ لِلّٰهِ (واللہ اعلم)۔

سَجۡدَةٌ ج: سُجُوۡدٌ۔ اسم ذات ہے۔ سجدہ۔ ﴿سِیۡمَاهُمۡ فِیۡ وُجُوۡهِهِمۡ مِّنۡ اَثَرِ السُّجُوۡدِ ؕ﴾ (48/الفتح:29) ''ان کی علامت ان کے چہروں پر ہے سجدوں کے اثر سے۔''

اُسْجُدْ ج: اُسْجُدُوْا۔ فعل امر ہے۔ تو سجدہ کو۔ ﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَ اسْجُدُوْا وَ اعْبُدُوْا رَبَّكُمْ ﴾ (22/الحج:77) ''اے ایمان والوتم رکوع کرو اور سجدہ کرو اور بندگی کرو اپنے رب کی۔''

سَاجِدٌ ج: سَاجِدُوْنَ، سُجَّدٌ اور سُجُوْدٌ۔ اسم الفاعل ہے۔ سجدہ کرنے والا۔ ﴿ اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّیْلِ سَاجِدًا وَّ قَآىِٕمًا یَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَ یَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ ﴾ (39/الزمر:9) ''بھلا جو شخص راتوں کے اوقات سجدے اور قیام کی حالت میں عبادت میں گزارتا ہو، آخرت سے ڈرتا ہو اور اپنے رب کی رحمت کی اُمید رکھتا ہو۔'' ﴿ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ﴾ (9/التوبة:112) ''سجدہ کرنے والے، حکم دینے والے بھلائی کا۔'' ﴿ وَ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا ﴾ (2/البقرة:58) ''اور تم لوگ داخل ہو دروازے میں سجدہ کرنے والوں کی حالت میں۔'' ﴿ وَ الْعٰكِفِیْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۱۲۵﴾ ﴾ (2/البقرة:125) ''اور اعتکاف کرنے والوں اور رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لیے۔'' (نوٹ: سُجُوْدٌ مصدر بھی ہے مطلب ہے جھکنا، یہ سِجْدَةٌ کی جمع بھی ہے مطلب ہے سجدے اور سَاجِدٌ کی جمع بھی ہے مطلب ہے سجدے کرنے والے۔ واللہ اعلم)۔

مَسْجِدٌ ج: مَسَاجِدُ۔ اسم ظرف مکان بھی ہے اور اسم ظرف زمان بھی۔ چنانچہ اس کا مطلب سجدہ کرنے کی جگہ کے بھی ہیں اور سجدہ کرنے کے وقت، یعنی نماز کے وقت کے بھی ہیں۔ مسجد کے معنی بطور ظرف مکان کے تو جانے پہچانے ہیں ہی، قرآن مجید میں یہ لفظ بطور ظرف زمان بھی استعمال ہوا ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿ وَ اَقِیْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ ﴾ (7/الاعراف:29) ''اور تم ہر سجدہ کے وقت اپنا رخ سیدھا رکھا کرو'' (ترجمہ ماجدیؒ) اس آیت کی حاشیے میں مولانا عبدالماجدؒ فرماتے ہیں: ''مسجد ظرف زمان و مکان دونوں ہے۔ معنی سجدہ کے وقت کے بھی ہیں اور سجدہ کی جگہ کے بھی۔ یہاں مراد اوّل الذکر یعنی سجدہ کے وقت سے لی گئی ہے۔'' ﴿ وَّ اَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ﴿۱۸﴾ ﴾ (72/الجن:18) ''اور یہ کہ مسجدیں اللہ کے لئے ہیں پس تم لوگ مت پکارو اللہ کے ساتھ کسی ایک کو بھی۔'' بعض علماء کے نزدیک مساجد اسم آلہ کی جمع ہے بمعنی سجدے کے آلہ و ذریعہ بننے والے اعضاء یعنی پیشانی، ناک، دونوں ہاتھ، دونوں پاؤں، دونوں زانو۔ (واللہ اعلم)۔

اٰدَمُ (ء د م): البقرة آیت 31 دیکھیں۔

اِلَّا مگر، سوائے۔ یہ حرف استثناء ہے۔ نحو کی اصطلاح میں استثناء سے مراد ہے کہ حرف استثناء کے ماقبل کے جملے میں جو حکم ہے (نفی یا اثبات) اس حکم سے مابعد کو خارج کر دینا یعنی یہ بتلانا کہ مابعد کا حکم ماقبل کے خلاف ہے۔

کسی کلام میں جب اِلَّا کے ذریعے استثناء کیا جاتا ہے تو اس کے کچھ قواعد ہیں۔ انہیں سمجھنے سے پہلے دو اصطلاحات سمجھ لیں۔ ہم کہتے ہیں ''پوری قوم آئی سوائے زید کے''۔ اس میں زید کو قوم سے الگ کیا گیا ہے۔ اب نوٹ کرلیں کہ جس سے کسی کو الگ کیا جاتا ہے اسے مستثنیٰ منه کہتے ہیں اور جس کو الگ کیا جاتا ہے اسے مستثنیٰ کہتے ہیں۔ چنانچہ مذکورہ جملے میں قوم مستثنیٰ منه ہے اور زید مستثنیٰ ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ مستثنیٰ منه اور مستثنیٰ ایک ہی جنس کے ہوں تو اسے مستثنیٰ متصل کہتے ہیں۔ جیسے مذکورہ جملے میں قوم اور زید کی جنس ایک ہی ہے اس لئے یہ مستثنیٰ متصل کی مثال ہے۔ لیکن اگر ہم کہیں تمام گھوڑے آئے سوائے گدھے کے، تو اس میں مستثنیٰ منه گھوڑے کی جنس الگ ہے اور مستثنیٰ گدھے کی جنس الگ ہے۔ اسے مستثنیٰ منقطع کہتے ہیں اب قواعد نوٹ کریں۔

(۱) مستثنیٰ متصل میں اگر کلام مثبت ہو (یعنی نفی اور استفہام نہ ہو) اور مستثنیٰ منه (جو کہ اِلَّا سے پہلے ہوگا) مذکور ہو تو مستثنیٰ ہمیشہ حالت نصب میں ہوگا۔ مثلاً جَاءَ الْقَوْمُ اِلَّا زَیْدًا۔ اس میں کلام مثبت ہے اور مستثنیٰ منه ''اَلْقَوْمُ'' مذکور ہے اس لئے مستثنیٰ زَیْدًا حالت نصب میں آیا ہے۔

(۲) مستثنیٰ متصل میں اگر کلام منفی ہو اور مستثنیٰ منه مذکور ہو تو ایسی صورت میں مستثنیٰ کو حالت نصب میں بھی لاسکتے ہیں اور جملے میں اس کی حالت کے

مطابق اعراب بھی لگا سکتے ہیں۔مثلاً مَاجَاءَ الْقَوْمُ اِلَّا زَیْدًا بھی درست ہے اور چونکہ اس جملے میں زید فاعل ہے اس لئے اِلَّا زَیْدٌ بھی درست ہے۔

(۳) مستثنیٰ متصل میں اگر کلام منفی ہو اور مستثنیٰ منہ مذکور نہ ہو تو پھر اِلَّا کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور مستثنیٰ پر اعراب جملے میں اس کی حالت میں مطابق لگایا جاتا ہے جیسے مَاجَاءَ اِلَّا زَیْدٌ ۔اس میں زَیْدٌ فاعل ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور مَاضَرَبْتُ اِلَّا زَیْدًا میں زَیْدًا مفعول ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

(۴) مستثنیٰ منقطع میں جس کو مستثنیٰ کیا جاتا ہے وہ حالت نصب میں آتا ہے۔غَیْرُ اور سِوٰی بھی استثناء کے لیے استعمال ہوتے ہیں لیکن اِن کا مستثنیٰ مجرور ہوتا ہے۔مزید تفصیل کے لیے عربی کا معلم، حصہ سوم، صفحہ ۱۱۴ دیکھیں۔(نوٹ: کبھی اِلَّا، اِنْ شرطیہ اور لَا نافیہ کا مرکب ہوتا ہے جیسے فرمایا:﴿ وَ اِلَّا تَغْفِرْ لِیْ وَ تَرْحَمْنِیْۤ اَكُنْ مِّنَ الْخٰسِرِیْنَ ﴾(11/ھود:47)''اور اگر تو نے مجھے نہ بخشا اور تو نے مجھ پر رحم نہ کیا تو میں خسارہ پانے والوں میں سے ہو جاؤں گا۔'')

ب ل س

(افعال) اِبْلَاسًا سخت نا امیدی کے باعث غمگین ہونا۔مایوس ہونا۔ثلاثی مجرد سے یہ مادہ استعمال نہیں ہوتا۔تفہیم القرآن میں اِس لفظ کی وضاحت یوں کی گئی ہے:''بَلَس اور اِبْلَاس کا لفظ کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔حیرت کی وجہ سے دنگ ہو کر رہ جانا۔خوف اور دہشت کے مارے دم بخود ہو جانا۔رنج و غم کے مارے دل شکستہ ہو جانا۔ہر طرف سے ناامید ہو کر ہمت توڑ بیٹھنا۔اور اسی کا ایک پہلو مایوسی و نامرادی کی وجہ سے برافروختہ (Desperate) ہو جانا بھی ہے جس کی بنا پر شیطان کا نام ابلیس رکھا گیا ہے۔''(تفہیم القرآن، ج ۳، ص ۲۹۴)۔صاحبِ تدبر قرآن فرماتے ہیں:''اَبْلَسَ کے معنی غمگین ہونے، انکار کرنے اور مایوس ہونے کے ہیں۔''﴿ وَ یَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ یُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴾(30/الروم:12)''اور جس دن قائم ہو گی وہ گھڑی یعنی قیامت تو شدید مایوس و غمگین ہوں گے مجرم لوگ۔''

مُبْلِسٌ اسم الفاعل ہے۔مایوس و غمگین ہونے والا۔﴿ اِنَّ الْمُجْرِمِیْنَ فِیْ عَذَابِ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ۚۖ لَا یُفَتَّرُ عَنْهُمْ وَ هُمْ فِیْهِ مُبْلِسُوْنَ ۚ﴾(43/الزخرف:74-75)''بیشک مجرم لوگ جہنم کے عذاب میں ہمیشہ رہنے والے ہیں، وہ نرم نہیں کیا جائے گا ان سے اور وہ لوگ اس میں شدید مایوس و غمگین ہوں گے۔''

اِبْلِیْسُ اِفْعِیْلُ کے وزن پر اسم صفت ہے۔مایوس و غمگین۔قرآن مجید میں ایک جن، شیطان کے اسم عَلَم کے طور پر استعمال ہوا ہے۔(ماجدیؒ)۔﴿ یٰۤاِبْلِیْسُ مَا لَكَ اَلَّا تَكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِیْنَ ﴾(15/الحجر:32)''اے ابلیس تجھے کیا ہوا کہ تو نہ ہوا سجدہ کرنے والوں کے ساتھ۔''

ء ب ی

(ف) اِبَاءً سختی سے انکار کرنا۔﴿ یُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَ تَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ ۚ﴾(9/التوبۃ:8)''وہ لوگ راضی کرتے ہیں تم لوگوں کو اپنے منہ سے اور انکار کرتے ہیں ان کے دل۔''حدیث شریف میں ہے:''كُلُّكُمْ فِي الْجَنَّةِ اِلَّا مَنْ اَبٰی''تم سب جنتی ہو مگر وہ شخص جس نے (اطاعت الٰہی سے) انکار کیا۔''(بخاری)

ك ب ر عربی زبان میں جس لفظ کا مادہ 'ک ب ر' ہو، اس کے مفہوم میں بڑائی کے معنی ضرور پائے جاتے ہیں۔البتہ بڑائی کی صورتیں مختلف ہو سکتی ہیں۔

(س)(ن) کِبَرًا عمر میں بڑا ہونا۔ بوڑھا ہو جانا۔﴿ وَلَا تَاْكُلُوْهَاۤ اِسْرَافًا وَّ بِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا ﴾(4/النساء:6)''اور تم لوگ مت کھاؤ یتیموں کے مال بے جا اور جلدی میں کہ کہیں وہ بڑے نہ ہو جائیں۔''

(ک) کُبَارَۃً، کِبَارَۃً، کَبَارَۃً اس کا مصدر مصباح اللغات میں کِبَارَۃً اور لغات القرآن میں کَبَارَۃً لکھا گیا ہے۔ واللہ اعلم۔ معنوی لحاظ سے بڑا ہونا۔ رتبہ یا اہمیت میں بڑا ہونا۔ بھاری یا دشوار ہونا۔﴿ كُوْنُوْا حِجَارَةً اَوْ حَدِيْدًا ۝ اَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِيْ صُدُوْرِكُمْ ﴾(17/بنی اسرائیل:50-51)''تم لوگ ہو جاؤ پتھر یا لوہا یا کوئی چیز جو بڑی ہے تمہارے سینوں میں یعنی تمہاری سمجھ میں۔''﴿ وَ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ ﴾(6/الانعام:35)''اور اگر آپ پر دشوار ہے اُن کا منہ پھیرنا۔''

کِبَرٌ اسم ذات ہے۔ بڑھاپا۔﴿ قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّ قَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ ﴾(3/آل عمران:40)''اس نے کہا اے میرے رب کہاں سے ہو گا میرے لئے کوئی لڑکا اس حال میں کہ پہنچ چکا ہے مجھ کو بڑھاپا۔''

کِبْرٌ اسم ذات ہے۔ بڑائی۔ بڑا۔﴿ اِنْ فِيْ صُدُوْرِهِمْ اِلَّا كِبْرٌ مَّا هُمْ بِبَالِغِيْهِ ﴾(40/المومن:56)''نہیں ہے ان کے سینوں میں مگر بڑائی، وہ لوگ اس تک پہنچنے والے نہیں ہیں۔''﴿ وَ الَّذِيْ تَوَلّٰى كِبْرَهٗ مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ ﴾(24/النور:11)''اور جس نے اٹھایا ہے اُس کا بڑا بوجھ اُس کے واسطے بڑا عذاب ہے۔''(ترجمہ شیخ الہندؒ)

کِبْرِیَاءُ اسم ذات ہے۔ عظمت۔ بزرگی۔ بڑائی۔ وہ ہستی جو ہر ایک کی اطاعت سے بالاتر ہو اور ایسی ہستی صرف اللہ ہی کی پاک ذات ہے۔ اسی لیے قرآنِ مجید میں فرمایا﴿ وَ لَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ﴾(45/الجاثیۃ:37)''اور اُسی کے لیے بڑائی ہے آسمانوں میں اور زمین میں'' اور حدیث قدسی میں ہے ''اَلْكِبْرِيَاءُ رِدَآئِيْ وَالْعَظَمَةُ اِزَارِيْ فَمَنْ نَازَعَنِيْ وَاحِدًا مِّنْهُمَا اَدْخَلْتُهُ النَّارَ- وَفِيْ رِوَايَةٍ قَذَفْتُهُ فِي النَّارِ-(رواہ مسلم)''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ذاتی بزرگی میری چادر ہے اور صفاتی عظمت میرا تہبند ہے پس جو ان دونوں میں سے کسی ایک میں میرے ساتھ جھگڑا کرے گا (یعنی جو تکبر کرے گا اور اس طرح وہ گویا میری ذات وصفات میں شرک کا ارتکاب کرے) تو میں اس کو آگ میں داخل کروں گا۔ اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ ''تو میں اس کو آگ میں پھینک دوں گا۔''(مظاہر حق جدید، شرح مشکوۃ شریف، ج ۴، ص ۵۸۶)۔﴿ وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ ﴾(10/یونس:78)''اور ہو جائے تم دونوں کے لئے بڑائی زمین میں۔''

کَبِیْرٌ ج: کُبَرَاءُ۔ اسم صفت ہے۔ بڑا۔ بھاری یا دشوار۔﴿ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ كَبِيْرٌ ۝ ﴾(35/فاطر:7)''ان کے لئے مغفرت ہے اور بڑا اجر ہے۔''۔﴿ رَبَّنَاۤ اِنَّاۤ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَ كُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا ۝ ﴾(33/الاحزاب:67)''اے ہمارے رب ہم نے اطاعت کی اپنے سرداروں کی اور اپنے بڑوں کی تو انہوں نے گمراہ کیا ہم کو راستے سے۔'' اَلْكَبِيْرُ اسمائے حسنیٰ میں سے بھی ہے۔﴿ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ ۝ ﴾(13/الرعد:9)''ظاہر اور پوشیدہ کا وہ عالم ہے، سب سے بڑا ہے اور سب سے بلند و بالا۔''(نوٹ: کَبِیْرٌ کا الٹ صَغِیْرٌ ہے۔ امام راغبؒ فرماتے ہیں: ''کبیر اور صغیر اسمائے اضافیہ سے ہیں۔ جن کے معانی ایک دوسرے کے لحاظ سے متعین ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایک ہی چیز دوسری کے مقابلہ میں صغیر ہوتی ہے۔ لیکن وہی شئے ایک اور کے مقابلہ میں کبیر کہلاتی ہے۔''(مفردات القرآن، ج ۲، ص ۸۸۸)۔

کُبَّارٌ کَبِیْرٌ کا صیغہ مبالغہ ہے۔ بہت بڑا۔﴿ وَ مَكَرُوْا مَكْرًا كُبَّارًا ۝ ﴾(71/نوح:22)''اور اُنہوں نے بڑے بڑے مکر کر ڈالے۔''(ترجمہ ماجدیؒ)۔ پیر کرم شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں: '' کَبِیْرٌ، کُبَارٌ اور کُبَّارٌ ہم معنی ہیں۔''

كَبِيْرَةٌ: ج: كَبَائِرُ - كَبِيْرٌ کا مونث ہے۔ ﴿ مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً ﴾ (18/الکہف:49) ''کیسی ہے یہ کتاب نہیں چھوڑتی کسی چھوٹی چیز کو اور نہ ہی بڑی چیز کو۔'' ﴿ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ﴾ (2/البقرہ:143) ''اور بیشک وہ بھاری تھی سوائے ان لوگوں کے جن کو ہدایت دی اللہ نے۔'' ﴿ وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ ﴾ (42/الشوریٰ:37) ''اور وہ لوگ جو اجتناب کرتے ہیں بڑے بڑے گناہوں سے۔''

اَكْبَرُ: ج: اَكَابِرُ - افعل التفضیل ہے۔ زیادہ بڑا۔ سب سے بڑا۔ ﴿ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ﴾ (2/البقرہ:219) ''اور ان دونوں کا گناہ زیادہ بڑا ہے ان دونوں کے نفع سے۔'' ﴿ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا ﴾ (6/الانعام:123) ''اور اسی طرح ہم نے ہر بستی میں وہاں کے رئیسوں ہی کو جرائم کا مرتکب بنایا۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)

كُبْرٰى: ج: كُبَرٌ - اَكْبَرُ کا مونث ہے۔ ﴿ الَّذِيْ يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰى ﴾ (87/الاعلیٰ:12) ''جو پڑے گا بڑی آگ میں۔'' ﴿ اِنَّهَا لَاِحْدَى الْكُبَرِ ﴾ (74/المدثر:35) ''یقیناً وہ جہنم بڑی چیزوں میں سے ایک ہے۔''

(افعال) **اِكْبَارًا**: کسی کو بڑا سمجھنا۔ حیران ہونا۔ ﴿ فَلَمَّا رَاَيْنَهٗٓ اَكْبَرْنَهٗ ﴾ (12/یوسف:31) اس آیت مبارکہ کے کئی طرح سے ترجمے کیے گئے ہیں مثلاً: ''اور جب اُن لوگوں نے (یوسفؑ کو) دیکھا اس پر حیران رہ گئیں۔'' (ترجمہ ماجدیؒ) ''اُن عورتوں نے جب اُسے دیکھا تو بہت بڑا جانا۔'' (ترجمہ احسن البیان) ''پس جب (یوسفؑ آئے اور) اُنہوں نے اُس کو دیکھا تو اُس کی عظمت (حسن) کی قائل ہوگئیں۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔ پیر کرم شاہ صاحبؒ اس آیت کے حاشیہ میں لکھتے ہیں: ''اَكْبَرْنَهٗ کا معنی ہے کہ وہ حسنِ یوسفی کو دیکھ کر مسحور بھی ہوئیں اور مرغوب بھی۔''

(تفعیل) **تَكْبِيْرًا**: کسی کو بڑا سمجھنا اور بڑا کہنا۔ کسی کی بڑائی بیان کرنا۔ اللہ اکبر کہہ کر اللہ کی عظمت کو ظاہر بھی کرنا اور اس کی عظمت کا احساس بھی کرنا۔ ﴿ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ ﴾ (2/البقرہ:185) ''اور تاکہ تم لوگ پورا کرو گنتی کو اور تاکہ تم لوگ بڑائی بیان کرو اللہ کی اس پر جو اس نے ہدایت دی تم کو۔''

كَبِّرْ: فعل امر ہے۔ تو بڑائی بیان کر۔ ﴿ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ﴾ (74/المدثر:3) ''اور پروردگار کی بڑائی بیان کیجیے۔'' ﴿ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا ﴾ (17/بنی اسرائیل:111) ''اور اُس کی خوب بڑائیاں بیان کیجیے۔'' (ترجمہ ماجدیؒ) اس آیت کے حاشیہ میں مولانا عبدالماجد دریابادیؒ فرماتے ہیں: ''محققین نے کہا ہے کہ عربی زبان میں مفہوم تعظیم و اجلال کے لیے لفظ تکبیر سے بڑھ کر اور جامع تر کوئی لفظ نہیں اور جب اس فعل کا امر مصدر اور پھر صیغہ نکرہ کے ساتھ مؤکد ہو کر آئے تو زور اور وسعت کی انتہا ہی نہیں رہ جاتی۔''

(تفعّل) **تَكَبُّرًا**: بناوٹی طور پر بڑا بننا۔ واقعی بڑا ہونا۔ صاحبؒ لغات القرآن فرماتے ہیں: ''تکبر دو طرح کا ہوتا ہے (۱) فی نفسہٖ کسی میں خوبیاں اور صفاتِ حسنہ سب سے زائد ہوں۔ (۲) واقع میں تو صفاتِ حسنہ سے خالی ہو اور مدعی ہو کمالِ صفات کا، اول محمود (قابل تعریف) ہے اور دوسرا مذموم (قابل مذمت) ہے اس لیے اول معنی کا لحاظ کرتے ہوئے متکبر اللہ کی صفت ہے اور محمود ہے اور دوسرے معنی کے لحاظ سے کافر یا مغرور انسان پر اطلاق ہوتا ہے جو مذموم اور قبیح (برا) ہے۔'' (لغات القرآن، ج ۵، ص ۲۹۹)۔ صاحبؒ مترادفات القرآن فرماتے ہیں: ''تَكَبُّرٌ، یہ فخر کا سب سے آخری درجہ ہے۔ جس میں انسان عُجب میں مبتلا ہو جاتا ہے اور خود پسندی کی اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ دوسروں کو حقیر سمجھنے لگتا ہے اور حق بات کو قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ جیسا کہ حدیث مبارک میں فرمایا ''تکبر یہ ہے کہ تو حق بات کو ٹھکرائے اور لوگوں کو حقیر سمجھے۔'' (بَطَرُ الْحَقِّ وَغَمْطُ النَّاسِ (بخاری)۔ پوری حدیث کے لیے ملاحظہ ہو مظاہر حق جدید، شرح مشکوٰۃ شریف، ج ۴، ص ۵۸۳) ﴿ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا ﴾ (7/الاعراف:13) ''پس تو اُتر اس سے، پس تیرے لئے

نہیں ہے کہ تو بڑا بنے اس میں۔''

مُتَكَبِّرٌ ج: مُتَكَبِّرُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ بڑا بننے والا۔ ﴿ اِنِّيْ عُذْتُ بِرَبِّيْ وَ رَبِّكُمْ مِّنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ ﴾ (40/المومن:27) ''میں پناہ میں آتا ہوں اپنے رب اور تمہارے رب کی، ہر بڑا بننے والے سے۔'' مُتَكَبِّرٌ اسمائے حسنیٰ میں سے بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لیے استعمال ہو تو معنی ہوتے ہیں وہ ہستی جس کی عظمت انتہا کو پہنچی ہوئی ہو اور جس میں فی نفسہٖ سب سے زیادہ خوبیاں ہوں۔ چنانچہ فرمایا ﴿ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ﴾ (الحشر:23)۔ اس آیت میں اَلْمُتَكَبِّرُ کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا مودودیؒ فرماتے ہیں: ''اصل میں لفظ اَلْمُتَكَبِّر استعمال ہوا ہے جس کے دو مفہوم ہیں۔ ایک وہ جو فی الحقیقت بڑا نہ ہو مگر خواہ مخواہ بڑا بنے۔ دوسرے وہ جو حقیقت میں بڑا ہو اور بڑا ہی ہو کر رہے۔ انسان ہو یا شیطان، یا کوئی اور مخلوق، چونکہ بڑائی فی الواقع اس کے لیے نہیں ہے، اس لیے اُس کا اپنے آپ کو بڑا سمجھنا اور دوسروں پر اپنی بڑائی جتانا ایک جھوٹا ادّعا اور بدترین عیب ہے۔ اس کے برعکس، اللہ تعالیٰ حقیقت میں بڑا ہے اور بڑائی فی الواقع اسی کے لیے ہے اور کائنات کی ہر چیز اس کے مقابلے میں حقیر و ذلیل ہے، اس لیے اس کا بڑا ہونا اور بڑا ہی ہو کر رہنا کوئی ادّعا اور تصنّع نہیں بلکہ ایک امر واقعی ہے، ایک بری صفت نہیں بلکہ ایک خوبی ہے جو اس کے سوا کسی میں نہیں پائی جاتی۔'' (تفہیم القرآن، ج ۵، ص ۴۱۵)

(استفعال) اِسْتِكْبَارًا بڑائی چاہنا۔ اس کا مطلب ہوتا ہے خواہ مخواہ اپنے آپ کو بڑا سمجھتے ہوئے حق بات کا انکار کر دینا اور دوسروں کو حقیر سمجھنا۔ ﴿ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لَوْ لَاۤ اَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِيْنَ ۝۳۱ ﴾ (34/سبا:31) ''وہ لوگ کہیں گے جن کو کمزور سمجھا گیا ان سے جنہوں نے بڑائی چاہی، اگر نہ ہوتے تم لوگ تو ہم ہوتے ایمان لانے والے۔''

مُسْتَكْبِرٌ ج: مُسْتَكْبِرُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ بڑائی چاہنے والا۔ ﴿ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّ هُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ۝۲۲ ﴾ (16/النحل:22) ''ان کے دل انکار کرنے والے ہیں اور وہ لوگ بڑائی چاہنے والے ہیں۔''

كَانَ (ك و ن): البقرۃ آیت 10 دیکھیں۔ كٰفِرِيْنَ (ك ف ر): البقرۃ آیت 6 دیکھیں۔

ترکیب

''وَ'' استینافیہ ہے۔ اِذْ ظرف زمان ہے اور اس سے پہلے فعل اُذْكُرْ یا اُذْكُرُوْا محذوف ہے۔ قُلْنَا فعل بافاعل ہے اور اس کی ضمیر فاعلی اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ لِلْمَلٰٓئِكَةِ متعلق فعل ہے۔ اُسْجُدُوْا فعل امر ہے اور اس کا فاعل اس میں شامل ضمیر اَنْتُمْ ہے جو فرشتوں کے لیے ہے۔ لِاٰدَمَ متعلق فعل ہے۔ لِاٰدَمَ میں ''لام'' اِلٰی کے معنی میں ہے (ماجدیؒ، حقانیؒ) یعنی 'لام' کے معنی 'واسطے' کے نہیں بلکہ ''طرف'' اور ''سمت'' کے ہیں۔ فَسَجَدُوْٓا فعل ماضی ہے اور اس کا فاعل اس میں شامل ضمیر ہے جو فرشتوں کے لیے ہے۔ اِلَّآ حرف استثناء ہے اور ابلیس، مستثنیٰ منقطع ہے کیونکہ فرشتے اور ابلیس ایک جنس کے نہیں اس لیے حالت نصب میں ہے۔ آگے اَبٰى اور اِسْتَكْبَرَ ماضی کے صیغے ہیں اور اس میں شامل ضمیر فاعلی ابلیس کے لیے ہے۔ درمیان میں حرف عطف ہے۔ آگے بھی 'وَ' عطف کا ہے اور كَانَ افعال ناقصہ میں سے ہے اور اس کا اسم اس میں شامل ضمیر 'هُوَ' ہے جو شیطان کے لیے ہے۔ اس کی خبر محذوف ہے اور مِنَ الْكٰفِرِيْنَ متعلق خبر ہے۔ كَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ کے دو طرح ترجمے کیے گئے ہیں یعنی ''وہ تھا'' اور ''وہ ہو گیا''۔ مثلاً حضرت شیخ الہندؒ ترجمہ کرتے ہیں ''اور تھا وہ کافروں میں کا۔'' اس صورت میں یہ بزرگ اس کے آگے فِيْ عِلْمِ اللّٰهِ محذوف مانتے ہیں اور دوسری صورت میں ہمارے بزرگوں کی رائے یہ ہے کہ كَانَ یہاں صَارَ (ہو گیا) کے معنی میں ہے یعنی وہ پہلے کافروں میں سے نہیں تھا بلکہ اللہ کے حکم کی نافرمانی نے اسے کافروں میں داخل کر دیا۔ اس ترکیب کے لحاظ سے بھی ترجمہ کیا گیا مثلاً ''اور کافروں میں سے ہو گیا۔'' (ترجمہ ماجدیؒ) (واللہ اعلم)

ترجمہ
البقرۃ:34

وَاِذْ قُلْنَا	لِلْمَلٰٓئِكَةِ	اسْجُدُوْا	لِاٰدَمَ	فَسَجَدُوْٓا
اور (یاد کرو) جب ہم نے کہا	تمام فرشتوں سے	تم سجدہ کرو	آدمؑ کو	تو انہوں نے سجدہ کیا

اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ	اَبٰى	وَاسْتَكْبَرَ ۫	وَكَانَ
سوائے ابلیس کے	اس نے انکار کیا	اور اس نے بڑائی چاہی (یعنی تکبر کیا)	اور وہ تھا یا ہو گیا

مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۴﴾
انکار کرنے والوں میں سے

نوٹ:1 آیت زیرِ مطالعہ میں کلام مثبت اور مستثنیٰ منہ (ملائکہ) مذکور ہے اس لئے اِبْلِيْسَ کی نصب سے یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ یہ مستثنیٰ متصل ہے یا منقطع ہے۔ چنانچہ اس مقام سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ابلیس فرشتہ تھا یا جن تھا۔ البتہ سورہ کہف کی آیت نمبر 50 میں وضاحت کی گئی ہے کہ وہ ایک جن تھا، اسی لیے ترکیب میں اسے مستثنیٰ منقطع بتایا گیا۔

نوٹ:2 مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اس آیت مبارکہ میں فرشتوں کو سجدہ کرنے کے حکم کے متعلق فرماتے ہیں: ''سجدہ سے مراد سجدۂ اصطلاحی وسجدۂ نماز نہیں، مطلق سجدہ مراد ہے۔ سجود اور سجدہ کے لفظی معنی محض تواضع وتذلل کے ہیں۔ سجدۂ نماز کو بھی سجدہ اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ تذلل وتواضع کا بہترین مظہر ہے۔ خود محاورۂ قرآن میں سجود کا استعمال اس عام معنی میں عام ہے۔ مثلاً ﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ ﴾ (اے مخاطب کیا تو نہیں دیکھتا کہ آسمان وزمین میں جو بھی مخلوق ہے، سب اللہ کے آگے جھکی ہوئی ہے) اور یہاں بھی قول اصح یہی ہے کہ یہ سجدہ اپنی ہیئت معروف کے ساتھ زمین پر پیشانی رکھنے کے معنی میں تھا ہی نہیں بلکہ صرف جھکنے کے معنی میں تھا۔ لیکن جن لوگوں نے اسے سجدۂ متعارف کے معنی میں لیا ہے، انہوں نے بھی تصریح کر دی ہے کہ یہ سجدۂ تعظیمی تھا جو اگلی شریعتوں میں جائز تھا سجدۂ عبادت ہرگز نہ تھا''...... آگے لِاٰدَمَ کے متعلق لکھتے ہیں......''لِاٰدَمَ۔ یعنی خلیفۃ اللہ کے آگے۔ نائب سلطان حقیقی کی طرف رُخ کر کے، نہ یہ کہ اس کو۔ ل یہاں الی کا مرادف ہے۔ یعنی سمت اور طرف کے معنی میں ہے۔ سجدہ صرف سمت آدم میں تھا، جیسے آج بھی سمتِ کعبہ میں ہوتا ہے۔ مسجود جس طرح آج بھی کعبہ نہیں رب کعبہ ہے۔ اسی طرح اُس وقت بھی ذاتِ باری ہی تھی۔ قرآن مجید ہی کی ایک اور آیت میں ل عند کے معنی میں آیا ہے۔ ﴿ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ ﴾ ۔ (تفسیر ماجدیؒ، ص ۲۰)

نوٹ:3 یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا جن بھی سجدہ کرنے کے حکم میں داخل تھے۔ تو اس کا جواب قاضی بیضاویؒ ان الفاظ میں دیتے ہیں: ''جن بھی فرشتوں کے ساتھ سجدہ کے حکم میں شامل تھے لیکن فرشتوں کے ذکر کے بعد جنات کے ذکر کی ضرورت اس وجہ سے باقی نہیں رہی کہ جب یہ بات معلوم ہو گئی کہ بڑوں کو کسی کی تعظیم وتکریم کا حکم ہوا ہے تو اس سے یہ بات آپ سے آپ واضح ہو گئی کہ چھوٹے بھی اس حکم میں شامل ہیں۔ اس صورت میں فَسَجَدُوْٓا کی جو ضمیر ہے وہ دونوں گروہوں کی طرف لوٹے گی۔ (بحوالہ تدبر قرآن، ج ۱، ص ۱۶۶)۔ حضرت قاضی بیضاویؒ کے قول کی تائید قرآنِ مجید سے بھی ہوتی ہے چنانچہ فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ۖ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۱۱﴾ قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ؕ ﴾ (7/ الاعراف: 11، 12) ''ہم نے تمہاری تخلیق کی ابتداء کی، پھر تمہاری صورت بنائی، پھر فرشتوں سے کہا آدم کو سجدہ کرو۔ اس حکم پر سب نے سجدہ کیا مگر ابلیس سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا۔ پوچھا، ''تجھے کس چیز نے سجدہ کرنے سے روکا جب کہ میں نے تجھ کو حکم دیا تھا؟'' ﴿ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ؕ ﴾ (18/ الکہف: 50) ''اور جب کہا ہم نے فرشتوں کو سجدہ کرو آدم کو تو سجدے میں گر پڑے مگر ابلیس، تھا جن کی قسم سے سو نکل بھاگا اپنے رب کے حکم سے۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)

آیت: 35

﴿وَ قُلْنَا يٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَ كُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۪ وَ لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۳۵﴾

قُلْنَا (ق و ل): البقرۃ آیت 8 دیکھیں۔ اٰدَمُ (ء د م): البقرۃ آیت 31 دیکھیں۔

س ك ن

(ن) **سُكُوْنًا** حرکت کے بعد ٹھہرنا۔آرام کرنا۔سکونت اختیار کرنا۔آباد ہونا۔﴿هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ﴾ (10/یونس:67)''وہ ہے جس نے بنایا تم لوگوں کیلئے رات کوتا کہ تم لوگ آرام کرو اس میں۔''﴿وَّ سَكَنْتُمْ فِيْ مَسٰكِنِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ﴾ (14/ابراہیم:45)''اور تم لوگوں نے سکونت اختیار کی ان لوگوں کے مکانوں میں، جنہوں نے ظلم کیا اپنے آپ پر۔'' جب اِس کے ساتھ اِلیٰ کا صلہ استعمال ہو تو مطلب ہوتا ہے سکون حاصل کرنا۔﴿وَ مِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَيْهَا﴾ (30/الروم:21)''اور اُسی کی نشانیوں میں ہے کہ اُس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس کی بیویاں بنائیں تا کہ تم اُن سے سکون حاصل کرو۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)

اُسْكُنْ ج: اُسْكُنُوْا۔فعل امر ہے ۔تو آرام کر۔تو سکونت اختیار کر۔﴿وَ اِذْ قِيْلَ لَهُمُ اسْكُنُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ﴾ (7/الاعراف:161)''اور جب کہا گیا ان لوگوں سے کہ تم لوگ سکونت اختیار کرو اس بستی میں۔''

سَاكِنٌ اسم الفاعل ہے۔ٹھہرنے والا۔ٹھہرا ہوا۔﴿اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ ۚ وَ لَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا ۚ﴾ (25/الفرقان:45)''کیا تو نے دیکھا نہیں اپنے رب کی (قدرت کی) طرف کیسے اس نے پھیلایا سائے کو، اور اگر وہ چاہتا تو وہ بنا تا اس کو ٹھہرا ہوا۔''

مَسْكُوْنٌ اسم المفعول ہے۔واحد مذکر۔آباد مکان کو کہتے ہیں جس میں کوئی رہتا ہو۔

مَسْكُوْنَةٌ اسم المفعول ہے۔ واحد مونث۔ آباد مکان۔ غَيْرُ مَسْكُوْنَةٍ کا مطلب ہوگا غیر آباد مکان جس میں کوئی نہ رہتا ہو۔﴿لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ مَسْكُوْنَةٍ فِيْهَا مَتَاعٌ لَّكُمْ ؕ﴾ (24/النور:29)''تم پر کوئی گناہ اس میں نہیں ہے کہ تم اُن مکانات میں داخل ہو جاؤ (جن میں) کوئی رہتا نہ ہو اور اُن میں تمہارا کچھ مال ہو۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)

مَسْكَنٌ ج: مَسَاكِنُ۔اسم الظرف ہے۔ٹھہرنے کی جگہ۔مکان۔﴿لَقَدْ كَانَ لِسَبَاٍ فِيْ مَسْكَنِهِمْ اٰيَةٌ ۚ﴾ (34/سبا:15) ''سبا والوں کے لیے اُن کے وطن ہی میں نشان موجود تھا۔'' اور مَسَاكِنُ کے لیے اوپر (ابراہیم:45) دیکھیں۔

سَكَنٌ اسم ذات ہے۔راحت۔آرام۔تسکین۔﴿اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ؕ﴾ (9/التوبہ:103)''بیشک آپؐ کی دعا ان کیلئے باعث تسکین ہے۔'' مفتی محمد شفیعؒ سَكَنٌ کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''سَكَن، سکون سے مشتق ہے، ہر ایسی چیز کو سَكَن کہا جاتا ہے جس پر پہنچ کر انسان کو سکون و اطمینان اور راحت حاصل ہو۔اسی لیے انسان کے رہنے کے گھر کو قرآن میں سَكَن فرمایا ہے، جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا، کیونکہ انسان کا گھر خواہ ایک جھونپڑی ہی ہو وہاں پہنچ کر انسان کو عادۃً سکون و راحت حاصل ہوتی ہے۔'' (معارف القرآن، ج ۳، ص ۴۰۰)

سَكِيْنَةٌ اسم ذات ہے۔ایسا اطمینان اور سکون جس سے دل کو قرار آ جائے اور ہر قسم کی تشویش کا خاتمہ ہو جائے۔صاحبؒ لغات القرآن فرماتے ہیں: ''سَكِيْنَةٌ وہ اطمینان، چین، قرار اور سکون ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندہ کے قلب میں اس وقت

نازل فرماتا ہے جب کہ وہ ہولناکیوں کی شدت سے مضطرب (بےقرار) ہو جاتا ہے پھر اس کے بعد جو کچھ بھی اس پر گزرے وہ اس سے گھبراتا نہیں، یہ اس کے لیے ایمان کی زیادتی، یقین میں قوت اور استقلال کو ضروری کر دیتا ہے، اسی وجہ سے حق سبحانہ نے ''یوم الغار'' اور ''یوم حنین'' جیسے قلق واضطراب کے مواقع پر اپنے رسولؐ اور مومنین پر اس کے نازل کرنے کی خبر دی ہے۔'' (لغات القرآن، ج۳،ص ۲۱۹)۔ ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ فِيْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (48/الفتح:4) ''وہی ہے جس نے اتارا سکون مومنوں کے دلوں میں۔'' واضح رہے کہ قرآن مجید میں سَكِيْنَةٌ کا لفظ چھ جگہ استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ اس کے معنی اطمینان وسکون ہی کے ہیں۔'' (واللہ اعلم)

سِكِّيْنٌ — اسم ذات ہے۔ چھری۔ چاقو۔ یہ لفظ مذکر اور مؤنث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ امام راغبؒ لکھتے ہیں: ''اس کا نام سِكِّيْنٌ اس لیے ہوا کہ مذبوح (جس کو ذبح کیا جائے) کی حرکت کو زائل کر دیتی ہے۔ یہ سُكُوْنٌ سے بروزن فِعِّيْلٌ اسم مشتق ہے۔'' ﴿وَ اٰتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّيْنًا﴾ ﴿وَ اَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَاً﴾ (12/یوسف:31) ''اور تیار کی اُن کے واسطے ایک مجلس اور دی اُن کو ہر ایک کے ہاتھ میں ایک چھری۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)

(ک) سُكُوْنَةٌ — متحرک نہ ہونا۔ محتاج ہونا (محتاجی انسان کو متحرک نہیں رہنے دیتی)۔

مَسْكَنَةٌ — اسم ذات ہے۔ محتاجی۔ ﴿وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ق﴾ (2/البقرہ:61) ''اور تھوپی گئی ان لوگوں پر ذلت اور محتاجی۔''

مِسْكِيْنٌ — ج: مَسَاكِيْنُ ۔اسم صفت ہے۔ مَنْ لَّا شَيْءَ لَهٗ۔ مسکین وہ ہے جس کے پاس کچھ نہ ہو۔ محتاج۔ ضرورت مند۔ حدیث مبارک میں بڑی وضاحت کے ساتھ مسکین کی تعریف یوں بیان کی گئی ہے۔ اَلَّذِيْ لَا يَجِدُ غِنًى يُّغْنِيْهِ وَلَا يُفْطَنُ بِهٖ فَيُتَصَدَّقُ عَلَيْهِ وَلَا يَقُوْمُ فَيَسْأَلُ النَّاسَ مسکین شخص وہ ہے جو اتنا بھی مال نہیں رکھتا کہ وہ اس کی وجہ سے مستغنی ہو اور اس کے ظاہری حالات کی وجہ سے لوگ یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ محتاج وضرورت مند ہے اسے صدقہ دیا جائے نیز لوگوں کے آگے دست سوال دراز کرنے کے لیے کھڑا بھی نہیں ہوتا۔'' (پوری حدیث کے لیے ملاحظہ ہو مظاہر حق جدید، شرح مشکوٰۃ شریف، ج۲،ص ۲۱۲)۔ ﴿وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ﴾ (17/بنی اسرائیل:26) ''اور تو دے قرابت والوں کو ان کا حق اور ضرورت مند کو۔'' ﴿وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ﴾ (2/البقرہ:177) ''اور اس نے دیا مال اس کی محبت کے باوجود قرابت والوں کو اور یتیموں کو اور ضرورت مندوں کو۔''

(افعال) اِسْكَانًا — (1) کسی کو بسانا۔ آباد کرنا۔ ﴿رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ﴾ (14/ابراہیم:37) ''اے ہمارے رب میں نے آباد کیا اپنی اولاد میں سے، ایسی وادی میں جو بغیر کھیتی والی ہے۔'' (2) کسی کو ٹھہرا دینا۔ ساکن کر دینا۔ ﴿اِنْ يَّشَاْ يُسْكِنِ الرِّيْحَ فَيَظْلَلْنَ رَوَاكِدَ عَلٰى ظَهْرِهٖ ط﴾ (42/الشوریٰ:33) ''اگر چاہے تو ہوا کو ٹھہرا دے تو وہ جہاز سمندر کی سطح پر کھڑے کے کھڑے رہ جائیں۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)

> زَوْجٌ (ز و ج): البقرۃ آیت 25 دیکھیں۔ جَنَّةٌ (ج ن ن): البقرۃ آیت 25 دیکھیں۔

ء ك ل

(ن) اَكَلًا — کسی چیز کو کھانا۔ اس کا استعمال مادی اور معنوی دونوں طرح سے ہوتا ہے۔ ﴿وَتَرَكْنَا يُوْسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ ج﴾ (12/یوسف:17) ''اور ہم نے چھوڑا یوسفؑ کو اپنے سامان کے پاس تو کھا گیا اس کو بھیڑیا۔'' ﴿وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ﴾ (47/محمد:12) ''وہ کھاتے ہیں جیسے جانور کھاتے ہیں۔''

کُلْ — تثنیہ: کُلَا۔ جمع: کُلُوْا۔ واحد مونث: کُلِیْ۔ فعل امر ہے۔ تو کھا۔ ﴿ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ ﴾(2/البقرہ:58)''تو تم لوگ کھاؤ اس میں سے جہاں سے تم لوگ چاہو۔''

اٰکِلٌ — ج: اٰكِلُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ کھانے والا۔ ﴿ تَنْۢبُتُ بِالدُّهْنِ وَ صِبْغٍ لِّلْاٰكِلِيْنَ ﴾(23/المومنون:20)''وہ اگاتا ہے تیل اور سالن کھانے والوں کے لیے۔'' ﴿ فَاِنَّهُمْ لَاٰكِلُوْنَ مِنْهَا فَمَالِـُٔوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ ﴾(37/الصافات:66)''جہنّم کے لوگ اسے کھائیں گے اور اسی سے پیٹ بھریں گے۔''

مَاْکُوْلٌ — اسم المفعول ہے۔ کھایا ہوا۔ ﴿ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ ﴾(105/الفیل:5)''تو اس نے کر دیا ان کو کھائے ہوئے بھوسے کی مانند۔''

اَکَّالٌ — اسم المبالغہ ہے۔ بہت کھانے والا۔ ﴿ سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ ﴾(5/المائدہ:42)''بہت زیادہ سننے والے جھوٹ کو، بہت زیادہ کھانے والے حرام کو۔''

اُکُلٌ — اسم ذات ہے۔ درختوں اور پودوں کی پیداوار کا وہ حصہ جو انسان کی خوراک بنے۔ پھل، میوہ۔ ﴿ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ﴾(2/البقرہ:265)''پہنچی اس کو موٹی بوندوں والی بارش تو اس نے دیا اپنا پھل دوگنا۔''

ر غ د

(س) رَغَدًا — آسودہ و خوش حال ہونا۔

رَغَدٌ — اسم صفت ہے۔ بافراغت۔ کھلا ''وہ نعمت اور رزق جس کے حاصل کرنے میں کوئی محنت اور مشقت نہ ہو اور وہ اتنی کثیر ہو کہ اس کے ختم ہونے کا اندیشہ بھی نہ ہو'' (معارف القرآن) ﴿ يَاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ ﴾(16/النحل:112)''آتا اس کو یعنی بستی کو اس کا رزق بافراغت ہر طرف سے۔''

حَیْثُ

حَیْثُ ظرف مکان ہے اور مبنی بر ضمّہ ہے۔ معنیٰ ہوتا ہے ''جہاں سے''، ''جس جگہ سے'' وغیرہ۔ زیادہ تر مکان مبہم (غیر واضح جگہ) کے لیے آتا ہے اس لیے کسی جملے سے اس کی وضاحت کی جاتی ہے۔ حَیْثُ کے ایک معنیٰ ''اہل'' کے بھی ہیں۔ حضرت مولانا عبدالماجدؒ، سورۃ الانعام کی آیت 124 کا ترجمہ کرتے ہیں: ﴿ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ﴾''اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کون اُس کی رسالت کا اہل ہے'' اور حاشیے میں فرماتے ہیں: ''حَیْثُ یہاں بطور ظرف کے موضع و موقع کے معنیٰ میں نہیں۔ بطور اسم کے اہل کے معنیٰ میں ہے۔'' (نوٹ: ح ی ث مادہ سے کوئی فعل استعمال نہیں ہوتا۔ واللہ اعلم)

شِئْتُمَا (ش ی ء): البقرۃ آیت 20 دیکھیں۔

ق ر ب

(س۔ک) قُرْبًا، قُرْبَانًا — کسی کے نزدیک جانا (س)۔ کسی کے قریب ہونا (ک)۔ قرب کا استعمال قرآنِ مجید میں کہیں باعتبار مکان کے ہوا ہے، کہیں باعتبار زمان کے، کہیں باعتبار نسب کے اور کہیں باعتبار درجہ کے ہوا ہے۔ بندہ سے اللہ کے قریب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس پر اپنے فضل و رحمت سے متوجہ ہے۔ قرب کا لفظ بطور کنایہ، ہم بستری کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ قرآنِ مجید میں ثلاثی مجرد سے ماضی معروف اور مضارع معروف کے صیغے استعمال نہیں ہوئے، البتہ مصدر قُرْبَانًا استعمال ہوا ہے۔ ﴿ فَلَوْ لَا نَصَرَهُمُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قُرْبَانًا اٰلِهَةً ﴾(46/الاحقاف:28)''سو اُن کی مدد اُن لوگوں نے کیوں نہ کی جنہیں اُنہوں نے اللہ کے سوا معبود بنا رکھا تھا تقرب کے لیے۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)

لَا تَقْرَبْ — فعل نہی ہے۔ تو قریب مت جا۔ ﴿ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ﴾(2/البقرہ:187)''یہ اللہ کی حدود ہیں تو تم لوگ

ان کے نزدیک مت جاؤ‘‘ قرآن مجید میں جہاں کہیں لَا تَقْرَبُوْا کے الفاظ آئے ہیں وہاں قرب سے قربِ مکانی مراد ہے۔

اَقْرَبُ ج: اَقْرَبُوْنَ۔ افعل التفضیل کا صیغہ ہے۔ زیادہ قریب۔ زیادہ نزدیک۔ قریب کے رشتے دار۔ ﴿ وَلَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ﴾ (4/النساء:11) ’’اور تم لوگ نہیں جانتے کہ ان میں سے کون زیادہ قریب ہے تمہارے بلحاظ نفع کے۔‘‘ ﴿ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ﴾ (4/النساء:7) ’’مردوں کا بھی حصہ ہے اُس میں جو چھوڑ مریں ماں باپ اور قرابت والے۔‘‘ (ترجمہ شیخ الہندؒ)۔ اس آیت میں اَقْرَبُوْنَ کی وضاحت کرتے ہوئے مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں: ’’لفظ اَقْرَبُوْنَ ہر قسم کی قرابت اور رشتہ داری کو حاوی ہے، خواہ وہ رشتہ باہمی ولادت کا ہو جیسے اولاد اور ماں باپ میں، یا دوسری طرح کا جیسے عام خاندانی رشتوں میں، یا وہ رشتے جو ازدواجی تعلق سے پیدا ہوئے ہیں، لفظ ’’اَقْرَبُوْنَ‘‘ سب پر حاوی ہے۔‘‘ (معارف القرآن، ج ۲ ص ۳۱۰)

قُرْبٰى اَقْرَبُ کا مونث ہے۔ زیادہ قریب۔ زیادہ نزدیک۔ قرابت والے۔ ﴿ وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ﴾ (6/انعام:152) ’’اور جب بھی تم بولو تو انصاف کرو اگرچہ وہ ہو قرابت والا۔‘‘

قَرِيْبٌ فَعِيْلٌ کے وزن پر صفت ہے۔ قریب۔ نزدیک۔ ﴿ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ﴾ (2/البقرہ:186) ’’اور جب آپؐ سے پوچھیں میرے بندے میرے بارے میں تو یقینا میں نزدیک ہوں۔‘‘ قریب واحد و جمع سب کے لیے آتا ہے، لفظ مذکر ہے لیکن مؤنث غیر حقیقی پر بھی اس کا اطلاق صحیح ہے، جیسے اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ۔

مَقْرَبَةٌ (ا) مصدر میمی ہے۔ قرابت ہونا۔ (ب) اسم ہے۔ قرابت۔ رشتہ دار۔ ﴿ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ﴾ (90/البلد:15) ’’کسی رشتے دار یتیم کو۔‘‘

قُرْبَةٌ ج: قُرُبَاتٌ۔ اسم ذات ہے۔ قرب حاصل کرنے کا ذریعہ۔ نزدیک ہونے کا ذریعہ۔ ﴿ وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ اَلَآ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ ﴾ (9/التوبہ:99) ’’اور بعض اہل دیہات میں ایسے بھی ہیں جو اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ خرچ کرتے ہیں اس کو عنداللہ قرب حاصل ہونے کا ذریعہ اور رسولؐ کی دعا کا ذریعہ بناتے ہیں۔ یاد رکھو کہ ان کا یہ خرچ کرنا بیشک ان کے لیے موجب قربت ہے۔‘‘ (ترجمہ احسن البیان)

قُرْبَانٌ مصدر کے علاوہ اسم ذات بھی ہے لغوی معنی کے لحاظ سے قربان ہر وہ چیز ہے جس سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کیا جائے۔ خواہ یہ قرب کسی جانور کو اللہ کی راہ میں ذبح کر کے حاصل کیا جائے یا اس کی راہ میں صدقہ وخیرات کر کے یا اعمال صالح کے ذریعے سے، جیسے ایک حدیث مبارکہ میں آیا ہے کہ قرب الٰہی حاصل کرنے کے لیے فرائض کی ادائیگی سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں۔ (اربعین نوویؒ، حدیث نمبر 38)۔ اصطلاحی معنی کے لحاظ سے قربان اس ذبیحہ کو کہا جاتا ہے جو اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لیے ذبح کیا جائے اور اردو زبان میں یہی مفہوم عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں یہ لفظ اپنے لغوی اور اصطلاحی دونوں معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ﴿ اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيْنَآ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰى يَاْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهُ النَّارُ ﴾ (3/آل عمران:183) ’’بیشک اللہ نے ہم سے عہد لیا کہ ہم بات نہ مانیں گے کسی رسول کی یہاں تک کہ وہ آئے ہمارے پاس کسی ایسی قربانی کے ساتھ، کھاتی ہو جس کو آگ۔‘‘ ﴿ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا ﴾ (5/المائدۃ:27) ’’آدمؑ کے دونوں بیٹوں کا کھرا کھرا حال بھی اُنہیں سنا دو، اُن دونوں نے ایک نذرانہ پیش

کیا۔'' (ترجمہ احسن البیان) اس آیت کے تحت حضرت مولانا عبدالماجدؒ فرماتے ہیں: ''قُرْبَانًا: قربانی یہاں اصطلاحی معنیٰ میں یعنی ذبیحہ کے مرادف نہیں۔ بلکہ لفظی معنیٰ اور وسیع مفہوم میں ہے، نذر و نیاز کے مفہوم میں ہے۔'' قربان کا لفظ واحد اور جمع دونوں کے لیے آتا ہے اور اس کی جمع قَرَابِیْنُ بھی آتی ہے۔ قرآن مجید میں قربان کا لفظ مصدری معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے جس کی مثال پہلے آچکی ہے۔

(تفعیل) تَقْرِیْبًا کسی کو کسی کے نزدیک کرنا۔ پیش کرنا۔ ﴿فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِيْنٍ ۝ فَقَرَّبَهٗٓ اِلَيْهِمْ قَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ۝﴾ (51/الذّٰریٰت:26-27) ''تو وہ لایا ایک موٹا بچھڑا پھر اس نے قریب کیا اس کو، ان کے یعنی فرشتوں کے، کہا تم لوگ کھاتے کیوں نہیں۔''

مُقَرَّبٌ ج: مُقَرَّبُوْنَ۔ اسم المفعول ہے۔ قریب کیا ہوا۔ ﴿قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ۝﴾ (7/الاعراف:114) ''اس نے یعنی فرعون نے کہا ہاں اور یقیناً تم لوگ قریب کئے ہوئے لوگوں میں ہو گے۔''

(افتعال) اِقْتِرَابًا قریب ہونا۔ ﴿اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ﴾ (21/الانبیاء:1) ''قریب ہوا لوگوں کے لئے ان کا حساب۔''

اِقْتَرِبْ فعل امر ہے۔ تو قریب ہو جا۔ ﴿كَلَّا ۭ لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ۝﴾ (96/العلق:19) ''خبردار! اس کا کہنا ہرگز نہ ماننا اور سجدہ کر اور قریب ہو جا۔''

ش ج ر

(ن) شَجْرًا، شُجُوْرًا باہم مختلف ہونا۔ جھگڑنا۔

شَجَرٌ اسم ذات ہے۔ (1) تنے والا درخت (کیونکہ درخت کی شاخیں مختلف سمت میں پھیلتی ہیں شاید اسی لیے شجر کہلاتا ہے) (واللہ اعلم)۔ درخت کی جنس کے لیے شَجَرٌ۔ ایک درخت کے لیے شَجَرَةٌ جبکہ جمع اَشْجَارٌ ہے۔ ﴿اِۨالَّذِيْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا﴾ (36/یٰسٓ:80) ''جس نے بنایا تمہارے لیے سبز درخت سے آگ کو۔'' عربی زبان میں شجر کا لفظ صرف درخت کے لیے نہیں بولا جاتا بلکہ اس کے مفہوم میں پودے، جھاڑیاں، گھاس سب داخل ہیں۔ چنانچہ سورۃ النحل کی آیت 10 میں فرمایا ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّمِنْهُ شَجَرٌ فِيْهِ تُسِيْمُوْنَ ۝﴾ حضرت مولانا عبدالماجدؒ اس آیت کا ترجمہ کرتے ہیں: ''وہ اللہ وہی ہے جس نے تمہارے لیے آسمان سے پانی برسایا جس سے تمہیں پینے کو ملتا ہے اور اُسی سے سبزہ زار پیدا ہوتے ہیں جن میں تم مویشی چراتے ہو۔'' اور پیر کرم شاہ صاحبؒ ترجمہ کرتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے اتارا آسمان سے پانی تمہارے لیے اُس میں سے کچھ پینے کے کام آتا ہے اور اُس سے سبزہ اگتا ہے جس میں تم مویشی چراتے ہو۔'' اس آیت کے حاشیے میں حضرت مولانا عبدالماجدؒ فرماتے ہیں: ''شجر کے عموم میں پودے، درخت، جھاڑیاں، گھاس سب داخل ہیں۔ یہاں مراد چراگاہیں ہیں۔'' اور پیر کرم شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں: ''یہاں شجر سے مراد ہر وہ چیز ہے جو زمین سے اُگتی ہے۔ ابن قتیبہؒ نے کہا ہے کہ شجر سے مراد یہاں گھاس ہے۔'' اور مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں: ''لفظ شجر اکثر درخت کے لیے بولا جاتا ہے، جو ساق یعنی تنے پر کھڑا ہوتا ہے، اور کبھی مطلق زمین سے اُگنے والی ہر چیز کو بھی شجر کہتے ہیں، گھاس اور بیل وغیرہ بھی اس میں داخل ہوتی ہیں، اس آیت میں یہی معنی مراد ہیں، کیونکہ آگے جانوروں کے چرانے کا ذکر ہے اس کا تعلق زیادہ تر گھاس ہی سے ہے۔''

(2) اختلاف۔ جھگڑا۔ ﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ﴾ (4/النساء:65) ''(پس

نہیں! تیرے رب کی قسم، یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے یہاں تک کہ آپؐ کو حاکم تسلیم کر لیں اس میں جس میں جھگڑا ہے ان کے مابین۔''

اَلظّٰلِمِيْنَ (ظ ل م): البقرۃ آیت 17 دیکھیں۔

ترکیب

'وَ' استئنافیہ ہے۔ قُلْنَا فعل ماضی ہے اور اس کا فاعل اس میں شامل ضمیر نَحْنُ ہے جو اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ يَا۔ حرف ندا ہے اور اٰدَمُ۔ منادیٰ ہے۔ اُسْكُنْ فعل امر ہے اور اس کا فاعل اس میں شامل اَنْتَ کی ضمیر ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اُسْكُنْ کے اندر اَنْتَ کی ضمیر موجود ہے پھر ایک اور اَنْتَ کی ضمیر آگے کیوں آئی۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اُسْكُنْ کی ضمیر فاعلی کی تاکید کے لیے آئی اور اس کے بعد 'وَ' عطف کا ہے اور آگے زوج اسم ہے اور عطف کا قاعدہ یہ ہے کہ اسم کا اسم پر، فعل کا فعل پر اور جملے کا جملے پر عطف ہوتا ہے۔ اس لیے یہاں زَوْجُكَ کا عطف فعل اُسْكُنْ پر نہیں ہو سکتا اس لیے اُسْكُنْ کی ضمیر فاعلی کو الگ سے لکھا گیا۔ اس کی اور مثالیں بھی قرآن مجید میں دیکھی جا سکتی ہیں مثلاً المائدہ۔24، ابراہیم:8 وغیرہ۔ (اس قاعدے کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو عربی کا معلم حصہ چہارم، ص:163 ''المعطوف'')۔ اَلْجَنَّةَ۔ اُسْكُنْ کا مفعول ہونے کی وجہ سے نصب میں ہے۔ آگے 'وَ' پھر عطف کا ہے اور كُلَا فعل امر میں تثنیہ کا صیغہ ہے اور كُلَا اُسْكُنْ پر عطف ہے۔ مِنْهَا میں 'ھا' ضمیر اَلْجَنَّةَ کے لیے ہے۔ رَغَدًا۔ صفت ہے محذوف مفعول مطلق کی یعنی وَ كُلَا مِنْهَا اَكْلًا رَغَدًا۔ حَيْثُ۔ ظرف مکان ہے اور شِئْتُمَا۔ ماضی میں تثنیہ کا صیغہ ہے۔ آگے پھر 'وَ' عطف کا ہے اور لَا تَقْرَبَا۔ فعل نہی ہے اور اس کا عطف ''كُلَا'' پر ہے۔ هٰذِهِ الشَّجَرَةَ مرکب اشاری اور لَا تَقْرَبَا کا مفعول ہونے کی وجہ سے حالت نصب میں ہے۔ فَتَكُوْنَا میں 'فَ' سببیہ ہے اسی لیے تَكُوْنَا منصوب ہے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو عربی کا معلم حصہ چہارم، ص: 75)۔ تَكُوْنَا کا اسم اس میں شامل ضمیر اَنْتُمَا ہے۔ خبر محذوف ہے اور مِنَ الظّٰلِمِيْنَ۔ متعلق خبر ہے۔ علامہ عثمانیؒ فرماتے ہیں: ''میرے نزدیک فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ کا ترجمہ اگر یوں کیا جاتا تو زیادہ موزوں ہوتا ''پھر ہو جاؤ گے تم نقصان اٹھانے والوں میں سے''۔ ظلم کے معنی نقصان، کمی و کوتاہی کے آتے ہیں۔ جیسا کہ وَ لَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْـًٔا (کہف) میں۔ (تفسیر عثمانیؒ، الاعراف۔19 کے تحت)۔

ترجمہ
البقرۃ:35

وَقُلْنَا	يٰٓاٰدَمُ	اسْكُنْ	اَنْتَ وَ زَوْجُكَ	الْجَنَّةَ
اور ہم نے کہا	اے آدمؑ	تم رہو	تم بھی اور تمہاری بیوی بھی	اس جنت میں

وَ كُلَا	مِنْهَا	رَغَدًا	حَيْثُ شِئْتُمَا
اور تم دونوں کھاؤ	اس میں سے	جی بھر کے	جہاں سے تم دونوں چاہو

وَلَا تَقْرَبَا	هٰذِهِ الشَّجَرَةَ	فَتَكُوْنَا
اور تم دونوں نزدیک مت جانا	اس درخت کے	ورنہ تم دونوں ہو جاؤ گے

مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۳۵
نقصان اٹھانے والوں میں سے

نوٹ:1 سورہ آل عمران کی آیت نمبر۔7 میں بتایا گیا ہے کہ قرآن مجید میں محکمات بھی ہیں اور متشابہات بھی ہیں۔ اور وہی لوگ متشابہات کے پیچھے پڑتے ہیں جن کے دلوں میں کجی ہوتی ہے۔ آیت زیر مطالعہ میں محکم اور متشابہ، دونوں پہلو شامل ہیں۔ محکم بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک حکم دیا تھا جس کی

پابندی نہیں کی گئی۔ متشابہ بات یہ ہے کہ وہ درخت کس چیز کا تھا۔

قرآن مجید سے راہنمائی حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ طالبعلم اپنی توجہ کو اس بات پر مرتکز کرے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی کرنے کا کیا نتیجہ نکلا اور اس سے ہمیں کیا سبق ملتا ہے۔ اگر طالبعلم اس جستجو میں لگے گا کہ وہ درخت کس چیز کا تھا تو اس کا حاصل کچھ نہیں ہے۔ البتہ اصل سبق سے اس کی توجہ ہٹ جائے گی اور وہ ہدایت سے محروم رہے گا۔ (از لطف الرحمٰن خان صاحب)

آیت: 36

﴿فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۠ وَ قُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴾

ز ل ل

(ض) زَلَّةً، زَلًّا: بلا ارادہ پھسل جانا۔ لغزش ہوجانا۔ بلا ارادہ گناہ ہو جانا۔ ﴿فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ﴾ (2/البقرہ:209) ''پھر اگر لغزش ہوجائے تم لوگوں سے اس کے بعد جو آئیں تمہارے پاس روشن دلیلیں۔'' ﴿وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اَيْمَانَكُمْ دَخَلًاۢ بَيْنَكُمْ فَتَزِلَّ قَدَمٌۢ بَعْدَ ثُبُوْتِهَا﴾ (16/النحل:94) ''اور نہ بناؤ اپنی قسموں کو آپس میں فریب دینے کا ذریعہ ورنہ (جادۂ حق سے) پھسل جائے گا (لوگوں کا) قدم (اس پر) جم جانے کے بعد۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)

(افعال) اِزْلَالًا: کسی کو پھسلا دینا۔ آیت زیر مطالعہ۔

(استفعال) اِسْتِزْلَالًا: کسی کو پھسلانے کا ارادہ کرنا۔ کوشش کرنا۔ ﴿اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ۚ﴾ (3/آل عمران:155) ''بیشک بہکا دیا ان کو شیطان نے بسبب بعض چیزوں کے جو انہوں نے کمائیں۔''

اَلشَّيْطٰنُ (ش ط ن، ش ی ط): اعوذ باللہ دیکھیں۔ اَخْرَجَ (خ ر ج): البقرۃ آیت 22 دیکھیں۔
قُلْنَا (ق و ل): البقرۃ آیت 8 دیکھیں۔

ھ ب ط

(ض) هُبُوْطًا، هَبْطًا: هُبُوْطٌ اور هَبْطٌ کئی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں مثلاً بلندی سے نیچے اترنا جیسے آیت زیر مطالعہ میں فرمایا: ﴿اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ﴾۔ گر پڑنا جیسے فرمایا: ﴿وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ۭ﴾ (2/البقرہ:74) ''اور یقیناً ان پتھروں میں وہ بھی ہیں جو گر پڑتے ہیں اللہ کے ڈر سے۔'' مسافر کا سواری سے کسی منزل پر اترنا جیسے فرمایا: ﴿قِيْلَ يٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَ بَرَكٰتٍ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ ۭ﴾ (11/ھود:48) ''ارشاد ہوا اے نوحؑ (کشتی سے) اتریئے امن وسلامتی کے ساتھ ہماری طرف سے اور برکتوں کے ساتھ جو آپؑ پر ہیں اور اُن قوموں پر جو آپ کے ہمراہ ہیں۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔ کسی شہر میں داخل ہونا جیسے فرمایا: ﴿اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ۭ﴾ (2/البقرۃ:61) ''اچھا شہر میں جاؤ وہاں تمہاری چاہت کی سب چیزیں ملیں گی۔'' (ترجمہ احسن البیان)۔ اس آیت میں اِهْبِطُوْا کی وضاحت کرتے ہوئے صاحبؒ تدبر قرآن فرماتے ہیں: ''هَبَطَ کے اصلی معنی گرنے کے ہیں اور استعمال میں یہ کسی مسافر کے کسی منزل میں اترنے کے لیے بھی آتا ہے مثلاً کہیں گے هَبَطْنَا الْوَادِيَ (ہم وادی میں داخل ہوئے) یہیں

سے اِھْبِطُوْا مِصْرًا کا محاورہ رائج ہوا اور ھُبُوْط کا لفظ نزول کے مرادف کی حیثیت سے استعمال ہونے لگا۔ اس استعمال کی وجہ غالباً یہ ہوئی ہوگی کہ مسافر جب کسی مقام پر قیام کا ارادہ کرتا ہے تو وہاں وہ اپنے مرکب سے اترتا ہے۔'' (تدبر قرآن، ج۱،ص ۲۲۵)۔ کسی چیز کو کم کر دینا، گھٹا دینا۔ عربی میں کہتے ہیں ھَبَطَ الْمَرَضُ لَحْمَ الْعَلِيْلِ بیماری نے اس کے گوشت کو کم کر دیا اور اَلْھَبِيْطُ کمزور اور لاغر اونٹ کو کہتے ہیں۔ یہ فعل لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔

ھُبُوْط یا ھَبَط کا لفظ جب انسان یا جن کے لیے بولا جائے تو اس میں حقارت کا پہلو بھی پایا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ ۝۱۳﴾ (7/الاعراف:13) ''حق تعالیٰ نے فرمایا تو آسمان سے اتر تجھ کو کوئی حق حاصل نہیں کہ تو آسمان میں رہ کر تکبر کرے سو نکل، بے شک تو ذلیلوں میں سے ہے۔'' (ترجمہ احسن البیان)۔

اِھْبِطْ: تثنیہ: اِھْبِطَا۔ ج: اِھْبِطُوْا۔ فعل امر ہے۔ تو اُتر۔ اِھْبِطْ کے لیے اوپر الاعراف۔13 دیکھیں۔ ﴿قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ﴾ (20/طٰہٰ:123) ''اللہ تعالیٰ نے فرمایا تم دونوں جہاں سے اتر جاؤ سب کے سب تم میں سے بعض، بعض کے دشمن ہیں۔'' اور اِھْبِطُوْا آیت زیر مطالعہ میں آیا ہے۔

بَعْضٌ (ب ع ض): البقرۃ آیت 26 دیکھیں۔

ع د و

(ن) **عَدْوًا**: حد سے تجاوز کرنا۔ ظلم و زیادتی کرنا۔ دشمنی کرنا۔ اگر اس کا تعلق چلنے سے ہو تو مطلب ہوتا ہے دوڑنا کیونکہ دوڑنا، چلنے سے تجاوز ہی ہے۔ ﴿اِذْ يَعْدُوْنَ فِي السَّبْتِ﴾ (7/الاعراف:163) ''جب انہوں نے حد سے تجاوز کیا ہفتہ کے دن میں۔'' ﴿فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُوْدُهٗ بَغْيًا وَّعَدْوًا ۭ﴾ (10/یونس:90) ''تو ان کا پیچھا کیا فرعون نے اور اس کے لشکروں نے سرکشی اور ظلم کرتے ہوئے۔'' ﴿فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًاۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۭ﴾ (6/الانعام:108) ''تو وہ برا کہیں گے اللہ کو زیادتی کرتے ہوئے کسی علم کے بغیر۔''

لَا تَعْدُ: فعل نہی ہے۔ تو حد سے مت بڑھ۔ ﴿وَّقُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوْا فِي السَّبْتِ﴾ (4/النساء:154) ''اور ہم نے کہا ان سے تم لوگ حد سے مت بڑھو ہفتہ کے دن میں۔''

عَادٍ: ج: عَادُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ حد سے بڑھنے والا۔ ﴿فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۭ﴾ (2/البقرہ:173) ''پس جو مجبور ہوا، نہ سرکشی کرنے والا نہ حد سے بڑھنے والا، تو کوئی گناہ نہیں اس پر۔'' ﴿فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَاۗءَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۚ﴾ (23/المومنون:7) ''پس جو چاہے اس سے آگے تو وہ لوگ ہی حد سے تجاوز کرنے والے ہیں۔''

عَادِيَةٌ: ج: عَادِيَاتٌ۔ اسم الفاعل ہے۔ بڑی تیزی سے دوڑنے والی۔ قرآن مجید میں اس کی جمع گھوڑوں کی صفت کے طور پر استعمال ہوئی ہے۔ مثلاً: ﴿وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا ۝۱ۙ﴾ (100/العادیات:1) ''قسم ہے تیز دوڑنے والے گھوڑوں کی جب وہ سینہ سے آواز نکالتے ہیں۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)

عَدُوٌّ: اسم صفت ہے۔ دشمن۔ واحد، جمع، مذکر، مؤنث سب کے لیے استعمال ہوتا ہے اور اس کی جمع اَعْدَاءٌ بھی آتی ہے۔ ﴿وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝۱۶۸﴾ (2/البقرہ:168) ''اور تم لوگ پیروی مت کرو شیطان کے نقش قدم کی بیشک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔'' ﴿مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰىلَ فَاِنَّ اللّٰهَ

عَدُوٌّ لِّلۡكٰفِرِيۡنَ ﴿٩٨﴾ (2/البقرۃ:98) ''جو شخص اللہ کا اور اُس کے فرشتوں کا اور اُس کے رسولوں کا اور جبریلؑ اور میکائیلؑ کا دشمن ہو تو بے شک اللہ تعالیٰ بھی ایسے کافروں کا دشمن ہے۔'' ﴿وَيَوۡمَ يُحۡشَرُ اَعۡدَآءُ اللّٰهِ اِلَى النَّارِ﴾ (41/حٰم السجدہ:19) ''اور جس دن ہانکے جائیں گے اللہ کے دشمن آگ کی طرف۔'' واضح رہے کہ یہ لفظ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے لیے بھی استعمال ہوا ہے (جیسے اوپر البقرۃ۔98) اور بندے کے لیے بھی۔ بندے کی دشمنی اللہ سے یہ ہے کہ اللہ کے احکامات کی نافرمانی کرے اور اس کے رسولوں، فرشتوں اور اولیاء اللہ سے دشمنی رکھے اور اللہ کی دشمنی کا مطلب یہ ہے کہ اللہ ایسے شخص کو اس کے گناہ پر سزا دے گا اور اس کی مغفرت نہیں کرے گا۔ عَدُوٌّ کی قسمیں بھی دو ہیں۔ ایک دشمنی وہ ہے جو کوئی قصد اور ارادہ کے ساتھ کسی سے رکھے جیسے فرمایا ﴿وَ كَذٰلِكَ جَعَلۡنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيۡنَ الۡاِنۡسِ وَ الۡجِنِّ﴾ (الانعام:112) یا فرمایا ﴿اِنَّ الشَّيۡطٰنَ كَانَ لِلۡاِنۡسَانِ عَدُوًّا مُّبِيۡنًا ﴿٥٣﴾﴾ (بنی اسرائیل:53) اور دوسری دشمنی وہ ہے کہ جس میں قصد و ارادہ کا دخل تو نہ ہو لیکن اس دشمنی کی حالت ایسی ہو کہ جس کی وجہ سے کسی شخص کو ویسی ہی تکلیف پہنچے جیسی کہ دشمنوں سے پہنچتی ہے مثلاً فرمایا: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنَّ مِنۡ اَزۡوَاجِكُمۡ وَ اَوۡلَادِكُمۡ عَدُوًّا لَّكُمۡ فَاحۡذَرُوۡهُمۡ ۚ﴾ (التغابن:14) بعض بیویوں اور اولاد کو جو دشمن قرار دیا گیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض دفعہ آدمی بیوی بچوں کی محبت اور فکر میں پھنس کر اللہ اور اس کے احکامات کو بھلا دیتا ہے جس کا آخری انجام نقصان اور خسارے کے سوا کچھ نہیں۔ چنانچہ جو اہل و عیال اتنے بڑے نقصان کا سبب بنیں وہ حقیقتاً دوست نہیں بلکہ دشمن ہیں۔ (واللہ اعلم)۔

عَدَاوَةٌ اسم ذات ہے۔ دشمنی۔ اس کا تعلق دل کی کیفیت سے ہے۔ یعنی باہمی ہم آہنگی نہ ہونا۔ ﴿وَ اَلۡقَيۡنَا بَيۡنَهُمُ الۡعَدَاوَةَ وَ الۡبَغۡضَآءَ اِلٰى يَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ ؕ﴾ (5/المائدہ:64) ''اور ہم نے ڈال دی ان کے مابین دشمنی اور بغض قیامت کے دن تک کے لیے۔''

عُدۡوَانٌ اسم ذات ہے۔ زیادتی۔ ظلم۔ عُدۡوَانٌ وہ ظلم ہے جو عدل نہ کرنے سے ہوتا ہے۔ ﴿وَ لَا تَعَاوَنُوۡا عَلَى الۡاِثۡمِ وَ الۡعُدۡوَانِ ۪﴾ (5/المائدہ:2) ''اور تم لوگ تعاون مت کرو گناہ اور زیادتی پر۔''

عُدۡوَةٌ اسم ذات ہے۔ کسی چیز کی حد۔ کنارہ۔ ﴿اِذۡ اَنۡتُمۡ بِالۡعُدۡوَةِ الدُّنۡيَا﴾ (8/الانفال:42) ''جب تم لوگ تھے نزدیکی کنارے پر۔''

(مفاعلہ) **مُعَادَاةٌ اور عِدَاءً** باہم جھگڑا کرنا۔ کسی سے دشمنی رکھنا۔ ﴿عَسَى اللّٰهُ اَنۡ يَّجۡعَلَ بَيۡنَكُمۡ وَ بَيۡنَ الَّذِيۡنَ عَادَيۡتُمۡ مِّنۡهُمۡ مَّوَدَّةً ؕ﴾ (60/الممتحنۃ:7) ''قریب ہے کہ اللہ پیدا کر دے تمہارے مابین اور ان کے مابین جن سے تمہارا جھگڑا ہے، ان میں سے کچھ کے، محبت۔''

(تفعّل) **تَعَدٍّ** کوشش کر کے تجاوز کرنا۔ جانتے بوجھتے تجاوز کرنا۔

يَتَعَدَّ مضارع مجزوم ہے۔ ﴿وَ مَنۡ يَّعۡصِ اللّٰهَ وَ رَسُوۡلَهٗ وَ يَتَعَدَّ حُدُوۡدَهٗ يُدۡخِلۡهُ نَارًا﴾ (4/النساء:14) ''اور جس نے نافرمانی کی اللہ اور اس کے رسول کی اور تجاوز کیا اس کی حدود سے تو وہ داخل کرے گا اس کو آگ میں۔''

(افتعال) **اِعۡتِدَاءً** اہتمام سے تجاوز کرنا۔ زیادتی کرنا۔ ﴿وَ لَقَدۡ عَلِمۡتُمُ الَّذِيۡنَ اعۡتَدَوۡا مِنۡكُمۡ فِى السَّبۡتِ﴾ (2/البقرہ:65) ''اور تم لوگ جان چکے ہو ان لوگوں کو جنھوں نے تجاوز کیا تم میں سے ہفتہ کے دن میں۔'' ﴿فَمَنِ اعۡتَدٰى بَعۡدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ﴿١٧٨﴾﴾ (2/البقرہ:178) ''پس جو زیادتی کرے اس کے بعد تو اس کے لیے دردناک عذاب ہے۔''

اِعۡتَدِ ج: اِعۡتَدُوۡا۔ فعل امر ہے۔ تو زیادتی کر۔ ﴿فَمَنِ اعۡتَدٰى عَلَيۡكُمۡ فَاعۡتَدُوۡا عَلَيۡهِ بِمِثۡلِ مَا اعۡتَدٰى عَلَيۡكُمۡ ۪﴾ (2/البقرہ:194) ''پس جس نے زیادتی کی تم لوگوں پر تو تم لوگ زیادتی کرو اس پر، اس کی مانند جو اس نے زیادتی کی تم پر۔''

مُعْتَدٍ — ج: مُعْتَدُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ حد سے بڑھنے والا۔ زیادتی کرنے والا۔﴿ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ مُّرِيْبٍ ﴾ (50/قٓ:25)''جو نیک کام سے روکنے والا، حد سے گزرنے والا اور شک کرنے والا تھا۔''﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴾(2/البقرہ:190)''بیشک اللہ پسند نہیں کرتا زیادتی کرنے والوں کو۔''

اَلْاَرْضُ(ء ر ض): البقرۃ آیت 11 دیکھیں۔

ق ر ر

(ض۔س)(ا) قَرًّا اور قُرُوْرًا — کسی چیز کا ٹھنڈا ہو کر جم جانا۔ ٹھنڈا ہونا۔ ٹھنڈا رکھنا (لازم و متعدی) ﴿ فَرَجَعْنٰكَ اِلٰٓى اُمِّكَ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا ﴾ (20/طٰہٰ:40)''تو ہم نے لوٹایا آپؑ کو (یعنی موسیٰؑ کو) آپؑ کی والدہ کی طرف تاکہ ٹھنڈی ہو اس کی آنکھ۔''

(ب) قَرَارًا — ٹھہرنا۔﴿ وَ جَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَ اُمَّهٗٓ اٰيَةً وَّ اٰوَيْنٰهُمَآ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّ مَعِيْنٍ ﴾(23/مومنون:50) ''اور ہم نے ابن مریمؑ اور اُن کی والدہ کو ایک بڑا نشان بنایا اور ہم نے اُن دونوں کو بلند زمین پر پناہ دی جو ٹھہرنے کے قابل اور شاداب تھی۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)

قَرِّ — فعل امر ہے۔ تو ٹھنڈا رہ۔ ٹھنڈا رکھ۔ تو ٹھہر۔﴿ فَكُلِيْ وَ اشْرَبِيْ وَ قَرِّيْ عَيْنًا ﴾(19/مریم:26)''پس تو کھا اور تو پی اور تو ٹھنڈی رکھ آنکھ۔'' (قَرِّيْ، واحد مؤنث حاضر کا صیغہ ہے)۔﴿ وَ قَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ ﴾ (33/الاحزاب:33)''اور تم ٹھہری رہو اپنے گھروں میں۔'' (قَرْنَ، جمع مؤنث حاضر کا صیغہ ہے)۔

قَرَارٌ — (1) اسم ذات بھی ہے۔ مطلب ہے ٹھہراؤ۔﴿ وَ مَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِ اِجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ ﴾(14/ابراہیم:26)''اور مثال گندی بات کی جیسے درخت گندہ اُکھاڑ لیا اُس کو زمین کے اُوپر سے کچھ نہیں اُس کو ٹھہراؤ۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)

(2) اسم ظرف ہے۔ مطلب ہے ٹھہرنے کی جگہ۔ ٹھکانہ۔ مقام۔﴿ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ﴾ (23/المومنین:13)''پھر ہم نے اُسے نطفہ بنایا ایک محفوظ مقام میں۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔﴿ جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا وَ بِئْسَ الْقَرَارُ ﴾(14/ابراہیم:29)''جہنم جس میں وہ داخل ہوں گے اور وہ کیسا برا ٹھکانا ہے۔''

قُرَّةٌ — اسم ذات ہے۔ ٹھنڈک۔﴿ وَ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَ ذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ ﴾ (25/الفرقان:74)''اور یہ وہ لوگ ہیں جو دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو ہماری بیویوں اور ہماری اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔﴿ وَ قَالَتِ امْرَاَتُ فِرْعَوْنَ قُرَّتُ عَيْنٍ لِّيْ وَ لَكَ ﴾ (28/القصص:9)''اور فرعون کی بیوی نے کہا یہ تو میری اور تیری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔'' یہاں اس آیت مبارکہ میں قُرَّةٌ کو لمبی 'ت' کے ساتھ لکھا گیا ہے (واللہ اعلم)۔

قَارُوْرَةٌ — ج: قَوَارِيْرُ۔ شیشہ۔﴿ قَوَارِيْرَاْ مِنْ فِضَّةٍ ﴾(76/الدھر:16)''چاندی کے شیشے۔'' چاندی کے قواریر ہونے کا یہ مطلب ہے کہ چاندی کی طرح سفیدی اور شیشے کی طرح صفائی ان برتنوں میں ہوگی۔

(افعال) اِقْرَارًا — (1) کسی کو ٹھہرانا۔ (2) کسی بات کا اقرار کرنا۔﴿ وَ نُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ ﴾(22/الحج:5)''اور ہم ٹھہراتے ہیں رحموں میں جو ہم چاہتے ہیں۔''﴿ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوْا ﴾(3/آل عمران:81)''ان لوگوں نے کہا ہم نے اقرار کیا، اس نے کہا تو تم لوگ گواہ رہو۔''

(استفعال) اِسْتِقْرَارًا — ٹھہرے رہنا۔ قرار پکڑنا۔﴿ وَ لٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِيْ ﴾(7/الاعراف:143)

''لیکن تو دیکھ پہاڑ کی طرف پس اگر وہ ٹھہرا رہا اپنی جگہ پر تب تو دیکھے گا مجھ کو۔''

مُسْتَقِرٌّ اسم الفاعل ہے۔قرار پکڑنے والا۔ٹھہرنے والا۔﴿ وَ لَقَدْ صَبَّحَهُمْ بُكْرَةً عَذَابٌ مُّسْتَقِرٌّ ﴾(54/القمر:38)''اور ان پر صبح تڑکے آچکا ہے ٹھہرنے والا عذاب۔''

مُسْتَقَرٌّ اسم المفعول ہے جو ظرف کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ٹھہرنے کی جگہ۔ٹھکانہ۔مقررہ وقت۔﴿ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَىٕذِ الْمُسْتَقَرُّ ﴾(75/القیامہ:12)''تیرے رب کی طرف اس دن ٹھہرنے کی جگہ ہے۔''﴿ لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ وَّ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴾(6/الانعام:67)''ہر خبر کے وقوع کا ایک وقت معین ہے اور تمہیں معلوم ہی ہو کر رہے گا۔''(ترجمہ ماجدیؒ)۔اس آیت میں مُّسْتَقَرٌّ کی وضاحت کرتے ہوئے حضرت مولانا عبدالماجد دریا بادیؒ فرماتے ہیں:''مُّسْتَقَرٌّ کے لفظی معنی تو ہیں جائے وقوع واستقرار کے لیکن یہاں مراد وقت وقوع واستقرار ہے،بعض نے دونوں معنیٰ جائز رکھے ہیں۔''

م ت ع

(ف) **مُتُوْعًا** کسی چیز کا بڑھنا۔بلند ہونا۔

مَتَاعٌ ج: اَمْتِعَةٌ۔سامانِ زندگی میں سے ہر وہ چیز مَتَاعٌ کہلاتی ہے جس سے انسان یا کوئی جاندار اپنے زندہ رہنے کے لیے فائدہ اٹھائے۔ہر وہ چیز جس سے فائدہ اٹھایا جائے اور پھر وہ فنا ہو جائے۔عارضی سامان۔﴿ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ﴾(4/النساء:77)''آپ کہہ دیجیے کہ دنیا کا سامان تھوڑا ہے۔''﴿ وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَ اَمْتِعَتِكُمْ ﴾(4/النساء:102)''چاہتے ہیں وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا کہ اگر تم لوگ غافل ہو اپنے ہتھیاروں سے اور اپنے سامان سے۔''

(تفعیل) **تَمْتِيْعًا** لمبا کرنا یا بلند کرنا۔کسی دوسرے کو ایسا سامانِ دنیا دینا جس سے وہ فائدہ اٹھا سکے۔فائدہ پہنچانا۔﴿ وَ لٰكِنْ مَّتَّعْتَهُمْ وَ اٰبَآءَهُمْ حَتّٰى نَسُوا الذِّكْرَ ﴾(25/الفرقان:18)''اور لیکن تو نے عرصہ دراز تک فائدہ اٹھانے دیا ان کو اور ان کے باپ دادا کو یہاں تک کہ وہ لوگ بھول گئے یاد دہانی کو۔''

مَتِّعْ ج: مَتِّعُوْا۔فعل امر ہے۔تو فائدہ اٹھانے دے۔تو برتنے کی چیز دے۔﴿ وَ مَتِّعُوْهُنَّ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَ عَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ﴾(2/البقرہ:236)''اور برتنے کا سامان دو ان عورتوں کو وسعت والے پر ہے اس کی قدرت کے مطابق اور تنگدست پر ہے اس کی قدرت کے مطابق۔''

(تفعّل) **تَمَتُّعًا** کوشش کر کے کسی چیز سے فائدہ اٹھانا۔﴿ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَ يَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ ﴾(47/محمد:12)''اور جن لوگوں نے کفر کیا وہ لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں اور کھاتے ہیں جیسے کھاتے ہیں چوپائے۔''(حج کے ایک ہی سفر میں پہلے عمرے کا احرام باندھ کر عمرہ کر لیا جائے پھر مکہ مکرمہ سے ہی حج کا احرام باندھ کر حج کیا جائے تو اسے (ڈبل فائدہ اٹھانے کی وجہ سے)''حج تمتع'' کہتے ہیں)۔

تَمَتَّعْ ج: تَمَتَّعُوْا۔فعل امر ہے۔تو فائدہ اٹھا۔﴿ فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ ﴾(11/ھود:65)''تو انہوںؑ نے کہا تم لوگ فائدہ اٹھا لو اپنے گھر میں تین دن۔''قرآن مجید میں جہاں کہیں تَمَتَّعْ اور تَمَتَّعُوْا (فعل امر) کے صیغے آئے ہیں تو اس سے دنیا سے فائدہ اٹھانے کو کہا گیا ہے اور بطور ڈانٹ کے کہا گیا ہے۔یعنی تمہیں ڈھیل دی جا رہی ہے برت لو جو برتنا ہے۔(لغات القرآن۔تلخیصاً)

(استفعال) **اِسْتِمْتَاعًا** کسی چیز سے فائدہ اٹھانا۔''کسی شخص یا مال سے کوئی فائدہ حاصل کیا جائے تو اس کو استمتاع کہتے ہیں عربی قواعد کی

رو سے کسی کلمہ کے مادے میں 'س' اور 'ت' کا اضافہ کر دینے سے طلب وحصول کے معنی پیدا ہو جاتے ہیں۔'' (معارف القرآن، ج ۲، ص: ۳۶۶) ﴿اَذۡهَبۡتُمۡ طَيِّبٰتِكُمۡ فِىۡ حَيَاتِكُمُ الدُّنۡيَا وَاسۡتَمۡتَعۡتُمۡ بِهَا ۚ﴾ (46/الاحقاف:20) ''تم لوگ لے گئے اپنی پاکیزہ چیزیں اپنی دنیاوی زندگی میں اور تم لوگوں نے فائدہ اٹھایا اس سے۔''

| ح ی ن |

(ض) حَيۡنًا کسی چیز کا وقت قریب آنا۔

حِيۡنٌ ظرف زمان ہے۔ وقت۔ حِيۡنٌ کہتے ہیں طویل اور لامحدود زمانے کا ایک محدود حصہ یعنی وہ خاص وقت جو اس طویل زمانے کے اندر کبھی پیش آیا ہو۔ اس طویل اور لامحدود زمانے کو قرآن میں الدّھر کہا گیا ہے۔ حِيۡنٌ ظرف مبہم ہے یعنی اس میں غیر معین وقت کا مفہوم ہے۔ اگر کسی معین وقت کا ذکر ہو تو اس کے بعد مضاف الیہ یا کوئی فعل لاتے ہیں۔ ﴿وَمَتَّعۡنٰهُمۡ اِلٰى حِيۡنٍ ۞﴾ (10/یونس:98) ''اور ہم نے برتنے دیا ان کو ایک وقت تک یعنی کچھ عرصہ تک۔'' (غیر معین) ﴿وَالصّٰبِرِيۡنَ فِى الۡبَاۡسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيۡنَ الۡبَاۡسِ ؕ﴾ (2/البقرۃ:177) ''اور ڈٹے رہنے والے سختی میں اور تکلیف میں اور لڑائی کے وقت۔'' (معین وقت) ﴿وَسَوۡفَ يَعۡلَمُوۡنَ حِيۡنَ يَرَوۡنَ الۡعَذَابَ﴾ (25/الفرقان:42) ''اور وہ لوگ جلد ہی جان لیں گے جس وقت وہ لوگ دیکھیں گے عذاب کو۔'' (معین وقت)۔

حِيۡنَئِذٍ۔ حِيۡنٌ کے بعد اِذۡ کا اضافہ کر کے حِيۡنَئِذٍ بنا دیا جاتا ہے۔ اور یہ کسی معین وقت کی طرف اشارہ کے لیے آتا ہے۔ بمعنی ''اس وقت۔'' ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَاَنۡتُمۡ حِيۡنَئِذٍ تَنۡظُرُوۡنَ ۞﴾ (56/الواقعۃ:84) ''اور تم اس وقت (مرنے والے کی حالت کو) دیکھ رہے ہوتے ہو۔''

ترکیب اَزَلَّ فعل۔ هُمَا اس کا مفعول اور اَلشَّيۡطٰنُ اس کا فاعل ہے۔ هُمَا کی ضمیر مفعولی، حضرت آدمؑ اور بی بی حوّا کے لیے ہے۔ عَنۡهَا متعلق فعل ہے۔ عَنۡ یہاں پر سببیہ ہے اور 'ھا' ضمیر گزشتہ آیت میں لفظ اَلشَّجَرَةَ کے لیے ہے۔ مطلب ہے ''اس درخت کے باعث'' یا ''اس درخت کی وجہ سے'' شیطان نے حضرت آدمؑ اور حوّا کو پھسلا دیا۔ آگے اَخۡرَجَ کا فاعل اس میں شامل هُوَ کی ضمیر ہے جو اَلشَّيۡطٰنُ کے لیے ہے اور هُمَا اس کا مفعول ہے۔ مِمَّا۔ مِنۡ اور مَا کا مرکب ہے۔ كَانَا بھی تثنیہ کا صیغہ ہے اور مراد حضرت آدمؑ اور حوّا ہیں۔ فِيۡهِ متعلق فعل ہے۔ فِيۡهِ میں 'ہ' ضمیر، اَلۡجَنَّةَ کے لیے نہیں ہے کیونکہ اس کے لیے مؤنث ضمیر 'ھا' آتی۔ چنانچہ اس سے 'عزت وراحت'' مراد لی گئی ہے۔ حضرت شیخ الہندؒ ترجمہ کرتے ہیں ''پھر نکالا ان کو اس عزت وراحت سے کہ جس میں تھے۔'' قُلۡنَا ماضی کا صیغہ ہے اور اس کا فاعل اس میں شامل ضمیر نَحۡنُ ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ اِهۡبِطُوۡا فعل امر ہے اور اس کا فاعل اس میں شامل ضمیر اَنۡتُمۡ ہے جو کہ حضرت آدمؑ، بی بی حوّا اور شیطان کے لیے ہے۔ گویا اِهۡبِطُوۡا کے حکم میں یہ سب شامل تھے۔ اگلہ جملہ بَعۡضُكُمۡ لِبَعۡضٍ عَدُوٌّ، اِهۡبِطُوۡا کی ضمیر فاعلی کا حال ہے یعنی ''تم سارے اتر جاؤ اس حال میں کہ تم میں سے بعض، بعض کے دشمن ہیں۔'' بَعۡضُكُمۡ مبتدا ہے، عَدُوٌّ خبر اور لِبَعۡضٍ متعلق خبر ہے۔ آگے مُسۡتَقَرٌّ اور مَتَاعٌ مبتدا موخر ہیں۔ لَكُمۡ فِى الۡاَرۡضِ قائم مقام خبر مقدم اور اِلٰى حِيۡنٍ متعلق خبر ہے۔ (واللہ اعلم)۔

ترجمہ البقرۃ:36

فَاَزَلَّهُمَا	الشَّيۡطٰنُ	عَنۡهَا	فَاَخۡرَجَهُمَا
پھر پھسلا دیا ان دونوں کو	شیطان نے	اس (درخت کی وجہ) سے	پھر اس نے نکالا ان دونوں کو

مِمَّا كَانَا فِيۡهِ ۖ	وَقُلۡنَا	اهۡبِطُوۡا	بَعۡضُكُمۡ
اس میں سے جس (عزت وراحت) میں وہ دونوں تھے	اور ہم نے کہا	تم لوگ اترو	(اس حال میں کہ) تم میں سے بعض

مُسْتَقَرٌّ	وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ	عَدُوٌّ	لِبَعْضٍ
ایک ٹھہرنے کی جگہ	اور تمہارے لیے زمین میں ہے	دشمن ہیں	بعض کے

اِلٰى حِيْنٍ ۝	وَّمَتَاعٌ
ایک عرصہ کے لیے	اور فائدہ اٹھانے کا کچھ سامان

نوٹ:1 ایک اہم بات یہ نوٹ کرلیں کہ فَاَزَلَّهُمَا میں ضمیر مفعولی هُمَا تثنیہ کے صیغے میں آئی ہے۔اس سے وضاحت ہوجاتی ہے کہ لغزش میں حضرت آدمؑ اور بی بی حوّا، دونوں شامل تھے۔اس لیے یہ عام خیال غلط ہے کہ بی بی حوّا نے حضرت آدمؑ کو جنت سے نکلوایا تھا۔اس کی مزید تصدیق آگے فَاَخْرَجَهُمَا کے الفاظ سے ہوتی ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو جنت سے نکلوانے کا ذمہ دار شیطان کو قرار دیا ہے۔اس کی ذمہ دار اگر بی بی حوّا ہوتیں تو اَخْرَجَ کے بجائے اَخْرَجَتْ کا صیغہ آتا اور ضمیر مفعولی واحد مذکر آتی۔(اَخْرَجَتْهُ)۔شیطان نے اُس درخت کی وجہ سے حضرت آدمؑ اور حضرت بی بی حوّا کو کیسے بہکایا اس کی تفصیل سورۂ طٰہٰ آیت 120 میں ہے۔

نوٹ:2 انبیاء علیہم السلام معصوم ہوتے ہیں البتہ ان سے نسیان (بھول)، اجتہادی غلطی وغیرہ کا صُدور ہوسکتا ہے جو کہ عصمت کے خلاف نہیں۔حضرت آدمؑ سے شجرہ ممنوعہ کھالینے میں نسیان ہی ہوا تھا جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:﴿ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ۝ ﴾(طٰہٰ:115)''سو وہ بھول گئے اور نہ پایا ہم نے (اس لغزش میں) ان کا کوئی قصد۔''

آیت:37

﴿ فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝ ﴾

تَلَقّٰٓى (ل ق ی): البقرۃ آیت 14 دیکھیں۔ اٰدَمُ (ء د م): البقرۃ آیت 31 دیکھیں۔ رَبِّ (ر ب ب): الفاتحہ آیت 1 دیکھیں۔

ك ل م

(ض۔ن) كَلْمًا زخم لگانا۔'ک ل م' ان مادوں میں سے ہے جن کا مفہوم ثلاثی مزید فیہ میں جاکر بالکل تبدیل ہوجاتا ہے۔

(تفعیل) تَكْلِيْمًا کسی سے بات چیت کرنا۔گفتگو کرنا۔﴿ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ ﴾(3/آل عمران:41)''اس نے یعنی اللہ نے کہا آپؑ کی نشانی ہے کہ آپؑ بات نہیں کریں گے لوگوں سے تین دن۔''﴿ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ۝ ﴾(4/النساء:164)''اور اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ سے اس طرح گفتگو کی جس طرح گفتگو کی جاتی ہے۔''

(تفعّل) تَكَلُّمًا بولنا۔کہنا۔﴿ لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ ﴾(78/النبا:38)''وہ لوگ نہیں بولیں گے مگر وہ جس کو اجازت دی اللہ نے۔''

كَلِمَةٌ ج: كَلِمَاتٌ اور كَلِمٌ۔اسم ذات ہے۔كَلِمَةٌ کا لغوی معنیٰ ''بامعنی بات'' ہے جس کا ادراک سماعت سے ہوسکے اور اس کا مفہوم بھی سمجھ میں آسکے۔اس کا اطلاق منظم و مرتب الفاظ اور اِن کے معانی دونوں کے مجموعہ پر ہوتا ہے جیسے كَلِمَةُ التَّوْحِيْدِ (لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ الرَّسُوْلُ اللّٰهِ)، كَلِمَةُ التَّقْوٰى (بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ) اور بامعنی کلام کے ہر جز پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے خواہ وہ اسم ہو، فعل ہو یا حرف ہو۔چنانچہ عربی زبان میں کسی بات، خطبہ، شعر اور پورے

قصیدے کے لیے اس کا استعمال جائز ہے اور قرآن مجید میں حضرت عیسیٰؑ کو بھی کَلِمَۃُ اللّٰہ کہا گیا ہے کیونکہ وہ کلمہ کُنْ سے پیدا ہوئے تھے۔کلمہ کی نسبت جب اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس کے معنیٰ عجائباتِ قدرت، قوانین فطرت اور اللہ تعالیٰ کے تخلیقی کارنامے مراد ہوتے ہیں۔(تفہیم القرآن) چنانچہ فرمایا: ﴿ قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا ﴾ (18/ الکہف:109) ''کہہ دو اگر سمندر میرے رب کی باتوں کے لکھنے کے لیے سیاہی ہو تو قبل اس کے کہ میرے رب کی باتیں تمام ہوں سمندر ختم ہو جائے اگرچہ ہم ویسا ہی اور اُس کی مدد کو لائیں۔'' جب کلمہ کی نسبت اللہ تعالیٰ سے انسان کی طرف ہو تو اس سے مراد احکام الٰہیہ اور فرامین الٰہیہ ہوتے ہیں۔﴿ اَفَمَنْ حَقَّ عَلَيْهِ كَلِمَةُ الْعَذَابِ ؕ اَفَاَنْتَ تُنْقِذُ مَنْ فِي النَّارِ ﴾ (39/ الزمر:19) ''بھلا جس شخص پر عذاب کی بات ثابت ہو چکی ہے تو کیا آپؐ اُسے جو دوزخ میں ہے چھڑا سکتے ہیں۔'' ﴿ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا ؕ ﴾ (23/ المومنون:100) ''یہ تو بس ایک بات ہے، وہ اس کا کہنے والا ہے۔ ﴿ وَيُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ﴾ (10/ یونس:82) ''اور سچ کرتا ہے اللہ حق کو اپنے فرمانوں سے اگرچہ ناپسند کریں مجرم لوگ۔''

﴿ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ﴾ (5/ المائدہ:13) ''وہ لوگ پھیرتے ہیں الفاظ کو ان کے اصل مقام سے۔''

كَلَامٌ اسم ذات ہے۔منظم، مرتب اور مکمل بات۔کلام۔بعض بزرگوں کا قول ہے کہ کلام ہر ایسی مفید بات کو کہتے ہیں جو مخاطب کی سمجھ میں آنے والی ہو۔اور بعض بزرگوں کا قول ہے کہ کلام ایسی صفت ہے جس سے کوئی زندہ اپنے مافی الضمیر (جو کچھ اُس کے دل میں ہے) کو زبانی الفاظ، تحریر یا اشارات کے ذریعے دوسرے کو سمجھا سکے۔﴿ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّبَدِّلُوْا كَلٰمَ اللّٰهِ ؕ ﴾ (48/ الفتح:15) ''وہ لوگ چاہتے ہیں کہ تبدیل کر دیں اللہ کے کلام کو۔''

ت و ب

(ن) تَوْبًا، تَوْبَةً اور مَتَابًا رجوع کرنا۔پلٹنا۔واپس ہونا۔(۱) گناہ کے بعد بندے کا اپنی غلطی پر شرمندہ ہو کر اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی طرف پلٹنا۔توبہ کرنا۔(۲) اللہ کا پلٹنا بندے پر اپنی شفقت اور رحمت کے ساتھ۔توبہ قبول کرنا۔توبہ کرنے کے مفہوم میں فعل کے ساتھ کبھی اِلٰی کا صلہ آتا ہے اور کبھی صلہ کے بغیر آتا ہے۔اس وقت دراصل اِلَى اللّٰهِ کے الفاظ محذوف ہوتے ہیں۔جبکہ توبہ قبول کرنے کے مفہوم میں فعل کے ساتھ عَلٰی کا صلہ آتا ہے۔﴿ اَفَلَا يَتُوْبُوْنَ اِلَى اللّٰهِ وَيَسْتَغْفِرُوْنَهٗ ؕ ﴾ (5/ المآئدہ:74) ''تو وہ لوگ کیوں نہیں پلٹتے اللہ کی طرف یعنی کیوں توبہ نہیں کرتے اور مغفرت طلب کرتے اس سے۔''

﴿ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ﴾ (6/ الانعام:54) ''بیشک وہ جس نے عمل کیا تم میں سے کسی برائی کا پھر وہ پلٹا یعنی اس نے توبہ کی اس کے بعد۔'' ﴿ لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ ؕ ﴾ (33/ الاحزاب:24) ''تاکہ اللہ جزا دے سچوں کو ان کی سچائی کے سبب سے اور تاکہ وہ عذاب دے منافقوں کو اگر وہ چاہے، یا وہ ان کی توبہ قبول کرے۔'' ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ؕ ﴾ (66/ التحریم:8) ''اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کے سامنے سچی خالص توبہ کرو۔'' ﴿ وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا ﴾ (25/ الفرقان:71) ''اور جس نے توبہ کی اور نیک کام کیے تو اُس نے رجوع کیا اللہ تعالیٰ کی طرف جیسے رجوع کا حق ہے۔''

تُبْ ج: تُوْبُوْا۔فعل امر ہے۔تو توبہ کر یا توبہ قبول کر۔﴿ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ﴾ (2/ البقرہ:128) ''اور تو سمجھا دے ہم کو ہمارے عبادت کے طریقے اور تو ہماری توبہ قبول فرما۔'' ﴿ وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ﴾

(11/ھود:52) ''اور اے میری قوم تم لوگ مغفرت طلب کرو اپنے رب کی پھر تم لوگ توبہ کرو۔''

تَآئِبٌ ج: تَآئِبُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ واحد مذکر کا صیغہ۔ توبہ کرنے والا یا توبہ قبول کرنے والا۔ ﴿ اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ ﴾ (9/التوبۃ:112) ''توبہ کرنے والے، عبادت کرنے والے، حمد کرنے والے۔'' قرآن مجید میں تائب کا لفظ اللہ تعالیٰ کے لیے استعمال نہیں ہوا۔

تَآئِبَۃٌ ج: تَآئِبَاتٌ۔ اسم الفاعل ہے۔ واحد مؤنث کا صیغہ۔ توبہ کرنے والی۔ ﴿ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ ﴾ (66/التحریم:5) ''جو اسلام والیاں، ایمان والیاں، اللہ کے حضور جھکنے والیاں، توبہ کرنے والیاں۔''

تَوَّابٌ ج: تَوَّابُوْنَ۔ فَعَّالٌ کے وزن پر مبالغہ ہے۔ بہت زیادہ اور بار بار توبہ کرنے والا یا توبہ قبول کرنے والا۔ ﴿ وَ اَنَّ اللّٰہَ ھُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ﴾ (9/التوبۃ:104) ''اور یہ کہ اللہ ہی بار بار توبہ قبول کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔'' ﴿ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ ﴾ (2/البقرۃ:222) ''یقیناً اللہ پسند کرتا ہے بار بار توبہ کرنے والوں کو۔'' تَوَّابٌ کا لفظ اللہ تعالیٰ اور بندے دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں: ''لفظ تَوَّابٌ بندہ کے لیے بھی بولا جاتا ہے جیسے ﴿ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ ﴾ (2/البقرۃ:222) ''اور اللہ تعالیٰ کے لیے بھی جیسے اس آیت میں ﴿ اِنَّہٗ ھُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ﴾ (2/البقرۃ:37) ''جب بندے کے لیے استعمال ہوتا ہے تو معنی ہوتے ہیں گناہ سے اطاعت کی طرف رجوع کرنے والا، اور جب اللہ تعالیٰ کے لیے استعمال ہوتا ہے تو معنی ہوتے ہیں توبہ قبول کرنے والا، یہ صرف لفظ تَوَّابٌ کا حکم ہے اسی معنی کا دوسرا لفظ تَآئِبٌ ہے، اس کا استعمال اللہ تعالیٰ کے لیے جائز نہیں، اگرچہ لغوی معنی کے اعتبار سے وہ بھی غلط نہیں، مگر اللہ تعالیٰ کی شان میں صرف وہی صفات اور القاب استعمال کرنا جائز ہیں جن کا ذکر قرآن وسنت میں وارد ہے، باقی دوسرے الفاظ اگرچہ معنی کے اعتبار سے صحیح ہوں مگر اللہ تعالیٰ کے لیے اس کا استعمال درست نہیں۔'' (معارف القرآن، ج۱، ص۲۰۱)۔

تَوْبَۃٌ اور تَوْبٌ اسم ذات ہیں۔ توبہ۔ ﴿ اَلَمْ یَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ ھُوَ یَقْبَلُ التَّوْبَۃَ عَنْ عِبَادِہٖ ﴾ (9/التوبۃ:104) ''کیا وہ لوگ جانتے نہیں کہ اللہ ہی قبول کرتا ہے توبہ کو اپنے بندوں سے۔'' ﴿ غَافِرِ الذَّنْۢبِ وَ قَابِلِ التَّوْبِ شَدِیْدِ الْعِقَابِ ﴾ (40/المؤمن:3) ''گناہ کا بخشنے والا اور توبہ کا قبول کرنے والا ہے سخت سزا دینے والا ہے۔''

توبہ جب بندے کی طرف سے ہو تو وہ چار چیزوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ (ا) اپنے کیے ہوئے گناہ کو گناہ سمجھنا اور اُس پر ندامت ہونا۔ (ب) اس گناہ کو بالکل چھوڑ دینا۔ (ج) آئندہ کے لیے دوبارہ نہ کرنے کا پختہ عزم کرنا۔ یعنی گزشتہ پر ندامت اور اعتراف جرم، حال میں اُس کا ترک کرنا اور مستقبل میں نہ کرنے کا ارادہ کرنا اور چوتھی شرط یہ ہے کہ (د) اگر معاملہ حقوق العباد کا ہو تو جس کا حق مارا ہو اس کا حق واپس کرنا یا اس سے معافی مانگنا اور اگر معاملہ حقوق اللہ کا ہے تو جو فرائض فوت ہو چکے ہوں اور اگر ان کی قضا ہے، تو قضا ادا کرنا۔ یہ چار چیزیں کسی توبہ میں ہوں، تب وہ حقیقتاً توبہ ہے۔

اَلرَّحِیْمُ (ر ح م): آیت بسم اللہ دیکھیں۔

ترکیب

فَتَلَقّٰٓی فعل ماضی، اٰدَمُ فاعل، مِنْ رَّبِّہٖ متعلق فعل اور کَلِمٰتٍ مفعول ہے۔ تَابَ کے ساتھ عَلٰی کا صلہ آیا ہے چنانچہ اس کا مطلب ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے ساتھ حضرت آدمؑ پر متوجہ ہوا یا دوسرے الفاظ میں ان کی توبہ قبول کی۔ عَلَیْہِ میں 'ہٖ' ضمیر حضرت آدمؑ کے لیے اور تَابَ کی ضمیر فاعلی اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ اِنَّ کا اسم منصوب ہوتا ہے، اس لیے اِنَّہٗ میں اِنَّ کے بعد ضمیر مرفوعہ ھُوَ کے بجائے ضمیر منصوبہ ہٗ آئی ہے۔ ھُوَ ضمیر فاصل ہے، کیونکہ تَوَّابٌ اور رَحِیْمٌ، خبریں معرّف باللّام ہیں اور اس سے حصر کا مفہوم بھی پیدا ہوا ہے۔

ترجمہ	فَتَلَقّٰۤى	اٰدَمُ	مِنْ رَّبِّهٖ	كَلِمٰتٍ	فَتَابَ عَلَيْهِ
البقرۃ:37	تو سیکھ لیے	حضرت آدمؑ نے	اپنے رب سے	کچھ الفاظ	تو اس (اللہ تعالیٰ) نے توبہ قبول کی ان (آدمؑ) کی

اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۳۷﴾
یقیناً وہ ہی بار بار توبہ قبول کرنے والا بہت رحم کرنے والا ہے

نوٹ:1 دیکھیے یہاں تَلَقّٰى کی جگہ عَلَّمَ کا لفظ بھی آسکتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو ان کلمات کا علم سکھا دیا اور تَعَلَّمَ بھی آسکتا تھا کہ حضرت آدمؑ نے خود کوشش کر کے کلمات سیکھ لیے۔لیکن یہاں تَلَقّٰى آیا ہے جو فصاحت اور بلاغت کی انتہا ہے اور اس ایک لفظ نے حضرت آدمؑ کی کیفیت کو واضح کر دیا ہے۔ یعنی وہ جنت سے نکالے جانے کی وجہ سے اور اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنے کی وجہ سے بہت بے قرار تھے اور جب اللہ تعالیٰ نے ان کو کلمات سکھائے تو انہوں نے ان کا بھر پور طریقے سے استقبال کیا۔ مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں: ''تَلَقّٰى کے معنی ہیں شوق اور رغبت کے ساتھ کسی کا استقبال کرنا اور اس کو قبول کرنا ہے۔ مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب اُن کو توبہ کے کلمات کی تلقین کی گئی تو آدمؑ نے اہتمام کے ساتھ اُن کو قبول کیا۔'' (معارف القرآن، ج ۱، ص ۱۹۹)۔ یہ کلمات سورۃ الاعراف کی آیت نمبر 23 میں بیان ہوئے ہیں۔﴿ قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ۫ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۲۳﴾ ﴾۔ اس آیت مبارکہ سے عیسائیوں کے عقیدے (Original Sin) کی بھی نفی ہو گئی ہے۔ حدیث پاک میں ہے کہ ان کلمات کو اپنی دعا میں اپناؤ جن کے ذریعے تمہارے باپ آدمؑ کی توبہ قبول ہوئی۔ (واللہ اعلم)۔

آیت:38

﴿ قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۸﴾ ﴾

قُلْنَا (ق و ل): البقرۃ آیت 8 دیکھیں۔ اِهْبِطُوْا (ھ ب ط): البقرۃ آیت 36 دیکھیں۔ جَمِيْعًا (ج م ع): البقرۃ آیت 29 دیکھیں۔

اِمَّا ''حروف غیر عاملہ'' میں سے ہے اس کے معنی ہوتے ہیں ''یا'' اور یہ جملے میں دو بار استعمال ہوتا ہے اور کئی معنی دیتا ہے۔

(1) بطور حرف تفصیل: جیسے فرمایا: ﴿ اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ﴿۳﴾ ﴾ (76/الدھر:3) ''ہم ہی نے اس کو راستہ بتایا (پھر) یا تو وہ شکر گزار ہوا اور یا کافر ہو گیا۔'' (ترجمہ ماجدیؒ) ''ہم نے اس کو سجھائی راہ یا حق مانتا ہے اور یا ناشکری کرتا ہے۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)

(2) شک وابہام کے موقع پر جیسے: جَاءَ اِمَّا زَيْدٌ وَاِمَّا خَالِدٌ۔ یا تو زید آیا ہے یا خالد گویا یہ معلوم نہیں کہ دونوں میں سے کون آیا ہے۔

(3) اِبَاحَتْ (جائز قرار دینا) اور تخییر (اختیار دینا) کے معنی بھی دیتا ہے۔ جیسے فرمایا ﴿ قَالُوْا يٰمُوْسٰۤى اِمَّاۤ اَنْ تُلْقِىَ وَاِمَّاۤ اَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِيْنَ ﴿۱۱۵﴾ ﴾ (7/الاعراف:115) ''وہ (جادوگر) بولے اے موسیٰؑ یا تو آپؑ پہلے ڈال لیجیے یا ہم ہی پہلے ڈالنے والے ہوں۔'' یہاں اس آیت مبارکہ میں اِمَّا تخییر کے معنی دے رہا ہے۔

نوٹ: کبھی اِمَّا، اِنْ شرطیہ اور 'ما' زائدہ کا مرکب ہوتا ہے اور 'ما' زائدہ تاکید کے معنی دیتا ہے۔ اِنْ شرطیہ کے ساتھ مضارع مجزوم آتا ہے لیکن اِمَّا کے ساتھ مضارع، نِ ثقیلہ کے ساتھ آتا ہے جیسے آیت زیر مطالعہ میں ہے یا فرمایا: ﴿ فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا ﴾ (9/مریم:26) ''پھر اگر تو دیکھے کوئی آدمی۔'' ﴿ وَاِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ﴾ (17/بنی اسرائیل:28) ''اور اگر آپؐ کو اُن سے منہ پھیرنا ہی پڑے۔'' وغیرہ۔

يَاْتِيَنَّ (ء ت ی): البقرۃ آیت 23 دیکھیں۔ هُدًى (ھ د ی): الفاتحہ آیت 5 دیکھیں۔ مَنْ: البقرۃ آیت 8 دیکھیں۔

ت ب ع

(س) **تَبَعًا** کسی کے نقشِ قدم پر چلنا۔ کسی کی پیروی کرنا۔ ﴿فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ ۚ وَمَنْ عَصَانِیْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝﴾ (14/ابراہیم:36) ''پس جس نے میری پیروی کی تو یقیناً وہ مجھ سے ہے اور جس نے میری نافرمانی کی تو بیشک تو بہت ہی بخشنے والا ہر حال میں رحم کرنے والا ہے۔''

تَابِعٌ ج: تَابِعُوْنَ اور تَبَعٌ۔ اسم الفاعل ہے۔ پیروی کرنے والا۔ خدمت کرنے والا۔ نوکر۔ ﴿وَمَآ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ﴾ (2/البقرۃ:145) ''اور آپؐ پیروی کرنے والے نہیں ہیں ان کے قبلہ کی۔'' ﴿اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا﴾ (40/المومن:47) ''بیشک ہم تو تمہاری پیروی کرنے والے تھے۔'' ﴿اَوِ التّٰبِعِیْنَ غَیْرِ اُولِی الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ﴾ (24/النور:31) ''یا اپنے ایسے نوکروں پر جو (عورت) کے خواہش مند نہ ہوں مردوں میں سے۔'' (نوٹ: تَبَعٌ مصدر بھی ہے مطلب ہے پیروی کرنا اور تَابِعٌ کی جمع بھی ہے مطلب ہے پیروی کرنے والے)۔

تَبِیْعٌ فَعِیْلٌ کے وزن پر بمعنی اسم الفاعل ہے۔ اس لفظ کے لفظی معنی ہیں ''پیچھا کرنے والا'' البتہ ہمارے بزرگوں نے اس لفظ کے کئی طرح سے ترجمے کیے ہیں، مثلاً: باز پرس کرنے والا۔ دعویٰ کرنے والا۔ انتقام لینے والا، وغیرہ۔ قرآن مجید میں یہ ایک ہی مرتبہ، سورہ بنی اسرائیل کی آیت نمبر 69 میں استعمال ہوا ہے۔ ﴿ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ عَلَیْنَا بِهٖ تَبِیْعًا ۝﴾ ''اور تم کو اس بات پر ہمارا کوئی پیچھا کرنے والا نہ ملے۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔ ''پھر نہ پاؤ اپنی طرف سے ہم پر اُس کا کوئی باز پرس کرنے والا۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ) ''پھر تم اپنے لیے ہم پر اُس کا دعویٰ (پیچھا) کرنے والا کسی کو نہ پاؤ گے۔'' (ترجمہ احسن البیان) ''پھر تم نہیں پاؤ گے اپنے لیے ہم سے اس ڈبونے پر کوئی انتقام لینے والا۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)

تُبَّعٌ یمن کے بادشاہوں کا لقب تھا۔ ﴿اَهُمْ خَیْرٌ اَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ ۙ﴾ (44/الدخان:37) ''کیا یہ لوگ بہتر ہیں یا یمن کے بادشاہوں کی قوم۔''

(افعال) **اِتْبَاعًا** (۱) کسی کے پیچھے لگنا۔ (۲) کسی کو کسی کے پیچھے لگانا، اس صورت میں اس کے دو مفعول ہوتے ہیں۔ ﴿فَاَتْبَعَهُ الشَّیْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِیْنَ ۝﴾ (7/الاعراف:175) ''پس پیچھے لگا اس کے شیطان تو وہ ہو گیا گمراہوں میں سے۔'' ﴿وَاَتْبَعْنٰهُمْ فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا لَعْنَةً ۚ﴾ (28/القصص:42) ''تو ہم نے ان کے پیچھے لگا دیا اس دنیا میں لعنت کو۔''

(افتعال) **اِتِّبَاعًا** اہتمام سے پیروی کرنا۔ پیچھا کرنا۔ ﴿رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ﴾ (3/آل عمران:53) ''اے ہمارے رب ہم ایمان لائے اس پر جو تو نے نازل کیا اور ہم نے پیروی کی اِن رسولؐ کی۔'' پیر کرم شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں: ''کسی کے فعل کے اتباع کا یہ معنی ہے کہ اس کے اس فعل کو اس طرح کیا جائے جس طرح وہ کرتا ہے اور اس لیے کیا جائے کیونکہ وہ کرتا ہے۔'' (ضیاء القرآن، ج ۱، ص: ۲۲۳)

اِتَّبِعْ ج: اِتَّبِعُوْا۔ فعل امر ہے۔ تو پیروی کر۔ ﴿وَاتَّبِعْ سَبِیْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَیَّ ۚ﴾ (31/لقمان:15) ''اور تو پیروی کر اس کے راستے کی جس نے رخ کیا میری طرف۔'' ﴿وَاِذَا قِیْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ﴾ (2/البقرۃ:170) ''اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ تم لوگ پیروی کرو اُس کی جس کو نازل کیا اللہ نے۔''

مُتَّبَعٌ ج: مُتَّبَعُوْنَ۔ اسم المفعول ہے۔ جس کی پیروی کی جائے۔ جس کا پیچھا کیا جائے۔ ﴿فَاَسْرِ بِعِبَادِیْ لَیْلًا اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ۝﴾ (44/الدخان:23) ''تو تم روانہ ہو میرے بندوں کے ساتھ رات کے وقت یقیناً تمہارا پیچھا کیا جائے گا۔''

(تفاعل) تَتَابُعًا ایک کے پیچھے ایک آنا۔لگا تار آنا۔

مُتَتَابِعٌ ج: مُتَتَابِعُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ ایک کے پیچھے ایک آنے والا۔لگا تار آنے والا۔ ﴿فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ﴾ (4/النساء:92) ''پس جو نہ پائے تو روزہ (رکھنا) ہے ایک کے پیچھے ایک آنے والے یعنی مسلسل دو مہینوں کا۔''

| خ و ف |

(ف) خَوْفًا اور خِيْفَةً آئندہ پیش آنے والی کسی تکلیف ومصیبت کا اندیشہ کرنا۔ڈرنا۔خوف محسوس کرنا۔اس کا تعلق مستقبل سے ہے۔ ﴿اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَةِ ﴾ (11/ھود:103) ''بیشک اس میں نشانی ہے اس کے لیے جو ڈرے آخرت کے عذاب سے۔'' ﴿وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّ خِيْفَةً ﴾ (7/الاعراف:205) ''اور یاد کر اپنے رب کو اپنے جی میں گڑگڑاتے ہوئے اور ڈرتے ہوئے۔'' خِيْفَةٌ، اصل میں خَوْفَةٌ تھا۔'و' ، 'ی' میں تبدیل ہوگئی اور خ کی زبر کو 'ی' کی مناسبت سے زیر میں تبدیل کر دیا۔اس طرح خِيْفَةٌ بن گیا۔ اَلْخَوْفُ مِنَ اللهِ: امام راغبؒ فرماتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ جس طرح انسان شیر کے دیکھنے سے ڈر محسوس کرتا ہے،اسی قسم کا رعب اللہ تعالیٰ کے تصور سے انسان کے قلب پر طاری ہو جائے بلکہ خوف الٰہی کے معنی یہ ہیں کہ انسان گناہوں سے بچتا رہے اور طاعات کو اختیار کرے۔اسی بنا پر کہا گیا ہے کہ جو شخص گناہ ترک نہیں کرتا وہ خائف یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا نہیں ہو سکتا۔'' (مفردات القرآن، ج۱،ص ۳۲۳)

خَوْفٌ اسم ذات بھی ہے۔ڈر۔خوف۔ ﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ ﴾ (2/البقرۃ:155) ''اور البتہ ہم آزمائیں گے تم کو تھوڑے سے ڈر سے اور بھوک سے۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ) ''خوف اور خشیّت میں فرق: مولانا مودودیؒ ان دو لفظوں میں فرق واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''عربی زبان میں ڈر کے لیے خوف اور خشیّت دو لفظ استعمال ہوتے ہیں جن کے مفہوم میں ایک باریک فرق ہے۔خوف کا لفظ بالعموم اُس ڈر کے لیے استعمال ہوتا ہے جو کسی کی طاقت کے مقابلہ میں اپنی کمزوری کے احساس کی بنا پر آدمی کے دل میں پیدا ہو۔اور خشیت اُس ہیبت کے لیے بولتے ہیں جو کسی کی عظمت کے تصور سے آدمی کے دل میں طاری ہو۔'' (تفہیم القرآن، ج۵،ص ۱۲۳)

خَائِفٌ ج: خَائِفُوْنَ۔اسم الفاعل ہے۔ڈرنے والا۔ ﴿فَخَرَجَ مِنْهَا خَآئِفًا يَّتَرَقَّبُ ﴾ (28/القصص:21) ''پس وہ نکلے اس (بستی) سے ڈرنے والا ہوتے ہوئے، (اپنی گرفتاری) کا انتظار کرتے ہوئے۔''

خَفْ ج: خَافُوْا۔فعل امر ہے۔تو ڈر۔ ﴿فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴾ (3/آل عمران:175) ''پس تم اُن سے نہ ڈرو بلکہ مجھ ہی سے ڈرو اگر تم ایمان والے ہو۔''

(تفعیل) تَخْوِيْفًا خوف دلانا۔ڈرانا۔ ﴿ذٰلِكَ يُخَوِّفُ اللّٰهُ بِهٖ عِبَادَهٗ ﴾ (39/الزمر:16) ''یہ ہے، خوف دلاتا ہے اللہ اس سے اپنے بندوں کو۔'' ''اللہ تعالیٰ کا لوگوں کو ڈرانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگوں کو برے کاموں سے بچنے کی ترغیب دیتا ہے۔'' (راغبؒ)۔ ﴿وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا ﴾ (17/بنی اسرائیل:59) ''اور ہم نہیں بھیجتے ایسی نشانیاں مگر (لوگوں کو عذاب سے) خوف زدہ کرنے کے لیے۔''

(تفعّل) تَخَوُّفًا انسان میں خوف ظاہر ہونا۔ڈرنا۔خوف محسوس کرنا۔جب اس کے ساتھ عَلٰی کا صلہ استعمال ہو تو پھر اس سے دو معنی مراد لیے جاتے ہیں (1) کسی کو ڈرانا یا خوف دلانا۔(2) تَنَقُّصٌ یعنی کسی چیز کو آہستہ آہستہ کم کرنا۔قرآن مجید میں تَخَوُّفًا

ایک ہی مرتبہ استعمال ہوا ہے سورۂ نحل کی آیت 47 میں: ﴿ اَوۡ یَاۡخُذَهُمۡ عَلٰی تَخَوُّفٍ ؕ ﴾ اس آیت کا ترجمہ اِن دونوں مفہوم کے لحاظ سے کیا گیا ہے۔ ''یا پکڑے اُن کو ڈرانے کے بعد'' (ترجمہ شیخ الہندؒ) ''یا اُنہیں گھٹاتے گھٹاتے پکڑ لے'' (ترجمہ ماجدیؒ)

ح ز ن

(س) حَزَنًا غمگین ہونا۔ پچھتانا۔ (لازم) ﴿ تَتَنَزَّلُ عَلَیۡهِمُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوۡا وَ لَا تَحۡزَنُوۡا ﴾ (41/حٰم السجدہ:30) ''اترتے ہیں ان پر فرشتے کہ خوف مت کرو اور غمگین مت ہو۔''

(ن) حَزۡنًا غمگین کرنا۔ (متعدی) ﴿ وَ لَا یَحۡزُنۡكَ الَّذِیۡنَ یُسَارِعُوۡنَ فِی الۡکُفۡرِ ۚ ﴾ (3/آل عمران:176) ''اور غمگین نہ کریں آپؐ کو وہ لوگ جو باہم سبقت کرتے ہیں کفر میں۔''

حُزۡنٌ اور حَزَنٌ دونوں اسم ذات ہیں۔ غم۔ افسوس۔ کسی مقصد و مراد کے فوت ہو جانے سے پیدا ہونے والے غم کو یا کسی پیاری چیز سے محروم ہو جانے پر دل میں جو دکھ پیدا ہوتا ہے اُسے حزن کہتے ہیں۔ اس کا تعلق ماضی سے ہے۔ ﴿ وَ ابۡیَضَّتۡ عَیۡنٰهُ مِنَ الۡحُزۡنِ ﴾ (12/یوسف:84) ''اور سفید ہو گئیں انؑ کی آنکھیں غم سے۔'' ﴿ وَ قَالُوا الۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِیۡۤ اَذۡهَبَ عَنَّا الۡحَزَنَ ؕ ﴾ (35/فاطر:34) ''اور ان لوگوں نے کہا تمام حمد اللہ کے لیے ہے جو لے گیا ہم سے غم کو۔''

ترکیب

قُلۡنَا فعل ماضی ہے اور اس کا فاعل اس میں شامل ضمیر نَحۡنُ ہے جو اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اور اگلا جملہ وہ بات ہے جو کہی گئی ہے۔ اِهۡبِطُوۡا فعل امر ہے۔ اس میں شامل اَنۡتُمۡ کی ضمیر اس کا فاعل ہے۔ مِنۡهَا متعلق فعل ہے اور 'هَا' ضمیر اَلۡجَنَّۃ کے لیے ہے اور جَمِیۡعًا لفظاً تو اِهۡبِطُوۡا کی ضمیر فاعلی کا حال ہے اور معناً تاکید ہے یعنی تم سب اترو۔ فَاِمَّا میں 'ف' حرف عطف ہے اور اِمَّا، اِنۡ شرطیہ اور 'ما' زائدہ کا مرکب ہے۔ 'ما' زائدہ تاکید کے لیے ہے۔ یَاۡتِیَنَّ، اصل میں فعل مضارع یَاۡتِیۡ پر نون ثقلیہ داخل کرنے سے بنا ہے۔ اس کا مفعول کُمۡ ضمیر ہے، مِنِّیۡ متعلق فعل ہے اور هُدًی اس کا فاعل ہے اس لیے محلاً حالت رفع میں ہے۔ مِنِّیۡ اصل میں حرف جر مِنۡ اور یائے متکلم کا مرکب جاری ہے۔ یہ ان بعض صورتوں میں سے ہے جہاں ن وقایہ آتا ہے چنانچہ یہ مِنۡ نِیۡ ہے۔ جب اِن کو ملایا تو ن وقایہ کا مِنۡ کے 'ن' کے اندر ادغام ہوا اور مِنِّیۡ بن گیا۔ فَاِمَّا یَاۡتِیَنَّکُمۡ مِّنِّیۡ هُدًی، جملہ شرطیہ ہے اور اس کا جواب شرط اگلا پورا جملہ فَمَنۡ تَبِعَ سے لے کر اخیر تک ہے جو کہ خود ایک جملہ شرطیہ ہے۔ چنانچہ فَمَنۡ میں 'ف' جواب شرط کے لیے ہے۔ مَنۡ شرطیہ اور مبتدا ہے۔ مَنۡ موصول، واحد اور جمع دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے یہاں مَنۡ کی لفظی رعایت کے تحت واحد مذکر غائب کا صیغہ تَبِعَ آیا ہے۔ لیکن مَنۡ یہاں جمع کے معنوں میں ہے اس لیے آگے عَلَیۡهِمۡ اور وَلَا هُمۡ میں اس کی معنوی رعایت کرتے ہوئے جمع کی ضمیریں آئی ہیں۔ تَبِعَ فعل ماضی ہے اور اس میں شامل ضمیر اس کا فاعل ہے هُدَایَ اس کا مفعول ہے جو کہ مرکب اضافی ہے۔ هُدَا دراصل اَلۡهُدٰی تھا۔ مضاف ہونے کی وجہ سے لام تعریف گرا تو هُدٰی باقی بچا اور قاعدہ یہ ہے کہ الف مقصورہ (جس کے آخر میں ___ ی ہو) والے لفظ کے بعد اگر ضمیر آئے تو اسے الف کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔ چنانچہ هُدٰی کی 'ی' گری اور هُدَا باقی بچا۔ اس کے آگے یَ دراصل یائے متکلم ہے جس سے پہلے اگر الف ہو تو اسے فتحہ سے پڑھتے ہیں۔ تَبِعَ هُدَایَ، جملہ فعلیہ بن کر مَنۡ کی خبر ہے اور یہ جملہ اسمیہ، شرط ہے اور محلاً مجزوم ہے۔ آگے فَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡهِمۡ وَ لَا هُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ، اس شرط کی جزا ہے۔ اس میں 'ف' جواب شرط کے لیے ہے، لَا نفی کا ہے، خَوۡفٌ مبتداء ہے اور عَلَیۡهِمۡ محذوف خبر سے متعلق ہے۔ 'وَ' عطف کا ہے لَا نافیہ ہے۔ هُمۡ مبتدا اور جملہ فعلیہ یَحۡزَنُوۡنَ اس کی خبر۔ جملہ لَا هُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ معطوف ہے جملہ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡهِمۡ پر۔ اور جملہ اِمَّا یَاۡتِیَنَّکُمۡ اپنے جواب شرط کے ساتھ مل کر (جو کہ خود ایک جملہ شرطیہ ہے) معطوف ہے جملہ قُلۡنَا اهۡبِطُوۡا مِنۡهَا جَمِیۡعًا پر۔ حضرت مفتی محمد شفیعؒ آیت کے آخری حصے فَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡهِمۡ وَ لَا هُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ کے متعلق فرماتے ہیں: ''خوف کی نفی تو عام انداز میں کر دی گئی، مگر حزن کے متعلق یہ نہیں فرمایا کہ لَا حُزۡنَ عَلَیۡهِمۡ،

بلکہ بصیغۂ فعل لایا گیا، اور اُس کی ضمیر فاعل کو مقدم کر کے وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ فرمایا گیا، اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ کسی چیز یا مراد کے فوت ہونے کے غم سے آزاد ہونا صرف انہی اولیاء اللہ کا مقام ہے جو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہدایات کی مکمل پیروی کرنے والے ہیں، ان کے سوا کوئی انسان اس غم سے نہیں بچ سکتا۔''

(معارف القرآن، ج ا ص ۲۰۲)

ترجمہ
البقرۃ:38

يَاْتِيَنَّكُمْ	فَاِمَّا	جَمِيْعًا	مِنْهَا	اهْبِطُوْا	قُلْنَا
آئے تمہارے پاس	پھر اگر	سب کے سب	اس (جنت) سے	تم لوگ اترو	ہم نے کہا

فَلَا خَوْفٌ	هُدَایَ	تَبِعَ	فَمَنْ	هُدًى	مِّنِّيْ
تو نہ کوئی خوف ہوگا	میری ہدایت کی	پیروی کی	پس جس نے	کوئی ہدایت	میری طرف سے

هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝۳۸	وَلَا	عَلَيْهِمْ
غمگین ہوں گے	اور نہ ہی وہ لوگ	ان پر

نوٹ:1 ''نیچے اُترنے کا حکم دو بار ہوا۔ پہلے لغزش کے صادر ہونے کے بعد، پھر قبول توبہ کے بعد، پہلے حکم سے ناراضگی کا اظہار مقصود تھا۔ اور دوسری بار منصب خلافت سنبھالنے کے لیے دونوں حکموں کی غرض و غایت الگ الگ ہے، اس لیے یہاں تکرار نہیں۔'' (ضیاء القرآن، ج ا ص ۵۱)

نوٹ:2 اس آیت مبارکہ کے مطالعے کے بعد اگر استاد محترم جناب عامر سہیل صاحب کی کتاب 'لسان القرآن' سے جملہ شرطیہ کے قواعد دوبارہ پڑھ لیے جائیں تو انشاء اللہ کافی فائدہ ہوگا۔

آیت:39

﴿ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۳۹ ﴾

كَفَرُوْا (ك ف ر): البقرۃ آیت 6 دیکھیں۔ كَذَّبُوْا (ك ذ ب): البقرۃ آیت 10 دیکھیں۔
اٰيٰتٌ: نوٹس کے آغاز میں لفظ سورۃ کے بعد دیکھیں۔

ص ح ب

(س) صُحْبَةً کسی کے ساتھ رہنا۔ ساتھی ہونا۔

صَاحِبٌ ج: اَصْحَابٌ، صَحَابَةٌ۔ اسم الفاعل ہے۔ واحد مذکر۔ والا۔ ساتھی۔ ساتھ رہنے والا، لیکن ایسے ساتھی کو صاحب کہا جاتا ہے جس کی رفاقت بکثرت ہو۔ کسی شے کے مالک کو بھی صاحب کہہ دیا جاتا ہے۔ جیسے صَاحِبُ الْبَيْتِ۔ گھر کا مالک۔ اور اسی طرح اُس کو بھی جو اس شے میں تصرف کا مالک ہو۔ ﴿ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ ﴾ (9/التوبۃ:40) ''جب انہوںؐ نے کہا اپنے ساتھی سے آپؓ غمگین نہ ہوں۔'' ﴿ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ ۘ ﴾ (68/القلم:48) ''اور آپؐ مت ہوں مچھلی والےؑ کی مانند۔'' ﴿ لَهٗٓ اَصْحٰبٌ يَّدْعُوْنَهٗٓ اِلَى الْهُدَى ائْتِنَا ۭ ﴾ (6/الانعام:71) ''اس کے کچھ ساتھی ہیں، وہ لوگ بلاتے ہیں اس کو ہدایت کی طرف کہ تو آ ہمارے پاس۔'' ﴿ وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اَصْحٰبَ النَّارِ ﴾ (7/الاعراف:44) ''اور پکارا جنت والوں نے آگ والوں کو۔'' صَحَابَةٌ، نبی اکرمؐ کے ساتھیوں کو کہتے ہیں جو حضورؐ پر

ایمان لائے، اُن کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اُن کا خاتمہ بھی ایمان پر ہوا۔ رضی اللہ عنہم اجمعین۔

صَاحِبَۃٌ ج: صَاحِبَاتٌ۔ اسم الفاعل ہے۔ واحد مونث۔ ساتھ رہنے والی۔ بیوی۔ چونکہ بیوی رفیقہ حیات ہوتی ہے اس لیے صاحبہ کہلاتی ہے۔ ﴿اَنّٰی یَکُوْنُ لَہٗ وَلَدٌ وَّ لَمْ تَکُنْ لَّہٗ صَاحِبَۃٌ﴾ (6/الانعام:101) ''اللہ تعالیٰ کی اولاد کہاں سے ہوسکتی ہے حالانکہ اُس کی کوئی بیوی تو ہے ہی نہیں۔''

(افعال) اِصْحَابًا کسی کو رفاقت دینا۔ کسی کی تائید وحمایت کرنا۔ ﴿لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ نَصْرَ اَنْفُسِهِمْ وَلَا هُمْ مِّنَّا یُصْحَبُوْنَ ﴿۴۳﴾﴾ (21/الانبیاء:43) ''وہ لوگ طاقت نہیں رکھتے اپنے آپ کی مدد پر اور نہ ہی وہ ہماری طرف سے رفاقت دیے جاتے ہیں۔'' ''وہ جھوٹے معبود تو خود اپنی مدد بھی نہیں کر سکتے اور نہ اُنہیں ہماری تائید میسر ہوگی۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔ یُصْحَبُوْنَ مضارع مجہول کا صیغہ ہے۔

(مفاعلہ) مُصَاحَبَۃً باہم ساتھ رہنا۔ مل کر رہنا۔ کسی کو ساتھ رکھنا۔

لَا تُصَاحِبْ فعل نہی ہے۔ تو ساتھ نہ رکھ۔ ﴿فَلَا تُصٰحِبْنِیْ﴾ (18/الکہف:76) ''تو آپ ساتھ نہ رکھیں مجھے۔''

صَاحِبْ فعل امر ہے۔ تو ساتھ رہ۔ ﴿وَصَاحِبْهُمَا فِی الدُّنْیَا مَعْرُوْفًا﴾ (31/لقمان:15) ''اور تو ساتھ رہ ان دونوں کے یعنی والدین کے دنیا میں اچھے طریقے سے۔''

اَلنَّارُ (ن و ر): البقرۃ آیت 17 دیکھیں۔ خٰلِدُوْنَ (خ ل د): البقرۃ آیت 25 دیکھیں۔

ترکیب 'وَ' عطف کا ہے اور اَلَّذِیْنَ اسم موصول ہے اور مبتدا ہے اور یہ گزشتہ آیت میں فَمَنْ کے مَنْ پر عطف ہے۔ کَفَرُوْا اس کا صلہ ہے۔ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَآ معطوف ہے کَفَرُوْا پر۔ بِاٰیٰتِنَآ کے متعلق مولانا عبدالماجد دریابادیؒ فرماتے ہیں: ''اہل جنت کے ذکر میں ذاتِ حق کے لیے ضمیر متکلم صیغہ واحد کی ابھی گزر چکی ہے، تَبِعَ هُدَایَ اور اہل جہنم کے سلسلہ میں وہی ضمیر متکلم صیغہ جمع میں ہوگئی ہے، بِاٰیٰتِنَآ۔ اہل لطائف نے لکھا ہے کہ وہ موقع اظہار خصوصیت و شفقت کا تھا۔ اس لیے ''میری'' ہی مناسب تھا۔ اب محل حاکمانہ جلالت واقتدار کا ہے، اس لیے یہاں ''ہماری'' ہی موزوں ہے۔'' آگے اُولٰٓئِكَ مبتدا ہے اور اَصْحٰبُ النَّارِ اس کی خبر۔ یہ جملہ اسمیہ خبر ہے اَلَّذِیْنَ کی۔ هُمْ پھر مبتدا ہے، فِیْهَا متعلق خبر ہے 'ھا' ضمیر اَلنَّارِ کے لیے ہے اور خٰلِدُوْنَ خبر ہے۔ یہ جملہ اسمیہ، حال ہے اَصْحٰبُ النَّارِ کا۔ (واللہ اعلم)۔

ترجمہ البقرۃ:39

وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا	وَکَذَّبُوْا	بِاٰیٰتِنَآ	اُولٰٓئِكَ	اَصْحٰبُ النَّارِ
اور جن لوگوں نے انکار کیا	اور جھٹلایا	ہماری نشانیوں کو	تو وہ لوگ	آگ والے ہیں

هُمْ	فِیْهَا	خٰلِدُوْنَ ﴿۳۹﴾
وہ لوگ	اس (آگ) میں	ہمیشہ رہنے والے ہیں

نوٹ انکار اور تکذیب تقریباً ہم معنی ہیں۔ ایک شخص کہتا ہے، میں نہیں مانتا تو یہ انکار ہے۔ دوسرا شخص کہتا ہے کہ یہ بات غلط ہے اور اس غلط بات کو میں جھٹلاتا ہوں تو یہ تکذیب ہے۔

آیت:40

﴿یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ وَ اَوۡفُوۡا بِعَہۡدِیۡۤ اُوۡفِ بِعَہۡدِکُمۡ ۚ وَ اِیَّایَ فَارۡہَبُوۡنِ ﴿۴۰﴾﴾

اِبۡنٌ بیٹا۔تثنیہ:اِبۡنَانِ (رفع)اِبۡنَیۡنِ (نصب،جر)

ج:جمع سالم: بَنُوۡنَ (رفع)بَنِیۡنَ (نصب،جر)

جمع مکسر: اَبۡنَاءُ (غیر منصرف)

مؤنث:بیٹی۔اِبۡنَۃٌ اور بِنۡتٌ۔تثنیہ:اِبۡنَتَانِ (رفع)اِبۡنَتَیۡنِ (نصب،جر)

ج:بَنَاتٌ

صاحبؒ تفسیر حقانی فرماتے ہیں:''اگر چہ اِبۡنٌ کے معنی بیٹے کے ہیں مگر پوتے اور اس کی اولاد پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔اس لیے اِس وقت کے لوگوں کو بھی بنی آدم کہتے ہیں۔''(تفسیر حقانی،ج ا،ص:۴۴۰)

اِبۡنٌ کا اعراب:

اِبۡنٌ کا اعراب اس لفظ کے اعراب کے مطابق ہوتا ہے جس کے لیے اِبۡنٌ کا لفظ آیا ہو۔جیسے قَالَ عِیۡسَی ابۡنُ مَرۡیَمَ (المائدۃ:114)۔اس جملہ میں لفظ عیسیٰ فاعل ہونے کی وجہ سے رفع میں ہے اس لیے اِبۡنُ (نون کی پیش کے ساتھ) آیا ہے۔بِعِیۡسَی ابۡنِ مَرۡیَمَ (المائدۃ:46)۔یہاں لفظ عیسیٰ حرف جار بِ کی وجہ سے حالتِ جر میں ہے اس لیے اِبۡنِ (نون کی زیر کے ساتھ) آیا ہے۔وَاٰتَیۡنَا عِیۡسَی ابۡنَ مَرۡیَمَ (البقرۃ:87) میں اٰتَیۡنَا کا مفعول ہونے کی وجہ سے لفظ عیسیٰ حالتِ نصب میں ہے اس لیے اِبۡنَ (نون کی زبر کے ساتھ) آیا ہے۔

اِبۡنٌ کی تصغیر:

تَصۡغِیۡرٌ کا مطلب ہے چھوٹا پن۔کسی چیز میں چھوٹا پن بتانے کے لیے ثلاثی اسم کو فُعَیۡلٌ یا فُعَیۡلَۃٌ کے وزن پر لے آتے ہیں جسے اَلۡاِسۡمُ التَّصۡغِیۡر یا اَلۡاِسۡمُ الۡمُصَغَّر کہتے ہیں اور اصل لفظ کو مُکَبَّرٌ کہتے ہیں۔چنانچہ اِبۡنٌ (دراصل بَنُوٌ) کا اسم تصغیر بُنَیۡوٌ بنتا ہے۔'وٗ کو 'ی' میں تبدیل کر کے بُنَیۡیٌ بنا اور پھر 'ی' کا ادغام ہو کر بُنَیٌّ بن گیا۔مطلب ہے چھوٹا سا بیٹا۔یا پیارا سا بیٹا۔﴿یٰبُنَیَّ لَا تُشۡرِکۡ بِاللّٰہِ ؕ﴾ (31/لقمان:13)''اے میرے پیارے بیٹے اللہ کے ساتھ شرک مت کرو۔''

اِبۡنُ السَّبِیۡلِ:

لفظی معنی ہے راستے کا بیٹا۔لیکن عربی زبان میں یہ مسافر کے لیے استعمال ہوتا ہے۔یہ واحد اور جمع دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔عربی زبان میں اَبۡنَاءُ السَّبِیۡلِ استعمال ہی نہیں ہوتا۔مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں:''اِبۡنٌ کا لفظ اصل میں تو بیٹے کے لیے بولا جاتا ہے لیکن عربی محاورات میں اِبۡنٌ اور اَبٌ اور اَخٌ وغیرہ کے الفاظ ان چیزوں کے لیے بھی بولتے جاتے ہیں جن کا گہرا تعلق کسی سے ہو،اسی محاورہ کے مطابق ابن السبیل،راہ گیر و مسافر کو کہا جاتا ہے،کیونکہ ان کا گہرا تعلق راستہ قطع کرنے اور منزل مقصود پر پہنچنے سے ہے۔''(معارف القرآن،ج ۴،ص ۴۰۹)

اِسۡرَآءِیۡلُ اسرائیل،حضرت یعقوبؑ بن اسحاقؑ بن ابراہیمؑ کا لقب ہے۔بعض بزرگوں کے نزدیک یہ ان کا دوسرا نام ہے۔اسرائیل عبرانی زبان کا لفظ ہے۔یہ مرکب اضافی ہے اور غیر منصرف ہے۔''اِسۡرَا'' کے معنیٰ بندہ کے ہیں اور ''اِیۡل''عبرانی زبان میں اللہ تعالیٰ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔لہٰذا اسرائیل

کے معنی ہوں گے عَبْدُاللّٰہِ یعنی اللہ کا بندہ۔ ان کے بارہ بیٹے تھے۔ اِن بیٹوں سے جو نسل چلی وہ بنی اسرائیل کہلائی۔ حضرت مولانا عبدالماجد دریا بادیؒ فرماتے ہیں: ''بنی اسرائیل'' تو ایک قومی ونسلی اصطلاح ہے۔ مذہبی حیثیت سے یہ لوگ یہود تھے۔ اہل کتاب تھے۔ توریت محرف ومسخ شدہ ہو کر، لیکن بہرحال موجود ان کے درمیان تھی۔ سلسلۂ وحی ونبوت اور عقیدۂ جزا وسزا کے کسی نہ کسی صورت میں قائل تھے۔ علوم انبیاء ومعارفِ اولیاء کے حامل تھے۔ مالدار تھے، ساہوکار تھے۔ ساتھ ہی سفلی عملیات، سحر وکہانت نیز تجارت کے بھی بڑے ماہر تھے۔'' (تفسیر ماجدیؒ، ص ۲۳)۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ فرماتے ہیں: ''قرآن مجید کے نزول کے وقت تک ان پر عروج وزوال کے چار ادوار آچکے تھے۔ دو مرتبہ ان پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کی بارشیں ہوئیں اور انہیں عروج نصیب ہوا، جبکہ دو مرتبہ دنیا پرستی، شہوت پرستی اور اللہ کے احکام کو پس پشت ڈال دینے کی سزا میں ان پر اللہ کے عذاب کے کوڑے برسے۔ اس کا ذکر سورۂ بنی اسرائیل کے پہلے رکوع میں آئے گا۔ اُس وقت جبکہ قرآن نازل ہو رہا تھا وہ اپنے اس زوال کے دور میں تھے۔'' (بیان القرآن، ج ا، ص:۲۴۹)۔

ذ ك ر

(ن) **ذِكْرًا**: یاد کرنا۔ یاد رکھنا۔ کسی کا ذکر کرنا۔ نصیحت حاصل کرنا۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں: ''ذکر کے اصل معنی یاد کرنے کے ہیں، جس کا تعلق قلب سے ہے، زبان سے ذکر کرنے کو بھی ذکر اس لیے کہا جاتا ہے کہ زبان ترجمان قلب ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ذکر زبانی وہی معتبر ہے جس کے ساتھ دل میں بھی اللہ کی یاد ہو۔'' (معارف القرآن، ج ا، ص:۳۹۲) ﴿اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ﴾ (3/آل عمران:191) ''وہ لوگ جو یاد رکھتے ہیں اللہ کو کھڑے ہوئے اور بیٹھے ہوئے اور اپنی کروٹوں کے بل۔'' ﴿وَ مَاۤ اَنْسٰىنِيْهُ اِلَّا الشَّيْطٰنُ اَنْ اَذْكُرَهٗ ۚ﴾ (18/الکہف:63) ''اور نہیں بُھلائی مجھے وہ بات مگر شیطان نے کہ میں اس کا ذکر کروں۔''

اُذْكُرْ: ج: اُذْكُرُوْا فعل امر ہے۔ تو یاد کر۔ ﴿وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّ خِيْفَةً﴾ (7/الاعراف:205) ''اور تو یاد کر اپنے رب کو اپنے جی میں گڑگڑاتے ہوئے اور ڈرتے ہوئے۔'' اُذْكُرُوْا آیت زیر مطالعہ میں استعمال ہوا ہے۔

ذَاكِرٌ: ج: ذَاكِرُوْنَ۔ ذَاكِرِيْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ مذکر کا صیغہ۔ یاد کرنے والا۔ ذکر کرنے والا۔ ﴿اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ ۚ﴾ (11/ہود:114) ''بے شک نیکیاں لے جاتی ہیں برائیوں کو۔ یہ ایک بڑی نصیحت ہے یاد کرنے والوں کے لیے۔''

ذَاكِرَةٌ: ج: ذَاكِرَاتٌ۔ اسم الفاعل ہے۔ مونث کا صیغہ۔ یاد کرنے والی۔ ذکر کرنے والی۔ ﴿وَ الذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّ الذّٰكِرٰتِ ۙ﴾ (33/الاحزاب:35) ''اور کثرت سے اللہ کا ذکر کرنے والے اور ذکر کرنے والیاں۔''

مَذْكُوْرٌ: اسم المفعول ہے۔ جس کو یاد کیا جائے۔ جس کا ذکر کیا جائے۔ ﴿لَمْ يَكُنْ شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا ۝﴾ (76/الدھر:1)۔ ''وہ نہیں تھا کوئی قابل ذکر چیز۔''

ذِكْرٌ: اسم ذات بھی ہے۔ یاد۔ نصیحت۔ کسی کا ذکر۔ ﴿وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ۝﴾ (20/طٰہٰ:14) ''اور تو قائم کر نماز کو میری یاد کے لیے۔'' ﴿اَوَ عَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ (7/الاعراف:63) ''تو کیا تم لوگوں کو تعجب ہوا کہ آئی تمہارے پاس ایک نصیحت تمہارے رب کی طرف سے۔ ﴿لَقَدْ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ؕ﴾ (21/الانبیاء:10) ''ہم نے نازل کی ہے تمہاری طرف ایک کتاب، اس میں تمہارا ذکر ہے۔

ذِكْرٰى: اسم ذات ہے لیکن اس میں ذِكْرٌ کی بنسبت مبالغہ ہے۔ بڑی نصیحت۔ اوپر ذَاكِرٌ میں آیت نمبر (11/ہود:114) دیکھیں۔

ذَکَرٌ تثنیہ: ذَکَرَانِ، ذَکَرَیْنِ۔ ج: ذُکُوْرٌ، ذُکْرَانٌ۔ نر۔ مرد۔ اس کی ضد اُنْثٰی ہے اور یہ عموماً اس وقت استعمال ہوتا ہے جب جنس کا اظہار مقصود ہو۔ خواہ مردوں میں یا حیوانات میں۔ ﴿ اَنِّیْ لَآ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ ﴾ (3/آل عمران:195) ''کہ میں ضائع نہیں کرتا تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل کو، کوئی بھی مرد ہو یا عورت۔'' ﴿ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ ﴾ (6/الانعام:143) ''آپؐ کہیے کیا اللہ نے اِن دونوں کو حرام کیا یا دونوں مادہ کو۔'' ﴿ مَا فِيْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا ﴾ (6/الانعام:139) ''جو ان مویشیوں کے پیٹ میں ہے وہ صرف ہمارے مردوں کے لیے ہے۔'' ﴿ اَتَاْتُوْنَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعٰلَمِيْنَ ۙ﴾ (26/الشعراء:165) ''کیا تم بدفعلی کے لیے جاتے ہو مردوں کے پاس ساری مخلوق سے۔'' کنایۃً ذَکَرٌ سے مرد کی شرم گاہ بھی مراد لی جاتی ہے۔

(تفعیل) تَذْکِیْرًا اور تَذْکِرَۃً یاد دلانا۔ نصیحت کرنا۔ ﴿ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ۭ﴾ (2/البقرۃ:282) ''کہ بھول جائے ان میں سے ایک تو یاد دلائے ان میں سے دوسری۔'' ﴿ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ فَاَعْرَضَ عَنْهَا ﴾ (18/الکہف:57) ''اور کون زیادہ ظالم ہے اس سے جس کو یاد دلائی جائیں اس کے رب کی نشانیاں اور وہ اعراض کرے ان سے۔'' ﴿ يٰقَوْمِ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَّقَامِيْ وَتَذْكِيْرِيْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ﴾ (10/یونس:71) ''اے میری قوم اگر تم لوگوں پر بھاری ہے میرا کھڑا ہونا اور اللہ تعالیٰ کی آیات سے یاد دہانی کرانا۔''

تَذْکِرَۃٌ اسم ذات بھی ہے۔ یاد دہانی۔ جس کے ذریعے کسی چیز کو یاد دلایا جائے۔ ﴿ وَاِنَّهٗ لَتَذْكِرَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ ﴾ (69/الحاقۃ:48) ''اور یقیناً وہ یعنی قرآن مجید یاددہانی ہے متقی لوگوں کے لیے۔''

ذَکِّرْ فعل امر ہے۔ تو یاد دہانی کرا۔ ﴿ فَذَكِّرْ ڜ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ ۝ ۭ﴾ (88/الغاشیۃ:21) ''آپؐ یاد دہانی کرایئے آپؐ تو بس یاد دہانی کرانے والے ہیں۔''

مُذَکِّرٌ اسم الفاعل ہے۔ یاد دہانی کرانے والا۔ اوپر آیت نمبر (88/الغاشیۃ:21) دیکھیں۔

(تفعّل) تَذَکُّرًا اس کا ماضی تَذَکَّرَ اور اِذَّکَّرَ، مضارع یَتَذَکَّرُ اور یَذَّکَّرُ، نیز مخاطب کے صیغوں میں مضارع تَتَذَکَّرُ اور تَذَکَّرُ دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ یاد دہانی حاصل کرنا۔ یاد کرنا۔ نصیحت پکڑنا۔ تَذَکُّرٌ کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ ایک شخص غفلت اور بھلاوے میں پڑا ہوا ہو اور چونک کر اُس چیز کو یاد کرلے جس سے غافل تھا۔ ﴿ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ ﴾ (20/طٰہٰ:44) ''پس تم دونوں کہنا، اس سے نرم بات شاید کہ وہ نصیحت پکڑے۔'' ﴿ سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى ۝ ۙ﴾ (87/الاعلیٰ:10) ''وہ نصیحت پکڑے گا جو خوف کرتا ہے۔'' ﴿ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝ ﴾ (10/یونس:3) ''تو کیا تم لوگ نصیحت نہیں پکڑتے۔''

(افتعال) اِدِّکَارًا قرآن مجید میں اس کا استعمال 'ذ' کو 'د' میں تبدیل کر کے ہوا ہے جو ایک استثنائی صورت ہے۔ اس لیے اِذْتِکَارٌ، اِدِّکَارٌ ہوگیا اور 'ت'، 'د' میں اس لیے تبدیل ہوئی کہ یہ باب افتعال کا خصوصی قاعدہ ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ باب افتعال کے 'ف' کلمہ پر اگر د، ذ یا ز میں سے کوئی حرف ہو تو افتعال کی 'ت' وہی حرف بن جاتی ہے اور پھر ادغام کے قواعد کا اطلاق ہوتا ہے۔ یہاں چونکہ 'ذ' پہلے 'د' میں تبدیل ہوگئی، اس لیے 'ت' بھی 'د' میں تبدیل ہوگئی اور پھر دونوں کا ادغام ہو گیا۔ نصیحت حاصل کرنا۔ سوچنا۔ غور کرنا۔ یاد کرنا۔ ﴿ وَقَالَ الَّذِيْ نَجَا مِنْهُمَا وَادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ ﴾ (12/یوسف:45) ''اور کہا اس نے جس نے نجات پائی ان دونوں میں سے اور اس نے یاد کیا ایک مدت کے بعد۔''

مُّدَّكِرٌ — اسم الفاعل ہے۔نصیحت حاصل کرنے والا۔ یاد کرنے والا۔ ﴿وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴾ (54/القمر:17) ''اور ہم نے آسان کیا ہے قرآن کو یاددہانی کے لیے تو کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے۔''

نِعْمَتِیَ اور اَنْعَمْتُ (ن ع م): الفاتحہ آیت 6 دیکھیں۔

و ف ی

(ض) وَفَاءً — کسی چیز کو مکمل کرنا۔ پورا کرنا۔

اَوْفٰی — اَفْعَلُ کے وزن پر افعل التفضیل ہے۔ زیادہ پورا کرنے والا۔ پورا۔ مکمل۔ ﴿وَمَنْ اَوْفٰی بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ﴾ (9/توبۃ:111) ''اور کون زیادہ پورا کرنے والا ہے اپنے وعدے کو اللہ سے۔'' ﴿ثُمَّ یُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰی ﴾ (53/النجم:41) ''پھر اُسے پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔''

(افعال) اِیْفَاءً — وعدہ، نذر، ناپ تول وغیرہ پورا کرنا۔ ﴿بَلٰی مَنْ اَوْفٰی بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰی فَاِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ ﴾ (3/آل عمران:76) ''کیوں نہیں! جس نے پورا کیا اپنے عہد کو اور تقویٰ کیا تو بے شک اللہ پسند کرتا ہے متقی لوگوں کو۔'' ﴿اَلَا تَرَوْنَ اَنِّیْٓ اُوْفِی الْكَیْلَ وَاَنَا خَیْرُ الْمُنْزِلِیْنَ ﴾ (12/یوسف:59) ''کیا تم لوگ دیکھتے نہیں کہ میں پورا بھرتا ہوں پیمانے کو اور میں سب سے بہتر مہمان نواز ہوں۔'' ﴿الَّذِیْنَ یُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ﴾ (13/الرعد:20) ''وہ لوگ جو پورا کرتے ہیں اللہ کے عہد کو۔''

اَوْفِ — ج: اَوْفُوْا۔ فعل امر ہے۔ تو پورا کر۔ ﴿فَاَوْفِ لَنَا الْكَیْلَ﴾ (12/یوسف:88) ''پس آپ پورا بھریئے ہمارے لیے پیمانے کو۔'' ﴿فَاَوْفُوا الْكَیْلَ وَالْمِیْزَانَ﴾ (7/الاعراف:85) ''پس تم لوگ پورا کرو ناپ اور تول کو۔''

لِیُوْفِ — ج: لِیُوْفُوْا۔ فعل امر غائب ہے۔ اسے چاہیے کہ پورا کرے۔ ﴿وَلْیُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَلْیَطَّوَّفُوْا بِالْبَیْتِ الْعَتِیْقِ ﴾ (22/الحج:29) ''اور ان لوگوں کو چاہیے کہ پورا کریں اپنی منتوں کو اور طواف کریں قدیم گھر کا۔''

اُوْفِ — مضارع مجزوم میں واحد متکلم کا صیغہ ہے۔ آیت زیر مطالعہ۔ (نوٹ: یہاں ایک بات کا خاص خیال رہے۔ وہ یہ کہ فعل امر کے واحد مذکر حاضر کے صیغے میں الف پر زبر آتی ہے (اَوْفِ) اور مضارع مجزوم میں واحد متکلم کے صیغے میں الف پر پیش آتی ہے۔ (اُوْفِ)۔

مُوْفٍ — ج: مُوْفُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ پورا کرنے والا۔ ﴿وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا﴾ (2/البقرۃ:177) ''اور پورا کرنے والے اپنے عہد کو جب کبھی باہم عہد کریں۔''

(تفعیل) تَوْفِیَةً — (1) کسی کام کو کامل طور پر پورا کرنا۔ ﴿وَاِبْرٰهِیْمَ الَّذِیْ وَفّٰٓی ﴾ (53/النجم:37) ''اور ابراہیمؑ کے صحیفوں میں جو پوری طرح (احکام) بجالائے۔''

(2) حق پورا پورا دے دینا۔ ﴿وَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَیُوَفِّیْهِمْ اُجُوْرَهُمْ﴾ (3/آل عمران:57) ''اور وہ لوگ کہ جو ایمان لائیں اور عمل کریں نیک تو وہ یعنی اللہ پورا پورا دے گا ان کو ان کے اجر۔''

یُوَفّٰی — مضارع مجہول ہے۔ اُسے دیا جائے گا پورا حق۔ ﴿وَتُوَفّٰی كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ﴾ (16/النحل:111) ''اور پورا حق دیا جائے گا ہر نفس کو جو اس نے عمل کیا۔'' ﴿وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ﴾ (3/آل عمران:185) ''اور قیامت کے دن تم اپنے بدلے پورے پورے دیے جاؤ گے۔''

یُوَفِّ — مضارع مجزوم ہے۔﴿ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا ﴾(11/ھود:15)''جو چاہتا ہے دنیا کی زندگی کو اور اس کی زینت کو تو ہم پورا حق دیں گے ان کو ان کے اعمال کا اس دنیا میں۔''

مُوَفِّ — ج:مُوَفُّوْنَ۔اسم الفاعل ہے۔پورا دینے والا۔﴿ وَاِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ غَيْرَ مَنْقُوْصٍ ۝۱۰۹ ع ﴾(11/ھود:109)''اور ہم اُن سب کو اُن کا پورا پورا حصہ بغیر کسی کمی کے دینے والے ہیں۔''

(تفعّل) **تَوَفِّ** — اس کے اصل معنیٰ ہیں کسی چیز کو پورا لے لینا، وصول کر لینا اور اس پر کامل طور پر قبضہ کر لینا۔ یہ لفظ کنایۃً 'موت دینا' کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے لیکن یہ اس کا حقیقی معنیٰ نہیں بلکہ مرادی اور تعبیری معنیٰ ہے۔قرآن مجید میں یہ لفظ (1) سوتے وقت ظاہری احساس و شعور کو لے لینے کے لیے استعمال ہوا ہے۔مثلاً:﴿ وَهُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ لِيُقْضٰٓى اَجَلٌ مُّسَمًّى ج ﴾(6/الانعام:60)''اور وہ وہی ہے جو قبضہ میں لے لیتا ہے تمہیں رات کو اور جانتا ہے جو کمایا تم نے دن کو پھر اٹھاتا ہے تمہیں (نیند سے) دن میں تاکہ پوری کر دی جائے (تمہاری عمر کی) میعاد مقرر۔''(ترجمہ ضیاء القرآن)۔(2) موت کے وقت روح کو قبض کر لینے کے لیے استعمال ہوا ہے۔مثلاً﴿ اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا ج ﴾(39/الزمر:42)''اللہ ہی روحوں کو اُن کی موت کے وقت اور جن کی موت نہیں آئی اُنہیں اُن کی نیند کے وقت قبض کر لیتا ہے۔''(ترجمہ احسن البیان)۔(3) حضرت عیسیٰؑ کو ان کی زندگی میں ان کی روح اور بدن سمیت آسمانوں میں اٹھائے جانے کے لیے استعمال ہوا ہے۔مثلاً:﴿ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ ﴾(5/المائدة:117)''پھر جب تو نے مجھ کو اٹھا لیا۔''(ترجمہ شیخ الہندؒ)۔حافظ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:''اَلتَّوَفِّيْ فِيْ لُغَةِ الْعَرَبِ مَعْنَاهَا الْقَبْضُ وَالْاِسْتِيْفَاءُ وَ ذٰلِكَ ثَلَاثَةُ اَنْوَاعٍ، اَحَدُهَا التَّوَفِّيْ فِي النَّوْمِ وَالثَّانِيْ تَوَفِّي الْمَوْتِ وَالثَّالِثُ تَوَفِّي الرُّوْحِ وَالْبَدَنِ جَمِيْعًا۔''(معارف القرآن، ج۲، ص ۴۳)''التوفی کا معنی لغتِ عرب میں قبض کرنے اور پورا لینے کے ہیں۔اور اس کی تین قسمیں ہیں۔نیند میں وصول کرنا، موت کے وقت وصول کرنا اور روح اور بدن کا مکمل وصول کرنا۔'' اور کلیات ابو بقاء میں ہے:''اَلتَّوَفِّيْ اَلْاِمَاتَةُ وَقَبْضُ الرُّوْحِ وَعَلَيْهِ اسْتِعْمَالُ الْعَامَّةِ اَوِ الْاِسْتِيْفَاءُ وَاَخْذُ الْحَقِّ وَ عَلَيْهِ اسْتِعْمَالُ الْبُلَغَاءِ''''توفی'' کا لفظ عوام کے یہاں موت دینے اور جان لینے کے لیے استعمال ہوتا ہے لیکن بلغاء کے نزدیک اس کے معنی ہیں پورا وصول کرنا اور ٹھیک لینا۔''(تفسیر عثمانی، ص ۷۴)۔حضرت شیخ الاسلام علامہ عثمانیؒ فرماتے ہیں:''موت اور نوم میں لفظ ''توفی'' کا استعمال قرآن کریم ہی نے شروع کیا ہے۔جاہلیت والے تو عموماً اس حقیقت سے ہی ناآشنا تھے کہ موت یا نوم میں خدا تعالیٰ کوئی چیز آدمی سے وصول کر لیتا ہے اسی لیے لفظ ''توفی'' کا استعمال موت اور نوم پر اُن کے یہاں شائع نہ تھا قرآن کریم نے موت وغیرہ کی حقیقت پر روشنی ڈالنے کے لیے اول اس لفظ کا استعمال شروع کیا۔تو اسی کو حق ہے کہ موت و نوم کی طرح اخذ روح مع البدن کے نادر مواقع میں بھی اسے استعمال کر لے۔''(تفسیر عثمانی، ص ۷۴)۔قرآن مجید کی ایک آیت میں تو توفی کے معنی ''لے لینے، قبض کر لینے'' کے بہت واضح ہیں چنانچہ فرمایا:﴿ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِي الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰىهُنَّ الْمَوْتُ ﴾(4/النساء:15)''پھر اگر وہ گواہی دیویں تو بند رکھو اُن عورتوں کو گھروں میں یہاں تک کہ اٹھا لیوے اُن کو موت۔''(ترجمہ شیخ الہندؒ)۔

تَوَفَّ فعل امر ہے۔تو موت دے۔﴿ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ كَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَ تَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ﴾(3/آل عمران:193)''اے ہمارے رب پس تو بخش دے ہمارے لیے ہمارے گناہوں کو اور تو دور کر دے ہم سے ہماری برائیوں کو اور تو موت دے ہم کو نیک لوگوں کے ساتھ۔''

يُتَوَفّٰى ج: يُتَوَفَّوْنَ۔مضارع مجہول کا صیغہ ہے۔اسے لیا جاتا ہے۔اُسے موت دی جاتی ہے۔﴿ وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى ﴾ (22/الحج:5)''اور کوئی تم میں سے قبضہ کر لیا جاتا ہے۔''(ترجمہ شیخ الہندؒ)''اور تم میں سے وہ بھی ہیں جو مر جاتے ہیں۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔﴿ وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ ﴾(2/البقرۃ:243)''اور وہ جنہیں موت دی جائے تم میں سے یعنی تم میں سے جو لوگ فوت ہو جائیں۔''

مُتَوَفِّ اسم الفاعل ہے۔حق پورا لینے والا۔موت دینے والا۔﴿ اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰۤى اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَ رَافِعُكَ اِلَيَّ ﴾(3/آل عمران:55)''جب کہا اللہ نے اے عیسیٰؑ میں پورا لینے والا ہوں آپ کو اور اٹھانے والا ہوں آپ کو اپنی طرف۔''

(استفعال) **اِسْتِيْفَاءً** پورا پورا لینا۔﴿ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ﴾(83/المطففین:2)''وہ جب لوگوں سے ناپ لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں۔''

عَهْدٌ(ع ھ د):البقرۃ آیت 27 دیکھیں۔

ر ھ ب

(س) **رَهْبَةً** کسی کی عظمت اور جلالت کے تصور سے دل پر لرزش اور کپکپی طاری ہونا۔خوف محسوس کرنا۔ڈرنا۔﴿ وَ فِيْ نُسْخَتِهَا هُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُوْنَ ﴾(7/الاعراف:154)''اور ان تختیوں کی تحریر میں ہدایت ہے اور رحمت ہے ان لوگوں کے لیے جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔''

اِرْهَبْ ج: اِرْهَبُوْا۔فعل امر ہے۔تو ڈر۔آیت زیر مطالعہ۔

رَهَبٌ، رَهْبَةٌ، رَهْبٌ اسم ذات ہیں۔ڈر۔خوف۔ایسا ڈر یا خوف جو کسی کی عظمت اور جلالت کے تصور سے دل پر طاری ہو اور امام راغبؒ کے مطابق ایسا ڈر یا خوف جس میں احتیاط اور بے چینی دونوں شامل ہوں۔﴿ اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَ يَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّ رَهَبًا ﴾(21/الانبیاء:90)''بے شک وہ لوگ باہم سبقت کرتے تھے بھلائی میں اور ہم کو پکارتے تھے توقع کرتے ہوئے اور ڈرتے ہوئے۔''﴿ لَاَنْتُمْ اَشَدُّ رَهْبَةً فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنَ اللّٰهِ ﴾(59/الحشر:13)''بے شک تم لوگ زیادہ ہو بلحاظ خوف کے ان کے سینوں میں بنسبت اللہ کے۔''﴿ وَّ اضْمُمْ اِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ ﴾(28/القصص:32)''اور ملا لیں اپنی طرف اپنے بازو خوف سے (بچنے کے لیے)۔''

رَاهِبٌ ج: رُهْبَانٌ۔اللہ سے بہت ڈرنے والا۔درویش۔تارکِ دنیا۔یہود میں جو لوگ خدا ترس تھے ان کو راہب کہتے تھے۔یہ لوگ دنیا کے ہنگاموں سے الگ تھلگ رہتے اور اپنی خانقاہوں میں ذکر و فکر میں مصروف رہتے۔امت محمدیہ ﷺ میں جو لوگ خدا ترس ہیں ان کو متقی کہتے ہیں۔امام راغبؒ فرماتے ہیں کہ رُهْبَانٌ، واحد اور جمع دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔جب واحد استعمال ہو تو اس کی جمع رَهَابِيْنُ آتی ہے۔﴿ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَ رُهْبَانًا ﴾(5/الاعراف:82)''یہ اس لیے کہ ان میں عالم ہیں اور درویش ہیں۔''

رَهْبَانِيَّةٌ اِسم ذات ہے۔ اللہ کے ڈر سے ترکِ دنیا۔ گوشہ نشینی۔ صاحبؒ ضیاء القرآن فرماتے ہیں: ''رہبانیت میں دولغتیں ہیں: رَهْبَانِيَّت (بفتح را) اور رُهْبَانِيَّت (بضم را) پہلی صورت میں یہ رَهْب سے ماخوذ ہوگا جس کا معنی خوف اور ڈر ہے اور دوسری صورت میں یہ رُهْبَان (جو رَاهِبٌ کی جمع ہے) کی طرف منسوب ہوگا۔ پہلی صورت میں اس کا معنی ہے وہ مسلک اور وہ طرزِ حیات جس کی بنیاد خوف اور ڈر پر ہے۔ دوسری صورت میں اس کا معنی ہوگا ان لوگوں کا مسلک اور طرزِ زندگی جو ہر وقت ڈرنے والے اور خوفزدہ رہنے والے ہیں۔ امام راغبؒ لکھتے ہیں: (رہبانیت کا مطلب ہے) فرطِ خوف سے عبادات وریاضات میں حد درجہ غلو کرنا۔ علامہ پانی پتیؒ اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: (رہبانیت کا مطلب ہے) عبادت وریاضت میں مبالغہ، لوگوں سے قطع تعلق، جائز اور مباح خواہشات کو بھی ترک کردینا۔ علامہ ابن منظورؒ فرماتے ہیں: (رہبانیت کا مطلب ہے) دنیا کے مشاغل کو ترک کردینا، اس کی لذتوں کو نظر انداز کردینا، اہل دنیا سے عزلت گزینی، اپنے آپ کو طرح طرح کی مشقتوں میں مبتلا کردینا۔'' (ضیاء القرآن، ج۵ ص:۱۲۷، تلخیصاً)۔ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ فرماتے ہیں: ''رہبانیت کے معنی ترکِ لذات وتحمل شدائد (یعنی مصیبتوں اور تکلیفوں کو برداشت کرنا) کے ہیں اور بعض اہل لغت کے نزدیک محض زیادتی اور افراط کے۔'' (تفسیر ماجدیؒ، ص ۱۰۷۴)۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں: ''شریعت حقہ اسلامیہ نے اس اعتدال فطری سے متجاوز رہبانیت کی اجازت نہیں دی۔ ہاں بعض احادیث میں وارد ہوا ہے کہ 'اس اُمت کی رہبانیت جہاد فی سبیل اللہ ہے' کیونکہ مجاہد اپنے سب حظوظ وتعلقات سے واقعی الگ ہوکر اللہ کے راستہ میں نکلتا ہے۔'' (تفسیر عثمانی، ص ۷۱۸)۔ ﴿وَرَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ﴾ (57/الحدید:27) ''اور دنیا سے کنارہ کشی! انہوں نے ابتدا کی اس کی، ہم نے اس کو فرض نہیں کیا ان پر۔''

(افعال) اِرْهَابًا کسی پر رعب ڈالنا۔ دھاک بٹھانا۔ کسی کو خوف زدہ کرنا۔ ﴿تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ﴾ (8/الانفال:60) ''تم لوگ رعب رکھتے ہو اس سے اللہ کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں پر۔''

(استفعال) اِسْتِرْهَابًا خوفزدہ کرنا۔ ڈرانا۔ ﴿سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ﴾ (7/الاعراف:116) ''انہوں نے جادو کیا لوگوں کی آنکھوں پر اور ان کو خوفزدہ کیا۔''

ترکیب 'یَا' حرف ندا ہے۔ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مرکب اضافی ہے۔ اِبْنٌ کی جمع سالم حالت رفع میں بَنُوْنَ اور نصب وجر میں بَنِيْنَ آتی ہے۔ یہ جب مضاف بنتے ہیں تو نون اعرابی گر جاتا ہے۔ اصل مرکب تھا بَنُوْ اِسْرَآءِيْلَ۔ اس پر حرف ندا ''یَا'' داخل ہوا تو اس نے مضاف کو نصب دی۔ اس طرح یہ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ہوگیا۔ اِسْرَآءِيْلَ مضاف الیہ ہونے کی وجہ سے حالت جر میں ہے اور چونکہ یہ غیر منصرف ہے اس لیے حالت جر میں 'ل' پر ایک زبر آئی۔

اُذْكُرُوْا فعل امر ہے اور نِعْمَتِيَ اس کا مفعول ہے۔ یہ دراصل نِعْمَتِيْ تھا۔ قاعدہ یہ ہے کہ یائے متکلم کو آگے ملانے کے لیے اگر حرکت دینی ہو تو اسے فتحہ دیتے ہیں۔ چنانچہ آگے اَلَّتِيْٓ سے ملانے کے لیے نِعْمَتِيْ کے بجائے نِعْمَتِيَ استعمال ہوا۔ اَلَّتِيْٓ اسم موصول ہے اور اَنْعَمْتُ، ماضی میں واحد متکلم کا صیغہ ہے اور اس کا فاعل اس میں ضمیر اَنَا ہے جو اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اور عَلَيْكُمْ، جار مجرور متعلق فعل ہے۔ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ، صلہ ہے اَلَّتِيْٓ کا اور صلہ اور موصول مل کر صفت ہے نِعْمَةٌ کی۔

'وَ' حرف عطف ہے اور اَوْفُوْا عطف ہے اُذْكُرُوْا پر۔ اَوْفُوْا فعل امر ہے۔ اس میں شامل اَنْتُمْ کی ضمیر اس کا فاعل ہے اور بِعَهْدِيْٓ میں 'بِ' حرف جار اور عَهْدِيْ، مضاف، مضاف الیہ ہے اور یہ مرکب جاری متعلق فعل ہے۔ آگے اُوْفِ دراصل مضارع میں واحد متکلم کا صیغہ اُوْفِيْ تھا۔ جواب امر ہونے کی وجہ

سے مضارع مجزوم ہوا تو ''ی'' گر گئی۔ اس لیے اُوْفِ استعمال ہوا اور بِعَهْدِكُمْ متعلق ہے اُوْفِ سے۔

آگے اِيَّایَ میں ی متکلم مفعول بہ ہے اِرْهَبُوْا کا جس کو تاکید کے لیے پہلے لایا گیا ہے بالکل اسی طرح جیسے سورہ الفاتحہ میں اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ہے۔ اور یاد کر لیجئے کلمہ 'اِيَّا' اس وقت استعمال ہوتا ہے جب ضمائر منصوبہ متصلہ یعنی ضمیر مفعولی کو منفصل لکھنا ہو۔ اس سے عموماً تاکید کا مفہوم پیدا ہوتا ہے۔ فَارْهَبُوْنِ میں 'فَ' زائدہ ہے اور اِرْهَبُوْا فعل امر ہے اور اس کا فاعل اس میں شامل ضمیر اَنْتُمْ ہے اور آگے 'نِ' دراصل نونِ وقایہ ہے۔ یہ جملہ اِرْهَبُوْیَ تھا۔ اِرْهَبُوْا کے واوالجمع کا الف، ضمیر لگنے کی وجہ سے گر گیا۔ قاعدہ یہ ہے کہ جب امر کے صیغے کے بعد 'ی' متکلم آئے تو اس پر ایک 'ن' داخل کر دیتے ہیں جسے 'ن' وقایہ کہتے ہیں۔ وقایہ کا معنی ہے 'بچانا' اور یہ نون فعل امر کے آخری حرفِ ساکن اور یاء ساکن کے ذریعے پیدا ہونے والے ''التقاء ساکنین'' سے بچانے کے لیے لگتا ہے۔ چنانچہ 'ن' وقایہ داخل کرنے کے بعد یہ اِرْهَبُوْنِیْ بن گیا۔ اور جب ضمیر مفعولی نِیْ کے آگے وقف کرنا ہو تو عموماً اس کی 'ی' کو گرا دیتے ہیں اور 'ن' وقایہ کو بڑا کر کے لکھ دیتے ہیں۔ اس کی پہچان 'ن' کی زیر سے ہوتی ہے۔ یہاں ایک بات اور نوٹ کیجئے، اگر جملہ یہ ہوتا اِيَّایَ فَارْهَبُوْا تو بھی اس میں تاکید کا مفہوم ہوتا لیکن یہاں ضمیر منفصل کے بعد فعل امر اِرْهَبُوْا کے ساتھ ایک اور ضمیر مفعولی لائی گئی جس سے نہایت تاکید کا اسلوب پیدا ہوا ہے۔ اردو زبان میں اس اسلوب سے قریب ترین ترجمانی یہ ہوگی ''اور مجھ ہی سے، مجھ ہی سے تم لوگ ڈرو۔'' (واللہ اعلم)

ترجمہ	يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ	اذْكُرُوْا	نِعْمَتِيَ	الَّتِيْٓ	اَنْعَمْتُ
البقرۃ:40	اے اسرائیل کے بیٹو	تم لوگ یاد کرو	میری نعمت کو	جس کو	میں نے انعام کیا

عَلَيْكُمْ	وَ اَوْفُوْا	بِعَهْدِيْٓ	اُوْفِ	بِعَهْدِكُمْ ۚ
تم لوگوں پر	اور تم لوگ پورا کرو	میرے (ساتھ کیے ہوئے) وعدہ کو	تو میں پورا کروں گا	تمہارے (ساتھ کیے ہوئے) وعدہ کو

وَاِيَّایَ	فَارْهَبُوْنِ ۝۴۰
اور صرف مجھ سے ہی	تم لوگ ڈرو مجھ سے

نوٹ:1 اس آیت سے بنواسرائیل کی فردِ جرم کا آغاز ہو رہا ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے چند بنیادی باتیں ذہن نشین ہونا ضروری ہیں۔

(۱) ہم سے پہلے بنواسرائیل امت مسلمہ کے عہدے پر فائز تھے۔ پھر انہیں معزول کر کے امت محمد ﷺ کو اس عہدے پر فائز کیا گیا۔ چنانچہ اس فردِ جرم (Charge Sheet) کے ذریعے بنواسرائیل پر ان کی معزولی کے سلسلہ میں حجت قائم کی گئی ہے۔

(۲) ہمارے حوالے سے اس کا مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے کان کھول رہا ہے کہ اگر تم ایسے کام کرو گے تو تم بھی انہی کی طرح دنیا اور آخرت میں ذلیل و رسوا ہو گے۔ اس لیے یہ بات خوب اچھی طرح ذہن نشین کر لیں کہ اس فردِ جرم کا مطالعہ کرتے وقت اگر ہم بنواسرائیل کو برا بھلا کہتے رہے اور خود کو پارسا سمجھتے رہے تو پھر ہم ہدایت سے محروم رہیں گے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس فردِ جرم کے آئینے میں ہم اپنے اعمال کا جائزہ لیتے رہیں اور اپنی اصلاح کی فکر کریں۔ اسی صورت میں یہ فردِ جرم قرآن مجید میں نقل کرنے کا مقصد پورا ہوگا۔

(۳) بنواسرائیل کی فردِ جرم میں بھی اور قرآن مجید کے دیگر مقامات میں جہاں تاریخی واقعات کا ذکر ہے، وہاں عام طور پر آپ کو ترتیب زمانی نہیں ملے گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تاریخی واقعات اس ترتیب سے نہیں بیان کیے گئے جس ترتیب سے وہ وقوع پذیر ہوئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید تاریخ کی تعلیم دینے والی کتاب نہیں ہے۔ بلکہ یہ ہدایت دینے کے لیے نازل کی گئی ہے۔ اور اس مقصد کے تحت تاریخی واقعات کو استدلال یا ثبوت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ چنانچہ تاریخی حوالہ دیتے وقت موضوع سے اس کی مناسبت کو پیش نظر رکھا گیا ہے نہ کہ زمانے کی ترتیب کو۔ (از لطف الرحمٰن خان صاحب)

نوٹ 2: آیت زیرِ مطالعہ میں جس عہد کا ذکر آیا ہے اِس کی تفصیل بعض علماء کے نزدیک آلِ عمران کی آیت 81 میں بیان کی گئی ہے، بعض علماء کے نزدیک المائدہ کی آیت 12 میں اور بعض علماء کے مطابق اس عہد کا ذکر تورات کی کتاب استثناء، باب 15، آیت نمبر 18، 19 میں آیا ہے۔ (واللہ اعلم)۔

آیت:41

﴿وَ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَ لَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهٖ ۠ وَ لَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۡ وَّ اِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ ﴿۴۱﴾﴾

اٰمِنُوْا (ء م ن): البقرۃ آیت 3 دیکھیں۔	اَنْزَلْتُ (ن ز ل): البقرۃ آیت 4 دیکھیں۔
مُصَدِّقًا (ص د ق): البقرۃ آیت 23 دیکھیں۔	تَكُوْنُوْٓا (ك و ن): البقرۃ آیت 10 دیکھیں۔

ء و ل

(ن) اَوْلًا اور مَآلًا: لوٹنا۔ کسی چیز کا اپنے اصل کی طرف واپس ہونا۔ اس مادہ سے کوئی فعل قرآن مجید میں استعمال نہیں ہوا۔

اٰلٌ: اسم صفت ہے۔ کسی کے ساتھ تعلق والا۔ ساتھی۔ پیروکار۔ Follower۔ اٰلٌ کی اصل کیا ہے اس کے متعلق اہل علم کا اختلاف ہے۔ اکثر علماء کی رائے یہ ہے کہ یہ دراصل اَوْلٌ تھا۔ جس کے معنیٰ لوٹنے کے ہیں۔ 'وْ' کو الف سے بدلا گیا تو اَالٌ بن گیا۔ اس کو پھر الف کے اوپر کھڑی زبر کے ساتھ اٰلٌ لکھا جاتا ہے اور معنیٰ یہ ہوئے کہ جو شخص کسی کی طرف اس کی قرابت اور دوستی کی وجہ سے لوٹے وہ اس کے اٰلٌ میں سے ہے۔ اٰلٌ کا لفظ ہمیشہ اسم عَلَم کی طرف مضاف ہوتا ہے۔ اس کی اضافت غیر ذوی العقول، اسم نکرہ یا ضمیر کی طرف جائز نہیں۔ چنانچہ اٰلُ رَجُلٍ بولنا جائز نہیں۔ اس کی اضافت کسی قابلِ تعظیم اور معروف ہستی کی طرف ہوتی ہے جیسے اٰل محمدؐ، اٰل ابراہیمؑ اور اٰل عمران وغیرہ۔ لیکن اٰل الخیاط یا اٰل الحجام نہیں بولتے۔ اور فرعون چونکہ کوئی قابلِ تعظیم ہستی نہیں اس لیے جب اٰل فرعون کہا جائے تو وہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ فرعون اسم عَلَم بھی ہے اور اپنے کفر کی وجہ سے ایک معروف ہستی بھی ہے۔ عربی زبان میں اٰل کے قریب المعنی ایک لفظ اَهْلٌ بھی استعمال ہوتا ہے۔ لیکن اِن دونوں میں کچھ فرق ہیں۔ مثلاً: (1) اَهْلٌ کا دائرہ اس لحاظ سے محدود ہے کہ اس میں کسی شخص کے صرف گھر والے یعنی اس کے بیوی بچے سمجھے جاتے ہیں خواہ وہ اس شخص کے ساتھی ہوں یا نہ ہوں، جبکہ کسی شخص کی اٰل میں وہ سب لوگ سمجھے جاتے ہیں جو اس کے ساتھی، مددگار اور اس سے ذہنی یگانگت رکھنے والے ہوں خواہ وہ اس کے رشتے دار ہوں یا نہ ہوں۔ چنانچہ اہل فرعون سے صرف اس کے گھر والے مراد ہوں گے اور اٰل فرعون سے مراد اس کے گھر میں سے اس سے متفق رشتے دار، اس کے اہل کار اور وہ تمام لوگ شامل ہوں گے جو حضرت موسیٰؑ کے مقابلے میں فرعون کے ساتھی اور مددگار تھے۔ حضرت آسیہ سلام علیہا (فرعون کی بیوی)، فرعون کے اہل میں سے تو ہیں لیکن اس کی اٰل میں شامل نہیں۔ اسی طرح حضرت موسیٰؑ کی قوم میں سے قارون، اٰل فرعون میں سے تھا۔ اسی سے سمجھا جا سکتا ہے کہ اٰل محمدؐ سے ہر وہ شخص خارج ہے جو حضورؐ کے طریقے پر نہ ہو،

خواہ وہ خاندانِ رسالت کا کوئی فرد ہی کیوں نہ ہو۔ اور اس میں ہر وہ شخص داخل ہے جو حضورؐ کے نقشِ قدم پر چلتا ہو چاہے اس کا حضورؐ سے کوئی نسبی تعلق نہ بھی ہو۔ (۲) اَھْلٌ کا دائرہ اس لحاظ سے وسیع ہے کہ یہ غیر ذوی العقول، معرفہ، نکرہ اور ضمیر کی طرف بھی مضاف ہو جاتا ہے۔ کسی شہر کی طرف نسبت کریں گے تو بھی اَھْلٌ استعمال کریں گے جیسے اہل مدینہ، اہل بلد وغیرہ۔ کسی پیشے کی طرف نسبت کریں گے تو بھی اَھْلٌ استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً اھل الخیاط، (درزی کے گھر والے) اھل الحجام (نائی کے گھر والے) وغیرہ۔ لیکن اٰل البلد یا اٰل الارض وغیرہ کے الفاظ نہیں بولے جاتے۔

اَوَّلُ پہلا۔ ج: اَوَّلُوْنَ۔ اَوَّلِیْنَ۔ مؤنث: اُوْلٰی۔ پہلی۔ یہ اَفعل التفضیل میں اَفْعَلُ کے وزن پر صیغہ صفت ہے۔ اصل میں اَءْوَلُ بنتا ہے۔ پھر مہموز کے لازمی قاعدے کے تحت اس کو اَوْاَلُ لکھا جاتا ہے لیکن کثرتِ استعمال کی وجہ سے ہمزہ کا واؤ میں ادغام کر کے اَوَّلُ لکھا اور بولا جاتا ہے۔ ﴿ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴾ (7/الاعراف:143) ''اور میں ایمان لانے والوں کا پہلا ہوں۔'' ﴿ اِنَّ ھٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰی ﴾ (87/الاعلیٰ:18) ''بے شک یہ پہلے صحیفوں میں ہے۔'' اَوَّلُ کا استعمال تین طرح سے ہوتا ہے۔ (1) عددی ترتیب کے لحاظ سے یعنی وہ عدد جس سے پہلے کوئی عدد نہیں۔ اس لحاظ سے اوّل کے بعد ثانی۔ پھر ثالث وغیرہ آتا ہے۔ (2) ترتیب کار یا نظامِ صناعی کے لحاظ سے جیسے اَلْاَسُّ اَوَّلًا ثُمَّ الْبِنَاءُ یعنی پہلے بنیاد رکھی جائے گی پھر تعمیر ہوگی۔ (3) ترتیب زمانی کے لحاظ سے۔ اس لحاظ سے اوّل کی ضد اٰخِرٌ بمعنی پچھلا ہے۔ اور اُوْلٰی (پہلی۔ دنیا) کی ضد اٰخِرَت (پچھلی۔ اخروی زندگی) ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ قُلْ اِنَّ الْاَوَّلِیْنَ وَالْاٰخِرِیْنَ ۙ لَمَجْمُوْعُوْنَ ۙ اِلٰی مِیْقَاتِ یَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴾ (56/الواقعۃ:49، 50) ''آپ فرما دیجیے بے شک اگلوں کو بھی اور پچھلوں کو بھی سب کو جمع کیا جائے گا ایک مقررہ وقت پر ایک جانے ہوئے دن میں۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)

اگر اللہ تعالیٰ کے لیے استعمال ہو جیسے ھُوَ الْاَوَّلُ تو اس سے مراد وہ ذات ہوتی ہے جس سے پہلے کوئی چیز موجود نہ ہو۔ اور یہ بھی نوٹ کیجئے کہ اَوَّلُ کا لفظ عموماً جمع کی طرف مضاف ہوتا ہے۔ جیسے اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ یا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِیْنَ وغیرہ۔

اُولُوْا والے۔ یہ جمع ہے اور اس کی واحد نہیں آتی۔ یہ ہمیشہ مضاف استعمال ہوتا ہے اور حالت رفع میں اُولُوْا اور حالت نصب وجر میں اُولِیْ لکھا جاتا ہے۔ ﴿ قَالُوْا نَحْنُ اُولُوْا قُوَّۃٍ ﴾ (27/النمل:33) ''انہوں نے کہا ہم قوت والے ہیں۔'' ﴿ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىھُمَا بَعَثْنَا عَلَیْکُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِیْ بَاْسٍ شَدِیْدٍ ﴾ (17/بنی اسرائیل:5) ''پھر جب آیا پہلا وعدہ بھیجے ہم نے تم پر اپنے بندے سخت لڑائی والے۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)۔

مؤنث: اُولَاتٌ۔ والیاں۔ حالت رفع میں اُولَاتُ اور حالت نصب وجر میں اُولَاتِ لکھا جاتا ہے۔ ﴿ وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُھُنَّ اَنْ یَّضَعْنَ حَمْلَھُنَّ ؕ ﴾ (65/الطلاق:4) ''اور حمل والیاں یعنی حاملہ عورتوں کی میعاد ان کے بچہ جننے تک ہے۔''

اُولَآءِ یہ سب۔ جمع قریب کے لیے اسم اشارہ ہے۔ مذکر مؤنث دونوں کے لیے آتا ہے۔ ﴿ ھٰاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَھُمْ وَلَا یُحِبُّوْنَکُمْ ﴾ (3/آل عمران:119) ''سنو! تم تو یہ ہو کہ محبت کرتے ہو ان سے اور وہ محبت نہیں کرتے تم سے۔'' ﴿ قَالَ ھُمْ اُولَآءِ عَلٰٓی اَثَرِیْ ﴾ (20/طٰہٰ:84) ''حضرت موسیٰؑ نے عرض کی وہ یہ ہیں میرے پیچھے۔'' (نوٹ: اُولَآءِ

کے شروع میں 'ھا' داخل کرنے سے یہ ھٰاُولَاءِ بن جاتا ہے۔ جسے پھر ھٰۤؤُلَاۤءِ لکھا جاتا ہے اور یہ بھی جمع قریب کے لیے اشارہ ہے۔ اِس کے آخر میں کاف خطاب لگانے سے یہ اُولَاءِكَ بن جاتا ہے۔ جسے پھر اُولٰٓئِكَ لکھا جاتا ہے اور یہ اشارہ بعید کے لیے استعمال ہوتا ہے۔)

(تفعیل) تَاْوِیْلًا کسی چیز کو اس کے اصل کی طرف لوٹانا۔ کسی بات یا واقعہ کا انجام بتانا۔ اس باب سے بھی قرآن مجید میں فعل استعمال نہیں ہوا۔

تَاْوِیْلٌ مصدر کے علاوہ اسم ذات بھی ہے۔ کسی چیز کا آخری انجام۔ اخیر نتیجہ۔ خواب کی تعبیر۔ کسی شے کو خواہ وہ شے علم ہو یا فعل، اس کی اصل مراد کی طرف لوٹانے کا نام تاویل ہے۔ علم کی مثال جیسے فرمایا: ﴿وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ﴾ (3/آل عمران:7) ''حالانکہ کوئی اس کا صحیح مطلب نہیں جانتا سوائے اللہ کے۔'' اور فعل کی مثال: ﴿ھَلْ یَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِیْلَهٗ﴾ (7/الاعراف:53) ''ان لوگوں کو اور کسی بات کا انتظار نہیں صرف اس کے اخیر نتیجے کا انتظار ہے۔'' اس آیت کے تحت مولانا عبدالماجد دریا بادیؒ فرماتے ہیں: ''تَاْوِیْلَهٗ۔ یعنی وعدۂ سزا کے عملی ظہور اور قرآن کے بتائے ہوئے مصداق کے۔ تاویل سے مراد وعید قرآنی کے آخری نتیجہ کے ہیں۔'' اور صاحبؒ احسن البیان فرماتے ہیں: ''تاویل کا مطلب ہے، کسی چیز کی اصل حقیقت اور انجام۔ یعنی کتاب الٰہی کے ذریعے سے وعدے، وعید اور جنت ودوزخ وغیرہ کا بیان تو کر دیا گیا تھا۔ لیکن یہ اس دنیا کا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے منتظر تھے، سواب وہ انجام ان کے سامنے آ گیا۔'' ﴿ذٰلِكَ خَیْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِیْلًا﴾ (4/النساء:59) ''یہ بہتر ہے اور اچھا ہے بلحاظ انجام کار کے۔'' ﴿وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِیُوْسُفَ فِی الْاَرْضِ وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ﴾ (12/یوسف:21) ''اور اس طرح ہم نے سکونت دی یوسفؑ کو زمین میں اور تاکہ ہم سکھائیں ان کو خوابوں کی تعبیر۔''

كَافِرٌ (ك ف ر): البقرۃ آیت 6 دیکھیں۔ تَشْتَرُوْا (ش ر ی): البقرۃ آیت 16 دیکھیں۔ اٰیٰتٌ: نوٹس کے آغاز میں دیکھیں۔

ث م ن

(ض۔ن) ثَمْنًا کسی چیز کا آٹھواں حصہ لینا۔

(ک) ثَمَانَةً کسی چیز کا قیمتی ہونا۔

ثَمَنٌ اسم ذات ہے۔ قیمت۔ بیچنے والا جو کچھ فروخت شدہ چیز کے بدلے میں لیتا ہے خواہ نقد ہو یا سامان، وہ ثمن کہلاتا ہے اور ہر وہ چیز جو کسی چیز کے عوض حاصل کی جائے اُسے بھی ثمن کہتے ہیں۔ ﴿وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ﴾ (12/یوسف:20) ''اور انہوں نے بیچا اس کو کم قیمت میں۔''

ثَمَانِیَةٌ اور ثَمَانٍ یا ثَمَانِیْ آٹھ (۸)۔ اسم عدد ہے۔ ثَمَانِیَةٌ مذکر معدود کے لیے آتا ہے اور ثَمَانِیْ مونث معدود کے لیے آتا ہے۔ ﴿وَ اَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِیَةَ اَزْوَاجٍ﴾ (39/الزمر:6) ''اور اس نے اتارے تمہارے لیے چوپایوں میں سے آٹھ جوڑے۔'' ﴿اَنْ تَاْجُرَنِیْ ثَمٰنِیَ حِجَجٍ﴾ (28/القصص:27) ''کہ تم ملازمت کرو میری آٹھ سال۔''

ثَمَانُوْنَ اور ثَمَانِیْنَ اسّی (۸۰)۔ ثَمَانُوْنَ (رفع)۔ ثَمَانِیْنَ (نصب اور جر) ﴿فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِیْنَ جَلْدَةً﴾ (24/النور:4) ''تو تم لوگ مارو ان کو اسّی کوڑے۔''

ثَامِنٌ ترتیب میں آٹھواں۔﴿وَ يَقُوْلُوْنَ سَبْعَةٌ وَّ ثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ؕ﴾(18/الکہف:22)''وہ لوگ کہیں گے سات ہیں اور آٹھواں ان کا کتا ہے۔''

ثُمُنٌ آٹھواں حصہ یعنی 1/8۔﴿فَاِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ﴾(4/النساء:12)''پھر اگر تمہاری اولاد ہے تو ان کے لیے آٹھواں حصہ ہے اس میں سے جو تم نے چھوڑا۔''

ق ل ل

(ض) **قِلَّةٌ** (۱) کسی چیز کا کم ہونا۔(۲) کسی چیز کا بلند ہونا (ہلکی چیز اوپر اٹھتی ہے)۔﴿وَ لِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ ؕ﴾(4/النساء:7)''اور عورتوں کے لیے ایک حصہ ہے اس میں سے جو چھوڑا والدین اور قرابت داروں نے، خواہ تھوڑا ہو یا زیادہ۔''

قَلِيْلٌ ج: قَلِيْلُوْنَ- فَعِيْلٌ کے وزن پر صفت ہے۔کم۔تھوڑا۔﴿وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلٌ ۝﴾(11/ھود:40)''اور ایمان نہیں لائے اس کے ساتھ مگر تھوڑے سے لوگ۔''﴿اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَشِرْذِمَةٌ قَلِيْلُوْنَ ۝﴾(26/الشعراء:54)''اور یقیناً یہ گروہ بہت ہی کم تعداد میں ہے۔''

قَلِيْلَةٌ قَلِيْلٌ کی مؤنث۔تھوڑی۔﴿كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ﴾(2/البقرۃ:249)''بارہا چھوٹی جماعتیں غالب آئی ہیں بڑی جماعتوں پر اللہ کے حکم سے۔''

اَقَلُّ اسم التفضیل ہے۔کسی سے کم یا سب سے کم۔﴿فَسَيَعْلَمُوْنَ مَنْ اَضْعَفُ نَاصِرًا وَّ اَقَلُّ عَدَدًا ۝﴾(72/الجن:24)''پس وہ لوگ جان لیں گے کہ کون زیادہ کمزور ہے بلحاظ مددگار کے اور زیادہ کم ہے بلحاظ گنتی کے۔''

(افعال) **اِقْلَالًا** کسی کو ہلکا پانا۔ہلکا سمجھنا۔بلند کرنا۔اٹھا لینا۔﴿حَتّٰٓى اِذَآ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا﴾(7/الاعراف:57)''یہاں تک کہ جب بھی وہ ہوا بلند کرتی ہے بھاری بادل کو''امام راغبؒ فرماتے ہیں:''یہاں اَقَلَّتْ کہہ کر اشارہ فرمایا ہے کہ وہ بادل جن کو (ہوا) اٹھا کر لاتی ہے اگرچہ فی نفسہ بھاری ہوتے ہیں مگر ہوا کی قوت کے اعتبار سے نہایت ہلکے ہیں۔''(مفردات القرآن، ۲ص ۸۶۴)۔اور مولانا عبدالماجد دریابادیؒ فرماتے ہیں:''اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا یعنی ہوا بادل کے اجزاء کو باہم ملائے رہتی اور انہیں فضا میں معلق رکھتی ہے۔''

(تفعیل) **تَقْلِيْلًا** کم کرنا۔﴿وَ يُقَلِّلُكُمْ فِيْٓ اَعْيُنِهِمْ﴾(8/الانفال:44)''اور اس نے کم کیا تمہیں ان کی آنکھوں میں۔''

اِتَّقُوْا (و ق ی): البقرۃ آیت 2 دیکھیں۔

ترکیب

''وَ'' عطف کا ہے۔اٰمِنُوْا فعل امر ہے اور یہ گزشتہ آیت میں اَوْفُوْا پر عطف ہے۔اس کا فاعل اس میں شامل اَنْتُمْ کی ضمیر ہے۔بِمَا میں 'بِ' حرف جار ہے، مَا اسم موصول ہے اور اَنْزَلْتُ، صلہ ہے۔صلہ اور موصول مل کر مجرور ہیں 'بِ' کی وجہ سے اور یہ مرکب جاری متعلق ہے اٰمِنُوْا سے اور اس میں اشارہ ہے قرآن کی طرف۔مُصَدِّقًا حال ہے، اسم موصول 'مَا' کا اور آگے مرکب جاری لِمَا مَعَكُمْ متعلق ہے مُصَدِّقًا سے اور اس میں اشارہ ہے تورات کی طرف۔''وَ'' عطف کا ہے اور لَا تَكُوْنُوْٓا، كَانَ کا فعل نہی ہے، اس کا اسم اس میں شامل اَنْتُمْ کی ضمیر ہے اور اَوَّلَ كَافِرٍ بِهٖ اس کی خبر ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس کا مضاف اَوَّلَ حالت نصب میں ہے۔اَوَّلَ کا لفظ عموماً جمع کی طرف مضاف ہوتا ہے مثلاً اوّل المسلمین، اوّل المومنین وغیرہ لیکن یہاں کافرین یا کفّار کی بجائے کافر واحد آیا ہے اس کا جواب صاحب تفسیر ماجدیؒ اور صاحب تفسیر حقانی کے مطابق یہ ہے کہ کافر صورۃً واحد ہے لیکن معنیً جمع ہے اور تقدیر کلام میں

ایک مضاف محذوف ہے یعنی اَوَّلَ فَرِيْقٍ كَافِرٍۢ بِهٖ یعنی سب سے پہلے انکار کرنے والا گروہ نہ بنو۔ بِهٖ میں ضمیر قرآن کے لیے ہے۔ آگے وَلَا تَشْتَرُوْا میں وَ عطف کا ہے اور لَا تَشْتَرُوْا ، لَا تَكُوْنُوْٓا پر عطف ہے۔ لَا تَشْتَرُوْا فعل نہی اور اَنْتُمْ کی ضمیر اس کا فاعل ہے۔ بِاٰيٰتِيْ متعلق فعل ہے۔ اٰيٰتِيْ پر بِ کا صلہ بتا رہا ہے کہ اس کے بدلے کچھ حاصل کرنے سے منع کیا ہے۔ ثَمَنًا قَلِيْلًا مرکب توصیفی مفعول بنفسہ آیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ وہ چیز ہے جس کو حاصل کرنے سے منع کیا ہے۔ آگے اِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ کی ترکیب بھی وہی ہے جو گزشتہ آیات میں اِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ کی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ گزشتہ آیت میں فعل امر اِرْهَبُوْا تھا، یہاں اِتَّقُوْا ہے۔

ترجمہ				
البقرۃ:41				

وَاٰمِنُوْا	بِمَآ	اَنْزَلْتُ	مُصَدِّقًا
اور تم لوگ ایمان لاؤ	اس (قرآن) پر جو	میں نے نازل کیا	اس حال میں کہ وہ تصدیق کرنے والا ہے

لِّمَا	مَعَكُمْ	وَلَا تَكُوْنُوْٓا	اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ۠
اس (تورات) کی جو	تمہارے ساتھ ہے	اور تم لوگ مت بنو	سب سے پہلے اس کا انکار کرنے والے

وَلَا تَشْتَرُوْا	بِاٰيٰتِيْ	ثَمَنًا قَلِيْلًا	وَاِيَّايَ
اور تم لوگ مت خریدو	میری آیات کے بدلے	تھوڑی قیمت کو	اور صرف مجھ سے ہی

فَاتَّقُوْنِ
مجھ ہی سے بچتے رہو/ مجھ ہی سے ڈرو

نوٹ :1 آیت مبارکہ میں یہود کو فرمایا وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ’’اور اے یہود تم اس قرآن کے پہلے انکار کرنے والے مت بنو‘‘ جبکہ مشرکین مکہ یہود سے پہلے حضورؐ کی دعوت کا انکار کر چکے تھے تو پھر ایسا کیوں فرمایا؟ اس کا جواب دو طرح سے دیا گیا ہے۔ پہلا یہ کہ اگرچہ مشرکین مکہ، یہود سے پہلے انکار کر چکے تھے مگر ان کا انکار جہالت اور نادانی کی وجہ سے تھا۔ جبکہ یہود حق کو خوب پہچانتے تھے اور ان کا انکار جانتے بوجھتے تھا۔ علامہ عثمانیؒ فرماتے ہیں: ’’یعنی قرآن کی دیدہ ودانستہ تکذیب کرنے والوں میں اوّل مت ہو کہ قیامت تک کے منکرین کا وبال تمہاری گردن پر ہو، اور مشرکین مکہ نے جو انکار کیا ہے وہ جہل اور بے خبری کے سبب کیا ہے دیدہ ودانستہ ہرگز نہ تھا اس میں تو اوّل تم ہی ہو گے اور یہ کفر پہلے کفر سے سخت تر ہے۔‘‘ (تفسیر عثمانیؒ ص۹)۔ اس کا دوسرا جواب یہ ہے کہ ہجرت کے بعد، مدینہ میں اہل کتاب (یہود ونصاریٰ) میں سے قرآن مجید اور حضورؐ کی رسالت کا پہلے انکار کرنے والے یہودی تھے اس لیے ایسے فرمایا۔ (واللہ اعلم)۔

نوٹ :2 تھوڑی قیمت پر فروخت نہ کرو، کا یہ مطلب نہیں کہ زیادہ معاوضہ مل جائے تو احکام الٰہی کا سودا کر لو۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ احکام الٰہی کے مقابلے میں دنیاوی مفادات کو اہمیت نہ دو۔ احکام الٰہی تو اتنے قیمتی ہیں کہ ساری دنیا کا مال ومتاع بھی ان کے مقابلے میں ثمن قلیل ہے۔

نوٹ :3 آیت نمبر 40 میں وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ فرمایا اور آیت زیر مطالعہ میں وَاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ فرمایا۔ دونوں کا ترجمہ عام طور پر ’’ڈرنا‘‘ سے کیا جاتا ہے۔ انہی کا ایک ہم معنی لفظ ہے خُشُوْع۔ ان تینوں لفظوں کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا امین احسن اصلاحیؒ فرماتے ہیں: ’’رہبت، تقویٰ، خشوع سب ایک ہی حقیقت کے مختلف مظاہر ہیں۔ کسی کے عظمت وجلال کے تصور سے دل پر جو لرزش اور کپکپی طاری ہوتی ہے وہ **رہبت** ہے۔ اس لرزش وکپکپی سے صاحب

عظمت وجلال کے لیے دل میں جو عجز وفروتنی اور پستی و نیاز مندی کی حالت پیدا ہوتی ہے اور طبیعت میں بے نیازی کی جگہ فقر کا اور گھمنڈ کی جگہ اخبات کا جو احساس ابھرتا ہے وہ **خشوع** ہے۔ اسی طرح اس صاحب عظمت وجلال کے قہر وغضب سے بچنے، اس کے مقرر کردہ حدود کی مخالفت سے احتراز اور اس کے احکام وآیات کی خلاف ورزی سے اجتناب واحتیاط کی جو بے چینی طبیعت میں پیدا ہوتی ہے اور جو خلوت وجلوت ہر جگہ آدمی کو بیدار اور چوکنا رکھتی ہے وہ **تقویٰ** ہے۔'' (تدبر قرآن، ج ۱ص ۱۸۲)

آیت:42

﴿وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۴۲﴾

ل ب س

(ض) **لَبْسًا** اس کا بنیادی مفہوم ہے کسی چیز کو چھپا دینا۔ پھر اسی مناسبت سے یہ لفظ کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے مثلاً خلط ملط کرنا۔ گڈمڈ کرنا۔ مشتبہ کرنا۔ کسی کام کے بارے میں شک وشبہ میں مبتلا ہو جانا۔ کسی کو کسی معاملے کے بارے میں شبہ میں ڈال دینا (عَلٰی کے صلے کے ساتھ)۔ ﴿ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ ﴾ (3/آل عمران:71) ''اے اہل کتاب تم لوگ کیوں گڈمڈ کرتے ہو حق کو باطل کے ساتھ۔'' ﴿ وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّ لَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ ۝۹ ﴾ (6/الانعام:9) ''اور اگر ہم رسول بنا کر بھیجتے کسی فرشتہ کو تو وہ بھی آدمی ہی کی صورت میں ہوتا اور اُن کو اُسی شبہ میں ڈالتے جس میں اب پڑ رہے ہیں۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)۔ لَبْسٌ کا لفظ لڑا دینا، بھڑا دینا کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ ﴿ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّ يُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ؕ ﴾ (6/الانعام:65) ''یا بھڑا دے تم کو مختلف فرقے کر کے اور چکھا دے ایک کو لڑائی ایک کی۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)

لَبْسٌ اسم ذات بھی ہے۔ شبہ۔ شک۔ ﴿ اَفَعَيِيْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ ؕ بَلْ هُمْ فِيْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۝۱۵ ﴾ (50/قٓ:15) ''تو کیا ہم تھک گئے پہلی تخلیق سے؟ بلکہ یہ لوگ شک میں ہیں نئی تخلیق کے بارے میں۔''

(س) **لُبْسًا** پوشاک پہننا۔ کپڑا پہننا۔ ﴿ يَلْبَسُوْنَ ثِيَابًا خُضْرًا ﴾ (18/الکھف:31) ''اور وہ لوگ پہنیں گے سبز کپڑے۔''

لِبَاسٌ اسم ذات ہے۔ وہ چیز جو پہنی جائے۔ ﴿ يٰبَنِيْۤ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ؕ ﴾ (7/الاعراف:26) ''اے آدمؑ کی اولاد ہم نے اتارا ہے تم لوگوں پر ایک لباس، وہ چھپاتا ہے تمہاری بری چیزوں کو اور بطور آرائش کے۔''

لباس کا لفظ ہر اس چیز پر بولا جاتا ہے جو انسان کی کمزوریوں اور برے کاموں پر پردہ ڈال سکے۔ اس لیے قرآن مجید میں میاں بیوی میں سے ہر ایک کو دوسرے کا لباس قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا ﴿ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ ﴾ (2/البقرۃ:187) ''وہ (بیویاں) تمہاری لباس ہیں اور تم ان (بیویوں) کا لباس ہو۔'' ظاہری جسمانی لباس کے علاوہ ایک باطنی لباس بھی ہے جو انسان کے باطن کی زینت وآرائش کا ذریعہ بنتا ہے۔ اس باطنی لباس کو قرآن لِبَاسُ التَّقْوٰى کہتا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ؕ ﴾ (7/الاعراف:26) ''اور پرہیزگاری کا لباس، وہ تو سب سے بہتر ہے۔'' حضرت علامہ عثمانیؒ فرماتے ہیں: ''بلکہ اگر غور کیا جائے تو ظاہری بدنی لباس بھی اس

باطنی لباس کو زیب تن کرنے کے لیے شرعاً مطلوب ہوا ہے۔'' اور قرآن مجید میں یہ جو فرمایا: ﴿لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ﴾ (16/النحل:112) ''بھوک اور خوف کا لباس۔'' تو یہ بھوک اور خوف کی شدت کو ظاہر کرنے کے لیے فرمایا، جیسے لباس انسان کے بدن کو ہر طرف سے گھیر لیتا ہے اسی طرح بھوک اور خوف نے ان کو ہر طرف سے گھیر لیا۔ قرآنِ مجید میں رات کو بھی لباس کہا گیا ہے۔ ﴿وَّ جَعَلْنَا الَّیْلَ لِبَاسًا ۙ﴾ (78/النبا:10) ''اور ہم ہی نے رات کو پردہ کی چیز بنا دیا'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔ رات کو لباس اس لیے کہا کہ رات ہر چیز کو اپنی تاریکی کی چادر میں ڈھانپ لیتی ہے۔ یا اس لیے کہ جیسے لباس پہن کر آدمی اپنے آپ کو آرام دہ محسوس کرتا ہے اسی لیے رات کو لباس کہا کیونکہ رات کو ہر جاندار آرام اور سکون محسوس کرتا ہے۔ (واللہ اعلم)

لَبُوْسٌ — فَعُوْلٌ کے وزن پر مبالغے کا صیغہ ہے۔ لغت کے اعتبار سے اس سے مراد ہر طرح کا لباس ہے اور عام طور پر لڑائی کے وقت پہنے جانے والی زرہ کے لیے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ ﴿وَ عَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ ۚ﴾ (21/الانبیاء:80) ''اور ہم نے اُنؑ کو زرہ بنانے کا ہنر سکھا دیا تمہارے لیے تاکہ وہ تمہاری حفاظت کرے تمہاری لڑائی میں۔'' اس آیت کے تحت مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں: ''لبوس لغت کے اعتبار سے اسلحہ میں سے ہر چیز کو کہا جاتا ہے جو انسان اوڑھ کر یا گلے میں ڈال کر استعمال کرے۔ مراد اس جگہ آہنی زرہ ہے جو جنگ میں حفاظت کے لیے پہنی جاتی ہے۔'' (معارف القرآن، ج ۶ ص ۲۱۱)

> اَلْحَقُّ (ح ق ق): البقرۃ آیت 26 دیکھیں۔

ب ط ل

(ن) **بَطْلًا، بُطْلَانًا** — یہ لفظ حق کی ضد ہے۔ اس لیے سورۃ البقرہ کی آیت:26 میں لفظ حق کی وضاحت پھر دیکھ لیں۔
(۱) ثابت نہ ہونا۔ (۲) جھوٹ ہونا۔ (۳) بے مقصد ہونا۔ بیکار ہونا۔ ضائع ہونا یعنی وجود بے معنی ہونا۔ (۴) واجب نہ ہونا۔ ﴿فَوَقَعَ الْحَقُّ وَ بَطَلَ مَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۚ﴾ (7/الاعراف:118) ''پس واقع ہوا حق اور ضائع ہوا جو وہ لوگ کیا کرتے تھے۔''

بَاطِلٌ — فَاعِلٌ کے وزن پر صفت ہے۔ بے مقصد۔ بیکار۔ ناحق۔ ﴿وَ اَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ؕ﴾ (۴/النساء:161) ''اور بسبب ان کے کھانے کے لوگوں کا مال ناحق۔''

(افعال) **اِبْطَالًا** — باطل کرنا۔ ضائع کرنا۔ ﴿قَالَ مُوْسٰی مَا جِئْتُمْ بِهِ ۙ السِّحْرُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَیُبْطِلُهٗ ؕ﴾ (10/یونس:81) ''حضرت موسیٰؑ نے کہا جو تم لوگ جولائے ہو، سو وہ جادو ہے۔ بے شک اللہ باطل کرے گا اس کو۔'' ﴿وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ ﴾ (47/محمد:33) ''اور تم مت ضائع کرو اپنے اعمال۔''

مُبْطِلٌ — ج: مُبْطِلُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ باطل کرنے والا۔ ناحق کرنے والا۔ گمراہ۔ ﴿وَلَئِنْ جِئْتَهُمْ بِاٰیَةٍ لَّیَقُوْلَنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُبْطِلُوْنَ ﴾ (30/الروم:58) ''اور اگر تم ان کے پاس لاؤ کوئی نشانی تو لازماً کہیں گے وہ جنہوں نے کفر کیا کہ نہیں ہو تم لوگ مگر ناحق کرنے والے یعنی گمراہ۔''

> تَكْتُمُوا (ک ت م): البقرۃ آیت 33 دیکھیں۔ تَعْلَمُوْنَ (ع ل م): الفاتحہ آیت 1 دیکھیں۔

ترکیب 'وَ' عطف کا ہے اور لَا تَلْبِسُوْا عطف ہے گزشتہ آیت میں لَا تَشْتَرُوْا پر۔ لَا تَلْبِسُوْا باب ضرب سے فعل نہی ہے۔اس میں شامل اَنْتُمْ کی ضمیر فاعل ہے، اَلْحَقَّ مفعول اور بِالْبَاطِلِ متعلق فعل ہے۔ وَتَكْتُمُوْا میں 'وَ' عطف کا ہے اور تَكْتُمُوْا ، تَلْبِسُوْا پر عطف ہے۔ اسی لیے 'لَا' نہی کی وجہ سے مجزوم ہے۔ اس کا فاعل اس میں شامل اَنْتُمْ کی ضمیر ہے۔ اور اَلْحَقَّ اس کا مفعول ہے۔ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ میں 'وَ' حالیہ ہے، اَنْتُمْ مبتدا ہے اور جملہ فعلیہ تَعْلَمُوْنَ اس کی خبر ہے۔ یہ جملہ اسمیہ حال ہے تَكْتُمُوا کی ضمیر فاعلی کا۔

ترجمہ	وَلَا تَلْبِسُوا	الْحَقَّ	بِالْبَاطِلِ	وَتَكْتُمُوا
البقرۃ:42	اور تم لوگ گڈمڈ مت کرو	حق کو	باطل کے ساتھ	اور تم لوگ مت چھپاؤ

الْحَقَّ	وَ	اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۲﴾
حق کو	اس حال میں کہ	تم لوگ (اسے) جانتے ہو

نوٹ آیت مبارکہ میں لَا تَلْبِسُوْا کی وضاحت کرتے ہوئے حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ فرماتے ہیں: ''تلبیس کے اصلی معنی ہیں کسی چیز کو ڈھانپ لینا، چھپا لینا۔ ادھوری بات کہنا کہ مطلب کچھ کا کچھ ہو جائے، یا جھوٹ کو لفظی اور ظاہری سچائی کا رنگ دے دینا، بعض اوقات بالکل گھڑے ہوئے جھوٹ سے کہیں بڑھ کر دھوکے اور مغالطہ کا سبب بن جاتا ہے۔ اسی سے ملتی جلتی ہوئی شے کا نام آج کی اصطلاح میں پروپیگنڈہ ہے۔ موجودہ فرنگیوں کی طرح یہود بھی اس فن میں اُستاد رہ چکے ہیں۔'' (تفسیر ماجدیؒ، ص ۲۴)

آیت:43

﴿وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ ارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾﴾

اَقِيْمُوْا (ق و م): الفاتحہ آیت 5 دیکھیں۔ اَلصَّلٰوةَ (ص ل و): البقرۃ آیت 3 دیکھیں۔
اٰتُوْا (ء ت ی): البقرۃ آیت 23 دیکھیں۔

ز ك و

(ن) زَكَاءً اس مادے میں دو مفہوم پائے جاتے ہیں۔
(1) پاک ہونا۔ عربی زبان میں نفس زکیہ اس نفس کو کہا جاتا ہے جو گناہوں سے پاک ہو۔
(2) بڑھنا۔ نشو ونما پانا۔ زیادہ ہونا۔ عربی زبان میں زَكَا الزَّرْعُ کے معنی ہیں کھیتی بڑھی اور پھلی پھولی۔ ﴿وَ لَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا ۙ﴾ (24/النور:21) ''اور اگر نہ ہوتا اللہ کا فضل تم لوگوں پر اور اس کی رحمت تو پاک نہ ہوتا تم میں سے کوئی ایک بھی کبھی بھی۔''

اَزْكٰى افعل التفضیل ہے۔ زیادہ پاک۔ زیادہ ستھرا۔ ﴿ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَ اَطْهَرُ ؕ﴾ (2/البقرۃ:232) ''یہ تمہارے لیے پاکیزہ تر ہے اور صاف تر ہے۔''

زَكِيٌّ فَعِيْلٌ کے وزن پر صفت مشبہ کا صیغہ ہے۔ واحد مذکر۔ گناہوں سے پاک۔ ستھرا۔ پاکیزہ۔ ﴿لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا ﴿۱۹﴾﴾ (19/مریم:19) ''تاکہ میں عطا کروں تجھ کو ایک پاکیزہ لڑکا۔''

زَكِيَّةٌ فَعِيْلَةٌ کے وزن پر صفت مشبہ کا صیغہ ہے۔ واحد مونث۔ گناہوں سے پاک۔ ستھری۔ پاکیزہ ﴿قَالَ اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةًۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ﴾ (18/الکہف:74) ''حضرت موسیٰؑ بولے کیا تو نے مار ڈالی ایک جان ستھری بغیر عوض کسی جان کے۔''

(تفعیل) **تَزْكِيَةٌ** (1) پاک کرنا۔نشوونما دینا۔ عام طور پر یہ لفظ باطنی صفائی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ﴿وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ﴾ (24/النور:21) ''اور لیکن اللہ پاک کرتا ہے اُس کو جس کو وہ چاہتا ہے۔'' ﴿يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَ يُزَكِّيْكُمْ وَ يُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ (2/البقرۃ:151) ''وہ پڑھ کر سناتا ہے تمہیں ہماری آیتیں اور پاک کرتا ہے تم کو اور سکھاتا ہے تم کو کتاب اور حکمت۔''

(2) اپنی پاکیزگی خود بیان کرنا۔ ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ﴾ (4/النساء:49) ''کیا تو نے نہ دیکھا ان کو جو اپنے آپ کو پاکیزہ کہتے ہیں۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ) ﴿فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى﴾ (53/النجم:32) ''سو مت بیان کرو اپنی خوبیاں وہ خوب جانتا ہے اس کو جو بچ کر چلا۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)۔

یہاں یہ جان لینا ضروری ہے کہ نفس انسانی کے تزکیے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک ہے تزکیہ بالفعل، یعنی اچھے اعمال کے ذریعے اپنے آپ کو درست کر لینا۔ یہ پسندیدہ بھی ہے اور مطلوب بھی جیسے فرمایا قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ''وہ کامیاب ہوا جس نے اپنے آپ کو سنوار لیا۔'' دوسرا ہے تزکیہ بالقول یعنی ایک متقی شخص کا دوسرے شخص کا تزکیہ کرنا اور اس کی خوبیوں کی گواہی دینا۔ قرآن مجید میں نبی اکرمؐ کے فرائض منصبی ایک خاص ترتیب کے ساتھ تین دفعہ بیان ہوئے ہیں جن میں سے ایک تزکیہ ہے۔ مثلاً: (البقرۃ:151) (آل عمران:164) (الجمعہ:2)۔ سورۃ النساء کی آیت:49 اور سورۃ النجم کی آیت 32 میں جس چیز کی مذمت کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ بعض دفعہ کچھ لوگ اپنے نفس کے تزکیے کے لیے کی جانے والی کوششوں کے نتیجے کو یقینی سمجھ کر خود کو پاک صاف سمجھنا شروع کر دیتے ہیں اور اپنی پاکیزگی کا دعویٰ کرنے لگتے ہیں۔ یہ ہے وہ چیز جس سے منع کیا گیا ہے کیونکہ اپنی تعریف آپ کرنے کی اکثر وجہ تکبر ہوتا ہے اور دوسری وجہ یہ کہ یہ چیز خلافِ خوفِ الٰہی بھی ہے کیونکہ کوئی شخص نہیں جانتا کہ اس کا خاتمہ کس حال میں ہوگا۔ لہٰذا اس چیز سے بچنا چاہیے۔ حدیث میں بھی اس کی ممانعت آئی ہے، ''چنانچہ ایک روایت میں حضرت زینب بنت ابی سلمہؓ فرماتی ہیں کہ رسولِ کریمؐ نے مجھ سے دریافت فرمایا کہ تمہارا نام کیا ہے؟ اس وقت چونکہ میرا نام بَرَّۃ تھا (جس کے معنی ہیں گناہوں سے پاک) میں نے وہی بتلایا، تو آپؐ نے فرمایا: لَا تُزَكُّوْا اَنْفُسَكُمْ، اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَهْلِ الْبِرِّ مِنْكُمْ، سَمُّوْهَا زَيْنَبَ (رواہ مسلم بحوالہ مشکوٰۃ) یعنی تم اپنے آپ کی گناہوں سے پاکی بیان نہ کرو کیونکہ یہ علم صرف اللہ ہی کو ہے کہ تم میں سے کون پاک ہے، پھر برّہ کے بجائے آپؐ نے زینب نام رکھا۔'' (معارف القرآن، ج۲، ص۴۳۰)۔

زَكٰوةٌ اسم ذات ہے۔ ستھرائی۔ پاکیزگی۔ زکوٰۃ۔ لغات القرآن کے مطابق یہ تَزْكِيَةٌ سے مشتق ہے۔ یہ لفظ اصلاً زَكَوَةٌ ہے جو قاعدہ کے مطابق تبدیل ہو کر زَكَاةٌ بنتا ہے اور قرآن مجید کی خاص املاء میں زَكٰوةٌ لکھا جاتا ہے۔ لغوی اعتبار سے زکوٰۃ کے اندر پاکیزگی اور نشوونما دونوں کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ اصطلاح شرع میں مال کے اس حصے کو زکوٰۃ کہا جاتا ہے جو شریعت کے احکام کے مطابق کسی مال میں سے نکالا جائے اور اس کے احکام کے مطابق خرچ کیا جائے۔ مال کے اس مقررہ حصے کو زکوٰۃ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اس سے نفس اور مال دونوں کو پاکیزگی بھی ملتی ہے اور اس سے مال میں برکت اور بڑھوتری بھی ہوتی ہے۔ ﴿وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ﴾ (2/البقرۃ:277) ''اور اُنہوں نے نماز قائم کی اور

زکوٰۃ ادا کی۔" ﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۙ﴾ (23/المومنون:4) "زکوٰۃ کے طریقے پر عامل ہوتے ہیں۔" اس آیت مبارکہ کے تحت مولانا مودودیؒ فرماتے ہیں: "عربی زبان میں زکوٰۃ کا مفہوم دو معنوں سے مرکب ہے۔ ایک "پاکیزگی" دوسرے "نشوونما"۔ کسی چیز کی ترقی میں جو چیزیں مانع ہوں اُن کو دور کرنا، اور اس کے اصل جوہر کو پروان چڑھانا، یہ دو تصورات مل کر زکوٰۃ کا پورا تصور بناتے ہیں۔ پھر یہ لفظ جب اسلامی اصطلاح بنتا ہے تو اس کا اطلاق دو معنوں پر ہوتا ہے۔ ایک وہ مال جو مقصدِ تزکیہ کے لیے نکالا جائے۔ دوسرے بجائے خود تزکیہ کا فعل اگر يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ کہیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ تزکیہ کی غرض سے اپنے مال کا ایک حصہ دیتے یا ادا کرتے ہیں۔ اس طرح بات صرف مال دینے تک محدود ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ کہا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ تزکیہ کا فعل کرتے ہیں، اور اس صورت میں بات صرف مالی زکوٰۃ ادا کرنے تک محدود نہ رہے گی بلکہ تزکیۂ نفس، تزکیۂ اخلاق، تزکیۂ زندگی، تزکیۂ مال، غرض ہر پہلو کے تزکیے تک وسیع ہو جائے گی۔" (تفہیم القرآن، ج ۳، ص ۲۶۳)۔ قرآن مجید میں زکوٰۃ کا لفظ مندرجہ ذیل معنوں میں استعمال ہوا ہے (1) اصطلاحی زکوٰۃ کے لیے جیسے اوپر البقرہ کی آیت 277۔ قرآن مجید میں اکثر و بیشتر اصطلاحی زکوٰۃ کا ذکر نماز کے ساتھ آیا ہے۔ (2) پاکیزگی کے لیے مثلاً: ﴿ فَاَرَدْنَاۤ اَنْ يُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً وَّ اَقْرَبَ رُحْمًا ۝﴾ (18/الکہف:81) "پھر ہم نے چاہا کہ بدل دے اُن کو اُن کا رب بہتر اُس سے پاکیزگی میں اور نزدیک تر شفقت میں۔" (ترجمہ شیخ الہندؒ)۔ ﴿ وَّ حَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَ زَكٰوةً ؕ وَ كَانَ تَقِيًّا ۙ۝﴾ (19/مریم:13) "اور خاص اپنے پاس سے رقت قلب اور پاکیزگی اور وہ بڑے پرہیزگار تھے۔" (ترجمہ ماجدیؒ)۔ (3) عام صدقہ کے لیے مثلاً: ﴿ وَمَاۤ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ ۝﴾ (30/الروم:39) "اور تم جو صدقہ دو گے جسے اللہ کی رضا طلب کرتے ہو گے تو ایسے ہی لوگ عنقریب بڑھاتے رہیں گے۔" (ترجمہ ماجدیؒ)۔ اس آیت کے تحت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ فرماتے ہیں: "زکوٰۃ سے یہاں اصطلاحی زکوٰۃ مراد نہیں۔ شریعت کی یہ اصطلاح تو بہت بعد کی ہے بلکہ مطلق صدقہ مراد ہے، جو اللہ کی رضاجوئی کے لیے دیا جائے۔"

(تفعّل) **تَزَكّٰى** پاکیزگی حاصل کرنا۔ پاک ہونا۔ ﴿ وَمَنْ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا يَتَزَكّٰى لِنَفْسِهٖ ؕ﴾ (35/فاطر:18) "اور جس نے پاکیزگی حاصل کی تو وہ تو بس پاکیزگی حاصل کرتا ہے اپنے ہی لیے۔" ﴿ وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى ؕ﴾ (80/عبس:7) "آپؐ پر ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ پاکیزگی حاصل نہیں کرتا۔" "ابن زیدؒ کہتے ہیں کہ قرآن میں جہاں بھی تزکّی کا لفظ استعمال ہوا ہے وہاں اس سے مراد اسلام قبول کرنا ہی ہے۔ چنانچہ وہ مثال میں قرآن مجید کی حسب ذیل تین آیات کو پیش کرتے ہیں: ﴿ وَ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا مَنْ تَزَكّٰى ۧ۝﴾ (20/طٰہٰ:76) "اور یہ جزا ہے اس کی جو پاکیزگی اختیار کرے۔" یعنی اسلام لے آئے۔ ﴿ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰى ۙ۝﴾ (80/عبس:3) اور "تمہیں کیا خبر شاید کہ وہ پاکیزگی اختیار کرے۔" یعنی مسلمان ہو جائے۔ ﴿ وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى ؕ۝﴾ (80/عبس:7) "اور تم پر کیا ذمہ داری ہے اگر وہ پاکیزگی اختیار نہ کرے۔" یعنی مسلمان نہ ہو۔ (ابن جریرؒ بحوالہ تفہیم القرآن، ج ۶ ص ۲۴۲) نوٹ: يَزَّكّٰى اصل میں يَتَزَكّٰى ہے۔

ر ک ع

(ف) **رَكْعًا، رُكُوْعًا** عاجزی کے اظہار میں جھکنا۔ پشت میں خم ڈالنا۔ اصطلاحاً رکوع نماز کا ایک رکن ہے۔ لغوی معنی جھکنے کے اعتبار سے عربی زبان میں رکوع، سجود یعنی سجدہ کرنا کے معنوں میں بھی اکثر استعمال ہوتا ہے جیسے اس شعر میں ہے (فَخَرَّ عَلٰى وَجْهِهٖ

رَاکِعًا ـــــ وَتَابَ اِلَی اللّٰہِ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ)۔یعنی وہ سجدہ کرتے ہوئے منہ کے بل گر پڑا اور بارگاہِ الٰہی میں ہر گناہ سے توبہ کی۔اس شعر میں رَاکِعًا کا معنی سَاجِدًا (سجدہ کرنے والا) ہے۔(روح المعانی بحوالہ ضیاء القرآن)۔حضرت مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں:''رکوع کے لغوی معنی جھکنے کے ہیں،اور اس معنی کے اعتبار سے یہ لفظ سجدہ پر بھی بولا جا سکتا ہے،کیونکہ وہ بھی جھکنے کا انتہائی درجہ ہے،مگر اصطلاحِ شرع میں اس خاص جھکنے کو رکوع کہتے ہیں جو نماز میں معروف و مشہور ہے۔''(معارف القرآن،ج۱،ص ۲۱۵)۔﴿ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ ارْكَعُوْا لَا يَرْكَعُوْنَ ﴾(77/المرسلت:48)''اور جب بھی کہا جاتا ہے ان لوگوں سے کہ تم لوگ رکوع کرو یعنی نماز پڑھو تو وہ لوگ رکوع نہیں کرتے ہیں یعنی نماز نہیں پڑھتے۔''

اِرْکَعْ — ج:اِرْكَعُوْا۔فعل امر ہے۔تو رکوع کر۔اوپر آیت نمبر(77/المرسلت:48) دیکھیں۔

رَاکِعٌ — ج:رَاكِعُوْنَ اور رُكَّعٌ۔اسم الفاعل ہے۔جھکنے والا۔عاجزی کرنے والا۔رکوع کرنے والا۔﴿ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَخَرَّ رَاكِعًا وَّاَنَابَ ﴾(38/ص:24)''سو وہ معافی مانگنے لگ گئے اپنے رب سے اور گر پڑے رکوع میں اور (دل و جان سے) اُس کی طرف متوجہ ہو گئے۔''(ترجمہ ضیاء القرآن)۔اس آیت میں بھی صاحبؒ ضیاء القرآن کے مطابق رَاکِعٌ سے مراد سَاجِدٌ ہے۔﴿ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴾(3/آل عمران:43)''اور آپ (اے مریم) رکوع کریں رکوع کرنے والوں کے ساتھ۔''﴿ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴾(2/البقرۃ:125) ''کہ تم دونوں پاک رکھو میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور اعتکاف کرنے والوں اور رکوع کرنے والوں کے لیے۔''

ترکیب

'وَ' حرف عطف ہے اور اَقِيْمُوْا گزشتہ آیت میں لَا تَلْبِسُوْا پر عطف ہے۔اَقِيْمُوْا فعل امر میں جمع مذکر کا صیغہ ہے اور اس کا فاعل اس میں شامل اَنْتُمْ کی ضمیر ہے۔اَلصَّلٰوةَ اس کا مفعول ہے۔آگے وَاٰتُوْا میں 'وَ' عطف کا ہے اور اٰتُوْا بھی فعل امر ہے اور اَلزَّكٰوةَ اس کا مفعول ہے۔وَارْكَعُوْا میں 'وَ' عطف کا ہے اور اِرْكَعُوْا بھی فعل امر ہے۔مَعَ ظرف ہے اور مضاف ہے اور متعلق ہے اِرْكَعُوْا سے۔اَلرّٰكِعِيْنَ مضاف الیہ ہے۔

ترجمہ البقرۃ:43

وَاَقِيْمُوا	الصَّلٰوةَ	وَاٰتُوا	الزَّكٰوةَ	وَارْكَعُوْا
اور تم لوگ قائم کرو	نماز کو	اور تم لوگ ادا کرو	زکوٰۃ	اور تم لوگ جھکو

مَعَ الرّٰكِعِيْنَ
(نماز میں) جھکنے والوں کے ساتھ

نوٹ:1

آیت مبارکہ میں بنی اسرائیل سے جو یہ فرمایا وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ تو اس سے کیا مراد ہے۔حضرت مفتی محمد شفیعؒ اس کا جواب دیتے ہیں''یہاں نماز کا ایک جز بول کر کُل نماز مراد لی گئی ہے،جیسے قرآن مجید میں ایک جگہ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ فرما کر پوری نماز فجر مراد ہے اور بعض روایات حدیث میں سجدہ کا لفظ بول کر پوری رکعت یا نماز مراد لی گئی ہے،اس لیے مراد آیت کی یہ ہوگئی کہ نماز پڑھو نماز پڑھنے والوں کے ساتھ۔''لیکن یہ سوال پھر بھی باقی رہ جاتا ہے کہ نماز کے بہت سے ارکان میں سے خاص رکوع کا ہی کیوں ذکر کیا گیا تو اس کا جواب حضرت مفتی محمد شفیعؒ اِن الفاظ میں دیتے ہیں''یہود کی نماز میں سجدہ وغیرہ تو تھا،مگر رکوع نہیں تھا،رکوع اسلامی نماز کی خصوصیات میں سے ہے،اس لیے راکعین کے لفظ سے امت محمدیہؐ کے نمازی مراد ہوں گے،جن کی نماز میں رکوع بھی ہے اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ تم بھی امت محمدیہؐ کے نمازیوں کے ساتھ نماز ادا کرو،یعنی اوّل ایمان قبول کرو پھر جماعت کے ساتھ نماز ادا کرو'' (معارف القرآن،ج۱،ص ۲۱۵)۔

نوٹ:2 ہمارے بزرگوں میں ایک بحث ہوئی ہے کہ کیا کافروں کو شریعت کے فروعی احکامات کا مخاطب بنانا درست ہے۔ تو اس کا جواب جمہور علماء نے یہ دیا ہے کہ آیت مبارکہ کے یہ سارے احکام ایک آیت قبل کے حکمِ ایمان وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ کے ماتحت ہیں۔ یعنی پہلے ایمان لاؤ اور پھر اِن احکامات پر عمل کرو۔'' (بحوالہ تفسیر ماجدیؒ۔ تلخیصاً)۔

آیت:44

﴿ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴾

تَاْمُرُوْنَ (ء م ر): البقرۃ آیت 27 دیکھیں۔ اَلنَّاسَ: البقرۃ آیت 8 دیکھیں۔

ب ر ر

(س۔ض) **بِرًّا** احسان وحسنِ سلوک کرنا۔ نیکی وبھلائی کرنا۔ کسی کے حق کو پورا کرنا، چاہے وہ اللہ تعالیٰ کا حق ہو، ماں باپ کا حق ہو یا عام بندوں کا حق ہو۔ اِن بنیادی حقوق کے علاوہ اس لفظ میں ان حقوق کو پورا کرنے کا مفہوم بھی شامل ہے ہے جو معاہدات، قول وقرار اور قسموں سے پیدا ہوتے ہیں۔ ﴿ لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ ﴾ (60/الممتحنۃ:8) ''جن لوگوں نے تم سے دین کے بارے میں لڑائی نہیں لڑی اور تمہیں جلا وطن نہیں کیا ان کے ساتھ حسن سلوک واحسان کرنے سے اللہ تعالیٰ تمہیں نہیں روکتا۔''

بِرٌّ اسم ذات بھی ہے۔ نیکی۔ اس میں اعتقادی اور عملی دونوں قسم کی نیکیاں شامل ہیں اور قرآن مجید میں سورہ البقرہ کی آیت 177 میں اس کی تفصیل ہے ﴿ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ ﴾ (2/البقرۃ:177) ''نیکی (بس یہی) نہیں کہ تم پھیر لو اپنے رخ مشرق کی طرف اور مغرب کی طرف۔'' حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اس آیت کے تحت فرماتے ہیں: ''بِرٌّ کے معنی لغت عربی میں بہت وسیع ہیں، نیکی کے جملہ اقسام پر شامل ہے۔ اُردو میں اس کا صحیح مفہوم لفظ طاعت ہی سے ادا ہوسکتا ہے۔ اہل لغت ہی کو نہیں اہل تفسیر کو بھی بِرٌّ کے مفہوم کی بھی وسعت مسلم ہے۔ اَلْبِرُّ اِسْمٌ جَامِعٌ لِّلطَّاعَاتِ وَاَعْمَالِ الْخَيْرِ الْمُقَرِّبَةِ اِلَى اللّٰهِ تَعَالٰى۔ (کبیر) (تفسیر ماجدیؒ ص ۸۴)۔ مولانا امین احسن اصلاحیؒ فرماتے ہیں: ''یہ لفظ احسان اور نیکی کی تمام قسموں پر بھی حاوی ہے اور عدل کا بھی ہم معنی ہے۔ اپنے استعمالات کے لحاظ سے یہ لفظ اثم (حق تلفی) عقوق (والدین کی نافرمانی) غدر (بے وفائی) اور ظلم کا ضد ہے۔'' (تدبر قرآن، ج ا،ص ۱۸۷)۔ حدیث میں ہے: حج مبرور کی جزاء جنت کے سوا کچھ نہیں۔ اس میں حج مبرور سے مراد بِرّ یعنی نیکیوں سے بھرپور حج ہے۔

بَارٌّ ج: اَبْرَارٌ۔ اسم الفاعل ہے۔ نیکی کرنے والا۔ بطور صفت بھی استعمال ہوتا ہے بمعنی نیک۔ شریعت کی رو سے بَارٌّ وہ ہے جو اپنے ذمے عائد ہونے والے حقوق کو پوری طرح ادا کرے، اپنے رب کی اطاعت کرے اور اس کے منع کیے ہوئے افعال سے پرہیز کرے۔ ﴿ وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ﴾ (3/آل عمران:193) ''اور تو موت دے ہم کو نیکی کرنے والوں یعنی نیک لوگوں کے ساتھ۔''

بَرٌّ ج: بَرَرَةٌ۔ فَاعِلٌ کے وزن پر بَارِرٌ تھا۔ الف گر گیا تو بَرِرٌ ہوا پھر ادغام ہو کر بَرٌّ بنا۔ اسم صفت ہے۔ اس کی نسبت اللہ

تعالیٰ اور بندے دونوں کی طرف ہوتی ہے۔ جب اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو مطلب ہوتا ہے احسان کرنے والا۔﴿ اِنَّهٗ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيْمُ ﴾ (52/الطور:28) ''یقیناً وہی احسان کرنے والا ہر حال میں رحم کرنے والا ہے۔'' اور جب اس کی نسبت بندے کی طرف ہو تو معنی ہوتے ہیں حسنِ سلوک کرنے والا۔ اطاعت گزار۔ فرمانبردار۔ نیک۔ ﴿ وَ كَانَ تَقِيًّا ۝ وَّ بَرًّاۢ بِوَالِدَيْهِ ﴾ (19/مریم:13-14) ''اور وہ یعنی یحییٰ تقوے والے تھے اور نیکی کرنے والے تھے اپنے والدین کے ساتھ۔'' اس کی جمع قرآن مجید میں ایک ہی دفعہ فرشتوں کی صفت کے طور پر استعمال ہوئی ہے۔ ﴿ كِرَامٍۭ بَرَرَةٍ ﴾ (80/عبس:16) ''جو بڑے درجہ والے نیک کار ہیں۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)۔ صاحبؒ لغات القرآن بَرَرَةٌ کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''بَرَرَةٌ، اَبْرَارٌ کی بہ نسبت زیادہ بلیغ ہے کیونکہ اَبْرَارٌ بَارٌّ کی جمع ہے اور بَرَرَةٌ بَرٌّ کی اور جس طرح عَدْلٌ (یعنی سرتاپا انصاف) عَادِلٌ سے زیادہ بلیغ ہے اسی طرح بَرٌّ، بَارٌّ سے زیادہ بلیغ ہے۔'' (لغات القرآن، ج ۲ ص ۲۷)

بَرٌّ صفت کے علاوہ اسم ذات بھی ہے۔ خشکی۔ (جس طرح حسنِ سلوک کرنے والا اپنے اندر سکون اور ٹھہراؤ محسوس کرتا ہے اسی طرح پانی پر ہچکولوں کے مقابلے میں خشکی پر انسان کو سکون اور ٹھہراؤ ملتا ہے)۔ ﴿ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ﴾ (6/الانعام:59) ''اور وہ جانتا ہے جو خشکی اور تری میں ہے۔''

ن س ی

(س) نَسْيًا اور نِسْيَانًا نسیان کا معنی ہے انسان کا اس چیز کو محفوظ نہ رکھنا جو اسے ودیعت کی گئی۔ اس کی وجہ کبھی دل کی کمزوری اور غفلت ہوتی ہے اور کبھی قصداً بھی انسان کسی چیز کو اپنے دل سے مٹا دیتا ہے۔ چنانچہ یہ لفظ کسی بات یا چیز کو بلا ارادہ بھلا دینا یا ارادۃً بھلا دینا، دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔﴿ وَ لَقَدْ عَهِدْنَاۤ اِلٰۤى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَ لَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ﴾ (20/طٰہٰ:115) ''اور ہم نے حکم دیا تھا آدمؑ کو اس سے پہلے (کہ وہ اُس درخت کے قریب نہ جائے) سو وہ بھول گیا اور نہ پایا ہم نے (اس لغزش میں) اُس کا کوئی قصد۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔﴿ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰۤى ﴾ (87/الاعلیٰ:6) ''ہم پڑھائیں گے آپؐ کو تو آپؐ نہیں بھولیں گے۔'' ﴿ فَذُوْقُوْا بِمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ﴾ (32/السجدۃ:14) ''پس اب چکھو سزا اُس جرم کی کہ تم نے بھلا دیا تھا اپنے اس روز کی ملاقات کو۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔ ﴿ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ﴾ (5/المائدۃ:13) ''اور اُنہوں نے بھلا دیا بڑا حصہ جس کے ساتھ اُنہیں نصیحت کی گئی تھی۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔ ہر وہ نسیان جو قصد و ارادہ سے ہو، قابل مذمت ہے اور جو بغیر قصد اور ارادہ سے ہو وہ معاف ہے۔ اسی لیے حدیث میں فرمایا گیا رُفِعَ عَنْ اُمَّتِي الْخَطَأُ وَالنِّسْيَانُ۔ اٹھا لیا گیا (یعنی معاف کر دیا گیا) میری امت سے خطاء اور نسیان کو۔'' نسیان کا لفظ جان بوجھ کر کسی چیز کو چھوڑ دینے کے معنیٰ میں بھی استعمال ہوتا ہے مثلاً: ﴿ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖۤ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ ﴾ (7/الاعراف:165) ''پھر جب اُنہوں نے فراموش کر دی جو اُنہیں نصیحت کی گئی تھی تو ہم نے نجات دے دی اُنہیں جو روکتے تھے برائی سے۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔ اس آیت کے تحت پیر کرم شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں: ''نسیان جان بوجھ کر کسی چیز کو چھوڑ دینے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور یہاں اسی معنی میں مستعمل ہوا ہے۔'' (ضیاء القرآن، ج ۲ ص ۹۷)۔ قرآن مجید کی کئی آیات میں نسیان کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف بھی کی گئی ہے مثلاً: ﴿ فَالْيَوْمَ نَنْسٰىهُمْ كَمَا نَسُوْا لِقَآءَ يَوْمِهِمْ هٰذَا ﴾ (7/الاعراف:51) ''سو آج ہم فراموش کر دیں گے اُنہیں جیسے انہوں نے اپنے اس دن کی ملاقات کو بھلا دیا تھا۔'' ﴿ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ ﴾

(9/التوبۃ:67) ''انہوں نے بھلا دیا اللہ کو تو اس (اللہ) نے بھی انہیں فراموش کر دیا۔'' اور ﴿ اِنَّا نَسِيْنٰكُمْ ﴾ (32/السجدۃ:14) ''ہم نے تم کو نظر انداز کر دیا۔'' ایسی تمام آیات جہاں نسیان کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے وہاں اس کے معنی ترک کرنے اور نظر انداز کرنے کے ہوتے ہیں کیونکہ بھولنا ایک انسانی عیب ہے اور اللہ تعالیٰ ہر عیب سے پاک ہے۔ چنانچہ الاعراف:51 کے تحت مولانا عبدالماجد دریا بادیؒ فرماتے ہیں: ''انساء الٰہی سے جو ظاہر ہے کہ بالکل ارادی اختیاری ہوگا۔ مراد اللہ کا ان لوگوں کو رحمت کے ساتھ یاد نہ فرمانا ہے۔ محاورۂ عرب میں نسیان و انساء کا یہ استعمال نامعلوم نہیں۔'' اور اسی آیت کے تحت پیر کرم شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں: ''نسیان (بھلا دینے) کا کیا معنی ہے؟ امام رازیؒ نے دو قول نقل کیے ہیں۔ (۱) نسی بمعنی ترک یعنی ہم انہیں چھوڑ دیں گے اور ان کو نجات نہیں دیں گے۔ (۲) دوسرا معنی یہ ہے کہ ہم ان سے ایسا برتاؤ کریں گے جیسے ہم نے ان کو فراموش کر دیا ہے۔'' اور پیر کرم شاہ صاحبؒ السجدہ:14 کے تحت فرماتے ہیں: ''نسیان کا معنی بھلا دینا اور فراموش کر دینا ہے لیکن کسی چیز کو ترک کرنے اور نظر انداز کر دینے کے معنی میں بھی یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے خصوصاً جب اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو کیونکہ وہاں بھولنا اور فراموش کرنا مراد نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ عیب ہے اور اللہ تعالیٰ ہر عیب سے پاک ہے وہاں فقط ترک کرنا، نظر انداز کرنا کے معنی میں یہ لفظ مستعمل ہوگا علامہ ابن منظور لکھتے ہیں: قولهٗ عزوجل۔ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ اِنَّمَا مَعْنَاهٗ تَرَكُوا اللّٰهَ فَتَرَكَهُمْ۔'' (لسان العرب بحوالہ ضیاء القرآن، ج ۳، ص ۲۳۴)

لَا تَنْسَ فعل نہی ہے۔ تو مت بھول یا مت بھلا۔ ﴿ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا ﴾ (28/القصص:77) ''اور تو مت بھول اپنے حصے کو دنیا میں سے۔''

نَسْیٌ اسم ذات ہے۔ وہ معمولی چیز جو توجہ کے قابل نہ ہو۔ ﴿ وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا ﴾ (19/مریم:23) ''اور میں ہوتی ایک معمولی چیز بھولی ہوئی۔'' اس آیت میں نَسْیٌ کے متعلق امام راغبؒ فرماتے ہیں: ''نَسْیٌ کے معنی ہیں وہ حقیر چیز جس کی طرف کوئی دھیان نہ دے اگرچہ وہ بھولی ہوئی نہ ہو پھر بھولی ہوئی چیز کے معنی کو ظاہر کرنے کے لیے مَنْسِيًّا کا لفظ لایا گیا۔'' (تلخیصاً)

مَنْسِیٌّ مَفْعِیٌّ کے وزن پر اسم المفعول ہے۔ وہ چیز جس کو بھلا دیا جائے۔ فراموش شدہ چیز۔ بھولی ہوئی چیز۔ اوپر (19/مریم:23) دیکھیں۔

نَسِیٌّ فَعِیْلٌ کے وزن پر فاعل کے معنی میں ہے۔ بھولنے والا۔ ﴿ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ﴾ (19/مریم:64) ''اور نہیں ہے آپؐ کا رب بھولنے والا۔''

(افعال) **اِنْسَاءً** کسی دوسرے کو کوئی چیز یا بات بھلا دینا۔ ﴿ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ ﴾ (59/الحشر:19) ''اور تم لوگ مت ہو ان لوگوں کی مانند جو بھولے اللہ کو تو اس نے یعنی اللہ نے ان کو بھلا دیا اپنا آپ۔'' ﴿ مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا ﴾ (2/البقرۃ:106) ''جو آیت ہم منسوخ کرتے ہیں یا ہم بھلا دیتے ہیں۔''

اَنْفُسٌ (ن ف س): البقرۃ آیت 9 دیکھیں۔

ت ل و

(ن) **تَلَوًا** کسی کے پیچھے پیچھے چلنا۔ پیروی کرنا۔ اتباع کرنا۔ اصل میں تَلَا یَتْلُوْ کا مطلب پیروی کرنا ہے۔ یہ پیروی کبھی ظاہری

اور جسمانی طور پر کسی کے پیچھے پیچھے چلنے سے ہوتی ہے اور کبھی کسی چیز کو پڑھنے اور اس کے معنی میں غور و فکر کر کے جو راستہ سمجھ آئے اس پر چلنے سے ہوتی ہے۔ پہلے معنی کے لحاظ سے مصدر تَلْوٌ اور تُلُوٌّ استعمال ہوتا ہے اور دوسرے معنی کے لحاظ سے تِلَاوَۃٌ مصدر استعمال ہوتا ہے۔ عربی زبان میں تِلْوٌ اونٹنی کے اس بچے کو کہتے ہیں جس کا دودھ چھڑا دیا جائے اور وہ اپنی ماں کے پیچھے پیچھے چلے۔ (مصباح) ﴿وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰىهَا﴾ (91/الشمس:2) ''قسم ہے چاند کی جب وہ پیچھے پیچھے چلا اس (سورج) کے۔''

تِلَاوَۃٌ

کسی چیز کو پڑھنا اور اس کی پیروی کرنا۔ تلاوت کا لفظ، قرأت (پڑھنا) سے خاص ہے۔ قرأت کا لفظ پڑھنے اور مطالعہ کرنے کے لیے عام ہے خواہ کوئی تحریر پڑھی جائے، کوئی کتاب یا ایک آدھ لفظ اور یہ بھی ضروری نہیں کہ جو کچھ قرأت کی جائے اس کی پیروی بھی لازماً کی جائے جبکہ تلاوت میں یہ مفہوم ہے کہ جو کچھ پڑھا جائے اس کی پیروی بھی کی جائے۔ چنانچہ تلاوت کے اندر قرأت کا مفہوم ہے لیکن قرأت کے اندر تلاوت کا مفہوم نہیں ہے۔ اسی لیے عربی زبان میں کسی کے خط کو پڑھنے کے لیے تَلَوْتُ رُقْعَتَكَ کے الفاظ نہیں بولے جاتے۔ اصطلاحاً تلاوت کا لفظ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتابوں کو پڑھنے کے لیے مخصوص ہے کیونکہ ان کو پڑھنے کے ساتھ ساتھ ان میں درج شدہ ہدایات کی پیروی کرنا بھی لازم ہوتا ہے۔ اب چونکہ قرآن مجید واحد آسمانی کتاب ہے جو اپنی اصلی حالت میں ہے اس لیے تلاوت کا لفظ قرآن پاک کو پڑھنے کے لیے مخصوص ہے۔ اس لیے جب ''تلاوت قرآنِ پاک'' کہا جائے تو اس میں دو مفہوم ہیں ایک قرآنِ پاک کو پڑھنا اور دوسرا اس پر عمل کرنا۔ تَلَا یَتْلُوْ کے بعد اگر مفعول بنفسہٖ آئے تو مطلب ہوتا ہے پڑھنا یعنی تلاوت کرنا۔ اور اگر عَلٰی کا صلہ آئے تو مطلب ہوتا ہے کسی کو پڑھ کر سنانا۔ ﴿وَقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ ۙ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ﴾ (2/البقرۃ:113) ''اور کہا نصاریٰ نے کہ نہیں ہیں یہود کسی چیز پر حالانکہ وہ لوگ پڑھتے ہیں کتاب کو۔'' ﴿اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَتْلُوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ رَبِّكُمْ﴾ (39/الزمر:71) ''کیا نہیں پہنچے تم لوگوں کے پاس کچھ رسول تم میں سے، وہ لوگ پڑھ کر سناتے تھے تم کو تمہارے رب کی آیات۔'' ﴿اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ﴾ (2/البقرۃ:121) ''وہ لوگ جن کو ہم نے دی کتاب وہ اس کو پڑھتے ہیں جیسے کہ اُس کو پڑھنے کا حق ہے۔'' امام راغبؒ اس آیت کے بارے میں فرماتے ہیں: ''کہ وہ اس کو پڑھ کر سمجھتے اور اس پر عمل کرتے ہیں۔'' اور قرآن مجید میں یہ جو فرمایا ﴿وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ﴾ (2/البقرۃ:102) جس میں تلاوت کی نسبت شیاطین کی طرف کی گئی ہے تو ہمارے بزرگوں نے اس کی تین طرح سے وضاحت کی ہے (1) اگر تَتْلُوْا، تِلَاوَۃٌ سے مشتق ہے تو پھر آیت کے معنی ہوں گے ''اور انہوں نے پیروی کی اس کی جس کو شیاطین پڑھا کرتے تھے۔'' (عام طور پر اسی طرح ترجمہ کیا گیا ہے) اس صورت میں شیاطین کے پڑھنے کو تلاوت کہا گیا تو اس کی وجہ امام راغبؒ کے نزدیک یہ ہے کہ ان شیاطین کو یہ گمان باطل اور زعم تھا کہ وہ کتب الٰہیہ کی تلاوت کر رہے ہیں۔ (2) اگر تَتْلُوْا، تَلْوٌ یا تُلُوٌّ سے مشتق ہو تو پھر آیت کے معنی ہوں گے ''اور انہوں نے پیروی کی اس چیز کی جس کی پیروی کی شیاطین نے۔'' لیکن آیت کا یہ ترجمہ میرے علم کی حد تک نہیں کیا گیا۔ (3) ایک تیسری وجہ جو صاحبؒ ضیاء القرآن نے لکھی ہے وہ یہ کہ تَلْوٌ کا ایک معنی بہتان باندھنا بھی ہے اس صورت میں آیت کا مفہوم ہوگا کہ یہودی پیروی کرنے لگے اس چیز (سحر) کی جس کا شیطان حضرت سلیمانؑ پر بہتان باندھا کرتے تھے۔ (واللہ اعلم)۔ امام راغبؒ کے مطابق تلاوت کی نسبت جب اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس کے معنی نازل کرنے کے ہوتے ہیں جیسے فرمایا: ﴿ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنَ الْاٰيٰتِ

وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ ﴿ (3/آل عمران:58) ''یہ جسے ہم آپ کو پڑھ کر سناتے ہیں نشانیوں میں سے ہے اور پُرحکمت مضمون میں سے۔'' تو اس آیت میں نَتْلُوْهُ کے معنی نازل کرنا کے ہیں۔

اُتْلُ	فعل امر ہے۔ تو پڑھ کر سنا۔ ﴿ اُتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ ﴾ (29/العنکبوت:45) ''آپ پڑھئے جو وحی کیا گیا آپ کی طرف کتاب میں سے۔'' ﴿ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ نُوْحٍ ﴾ (10/یونس:71) ''پڑھ کر سناؤ ان لوگوں کو نوحؑ کی خبر۔''
تَالٍ	اسم الفاعل ہے۔ واحد مذکر۔ تلاوت کرنے والا (تِلَاوَةٌ سے)
تَالِيَةٌ	ج: تَالِيَاتٌ۔ اسم الفاعل ہے۔ واحد مؤنث۔ تلاوت کرنے والی (تِلَاوَةٌ سے)۔ ﴿ فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا ﴾ (37/الصافات:3) ''پھر ذکر کی تلاوت کرنے والے (فرشتوں کی)۔''

اَلْكِتَابُ (ك ت ب): البقرۃ آیت 2 دیکھیں۔

ع ق ل

(ض) عَقْلًا

عربی زبان کا یہ لفظ کئی معنی کا مجموعہ ہے۔ مثلاً روکنا۔ منع کرنا۔ کسی شے پر غور وفکر کر کے اس کی حقیقت کو سمجھ لینا۔ دانا ہونا۔ دانائی کی صلاحیت کو استعمال کرنا۔ غلطی کا احساس کرنے کے قابل ہونا۔ عربی میں عِقَالٌ اس رسی کو کہتے ہیں جس سے اونٹ کا پاؤں باندھ دیا جائے اور جس سے اونٹ آزادی سے چل پھر نہ سکے۔ سر پر باندھنے کی رسی کو بھی عِقَالٌ کہا جاتا ہے۔ عورت جب اپنے بال باندھ لے تو کہتے ہیں عَقَلَتِ الْمَرْءَةُ شَعْرَهَا۔ اسی طرح عَقَلَ لِسَانَهٗ کا معنی ہے اس نے اپنی زبان روک لی۔ قرآن مجید میں اس مادے سے ماضی اور مضارع کے صیغے استعمال ہوئے ہیں اور اکثر ان کا ترجمہ ''عقل'' سے کیا گیا ہے۔ عقل بطور اسم ذات قرآنِ مجید میں استعمال نہیں ہوا۔ ﴿ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ ﴾ (2/البقرۃ:75) ''وہ لوگ سنتے ہیں اللہ کے کلام کو پھر وہ بدل دیتے ہیں اس کو اس کے بعد کہ جو انہوں نے سمجھا اس کو۔'' ﴿ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴾ (2/البقرۃ:73) ''اس طرح اللہ زندہ کرے گا مردہ کو اور وہ دکھاتا ہے تم لوگوں کو اپنی نشانیاں شاید تم لوگ عقل سے کام لو۔'' اصل میں عقل وہ روحانی نور (یاقوت) ہے جس سے چیزوں کی حقیقت کو سمجھا جاتا ہے، جس سے نقصان دہ چیزوں سے بچا جاتا ہے، جس سے انسان نفع اور نقصان کا فرق کرتا ہے، جو انسان کو فائدہ مند چیزوں کے حصول اور قبول علم کے لیے ہر وقت تیار رکھتا ہے اور جس سے انسان سوچ و بچار کرتا ہے۔ عقل کو عقل بھی اس لیے کہتے ہیں کہ عقل کے معنی منع کرنے کے ہیں چونکہ عقل عاقل کو نازیبا باتوں سے روکتی رہتی ہے، اس لیے اس کا نام ''عقل'' ہوا۔ اس روکنے کے مفہوم کے لحاظ سے اسے نُهْيَةٌ بھی کہتے ہیں (یعنی بری باتوں سے روکنے والی عقل)۔ اس کی جمع قرآن مجید میں استعمال ہوئی ہے لِاُولِي النُّهٰى (طٰہٰ:54)۔ یا عقل مَعْقِلٌ سے ماخوذ ہے، معقل کہتے ہیں جائے پناہ کو، اور چونکہ عقلمند کو عقل کے تلے ہی پناہ ملتی ہے اس لیے اس کو عقل کہنے لگے۔ قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عقل کا محل قلب ہے چنانچہ فرمایا: ﴿ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ﴾ (22/الحج:46) ''کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ ان کے دل سمجھنے والے یا ان کے کان سننے والے ہوتے؟۔'' عقل کی قسموں

کے متعلق حضرت علیؓ کا قول ہے: اَلْعَقْلُ عَقْلَان۔ مَطْبُوْعٌ وَمَسْمُوْعٌ۔ عقل کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جو طبیعت میں ودیعت کی جاتی ہے اور دوسری وہ جو سن کر حاصل ہوتی ہے۔ وَلَا یَنْفَعُ مَسْمُوْعٌ اِذَا لَمْ یَكُ مَطْبُوْعٌ اور وہ عقل جو سن کر حاصل ہوتی ہے وہ فائدہ مند نہیں ہوتی جب تک طبیعت میں ودیعت کی جانے والی عقل موجود نہ ہو۔ كَمَا لَا یَنْفَعُ ضَوْءُ الشَّمْسِ وَضَوْءُ الْعَیْنِ مَمْنُوْعٌ جس طرح سورج کی روشنی اس وقت فائدہ نہیں دیتی جب آنکھ میں روشنی نہ ہو۔ عقل کے پہلے معنی کی طرف آنحضرتؐ نے ایک حدیث میں اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: مَا خَلَقَ اللّٰهُ خَلْقًا اَكْرَمَ عَلَیْهِ مِنَ الْعَقْلِ اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسی مخلوق پیدا نہیں کی جو اس کے نزدیک عقل سے زیادہ باعزت ہو۔ اور دوسرے معنی کی طرف آنحضرتؐ کے اس ارشاد میں اشارہ پایا جاتا ہے۔ مَا كَسَبَ اَحَدٌ شَیْئًا اَفْضَلَ مِنْ عَقْلٍ یَّهْدِیْهِ اِلٰی هُدًی اَوْیَرُدُّهٗ عَنْ رَدًی کہ کسی شخص نے اس عقل سے بڑھ کر کوئی چیز حاصل نہیں کی جو انسان کی رہنمائی کرے یا اسے ہلاکت سے بچائے چنانچہ آیت کریمہ: ﴿وَمَا یَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ ﴾ (29/العنکبوت:43) ''اور اسے تو اہل دانش ہی سمجھتے ہیں۔'' میں اسی معنی کی طرف اشارہ ہے۔ اور ہر وہ جگہ جہاں اللہ تعالیٰ نے فقدان عقل کی وجہ سے کفار کی مذمت فرمائی ہے وہاں دوسرے معنی ہی مراد ہیں جیسے فرمایا: ﴿وَمَثَلُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِیْ یَنْعِقُ بِمَا لَا یَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّ نِدَآءً ؕ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْیٌ فَهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ ﴾ (2/البقرۃ:171) ''جو کافر ہیں ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جو کسی ایسی چیز کو آواز دے جو پکار اور آواز کے سوا کچھ نہ سن سکے، بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں کہ کچھ سمجھ ہی نہیں سکتے۔'' (تلخیص از مفردات القرآن، مترادفات القرآن، لغات القرآن، مصباح اللغات)

ترکیب

اَ استفہامیہ ہے اور اظہار حیرت اور ملامت کے لیے ہے۔ تَاْمُرُوْنَ فعل ہے اس میں شامل اَنْتُمْ کی ضمیر اس کا فاعل ہے۔ اَلنَّاسَ مفعول ہے اور بِالْبِرِّ متعلق فعل ہے۔ یہاں یہ بھی نوٹ کریں کہ جس کو حکم دیا جائے وہ مفعول بنفسہٖ آتا ہے اور جو حکم دیا جائے اس کے ساتھ زیادہ تر 'ب' یا 'اَنْ' کا صلہ آتا ہے۔ 'وْ عطف کا ہے تَنْسَوْنَ، تَاْمُرُوْنَ پر عطف ہے اور اَنْفُسَكُمْ اس کا مفعول ہے۔ آگے 'وْ حالیہ ہے۔ اَنْتُمْ مبتدا اور جملہ فعلیہ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ اس کی خبر ہے یہ جملہ اسمیہ حال ہے تَنْسَوْنَ کی ضمیر فاعلی کا۔ آگے اَ استفہامیہ ہے، 'فَ' حرف عطف ہے، لَا نافیہ ہے اور تَعْقِلُوْنَ فعل اور اس میں شامل اَنْتُمْ کی ضمیر اس کا فاعل ہے۔ (واللہ اعلم)۔

ترجمہ
البقرۃ:44

اَتَاْمُرُوْنَ	النَّاسَ	بِالْبِرِّ	وَتَنْسَوْنَ
کیا تم حکم دیتے ہو	لوگوں کو	نیکی کا	اور تم بھول جاتے ہو

اَنْفُسَكُمْ	وَ	اَنْتُمْ تَتْلُوْنَ	الْكِتٰبَ
اپنے آپ کو	حالانکہ	تم پڑھتے ہو	کتاب

اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ
تو کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے

نوٹ اس آیت مبارکہ کی تفسیر اگر معارف القرآن سے دیکھ لی جائے تو بہت فائدہ ہوگا۔ بہر حال حضرت مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں: ''آیت کا مطلب یہ نہیں کہ بے عمل آدمی کو وعظ کہنا جائز نہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ واعظ کو بے عمل نہیں ہونا چاہیے۔'' (معارف القرآن، ج ۱، ص: ۲۱۸)

آیت:45

﴿وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ۝۴۵﴾

اِسْتَعِيْنُوْا (ع و ن): الفاتحہ آیت 4 دیکھیں۔

ص ب ر

(ض) **صَبْرًا** صَبْرٌ کے لغوی معنی ہیں روکنا اور باندھنا۔ عربی میں صَبَرْتُ الدَّابَّةَ کے معنی ہیں میں نے جانور کو کھانا کھلائے بغیر باندھ دیا۔ اسی طرح صَبَرْتُ نَفْسِيْ عَنْ كَذَا کے معنی ہیں میں نے اپنے آپ کو فلاں چیز سے روک دیا۔ اس لغوی مفہوم کے ساتھ یہ لفظ جب قرآن وسنت میں استعمال ہوتو پھر اس کے معنی ہوتے ہیں مشکل اور ناموافق حالات میں عقل اور شریعت دونوں یا ان میں سے کسی ایک کے تقاضے کے مطابق اپنے آپ کو روکے رکھنا، مشکلات اور تکلیفوں کو برداشت کرنا، ان کو سہنا، ثابت قدمی سے اپنے کام پر لگے رہنا اور اپنے موقف پر ڈٹے رہنا۔ ﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ﴾ (46/الاحقاف:35) ''تو آپؐ ثابت قدم رہیں جیسے کہ ثابت قدم رہے ہمت والے رسول۔'' ﴿وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً ۭ اَتَصْبِرُوْنَ ۚ﴾ (25/الفرقان:20) ''اور ہم نے تم میں سے ہر ایک کو دوسرے کی آزمائش کا ذریعہ بنا دیا۔ کیا تم صبر کرو گے۔'' (نوٹ: صبر کی مزید تفصیل آگے نوٹ 1 میں دیکھیں)۔

اِصْبِرْ ج: اِصْبِرُوْا۔ فعل امر ہے۔ تو ثابت قدم رہ۔ تو برداشت کر۔ اوپر آیت نمبر (46/الاحقاف:35) دیکھیں۔ ﴿فَاصْبِرُوْا حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ بَيْنَنَا ۚ﴾ (7/الاعراف:87) ''تو تم صبر کرو جب تک اللہ فیصلہ کرے ہمارے درمیان۔''

صَابِرٌ ج: صَابِرُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ ثابت قدم رہنے والا۔ برداشت کرنے والا۔ ﴿قَالَ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ صَابِرًا﴾ (18/الکہف:69) ''حضرت موسیٰؑ نے جواب دیا کہ انشاء اللہ آپ مجھے صبر کرنے والا پائیں گے۔'' ﴿اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ﴾ (8/الانفال:65) ''اگر ہوں تم میں بیس ثابت قدم رہنے والے، تو وہ لوگ غالب ہوں گے دو سو پر۔'' ﴿قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۡ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ۝۱۰۲﴾ (37/الصافات:102) ''بیٹے نے جواب دیا ابا جان آپ کر دیجیے جو آپ کو حکم ہوا انشاء اللہ آپ مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے۔''

صَابِرَةٌ ج: صَابِرَاتٌ۔ صبر کرنے والی۔ ﴿فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ﴾ (8/الانفال:66) ''پس اگر تم میں سے ایک سو صبر کرنے والے ہوں گے تو وہ دو ہزار پر غالب آئیں گے۔'' ﴿وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ﴾ (33/الاحزاب:35) ''اور صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں۔''

صَبَّارٌ فَعَّالٌ کے وزن پر مبالغہ کا صیغہ ہے۔ بہت زیادہ ثابت قدم رہنے والا۔ بہت زیادہ جھیلنے اور برداشت کرنے والا۔ ﴿اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ۝۵﴾ (14/ابراھیم:5) ''بیشک اس میں نشانیاں ہیں ہر ایک بہت زیادہ ثابت قدم رہنے والے، شکر گزار کے لیے۔''

صَبْرٌ اسم ذات بھی ہے۔ ثابت قدمی۔ برداشت۔ استقامت۔ استقلال۔﴿ وَ تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ۬ وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝۳ ﴾ (103/العصر:3)''اور باہم تاکید کی حق کی اور باہم تاکید کی ثابت قدمی کی۔''اور آیت زیر مطالعہ۔

مَا اَصْبَرَ صیغۂ تعجب ہے۔﴿ فَمَاۤ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ۝۱۷۵ ﴾(2/البقرۃ:175)''تو وہ کتنے ثابت قدم ہیں آگ پر۔''

(مفاعلہ) مُصَابَرَةً کسی کے مقابلہ پر ثابت قدم رہنا۔ عام طور پر یہ لفظ دشمن کے مقابلے میں ثابت قدم رہنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

صَابِرْ ج: صَابِرُوْا۔ فعل امر ہے۔ ثابت قدمی میں غالب آ ؤ یا غالب رہو۔﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَ صَابِرُوْا وَ رَابِطُوْا ۟ ﴾(3/آل عمران:200)''اے ایمان والو صبر کرو اور ثابت قدم رہو (دشمن کے مقابلے میں) اور کمر بستہ رہو (خدمت دین کے لیے)۔''(ترجمہ ضیاء القرآن)۔

(افتعال) اِصْطِبَارًا اہتمام سے ڈٹے رہنا۔ ثابت قدم رہنا۔

اِصْطَبِرْ فعل امر ہے۔ اہتمام سے ڈٹے رہو۔ ثابت قدم رہو۔﴿ وَ اْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَ اصْطَبِرْ عَلَیْهَا ؕ ﴾(20/طٰہٰ:132) ''اور حکم دو اپنے گھر والوں کو نماز کا اور خود ڈٹے رہو اس پر یعنی نماز پر۔''

اَلصَّلٰوۃُ (ص ل و): البقرۃ آیت 3 دیکھیں۔ کَبِیْرَۃٌ: (ک ب ر) البقرۃ آیت 34 دیکھیں۔ اِلَّا: البقرۃ آیت 34 دیکھیں۔

خ ش ع

(ف) خُشُوْعًا عاجزی کرنا۔ جھک جانا۔ (خشوع اصل میں وہ قلبی سکون اور انکساری ہے جو اللہ کی عظمت اور اس کے سامنے اپنی حقارت کے علم سے پیدا ہو۔ اس سے اطاعت میں آسانی ہو جاتی ہے۔ کبھی اس کے آثار بدن پر بھی ظاہر ہونے لگتے ہیں جس کو خضوع کہتے ہیں)۔ آنکھوں کے لیے یہ لفظ استعمال ہو تو مطلب ہوتا ہے آنکھوں کا جھک جانا۔ آواز کے لیے یہ لفظ استعمال ہو تو مطلب ہوتا ہے آواز کا آہستہ اور پست ہو جانا۔ زمین کے لیے استعمال ہو تو مطلب ہوتا ہے زمین کا خشک اور بنجر ہو جانا۔ چہرے کے لیے استعمال ہو تو مطلب ہوتا ہے چہرے کا جھک جانا۔ عربی زبان میں اونٹ کا کوہان اگر لاغری کے سبب سے بیٹھ جائے تو اس کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔﴿ اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ ﴾(57/الحدید:16)''کیا وقت نہیں آیا ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے کہ جھک جائیں ان کے دل اللہ کے ذکر سے۔''﴿ وَ خَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا ۝۱۰۸ ﴾(20/طٰہٰ:108)''اور پست ہو جائیں گی آوازیں اللہ کے حضور، پس تو نہیں سنے گا مگر کچھ گھس پھس۔''(نوٹ: خشوع کی حقیقت آگے نوٹ 2 میں دیکھیں)۔

خَاشِعٌ ج: خَاشِعُوْنَ اور خُشَّعٌ۔ اسم الفاعل ہے۔ مذکر کا صیغہ۔ جھکنے والا۔ عاجزی کرنے والا۔﴿ لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَیْتَهٗ خَاشِعًا ﴾(59/الحشر:21)''اگر ہم نے اتارا ہوتا اس قرآن کو کسی پہاڑ پر تو آپؐ اُس کو دیکھتے کہ وہ جھک جاتا۔''﴿ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝۲ ﴾(23/المؤمنون:2)''وہ لوگ جو اپنی نماز میں عاجزی کرنے والے ہیں۔''﴿ خُشَّعًا اَبْصَارُهُمْ ﴾(54/القمر:7)''اُن کی آنکھیں جھکی ہوں گی۔''

خَاشِعَةٌ ج: خَاشِعَاتٌ۔ اسم الفاعل ہے۔ مونث کا صیغہ۔ جھکنے والی۔ عاجزی کرنے والی۔﴿ اَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ ۝۹ ﴾(79/النّٰزعٰت:9)''اُن کی آنکھیں (ڈر سے) جھکی ہوں گی۔''﴿ وُجُوْهٌ یَّوْمَىِٕذٍ خَاشِعَةٌ ۝۲ ﴾(88/الغاشیۃ:2) ''کتنے ہی چہرے اُس دن (ذلت کی وجہ سے) جھکے ہوں گے۔''﴿ وَ مِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنَّكَ تَرَى الْاَرْضَ خَاشِعَةً ﴾

(41/حٰم السجدۃ:39)''اور اُس کی قدرت کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ تو دیکھتا ہے زمین کو کہ وہ خشک اور بنجر ہے۔''

﴿ وَالْخٰشِعِیْنَ وَالْخٰشِعٰتِ ﴾(33/الاحزاب:35)''اور عاجزی کرنے والے مرد اور عاجزی کرنے والی عورتیں۔''

ترکیب 'وَ' عطف کا ہے اور فعل اِسْتَعِیْنُوْا، آیت 43 میں اِرْکَعُوْا پر عطف ہے۔ اِسْتَعِیْنُوْا فعل امر کا صیغہ ہے۔ اس کا فاعل اس میں شامل اَنْتُمْ کی ضمیر ہے اور بِالصَّبْرِ متعلق فعل ہے۔ یہاں ایک بات نوٹ کرلیں کہ استعانت کے اَفعال کا مفعول یعنی جس کی مدد طلب کی جائے، وہ بنفسہٖ آتا ہے۔ (جیسے نَسْتَعِیْنُکَ) اور جس چیز کے ذریعے اس کی مدد حاصل کی جائے اس پر بِ کا صلہ آتا ہے۔ اس آیت میں اِسْتَعِیْنُوْا کے ساتھ بِالصَّبْرِ آیا ہے۔ اس سے معلوم ہوگیا کہ اِسْتَعِیْنُوْا کا مفعول محذوف ہے جو کہ اللہ ہے۔ وَالصَّلٰوۃِ میں پھر 'وَ' عطف کا ہے اور اَلصَّلٰوۃِ، اَلصَّبْرِ پر عطف ہے اسی لیے حالت جر میں ہے۔ وَاِنَّھَا میں 'وَ' کو استئنافیہ اور حالیہ دونوں مانا گیا ہے۔ اِنَّ حرف مشبہ بالفعل ہے۔ اس کا اسم منصوب آتا ہے اسی لیے اس کے ساتھ ضمیر 'ھَا' آئی ہے جو کہ اَلصَّلٰوۃِ کے لیے ہے۔ لَکَبِیْرَۃٌ اس کی خبر ہے جس پر لام تاکید داخل ہے۔ اس لام تاکید کو 'لام مزحلقہ' کہتے ہیں۔ اِلَّا حصر کے لیے ہے اور جار مجرور عَلَی الْخٰشِعِیْنَ متعلق خبر ہے۔

وَالصَّلٰوۃِ	بِالصَّبْرِ	وَاسْتَعِیْنُوْا	ترجمہ
اور نماز سے	صبر سے	اور تم مدد لو	البقرۃ:45

عَلَی الْخٰشِعِیْنَ	اِلَّا	لَکَبِیْرَۃٌ	وَاِنَّھَا
عاجزی کرنے والوں پر (بھاری نہیں)	مگر	بھاری ہے	اور یقیناً وہ (نماز)

نوٹ:1 صَبْرٌ: صبر قرآن وسنت کی اہم ترین اصطلاحوں میں سے ایک ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ سورۃ العصر میں نجات کے چار لوازم بیان ہوئے ہیں جن میں سے ایک صبر ہے۔ دنیا کی اقوام میں سے جس کسی پر بھی اللہ تعالیٰ کے انعامات کی بارش ہوئی وہ اسی صبر کی وجہ سے ہوئی۔ مثلاً فرمایا:﴿ وَتَمَّتْ کَلِمَتُ رَبِّکَ الْحُسْنٰی عَلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ۙ بِمَا صَبَرُوْا ؕ﴾(7/الاعراف:137)''اور پورا ہوگیا نیکی کا وعدہ تیرے رب کا بنی اسرائیل پر بسبب ان کے صبر کرنے کے۔''(ترجمہ شیخ الہندؒ)﴿ وَجَعَلْنَا مِنْھُمْ اَئِمَّۃً یَّھْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا ؕ﴾(32/السجدۃ:24)''اور ہم نے ان میں جب کہ انہوں نے صبر کیا پیشوا بنادیے تھے جو ہمارے حکم سے ہدایت کیا کرتے تھے۔''(ترجمہ ماجدیؒ)۔ اردو زبان میں اس کا ترجمہ لفظ ''صبر'' ہی سے کیا جاتا ہے لیکن اردو میں یہ لفظ بہت محدود معنوں میں استعمال ہوتا ہے عام طور پر اردو زبان میں مجبوری کا نام صبر ہے۔ ظلم کے آگے گھٹنے ٹیک دینے کا نام صبر ہے۔ کوئی تکلیف اور مصیبت آپڑے تو غم کا اظہار نہ کرنا صبر ہے۔ اسی طرح انگریزی زبان میں بھی کوئی ایک لفظ ایسا نہیں جو صبر کی معنوی وسعت کو بیان کرے۔ البتہ دو لفظوں کو اگر ملا لیا جائے تو صبر کے مفہوم کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ وہ دو لفظ ہیں: Patience اور Endurance۔ اردو اور انگریزی کی بنسبت عربی میں اور قرآن وسنت کی اصطلاح میں اس کا معنی بہت وسیع ہے۔ مولانا مودودیؒ صبر کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''صبر کے لغوی معنی روکنے اور باندھنے کے ہیں اور اس سے مراد ارادے کی وہ مضبوطی، عزم کی وہ پختگی اور خواہشات نفس کا وہ انضباط (ضابطہ، ڈھنگ) ہے جس سے ایک شخص نفسانی ترغیبات اور بیرونی مشکلات کے مقابلے میں اپنے قلب وضمیر کے پسند کیے ہوئے راستے پر لگاتار بڑھتا چلا جائے۔''(تفہیم القرآن، ج ۱، ص ۷۳)۔ حضرت مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں: ''صبر کے لفظی معنی روکنے اور باندھنے کے ہیں اور اصطلاح قرآن وسنت میں نفس کو خلافِ طبع چیزوں پر جمائے رکھنے کو صبر کہا جاتا ہے۔'' (معارف القرآن، ج ۲، ص ۲۷۴)۔ مولانا امین احسن اصلاحیؒ فرماتے ہیں: ''لفظ 'صبر' کے اصل معنی روکنے کے ہیں یعنی نفس کو گھبراہٹ، مایوسی اور دل برداشتگی سے بچا کر اپنے موقف پر جمائے رکھنا۔ قرآن مجید میں اسی حقیقت نے کچھ زیادہ پاکیزہ صورت اختیار کرلی ہے۔ یعنی قرآن میں عموماً اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ بندہ پوری طمانیت قلب کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے عہد پر ڈٹا رہے اور اس کے وعدوں پر یقین رکھے اور اس راہ میں اس کو جن مشکلات سے بھی دوچار ہونا پڑے ان کو پرکاہ کے برابر بھی وقعت

نہ دے۔‘‘ (تدبر قرآن، ج ا،ص ۱۸۸)۔ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ فرماتے ہیں: ’’صبر کے لفظی معنی تنگی اور ناخوشگواری کی حالت میں اپنے کو روکے رہنے کے ہیں اور اصطلاحِ شریعت میں اس کے معنی یہ ہیں کہ نفس کو عقل پر غالب نہ آنے دیا جائے، اور قدم دائرہ شریعت سے باہر نہ نکالا جائے۔ صبر کے یہ معنی نہیں کہ جو امور طبعی اور بشری ہیں، اُن کے آثار کو بھی اپنے اوپر طاری نہ ہونے دیا جائے۔ بھوک کے وقت مضمحل اور نڈھال ہو جانا، درد کی تکلیف سے کراہنا، رنج کے وقت آہ سرد بھرنا، عزیزوں قریبوں کی موت پر آنسوؤں سے رونا، ان میں سے کوئی شے بھی صبر کے منافی اور بے صبری میں داخل نہیں۔‘‘ پھر آگے لکھتے ہیں: ’’صبر کرنے کے معنی یہ نہیں کہ بندہ بالکل بے حس ہو جائے اور غم کو غم محسوس ہی نہ کرے۔ اس کا نام صبر نہیں، بے حسی ہے۔ صبر یہ ہے کہ انتہائی غمناک و دردانگیز واقعہ پر بندہ عقل کو نفس پر غالب رکھے، زبان کو شکوہ اور ناشکری سے آلودہ نہ ہونے دے اور نظر مسبب الاسباب پر، اُس کی مصلحت و حکمت پر اُس کی شفقت و رحمت پر رکھے۔

غم میں بھی قانونِ فطرت سے میں کچھ بدظن نہیں
یہ سمجھتا ہوں کہ میرا دوست ہے، دشمن نہیں (اکبرؒ)

(تفسیر ماجدیؒ، ص ۷۵-۷۶)

صاحبؒ تفسیر حقانی فرماتے ہیں: ’’صبر عقل کا اتباع کر کے نفس کو غضب اور شہوت سے روکنے کو کہتے ہیں اس لیے جس میں یہ دونوں چیزیں ہوں گی، صبر اسی کو نصیب ہوگا۔ ملائکہ میں چونکہ غضب اور شہوت نہیں بلکہ صرف عقل ہے تو اس لیے ان کو بھی یہ نعمت نصیب نہیں اور دیگر حیوانات میں عقل نہیں، غضب اور شہوت ہے اسی لیے وہ بھی اس سعادت سے فیضیاب نہیں۔ (تفسیر حقانی، ج ا،ص ۵۹۲)۔

<u>**صبر کی قسمیں:**</u> حضرت مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں: ’’صبر کی تین قسمیں ہیں اوّل: صبر علی الطاعات، یعنی جن کاموں کا اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسولؐ نے حکم دیا ہے، ان کی پابندی طبیعت پر کتنی بھی شاق ہو اس پر نفس کو جمائے رکھنا۔ دوسرے: صبر عن المعاصی، یعنی جن چیزوں سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ نے منع فرمایا ہے وہ نفس کے لیے کتنی ہی مرغوب ولذیذ ہوں نفس کو اس سے روکنا۔ تیسرے: صبر علی المصائب، یعنی مصیبت و تکلیف پر صبر کرنا حد سے زائد پریشان نہ ہونا، اور سب تکلیف و راحت کو حق تعالیٰ کی طرف سے سمجھ کر نفس کو بے قابو نہ ہونے دینا۔ اسی لیے حدیث میں رسولِ کریمؐ نے فرمایا: اَلصَّبْرُ عِنْدَ الصَّدْمَةِ الْاُوْلٰی، یعنی اصل اور معتبر صبر تو وہی ہے جو ابتداءِ صدمہ کے وقت اختیار کر لیا جائے۔‘‘ (معارف القرآن، ج ۲،ص ۲۷۴ اور ج ۵،ص ۱۹۱)۔ صاحبؒ تفسیر حقانی صبر کی قسموں کے متعلق لکھتے ہیں: واضح ہو کہ صبر کی دو قسمیں ہیں: بدنی اور نفسانی۔ پھر بدنی کی بھی دو قسمیں ہیں: فعلی، جیسا کہ بڑے بھاری اور مشقت کے کاموں کو کرنا۔ انفعالی، درد اور تکلیف کو برداشت کرنا۔ گو اس تکلیف کے آثار خود بخود بشری تقاضوں سے ظاہر ہو جائیں مگر یہ شخص اس حالت میں بھی خلاف قانون عقل و شرع کوئی حرکت نہ کرے اور صبر نفسانی یہ ہے کہ نفس کو اس کی خواہشوں سے روکے۔ اگر ناجائز کھانے پینے اور جنسی خواہش کو روکے گا تو اس کو عفت کہیں گے اور اگر فضول چیزوں کی خواہش سے روکے گا تو اس کو زہد و قناعت کہیں گے۔ اگر غصہ کی حالت میں اپنے دشمن سے درگزر کرے گا اور نفس کو انتقام لینے سے روکے گا تو اس کو حلم کہیں گے۔ اگر کسی کے راز افشاء کرنے سے زبان کو بند کرے گا تو اس کو رازداری کہیں گے اور جو زبان کو بیہودہ بکواس سے اور اپنے اعضاء کو بے جا حرکات سے بند کرے گا تو اس کو متانت کہیں گے۔ اسلام نے اس امت کے لیے صبر کی ایک شاخ روزہ کو بھی فرض کر دیا تاکہ نفس کو بھوک اور پیاس کی تکلیف اٹھانے کی عادت پڑے اور جماع جیسی مرغوب چیز کو باوجود سامان مہیا ہونے کے ترک کرنے کا خوگر ہو‘‘ (تفسیر حقانی، ج ا،ص ۵۹۲، تلخیصاً)۔ چنانچہ حدیث میں روزے کو صبر کہا گیا ہے، فرمایا: صِيَامُ شَهْرِ الصَّبْرِ وَثَلَاثَةِ اَيَّامٍ فِيْ كُلِّ شَهْرٍ يُذْهِبُ وَحَرَ الصَّدْرِ۔ ماہ رمضان اور ہر ماہ میں تین روزے سینہ سے بغض کو نکال ڈالتے ہیں۔‘‘ (مفردات القرآن، ج ۲،ص ۵۶۷)۔

<u>**صبر کا اجر:**</u> صبر کا اجر بے حساب ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝﴾ (39/الزمر:10) ’’صبر کرنے والوں کو ان کا اجر بے حساب دیا جائے گا۔‘‘

نوٹ 2: خشوع کی حقیقت: حضرت شیخ الاسلام علامہ عثمانیؒ فرماتے ہیں: خشوع کے معنی ہیں کسی کے سامنے خوف و ہیبت کے ساتھ ساکن اور پست ہونا، چنانچہ ابن عباسؓ نے ''خَاشِعُوْنَ'' کی تفسیر ''خائفون ساکنون'' سے کی ہے۔ اور آیت ''تَرَی الْاَرْضَ خَاشِعَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَ رَبَتْ ط'' بھی دلالت کرتی ہے کہ ''خشوع'' میں ایک طرح کا سکون و تذلل معتبر ہے۔ قرآن کریم میں ''خشوع'' کو وجوہ، ابصار، اصوات وغیرہ کی صفت قرار دیا ہے۔ اور ایک جگہ آیت اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ میں قلب کی صفت بتلائی ہے معلوم ہوتا ہے کہ اصل خشوع قلب کا ہے اور اعضائے بدن کا خشوع اس کے تابع ہے۔'' (تفسیر عثمانی، ص ۴۵۵) ۔حضرت مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں: ''قرآن و سنت میں جہاں خشوع کی ترغیب مذکور ہے اس سے مراد وہ قلبی سکون و انکساری ہے، جو اللہ کی عظمت اور اس کے سامنے اپنی حقارت کے علم سے پیدا ہوتی ہے، اس کے نتیجہ میں طاعت آسان ہو جاتی ہے، کبھی اس کے آثار بدن پر بھی ظاہر ہونے لگتے ہیں کہ وہ باادب، متواضع اور شکستہ قلب نظر آتا ہے، اگر دل میں خوف خدا اور تواضع نہ ہو تو خواہ وہ ظاہر میں کتنا ہی باادب اور متواضع نظر آئے وہ خشوع کا حامل نہیں۔ بلکہ آثار خشوع کا قصداً اظہار کرنا بھی پسندیدہ نہیں، حضرت عمرؓ نے ایک نوجوان کو دیکھا کہ سر جھکائے بیٹھا ہے، فرمایا: سر اٹھا، خشوع دل میں ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیم نخعیؒ کا ارشاد ہے کہ ''موٹا پہننے، موٹا کھانے اور سر جھکانے کا نام خشوع نہیں، خشوع تو یہ ہے کہ تم حق کے معاملہ میں شریف و رذیل کے ساتھ یکساں سلوک کرو، اور اللہ نے جو تم پر فرض کیا ہے اُسے ادا کرنے میں اللہ کے لیے قلب کو فارغ کر لو۔'' حضرت حسنؒ کا ارشاد ہے کہ: حضرت عمرؓ جب بات کرتے تو سنا کر کرتے تھے، جب چلتے تو تیز چلتے، اور جب مارتے تو زور سے مارتے تھے، حالانکہ بلاشبہ وہ خشوع رکھنے والے تھے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اپنے قصد و اختیار سے خاشعین کی سی صورت بنانا شیطان اور نفس کا دھوکہ ہے اور مذموم ہے، ہاں اگر بے اختیار یہ کیفیت ظاہر ہو جائے تو معذور ہے۔ (قرطبیؒ)

فائدہ: خشوع کے ساتھ ایک دوسرا لفظ خضوع بھی استعمال ہوتا ہے، قرآن کریم میں بھی بار بار آیا ہے، یہ دونوں لفظ تقریباً ہم معنی ہیں لیکن خشوع کا لفظ اصل کے اعتبار سے آواز اور نگاہ کی پستی اور تذلل کے لیے بولا جاتا ہے، جب کہ وہ مصنوعی نہ ہو بلکہ قلبی خوف اور تواضع کا نتیجہ ہو، قرآن کریم میں ہے خَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ (آوازیں پست ہو گئیں) اور خضوع کا لفظ بدن کی تواضع اور انکساری کے لیے استعمال ہوتا ہے، قرآن حکیم میں ہے: فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِيْنَ (4:26) ''پس اُن کی گردنیں اس کے سامنے جھک گئیں۔'' (معارف القرآن، ج ۱، ص ۲۲۰)

آیت: 46

﴿اَلَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَ اَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۴۶﴾ ع﴾

ظ ن ن

(ن) ظَنًّا علماءِ لغت فرماتے ہیں کہ ظَنٌّ ان الفاظ میں سے ہے جو مختلف اور متضاد معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کا لفظی معنی ہے خیال کرنا۔ گمان کرنا۔ پھر کسی کے بارے میں خیال و گمان کرنا کبھی تو یقین کی حد تک پہنچ جاتا ہے اور کبھی شک اور وہم سے آگے نہیں بڑھتا۔ چنانچہ یہ لفظ یقین کرنا اور شک کرنا، دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اصل میں کسی چیز کی علامات سے جو نتیجہ حاصل ہو اسے ظَنٌّ کہتے ہیں۔ اگر علامات قوی ہوں تو ظَنٌّ علم اور یقین کے معنی دیتا ہے اور اگر علامات کمزور ہوں تو شک اور وہم کے معنی دیتا ہے۔ قرآن مجید میں اس کے ماضی، مضارع کے صیغے اور ظَنٌّ بطور اسم ذات اِن معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ظَنٌّ کے عام طور پر دو مفعول ہوتے ہیں یعنی کسی کو گمان کیا اور کیا گمان کیا جیسے فرمایا ﴿وَّ مَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ﴾ (18/الکہف:36) ''اور میں یہ خیال نہیں کرتا کہ قیامت بھی برپا ہوگی۔'' اور کبھی دو مفعولوں کے قائم مقام ایک جملہ آ جاتا ہے۔ ﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ﴾ (2/البقرۃ:249)

''اور کہا ان لوگوں نے جو خیال کرتے تھے کہ وہ لوگ اللہ سے ملاقات کرنے والے ہیں۔''﴿وَ ظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اِلَيْنَا لَا يُرْجَعُوْنَ ۝﴾ (28/القصص:39)''اور انہوں نے خیال کیا کہ وہ لوگ ہماری طرف نہیں لوٹائے جائیں گے۔''
(ظَنٌّ کی مزید تفصیل آگے نوٹ میں دیکھیں)۔

ظَنٌّ ج: ظُنُوْنٌ۔اسم ذات بھی ہے۔خیال۔گمان۔﴿مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ﴾(4/النساء:157)''نہیں ان کے پاس اس امر کا کوئی صحیح علم بجز اس کے کہ وہ پیروی کرتے ہیں گمان کی۔''﴿وَ تَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا ۝﴾ (33/الاحزاب:10)''اور تم اللہ تعالیٰ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کرنے لگ گئے۔''

ظَانٌّ ج: ظَآنُّوْنَ۔اسم الفاعل ہے۔خیال کرنے والا۔﴿الظَّآنِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ ۭ﴾(48/الفتح:6)''خیال کرنے والے اللہ کے بارے میں برا خیال۔''

مُلٰقُوْنَ (ل ق ی): البقرۃ آیت 14 دیکھیں۔	رَبٌّ (ر ب ب): الفاتحہ آیت 1 دیکھیں۔
رٰجِعُوْنَ (ر ج ع): البقرۃ آیت 18 دیکھیں۔	

ترکیب یہ پوری آیت گزشتہ آیت میں اَلْخٰشِعِيْنَ کی صفت ہے۔ اَلَّذِيْنَ اسم موصول ہے، يَظُنُّوْنَ فعل اور اس کا فاعل اس میں شامل هُمْ کی ضمیر ہے۔اگلا جملہ قائم مقام ہے دومفعولوں کا۔اس میں اَنَّ حرف مشبہ بالفعل ہے، هُمْ اِس کا اسم اور مُلٰقُوْا رَبِّهِمْ اس کی خبر۔مُلٰقُوْا دراصل باب مفاعلہ کے اسم الفاعل مُلَاقٍ کی جمع مُلَاقُوْنَ ہے۔مضاف ہونے کی وجہ سے نون اعرابی گرا ہوا ہے اور الف کا اضافہ قرآن مجید کا مخصوص املاء ہے۔رَبِّ اس کا مضاف الیہ ہونے کی وجہ سے حالت جر میں ہے اور آگے هِمْ کا مضاف ہونے کی وجہ سے لام تعریف اور تنوین سے خالی ہے۔آگے 'وَ' عطف کا ہے اَنَّ حرف مشبہ بالفعل، هُمْ اس کا اسم، اِلَيْهِ متعلق فعل ہے اور رٰجِعُوْنَ خبر۔یہ جملہ عطف ہے اَنَّهُمْ مُلٰقُوْا رَبِّهِمْ پر اور عطف اور معطوف مل کر مفعول ہیں يَظُنُّوْنَ کا اور یہ قائم مقام ہے دومفعولوں کے۔جملہ فعلیہ يَظُنُّوْنَ اپنے فاعل اور مفعول کے ساتھ مل کر صلہ ہے، اَلَّذِيْنَ کا۔صلہ اور موصول مل کر صفت ہے اَلْخٰشِعِيْنَ کی۔(واللہ اعلم)۔

ترجمہ	اَلَّذِيْنَ	يَظُنُّوْنَ	اَنَّهُمْ	مُلٰقُوْا رَبِّهِمْ
البقرۃ:46	وہ لوگ جو	یقین کرتے ہیں	کہ وہ	اپنے رب سے ملاقات کرنے والے ہیں

وَ اَنَّهُمْ	اِلَيْهِ	رٰجِعُوْنَ ۝
اور یہ کہ وہ	اس کی طرف ہی	لوٹنے والے ہیں

نوٹ علماء کرام نے قرآن مجید میں اس فرق کو سمجھنے کے لیے کہ کہاں ظن، یقین کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور کہاں شک کے معنی میں، کچھ ضابطے بیان کیے ہیں۔مثلاً ہر وہ مقام جہاں ظن کی تعریف آئی ہے اور اس پر ثواب کا وعدہ فرمایا گیا ہے وہاں یقین مراد ہے اور ہر وہ مقام جہاں اس کی مذمت آئی ہے اور اس پر عذاب کی دھمکی دی گئی ہے وہاں یہ شک اور وہم کے معنی میں ہے۔ہر وہ مقام جہاں اس کے بعد اَنَّ یا اَنْ آئے وہاں یہ یقین کے معنی دیتا ہے چاہے حقیقت کے اعتبار سے وہ یقین صحیح ہو یا غلط مثلاً﴿قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ﴾(2/البقرۃ:249)''وہ لوگ جن کو یقین تھا کہ وہ ملاقات کرنے والے ہیں اللہ سے، انہوں نے کہا۔''﴿وَّ ظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ ۝﴾(75/القیامۃ:28)''اور اس (جان) نے یقین کر لیا کہ اب جدائی ہے۔''اور آیت زیر مطالعہ میں فرمایا:﴿الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ﴾''وہ لوگ جن کو یقین ہے کہ وہ ملاقات کرنے والے ہیں اپنے رب سے۔''﴿اِنِّيْ ظَنَنْتُ اَنِّيْ

مُلٰقٍ حِسَابِيَهْ ﴿٢٠﴾﴾ (69/ الحاقۃ:20) ''مجھے یقین تھا کہ میں اپنے حساب کو پہنچوں گا۔'' ان آیات میں ظن، یقین کا معنی دے رہا ہے اور یہ یقین حقیقت کے اعتبار سے صحیح بھی ہے۔ اب یہ آیات دیکھیں ﴿وَظَنَّ اَهْلُهَآ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَآ﴾ (10/ یونس:24) ''اور یقین کر لیا اس کے مالکوں نے کہ (اب) انہوں نے قابو پا لیا ہے اس پر۔'' ﴿وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اِلَيْنَا لَا يُرْجَعُوْنَ ﴿٣٩﴾﴾ (28/ القصص:39) ''انہوں نے یہ گمان کیا کہ انہیں ہماری طرف نہیں لوٹایا جائے گا۔'' ﴿بَلْ ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّنْقَلِبَ الرَّسُوْلُ﴾ (48/ الفتح:12) ''اور تمہیں یقین تھا کہ اب رسولؐ کبھی لوٹ کر نہ آئیں گے۔'' اِن آیات میں ظن، یقین ہی کا معنی دے رہا ہے لیکن یہ یقین حقیقت کے اعتبار سے غلط ہے۔ اسی طرح حضرت یونسؑ کے بارے میں فرمایا: ﴿وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ﴾ (21/ الانبیاء:87) ''اور یاد کرو ذوالنون کو جب وہ چل دیے غضبناک ہو کر اور یہ خیال کیا کہ ہم ان پر کوئی گرفت نہیں کریں گے۔'' یہاں بھی حضرت یونسؑ کو یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ ان سے اس معاملے میں سختی نہیں کریں گے کہ جب وہ اللہ کے لیے اپنی قوم سے ناراض ہو کر چل دیے لیکن حقیقت کے اعتبار سے یہ یقین غلط ثابت ہوا۔ اسی لیے امام راغبؒ کے نزدیک یہاں ظن بمعنی وہم لینا بہتر ہے۔ (واللّٰہ اعلم)۔ اور قرآن مجید میں وہ آیات جہاں ظن، وہم اور شک کے معنوں میں ہے وہاں عام طور پر اس سے پہلے اِنَّ یا اِنْ آتا ہے یا ظن کے مقابلے میں کوئی ایسا لفظ ہوتا ہے جو اِس کے مفہوم کو شک اور وہم کے ساتھ مخصوص کرتا ہے یا اِس کی کوئی ایسی صفت بیان کی جاتی ہے جس سے اس کی مذمت ہوتی ہے مثلاً ﴿اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا ﴿٢٨﴾﴾ (53/ النجم:28) ''بیشک ظن، حق کے مقابلہ میں کچھ کام نہیں آتا۔'' اس مثال میں اِنَّ اور ظنّ کے مقابلہ میں حق، دونوں باتیں ظنّ کے معنی وہم و شک بتا رہی ہیں۔ ﴿اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ ﴿٣٢﴾﴾ (45/ الجاثیہ:32) ''ہم تو اُسے محض وہم ہی خیال کرتے ہیں اور اس پر یقین نہیں آتا۔'' اس مثال میں اِنْ اور ظنّ کے مقابلہ میں یقین کے الفاظ ظن کے معنی وہم بنا دیتے ہیں۔ اسی طرح الفتح:6 میں ظَنَّ السَّوْءِ (برا خیال) اور آل عمران:154 میں ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ (جاہلیت کا گمان) کے الفاظ سے اس کی مذمت کی گئی ہے۔

اب قرآن مجید میں سورۃ الحجرات کی آیت 12 دیکھیں جس میں فرمایا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۫ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ﴾ ''اے ایمان والو دور رہا کرو بکثرت بدگمانیوں سے بلاشبہ بعض بدگمانیاں گناہ ہیں۔'' اس آیت کے تحت پیر کرم شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں: ''ان کلمات کو دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ مطلقاً ظن سے نہیں روکا اور نہ ہر قسم کے ظن کو گناہ کہا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کئی ظن جائز ہیں۔ اس لیے علمائے کرام نے ظن کی متعدد قسمیں ذکر کی ہیں: واجب، مستحب، مباح اور ممنوع۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ حسن ظن کرنا واجب ہے۔ حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہؐ نے اپنے وصال سے تین روز پہلے فرمایا: لا یموتن احدکم الا وھو یحسن الظن باللہ عزوجل۔ تم میں سے کوئی نہ مرے مگر اس حالت میں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ حسن ظن رکھتا ہو۔ دوسرا ارشادِ نبویؐ ہے۔ یقول اللہ انا عند ظن عبدی بی فلیظن ماشاء کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مَیں اپنے بندے کے ساتھ وہی معاملہ کرتا ہوں جس کا وہ مجھ سے ظن رکھتا ہے۔ اب اس کی مرضی جیسا چاہے میرے ساتھ ظن رکھے۔ مستحب کی مثال: مومن کے ساتھ جس کا ظاہری حال اچھا ہو حسن ظن کرنا مستحب ہے۔ ایسا شخص جس کے احوال مشکوک ہوں اس کے متعلق سوءِ ظن کرنا مباح ہے، لیکن جب تک یقینی دلائل موجود نہ ہوں، اس وقت تک محض ظن کے مطابق اس کے خلاف کارروائی کرنا جائز نہیں۔ اسی کے متعلق حضورؐ کی حدیث ہے۔ اذا ظننتم فلا تحققوا۔ یعنی اگر کسی کے بارے میں شبہ پیدا ہو جائے تو اس کی تحقیق میں نہ لگ جاؤ۔ شریعت میں نصوص کے خلاف ظن و تخمین سے کام لینا ممنوع ہے۔'' (ضیاء القرآن، ج ۴، ص ۵۹۶)۔ بعض لوگوں نے سورہ یونس کی آیت 36 ﴿وَمَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا ۭ اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا ۭ﴾ ''اور نہیں پیروی کرتے ان میں سے اکثر مگر محض وہم و گمان کی بلاشبہ وہم و گمان بے نیاز نہیں کر سکتا حق سے ذرہ بھر۔'' سے حجیتِ حدیث میں شک و شبہے پیدا کیے ہیں جو کہ بالکل غلط ہے۔ اس کے جواب کے لیے حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی صاحبؒ کی ترجمان السنۃ اور حضرت پیر کرم شاہ صاحبؒ کی سنت خیر الانام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے صفحات 186 تا 200 تک کا مطالعہ انشاء اللہ مفید رہے گا۔

آیت:47

﴿يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۷﴾﴾

اِبْنٌ: البقرۃ آیت 40 دیکھیں۔ اِسْرَآءِيْلَ: البقرۃ آیت 40 دیکھیں۔ اُذْكُرُوْا (ذ ک ر): البقرۃ آیت 40 دیکھیں۔
نِعْمَةٌ اور اَنْعَمْتُ (ن ع م): الفاتحہ آیت 6 دیکھیں۔

ف ض ل

(ن) فَضْلًا — کسی چیز کا درمیانی درجے یا حق سے زیادہ ہونا۔ اس مادے میں ''زیادتی'' کا مفہوم ہوتا ہے۔ یہ پسندیدہ بھی ہے جیسے علم، حلم، حیاء یا رتبہ میں زیادہ ہونا۔ اور ناپسندیدہ بھی ہے جیسے غصے وغیرہ میں زیادہ ہونا۔ عام طور پر پسندیدہ چیز کے لیے فَضْلٌ اور ناپسندیدہ چیز کے لیے فُضُوْلٌ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ باب (ک) میں اس کا مطلب ہوتا ہے صاحب فضل ہونا۔ یعنی کسی شخص میں ایسی صفات ہونا جس سے وہ دنیا میں مدح وثناء کا مستحق ہو اور آخرت میں اجر وثواب کا۔ قرآن مجید میں ثلاثی مجرد سے فعل استعمال نہیں ہوا۔

فَضْلٌ — ج: فَضَائِلُ۔ اسم ذات بھی ہے۔ حق سے زیادہ دی ہوئی چیز۔ بڑائی۔ بزرگی۔ فضیلت۔ روزی۔ فضائل کا لفظ رذائل کے مقابلے پر بولا جاتا ہے۔ فضائل بمعنی اخلاق فاضلہ اور اخلاق حمیدہ اور رذائل بمعنی اخلاق رذیلہ یعنی برے اخلاق۔ ﴿قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۭ﴾ (3/آل عمران:73) ''آپ کہہ دیجئے یقیناً بڑائی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ دیتا ہے جس کو وہ چاہتا ہے۔'' ﴿وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۭ﴾ (2/البقرۃ:237) ''اور آپس کی فضیلت اور بزرگی کو فراموش نہ کرو۔'' روزی اور مالی نفع کو اکثر قرآن میں فضل کہا گیا ہے۔ مثلاً: ﴿فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ﴾ (62/الجمعۃ:10) ''پھر جب نماز پوری ہو چکے تو زمین پر چلو پھرو اور اللہ کی روزی تلاش کرو۔'' (ترجمہ ماجدیؒ) ﴿فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ﴾ (3/آل عمران:174) ''نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ کی نعمت وفضل کے ساتھ وہ لوٹے۔'' اس آیت میں فضل سے مراد وہ مالی نفع ہے جو بدر صغریٰ میں تجارت کے ذریعے سے حاصل ہوا۔ اس طرح کی اور بھی کئی آیات ہیں۔ یاد رہے کہ فَضْلٌ کے اصل معنی ''زیادتی'' کے ہیں۔ اس لیے اس کا اطلاق مال ودولت پر بھی ہوتا ہے جو بطور نفع انسان کو حاصل ہو اور اللہ تعالیٰ کے عطیہ پر بھی خواہ وہ دنیوی ہو یا اخروی۔

(تفعیل) تَفْضِيْلًا — کسی پسندیدہ چیز میں کسی کو زیادہ کرنا۔ زیادہ دینا۔ فضیلت دینا۔ بزرگی عطا کرنا۔ ﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ﴾ (2/البقرۃ:253) ''یہ رسول ہیں، ہم نے فضیلت دی ان میں سے بعض کو بعض پر۔'' ﴿وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ۚ﴾ (16/النحل:71) ''اور اللہ نے زیادہ کیا تم میں سے بعض کو بعض پر روزی میں۔'' مصیبت زدہ کو دیکھ کر پڑھنے کی مسنون دعا ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ عَافَانِيْ مِمَّا ابْتَلَاكَ بِهٖ وَفَضَّلَنِيْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقَ تَفْضِيْلًا۔

(تفعّل) تَفَضُّلًا — بڑا بننا۔ فضیلت حاصل کرنا۔ عَلٰی کے صلے کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ ﴿يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ ۭ﴾ (23/المومنون:24) ''یہ تم پر فضیلت اور بڑائی حاصل کرنا چاہتا ہے۔'' (ترجمہ احسن البیان)

اَلۡعٰلَمِیۡنَ (ع ل م): الفاتحہ آیت 1 دیکھیں۔

ترکیب یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ ... عَلَیۡکُمۡ تک کی ترکیب کے لیے آیت 40 دیکھیں۔ وَاَنِّیۡ میں 'وَ' عطف کا ہے اور اَنِّیۡ، نِعۡمَتِیَ پر عطف ہے۔ اَنَّ حرف مشبہ بالفعل ہے، 'یْ' اس کا اسم ہے اور جملہ فعلیہ فَضَّلۡتُکُمۡ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ اس کی خبر ہے۔

اَنۡعَمۡتُ	الَّتِیۡۤ	نِعۡمَتِیَ	اذۡکُرُوۡا	یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ	ترجمہ
میں نے انعام کیا	جس کو	میری نعمت کو	تم لوگ یاد کرو	اے اسرائیل کے بیٹو	البقرۃ:47

عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۴۷﴾	فَضَّلۡتُکُمۡ	وَاَنِّیۡ	عَلَیۡکُمۡ
تمام جہانوں پر	میں نے فضیلت دی تم کو	اور یہ کہ	تم پر

نوٹ صاحبؒ تفسیر عثمانی فرماتے ہیں: ''اہل عالم پر فضیلت کا یہ مطلب ہے کہ جس وقت سے بنی اسرائیل کا وجود ہوا تھا اس وقت سے لے کر اس خطاب کے نزول تک تمام فرقوں سے افضل رہے کوئی اُن کا ہم پلہ نہ تھا، جب انہوں نے نبی آخرالزمان اور قرآن کا مقابلہ کیا تو وہ فضیلت بالکل جاتی رہی اور مغضوب علیھم اور ضلال کا لقب عنایت ہوا۔ اور حضورؐ کے متبعین کو کنتم خیر امۃ کا خلعت ملا۔'' (تفسیر عثمانی، ص ۱۰)

آیت:48

﴿وَاتَّقُوۡا یَوۡمًا لَّا تَجۡزِیۡ نَفۡسٌ عَنۡ نَّفۡسٍ شَیۡـًٔا وَّ لَا یُقۡبَلُ مِنۡهَا شَفَاعَةٌ وَّ لَا یُؤۡخَذُ مِنۡهَا عَدۡلٌ وَّ لَا هُمۡ یُنۡصَرُوۡنَ ﴿۴۸﴾﴾

اِتَّقُوۡا (و ق ی): البقرۃ آیت 2 دیکھیں۔ یَوۡمٌ: الفاتحہ آیت 3 دیکھیں۔

ج ز ی

(ض) جَزَاءً (1) کسی چیز کا کسی کے لیے کافی ہونا۔ (2) بدلہ دینا۔ یہ لفظ خیر کے بدلے میں اچھی جزا دینے اور برائی کے بدلے میں سزا دینے، دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ جب بدلہ دینے کا مفہوم ہو تو عام طور پر یہ دو مفعول کا تقاضا کرتا ہے یعنی کس کو بدلہ دیا اور کیا بدلہ دیا پھر 'بِ' کے صلے کے ساتھ اُس چیز کا ذکر ہوتا ہے جس چیز کی وجہ سے بدلہ دیا جائے۔ مثلاً ﴿وَ لَنَجۡزِیَنَّ الَّذِیۡنَ صَبَرُوۡۤا اَجۡرَهُمۡ بِاَحۡسَنِ مَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۹۶﴾﴾ (16/النحل:96) ''اور ہم ضرور عطا کریں گے انہیں جنہوں نے (ہر مصیبت میں) صبر کیا ان کا اجر ان کے اچھے اور مفید کاموں کے عوض جو وہ کیا کرتے تھے۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن) ﴿سَنَجۡزِی الَّذِیۡنَ یَصۡدِفُوۡنَ عَنۡ اٰیٰتِنَا سُوۡٓءَ الۡعَذَابِ بِمَا کَانُوۡا یَصۡدِفُوۡنَ ﴿۱۵۷﴾﴾ (6/الانعام:157) ''عنقریب ہم سزا دیں گے اُنہیں جو منہ موڑتے ہیں ہماری آیتوں سے برے عذاب سے اس وجہ سے کہ وہ منہ پھیرا کرتے تھے۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔ کبھی ایک مفعول ہوتا ہے جیسے فرمایا: ﴿لِیَجۡزِیَ اللّٰهُ الصّٰدِقِیۡنَ بِصِدۡقِهِمۡ﴾ (33/الاحزاب:24) ''تاکہ اللہ جزائے خیر دے سچوں کو اُن کے سچ کے

باعث۔'' (3) جب اس کے ساتھ عَنْ کا صلہ استعمال ہو تو مطلب ہوتا ہے کسی کے کام آنا جیسے آیت زیر مطالعہ میں فرمایا: ﴿لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ﴾ ''کام نہیں آئے گی کوئی جان کسی جان کے۔'' یا فرمایا: ﴿لَّا یَجْزِیْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِہٖ﴾ (31/لقمان:34) ''کام نہ آئے کوئی باپ اپنے بیٹے کے بدلے۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)۔ کسی کے حسن سلوک پر مسنون کلمہ جَزَاكَ اللّٰہُ خَیْرًا اسی سے ہے۔

جَزَاءٌ اسم ذات بھی ہے۔ وہ چیز جو کافی ہو۔ بدلہ۔ خیر کے بدلے میں خیر اور شر کے بدلے میں شر جَزَاءٌ کہلاتا ہے۔ ﴿فَمَا جَزَآءُ مَنْ یَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ﴾ (2/البقرۃ:85) ''تو اس کا کیا بدلہ ہے جو یہ کرے تم میں سے۔''

جَازٍ اسم الفاعل ہے۔ بدلہ دینے والا۔ کام آنے والا۔ کافی ہونے والا۔ ﴿وَلَا مَوْلُوْدٌ ھُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِہٖ شَیْـًٔا﴾ (31/لقمان:33) ''اور نہ کوئی اولاد کام آئے گی اپنے والد کے کچھ بھی۔''

جِزْیَۃٌ اسم ذات ہے۔ امان کا بدلہ۔ وہ ٹیکس جو اسلامی حکومت اپنے غیر مسلم شہریوں (ذمیوں) سے وصول کرتی ہے اور اسے جِزْیَۃٌ اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ ان کی جان و مال کی حفاظت کے بدلے میں ہوتا ہے۔ ﴿حَتّٰی یُعْطُوا الْجِزْیَۃَ عَنْ یَّدٍ﴾ (9/التوبۃ:29) ''یہاں تک کہ وہ لوگ جزیہ ادا کریں ہاتھ سے۔''

(مفاعلہ) **مُجَازَاۃً اور جِزَاءً** بدلہ دینا۔ ﴿وَھَلْ نُجٰزِیْٓ اِلَّا الْکَفُوْرَ﴾ (34/سبا:17) ''اور ہم یہ بدلہ اُسی کو دیتے ہیں جو ناشکر ہو۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)

نَفْسٌ (ن ف س): البقرۃ آیت 9 دیکھیں۔ شَیْءٌ: البقرۃ آیت 20 دیکھیں۔

ق ب ل

(ن) **قَبْلًا** کسی کی طرف توجہ کرنا۔ قرآن مجید میں اس باب سے فعل استعمال نہیں ہوا۔

(ف) **قَبْلًا** کسی چیز کا نزدیک ہونا۔ قریب ہونا۔ پہلے واقع ہونا۔ قرآن مجید میں اس باب سے بھی فعل استعمال نہیں ہوا۔

(س) **قَبُوْلًا، قُبُوْلًا** کسی چیز کو لے لینا۔ قبول کرنا۔ ﴿اَلَمْ یَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ ھُوَ یَقْبَلُ التَّوْبَۃَ عَنْ عِبَادِہٖ﴾ (9/التوبۃ:104) ''کیا وہ لوگ نہیں جانتے کہ اللہ ہی قبول کرتا ہے توبہ کو اپنے بندوں سے۔'' ﴿فَتَقَبَّلَھَا رَبُّھَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ﴾ (3/آل عمران:37) ''پھر قبول فرمایا اُسے اُس کے رب نے بڑی ہی اچھی قبولیت کے ساتھ۔'' اور آیت زیر مطالعہ۔

قَابِلٌ اسم الفاعل ہے۔ قبول کرنے والا۔ ﴿غَافِرِ الذَّنْۢبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ﴾ (40/المومن:30) ''گناہ کا بخشنے والا اور توبہ کا قبول کرنے والا۔''

قَبْلُ البقرہ آیت 4 کے تحت دیکھیں۔

قُبُلٌ (1) کسی چیز کا آگے کا حصہ۔ ﴿اِنْ کَانَ قَمِیْصُہٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَھُوَ مِنَ الْکٰذِبِیْنَ﴾ (12/یوسف:26) ''اگر اس کی قمیص پھٹی ہے آگے سے تو عورت نے سچ کہا اور وہ جھوٹوں میں سے ہے۔'' (2) آنکھوں کے سامنے۔ ﴿وَحَشَرْنَا عَلَیْھِمْ کُلَّ شَیْءٍ قُبُلًا﴾ (6/الانعام:111) ''اور زندہ کر دیں ہم ہر چیز کو اُن کے سامنے۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)

قِبَلٌ یہ دو معانی میں آتا ہے۔ (1) طرف۔ سمت۔ ﴿لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْھَکُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ﴾ (2/البقرۃ:177) ''نیکی یہی نہیں ہے کہ تم لوگ پھیر لو اپنے چہرے مشرق اور مغرب کی طرف۔'' ﴿فَمَالِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا قِبَلَكَ مُھْطِعِیْنَ﴾ (70/المعارج:36) ''پس کافروں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ تیری طرف دوڑتے آتے ہیں۔''

(2) طاقت۔ قدرت۔ ﴿فَلَنَاْتِيَنَّهُمْ بِجُنُوْدٍ لَّا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا﴾ (27/النمل:37) ''تو ہم لازماً پہنچیں گے ان کے پاس ایسے لشکروں کے ساتھ جس پر کسی قسم کی کوئی طاقت نہیں ہوگی ان کو۔''

قِبْلَةٌ اسم ذات ہے۔ قبلہ۔ وہ ''سمت'' (معارف القرآن) یا ''مکان'' (تفسیر ماجدیؒ) جس کی طرف متوجہ ہوا جائے۔ عرف عام میں اس سمت یا مکان (کعبہ) کو قبلہ کہا جاتا ہے جس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی جاتی ہے۔ اصل لغت کے اعتبار سے سامنے والے آدمی کی حالت کو قبلہ کہا جاتا ہے پھر یہ لفظ سامنے والے آدمی اور سامنے کی سمت کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ ﴿فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا﴾ (2/البقرۃ:144) ''تو ہم ضرور پھیر دیں گے آپؐ کو اُس قبلے کی طرف جسے آپؐ پسند کرتے ہیں۔'' اور سورۂ یونس کی آیت 87 میں جو فرمایا ﴿وَّ اجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً﴾ تو اس آیت مبارکہ میں قبلہ کے دو مفہوم بیان کیے گئے ہیں۔ پہلا یہ کہ اپنے گھروں کو ہی نماز پڑھنے کی جگہ بنالو اور دوسرا یہ کہ اپنے گھروں کو قبلہ رخ بناؤ۔ ہمارے بزرگوں نے آیت کا ترجمہ دونوں طرح سے کیا ہے۔ ''اور تم لوگ اپنے گھروں ہی کو نماز گاہ قرار دے لو'' (ترجمہ ماجدیؒ) ''اور تم سب اپنے انہی گھروں کو نماز پڑھنے کی جگہ قرار دے لو۔'' (ترجمہ احسن البیان) ''اور بناؤ اپنے گھر قبلہ رو'' (ترجمہ شیخ الہندؒ) ''اور بناؤ اپنے ان گھروں کو قبلہ رُخ۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)

قَبِيْلٌ (1) سامنے۔ ﴿اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ۙ﴾ (17/بنی اسرائیل:92) ''یا لے آ اللہ کو اور فرشتوں کو سامنے۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)

(2) ج: قُبُلٌ۔ جماعت۔ گروہ۔ مختلف اقسام ﴿اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَ قَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ؕ﴾ (7/الاعراف:27) ''وہ دیکھتا ہے تم کو اور اُس کی قوم جہاں سے تم اُن کو نہیں دیکھتے۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)۔ (نوٹ: قُبُلٌ کا لفظ 'کسی چیز کے آگے کے حصے' اور 'آنکھوں کے سامنے' کے معنوں میں استعمال ہونے کے علاوہ قَبِيْلٌ کی جمع بھی ہے بمعنی گروہ۔ جماعت۔)

قَبِيْلَةٌ ج: قَبَآئِلُ۔ قبیلہ۔ قبیلہ اس گروہ کو کہتے ہیں جو ایک ہی باپ کی نسل سے ہو۔ ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ﴾ (49/الحجرات:13) ''اے لوگو بے شک ہم نے تم کو پیدا کیا ایک مرد اور ایک عورت سے اور بنایا تم کو شاخیں اور قبیلے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔''

(افعال) **اِقْبَالًا** کسی کے سامنے ہونا۔ کسی کے سامنے یا آگے آنا۔ کسی کی طرف متوجہ ہونا یا رخ کرنا۔ ﴿فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَلَاوَمُوْنَ ۝﴾ (68/القلم:30) ''تو سامنے ہوئے ان میں سے ایک دوسرے کے، باہم ایک دوسرے کو ملامت کرتے ہوئے۔'' ﴿وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا وَالْعِيْرَ الَّتِيْٓ اَقْبَلْنَا فِيْهَا ؕ﴾ (12/یوسف:82) ''اور پوچھ لے اُس بستی سے جس میں ہم تھے اور اُس قافلے سے جس میں ہم آئے ہیں۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)۔

اَقْبِلْ فعل امر ہے۔ تو آگے آ۔ سامنے آ۔ ﴿يٰمُوْسٰٓى اَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ ۣ﴾ (28/القصص:31) ''اے موسیٰ سامنے آ اور مت ڈر۔''

(تفعّل) **تَقَبُّلًا** اس طرح قبول کرنا جس میں اجر و ثواب دینا شامل ہو۔ ﴿قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ۝﴾ (5/المائدہ:27) ''اس نے کہا اللہ تو بس قبول کرتا ہے متقی لوگوں سے۔''

تَقَبَّلْ فعل امر ہے۔ تو قبول کر۔ ﴿رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝﴾ (2/البقرۃ:127) ''اے ہمارے رب! تو قبول فرما ہم سے بے شک تو ہی سننے والا جاننے والا ہے۔''

(تفاعل) تَقَابُلًا ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہونا۔ آمنے سامنے ہونا۔

مُتَقَابِلٌ ج: مُتَقَابِلُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ آمنے سامنے ہونے والا۔﴿ عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیْنَ ﴾(37/الصافات:44)''تختوں پر آمنے سامنے ہونے والے۔''

(استفعال) اِسْتِقْبَالًا کسی کی طرف متوجہ ہونا۔ کسی کے سامنے آنا۔ خوش آمدید کہنا۔ اسی سے ہے: استقبال القبلۃ (قبلہ رخ ہونا)۔

مُسْتَقْبِلٌ اسم فاعل ہے۔ سامنے آنے والا۔﴿ فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِيَتِهِمْ ﴾(46/الاحقاف:24)''پھر جب انہوں نے دیکھا اس (عذاب) کو بادل جیسا، اپنی وادیوں کے سامنے آنے والا۔'' یہی لفظ آنے والے زمانے کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔ زمانۂ مستقبل۔

ش ف ع

(ف) شَفْعًا کسی چیز کو اس جیسی دوسری چیز کے ساتھ ملا کر جوڑ ابنانا۔ جفت کرنا۔

(ف) شَفَاعَةً سفارش کرنا۔ امام راغبؒ فرماتے ہیں: الشفاعه کے معنی دوسرے کے ساتھ اس کی مدد یا سفارش کرتے ہوئے مل جانے کے ہیں۔ عام طور پر کسی بڑے باعزت آدمی کا اپنے سے کم تر کے ساتھ اس کی مدد کے لیے شامل ہو جانے پر (یہ لفظ) بولا جاتا ہے۔'' اور مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں: ''لفظی معنی ملنے یا ملانے کے ہیں اِس لیے شفع عربی میں جوڑے کے معنی میں آتا ہے اِس کے مقابلے میں لفظ وتر بمعنی طاق استعمال ہوتا ہے۔ اِس لیے شفاعت کے لفظی معنی ہوئے کہ کسی کمزور طالب حق کے ساتھ اپنی قوت ملا کر اِس کو قوی کر دیا جائے یا بیکس اکیلے شخص کے ساتھ مل کر اِس کو جوڑا بنا دیا جائے۔'' ﴿ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ﴾(2/البقرہ:255)''کون ہے جو سفارش کرے اس کے پاس مگر اس کی اجازت سے۔'' سفارش اچھی بھی ہو سکتی ہے اور بری بھی۔ اچھی سفارش کرنے والے کو اس کا اجر ملتا ہے اور بری سفارش کرنے والے کو اس کا گناہ ملتا ہے جیسے قرآن مجید میں فرمایا:﴿ مَنْ یَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً یَّكُنْ لَّهٗ نَصِیْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ یَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَیِّئَةً یَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ﴾(4/النساء:85)''جو شخص نیک بات کی سفارش کرے تو اس کو اس (کے ثواب) میں سے حصہ ملے گا اور جو بری بات کی سفارش کرے تو اس کو اس (کے گناہ) میں سے حصہ ملے گا۔''

شَفْعٌ ایسا عدد جو دو سے تقسیم ہو جائے۔ جفت۔﴿ وَّالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ ﴾(89/الفجر:3)''قسم ہے جفت کی، قسم ہے طاق کی۔''

شَفَاعَةٌ اسم ذات بھی ہے۔ سفارش۔﴿ فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِیْنَ ﴾(74/المدثر:48)''تو نفع نہیں دے گی ان کو سفارش کرنے والوں کی سفارش۔''

شَافِعٌ ج: شَافِعُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ سفارش کرنے والا۔ اوپر آیت (74/المدثر:48) دیکھیں۔ حدیث مبارک میں قرآن مجید کے بارے میں فرمایا اَلْقُرْاٰنُ شَافِعٌ وَّمُشَفَّعٌ۔ قرآن شافع ہے مطلب سفارش کرے گا اور مُشَفَّعٌ ہے یعنی اُس کی سفارش قبول کی جائے گی۔ (بحوالہ مفردات القرآن)۔

شَفِیْعٌ ج: شُفَعَآءُ۔ فَعِیْلٌ کا وزن ہے۔ ہمیشہ اور ہر حال میں سفارش کرنے والا۔﴿ لَیْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِیٌّ وَّلَا شَفِیْعٌ ﴾(6/الانعام:70)''اس کے لیے نہیں ہے اللہ کے سوا کوئی حمایتی اور نہ ہی کوئی سفارش کرنے والا۔''
﴿ وَیَقُوْلُوْنَ هٰۤؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ﴾(10/یونس:18)''اور وہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ ہماری سفارش کرنے والے

ہیں اللہ کے پاس۔'' واضح رہے کہ تمام قرآنِ مجید میں شُفَعٰٓؤُا کی املاء اسی طرح عین الف کے ساتھ ہے مگر سورۂ روم کی آیت 13 میں یہ عین واؤ کے ساتھ اس طرح لکھا گیا ہے شُفَعٰٓؤُا۔ (بحوالہ لغات القرآن، ج ۳، ص ۲۸۷)۔

| ء | خ | ذ |

(ن) اَخْذًا، اَخْذَۃً: اس کا بنیادی مفہوم ہے کسی چیز کو احاطہ میں لے لینا یا کسی چیز کا احاطہ کرنا۔ اس بنیادی مفہوم کے ساتھ پھر یہ لفظ کسی چیز کو پکڑنے اور کسی چیز کو لے لینے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ﴿وَ اَخَذَ بِرَاْسِ اَخِیْهِ﴾ (7/الاعراف:150) ''اور اس نے پکڑا اپنے بھائی کے سر کو۔'' ﴿وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ﴾ (5/المائدۃ:12) ''اور لے چکا ہے اللہ بنی اسرائیل سے پختہ وعدہ۔'' ﴿لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ﴾ (2/البقرۃ:255) ''نہیں پکڑ سکتی اُس کو اونگھ اور نہ نیند۔'' ﴿فَاَخَذْنٰهُ اَخْذًا وَّبِیْلًا ﴿۱۶﴾﴾ (73/المزمل:16) ''تو ہم نے اُس کو بڑی سختی سے پکڑ لیا۔'' ﴿فَاَخَذَهُمْ اَخْذَةً رَّابِیَةً ﴿۱۰﴾﴾ (69/الحاقۃ:10) ''تو اللہ نے پکڑ لیا اُنہیں بڑی سختی سے۔'' جب اس کے ساتھ 'ب' کا صلہ استعمال ہو تو مطلب ہوتا ہے آمادہ کرنا، اکسانا۔ مثلاً: ﴿وَاِذَا قِیْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ﴾ (2/البقرۃ:206) ''اور جب کہا جائے اُسے کہ (میاں) خدا سے ڈرو تو اور اکساتا ہے اسے غرور گناہ پر۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔ ''اور جب اُس سے کہا جاتا ہے کہ خوف خدا کرو تو اُسے نخوت گناہ پر (اور زیادہ) آمادہ کر دیتی ہے۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔

خُذْ: ج: خُذُوْا۔ فعل امر ہے۔ تو پکڑ۔ تو لے۔ ﴿خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً﴾ (9/التوبۃ:103) ''آپ لیں ان کے مال میں سے صدقہ۔'' ﴿وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾ (59/الحشر:7) ''اور تمہیں جو کچھ رسولؐ دے، لے لو اور جس چیز سے روکے، رک جاؤ۔''

اٰخِذٌ: ج: اٰخِذُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ پکڑنے والا۔ لینے والا۔ ﴿وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِیْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِیْهِ﴾ (2/البقرۃ:267) ''اور تم لوگ نہیں ہو اس کو لینے والے مگر یہ کہ تم لوگ چشم پوشی کرو اس سے۔''

(مفاعلہ) مُؤَاخَذَۃً: کسی کو کسی غلطی پر پکڑنا۔ مواخذہ کرنا۔ جواب طلبی کرنا۔ ﴿قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِیْ بِمَا نَسِیْتُ﴾ (18/الکہف:73) ''حضرت موسیٰؑ نے جواب دیا کہ میری بھول پر مجھے نہ پکڑیئے۔'' (ترجمہ احسن البیان)

(افتعال) اِتِّخَاذًا: کسی کو کچھ بنانا۔ اس کا فعل عام طور پر دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے۔ یعنی کس کو بنایا اور کیا بنایا۔ ﴿وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِیْمَ خَلِیْلًا ﴿۱۲۵﴾﴾ (4/النساء:125) ''اور بنایا اللہ نے ابراہیمؑ کو دوست۔'' ﴿وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ﴾ (2/البقرۃ:54) ''اور یاد کرو جب کہا موسیٰؑ نے اپنی قوم سے اے میری قوم بیشک تم نے ظلم ڈھایا اپنے آپ پر بچھڑے کو (خدا) بنا کر۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔ اور کبھی ایک مفعول کی طرف متعدی ہوتا ہے مثلاً: ﴿وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا﴾ (2/البقرۃ:116) ''اور وہ کہتے ہیں کہ اللہ نے ایک بیٹا بنایا۔''

اِتَّخِذْ: ج: اِتَّخِذُوْا۔ فعل امر ہے۔ تو بنا۔ ﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِیْلًا ﴿۹﴾﴾ (73/المزمل:9) ''کوئی معبود نہیں سوائے اس کے، پس تو بنا اس کو وکیل یعنی کام بنانے والا۔'' ﴿وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّی﴾ (2/البقرۃ:125) ''اور تم لوگ بناؤ ابراہیمؑ کے کھڑے ہونے کی جگہ میں سے نماز کی جگہ۔''

مُتَّخِذٌ: ج: مُتَّخِذُوْنَ۔ اسم فاعل ہے۔ بنانے والا۔ واحد مذکر۔ ﴿وَمَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّیْنَ عَضُدًا ﴿۵۱﴾﴾ (18/الکہف:51) ''اور میں نہیں ہوں گمراہ کرنے والوں کو بنانے والا بازو یعنی مشیر۔'' ﴿وَلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ﴾

(5/المائدۃ:5)''اور نہ چوری چھپے آشنا بناتے ہوئے۔''

مُتَّخِذَۃٌ ج:مُتَّخِذٰتٌ۔اسم الفاعل ہے۔بنانے والی۔واحد مؤنث۔﴿وَلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ۚ﴾(4/النساء:25)''اور نہ بنانے والی ہوں پوشیدہ یار۔''

| ع | د | ل |

(ض) **عَدْلًا** یہ لفظ ظاہری اور معنوی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔اس لفظ کا بنیادی مفہوم ہے برابری کرنا۔عربی میں کہا جاتا ہے عَدَلْتُ ھٰذَا بِھٰذَا میں نے اس کو،اس کے برابر کر دیا۔اسی طرح اَیَّامٌ مُعْتَدِلَاتٌ ان دِنوں کو کہا جاتا ہے جب رات اور دن برابر ہوں۔قرآن مجید میں فرمایا:﴿وَھُمْ بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ ۝﴾(6/الانعام:150)''اور وہ اپنے رب کے برابر کرتے ہیں(اوروں کو)۔''(ترجمہ شیخ الہندؒ)﴿وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَاۗءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ﴾(4/النساء:129)''اور تم ہرگز برابر نہ رکھ سکو گے عورتوں کو اگرچہ اس کی حرص کرو۔''(ترجمہ شیخ الہندؒ)﴿فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً﴾(4/النساء:3)''لیکن اگر تمہیں برابری نہ کر سکنے کا خوف ہو تو ایک ہی کافی ہے۔''(ترجمہ احسن البیان)۔
اس لفظ کا دوسرا مفہوم ہے کسی چیز کے برابر اس کا بدلہ دینا۔نیکی کا بدلہ نیکی سے اور برائی کا بدلہ برائی سے دینے کا نام عدل ہے۔قرآن مجید میں فرمایا:﴿وَاِنْ تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ لَّا يُؤْخَذْ مِنْهَا ۭ﴾(6/الانعام:70)''اور اگر بدلے میں دے سارے بدلے تو قبول نہ ہوں اس سے۔''(ترجمہ شیخ الہندؒ)۔
اس لفظ کا تیسرا مفہوم ہے انصاف کرنا۔حق دار کو اس کا حق ادا کرنا۔قرآن مجید میں فرمایا گیا:﴿وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ۭ﴾(42/الشوریٰ:15)''اور مجھ کو حکم ہے کہ انصاف کروں تمہارے بیچ میں۔''(ترجمہ شیخ الہندؒ)۔﴿فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ﴾(4/النساء:135)''تو نہ پیروی کرو خواہش نفس کی انصاف کرنے میں۔''(ترجمہ ضیاء القرآن)۔
اس معنی کے اعتبار سے عدل کا لفظ ذوی الاضداد سے ہے۔اگر یہ باب سمع سے آئے تو پھر اس کے معنی ظلم کرنا اور ناانصافی کرنا کے ہوتے ہیں۔لیکن ان معنوں میں فعل قرآن مجید میں استعمال نہیں ہوا۔(واللہ اعلم)۔
اس لفظ کا چوتھا مفہوم ہے کسی چیز کے توازن و تناسب کو قائم رکھنا۔کسی چیز کو معتدل بنانا کہ اس میں کوئی کمی بیشی نہ رہے۔قرآن مجید میں فرمایا:﴿الَّذِيْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ ۝﴾(82/الانفطار:7)''جس نے تجھے پیدا کیا پھر تیرے (اعضاء کو)درست کیا پھر تیرے(عناصر کو)معتدل بنایا۔''(ترجمہ ضیاء القرآن)۔
قرآن مجید میں مصدر عَدْلٌ بمعنی عَدَالَۃٌ(معتبر)بھی استعمال ہوا ہے۔﴿وَّاَشْهِدُوْا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ﴾(65/الطلاق:2)''اور گواہ کر لو دو معتبر اپنے میں کے۔''(ترجمہ شیخ الہندؒ)۔

عُدُوْلًا عَدَلَ یَعْدِلُ کا مصدر اگر عُدُوْلٌ آئے تو مطلب ہوتا ہے راہِ راست سے انحراف کرنا،ہٹ جانا۔﴿فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ﴾(4/النساء:135)''تو خواہش نفس کی پیروی نہ کرنا کہ(حق سے)ہٹ جاؤ۔''(ترجمہ ماجدیؒ)۔﴿بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ ۝﴾(27/النمل:60)''مگر ہاں یہ لوگ ہیں ہی حق سے عدول کرنے والے۔''(ترجمہ ماجدیؒ)۔حاشیے میں حضرت عبدالماجد دریا بادیؒ فرماتے ہیں:''یعدلون۔عدول سے ہے جس کے معنی حق سے انحراف اور کجی کے ہیں۔''

اِعْدِلْ ج:اِعْدِلُوْا۔فعل امر ہے۔تو برابر کر۔تو انصاف کر۔﴿وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۚ﴾(6/الانعام:152)''اور جب بھی تم بولو تو انصاف کرو چاہے وہ شخص تمہارا قرابت دار ہی ہو۔''

عَدۡلٌ — اسم ذات بھی ہے۔ کسی چیز کے برابر کوئی دوسری چیز۔ بدلہ۔ عدل۔ انصاف۔ ﴿ وَلَا يُقۡبَلُ مِنۡهَا عَدۡلٌ وَّ لَا تَنۡفَعُهَا شَفَاعَةٌ ﴾ (2/البقرۃ:123) ''اور قبول نہیں کیا جائے گا اس سے بدلہ اور نفع نہیں دے گی اس کو سفارش۔'' ﴿ اَوۡ عَدۡلُ ذٰلِكَ صِيَامًا ﴾ (5/المائدۃ:95) ''یا اس کے برابر روزے رکھنا۔''

ن ص ر

(ن) نَصۡرًا، نُصۡرَةً — کسی کی مدد کرنا۔ ﴿ وَ لَقَدۡ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدۡرٍ ﴾ (3/آل عمران:123) ''اور یقیناً مدد کی تمہاری اللہ نے بدر میں۔'' حضرت مولانا عبدالماجد دریا بادیؒ فرماتے ہیں: ''نصر کا صلہ جب عَلٰی کے ساتھ آتا ہے تو معنی غلبے کے ہو جاتے ہیں اور غلبہ سے مراد دونوں ہیں بہ لحاظ دلائل وعلوم، غلبہ علمی ومعنوی اور بہ لحاظ فتوحات جہاد، غلبہ مادی و مُلکی۔ ﴿ فَانۡصُرۡنَا عَلَى الۡقَوۡمِ الۡكٰفِرِيۡنَ ﴾ (2/البقرۃ:286) ''سو ہم کو غالب کر کافر لوگوں پر۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔

نَصۡرٌ — اسم ذات بھی ہے۔ مدد۔ ﴿ اَلَاۤ اِنَّ نَصۡرَ اللّٰهِ قَرِيۡبٌ ﴾ (2/البقرہ:214) ''سن لو یقیناً اللہ کی مدد قریب ہے۔''

اُنۡصُرۡ — فعل امر ہے۔ تو مدد کر۔ ﴿ وَ ثَبِّتۡ اَقۡدَامَنَا وَ انۡصُرۡنَا عَلَى الۡقَوۡمِ الۡكٰفِرِيۡنَ ﴾ (2/البقرہ:250) ''اور تو جما دے ہمارے قدموں کو اور تو مدد کر ہماری کافر قوم پر۔''

نَاصِرٌ — ج: نَاصِرُوۡنَ اور اَنۡصَارٌ۔ اسم فاعل ہے۔ مدد کرنے والا۔ مددگار۔ ﴿ اَهۡلَكۡنٰهُمۡ فَلَا نَاصِرَ لَهُمۡ ﴾ (47/محمد:13) ''ہم نے ہلاک کیا ان کو تو کسی قسم کا کوئی مددگار نہیں ہے ان کے لیے۔'' ﴿ وَمَا لَهُمۡ مِّنۡ نّٰصِرِيۡنَ ﴾ (3/آل عمران:22) ''اور نہیں ہیں اُن کے کوئی بھی مددگار۔'' ﴿ قَالَ الۡحَوَارِيُّوۡنَ نَحۡنُ اَنۡصَارُ اللّٰهِ ﴾ (61/الصف:14) ''حواریوں نے کہا ہم اللہ کے مددگار ہیں۔'' قرآن مجید میں جہاں مہاجرین و انصار کا ذکر ہے وہاں انصار سے انصارِ مدینہ مراد ہیں جو نصرتِ نبیؐ کی بدولت اس لقب سے سرفراز کئے گئے۔

نَصِيۡرٌ — ج: اَنۡصَارٌ۔ فَعِيۡلٌ کا وزن ہے۔ ہمیشہ اور ہر حال میں مدد کرنے والا۔ ﴿ فَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ مَوۡلٰىكُمۡ ؕ نِعۡمَ الۡمَوۡلٰى وَ نِعۡمَ النَّصِيۡرُ ﴾ (8/الانفال:40) ''پس جان لو کہ اللہ تمہارا حمایتی ہے کیا ہی اچھا حمایتی اور کیا ہی اچھا مددگار ہے۔''

مَنۡصُوۡرٌ — ج: مَنۡصُوۡرُوۡنَ۔ اسم المفعول ہے۔ جس کی مدد کی جائے۔ مدد کیا ہوا۔ ﴿ فَلَا يُسۡرِفۡ فِّى الۡقَتۡلِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مَنۡصُوۡرًا ﴾ (17/بنی اسرائیل:33) ''پس اسے چاہیے کہ زیادتی نہ کرے قتل میں یقیناً وہ مدد کیا گیا ہے۔'' ﴿ اِنَّهُمۡ لَهُمُ الۡمَنۡصُوۡرُوۡنَ ﴾ (37/الصافات:172) ''اُن کی ضرور مدد کی جائے گی۔''

نَصۡرَانِيٌّ — ج: نَصٰرٰى۔ اسم نسبت ہے۔ مدد والا۔ اصطلاحاً یہ لفظ عیسائی لوگوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ نَصۡرَانِيٌّ کے ماخذ کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض بزرگوں کی رائے ہے کہ یہ ''ناصرہ'' کی طرف منسوب ہے جو کہ ملک شام (حال فلسطین) میں ایک قصبے کا نام ہے۔ انگریزی میں اسے (Nazareth) کہتے ہیں۔ حضرت عیسٰیؑ کا آبائی وطن یہی قصبہ تھا اور آپؑ ''مسیح ناصری'' اسی مناسبت سے کہلاتے ہیں۔ اور بعض بزرگوں کی رائے ہے کہ اس کا ماخذ ''نُصۡرَةٌ'' (مدد) ہے اور اس کی وجہ وہ قول ہے جو حضرت عیسٰیؑ کے سوال مَنۡ اَنۡصَارِىۡۤ اِلَى اللّٰهِ (اللہ کی راہ میں کون میرے مددگار ہیں) کے جواب میں حواریوں نے کہا تھا۔ نَحۡنُ اَنۡصَارُ اللّٰهِ (ہم اللہ کے (دین کے) مددگار ہیں)۔ (واللہ اعلم)۔ ﴿ مَا كَانَ اِبۡرٰهِيۡمُ يَهُوۡدِيًّا وَّ لَا نَصۡرَانِيًّا ﴾ (3/آل عمران:67) ''ابراہیمؑ یہودی نہیں تھے اور نہ ہی نصرانی۔'' ﴿ وَ قَالَتِ الۡيَهُوۡدُ لَيۡسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَىۡءٍ ﴾ (2/البقرۃ:113) ''اور کہا یہودیوں نے کہ نہیں ہیں

عیسائی کسی چیز پر۔‘‘

(تفاعل)	تَنَاصُرًا	ایک دوسرے کی مدد کرنا۔﴿ مَا لَكُمْ لَا تَنَاصَرُوْنَ ﴾(37/الصافات:25)’’تم لوگوں کو کیا ہوا ایک دوسرے کی مدد نہیں کرتے۔‘‘
(افتعال)	اِنْتِصَارًا	(1) مدد طلب کرنا۔(2) بدلہ لینا۔ انتقام لینا۔(3) ظلم یا ظالم سے بچنا۔ اپنے آپ کو کسی کے حملے سے بچانا۔﴿ وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ﴾(42/الشوریٰ:41)’’اور جو بدلہ لیتے ہیں اپنے اوپر ظلم ہونے کے بعد پس یہ لوگ ہیں جن پر کوئی ملامت نہیں۔‘‘(ترجمہ ضیاء القرآن)۔﴿ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ﴾(42/الشوریٰ:39)’’اور جب اُن پر زیادتی کی جاتی ہے تو وہ اُس کا (مناسب) بدلہ لیتے ہیں۔‘‘ (ترجمہ ضیاء القرآن)۔
	اِنْتَصِرْ	فعل امر ہے۔ تو بدلہ لے۔﴿ فَدَعَا رَبَّهٗٓ اَنِّيْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ ﴾(54/القمر:10)’’تو اس نے پکارا اپنے رب کو کہ میں مغلوب ہوں پس تو بدلہ لے۔‘‘
	مُنْتَصِرٌ	ج: مُنْتَصِرُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ بدلہ لینے والا۔ غالب۔﴿ اَمْ يَقُوْلُوْنَ نَحْنُ جَمِيْعٌ مُّنْتَصِرٌ ﴾(54/القمر:44)’’یا وہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم ایسی جماعت ہیں جو غالب ہی رہے گی۔‘‘
(استفعال)	اِسْتِنْصَارًا	مدد مانگنا۔﴿ وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ ﴾(8/الانفال:72)’’اور اگر وہ لوگ مدد مانگیں تم لوگوں سے دین میں تو تم لوگوں پر لازم ہے مدد کرنا۔‘‘

ترکیب

وَاتَّقُوْا میں ’وَ‘ عطف کا ہے اور اِتَّقُوْا گزشتہ آیت میں اُذْكُرُوْا پر عطف ہے۔ اِتَّقُوْا فعل امر ہے اور اس میں شامل ضمیر اس کا فاعل ہے۔ يَوْمًا اس کا مفعول ہے اور نکرہ موصوفہ ہے۔ آیت کا اگلا حصہ يَوْمًا کی صفات بیان کر رہا ہے۔ چنانچہ لَا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا، يَوْمًا کی پہلی صفت ہے۔ اس میں لَا نافیہ ہے۔ تَجْزِيْ مضارع معروف کا صیغہ ہے، اس کے بعد فِيْهِ محذوف ہے، نَفْسٌ اس کا فاعل ہے، عَنْ نَفْسٍ، جار مجرور متعلق فعل ہے اور شَيْئًا مفعول ہے۔ آگے وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ، يَوْمًا کی دوسری صفت ہے۔ اس میں ’وَ‘ عطف کا ہے ’لَا‘ نافیہ ہے، يُقْبَلُ، مضارع مجہول کا صیغہ ہے، اس کے بعد فِيْهِ محذوف ہے۔ مِنْهَا اس سے متعلق ہے اور شَفَاعَةٌ، نائب الفاعل ہے۔ مِنْهَا میں ’ھا‘ ضمیر نَفْسٌ کے لیے ہے۔ شَفَاعَةٌ، مونث غیر حقیقی ہے اس لیے اس کا فعل تُقْبَلُ کی بجائے يُقْبَلُ بھی درست ہے۔ اگلا جملہ وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ، يَوْمًا کی تیسری صفت ہے۔ اس میں ’وَ‘ عطف کا ہے۔ ’لَا‘ نافیہ ہے۔ يُؤْخَذُ، مضارع مجہول کا صیغہ ہے۔ فِيْهِ محذوف ہے۔ مِنْهَا اس سے متعلق ہے، ’ھا‘ ضمیر نَفْسٌ کے لیے ہے اور عَدْلٌ نائب الفاعل ہے۔ اور اگلا جملہ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ، يَوْمًا کی چوتھی صفت ہے۔ اس میں ’وَ‘ عطف کا ہے، ’لَا‘ نافیہ ہے هُمْ مبتدا ہے اور جملہ فعلیہ يُنْصَرُوْنَ اس کی خبر ہے۔ يُنْصَرُوْنَ مضارع مجہول کا صیغہ ہے اور اس کا نائب الفاعل اس میں شامل ضمیر ہے۔ اور اس کے بعد فِيْهِ محذوف ہے۔ آخری صفت وَلَا يُنْصَرُوْنَ (بغیر هُمْ کے) بھی ہو سکتی تھی۔ لیکن اس کو جملہ اسمیہ کی صورت میں بیان کرنے سے اس میں حصر اور تاکید کا مفہوم پیدا ہو گیا ہے۔ (واللہ اعلم)۔

ترجمہ

البقرۃ:48

عَنْ نَفْسٍ	نَفْسٌ	لَا تَجْزِيْ	يَوْمًا	وَاتَّقُوْا
کسی جان کے	کوئی جان	کام نہیں آئے گی	ایک ایسے دن سے جب	اور تم لوگ ڈرو

وَّلَا يُؤْخَذُ	شَفَاعَةٌ	مِنْهَا	وَّلَا يُقْبَلُ	شَيْئًا
اور نہیں لیا جائے گا	کوئی سفارش	اس سے	اور قبول نہیں کی جائے گی	کچھ بھی

مِنۡهَا	عَدۡلٌ	وَّلَا هُمۡ	يُنۡصَرُوۡنَ ۝٤٨
اس سے	کوئی بدلہ	اور نہ ہی وہ	مدد کیے جائیں گے

نوٹ:1 کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی نکرہ کی کوئی خصوصیت ایک یا چند فقروں یا جملوں میں بیان کی جاتی ہے۔ایسی صورت میں وہ نکرہ، محض نکرہ نہیں رہتا۔اسے نکرہ موصوفہ مخصّصہ کہتے ہیں۔اس بات کو اُردو کی مثال سے سمجھ لیں۔ہم کہتے ہیں ایک ٹھنڈا دن۔اب یہ کسی بھی ٹھنڈے دن کی بات ہوسکتی ہے۔اس لیے اس فقرہ میں دن کا لفظ محض نکرہ ہے۔اسے نکرہ محضہ کہتے ہیں۔لیکن اگر ہم کہیں ایک ایسا ٹھنڈا دن جب پانی جم جائے۔اس فقرہ میں بھی دن کا لفظ نکرہ ہے کیونکہ ایسا ٹھنڈا دن کوئی بھی دن ہوسکتا ہے۔لیکن عام ٹھنڈے دنوں کے بنسبت اس دن کی ایک خصوصیت ہے۔اس لیے اس فقرہ میں دن کا لفظ نکرہ محضہ نہیں رہا بلکہ نکرہ موصوفہ مخصّصہ ہوگیا۔

اسی طرح سے آیت زیرِ مطالعہ میں یَوۡمًا کا لفظ نکرہ آیا ہے کیونکہ یہ ایک غیر معین دن ہے۔لیکن جب بھی یہ دن وقوع پذیر ہوگا تو کچھ خصوصیات کا حامل ہوگا جو آیت میں بیان کردی گئی ہیں۔اس لیے یہ نکرہ محضہ نہیں ہے بلکہ نکرہ موصوفہ مخصّصہ ہے۔ترجمہ کرتے وقت اس فرق کا لحاظ کرنا ہوتا ہے۔

نوٹ:2 اس آیت میں لفظ شَیۡـًٔا کے استعمال کو سمجھنے کے لیے پہلے ہمیں مفعول مطلق کا استعمال سمجھنا ہوگا۔ہم کہتے ہیں میں نے اس کو مارا یعنی ضَرَبۡتُهٗ۔یہ ایک سادہ جملہ ہے۔لیکن اگر ہم کہتے ہیں میں نے اس کو ٹھیک ٹھاک مار ماری تو عربی کے جملہ میں یہ انداز پیدا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ جس فعل کا ذکر ہو اسی فعل کا مصدر بطور مفعول لے آتے ہیں۔اور کہتے ہیں ضَرَبۡتُهٗ ضَرۡبًا۔اب اس میں ضَرَبۡتُ کے بعد ہٗ اصل مفعول ہے اور ضَرۡبًا مفعول مطلق ہے جس کی وجہ سے بات میں بہت زور پیدا ہوگیا ہے۔اسی طرح سے جَزَیۡتُهٗ جَزَاءً یعنی میں نے اس کو بدلہ دیا جیسا بدلہ دیتے ہیں یا جیسا بدلہ دینے کا حق ہے۔

اب فرض کریں یہی بات ہم منفی انداز میں کہنا چاہتے ہیں کہ میں نے اس کو بالکل نہیں مارا، تو اس کے لیے مَا ضَرَبۡتُهٗ ضَرۡبًا نہیں کہیں گے بلکہ منفی جملہ میں مفعول مطلق کے طور پر فعل کا مصدر لانے کے بجائے عام طور پر لفظ شَیۡـًٔا لے آتے ہیں۔اس لیے کہیں گے مَا ضَرَبۡتُهٗ شَیۡـًٔا۔میں نے اس کو کچھ بھی نہیں مارا۔اسی طرح سے مَا جَزَیۡتُهٗ جَزَاءً کے بجائے مَا جَزَیۡتُهٗ شَیۡـًٔا کہیں گے۔میں نے اس کو کچھ بھی بدلہ نہیں دیا۔

اب نوٹ کریں کہ آیت میں اصل جملہ تھا لَا تَجۡزِیۡ فِیۡهِ نَفۡسٌ عَنۡ نَّفۡسٍ جَزَاءً۔اس میں فِیۡهِ محذوف کر دیا۔اور مفعول مطلق کے طور پر جَزَاءً کے بجائے شَیۡـًٔا آیا ہے۔یعنی کوئی جان کسی جان کے کچھ بھی کام نہ آئے گی یا بدلہ میں ذرہ برابر بھی کوئی چیز نہ دے گی۔

آیت:49

﴿وَاِذۡ نَجَّیۡنٰکُمۡ مِّنۡ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ یَسُوۡمُوۡنَکُمۡ سُوۡٓءَ الۡعَذَابِ یُذَبِّحُوۡنَ اَبۡنَآءَکُمۡ وَ یَسۡتَحۡیُوۡنَ نِسَآءَکُمۡ ؕ وَ فِیۡ ذٰلِکُمۡ بَلَآءٌ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ عَظِیۡمٌ ۝٤٩﴾

اِذۡ: البقرۃ آیت 30 دیکھیں۔

ن ج و

(ن) (ا) نَجَاۃً اور نَجَاءً کسی کا کسی چیز سے الگ ہوجانا۔رہائی پانا۔نجات پانا۔﴿وَقَالَ الَّذِیۡ نَجَا مِنۡهُمَا﴾ (12/یوسف:45) ''اور کہا اُس شخص نے جس نے نجات پائی اُن دونوں میں سے۔'' ﴿قَالَ لَا تَخَفۡ ۫ نَجَوۡتَ مِنَ الۡقَوۡمِ الظّٰلِمِیۡنَ ۝٢٥﴾ (28/القصص:25) ''انہوں نے کہا آپؑ (حضرت موسیٰؑ) مت ڈریں۔آپؑ نے نجات پائی ظالم قوم سے۔''

(ب) نَجْوًا اور نَجْوٰی سرگوشی کرنا۔ دو آدمیوں کا راز داری سے بات کرنا۔ سرگوشی کے معنی میں ثلاثی مجرد سے فعل قرآن مجید میں استعمال نہیں ہوا۔

نَاجٍ اسم الفاعل ہے۔ نجات پانے والا۔ ﴿ وَ قَالَ لِلَّذِیْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا ﴾ (12/یوسف:42) ''اور حضرت یوسفؑ نے کہا اس سے جس کے لیے انہوں نے خیال کیا کہ وہ نجات پانے والا ہے ان دونوں میں سے۔''

نَجِیٌّ یہ لفظ نَجْوٌ یا نَجْوٰی مصدر سے فَعِیْلٌ کے وزن پر صفت مشبہ کا صیغہ ہے۔ واحد اور جمع دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ فَعِیْلٌ کے وزن میں کبھی اسم الفاعل اور کبھی اسم المفعول کا مفہوم ہوتا ہے۔ چنانچہ نَجِیٌّ کا معنی دونوں طرح سے کیا گیا ہے۔ بعض بزرگوں کے نزدیک اس کا معنی ''سرگوشی کرنے والا'' کے ہیں (مفردات القران، لغات القرآن) اور بعض بزرگوں کے نزدیک اس کا معنی ''وہ جس سے سرگوشی کی جائے یا جس سے راز کی بات کہی جائے'' کے ہیں (مصباح اللغات، معارف القرآن)۔ بعض بزرگوں کے نزدیک اس کا مصدر تَنَاجٍ (تفاعل) ہے جس کے معنی ہیں ''باہم مشورہ کرنا''۔ قرآن مجید میں یہ لفظ دو مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ سورہ یوسف کی آیت 80 میں فرمایا ﴿ فَلَمَّا اسْتَیْـَٔسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِیًّا ؕ﴾۔ اس آیت کا ترجمہ عام طور سے دو طرح کیا گیا ہے مثلاً: ''پھر جب ناامید ہوئے اس سے اکیلے ہو بیٹھے مشورہ کرنے کو۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ) ''پھر جب وہ ان کی طرف سے مایوس ہو گئے تو علیحدہ باہم مشورہ کرنے لگے۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔ ''پھر جب وہ مایوس ہو گئے یوسف سے تو الگ جا کر سرگوشی کرنے لگے۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔ گویا ہمارے بزرگوں نے اس آیت مبارکہ میں نَجِیٌّ کو نَجْوٌ، نَجْوٰی یا تَنَاجٍ سے اسم الفاعل کے معنی میں لیا ہے۔ اور دوسری جگہ سورہ مریم کی آیت 52 میں فرمایا ﴿ وَ قَرَّبْنٰهُ نَجِیًّا ۝۵۲ ﴾ اس آیت مبارکہ میں عام طور پر نَجِیٌّ کو نَجْوٌ یا نَجْوٰی سے اسم المفعول، ''جس سے سرگوشی کی جائے، جس سے راز کی بات کہی جائے'' کے معنی میں لیا گیا ہے اور اس کو قَرَّبْنٰهُ میں ضمیر مفعولی کا حال مانا گیا ہے۔ ''اور نزدیک بلایا اس کو بھید کہنے کو۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ) ''اور ہم نے ان کو مقرب بنایا راز کی گفتگو کے لیے۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔ اس آیت کے تحت حضرت مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں: ''نَجِیًّا سرگوشی اور خصوصی کلام کو مناجات اور جس شخص سے ایسا کلام کیا جائے اُس کو نَجِیٌّ کہا جاتا ہے۔'' (معارف القرآن، ج۶ص۳۹)۔

نَجٰوةٌ اسم ذات ہے۔ رہائی۔ نجات۔ ﴿ اَدْعُوْكُمْ اِلَی النَّجٰوةِ وَ تَدْعُوْنَنِیْۤ اِلَی النَّارِ ۝۴۱ ﴾ (40/مومن:41) ''میں بلاتا ہوں تم لوگوں کو نجات کی طرف اور تم لوگ بلاتے ہو مجھ کو آگ کی طرف۔'' نَجٰوةٌ خاص قرآنی املاء ہے۔

نَجْوٰی اسم ذات بھی ہے۔ سرگوشی۔ ﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ نُهُوْا عَنِ النَّجْوٰی ﴾ (58/المجادلۃ:8) ''کیا آپؐ نے ان لوگوں کے حال میں غور کیا جنہیں سرگوشی سے روک دیا گیا تھا۔'' ﴿ لَا خَیْرَ فِیْ كَثِیْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍۭ بَیْنَ النَّاسِ ؕ﴾ (4/النساء:114) ''نہیں کوئی بھلائی ان کی اکثر سرگوشیوں میں بجز ان لوگوں کے جو حکم دیں صدقہ دینے کا یا نیک کام کا یا صلح کرانے کا لوگوں میں۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔ نَجْوٰی کے ماخذ کے بارے میں ہمارے بزرگوں میں اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک یہ باب نصر سے مصدر ہے بمعنی سرگوشی کرنا اور بطور اسم ذات (سرگوشی) استعمال ہوتا ہے۔ بعض کے نزدیک یہ نَجْوَةٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں وہ اونچی زمین جو دوسری زمینوں سے ممتاز اور بلندی کی وجہ سے آس پاس کی زمینوں سے جدا ہو۔ آہستہ اور راز سے کہی ہوئی بات بھی چونکہ کسی دوسرے کے سننے سے محفوظ ہو جاتی ہے اس لیے وہ نَجْوَةٌ کے مشابہ ہے۔ اور بعض کے نزدیک یہ لفظ نجوت الشئ انجوہ سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے کسی چیز کو خالص اور منفرد کر لینا۔ اسی مناسبت سے دو آدمی جو دوسرے لوگوں سے

الگ تھلگ ہو کر باتیں کرتے ہیں اس کو نَجْوٰی کہتے ہیں۔ یہ لفظ واحد اور جمع دونوں طرح استعمال ہوتا ہے مثلاً ھُوَ نَجْوٰی اور ھُمْ نَجْوٰی۔ اس لفظ کا استعمال بطور صفت بھی ہوتا ہے جیسے قَوْمٌ نَجْوٰی یعنی سرگوشی کرنے والے لوگ۔ قرآن مجید میں ہے ﴿وَاِذْ ھُمْ نَجْوٰٓی﴾ (17/بنی اسرائیل:47) ''اور جب وہ سرگوشی کر رہے تھے۔'' اس صورت میں اس سے پہلے لفظ ذُوْ محذوف مانا جاتا ہے۔ اب نوٹ کر لیں کہ نَجْوٰی کا استعمال بطور مصدر (سرگوشی کرنا)، بطور اسم ذات (سرگوشی) اور بطور صفت (سرگوشی کرنے والا، والے) ہوتا ہے۔ (واللہ اعلم)۔

(افعال) اِنْجَاءً کسی کو رہائی دینا۔ نجات دینا۔ ﴿اِذْ اَنْجٰىكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ﴾ (14/ابراہیم:6) ''جب اس نے رہائی دی تم کو آلِ فرعون سے۔''

(تفعیل) تَنْجِیَۃً کسی کو رہائی دینا۔ نجات دینا۔ (اس میں تدریجاً نجات دینے کا مفہوم ہوتا ہے)۔ ﴿الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ نَجّٰىنَا مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ۝﴾ (23/المومنون:28) ''تمام حمد اللہ کے لیے ہے جس نے نجات دی ہم کو ظالم قوم سے۔''

نَجِّ فعل امر ہے۔ واحد مذکر حاضر کا صیغہ۔ تو نجات دے۔ تو چھٹکارا دے۔ ﴿وَّ نَجِّنِیْ وَمَنْ مَّعِیَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝﴾ (26/الشعراء:118) ''اور تو نجات دے مجھے اور میرے ساتھ جو ایمان والے ہیں انہیں بھی۔''

مُنَجٍّ ج: مُنَجُّوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ نجات دینے والا۔ ﴿اِنَّا مُنَجُّوْكَ وَاَهْلَكَ﴾ (29/العنکبوت:33) ''بے شک ہم نجات دینے والے ہیں آپؑ کو اور آپؑ کے گھر والوں کو۔''

(مفاعلہ) مُنَاجَاۃً چپکے چپکے سے کان میں بات کہنا۔ کسی سے سرگوشی کرنا۔ راز داری سے مشورہ دینا۔ ﴿اِذَا نَاجَیْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً ؕ﴾ (58/المجادلہ:12) ''اور جب بھی تم لوگ سرگوشی کرو رسولؐ سے تو اپنی سرگوشی سے پہلے صدقہ دو۔''

(تفاعل) تَنَاجِیًا باہم ایک دوسرے سے سرگوشی کرنا۔ باہم خفیہ مشورہ کرنا۔ ﴿اِذَا تَنَاجَیْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِیَتِ الرَّسُوْلِ﴾ (58/المجادلہ:9) ''تم جب سرگوشی کرو تو یہ سرگوشیاں گناہ اور ظلم (زیادتی) اور نافرمانی پیغمبر کی نہ ہوں۔'' (ترجمہ احسن البیان) ''جب تم خفیہ مشورہ کرو تو مت خفیہ مشورہ کرو گناہ، زیادتی اور رسول کریمؐ کی نافرمانی کے متعلق۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)

اٰلٌ: البقرۃ آیت 41 دیکھیں۔

فِرْعَوْنُ ج: فَرَاعِنَةٌ۔ یہ کسی ایک متعین بادشاہ کا نام نہیں بلکہ قدیم مصر کے بادشاہوں کا لقب تھا۔ مولانا مودودیؒ فرماتے ہیں: ''لفظ فرعون کے معنی ہیں ''سورج دیوتا کی اولاد'' قدیم اہل مصر سورج کو، جو اُن کا مہادیو یا رب اعلیٰ تھا، رَعْ کہتے تھے اور فرعون اسی کی طرف منسوب تھا۔ اہل مصر کے اعتقاد کی رو سے کسی فرماں روا کی حاکمیت کے لیے اس کے سوا کوئی بنیاد نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ رَعْ کا جسمانی مظہر اور اُس کا ارضی نمائندہ ہو، اسی لیے ہر شاہی خاندان جو مصر میں برسراقتدار آتا تھا، اپنے آپ کو سورج بنسی بنا کر پیش کرتا، اور ہر فرماں روا جو تخت نشین ہوتا، ''فرعون'' کا لقب اختیار کر کے باشندگانِ ملک کو یقین دلاتا کہ تمہارا رب اعلیٰ یا مہادیو میں ہوں۔

یہاں یہ بات اور جان لینی چاہیے کہ قرآن مجید میں حضرت موسیٰؑ کے قصے کے سلسلہ میں دو فرعونوں کا ذکر آتا ہے۔ ایک وہ جس کے زمانہ میں آپ پیدا ہوئے اور جس کے گھر میں آپ نے پرورش پائی۔ دوسرا وہ جس کے پاس آپ اسلام کی دعوت اور بنی اسرائیل کی رہائی کا مطالبہ لے کر پہنچے اور جو بالآخر غرق ہوا۔ موجودہ زمانہ کے محققین کا عام میلان اس طرف ہے کہ پہلا فرعون رَعْمسیس دوم تھا جس کا زمانۂ حکومت ۱۲۹۲ سے ۱۲۲۵ قبل مسیح تک رہا۔ اور دوسرا فرعون

جس کا یہاں اِن آیات میں ذکر ہو رہا ہے، (الاعراف:104) منفتہ یا منفتاح تھا جو اپنے باپ رعمسیس دوم کی زندگی ہی میں شریک حکومت ہو چکا تھا اور اس کے مرنے کے بعد سلطنت کا مالک ہوا۔'' (تفہیم القرآن، ج ۲،ص ۶۴)۔اور سورۂ یوسف کے تعارف میں فرماتے ہیں:''قرآن مجید حضرت یوسفؑ کے ہم عصر بادشاہ کو''فرعون'' کے نام سے یاد نہیں کرتا۔ کیونکہ''فرعون''مصر کی مذہبی اصطلاح تھی اور یہ لوگ (چرواہے بادشاہ، Hyksos kings) مصری مذہب کے قائل نہ تھے لیکن بائیبل میں غلطی سے اس کو بھی''فرعون'' ہی کا نام دیا گیا ہے شاید اس کے مرتب کرنے والے سمجھتے ہوں گے کہ مصر کے سب بادشاہ''فراعنہ'' ہی تھے۔'' (تفہیم القرآن، ج ۲،ص ۳۸۲)۔امام راغبؒ نے اس کو''ف ر ع ن'' (رباعی) مادہ کے تحت بیان کیا ہے کہتے ہیں کہ یہ عجمی لفظ ہے اور عربی زبان میں اس سے سرکشی کے معنی لے کر کہا جاتا ہے تَفَرْعَنَ فُلَانٌ یعنی فلاں نے سرکشی کی۔

س و م

(ن) **سَوْمًا**: اس کا بنیادی مفہوم ہے کسی چیز کی طلب میں کہیں جانا۔ چنانچہ سَوْمٌ کا مفہوم دو اجزاء سے مرکب ہے، طلب اور جانا۔ اس بنیادی مفہوم کے ساتھ پھر یہ لفظ مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے مثلاً (1) جانور کا چراگاہ میں جانا۔ جیسے سَامَتِ الْاِبِلُ اونٹ چراگاہ میں چرنے کے لیے چلے گئے۔ (2) کسی پر کوئی بوجھ ڈالنا یا اس کو تکلیف دینا۔ عربی میں کہتے ہیں سَامَهٗ ظُلْمًا وَ سَامَهٗ خَسْفًا، اس نے اس کو ظلم اور ذلت کا مزہ چکھایا۔ عربی زبان میں ''سَامَ خَسْفًا'' محاورہ ہے جس کا معنی ہے کسی کو تکلیف دینا اور ذلیل و خوار کرنا۔﴿ وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ﴾ (7/الاعراف:167) ''اور جب سنا دیا تیرے رب نے کہ وہ لازماً بھیجتا رہے گا ان پر قیامت کے دن تک اس کو جو تکلیف دے گا ان کو برے عذاب کی۔'' یہ فعل لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔

سِيْمَاءٌ: اسم ذات ہے۔ علامت۔ نشان۔﴿ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۚ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ﴾ (2/البقرۃ:273) ''تو پہچانے گا ان کو ان کی علامت سے، وہ لوگ نہیں مانگتے لوگوں سے لپٹتے ہوئے۔''﴿ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ﴾ (48/الفتح:29) ''ان (کے ایمان و عبادت) کی علامت ان کے چہروں پر سجدوں کے اثر سے نمایاں ہے۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔اس آیت کے تحت پیر کرم شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:''سِیْمٰی سے مراد وہ گٹا نہیں جو عام طور پر پیشانی پر نمودار ہو جاتا ہے، کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو عبارت یوں ہوتی۔ سِيْمَاهُمْ فِيْ جِبَاهِهِمْ۔ ان کی پیشانیوں پر نشانیاں۔ بلکہ اس سے مراد وہ نور باطن ہے جو اُن کے چہروں پر نمایاں ہوتا ہے۔'' (ضیاء القرآن، ج ۴،ص ۵۶۹)

(افعال) **اِسَامَةً**: مویشی کو چراگاہ میں لے جانا۔ چرانا۔﴿ وَمِنْهُ شَجَرٌ فِيْهِ تُسِيْمُوْنَ ﴾ (16/النحل:10) ''اور اس سے درخت ہیں، اس میں تم مویشی چراتے ہو۔''

(تفعیل) **تَسْوِيْمًا**: اپنے اوپر یا کسی پر نشان لگانا۔

مُسَوِّمٌ: ج: مُسَوِّمُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ نشان لگانے والا۔ نشان بنانے والا۔﴿ اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ﴾ (3/آل عمران:125)۔صاحبِ قاموس القرآن اس آیت کا ترجمہ کرتے ہیں:''اگر تم صبر و تقویٰ اختیار کرو گے اور کافر یکا یک تم پر حملہ آور ہوں گے تو تمہارا پروردگار پانچ ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا جو اپنے گھوڑوں پر علامت لگانے والے ہوں گے یا جن پر خود علامت لگی ہوگی۔'' اور آگے فرماتے ہیں:''پہلے معنی مُسَوِّمِيْنَ پڑھنے کی صورت میں ہیں اور دوسرے مُسَوَّمِيْنَ پڑھنے کی صورت میں۔'' (قاموس القرآن،ص ۵۱۸)۔آیت میں لفظ مُسَوِّمِيْنَ ہے لیکن ہمارے اکثر بزرگوں نے اس کا ترجمہ اسم المفعول کے معنی

میں کیا ہے مثلاً: ''اگر تم صبر کرو اور بچتے رہو اور وہ آئیں تم پر اُسی دم تو مدد بھیجے تمہارا رب پانچ ہزار فرشتے نشان دار گھوڑوں پر۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ) ''کیوں نہیں، بشرطیکہ تم نے صبر اور تقویٰ قائم رکھا اور اگر وہ تم پر فوراً آ پڑیں گے تو تمہارا پروردگار تمہاری مدد پانچ ہزار نشان کیے ہوئے فرشتوں سے کرے گا۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔ ''ہاں کافی ہے بشرطیکہ تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو اور اگر آ دھمکیں کفار تم پر تیزی سے اُسی وقت تو مدد کرے گا تمہاری تمہارا رب پانچ ہزار فرشتوں سے جو نشان والے ہیں۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔ ''جو نشان دار ہوں گے۔'' (احسن البیان) (واللہ اعلم)۔

مُسَوَّمٌ اسم المفعول ہے۔ نشان لگا یا ہوا۔ نشان زدہ۔ واحد مذکر۔

مُسَوَّمَةٌ اسم المفعول ہے۔ نشان لگا یا ہوا۔ نشان زدہ۔ واحد مؤنث۔ ﴿ لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ ۝ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِيْنَ ۝ ﴾ (51/الذّٰریٰت:33-34) ''تا کہ ہم برسائیں اُن پر گارے کے بنے ہوئے پتھر (کھنگر) جن پر نشان لگے ہیں آپ کے رب کی طرف سے حد سے بڑھنے والوں کے لیے۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔ ﴿ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ ﴾ (3/آل عمران:14) ''اور گھوڑے نشان لگائے ہوئے۔''

س و ء

(ن) **سَوْءًا** ناپسندیدہ ہونا۔ برا ہونا۔ غمگین ہونا۔ بگڑ جانا۔ (لازم)۔ برا لگنا۔ کسی چیز کو بگاڑ دینا۔ غمگین کرنا۔ (متعدی)۔ ﴿ وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِيْٓءَ بِهِمْ ﴾ (11/ھود:77) ''اور جب پہنچے ہمارے بھیجے ہوئے لوطؑ کے پاس تو وہ غمگین ہوئے اُن کے آنے سے۔'' اس آیت کے تحت پیر کرم شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں: ''ساء لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔'' (ضیاء القرآن، ج۲، ص ۳۸۰) ﴿ فَلَمَّا رَاَوْهُ زُلْفَةً سِيْٓـَٔتْ وُجُوْهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ﴾ (67/الملک:27) ''پھر جس وقت اُسے قریب آتے دیکھیں گے تو کافروں کے چہرے بگڑ جائیں گے۔'' ﴿ اِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ﴾ (9/التوبہ:50) ''اگر پہنچتی ہے آپؐ کو کوئی بھلائی تو وہ بری لگتی ہے ان کو۔'' ﴿ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ ﴾ (17/بنی اسرائیل:7) ''پھر جب آیا دوسرے وعدے کا وقت (تو ہم نے دوسرے بندوں کو بھیج دیا) تا کہ وہ تمہارے چہرے بگاڑ دیں/غمناک کر دیں/اداس کر دیں۔''

نوٹ: سَاءَ (بُرا ہے) اور سَاءَتْ (بری ہے) بطور فعل ذم بھی استعمال ہوتے ہیں مثلاً ﴿ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ۝ ﴾ (5/المائدۃ:66) ''بہت برا ہے جو کر رہے ہیں۔'' ﴿ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ۝ ﴾ (4/النساء:97) ''''اور جہنم بہت بری پلٹ کر آنے کی جگہ ہے۔''

اَسْوَءُ مؤنث: سُوْاٰی۔ افعل تفضیل ہے۔ زیادہ برا یا سب سے برا۔ ﴿ لِيُكَفِّرَ اللّٰهُ عَنْهُمْ اَسْوَاَ الَّذِيْ عَمِلُوْا ﴾ (39/الزمر:35) ''تا کہ اللہ دور کر دے ان سے بدترین اعمال کو جو انہوں نے کیے۔'' ﴿ ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوا السُّوْٓآٰى اَنْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ﴾ (30/الروم:10) ''پھر ہوا انجام ان لوگوں کا جنہوں نے برا کیا، انتہائی برا، اس واسطے کہ انہوں نے جھٹلایا اللہ کی نشانیوں کو۔'' سُوْاٰی کے مقابلے پر لفظ حُسْنٰی آتا ہے۔ حُسْنٰی ہر اچھے کام کو کہتے ہیں اور سُوْاٰی ہر برے کام کو۔

سَوْءٌ صفت ہے۔ برا۔ بری۔ ﴿ الظَّآنِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ ﴾ (48/الفتح:6) ''گمان کرنے والے اللہ کے بارے میں برا گمان۔'' ﴿ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ ﴾ (9/التوبۃ:98) ''(حقیقت میں) اُنہی پر ہے بری گردش۔''

سُوْءٌ اسم ذات (برائی) اور صفت (بُرا، بری) دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ﴿ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْحِسَابِ ۙ﴾ (13/الرعد:18) ''یہ لوگ ہیں جن کے لیے برا حساب ہے۔'' ﴿ اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَ الْفَحْشَآءِ ﴾ (2/البقرۃ:169) ''بے شک وہ تمہیں برائی اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے۔''

نوٹ: سَوْءٌ (س کی زبر کے ساتھ) کا استعمال تو قرآن مجید میں صفت کے طور پر مرکب اضافی کی صورت میں ہوا ہے مثلاً دَائِرَةُ السَّوْءِ (بری گردش)، مَثَلُ السَّوْءِ (بری صفتیں) قَوْمَ سَوْءٍ (بری قوم) وغیرہ اور سُوْءٌ (س کی پیش کے ساتھ) کا استعمال قرآن مجید میں بطور صفت (برا، بری) بھی ہوا ہے اور بطور اسم ذات (برائی) بھی ہوا ہے۔ بطور صفت تو یہ لفظ اکثر مرکب اضافی کی صورت میں آیا ہے مثلاً سُوْءُ الْعَذَابِ (بُرا عذاب)، سُوْءُ الْحِسَابِ (بُرا حساب) سُوْءُ الدَّارِ (بُرا گھر) وغیرہ۔ اور بطور اسم ذات یہ لفظ فاعل، مفعول یا مرکب جاری کی صورت میں استعمال ہوا ہے اور پھر مختلف آیات میں اس کا مفہوم بھی مختلف لیا گیا ہے مثلاً کہیں یہ برائی کے معنی میں آیا۔ (البقرۃ:169)، کہیں یہ گناہ کے معنی میں آیا ہے (النساء:17)، کہیں یہ سزا اور تکلیف کے معنی میں آیا ہے (النحل:94)، کہیں یہ عیب اور بیماری کے معنی میں آیا ہے (طٰہٰ:22) اور کہیں یہ بدکاری کے معنی میں آیا ہے (یوسف:25) وغیرہ۔ (واللہ اعلم)۔

سَيِّءٌ بد۔ برا۔ صفت مشبہ کا صیغہ ہے۔ قرآنِ مجید میں یہ لفظ سورہ فاطر کی آیت 43 میں دو مرتبہ ہی استعمال ہوا ہے۔ ﴿ اِسْتِكْبَارًا فِي الْاَرْضِ وَ مَكْرَ السَّيِّئِ ؕ وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ ؕ﴾ ''دنیا میں اپنے کو بڑا سمجھنے کی وجہ سے، اوران کی بری تدبیروں کی وجہ سے اور بری تدبیروں کا وبال ان تدبیر والوں ہی پر پڑتا ہے۔'' (ترجمہ احسن البیان)۔

سَيِّئَةٌ ج: سَيِّئَاتٌ۔ سَيِّءٌ کا مؤنث۔ ہر وہ چیز جو تکلیف اور ناگواری کا باعث بنے۔ یہ لفظ اسم ذات اور صفت دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ برائی۔ برا۔ گناہ۔ ﴿ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا ؕ﴾ (3/آل عمران:120) ''اور اگر تم لوگوں کو پہنچے کوئی برائی تو وہ لوگ خوش ہوتے ہیں اس سے۔'' ﴿ وَ مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً ﴾ (4/النساء:85) ''اور جو کوئی سفارش کرتا ہے کوئی بری سفارش۔'' ﴿ بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّ اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ ﴾ (2/البقرۃ:81) ''کیوں نہیں جس نے کمایا گناہ اور گھیر لیا اُس کو اُس کے گناہ نے۔'' اس کی ضد حَسَنَةٌ ہے۔ امام راغبؒ فرماتے ہیں کہ حَسَنَةٌ اور سَيِّئَةٌ کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو شرعاً اور عقلاً اچھی اور بری ہوں یعنی جن پر جزا یا سزا ملے مثلاً: ﴿ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ۚ وَ مَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا ﴾ (6/الانعام:160) ''جو کوئی (خدا کے حضور) نیکی لے کر آئے گا اس کو ویسی دس نیکیاں ملیں گی اور جو برائی لائے گا اسے سزا ویسی ہی ملے گی۔'' اور دوسری قسم وہ ہے جس میں طبعاً کسی شخص کو کوئی چیز اچھی یا بری لگے۔ اس معنی میں فرمایا ﴿ فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَ مَنْ مَّعَهٗ ؕ﴾ (7/الاعراف:131) ''تو جب ان کو آسائش حاصل ہوتی تو کہتے کہ ہم اس کے مستحق ہیں اور اگر سختی پہنچتی تو موسیٰؑ اور ان کے رفیقوں کی بدشگونی بتاتے۔'' ﴿ ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ ﴾ (7/الاعراف:95) ''پھر ہم نے تکلیف کو آسودگی سے بدل دیا۔'' اور مولانا مودودیؒ سورہ مومن کی آیت 9 ﴿ وَقِهِمُ السَّيِّاٰتِ ؕ﴾ ''اور بچا دے اُن کو برائیوں سے۔'' کے تحت فرماتے ہیں: ''سیئات'' (برائیوں) کا لفظ تین مختلف معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور تینوں ہی یہاں مراد ہیں ایک غلط عقائد اور بگڑے ہوئے اخلاق اور برے اعمال۔ دوسرے گمراہی اور اعمالِ بد کا وبال۔ تیسرے،

آفات اور مصائب اور اذیتیں خواہ وہ اس دنیا کی ہوں یا عالم برزخ کی، یا روزِ قیامت کی۔ فرشتوں کی دعا کا مقصود یہ ہے کہ ان کو ہر اُس چیز سے بچا جوان کے حق میں بری ہو۔'' اور اسی آیت کے جز ﴿ وَمَنۡ تَقِ السَّيِّاٰتِ يَوۡمَئِذٍ ﴾ ''جس کو تو نے قیامت کے دن برائیوں سے بچا دیا۔'' کے تحت لکھتے ہیں: ''روزِ قیامت کی برائیوں سے مراد میدانِ حشر کا ہول، سائے اور ہر قسم کی آسائشوں سے محرومی، محاسبے کی سختی، تمام خلائق کے سامنے زندگی کے راز فاش ہونے کی رسوائی اور دوسری وہ تمام ذلتیں اور سختیاں ہیں جن سے وہاں مجرمین کو سابقہ پیش آنے والا ہے۔'' (تفہیم القرآن، ج۴، ص ۳۹۶)

سَوۡءَةٌ — اسم ذات ہے۔ ناپسندیدہ چیز۔ ہر وہ چیز جس کے اظہار کو آدمی برا سمجھے۔ اصطلاحاً یہ لفظ ستر کی چیزوں (اگر وہ کھلی ہوں) اور انسانی لاش کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یہ سُوۡءٌ سے ہے جس کا معنی ہے ہر وہ چیز جو عقل اور شرعی لحاظ سے بری ہو یا دیکھنے میں بری معلوم ہو۔ امام راغبؒ فرماتے ہیں سَوۡءَةٌ کا لفظ عورت یا مرد، دونوں کی شرم گاہ پر بولا جاتا ہے جیسے فرمایا بَدَتۡ لَهُمَا سَوۡاٰتُهُمَا اور علامہ ابن الاثیرؒ فرماتے ہیں: ''اصل میں سَوۡءَةٌ کے معنی فرج (شرم گاہ) کے ہیں بعد میں اس کو ہر اس چیز کے لیے استعمال کیا جانے لگا کہ اگر ظاہر ہو تو اس سے حیاء آنے لگے خواہ وہ کوئی قول ہو یا فعل۔'' سَوۡءَةٌ کا اطلاق ستر کی تمام چیزوں پر ہوتا ہے مثلاً عورت کے بدن اور چھاتی وغیرہ پر اگر وہ کھلے ہوئے ہوں۔ اور انسانی لاش کے لیے سَوۡءَةٌ کا لفظ اس لیے استعمال ہوتا ہے کہ اگر کچھ عرصہ دفن نہ کی جائے تو دیکھنے میں بہت بری لگتی ہے۔ ﴿ كَيۡفَ يُوَارِىۡ سَوۡءَةَ اَخِيۡهِ ﴾ (5/المائدہ:31) ''کیسے وہ چھپائے اپنے بھائی کی لاش کو۔'' ﴿ قَدۡ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡكُمۡ لِبَاسًا يُّوَارِىۡ سَوۡاٰتِكُمۡ وَرِيۡشًا ﴾ (7/الاعراف:26) ''ہم نے اتارا ہے تم لوگوں پر لباس کو، وہ چھپاتا ہے تمہارے ستر کے حصوں کو اور آرائش ہے۔'' چنانچہ سَوۡءَةٌ کا اطلاق، مرد اور عورت کی شرم گاہ پر، ستر کی تمام چیزوں پر اگر وہ کھلی ہوں، انسانی لاش پر اور ہر برے قول یا فعل پر ہوتا ہے۔ (واللہ اعلم)۔

(افعال) اِسَاءَةٌ — خراب کرنا۔ بگاڑنا۔ برائی کرنا۔ ﴿ اِنۡ اَحۡسَنۡتُمۡ اَحۡسَنۡتُمۡ لِاَنۡفُسِكُمۡ وَاِنۡ اَسَاۡتُمۡ فَلَهَا ﴾ (17/بنی اسرائیل:7) ''اگر تم بھلائی کرو گے تو تم بھلائی کرو گے اپنے آپ سے اور اگر تم برائی کرو گے تو اس کی سزا بھی تمہارے نفسوں کو ملے گی۔'' اوپر اَسۡوٰٓء کے تحت آیت نمبر (30/الروم:10) بھی دیکھ لیں۔

مُسِیۡءٌ — اسم الفاعل ہے۔ برائی کرنے والا۔ بدکار۔ ﴿ وَمَا يَسۡتَوِى الۡاَعۡمٰى وَالۡبَصِيۡرُ ۙ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَلَا الۡمُسِىۡٓءُ ﴾ (40/المومن:58) ''اور یکساں نہیں ہے اندھا اور بینا اور (اسی طرح) مومن نیکوکار اور بدکار بھی یکساں نہیں۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)

عَذَابٌ (ع ذ ب): البقرۃ آیت 10 دیکھیں۔

ذ ب ح

(ف) ذَبۡحًا — کسی جاندار کا گلا کاٹنا۔ ذبح کرنا۔ ﴿ اِنَّ اللّٰهَ يَاۡمُرُكُمۡ اَنۡ تَذۡبَحُوۡا بَقَرَةً ﴾ (2/البقرہ:67) ''بے شک اللہ حکم دیتا ہے تم لوگوں کو کہ تم لوگ ذبح کرو ایک گائے۔''

ذِبۡحٌ — قربانی کیا ہوا جانور۔ ذبیحہ۔ ﴿ وَفَدَيۡنٰهُ بِذِبۡحٍ عَظِيۡمٍ ﴾ (37/الصافات:107) ''اور ہم نے اس کے فدیہ میں دیا ایک عظیم ذبیحہ۔''

(تفعیل) تَذۡبِيۡحًا — کثرت سے ذبح کرنا۔ (آیتِ زیرِ مطالعہ)

اَبۡنَآءٌ: البقرۃ آیت 40 دیکھیں۔ یَسۡتَحۡیُوۡنَ (ح ی ی): البقرۃ آیت 26 دیکھیں۔

اِمۡرَءَۃٌ اور مَرۡءَۃٌ ج: نِسَاءٌ اور نِسۡوَۃٌ۔عورت۔عربی زبان میں نِسَاءٌ کا لفظی ترجمہ ہے عورتیں اور سیاق وسباق کے لحاظ سے اس سے مراد بیویاں، بیٹیاں، قریبی رشتہ دار عورتیں یا کسی اور قسم کی مخصوص عورتیں بھی مراد ہوتی ہیں۔

ذَالِکُمۡ اسماء اشارہ میں سے ہے اشارہ بعید کے لیے آتا ہے۔اس میں ذَا اشارہ ہے اور کُمۡ ضمیر جمع، خطاب کے لیے ہے جو کہ مخاطب کے لحاظ سے مذکر، مونث، تثنیہ اور جمع میں بدلتی رہتی ہے لیکن اس سے معنی میں فرق نہیں پڑتا۔

ب ل و

(س) بَلَاءً بوسیدہ ہونا۔زائل ہونا۔﴿ قَالَ یٰۤاٰدَمُ هَلۡ اَدُلُّكَ عَلٰی شَجَرَةِ الۡخُلۡدِ وَ مُلۡكٍ لَّا یَبۡلٰی ﴾ (20/طٰہٰ:120) ’’اس (شیطان) نے کہا اے آدمؑ کیا میں آگاہ کروں تمہیں ہمیشگی کے درخت پر اور ایسی بادشاہی پر جو کبھی زائل نہ ہو۔‘‘

(ن) بَلَاءً کسی کو آزمانا۔امتحان لینا۔(یہ تکلیف اور آسودگی، دونوں طرح کی آزمائش کے لیے استعمال ہوتا ہے)۔اللہ تعالیٰ بندوں کی آزمائش دو طرح سے کرتا ہے کبھی تو بندوں کو فراخی اور کشادگی دے کر آزماتا ہے کہ دیکھے وہ شکر گزاری کرتا ہے یا نہیں اور کبھی تنگی کے ذریعہ امتحان کرتا ہے کہ وہ صبر کرتا ہے یا نہیں۔چنانچہ فرمایا:﴿ وَ بَلَوۡنٰهُمۡ بِالۡحَسَنٰتِ وَ السَّیِّاٰتِ لَعَلَّهُمۡ یَرۡجِعُوۡنَ ﴾ (7/الاعراف:168) ’’اور ہم نے آزمایا ان کو بھلائیوں سے اور برائیوں سے شائد کہ وہ پلٹ آئیں۔‘‘ ﴿ وَ نَبۡلُوۡكُمۡ بِالشَّرِّ وَ الۡخَیۡرِ فِتۡنَةً ﴾ (21/الانبیاء:35) ’’اور ہم تم کو جانچتے ہیں برائی اور بھلائی سے آزمانے کو۔‘‘

بَلَاءٌ اسم ذات ہے۔آزمائش، خواہ خیر سے ہو یا شر سے۔امتحان۔ایسا غم جو جسم کو گھلا دے۔تکلیف۔آزمائش جب خیر سے ہو تو بَلَاءٌ کا ترجمہ عموماً ’’انعام اور احسان‘‘ سے بھی کر دیا جاتا ہے اور قرآنِ مجید میں ہمارے بزرگوں نے بَلَاءٌ کا ترجمہ دونوں طرح سے کیا بھی ہے یعنی ’’آزمائش‘‘ کے لفظ سے بھی اور ’’انعام اور احسان‘‘ کے الفاظ سے بھی۔چنانچہ حضرت شیخ الہندؒ آیت زیر مطالعہ کا ترجمہ کرتے ہیں ’’اور اس میں آزمائش تھی تمہارے رب کی طرف سے بڑی۔‘‘ اور یہی آیت جب سورہ اعراف میں آتی ہے وہاں ترجمہ کرتے ہیں ’’اور اِس میں احسان ہے تمہارے رب کا بڑا۔‘‘ (آیت: 141)۔آیت زیر مطالعہ کے حاشیے میں حضرت شیخ الہندؒ فرماتے ہیں: ’’بلاء کے چند معنی آتے ہیں اگر ذٰلِکُمۡ کا اشارہ ذبح کی طرف لیا جائے تو اس کے معنی مصیبت کے ہوں گے اور اگر نجات کی طرف اشارہ ہے تو بلاء کے معنی نعمت کے ہوں گے اور مجموعہ کی طرف ہو تو امتحان کے معنی لیے جائیں گے۔‘‘ (تفسیر عثمانی، ص۱۰) اسی طرح حضرت شیخ الہندؒ الانفال:17 ﴿ وَ لِیُبۡلِیَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ مِنۡهُ بَلَآءً حَسَنًا ﴾ کا ترجمہ کرتے ہیں ’’اور تا کہ کرے ایمان والوں پر اپنی طرف سے خوب احسان‘‘، پیر کرم شاہ صاحبؒ اس آیت کا ترجمہ کرتے ہیں ’’تا کہ احسان فرمائے مومنوں پر اپنی جناب سے بہترین احسان۔‘‘ اور مولانا عبدالماجد دریا بادیؒ اس آیت کا ترجمہ کرتے ہیں ’’تا کہ آزمائش کرے ایمان والوں کی اپنی طرف سے اچھی آزمائش‘‘ گویا ایک ہی آیت میں بلاءٌ کا ترجمہ ’’احسان‘‘ سے بھی کیا گیا ہے اور ’’آزمائش‘‘ سے بھی۔اس کی وضاحت میں پیر کرم شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں: ’’علامہ زمخشری نے یبلی کا معنی یُعطی اور بلاء کا معنی عطاء کیا ہے اور صاحب تفسیر مظہری نے یبلی کا معنی ینعم اور بلاء کا معنی نعمت فرمایا ہے۔اگرچہ ابتلاء کا

لغوی معنی اختبار یعنی آزمانا ہے۔لیکن آزمائش جس طرح تکلیف و مصیبت سے کی جاتی ہے اسی طرح عطاء و احسان سے بھی کی جاتی ہے۔ اس لیے آیت کے مفہوم کے پیش نظر یہاں لفظ ابلاء کی یہ توضیح بالکل صحیح ہے۔''(ضیاء القرآن، ج۲،ص۱۳۷) اور اسی طرح الدخان:33﴿ وَاٰتَيْنٰهُمْ مِّنَ الْاٰيٰتِ مَا فِيْهِ بَلٰٓؤٌا مُّبِيْنٌ ﴾ کا ترجمہ مولانا عبدالماجدؒ یوں کرتے ہیں''اور ہم نے انہیں ایسی نشانیاں دی تھیں جن میں کھلا ہوا انعام تھا۔'' اور حاشیے میں فرماتے ہیں ''بَلٰٓؤٌ یہاں مصیبت کے معنی میں نہیں، اِنعام کے معنی میں ہے۔'' اسی آیت کا ترجمہ پیر کرم شاہ صاحبؒ کرتے ہیں ''اور ہم نے عطا فرمائیں انہیں ایسی نشانیاں جن میں صریح آزمائش تھی۔'' حضرت شیخ الہندؒ نے اس آیت میں بَلٰٓؤٌ کا ترجمہ ''مدد'' سے کیا ہے فرماتے ہیں:''اور دیں ہم نے ان کو نشانیاں جن میں تھی مدد صریح'' اس آیت کے حاشیے میں مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں:''بَلٰٓؤٌ کے دو معنی آتے ہیں، ایک انعام اور دوسرے آزمائش، یہاں دونوں معنی بلا تکلف ممکن ہیں۔''(معارف القرآن، ج۷،ص۷۶۸)

بَلٰى

حرف ایجاب ہے یعنی جس کے ذریعے جواب دیا جاتا ہے۔اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے''کیوں نہیں'' اور یہ ہمیشہ نفی کو اثبات بنانے کے لیے بولا جاتا ہے۔اس کا استعمال دو طرح سے ہوتا ہے۔(1) نفی ماقبل کی تردید کے لیے مثلاً یہودیوں کا دعویٰ تھا کہ ﴿ وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ﴾''اور انہوں نے کہا کہ ہم کو آگ ہرگز نہیں چھوئے گی مگر تھوڑے دن۔'' اس دعویٰ میں نفی شامل ہے کہ آگ نہیں چھوئے گی۔ اس نفی کی تردید کے لیے آگے فرمایا﴿ بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً ﴾ ''کیوں نہیں (ضرور چھوئے گی) بلکہ جو کوئی کمائے گا ایک برائی......'' یا اسی طرح فرمایا﴿ زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتُبْعَثُنَّ ﴾''کافروں نے دعویٰ کیا کہ وہ ہرگز نہیں اٹھائے جائیں گے۔'' اس دعویٰ میں بھی اٹھائے جانے کی نفی ہے۔اس نفی کی تردید کے لیے فرمایا۔''آپؐ کہیے کیوں نہیں (تم ضرور اٹھائے جاؤ گے) اور میرے رب کی قسم تم لازماً اٹھائے جاؤ گے۔''

(2) اس استفہام کے جواب کے طور پر آتا ہے جس استفہام میں نفی شامل ہو۔مثلاً فرمایا﴿ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ﴾''کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں۔'' جواب میں فرمایا بَلٰى (کیوں نہیں آپ ہی ہمارے رب ہیں) یا فرمایا﴿ اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ ﴾ ''کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ ہم ہرگز اس کی ہڈیاں جمع نہیں کریں گے۔'' جواب میں فرمایا﴿ بَلٰى ﴾''کیوں نہیں (ضرور کریں گے بلکہ۔''﴿ قٰدِرِيْنَ عَلٰٓى اَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهٗ ﴾ ''ہم تو قادر ہیں کہ اس کے پور پور درست کر دیں۔'' بَلٰى اور نَعَمْ میں فرق یہ کہ نَعَمْ صرف استفہام کے جواب میں آتا ہے اور کلام ماقبل کی تصدیق کرتا ہے خواہ کلام مثبت ہو یا منفی۔مثلاً اگر کہا جائے هَلْ جَاءَكَ زَيْدٌ (کیا زید تمہارے پاس آیا) اور جواب میں کہا جائے نَعَمْ تو مطلب ہوگا''ہاں زید آیا'' اسی طرح اگر کہا جائے مَا جَاءَكَ زَيْدٌ (زید تمہارے پاس نہیں آیا) اور جواب میں کہا جائے نَعَمْ تو مطلب ہوگا''ہاں زید نہیں آیا''۔لیکن اگر کوئی کہے مَا عِنْدِيْ شَيْءٌ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔اس کے جواب میں اگر بَلٰى کہا جائے تو اس کے دعویٰ کی نفی ہو جائے گی یعنی کیوں نہیں (تم غلط کہتے ہو) تمہارے پاس کچھ ہے اور اگر نَعَمْ کہا جائے تو اس کی نفی کا اقرار ہو جائے گا یعنی ہاں! تم درست کہتے ہو تمہارے پاس واقعی کچھ نہیں۔قرآن مجید میں فرمایا﴿ فَهَلْ وَجَدْتُّمْ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا قَالُوْا نَعَمْ ﴾ ''بھلا جو وعدہ تمہارے رب نے تم سے کیا تھا تم نے اسے سچا پایا (وہ کہیں گے) ہاں۔''

(افعال) اِبْلَاءً ثلاثی مجرد کا ہم معنی ہے یعنی کسی کو آزمانا۔ امتحان لینا۔ صاحبؒ لغات القرآن کے مطابق اِبْلَاءٌ کے معنی ہیں ''نعمت دے کر کسی کو آزمانا'' ﴿وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا ط﴾ (8/الانفال:17) ''تا کہ آزمائش کرے ایمان والوں کی اپنی طرف سے اچھی آزمائش۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔ بعض بزرگوں نے اس آیت میں يُبْلِيَ کا ترجمہ ''احسان'' سے بھی کیا ہے۔ چنانچہ حضرت شیخ الہندؒ ترجمہ کرتے ہیں: ''اور تا کہ کرے ایمان والوں پر اپنی طرف سے خوب احسان'' اور پیر کرم شاہ صاحبؒ ترجمہ کرتے ہیں ''تا کہ احسان فرمائے مومنوں پر اپنی جناب سے بہترین احسان۔'' اور حاشیے میں فرماتے ہیں: ''علامہ زمخشری نے یبلی کا معنی یُعطی اور بلاء کا معنی عطاء کیا ہے اور صاحب تفسیر مظہری نے یبلی کا معنی ینعم اور بلاء کا معنی نعمت فرمایا ہے۔ اگرچہ ابتلاء کا لغوی معنی اختیار یعنی آزمانا ہے۔ لیکن آزمائش جس طرح تکلیف و مصیبت سے کی جاتی ہے اسی طرح عطاء و احسان سے بھی کی جاتی ہے۔ اس لیے آیت کے مفہوم کے پیش نظر یہاں لفظ ابلاء کی یہ توضیح بالکل صحیح ہے۔'' (ضیاء القرآن، ج ۲، ص ۱۳۷)۔

(افتعال) اِبْتِلَاءً کسی کو آزمانا۔ آزمائش میں ڈالنا۔ امتحان لینا۔ ﴿وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ط﴾ (2/البقرہ:124) ''اور جب آزمایا ابراہیمؑ کو ان کے رب نے کچھ فرمانوں سے تو انہوں نے پورا کیا ان کو۔'' امام راغبؒ ابتلاء کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''کسی کو ابتلاء میں ڈالنے کے دو مقصد ہوتے ہیں ایک یہ کہ اس کی حالت کو جانچنا اور اس سے پوری طرح باخبر ہونا اور دوسرے یہ کہ اس کی اچھی یا بری حالت کو لوگوں کے سامنے ظاہر کرنا۔ پھر کبھی تو ابتلاء سے یہ دونوں مفہوم مراد ہوتے ہیں اور کبھی صرف ایک ہی معنی مراد ہوتا ہے۔ جب اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو صرف دوسرے معنی مراد ہوتے ہیں کیونکہ ذات باری تعالیٰ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ہے اسے کسی کی حالت سے باخبر ہونے کی ضرورت نہیں لہٰذا آیت کریمہ البقرۃ:124 میں حضرت ابراہیمؑ کی آزمائش سے مقصود یہ تھا کہ ان کے کمالات کو دوسروں کے سامنے ظاہر کیا جائے۔'' اسی آیت کے تحت حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ فرماتے ہیں: ''اِبْتَلٰى۔ آزمایا اپنی واقفیت کے لیے نہیں کہ وہ تو خود علیم کل ہے، بلکہ علی الاعلان تا کہ دوسروں کو ان کے ایمان کامل کا مشاہدہ ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ کے سلسلہ میں آزمانے کا لفظ جب بھی استعمال ہوتا ہے تو اس سے مراد یہی ہوتی ہے۔'' (تفسیر ماجدی، ص ۶۲)۔

مُبْتَلٍ ج: مُبْتَلُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ آزمانے والا۔ ﴿قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ ج﴾ (2/البقرہ:249) ''حضرت طالوت نے کہا یقیناً اللہ آزمانے والا ہے تم کو ایک نہر سے۔'' (مُبْتَلٍ جب مضاف ہو تو مُبْتَلِيْ پڑھا جاتا ہے)۔ ﴿اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ وَّاِنْ كُنَّا لَمُبْتَلِيْنَ ۝﴾ (23/المومنون:30) ''بے شک اس قصے میں ہماری قدرت کی نشانیاں ہیں اور ہم ضرور (اپنے بندوں کو) آزمانے والے ہیں۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔

اِبْتَلِ ج: اِبْتَلُوْا۔ فعل امر ہے۔ تو آزما۔ ﴿وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى﴾ (4/النساء:6) ''اور تم آزماؤ یتیموں کو۔''

رَبٌّ (ر ب ب): الفاتحہ آیت 1 دیکھیں۔

ع ظ م

(ک) عَظَمَةٌ بڑا ہونا۔ بزرگ ہونا۔

اَعْظَمُ افعل التفضیل ہے۔ زیادہ بڑا۔ ﴿وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرًا وَّاَعْظَمَ اَجْرًا ط﴾ (73/المزمل:20) ''اور جو (نیکی) تم آگے بھیجو گے اپنے لیے تو اُسے اللہ کے پاس موجود پاؤ گے یہی بہتر ہے اور (اس

کا) اجر بہت بڑا ہوگا۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)

	عَظِيْمٌ	فَعِيْلٌ کے وزن پر صفت ہے۔ بڑا (ہمیشہ اور ہر حال میں)۔ ﴿وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴾(2/البقرۃ:105) ''اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔''
(ن)	عَظْمًا	ہڈی پر مارنا۔
	عَظْمٌ	ج: عِظَامٌ۔ اسم ذات ہے۔ ہڈی۔ ﴿قَالَ رَبِّ اِنِّيْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّيْ﴾(19/المریم:4)''اس نے کہا اے میرے رب بے شک کمزور ہوئی ہڈی میری۔'' ﴿اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ ﴾(75/القیامہ:3)''کیا گمان کرتا ہے انسان کہ ہم جمع نہ کرسکیں گے اس کی ہڈیوں کو۔''
(افعال)	اِعْظَامًا	بڑا کرنا۔ بڑا بنانا۔ ﴿وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُعْظِمْ لَهٗٓ اَجْرًا ﴾(65/الطلاق:5)''اور جو اللہ کا تقویٰ کرے گا تو وہ دور کردے گا اس سے اس کی برائیوں کو اور وہ بڑا کردے گا اس کے لیے اجر کو۔''
(تفعیل)	تَعْظِيْمًا	کسی کو بڑا سمجھنا۔ کسی کا ادب و احترام کرنا۔ ﴿وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَاۗىِٕرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ﴾(22/الحج:32)''اور جو ادب و احترام کرتا ہے اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کا تو یہ (احترام) اس وجہ سے ہے کہ دلوں میں تقویٰ ہے۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)

ترکیب

اِذْ سے پہلے اُذْكُرُوْا محذوف ہے۔ نَجَّيْنَا فعل، اس میں شامل ضمیر نَحْنُ اس کا فاعل ہے۔ كُمْ اس کا مفعول اور مِنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ متعلق فعل ہے۔ فِرْعَوْنَ، غیر منصرف ہے اس لیے حالت جر میں ایک زبر کے ساتھ آیا ہے۔ يَسُوْمُوْنَ فعل اور اس میں شامل هُمْ کی ضمیر فاعل ہے۔ جو کہ اٰلِ فرعون کے لیے ہے۔ كُمْ اس کا مفعول اوّل اور سُوْٓءَ الْعَذَابِ مفعول ثانی ہے۔ یہ جملہ حال ہے آل فرعون کا۔ اگلے جملے يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَاۗءَكُمْ اور يَسْتَحْيُوْنَ نِسَاۗءَكُمْ پچھلے جملے يَسُوْمُوْنَكُمْ ...کا بیان ہیں یا بدل ہیں۔ يُذَبِّحُوْنَ اور يَسْتَحْيُوْنَ دونوں کی ضمیر فاعلی بھی اٰلِ فرعون کے لیے ہیں اور اَبْنَاۗءَكُمْ اور نِسَاۗءَكُمْ دونوں مفعول ہیں۔ فِيْ ذٰلِكُمْ قائم مقام خبر مقدم ہے۔ بَلَاۗءٌ مبتداء مؤخر نکرہ ہے۔ مِنْ رَّبِّكُمْ متعلق خبر ہے اور عَظِيْمٌ، بَلَاۗءٌ کی صفت ہے۔

ترجمہ

البقرۃ:49

وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ	مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ	يَسُوْمُوْنَكُمْ
اور (یاد کرو) جب ہم نے نجات دی تم کو	فرعون کے پیروکاروں سے	وہ تکلیف دیتے تھے تم کو

سُوْۗءَ الْعَذَابِ	يُذَبِّحُوْنَ	اَبْنَاۗءَكُمْ	وَيَسْتَحْيُوْنَ
برے عذاب کی	(یعنی) وہ ذبح کرتے تھے	تمہارے بیٹوں کو	اور وہ زندہ رکھتے تھے

نِسَاۗءَكُمْ	وَفِيْ ذٰلِكُمْ	بَلَاۗءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ
تمہاری عورتوں کو	اور اس میں تھی	تمہارے رب کی طرف سے ایک بڑی آزمائش

نوٹ: 1

آیت میں لفظ بَلَاۗءٌ کے بارے میں حضرت شیخ الہندؒ فرماتے ہیں: ''بَلَاۗءٌ کے چند معنی آتے ہیں اگر ذٰلِكُمْ کا اشارہ ذبح کی طرف لیا جائے تو اس کے معنی مصیبت کے ہوں گے اور اگر نجات کی طرف اشارہ ہے تو بلاء کے معنی نعمت کے ہوں گے اور مجموعہ کی طرف ہو تو امتحان کے معنی لیے جائیں گے۔ (تفسیر عثمانی، ص ۱۰)

نوٹ: 2

مرکبات ناقصہ کا استعمال مختلف زبانوں میں مختلف ہے۔ مثلاً ہم کہتے ہیں دنیا کی زندگی (مرکب اضافی)۔ جبکہ دنیوی زندگی (مرکب

توصیفی) کا اردو میں استعمال نہ ہونے جیسا ہے۔اس کے برعکس عربی میں اَلْحَیَاۃُ الدُّنْیَا (مرکب توصیفی) استعمال ہوتا ہے۔جبکہ حَیَاۃُ الدُّنْیَا (مرکب اضافی) قران مجید میں تو استعمال نہیں ہوا۔اس لیے مرکباتِ ناقصہ کا ترجمہ کرتے وقت متعلقہ زبان کے محاورے کا لحاظ کرنا ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اَلْحَیَاۃُ الدُّنْیَا (مرکب توصیفی) کا ترجمہ دنیا کی زندگی (مرکب اضافی) سے کیا جاتا ہے۔

اسی طرح سے آیتِ زیرِ مطالعہ سُوْٓءَ الْعَذَابِ مرکب اضافی ہے جس کا ترجمہ بنتا ہے عذاب کا برا۔لیکن اردو میں اس کا رواج نہیں ہے۔اس لیے صحیح مفہوم واضح کرنے کے لیے اردو محاورہ کے مطابق اس کا ترجمہ برا عذاب (مرکب توصیفی) کیا جاتا ہے۔آگے بھی اس قسم کی مثالیں آئیں گی۔(از لطف الرحمٰن خان صاحب)

نوٹ:3 یہاں سے مسلسل کئی رکوع تک بنواسرائیل پر اللہ تعالیٰ کے انعامات اوران کی ناشکری کے حوالے سے متعدد تاریخی واقعات کا ذکر آئے گا۔یادرہے کہ ان واقعات میں ترتیب زمانی ملحوظ نہیں ہے۔

آیت:50

﴿وَ اِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَ اَغْرَقْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۵۰﴾

اِذْ: البقرۃ آیت30 دیکھیں۔

ف ر ق

(ن۔ض) **فَرْقًا** کسی چیز کو پھاڑ کر الگ الگ کرنا۔جدا جدا کرنا۔﴿ فَالْفٰرِقٰتِ فَرْقًا ۴ ﴾(77/المرسلات:4)''پھر (قسم) اُن (ہواؤں) کی جو (بادلوں کو) الگ الگ کرنے والی ہیں۔'' آیت زیر مطالعہ میں فرمایا﴿ وَ اِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ ﴾ ''اور جب ہم نے پھاڑ کر الگ کر دیا تمہارے لیے سمندر کو۔''﴿ وَ قُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ ﴾ (17/بنی اسرائیل:106)''اور قرآن،ہم نے جُدا جُدا کیا اس کو تا کہ آپؐ پڑھیں اس کو لوگوں پر ٹھہر ٹھہر کر۔''اس آیت میں قرآن کو جدا جدا کرنے سے بعض کے نزدیک جدا جدا کر کے نازل کرنا ہے اور بعض کے نزدیک اسے سورتوں اور آیتوں کے ذریعہ سے الگ الگ کرنا ہے۔بعض بزرگوں نے فَرَقْنٰهُ سے بَيَّنّٰهُ بھی مراد لیا ہے یعنی ہم نے اسے کھول کر صاف صاف بیان کیا ہے۔چنانچہ امام راغبؒ فرماتے ہیں ''قُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ کے معنی ہیں کہ ہم نے قرآن میں تمام احکام کھول کھول کر بیان کر دیے ہیں اور بعض نے فَرَقْنٰهُ کے معنی الگ الگ نازل کرنا بھی لکھے ہیں۔'' حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے بھی دونوں باتیں لکھ دی ہیں: ''فَرَقْنٰهُ یعنی اسے سورتوں،آیتوں وغیرہ کے ذریعہ سے الگ الگ رکھا گیا ہے۔اس کی دوسری تفسیر بَيَّنّٰهُ سے بھی آگئی ہے۔یعنی ہم نے اسے کھول کر صاف صاف بیان کیا ہے۔ یا یہ کہ اس میں حق کو باطل سے ممتاز کر دیا ہے۔''

فُرْقَانًا الگ الگ کرنا۔حق کو باطل سے جدا کرنا۔(لغات القرآن،مصباح اللغات)۔

(س) **فَرَقًا** ڈرنا۔ڈرپوک ہونا۔خوف کی وجہ سے اپنے اصل عقیدے کو چھپالینا۔﴿ وَمَا هُمْ مِّنْكُمْ وَلٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَّفْرَقُوْنَ ۵۶ ﴾ (9/التوبۃ:56)''حالانکہ وہ تم میں سے نہیں لیکن وہ ایسی قوم ہیں جو ڈرتے رہتے ہیں۔''

فَارِقٌ اسم الفاعل ہے۔واحد مذکر۔الگ الگ کرنے والا۔

فَارِقَۃٌ ج:فَارِقَاتٌ۔اسم الفاعل ہے۔واحد مونث۔الگ الگ کرنے والی۔اوپر آیت المرسلات:4 دیکھیں۔

اُفْرُقْ فعل امر ہے۔ تو الگ کر۔ جُدا کر۔ ﴿ فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ﴾ (5/المآئدۃ:25) ''تو آپ جُدائی کر دیں ہم دونوں اور نافرمان قوم کے درمیان۔''

فُرْقَانٌ فُعْلَانٌ کے وزن پر اسم مبالغہ ہے۔ یاد رہے کہ اسمائے مبالغہ بھی اسمائے صفت ہوتے ہیں جن میں مصدری معنی کی زیادتی سمجھی جاتی ہے۔ چنانچہ فرقان بطور مصدر بھی استعمال ہوتا ہے اور بطور اسم صفت بھی۔ بطور صفت اس کا مطلب ہے اَلْفَصْلُ بَيْنَ الْحَقِّ وَالْبَاطِلِ۔ حق اور باطل کے درمیان فیصلہ کرنے والی چیز۔ یا اس کی تعریف یوں کی گئی ہے كُلُّ مَا فَرَقَ بِهٖ بَيْنَ الْحَقِّ وَالْبَاطِلِ فَهُوَ فُرْقَانٌ۔ ہر وہ چیز جس سے حق و باطل کے درمیان فرق کیا جا سکے، وہ فرقان ہے۔ عربی زبان میں فَرْقٌ کا لفظ عام ہے جو کسی بھی چیز کو الگ الگ کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ لیکن فرقان کا لفظ خاص طور پر حق اور باطل کو الگ الگ کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ قرآنِ مجید میں یہ لفظ

(۱) قرآنِ مجید کے لیے آیا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرَا ﴾ (25/الفرقان:1) ''نہایت متبرک ہے وہ جس نے یہ فرقان اپنے بندے پر نازل کیا تاکہ سارے جہان والوں کے لیے خبردار کر دینے والا ہو۔'' اس آیت کے تحت مولانا مودودیؒ فرماتے ہیں: ''فرقان مصدر ہے مادۂ ف ر ق سے، جس کے معنی ہیں دو چیزوں کو الگ کرنا۔ یا ایک ہی چیز کے اجزاء کا الگ الگ ہونا۔ قرآن مجید کے لیے اس لفظ کا استعمال یا تو فارق کے معنی میں ہوا ہے یا مفروق کے معنی میں، یا پھر اس سے مقصود مبالغہ ہے، یعنی فرق کرنے کے معاملے میں اس کا کمال اتنا بڑھا ہوا ہے کہ گویا وہ خود ہی فرق ہے۔ اگر اسے پہلے اور تیسرے معنی میں لیا جائے تو اس کا صحیح ترجمہ کسوٹی، اور فیصلہ کن چیز، اور معیارِ فیصلہ (Criterion) کے ہوں گے اور اگر دوسرے معنی میں لیا جائے تو اس کا مطلب الگ الگ اجزاء پر مشتمل، اور الگ الگ اوقات میں آنے والے اجزاء پر مشتمل چیز کے ہوں گے قرآن مجید کو ان دونوں ہی اعتبارات سے ''الفرقان'' کہا گیا ہے۔'' (تفہیم القرآن، ج ۳، ص ۴۳۲)۔

(۲) تورات کے لیے آیا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ ﴾ (21/الانبیاء:48) ''اور یقیناً ہم نے عطا فرمایا موسیٰؑ اور ہارونؑ کو فرقان۔'' اس آیت میں فرقان سے مراد تورات ہے۔

(۳) یومِ بدر کے لیے آیا ہے: ﴿ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ﴾ (8/الانفال:41) ''اگر تم کو یقین ہے اللہ پر اور اُس چیز پر جو ہم نے اتاری اپنے بندے پر فیصلے کے دن جس دن بھڑ گئیں دونوں فوجیں۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ) اس آیت کے تحت حضرت مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں: ''محاورات میں فرقان اُس چیز کے لیے بولا جاتا ہے جو دو چیزوں میں واضح طور پر فرق اور فصل کر دے۔ اسی لیے فیصلہ کو فرقان کہتے ہیں کیونکہ وہ حق اور ناحق میں فرق واضح کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مدد کو بھی فرقان کہا جاتا ہے کیونکہ اُس کے ذریعہ اہل حق کو فتح اور اُن کے مخالف کو شکست ہو کر حق و باطل کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم میں اسی معنی کے لیے غزوۂ بدر کو یوم الفرقان کے نام سے موسوم کیا ہے۔'' (معارف القرآن، ج ۴، ص ۲۱۸)

(۴) معجزات کے لیے آیا ہے: ﴿ وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴾ (2/البقرۃ:53) ''اور جب عطا فرمائی ہم نے موسیٰؑ کو کتاب اور فرقان تاکہ تم ہدایت پاؤ۔'' اس آیت میں اکثر بزرگوں نے فرقان سے معجزات مراد لیے ہیں۔ (واللہ اعلم)۔

(۵) باطنی نور اور بصیرت کے لیے آیا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا

﴿وَّ یُکَفِّرۡ عَنۡکُمۡ سَیِّاٰتِکُمۡ وَ یَغۡفِرۡ لَکُمۡ ؕ﴾ (8/الانفال:29) ''اے ایمان والو اگر تم ڈرتے رہو گے اللہ سے تو وہ پیدا کر دے گا تم میں حق و باطل میں تمیز کی قوت اور ڈھانپ دے گا تم سے تمہارے گناہ اور بخش دے گا تمہیں۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔ اس آیت کے تحت حضرت مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں: ''فرقان سے مراد اس آیت میں وہ عقل و بصیرت ہے جس کے ذریعہ حق و باطل، کھرے کھوٹے میں امتیاز کرنا سہل ہو جائے۔'' (معارف القرآن، ج ۴، ص ۲۱۸)۔

فَرِیۡقٌ فَعِیۡلٌ کا وزن ہے۔ (۱) کسی جماعت سے الگ ہونے والا گروہ۔ فریق۔ ﴿وَ قَدۡ کَانَ فَرِیۡقٌ مِّنۡہُمۡ یَسۡمَعُوۡنَ کَلٰمَ اللّٰہِ﴾ (2/البقرۃ:75) ''اور اس میں سے ایک گروہ ہے جو سنتا ہے اللہ کے کلام کو۔'' (۲) کسی چیز کے جزء یا حصے کو بھی فریق کہتے ہیں۔ ﴿وَ لَا تَاۡکُلُوۡۤا اَمۡوَالَکُمۡ بَیۡنَکُمۡ بِالۡبَاطِلِ وَ تُدۡلُوۡا بِہَاۤ اِلَی الۡحُکَّامِ لِتَاۡکُلُوۡا فَرِیۡقًا مِّنۡ اَمۡوَالِ النَّاسِ بِالۡاِثۡمِ وَ اَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۸۸﴾﴾ (2/البقرۃ:188) ''اور نہ کھاؤ ایک دوسرے کا مال آپس میں ناجائز طریقے سے اور نہ رسائی حاصل کرو اس مال سے (رشوت دے کر) حاکموں تک تاکہ یوں کھاؤ کچھ حصہ لوگوں کے مال کا ظلم سے حالانکہ تم جانتے ہو (کہ اللہ نے یہ حرام کیا ہے)۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔ اس آیت کے تحت پیر کرم شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں: ''فریق کا معنی گروہ بھی ہے اور کسی چیز کے حصہ اور جزء کو بھی فریق کہتے ہیں۔ یہاں یہی معنی مراد ہے۔''

فِرۡقَۃٌ کسی جماعت سے الگ ہونے والی ٹکڑی۔ فرقہ۔ ﴿فَلَوۡ لَا نَفَرَ مِنۡ کُلِّ فِرۡقَۃٍ مِّنۡہُمۡ طَآئِفَۃٌ لِّیَتَفَقَّہُوۡا فِی الدِّیۡنِ وَ لِیُنۡذِرُوۡا قَوۡمَہُمۡ﴾ (9/التوبہ:122) ''اور کیوں نہ نکلا ان سب میں سے ایک گروہ تاکہ وہ سمجھ حاصل کریں دین میں اور تاکہ وہ خبردار کریں اپنی قوم کو۔'' نوٹ: فَرِیۡقٌ اور فِرۡقَۃٌ میں فرق یہ ہے کہ فَرِیۡقٌ بڑے گروہ کو کہتے ہیں اور فِرۡقَۃٌ چھوٹے گروہ کو۔ (لغات القرآن، ج ۵، ص ۴۵)

فِرۡقٌ اسم ذات ہے۔ کسی چیز کا ٹوٹا ہوا ٹکڑا۔ ﴿فَانۡفَلَقَ فَکَانَ کُلُّ فِرۡقٍ کَالطَّوۡدِ الۡعَظِیۡمِ ﴿۶۳﴾﴾ (26/الشعراء:63) ''پس وہ پھٹا تو ہر ٹکڑا تھا بڑے تودے کی مانند۔''

(تفعیل) **تَفۡرِیۡقًا** (۱) جُدائی ڈالنا۔ (۲) الگ الگ کرنا۔ (۳) فرق کرنا۔ ﴿اِنِّیۡ خَشِیۡتُ اَنۡ تَقُوۡلَ فَرَّقۡتَ بَیۡنَ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ﴾ (20/طٰہٰ:94) ''مجھے خوف ہوا کہ تو کہے گا کہ تو نے جُدائی ڈالی اسرائیل کے بیٹوں کے درمیان۔'' ﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ فَرَّقُوۡا دِیۡنَہُمۡ﴾ (6/الانعام:159) ''بے شک جن لوگوں نے الگ الگ کیا اپنے دین کو یعنی جُدا جُدا راہیں نکالیں۔'' ﴿لَا نُفَرِّقُ بَیۡنَ اَحَدٍ مِّنۡ رُّسُلِہٖ ۟﴾ (2/البقرۃ:285) ''ہم فرق نہیں کرتے اس کے رسولوں میں سے کسی ایک کے مابین۔''

(مفاعلہ) **مُفَارَقَۃً اور فِرَاقًا** ایک دوسرے سے جُدا ہونا اور جدا کرنا۔ ﴿ہٰذَا فِرَاقُ بَیۡنِیۡ وَ بَیۡنِکَ ۚ﴾ (18/الکہف:78) ''یہ جُدا ہونا ہے میرا اور آپ کا۔''

فَارِقۡ ج: فَارِقُوۡا۔ فعل امر ہے۔ تو جُدا ہو۔ ﴿فَاَمۡسِکُوۡہُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ فَارِقُوۡہُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ﴾ (65/الطلاق:2) ''تو تم لوگ تھامے رہو ان کو بھلائی سے یا تم لوگ جُدا ہو ان سے بھلائی کے ساتھ۔''

(تفعّل) **تَفَرُّقًا** الگ الگ ہونا۔ ﴿وَ مَا تَفَرَّقُوۡۤا اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَہُمُ الۡعِلۡمُ بَغۡیًۢا بَیۡنَہُمۡ ؕ﴾ (42/الشوریٰ:14) ''اور وہ الگ الگ نہیں ہوئے مگر اس کے بعد کہ جو علم آیا ان کے پاس، باہم حسد کرتے ہوئے۔''

مُتَفَرِّقٌ ج: مُتَفَرِّقُوۡنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ الگ الگ ہونے والا۔ الگ الگ۔ ﴿وَّ ادۡخُلُوۡا مِنۡ اَبۡوَابٍ مُّتَفَرِّقَۃٍ ؕ﴾ (12/یوسف:67) ''اور تم داخل ہو الگ الگ دروازوں سے۔'' ﴿یٰصَاحِبَیِ السِّجۡنِ ءَاَرۡبَابٌ مُّتَفَرِّقُوۡنَ خَیۡرٌ اَمِ

اللّٰہُ الۡوَاحِدُ الۡقَهَّارُ ﴿۳۹﴾ ﴾(12/یوسف:39)''اے قید خانے کے میرے دونوں رفیقو! یہ تو بتاؤ کیا بہت سے جدا جدا رب بہتر ہیں یا ایک اللہ جو سب پر غالب ہے۔''

ب ح ر

(ف)	بَحۡرًا	چیرنا۔ پھاڑنا۔ جیسے زمین کو گہرا کرنا یا اونٹ کا کان چیرنا۔
	بَحۡرٌ	ج: اَبۡحُرٌ اور بِحَارٌ۔ زمین کا نشیب جہاں پانی جمع ہو۔ سمندر۔ دریا۔ ﴿وَ الۡفُلۡكِ الَّتِیۡ تَجۡرِیۡ فِی الۡبَحۡرِ ﴾ (2/البقرہ:164)''اور کشتی جو چلتی ہے دریا میں۔'' ﴿مِنۡۢ بَعۡدِهٖ سَبۡعَةُ اَبۡحُرٍ ﴾(31/لقمان:27)''اس کے پیچھے سات سمندر ہوں۔'' ﴿وَ اِذَا الۡبِحَارُ فُجِّرَتۡ ۙ﴿۳﴾ ﴾(82/الانفطار:3)''اور جب سمندر بہائے جائیں گے۔''
	بَحِیۡرَةٌ	''جس جانور کا دودھ بتوں کے نام کر دیتے تھے کوئی اپنے کام میں نہ لاتا تھا۔''(تفسیر عثمانی ص ۱۶۵)۔''اس کا لغوی معنی ہے کان چرا۔ وہ اونٹنی جو پانچ بچے جنتی اور آخری بچہ نر ہوتا تو کان چیر کر اُسے چھوڑ دیتے۔ اس پر سواری کرنا، اس کا گوشت سب اپنے اُوپر حرام خیال کر لیتے۔''(ضیاء القرآن، ج ۱ ص ۵۱۵)۔ ﴿ وَمَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنۡۢ بَحِيۡرَةٍ ﴾ (5/المآئدۃ:103)''اور اللہ نے مقرر نہیں کیا کوئی بھی بحیرہ۔''

اَنۡجَيۡنَا(ن ج و): البقرۃ آیت 49 دیکھیں۔

غ ر ق

(س۔ن)	غَرَقًا اور غَرۡقًا	پانی کی تہہ میں چلے جانا۔ ڈوب جانا۔ غوطہ لگانا۔ ﴿حَتّٰۤى اِذَاۤ اَدۡرَكَهُ الۡغَرَقُ ۙ﴾(10/یونس:90)''یہاں تک کہ جب آ لیا اس کو ڈوبنے نے یعنی جب وہ ڈوبنے لگا۔'' ﴿وَالنّٰزِعٰتِ غَرۡقًا ۙ﴿۱﴾ ﴾(79/النازعات:1)''قسم ہے (فرشتوں کی) جو غوطہ لگا کر (جان) کھینچنے والے ہیں۔''اس آیت کے تحت مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں:''غرق اور اغراق کے معنی کسی کام میں پوری قوت خرچ کرنے کے بھی ہیں۔ محاورہ میں کہا جاتا ہے۔ اغرق النّازع فی القوس یعنی کمان کھینچنے والے نے اس کے کھینچنے میں اپنی پوری قوت خرچ کر دی۔''(معارف القرآن، ج ۸، ص ۶۶۳)۔ چنانچہ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اس آیت کا ترجمہ کرتے ہیں:''قسم ہے اُن فرشتوں کی جو (کافروں کی) جان سختی سے نکالتے ہیں۔''
(افعال)	اِغۡرَاقًا	کسی کو ڈبو دینا۔ ﴿وَ اَغۡرَقۡنَا الَّذِيۡنَ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا ؕ ﴾ (7/الاعراف:64)''اور ہم نے ڈبو دیا ان لوگوں کو جنہوں نے جھٹلایا ہماری نشانیوں کو۔''
	مُغۡرَقٌ	ج: مُغۡرَقُوۡنَ۔ اسم المفعول ہے۔ جس کو ڈبویا جائے۔ ڈبویا ہوا۔ ﴿وَ لَا تُخَاطِبۡنِیۡ فِی الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا ۚ اِنَّهُمۡ مُّغۡرَقُوۡنَ ﴿۳۷﴾ ﴾(11/ھود:37)''اور آپؐ خطاب نہ کریں مجھ سے ان لوگوں کے بارے میں جنہوں نے ظلم کیا یقیناً وہ لوگ ڈبوئے جانے والے ہیں۔''

اٰلٌ: البقرۃ آیت 41 دیکھیں۔ فِرۡعَوۡنُ: البقرۃ آیت 49 دیکھیں۔

ن ظ ر

(ن)	نَظۡرًا، نَظَرًا	کسی کی طرف نگاہ کر کے اپنی نظر یا فکر کو متحرک کرنا۔ اس بنیادی مفہوم کے ساتھ مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ (۱) کسی طرف محض دیکھنا۔ (۲) صورتحال کو سمجھنے کے لیے دیکھنا۔ (۳) غور و فکر کرنا۔ (۴) دوسرے کے حالات سمجھنے

کے لیے دیکھنا۔ رعایت کرنا۔ (۵) انتظار کرنا۔ عام طور پر انتظار کرنے کا مفہوم باب افتعال میں ہے لیکن ان معنوں میں باب (ن) سے بھی آجاتا ہے۔﴿ وَاِذَا مَآ اُنۡزِلَتۡ سُوۡرَةٌ نَّظَرَ بَعۡضُهُمۡ اِلٰى بَعۡضٍؕ ﴾(9/التوبہ:127) ’’اور جب بھی کوئی صورت اتاری جاتی ہے تو ان میں سے کچھ دیکھتے ہیں کچھ کی طرف۔‘‘﴿ قَالَ سَنَنۡظُرُ اَصَدَقۡتَ اَمۡ كُنۡتَ مِنَ الۡكٰذِبِيۡنَ ﴾(27/النمل:27)’’انہوں نے کہا میں دیکھوں گا آیا تو نے سچ کہا یا تو ہے جھوٹ بولنے والوں میں سے۔‘‘﴿ اَوَلَمۡ يَنۡظُرُوۡا فِىۡ مَلَكُوۡتِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ﴾(7/الاعراف:185)’’تو کیا ان لوگوں نے غور و فکر نہیں کیا زمین اور آسمانوں کی بادشاہت میں۔‘‘﴿ هَلۡ يَنۡظُرُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ يَّاۡتِيَهُمُ اللّٰهُ فِىۡ ظُلَلٍ مِّنَ الۡغَمَامِ وَالۡمَلٰٓـئِكَةُ وَقُضِىَ الۡاَمۡرُؕ ﴾(2/البقرۃ:210)’’کیا وہ اس بات کا انتظار کر رہے ہیں کہ آئے اُن کے پاس اللہ کا عذاب چھائے ہوئے بادلوں کی صورت میں اور فرشتے اور اُن کا فیصلہ ہی کر دیا جائے۔‘‘(ترجمہ ضیاء القرآن)۔

اُنۡظُرۡ — ج: اُنۡظُرُوۡا۔ فعل امر ہے۔ تو دیکھ۔﴿ فَانۡظُرۡ اِلٰٓى اٰثٰرِ رَحۡمَتِ اللّٰهِ كَيۡفَ يُحۡىِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَاؕ ﴾(30/الروم:50)’’پس تو غور کر اللہ کی رحمت کے آثار کی طرف کیسے وہ زندہ کرتا ہے زمین کو اس کی موت کے بعد۔‘‘﴿ وَلَا تَقُوۡلُوۡا رَاعِنَا وَقُوۡلُوا انۡظُرۡنَا وَاسۡمَعُوۡاؕ ﴾(2/البقرہ:104)’’اور تم لوگ مت کہو راعنا اور کہو آپؐ رعایت کریں ہماری اور سنو۔‘‘﴿ يَوۡمَ يَقُوۡلُ الۡمُنٰفِقُوۡنَ وَالۡمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيۡنَ اٰمَنُوا انۡظُرُوۡنَا ﴾(57/الحدید:113)’’اور اُس روز کہیں گے منافق مرد اور منافق عورتیں ایمان والوں سے اے نیک بختو ذرا ہمارا بھی انتظار کرو۔‘‘

نَاظِرٌ — ج: نَاظِرُوۡنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ دیکھنے والا۔﴿ فَاقِعٌ لَّوۡنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيۡنَ ﴾(2/البقرہ:69)’’شوخ ہے اس کا رنگ وہ یعنی گائے خوش کرتی ہے دیکھنے والوں کو۔‘‘

نَاظِرَةٌ — اسم الفاعل ہے۔ دیکھنے والی۔﴿ فَنٰظِرَةٌۢ بِمَ يَرۡجِعُ الۡمُرۡسَلُوۡنَ ﴾(27/النمل:35)’’تو میں دیکھنے والی ہوں کہ کس چیز کے ساتھ واپس ہوتے ہیں بھیجے ہوئے لوگ۔‘‘

نَظۡرَةٌ — اسم ذات ہے۔ ایک نگاہ۔ ایک نظر۔﴿ فَنَظَرَ نَظۡرَةً فِى النُّجُوۡمِ ﴾(37/الصافات:88)’’تو اس نے دیکھا ایک نظر ستاروں کو۔‘‘

(افعال) اِنۡظَارًا — کسی کو مہلت دینا۔﴿ ثُمَّ كِيۡدُوۡنِ فَلَا تُنۡظِرُوۡنِ ﴾(7/الاعراف:195)’’پھر تم لوگ داؤ چلاؤ مجھ پر اور مہلت نہ دو مجھ کو۔‘‘

نَظِرَةٌ — اسم ذات ہے۔ رعایت۔ مہلت۔﴿ وَاِنۡ كَانَ ذُوۡ عُسۡرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيۡسَرَةٍؕ ﴾(2/البقرہ:280)’’اور اگر وہ ہے تنگی والا تو مہلت ہے آسانی تک۔‘‘

اَنۡظِرۡ — فعل امر ہے۔ تو مہلت دے۔﴿ قَالَ اَنۡظِرۡنِىۡۤ اِلٰى يَوۡمِ يُبۡعَثُوۡنَ ﴾(7/الاعراف:14)’’اس نے کہا تو مہلت دے مجھ کو ان لوگوں کو دوبارہ اٹھائے جانے کے دن تک۔‘‘

مُنۡظَرٌ — ج: مُنۡظَرُوۡنَ۔ اسم المفعول ہے۔ مہلت دیا ہوا یعنی جس کو مہلت دی گئی۔﴿ قَالَ اِنَّكَ مِنَ الۡمُنۡظَرِيۡنَ ﴾(7/الاعراف:15)’’فرمایا بے شک تو مہلت دیئے ہوئے لوگوں میں سے ہے۔‘‘

(افتعال) اِنۡتِظَارٌ — راہ دیکھنا۔ انتظار کرنا۔﴿ فَمِنۡهُمۡ مَّنۡ قَضٰى نَحۡبَهٗ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّنۡتَظِرُ ﴾(33/الاحزاب:23)’’تو ان میں ہیں وہ، جنہوں نے پورا کیا اپنی منت کو اور ان میں ہیں وہ، جو راہ دیکھتے ہیں۔‘‘

اِنْتَظِرْ ج: اِنْتَظِرُوْا۔ فعل امر ہے۔ تو انتظار کر۔ ﴿ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَانْتَظِرْ اِنَّهُمْ مُّنْتَظِرُوْنَ ﴾ (32/السجدۃ:30) ''پس اے حبیبؐ رخ انور پھیر لیجئے اُن سے اور انتظار فرمایئے وہ بھی منتظر ہیں۔'' ﴿ فَانْتَظِرُوْا اِنِّیْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِیْنَ ﴾ (10/یونس:20) ''تو تم لوگ انتظار کرو بے شک میں تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں۔''

مُنْتَظِرٌ ج: مُنْتَظِرُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ راہ دیکھنے والا۔ انتظار کرنے والا۔ اوپر آیت (10/یونس:20) دیکھیں۔

ترکیب 'وَ' حرف عطف ہے اور اِذْ ظرف زمان ہے اور اس سے پہلے اُذْكُرُوْا محذوف ہے۔ فَرَقْنَا فعل ہے اور اس کا فاعل اس میں شامل ضمیر نَحْنُ ہے۔ بِكُمُ متعلق فعل ہے اور اَلْبَحْرَ مفعول ہے۔ بِكُمُ میں 'ب' بمعنی 'ل' ہے یعنی فَرَقْنَا لَكُمْ، مطلب ہے تمہارے لیے یا 'ب' سببیہ ہے یعنی تمہاری وجہ سے۔ 'ف' حرف عطف ہے۔ اَنْجَیْنَا فعل اور اس میں شامل ضمیر اس کا فاعل ہے اور كُمْ مفعول ہے۔ اسی طرح آگے 'وَ' عطف کا ہے، اَغْرَقْنَآ فعل اور اس میں شامل ضمیر اس کا فاعل اور اٰلَ فِرْعَوْنَ مفعول ہے، اسی لیے اٰلَ حالت نصب میں ہے۔ آگے 'وَ' حالیہ ہے، اَنْتُمْ مبتدا اور جملہ فعلیہ تَنْظُرُوْنَ اس کی خبر۔ یہ جملہ اسمیہ حال ہے فَاَنْجَیْنٰكُمْ میں كُمْ ضمیر کا۔

ترجمہ	وَاِذْ	فَرَقْنَا	بِكُمُ	الْبَحْرَ	فَاَنْجَیْنٰكُمْ
البقرۃ:50	اور (یاد کرو) جب	ہم نے پھاڑ کر الگ کیا	تمہارے لیے یا تمہاری وجہ سے	سمندر کو	پھر ہم نے نجات دی تم کو

وَاَغْرَقْنَآ	اٰلَ فِرْعَوْنَ	وَ	اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۰﴾
اور ہم نے ڈبو دیا	فرعون کے پیروکاروں کو	اس حال میں کہ	تم لوگ دیکھ رہے تھے

آیت:51

﴿ وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓی اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۱﴾ ﴾

نوٹ گزشتہ آیات میں قرآنی الفاظ اور ان کے مادوں کے حوالے اکٹھے دیے گئے تھے۔ لیکن آیت زیر مطالعہ سے الفاظ کے صرف مادے دیے جائیں گے کیونکہ قرآنِ مجید کے طالب علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ لفظ دیکھ کر اس کے مادے کو پہچانے۔

اِذْ البقرۃ آیت 30 دیکھیں۔

و ع د

(ض) (۱) وَعْدًا، مَوْعِدًا، مِیْعَادًا وعدہ کرنا۔ ﴿ هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۵۲﴾ ﴾ (36/یٰس:52) ''یہ ہے وہ جو وعدہ کیا رحمٰن نے اور سچ کہا بھیجے ہوؤں نے یعنی رسولوں نے۔''

عِدْ فعل امر ہے۔ تو وعدہ کر۔ ﴿ وَشَارِكْهُمْ فِی الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ ﴾ (17/بنی اسرائیل:64) ''اور تو حصہ دار بن ان کے مال اور اولاد میں اور تو وعدہ کر ان سے۔''

مَوْعُوْدٌ اسم المفعول ہے۔ جس کا وعدہ کیا گیا۔ ﴿ وَالْیَوْمِ الْمَوْعُوْدِ ﴿۲﴾ ﴾ (85/البروج:2) ''اور جس دن کا وعدہ کیا گیا ہے۔''

وَعْدٌ مصدر کے علاوہ بطور اسم ذات بھی استعمال ہوتا ہے۔ وعدہ۔ ﴿وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝﴾ (10/یونس:48) ''اور وہ لوگ کہتے ہیں کب ہوگا یہ وعدہ اگر تم لوگ سچے ہو۔''

نوٹ: وعدہ اور عہد میں فرق یہ ہے کہ وعدہ یک طرفہ ہوتا ہے اور عہد اس قول کا نام ہے جو دو طرفہ یعنی فریقین کے درمیان باہمی بات چیت سے طے ہوتا ہے جس پر دونوں کو قائم رہنا ضروری ہوتا ہے۔

مَوْعِدٌ مَفْعِلٌ کا وزن ہے۔ یہ لفظ مندرجہ ذیل معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ (1) مصدر میمی بمعنی وعدہ کرنا۔ (2) اسم ظرف بمعنی وعدے کا وقت یا جگہ۔ ﴿فَاجْعَلْ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ مَوْعِدًا لَّا نُخْلِفُهٗ﴾ (20/طٰہٰ:58) ''پس تو مقرر کر ہمارے اور اپنے درمیان وعدے کا وقت جس کے ہم خلاف نہ کریں۔'' ﴿وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ ۚ﴾ (11/ھود:17) ''اور جو کفر کرے گا اُس کے ساتھ مختلف گروہوں میں سے تو آتش جہنم ہی اُس کے وعدے کی جگہ ہے۔''
(3) اسم ذات بمعنی وعدہ۔ ﴿وَاِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَّنْ تُخْلَفَهٗ ۚ﴾ (20/طٰہٰ:97) ''بے شک تیرے لیے ایک اور وعدہ (عذاب) بھی ہے جس کی خلاف ورزی نہیں ہوگی۔'' ﴿وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ ۚ﴾ (9/التوبۃ:114) ''اور نہیں تھا حضرت ابراہیمؑ کا اپنے باپ کے لیے دعائے مغفرت مانگنا مگر صرف اس وعدے کی وجہ سے جس کا وعدہ انہوں نے اپنے باپ سے کیا تھا۔''

مِيْعَادٌ یہ لفظ بھی مصدر کے علاوہ 'وعدہ' اور 'وعدے کا مقرر وقت' کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝﴾ (3/آل عمران:9) ''بے شک اللہ تعالیٰ نہیں پھرتا اپنے وعدے سے۔'' ﴿وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيْعٰدِ ۙ﴾ (8/الانفال:42) ''اور اگر تم لڑائی کے لیے وقت مقرر کرتے تو ضرور اختلاف کرتے وقت مقرر کے بارے میں۔'' ﴿قُلْ لَّكُمْ مِّيْعَادُ يَوْمٍ لَّا تَسْتَاْخِرُوْنَ عَنْهُ سَاعَةً وَّلَا تَسْتَقْدِمُوْنَ ۝﴾ (34/سبا:30) ''فرمائیے اے منکرو! تمہارے لیے وعدے کا دن مقرر ہے نہ تم اس سے ایک لمحہ پیچھے ہٹ سکو گے اور نہ ایک لمحہ آگے بڑھ سکو گے۔''

(ب) وَعِيْدًا ڈرانا۔ دھمکانا۔ ﴿اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ﴾ (2/البقرۃ:268) ''شیطان تمہیں فقیری سے ڈراتا ہے اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے۔'' ﴿فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝﴾ (7/الاعراف:70) ''پس تم جس چیز سے ہمیں ڈراتے ہو اسے لے آؤ اگر تم سچوں میں سے ہو۔''

وَعِيْدٌ مصدر کے علاوہ اسم ذات کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ عذاب کا وعدہ۔ دھمکی۔ ڈراوا۔ ﴿فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ ۝﴾ (50/قٓ:45) ''پس آپؐ یاد دہانی کرائیں قرآن کے ذریعے اس کو جو ڈرتا ہے میری دھمکی سے۔'' ﴿ذٰلِكَ يَوْمُ الْوَعِيْدِ ۝﴾ (50/قٓ:20) ''یہ ہے دن ڈرانے کا۔''

(افعال) اِيْعَادًا کسی کو دھمکی دینا۔ ڈرانا۔ ﴿وَلَا تَقْعُدُوْا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوْعِدُوْنَ﴾ (7/الاعراف:86) ''اور تم لوگ مت بیٹھو ہر ایسے راستے پر جہاں تم لوگ ڈراتے ہو۔''

(مفاعلہ) مُوَاعَدَةً ایک دوسرے سے وعدہ کرنا۔ ﴿وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا﴾ (2/البقرۃ:235) ''اور لیکن تم لوگ خواتین سے باہمی وعدہ مت کرو خفیہ طور پر۔'' عموماً مفاعلہ میں مشارکہ ہوتا ہے لیکن عربی میں یہ لفظ یک طرفہ وعدے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً ﴿وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً﴾ (7/الاعراف:142) ''اور ہم نے وعدہ کیا موسیٰؑ سے تیس رات کا۔''

(تفاعل) تَوَاعُدًا ایک دوسرے سے وعدہ کرنا۔ ﴿وَ لَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِی الْمِیْعٰدِ﴾ (8/الانفال:42) ''اور اگر تم لڑائی کے لیے وقت مقرر کرتے تو ضرور اختلاف کرتے وقت مقرر کے بارے میں۔''

ل ی ل

(x) x ثلاثی مجرد سے فعل استعمال نہیں ہوتا۔

لَیْلٌ اسم جنس ہے۔ اس کی جمع لَیَالٍ اور واحد لَیْلَةٌ ہے۔ رات۔ ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ﴾ (97/القدر:1) ''بیشک ہم نے نازل کیا اس کو قدر کی رات میں۔'' ﴿سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا﴾ (17/بنی اسرائیل:1) ''پاک ذات ہے جو لے گیا اپنے بندے کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک۔'' لَیْلٌ پر جب 'ال' داخل ہو تو ایک ل کے ساتھ اَلَّیْلُ لکھا جاتا ہے۔ ﴿فَلَمَّا جَنَّ عَلَیْهِ الَّیْلُ رَاٰ کَوْکَبًا﴾ (6/الانعام:76) ''پھر جب چھا گئی اُن پر رات تو اُنہوں نے ایک ستارہ دیکھا۔'' لَیَالٍ اصل میں لَیَالِیُ ہے جو قاعدے کے مطابق تبدیل ہو کر لَیَالٍ لکھا جاتا ہے۔ ﴿اٰیَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَیَالٍ سَوِیًّا﴾ (19/مریم:10) ''تیری نشانی ہے کہ تو کلام نہیں کرے گا لوگوں سے تین راتیں مکمل۔''

ء خ ذ: البقرۃ آیت 48 دیکھیں۔

ع ج ل

(س) عَجَلًا، عُجْلَةً کسی چیز کو وقت سے پہلے حاصل کرنے کی کوشش کرنا۔ جلد بازی کرنا۔ ﴿وَ عَجِلْتُ اِلَیْكَ رَبِّ لِتَرْضٰی﴾ (20/طٰہٰ:84) ''اور میں نے جلدی کی تیری طرف اے میرے رب تاکہ تو راضی ہو۔'' ﴿لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ﴾ (75/القیامہ:16) ''آپؐ حرکت نہ دیں قرآن کے لیے، اپنی زبان کو تاکہ آپؐ جلدی کریں قرآن پڑھنے میں۔''

عَاجِلَةٌ اسم الفاعل ہے۔ واحد مؤنث کا صیغہ۔ بطور صفت استعمال ہوتا ہے۔ جلدی ملنے والی۔ پھر اس مفہوم میں یہ لفظ دنیا اور اس کے ساز و سامان کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ مولانا مودودیؒ فرماتے ہیں: ''عاجلہ کے لغوی معنی ہیں جلدی ملنے والی چیز۔ اور اصطلاحاً قرآن مجید اس لفظ کو دنیا کے لیے استعمال کرتا ہے جس کے فائدے اور نتائج اسی زندگی میں حاصل ہو جاتے ہیں۔ اس کے مقابلے کی اصطلاح ''آخرت'' ہے جس کے فوائد اور نتائج کو موت کے بعد دوسری زندگی تک مؤخر کر دیا گیا ہے۔'' (تفہیم القرآن، ج ۲، ص ۶۰۷) ﴿کَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ﴾ (75/القیامہ:20) ''ہرگز نہیں، بلکہ تم لوگ محبت کرتے ہو دنیا سے۔''

عَجُوْلٌ فَعُوْلٌ کے وزن پر مبالغہ ہے۔ بہت جلد باز۔ ﴿وَ کَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا﴾ (17/بنی اسرائیل:11) ''اور انسان بڑا جلد باز ہے۔''

عَجَلٌ اسم ذات ہے۔ جلدی۔ جلد بازی۔ ﴿خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ﴾ (21/الانبیاء:37) ''پیدا کیا گیا انسان کو جلد بازی سے۔'' یعنی جلد بازی انسان کی جبلت میں ودیعت کی گئی ہے۔

	عِجۡلٌ	گائے کا بچھڑا، کیونکہ اس میں بڑی تیزی اور پھرتی پائی جاتی ہے جو بیل بننے کے بعد ختم ہو جاتی ہے۔﴿فَرَاغَ اِلٰۤی اَهۡلِهٖ فَجَآءَ بِعِجۡلٍ سَمِیۡنٍ ﴾(51/الذریات:26)''پس وہ گیا اپنے گھر والوں کی طرف پھر وہ لایا ایک موٹا بچھڑا۔''
(افعال)	اِعۡجَالًا	جلدی کرانا۔جلدی کرنا۔﴿وَمَاۤ اَعۡجَلَكَ عَنۡ قَوۡمِكَ یٰمُوۡسٰی ﴾(20/طٰہٰ:83)''اور کس چیز نے جلدی کرائی آپؑ کو اپنی قوم سے اے موسیٰؑ۔''
(تفعیل)	تَعۡجِیۡلًا	جلدی دینا۔جلدی کرنا۔﴿مَنۡ كَانَ یُرِیۡدُ الۡعَاجِلَةَ عَجَّلۡنَا لَهٗ فِیۡهَا مَا نَشَآءُ لِمَنۡ نُّرِیۡدُ ثُمَّ جَعَلۡنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ﴾(17/بنی اسرائیل:18)''جو لوگ طلب گار ہیں صرف دنیا کے ہم جلدی دے دیتے ہیں اُس دنیا میں جتنا چاہتے ہیں اُن میں سے جسے چاہتے ہیں پھر ہم مقرر کر دیتے ہیں اُس کے لیے جہنم۔''
	عَجِّلۡ	فعل امر ہے۔تو جلدی دے۔تو جلدی کر۔﴿وَقَالُوۡا رَبَّنَا عَجِّلۡ لَّنَا قِطَّنَا قَبۡلَ یَوۡمِ الۡحِسَابِ ﴾(38/صٓ:16)''اور مذاقاً کہتے ہیں اے ہمارے رب جلدی دے دے ہمارے حصے کا عذاب یوم حساب سے پہلے۔''
(تفعّل)	تَعَجُّلًا	جلدی کرنا۔﴿فَمَنۡ تَعَجَّلَ فِیۡ یَوۡمَیۡنِ فَلَاۤ اِثۡمَ عَلَیۡهِ ﴾(2/البقرہ:203)''تو جس نے جلدی کی دو دنوں میں تو کوئی گناہ نہیں ہے اس پر۔''
(استفعال)	اِسۡتِعۡجَالًا	وقت سے پہلے مانگنا۔جلدی مچانا۔﴿یَسۡتَعۡجِلُ بِهَا الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِهَا ﴾(42/الشوریٰ:18)''جلدی مچاتے ہیں اس کے لیے یعنی قیامت کے لیے وہ لوگ جو ایمان نہیں لاتے اس پر۔''

ظ ل م: البقرۃ آیت 17 دیکھیں۔

ترکیب 'وَ' عطف کا ہے۔اِذۡ ظرف زمان ہے اور اس سے پہلے اُذۡكُرُوۡا محذوف ہے۔وٰعَدۡنَا باب مفاعلہ سے ماضی کا جمع متکلم کا صیغہ ہے۔ اس کا فاعل اس میں شامل نَحۡنُ کی ضمیر ہے۔اس کے دو مفعول ہوتے ہیں کس سے وعدہ کیا اور کیا وعدہ کیا۔ مُوۡسٰی اس کا پہلا مفعول ہے اور اَرۡبَعِیۡنَ دوسرا مفعول ہونے کی وجہ سے نصب میں ہے۔جبکہ لَیۡلَةً تمیز ہونے کی وجہ سے نصب میں ہے۔اَرۡبَعِیۡنَ کو اگر ظرف مانیں تب یہ متعلق فعل ہوگا یعنی وٰعَدۡنَا سے متعلق ہوگا اور معنی ہو جائیں گے ہم نے حضرت موسیٰؑ سے چالیس راتوں میں وعدہ کیا جو کہ صحیح نہیں۔آگے ثُمَّ حرف عطف ہے اور اِتَّخَذۡتُمۡ ماضی کا جمع مذکر حاضر کا صیغہ ہے۔اس کا فاعل اس میں شامل اَنۡتُمۡ کی ضمیر ہے۔اِتَّخَذَ بھی عموماً دو مفعول کا تقاضہ کرتا ہے۔کس کو بنایا؟ اور کیا بنایا؟ اس آیت میں اِتَّخَذَ کا پہلا مفعول اَلۡعِجۡلَ ہے جبکہ دوسرا مفعول اِلٰهًا محذوف ہے۔مِنۡۢ بَعۡدِهٖ میں 'ہٗ' ضمیر حضرت موسیٰؑ کے لیے ہے یعنی 'ان کے جانے کے بعد'۔آگے 'وَ' حالیہ ہے۔ اَنۡتُمۡ مبتدا اور ظٰلِمُوۡنَ خبر ہے۔یہ جملہ اسمیہ، حال ہے اِتَّخَذۡتُمۡ کی ضمیر فاعلی کا۔(واللہ اعلم)۔

ثُمَّ اتَّخَذۡتُمُ	اَرۡبَعِیۡنَ لَیۡلَةً	مُوۡسٰی	وَاِذۡ وٰعَدۡنَا	ترجمہ
پھر تم نے بنایا	چالیس راتوں کا	حضرت موسیٰؑ سے	اور (یاد کرو) جب ہم نے وعدہ کیا	البقرۃ:51

وَاَنۡتُمۡ ظٰلِمُوۡنَ ﴿۵۱﴾	مِنۡۢ بَعۡدِهٖ	الۡعِجۡلَ
اور تم ظلم کرنے والے تھے	اس (حضرت موسیٰؑ) کے (جانے کے) بعد	بچھڑے کو (معبود)

آیت:52

﴿ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۵۲﴾

ع	ف	و

(ن) **عَفَوًا** اس کا بنیادی مفہوم ہے کسی چیز کا نشان مٹا دینا۔ پھر یہ لفظ مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے مثلاً (ا) معاف کرنا۔ اپنا حق چھوڑ دینا۔ ﴿اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ؕ﴾ (2/البقرہ:237) ''سوائے اس کے کہ وہ خواتین معاف کر دیں یا وہ معاف کرے جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے۔'' ﴿وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ﴾ (42/الشوریٰ:40) ''اور برائی کا بدلہ اسی جیسی ایک برائی ہے۔ تو جس نے معاف کیا اور اصلاح کی تو اس کا اجر اللہ پر ہے۔''

(۲) جو شخص سزا کا مستحق ہو اسے چھوڑ دینا، اس کے قصور کا بدلہ نہ لینا۔ اللہ تعالیٰ کے لیے استعمال ہو تو مطلب ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کا کسی سے درگزر کرتے ہوئے اس کے گناہوں کو مٹا دینا۔ اِن معنوں میں عموماً عَنْ کا صلہ استعمال ہوتا ہے۔ ﴿وَعَفَا عَنْكُمْ ۚ﴾ (2/البقرۃ:187) ''اور اس نے تم سے درگزر کیا۔'' ﴿وَهُوَ الَّذِيْ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَعْفُوْا عَنِ السَّيِّاٰتِ﴾ (42/الشوریٰ:25) ''اور وہ ہے جو قبول کرتا ہے توبہ کو اپنے بندوں سے اور وہ درگزر کرتا ہے برائیوں سے۔''

(۳) کسی چیز کو بڑھانا۔ زیادہ کرنا۔ اسی معنی میں ارشادِ نبویؐ ہے: قَصُّوا الشَّوَارِبَ وَاعْفُوا اللُّحٰی اپنی مونچھوں کو کترا ؤ اور داڑھیوں کو بڑھاؤ یا زیادہ کرو۔

(۴) بڑھنا۔ زیادہ ہونا۔ (لازم)۔ جو چیز زیادہ اور گھنی ہو جائے تو عربی میں بولتے ہیں عَفَا الشَّیْءُ۔ ﴿ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ حَتّٰى عَفَوْا﴾ (7/الاعراف:95) ''پھر ہم نے بدل دیا برائی کی جگہ کو بھلائی سے یہاں تک کہ وہ لوگ زیادہ ہو گئے (مال اور اولاد میں)۔'' اس آیت میں عَفَوْا بمعنی کَثُرُوْا (زیادہ ہونا) ہے۔

اُعْفُ ج: اُعْفُوْا۔ فعل امر ہے۔ تو معاف کر یا درگزر کر۔ ﴿وَاعْفُ عَنَّا ۥ وَاغْفِرْ لَنَا ۥ وَارْحَمْنَا ۥ﴾ (2/البقرہ:286) ''اور تو درگزر فرما ہم سے اور تو بخش دے ہم کو اور تو رحم کر ہم پر۔'' ﴿فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ﴾ (2/البقرۃ:109) ''پس تم معاف کرو اور چھوڑ دو یہاں تک کہ اللہ بھیج دے اپنا حکم۔''

عَافٍ ج: عَافُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ معاف کرنے والا۔ درگزر کرنے والا۔ ﴿وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ﴾ (3/آل عمران:134) ''اور ضبط کرنے والے غصے کو اور درگزر کرنے والے لوگوں سے۔''

عَفُوٌّ فَعُوْلٌ کے وزن پر مبالغہ ہے۔ بہت زیادہ معاف کرنے والا۔ یوں معاف کرنے والا کہ گناہ کا نام و نشان تک نہ رہے۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا ۝۴۳﴾ (4/النساء:43) ''یقیناً اللہ بے انتہا معاف کرنے والا، بے انتہا بخشنے والا ہے۔'' شب قدر میں جو دعا مانگی جاتی ہے اُس میں بھی یہ لفظ آیا ہے۔ اَللّٰھُمَّ اِنَّكَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّیْ۔ اے اللہ بے شک تو بہت معاف کرنے والا ہے اور تو معافی کو پسند کرتا ہے پس تو مجھ سے درگزر کر۔''

عَفْوٌ (ا) معافی۔ درگزر۔ (۲) بڑھی ہوئی یعنی اضافی چیز۔ ضرورت سے زائد چیز۔ ﴿خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ﴾

(7/الاعراف:199)''آپؐ پکڑیں یعنی اپنائیں درگزر کو اور ترغیب دیں بھلائی کی۔''﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ قُلِ الْعَفْوَ ؕ﴾(2/البقرہ:219)''اور یہ لوگ پوچھتے ہیں آپؐ سے کہ کتنا خرچ کریں، آپؐ کہیے کہ اضافی چیز کو۔''اس آیت میں اَلْعَفْوَ سے مراد ہے مَاسَهُلَ وَتَيَسَّرَ وَلَمْ يَشُقَّ عَلَى الْقَلْبِ۔ جو آسان اور سہولت سے ہو اور دل پر گراں نہ گزرے۔

لَعَلَّ: البقرۃ آیت 21 دیکھیں۔

ش ك ر

(ن) شُكْرًا اور شُكُوْرًا کسی نعمت کا اعتراف کرنا اور احسان ماننا۔شکر ادا کرنا۔تین چیزوں کے مجموعے کا نام شکر ادا کرنا ہے۔ایک یہ کہ آدمی دل سے محسن کے انعامات اور احسانات کا اعتراف کرے۔دوسرے یہ کہ زبان سے اس کا اقرار کرے اور تیسرے یہ کہ عمل سے اِن انعامات اور احسانات کا ثبوت دے۔شکر کی ضد کفر ہے۔کفر جب شکر کے مقابلے میں استعمال ہو تو مطلب ہوتا ہے کسی کے انعامات اور احسانات کو چھپا دینا اور بھلا دینا اور اس کا ترجمہ 'ناشکری' سے کیا جاتا ہے۔اللہ کا شکر ادا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص دل سے اللہ تعالیٰ کے انعامات اور احسانات کا اعتراف کرے، دوسرے یہ کہ زبان سے بھی کلمہ شکر ادا کرے اور تیسرے یہ کہ توحید، اسلام اور ایمان کے تقاضوں کو پورا کرے اور اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کو اللہ ہی کے کاموں میں لگا دے۔اللہ کی ناشکری کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص نہ تو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کا اعتراف کرے، نہ زبان سے کلمہ شکر ادا کرے اور ان نعمتوں کو اللہ کی نافرمانی میں صرف کر دے۔﴿وَمَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ﴾(27/النمل:40)''اور جو شکر ادا کرتا ہے تو بے شک وہ شکر ادا کرتا ہے اپنے آپ ہی کے لیے۔''﴿اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ؕ﴾(34/سبا:13)''کام کرو اے داؤد کے گھر والو احسان مان کر۔''﴿وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ۝﴾(25/الفرقان:62)''اور وہ وہی تو ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کے پیچھے آنے جانے والا بنا دیا اُس شخص کے لیے جو سمجھنا چاہے یا شکر ادا کرنا چاہے۔''

اُشْكُرْ ج: اُشْكُرُوْا۔فعل امر ہے۔تو احسان مان۔تو شکر ادا کر۔﴿اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ ؕ﴾(31/لقمان:14)''کہ تو احسان مان میرا اور اپنے والدین کا۔''﴿فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ۝﴾(2/البقرۃ:152)''سو تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کیا کروں گا اور شکر ادا کرو میرا اور میری ناشکری نہ کیا کرو۔''

شَاكِرٌ ج: شَاكِرُوْنَ۔اسم الفاعل ہے۔اس کی نسبت جب بندے کی طرف ہو تو مطلب ہوتا ہے شکر ادا کرنے والا اور جب اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو مطلب ہوتا ہے قدر دان، اعتراف خدمت کرنے والا اور بندے کی تھوڑی سی اطاعت پر بہت زیادہ اجر دینے والا۔﴿شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ ؕ﴾(16/النحل:121)''شکر کرنے والا اس کے احسانوں کا۔''﴿فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ ۝﴾(2/البقرۃ:158)''سو اللہ تو بڑا قدر دان ہے بڑا علم رکھنے والا ہے۔''اس آیت کے تحت صاحبؒ تفسیر ماجدی فرماتے ہیں: ''شکر کا لفظ جب اللہ کے لیے آتا ہے تو اُس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ بندہ کی تھوڑی سی اطاعت پر معاوضہ بہت زائد دیتا ہے۔''(تفسیر ماجدی، ص ۷۷)۔﴿فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ ۝﴾(21/الانبیاء:80)''پھر کیا تم شکر گزار بنو گے۔''

مَشْكُوْرٌ — اسم المفعول ہے۔ جس کا شکر ادا کیا جائے۔ قدر کیا ہوا۔ ﴿ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ﴾ (17/ بنی اسرائیل:19) ''پس یہی لوگ ہیں جن کی کوشش کی (اللہ کے ہاں) قدر دانی کی جائے گی۔''

شَكُوْرٌ — فَعُوْلٌ کے وزن پر مبالغہ ہے۔ بے انتہا شکر کرنے والا۔ بڑا قدر دان۔ ﴿ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ﴾ (14/ ابراہیم:5) ''بے شک اس میں نشانیاں ہیں بار بار صبر کرنے والے، بے انتہا شکر کرنے والے کے لئے۔'' ﴿ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ﴾ (42/ الشوریٰ:23) ''بے شک اللہ بے انتہا بخشنے والا بے انتہا قدر کرنے والا ہے۔''

ترکیب ثُمَّ۔ حرف عطف ہے۔ عَفَوْنَا، ماضی کا جمع متکلم کا صیغہ ہے۔ عَنْكُمْ متعلق فعل ہے۔ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ کا اشارہ گوسالہ پرستی کی طرف ہے۔ لَعَلَّ حرف مشبہ بالفعل ہے۔ اس کا اسم، ضمیر متصل كُمْ ہے اور جملہ فعلیہ تَشْكُرُوْنَ اس کی خبر ہے۔

ترجمہ	ثُمَّ عَفَوْنَا	عَنْكُمْ	مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ	لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿٥٢﴾
البقرۃ:52	پھر ہم نے درگزر کیا	تم لوگوں سے	اس کے بعد	تاکہ تم لوگ شکر کرو

آیت:53

﴿ وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿٥٣﴾ ﴾

اِذْ: البقرۃ آیت 30 دیکھیں۔ ء ت ی: البقرۃ آیت 23 دیکھیں۔ ك ت ب: البقرۃ آیت 2 دیکھیں۔
ف ر ق: البقرۃ آیت 50 دیکھیں۔ لَعَلَّ: البقرۃ آیت 21 دیکھیں۔ ھ دی: الفاتحہ آیت 5 دیکھیں۔

ترکیب وَ عطف کا ہے۔ اِذْ ظرف زمان ہے اور اس سے پہلے اُذْكُرُوْا محذوف ہے۔ اٰتَيْنَا ماضی کا جمع متکلم کا صیغہ ہے۔ مُوْسٰى اس کا مفعول اوّل ہے اور اَلْكِتٰبَ مفعول ثانی ہے۔ اَلْفُرْقَانَ عطف ہے اَلْكِتٰبَ پر۔ لَعَلَّ حرف مشبہ بالفعل ہے۔ ضمیر متصل، كُمْ اس کا اسم ہے اور جملہ فعلیہ تَهْتَدُوْنَ اس کی خبر ہے۔

ترجمہ	وَاِذْ اٰتَيْنَا	مُوْسٰى	الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ	لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿٥٣﴾
البقرۃ:53	اور (یاد کرو) جب ہم نے دی	موسیٰؑ کو	کتاب اور فرقان	تاکہ تم ہدایت پاؤ

نوٹ یہاں کتاب سے مراد تورات ہے اور فرقان کے بارے میں ہمارے بزرگوں کے متعدد اقوال ہیں۔ چنانچہ بعض بزرگوں کے نزدیک کتاب اور فرقان کے درمیان 'وَ' تفسیری ہے اور فرقان سے مراد تورات ہی ہے۔ بعض کے نزدیک اس سے ''معجزات'' مراد ہیں۔ بعض کے نزدیک ''فتح و غلبہ'' مراد ہے۔ بعض کے نزدیک ''احکام شرعیہ'' یا ''دین کا علم و فہم'' مراد ہے۔ (واللہ اعلم)۔

آیت:54

﴿وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِىِٕكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِىِٕكُمْ ؕ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝۵۴﴾

اِذْ: البقرۃ آیت 30 دیکھیں۔	ق و ل: البقرۃ آیت 8 دیکھیں۔	ظ ل م: البقرۃ آیت 17 دیکھیں۔
ن ف س: البقرۃ آیت 9 دیکھیں۔	ء خ ذ: البقرۃ آیت 48 دیکھیں۔	ع ج ل: البقرۃ آیت 51 دیکھیں۔
ت و ب: البقرۃ آیت 37 دیکھیں۔		

ب ر ء

(ف) بَرَءَا — اس کا بنیادی مفہوم ہے جدا کرنا، چاک کرنا، پھاڑ کر الگ کرنا۔ پھر اس سے مراد لیا جاتا ہے کسی چیز کو عدم سے وجود میں لانا۔ وجود بخشنا۔ پیدا کرنا۔ ﴿مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِى الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ؕ﴾ (57/الحدید:22) ''نہ کوئی مصیبت دنیا میں آتی ہے نہ خاص تمہاری جانوں میں مگر اس سے پہلے کہ ہم اُس کو پیدا کریں وہ ایک خاص کتاب میں لکھی ہوئی ہے۔'' (ترجمہ احسن البیان)

بَارِءٌ — اسم الفاعل ہے۔ عدم سے وجود میں لانے والا۔ خالق۔ اسمائے حسنیٰ میں سے ہے۔ ﴿هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ﴾ (59/الحشر:24) ''وہ اللہ ہی پیدا کرنے والا، وجود بخشنے والا، صورت بنانے والا ہے۔''

بَرِيَّةٌ — اسم ذات ہے۔ وجود دی ہوئی چیز۔ مخلوق۔ فَعِيْلَةٌ کے وزن پر بَرِيْئَةٌ بھی پڑھتے ہیں اور 'ء' کو 'ی' میں تبدیل کر کے بَرِيَّةٌ بھی پڑھتے ہیں۔ فَعِيْلَةٌ کے وزن پر بمعنی اسم المفعول ہے۔ ﴿اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ۝۷﴾ (98/البینۃ:7) ''یہ لوگ ہی سب سے بہتر مخلوق ہیں۔''

(س) بَرَءَا اور بَرَآءَةً — کسی مکروہ یا تکلیف دہ چیز سے نجات حاصل کرنا۔ بیزار ہونا۔

بَرِیْءٌ — ج: بُرَءٰٓؤُا اور بَرِيْئُوْنَ۔ بَرَآءَةٌ سے فَعِيْلٌ کے وزن پر اسم الفاعل ہے۔ بیزار۔ لاتعلق۔ بری الذمہ۔ ﴿وَّاِنَّنِيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۝۱۹﴾ (6/الانعام:19) ''اور یقیناً میں بیزار ہوں اس سے جو تم لوگ شرک کرتے ہو۔'' ﴿اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ (60/الممتحنۃ:4) ''یقیناً ہم بیزار ہیں تم لوگوں سے اور اس سے جس کی تم عبادت کرتے ہو اللہ کے سوا'' ﴿اَنْتُمْ بَرِيْٓئُوْنَ مِمَّآ اَعْمَلُ وَاَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝۴۱﴾ (10/یونس:41) ''تم بری الذمہ ہو اس سے جو میں کرتا ہوں اور میں بری الذمہ ہوں اس سے جو تم کرتے ہو'' جب بَرِیْءٌ بطور صفت استعمال ہو تو وہ واحد، تثنیہ، جمع، مذکر اور مونث ہونے میں اپنے موصوف کے مطابق ہوتا ہے۔

بَرَآءٌ — بیزار۔ لاتعلق۔ اصل میں مصدر ہے اور بطور صفت بھی استعمال ہوتا ہے۔ جب بطور صفت استعمال ہو تو واحد، تثنیہ، جمع، مذکر اور مونث سب کے لیے اسی طرح استعمال ہوتا ہے۔ ﴿اِنَّنِيْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ ۝۲۶﴾ (43/الزخرف:26) ''یقیناً میں بیزار ہوں اس سے جس کی تم لوگ عبادت کرتے ہو۔''

بَرَاءَةٌ اسم ذات بھی ہے۔ (۱) بیزاری۔ قطع تعلق۔ ﴿ بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝۱ ﴾ (9/التوبہ:1) ''(یہ اعلانِ) بیزاری ہے اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے ان لوگوں سے جن سے تم لوگوں نے معاہدہ کیا مشرکوں میں سے۔'' (۲) معافی۔ چھٹکارا۔ ﴿ اَمْ لَكُمْ بَرَآءَةٌ فِي الزُّبُرِ ۝۴۳ ﴾ (54/القمر:43) ''یا آسمانی کتابوں میں تمہارے لیے کوئی معافی لکھی ہوئی ہے؟'' (ترجمہ تفہیم القرآن)۔ ''یا تمہارے لیے اگلی کتابوں میں چھٹکارا لکھا ہوا ہے۔'' (ترجمہ احسن البیان)

(افعال) اِبْرَاءً بیماری سے نجات دینا۔ شفا دینا۔ ﴿ وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ ﴾ (3/آل عمران:49) ''اور میں شفا دیتا ہوں اندھے اور کوڑھی کو۔''

(تفعیل) تَبْرِئَةً ، تَبْرِيَةً اس کا مصدر تَفْعِلَةٌ کے وزن پر تَبْرِئَةٌ بھی پڑھا جاتا ہے اور تَبْرِيَةٌ بھی۔ الزام سے نجات دینا۔ بری الذمہ قرار دینا۔ ﴿ فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا ﴾ (33/الاحزاب:69) ''تو بری قرار دیا انؑ کو اللہ نے اس سے جو ان لوگوں نے کہا۔''

مُبَرَّءٌ ج: مُبَرَّءُوْنَ۔ اسم المفعول ہے۔ بری کیا ہوا۔ ﴿ اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ ﴾ (24/النور:26) ''یہ لوگ بری کیے ہوئے ہیں اس سے جو وہ لوگ کہتے ہیں۔''

(تفعّل) تَبَرُّءًا مکروہ چیز سے خود بیزار ہو جانا۔ اعلان براءت کرنا۔ بیزاری کا اظہار کرنا۔ ﴿ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ﴾ (9/التوبہ:114) ''پھر جب واضح ہوا انؑ پر کہ یقیناً وہ یعنی آذر دشمن ہے اللہ کا تو انہوں نے اعلان براءت کیا اس سے۔''

ق ت ل

(ن) قَتْلًا کسی کو قتل کرنا۔ یہ یک طرفہ عمل ہے۔ ﴿ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ۝۱۵۷ ﴾ (4/النساء:157) ''اور ان لوگوں نے یعنی یہودیوں نے یقیناً قتل نہیں کیا انؑ کو یعنی عیسیٰؑ کو۔''

اُقْتُلْ ج: اُقْتُلُوْا۔ فعل امر ہے۔ تو قتل کر۔ ﴿ فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ ﴾ (9/التوبہ:5) ''پس جب نکل جائیں حرمت والے مہینے تو تم لوگ قتل کرو مشرکوں کو۔'' اور آیت زیر مطالعہ۔

قَتْلٌ اسم ذات بھی ہے۔ قتل۔ ﴿ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ﴾ (2/البقرہ:191) ''اور فتنہ زیادہ شدید ہے قتل سے۔''

قُتِلَ ماضی مجہول کا صیغہ ہے۔ وہ قتل کیا گیا۔ ﴿ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا ﴾ (17/بنی اسرائیل:33) ''اور جو قتل کیا گیا ناحق۔'' یہ بددعائیہ جملہ بھی ہے۔ لیکن کلام الٰہی میں اس سے مراد ہوتا ہے کہ اللہ نے ان کو اپنی رحمت سے دور کر دیا۔ ﴿ فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۝۱۹ ﴾ (74/المدثر:19) ''ہلاک ہو کیسی بات تجویز کی۔'' ﴿ قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ ۝۴ ﴾ (85/البروج:4) ''ہلاک ہوں کھائی کھودنے والے۔''

قَتِيْلٌ ج: قَتْلٰى۔ فَعِيْلٌ کے وزن پر اسم المفعول کے معنی میں مقتول مراد ہے۔ ﴿ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ﴾ (2/البقرۃ:178) ''اے ایمان والو فرض کر دیا گیا ہے تم پر مقتولوں کا قصاص (لینا)۔''

تَقْتِيْلًا کثرت اور شدت سے قتل کرنا۔ ﴿ سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَهُمْ ﴾ (7/الاعراف:127) ''ہم قتل کرتے رہیں گے ان کے بیٹوں کو۔''

(مفاعلہ) مُقَاتَلَةً اور قِتَالًا ایک دوسرے کو قتل کرنا۔ جنگ کرنا۔ لڑائی کرنا۔ اس فعل کی نسبت اگر اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو بددعا کا مفہوم ہوتا ہے یعنی

ہلاک کرے۔ ﴿لَا یَسۡتَوِیۡ مِنۡکُمۡ مَّنۡ اَنۡفَقَ مِنۡ قَبۡلِ الۡفَتۡحِ وَ قٰتَلَ ؕ اُولٰٓئِکَ اَعۡظَمُ دَرَجَۃً مِّنَ الَّذِیۡنَ اَنۡفَقُوۡا مِنۡۢ بَعۡدُ وَ قٰتَلُوۡا ؕ﴾ (57/الحدید:10) ''برابر نہیں ہے تم لوگوں میں سے وہ جس نے خرچ کیا فتح سے پہلے اور قتال کیا۔ وہ لوگ زیادہ عظیم ہیں بلحاظ درجے کے، ان لوگوں سے جنہوں نے خرچ کیا بعد میں اور قتال کیا۔'' ﴿قٰتَلَہُمُ اللّٰہُ ۚ اَنّٰی یُؤۡفَکُوۡنَ ﴿۳۰﴾﴾ (9/التوبہ:30) ''ہلاک کرے ان کو اللہ، کدھر بہکے جا رہے ہیں۔''

قَاتِلْ ج: قَاتِلُوْا۔ فعل امر ہے۔ تو جنگ کر۔ تو قتال کر۔ ﴿فَقَاتِلۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ۚ﴾ (4/النساء:84) ''پس آپ قتال کیجئے اللہ کی راہ میں۔'' ﴿وَ قَاتِلُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ﴾ (2/البقرہ:190) ''اور تم لوگ قتال کرو اللہ کی راہ میں۔''

(افتعال) **اِقْتِتَالًا** اہتمام سے لڑنا۔ آپس میں لڑنا۔ ﴿وَ لَوۡ شَآءَ اللّٰہُ مَا اقۡتَتَلُوۡا ۟ قف﴾ (2/البقرہ:253) ''اور اگر اللہ چاہتا تو وہ لوگ آپس میں نہ لڑتے۔''

خ ی ر

(ض) **خَیْرًا** فائدہ مند ہونا۔ صاحبِ خیر ہونا۔

خِیَرًا، خِیَرَۃً پسند کرنا۔ انتخاب کرنا۔ فضیلت دینا۔

خَیْرٌ مصدر کے علاوہ اسم ذات بھی ہے۔ وہ چیز جو سب کو پسندیدہ ہو۔ (۱) عربی زبان میں یہ لفظ ہر بھلائی، نیکی، خیر اور نیک کام پر بولا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿وَ مَا تُقَدِّمُوۡا لِاَنۡفُسِکُمۡ مِّنۡ خَیۡرٍ تَجِدُوۡہُ عِنۡدَ اللّٰہِ ؕ﴾ (2/البقرہ:110) ''اور جو نیکی بھی تم آگے بھیجو گے اپنے لیے تو تم پاؤ گے اس کو (یعنی اس کا اجر) اللہ کے ہاں۔'' ﴿وَلۡتَکُنۡ مِّنۡکُمۡ اُمَّۃٌ یَّدۡعُوۡنَ اِلَی الۡخَیۡرِ﴾ (3/آل عمران:104) ''اور ضرور ہونی چاہیے تم میں ایک ایسی جماعت جو نیکی کی طرف بلائے۔'' (۲) مال و دولت۔ عرب مال کو بھی خیر سے تعبیر کرتے تھے گویا مال بھلائی ہی بھلائی ہے۔ ﴿وَ اِنَّہٗ لِحُبِّ الۡخَیۡرِ لَشَدِیۡدٌ ؕ﴿۸﴾﴾ (100/العدیت:8) ''اور یقیناً وہ مال کی محبت میں شدید ہے۔'' ﴿قُلۡ مَاۤ اَنۡفَقۡتُمۡ مِّنۡ خَیۡرٍ فَلِلۡوَالِدَیۡنِ﴾ (2/البقرۃ:215) ''آپ فرمایئے جو کچھ خرچ کرو اپنے مال سے تو اس کے مستحق تمہارے ماں باپ ہیں۔''

خَیْرٌ اس مادہ کا افعل التفضیل اَخۡیَرُ بہت کم استعمال ہوتا ہے۔ اس کے بجائے زیادہ تر خَیۡرٌ استعمال ہوتا ہے اور قرآن مجید میں بھی خَیۡرٌ استعمال ہوا ہے۔ اَخۡیَرُ کہیں نہیں آیا۔ بہتر یا سب سے بہتر۔ ﴿اَنَا خَیۡرٌ مِّنۡہُ ۚ﴾ (7/الاعراف:12) ''میں بہتر ہوں اس سے۔'' ﴿بَلِ اللّٰہُ مَوۡلٰىکُمۡ ۚ وَ ہُوَ خَیۡرُ النّٰصِرِیۡنَ ﴿۱۵۰﴾﴾ (3/آل عمران:150) ''بلکہ اللہ تمہارا مولیٰ ہے اور وہ سب سے بہتر مدد کرنے والا ہے۔'' خَیۡرٌ کا استعمال جب افعل التفضیل کے معنی میں ہو تو اس کی جمع نہیں آتی۔ (لغات القرآن، ج ۲، ص ۳۲۹)

خَیْرٰتٌ یہ خَیۡرَۃٌ کی جمع سالم ہے۔ بھلائیاں۔ نیکیاں۔ نیک عورتیں۔ بہترین اخلاق والی عورتیں۔ ﴿اِنَّہُمۡ کَانُوۡا یُسٰرِعُوۡنَ فِی الۡخَیۡرٰتِ﴾ (21/الانبیاء:90) ''بیشک وہ لوگ جلدی کیا کرتے تھے نیکیوں میں۔'' ﴿فِیۡہِنَّ خَیۡرٰتٌ حِسَانٌ ﴿ۚ۷۰﴾﴾ (55/الرحمٰن:70) ''اُن میں نیک سیرت، خوبصورت عورتیں ہیں۔''

اَخْیَارٌ خَیۡرٌ کی اَفۡعَالٌ کے وزن پر جمع مکسر ہے۔ بہت خیر والے۔ ﴿وَ اذۡکُرۡ اِسۡمٰعِیۡلَ وَ الۡیَسَعَ وَ ذَا الۡکِفۡلِ ؕ وَ کُلٌّ مِّنَ الۡاَخۡیَارِ ﴿ؕ۴۸﴾﴾ (38/صٓ:48) ''اور یاد کرو اسمٰعیلؑ کو اور یسعؑ کو اور ذوالکفل کو، وہ سب بہت خیر والوں میں سے تھے۔''

خِيَرَةُ — مصدر کے علاوہ اسم ذات بھی ہے۔ اختیار۔ ﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ﴾ (33/الاحزاب:36) ''نہیں ہے کسی مومن مرد کے لیے اور نہ ہی کسی مومن عورت کے لیے، جب فیصلہ کرے اللہ اور اس کا رسول کسی کام کا، کہ ہو ان کے لیے پسند کرنے کا اختیار اپنے کام میں۔''

(تفعّل) تَخَيُّرًا — کسی چیز کو اپنے لیے پسند کرنا۔ ﴿وَفَاكِهَةٍ مِّمَّا يَتَخَيَّرُوْنَ ۙ﴾ (56/الواقعہ:20) ''اور پھل، اس میں سے جو وہ لوگ پسند کریں۔''

(افتعال) اِخْتِيَارًا — چن لینا۔ منتخب کرنا۔ ﴿وَاخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ سَبْعِيْنَ رَجُلًا﴾ (7/الاعراف:155) ''اور چن لیے حضرت موسیٰؑ نے اپنی قوم سے ستر مرد۔''

عِنْدَ یہ ظرف ہے اور قرب کے معنی دیتا ہے۔ پھر کبھی تو بطور ظرف مکان، قربِ مکانی کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا: ﴿فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ﴾ (27/النمل:40) ''پھر جب حضرت سلیمانؑ نے اسے اپنے پاس رکھا ہوا دیکھا'' یا فرمایا: ﴿عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى ؕ﴾ (53/النجم:15) ''اس کے قریب جنۃ الماویٰ ہے۔'' اور کبھی بطور ظرف زمان، قرب زمانی کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے مثلاً عِنْدَ الصُّبْحِ۔ صبح کے قریب یا عِنْدَ طلوعِ الشمسِ سورج نکلنے کے قریب۔ اور کبھی معنوی طور پر قرب ظاہر کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا: ﴿قَالَ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ﴾ (27/النمل:40) ''اس شخص نے کہا جس کے پاس کتاب میں سے علم تھا'' یا فرمایا: ﴿بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۙ﴾ (3/آل عمران:169) ''بلکہ وہ لوگ اپنے پروردگار کے پاس زندہ ہیں، انہیں رزق دیا جاتا ہے۔'' اس پر حرف جر میں سے صرف مِنْ آتا ہے جو مزید تاکید کا مفہوم پیدا کرتا ہے اور کوئی حرف نہیں آتا۔ جیسے فرمایا: ﴿فَاِذَا بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِكَ﴾ (4/النساء:81) ''پھر جب باہر نکلتے ہیں آپؐ کے پاس سے۔'' (واللہ اعلم)۔

ت و ب: البقرۃ آیت 37 دیکھیں۔ ر ح م: آیت بسم اللہ دیکھیں۔

ترکیب 'وَ' عطف کا ہے۔ اِذْ ظرف زمان ہے اور اس سے پہلے اُذْكُرُوْا محذوف ہے۔ قَالَ کا فاعل مُوْسٰى ہے اور لِقَوْمِهٖ متعلق فعل ہے۔ يَا قَوْمِ میں میم کی کسرہ بتا رہی ہے کہ اس کا مضاف الیہ یائے متکلم محذوف ہے۔ یعنی یہ فقرہ دراصل يَا قَوْمِيْ ہے۔ اِنَّ کا اسم كُمْ ہے اور ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ جملہ فعلیہ اِنَّ کی خبر ہے۔ بِاتِّخَاذِ میں 'بِ' سببیہ ہے اور اِتِّخَاذِ مصدر ہے اور مضاف ہونے کی وجہ سے لام تعریف اور تنوین سے خالی ہے۔ كُمْ اس کا مضاف الیہ ہے۔ یہاں پر مصدر، فعل کا کام کر رہا ہے اس لیے اِتِّخَاذِ کا مفعول اوّل اَلْعِجْلَ ہے اور اس کا مفعول ثانی اِلٰهًا محذوف ہے۔ فَتُوْبُوْٓا میں 'فَ' استئنافیہ ہے اور تُوْبُوْا فعل امر ہے۔ اس کا فاعل اس میں شامل ضمیر اَنْتُمْ ہے۔ اِلٰى بَارِئِكُمْ متعلق فعل ہے۔ تَابَ کے ساتھ جب اِلٰى کا صلہ آئے تو مطلب ہوتا ہے بندے کا اپنی غلطی پر پشیمان ہو کر اللہ کی طرف رجوع کرنا یعنی توبہ کرنا۔ آگے فَاقْتُلُوْٓا میں 'فَ' عطف کا ہے۔ اور اُقْتُلُوْا، تُوْبُوْا پر عطف ہے۔ اَنْفُسَكُمْ اس کا مفعول ہے۔ ذٰلِكُمْ مبتدا ہے، خَيْرٌ خبر اور لَكُمْ متعلق خبر ہے۔ عِنْدَ بَارِئِكُمْ ظرف ہے آگے فَتَابَ عَلَيْكُمْ سے پہلے ''فَفَعَلْتُمْ مَا اَمَرَكُمْ بِهٖ مُوْسٰى'' محذوف ہے۔ تَابَ کا فاعل اس میں شامل هُوَ کی ضمیر ہے جو اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ عَلَيْكُمْ متعلق فعل ہے۔ تَابَ کے ساتھ جب عَلٰى کا صلہ استعمال ہو تو مطلب ہوتا ہے اللہ کا اپنی رحمت کے ساتھ بندے کی طرف رجوع کرنا یعنی توبہ قبول کرنا۔ اِنَّ حرف مشبہ بالفعل ہے۔ اس سے متصل ضمیر اس کا اسم ہے۔ هُوَ ضمیر فاصل ہے اور تاکید کے لیے ہے اور اَلتَّوَّابُ اور اَلرَّحِيْمُ اس کی خبریں ہیں۔

ترجمہ
البقرۃ:54

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى	لِقَوْمِهٖ	يٰقَوْمِ	اِنَّكُمْ	ظَلَمْتُمْ
اور (یاد کرو) جب کہا موسیٰؑ نے	اپنی قوم سے	اے میری قوم	بے شک تم نے	ظلم کیا

اَنۡفُسَکُمۡ	بِاتِّخَاذِکُمُ	الۡعِجۡلَ	فَتُوۡبُوۡۤا	اِلٰی بَارِئِکُمۡ
اپنے آپ پر	بسبب تمہارے بنانے کے	بچھڑے کو (معبود)	پس تم توبہ کرو	اپنے خالق سے

فَاقۡتُلُوۡۤا	اَنۡفُسَکُمۡ ؕ	ذٰلِکُمۡ خَیۡرٌ	لَّکُمۡ	عِنۡدَ بَارِئِکُمۡ ؕ
اور تم قتل کرو	اپنوں کو (یعنی جنہوں نے شرک کیا)	یہ بہتر ہے	تمہارے لیے	تمہارے خالق کے نزدیک

فَتَابَ عَلَیۡکُمۡ ؕ	اِنَّہٗ	ہُوَ التَّوَّابُ	الرَّحِیۡمُ ﴿۵۴﴾
پس اس (اللہ) نے تمہاری توبہ قبول کی	یقیناً وہ	بہت ہی توبہ قبول کرنے والا	انتہائی رحم کرنے والا ہے

نوٹ :1 آیت میں قوم سے مراد خاص وہ لوگ ہیں جنہوں نے بچھڑے کو سجدہ کیا اور فَاقۡتُلُوۡۤا اَنۡفُسَکُمۡ سے یہ مراد نہیں کہ ہر شخص نے خود اپنی گردن پر تلوار چلا دے۔ دراصل حکم یہ تھا کہ ہر قبیلہ کے ایسے افراد جنہوں نے بچھڑے کی پرستش میں حصہ نہیں لیا تھا، اپنے قبیلہ کے ان لوگوں کو قتل کریں جنہوں نے اس کی پرستش کی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ باپ نے بیٹے کو، بیٹے نے باپ کو اور بھائی نے بھائی کو قتل کیا۔ اس صورتحال کو اپنے آپ کو قتل کرنا کہا گیا ہے۔

نوٹ :2 بنواسرائیل نے جب توبہ کر لی یعنی اپنے مجرموں کو قتل کر دیا تو پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کر لی۔ یہاں پر کچھ لوگوں کے ذہن میں یہ اُلجھن پیدا ہوتی ہے کہ مجرموں کو تو ان کے جرم کی سزا دی گئی پھر توبہ کہاں قبول ہوئی۔

اس ضمن میں پہلی بات یہ سمجھ لیں کہ توبہ کی قبولیت کا تعلق آخرت کی سزا سے ہے۔ اگر توبہ کرنے کے باوجود کسی کو اپنے گناہ کی سزا دنیا میں ملتی ہے تو یہ اس کے گناہ کا کفارہ ہے۔ اور ایسی صورت میں توبہ کی قبولیت یعنی آخرت کی سزا سے بچنے کا امکان بہت بڑھ جاتا ہے۔ اگر کسی کی توبہ کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ آخرت کی سزا کے ساتھ اس کی دنیا کی سزا بھی معاف کر دے تو یہ اضافی رحمت یعنی اس کا فضل ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ کچھ جرائم کی نوعیت ایسی ہوتی ہے کہ توبہ کرنے سے دنیا کی سزا ساقط نہیں ہوتی۔ مثلاً قتل عمد کا مجرم اگر توبہ کر لے تب بھی پھانسی کی سزا برقرار رہے گی اِلّا یہ کہ مقتول کے ورثاء معاف کر دیں یا ثبوت زنا بالشہادۃ پر رجم۔ یہی وجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر کچھ لوگوں نے اپنے جرم کا اعتراف کیا اور درخواست کی کہ انہیں رجم کی سزا دی جائے تا کہ ان کی توبہ کی قبولیت اور آخرت کی سزا سے بچنے کی صورت پیدا ہو۔

آیت :55

﴿وَ اِذۡ قُلۡتُمۡ یٰمُوۡسٰی لَنۡ نُّؤۡمِنَ لَکَ حَتّٰی نَرَی اللّٰہَ جَہۡرَۃً فَاَخَذَتۡکُمُ الصّٰعِقَۃُ وَ اَنۡتُمۡ تَنۡظُرُوۡنَ ﴿۵۵﴾﴾

اِذۡ: البقرۃ آیت 30 دیکھیں۔ ق و ل: البقرۃ آیت 8 دیکھیں۔ ء م ن: البقرۃ آیت 3 دیکھیں۔

حَتّٰی یہ لفظ کسی چیز کی انتہا اور غایت بتلانے کے لیے آتا ہے۔ یہ صرف اسم یا فعل پر داخل ہوتا ہے، کسی ضمیر پر داخل نہیں ہوتا۔ یہ تین طرح سے استعمال ہوتا ہے۔ (۱) بطور حرف جر۔ (تک۔Till)۔ اسم کو جر دیتا ہے (عامل)۔ عربی میں کہتے ہیں اَکَلۡتُ السَّمَکَۃَ حَتّٰی رَاۡسِہَا (میں نے مچھلی کو اس کے سر تک کھایا یعنی سر نہیں کھایا)۔ قرآنِ مجید میں فرمایا ﴿حَتّٰی حِیۡنٍ﴾ (12/یوسف:35) ''کچھ سالوں تک۔'' ﴿حَتّٰی مَطۡلَعِ الۡفَجۡرِ ﴿۵﴾﴾ (97/القدر:5) ''فجر کے طلوع ہونے تک۔''

(۲) بطور ناصب مضارع۔ (یہاں تک کہ۔ تاکہ)۔ مضارع پر داخل ہو تو مضارع کو نصب دیتا ہے (عامل)۔ عربی میں کہتے ہیں لَنْ اَجْلِسَ حَتّٰی یَأْذَنَ الْمُعَلِّمُ۔ میں نہیں بیٹھوں گا یہاں تک کہ استاد اجازت دے۔ قرآنِ مجید میں فرمایا ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ (3/آل عمران:92) ''تم ہرگز بھلائی نہ پاؤ گے جب تک تم اپنی پسندیدہ چیز میں سے خرچ نہیں کرو گے۔'' یا فرمایا: ﴿مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰی يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ﴾ (2/البقرۃ:214) ''چھوا ان کو سختی اور مصیبت نے اور وہ ہلا دیے گئے یہاں تک کہ (وقت کے) رسول اور جوان کے ساتھ ایمان لائے تھے کہہ اٹھے کب آئے گی اللہ کی مدد۔''

(۳) بطور حرفِ عطف (یہاں تک کہ)۔ غیر عامل ہے۔ اَكَلْتُ السَّمَكَةَ حَتّٰی رَاْسَهَا (میں نے مچھلی کھائی یہاں تک کہ اس کا سر بھی کھا گیا)۔ یہاں ماقبل کا نصب مابعد کو بھی آ گیا ہے۔ لغات القرآن کے مطابق قرآنِ مجید میں حتّٰی بطورِ عطف استعمال نہیں ہوا۔ (واللہ اعلم)۔

ر ء ی

(ف) رُؤْيَةً اور رَاْيًا اس کا ماضی رَاٰی اور مضارع میں ہمزہ کو حذف کر کے یَرٰی استعمال ہوتا ہے۔ اس کا معنی ہے کسی چیز کا ادراک کرنا۔ دیکھنا۔ خواہ آنکھوں سے دیکھنا ہو، عقل وبصیرت سے دیکھنا ہو یا خواب میں دیکھنا ہو۔ دیکھنے کے لیے یہ لفظ عام ہے۔ پھر یہ لفظ خیال کرنا یا غور وفکر کرنے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ ظاہری آنکھوں سے دیکھنے کے لیے فرمایا: ﴿فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا﴾ (6/الانعام:76) ''پھر جب چھا گئی انؑ پر رات تو انہوں نے دیکھا ایک تارا'' ﴿فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ﴾ (3/آل عمران:13) ''ایک گروہ لڑتا تھا اللہ کی راہ میں اور دوسرا کافر تھا۔ دیکھ رہے تھے (مسلمان) انہیں اپنے سے دو چند (اپنی) آنکھوں سے۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔ عقل وبصیرت سے دیکھنے کے لیے فرمایا: ﴿مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى﴾ (53/النجم:11) ''جھوٹ نہیں کہا رسولؐ کے دل نے جو دیکھا۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)۔ یہاں رؤیت بمعنی عقل وبصیرت سے دیکھنا ہے۔ خواب میں دیکھنے کے لیے فرمایا: ﴿اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى﴾ (37/الصافات:102) ''بے شک میں دیکھتا ہوں نیند میں کہ میں ذبح کرتا ہوں تجھ کو پس تو دیکھ کہ تو کیا خیال کرتا ہے۔'' خیال کرنے یا تصور کرنے کے لیے فرمایا: ﴿وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ﴾ (2/البقرہ:165) ''اور کاش تصور کریں وہ لوگ جنہوں نے ظلم کیا (اس وقت کا) جب وہ لوگ دیکھیں گے عذاب کو۔'' جب اس کے ساتھ ہمزہ استفہام ہو، جیسے اَرَاَيْتَ (کیا تو نے دیکھا) یا اَرَاَيْتُمْ (کیا تم نے دیکھا) تو اس سے مراد لی جاتی ہے 'کسی کی حالت پر غور کرنا'، 'یا کسی چیز کو جاننا' یا پھر یہ اَخْبِرْنِيْ (تو مجھے بتا) یا اَخْبِرُوْنِيْ (تم مجھے بتاؤ) کے قائم مقام ہوتا ہے۔ مثلاً: ﴿اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ﴾ (25/الفرقان:43) ''کیا آپؐ نے اس کی بھی حالت دیکھی ہے جس نے اپنی خواہشوں کو اپنا خدا بنا رکھا ہے۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔ ﴿اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ﴾ (107/الماعون:1) ''کیا آپؐ نے دیکھا اُس کو جو (روزِ) جزا کو جھٹلاتا ہے۔'' یعنی کیا آپؐ نے جانا اور پہچانا اُس شخص کو جو روزِ جزا کو نہیں مانتا۔ ﴿اَفَرَءَيْتَ اِنْ مَّتَّعْنٰهُمْ سِنِيْنَ﴾ (26/الشعراء:205) ''ذرا بتلا اگر ہم انہیں چند سال تک عیش میں رہنے دیں۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔ ﴿قَالَ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ﴾ (26/الشعراء:75) ''حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا کیا تم نے دیکھا یا کیا تم نے ان کی حالت پر غور کیا جنہیں تم پوجتے ہو۔'' ﴿اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ﴾ (56/الواقعۃ:58) ''اچھا یہ تو بتاؤ کہ تم جو منی پہنچاتے ہو۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔ کبھی اس کے آگے کاف خطاب بھی لگا دیا جاتا ہے یعنی اَرَاَيْتَكَ یا اَرَاَيْتَكُمْ۔ ایسی

صورت میں 'ت' تبدیل نہیں ہوتی بلکہ کاف خطاب حسبِ مقام تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ معنی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ﴿قَالَ اَرَءَیۡتَکَ ھٰذَا الَّذِیۡ کَرَّمۡتَ عَلَیَّ﴾ (17/بنی اسرائیل:62) ''اس نے کہا مجھے بتا یہ (آدم) جس کو تو نے مجھ پر فضیلت دی ہے۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔ ﴿قُلۡ اَرَءَیۡتَکُمۡ اِنۡ اَتٰىکُمۡ عَذَابُ اللّٰہِ﴾ (6/الانعام:40) ''آپؐ کہیے کہ اچھا یہ تو بتاؤ کہ اگر تم پر اللہ کا عذاب آپڑے۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔ جب اس کے ساتھ اِلٰی کا صلہ استعمال ہو تو مطلب ہوتا ہے کسی چیز کی حالت پر غور کر کے اسے سمجھنا اور اس سے عبرت حاصل کرنا۔ ﴿اَلَمۡ تَرَ اِلٰی رَبِّکَ﴾ (25/الفرقان:45) ''کیا آپؐ نے اپنے رب (کی قدرت) کی طرف نظر نہیں کی۔'' (نوٹ: مادہ ر ء ی کی املاء اور استعمال کے متعلق کچھ ضروری باتیں آگے نوٹ میں دیکھیں)

رأْیٌ — اسم ذات بھی ہے۔ رائے۔ خیال۔ ﴿وَمَا نَرٰىکَ اتَّبَعَکَ اِلَّا الَّذِیۡنَ ھُمۡ اَرَاذِلُنَا بَادِیَ الرَّاۡیِ ۚ﴾ (11/ھود:27) ''اور ہم تو بس یہی دیکھتے ہیں کہ تمہارے پیرو وہی ہوئے ہیں جو ہم میں سے بالکل رذیل ہیں (اور وہ بھی) سرسری رائے سے۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔ بَادِیُ الرَّأْیِ۔ ابتدائی رائے یا ظاہری، سرسری رائے۔

رُءْیَا — اسم ذات ہے۔ یہ فُعْلٰی کا وزن ہے۔ اس لیے مبنی کی طرح استعمال ہوتا ہے۔ کبھی 'ء' کو حذف کر کے واؤ کے ساتھ رُوْیَا بھی کہہ دیتے ہیں۔ اس کا عام اور مشہور معنی ''خواب'' ہے۔ مثلاً فرمایا: ﴿لَا تَقۡصُصۡ رُءۡیَاکَ عَلٰۤی اِخۡوَتِکَ﴾ (12/یوسف:5) ''تو مت بیان کر اپنے خواب کو اپنے بھائیوں سے۔'' اور حدیث مبارک میں فرمایا: لَمْ یَبْقَ مِنْ مُبَشِّرَاتِ النُّبُوَّۃِ اِلَّا الرُّؤْیَا۔ یعنی مبشراتِ نبوت میں سے صرف خواب رہ گئے ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ عربی زبان میں رُؤْیَا مصدر بمعنی ''حالت بیداری میں دیکھنا'' اور اسم ذات بمعنی ''نظارہ، منظر'' بھی استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ اِن معنوں میں قرآن مجید میں فرمایا: ﴿وَمَا جَعَلۡنَا الرُّءۡیَا الَّتِیۡۤ اَرَیۡنٰکَ اِلَّا فِتۡنَۃً لِّلنَّاسِ﴾ (17/بنی اسرائیل:60) ''اور وہ دکھلاوا جو تجھ کو دکھلایا ہم نے سو جانچنے کو لوگوں کے۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)۔ ''ہم نے واقعہ معراج میں جو تماشا (بحالتِ بیداری) آپؐ کو دکھلایا تھا......'' (ترجمہ حضرت تھانویؒ)۔ ''اور ہم نے جو منظر آپؐ کو دکھلایا تھا اسے ہم نے لوگوں کی آزمائش کا سبب بنا دیا۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔ ''صاحبؒ ضیاء القرآن اِس آیت میں الرُّءۡیَا کا ترجمہ ''نظارہ'' کرتے ہیں اور حاشیے میں فرماتے ہیں: ''اس آیت میں رؤیا کا لفظ خواب کے معنی میں مستعمل نہیں بلکہ عالمِ بیداری میں دیکھنے کے لیے مستعمل ہے حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے المراد برؤیا ھھنا رؤیا عین یہاں رؤیا سے مراد عالمِ بیداری میں دیکھنا ہے۔ سعید بن جبیر، حسن، مسروق، قتادہ، مجاہد، عکرمہ، ابن جریر اور ان کے علاوہ کثیر التعداد علماء تفسیر کی یہی رائے ہے اور اہل عرب کہتے ہیں رأیت بعینی رویۃً و رؤیا (مظہریؒ)۔'' (ضیاء القرآن، ج۲، ص۶۶۸)

رِءْیٌ — اسم ذات ہے۔ ''وہ دلکش حالت اور ظاہری لباس جو آنکھوں سے دکھائی دے۔'' (ضیاء القرآن، ج۳، ص ۹۴)۔ نمود و نمائش۔ ظاہری سج دھج۔ یہ رُؤْیَۃٌ سے مشتق ہے۔ ﴿وَ کَمۡ اَھۡلَکۡنَا قَبۡلَھُمۡ مِّنۡ قَرۡنٍ ھُمۡ اَحۡسَنُ اَثَاثًا وَّ رِءۡیًا ﴿۷۴﴾﴾ (19/مریم:74) ''اور کتنی قومیں اُن سے پہلے تھیں جن کو ہم نے برباد کر دیا، وہ ساز و سامان اور ظاہری سج دھج میں ان سے بہتر تھیں۔''

(افعال) اِرَاءَۃً اور اِرَاءً — اس کا ماضی۔ مضارع اَرٰی - یُرِیۡ استعمال ہوتا ہے۔ دکھانا۔ سمجھانا۔ اس کے عموماً دو مفعول ہوتے ہیں یعنی کس کو دکھایا اور کیا دکھایا اور دونوں بغیر صلے کے آتے ہیں۔ ﴿وَ کَذٰلِکَ نُرِیۡۤ اِبۡرٰھِیۡمَ مَلَکُوۡتَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ﴾ (6/الانعام:75) ''اور اس طرح ہم نے دکھائی ابراہیمؑ کو زمین اور آسمانوں کی بادشاہت۔'' ﴿قَالَ فِرۡعَوۡنُ مَاۤ اُرِیۡکُمۡ اِلَّا

مَآ اَرٰی ﴾(40/مومن:29) ''بولا فرعون میں تو وہی بات سمجھا تا ہوں تم کو جو سوجھی مجھ کو۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)

اَرِ — ج: اَرُوْا۔ فعل امر ہے۔ تو دکھا۔ تو سمجھا۔ ﴿وَ اَرِنَا مَنَاسِكَنَا﴾ (2/البقرۃ:128) ''اور تو دکھا اور سمجھا ہم کو ہماری عبادت کے طریقے۔'' ﴿هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ فَاَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ ط﴾ (31/لقمان:11) ''یہ سب کچھ بنایا ہوا ہے اللہ کا اب دکھلاؤ مجھ کو کیا بنایا ہے اوروں نے جو اس کے سوا ہیں۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)

(مفاعلہ) رِئَآءً اور رِیَآءً — اس کا ماضی۔ مضارع رَاءٰی۔ یُرٰءِیْ استعمال ہوتا ہے۔ حقیقت کے خلاف دکھانا۔ دکھاوا کرنا۔ ریا کاری کرنا۔ ﴿يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴾ (4/النساء:142) ''وہ لوگوں کو دکھاتے ہیں اور یاد نہیں کرتے اللہ کو مگر تھوڑا سا۔'' ﴿وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ﴾ (4/النساء:38) ''اور وہ لوگ جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال لوگوں کو دکھانے کے لیے۔''

(تفاعل) تَرَاءٍ — اس کا ماضی۔ مضارع تَرَاءٰی۔ یَتَرَاءٰی استعمال ہوتا ہے۔ ایک دوسرے کو دیکھنا۔ آمنے سامنے ہونا۔ ﴿فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ﴾ (8/الانفال:48) ''پھر جب آمنے سامنے ہوئیں دو جماعتیں تو وہ پیچھے ہٹا اپنی ایڑیوں کے بل۔''

اَللّٰهُ (ء ل ہ): آیت بسم اللہ دیکھیں۔

ج ہ ر

(ف) جَهْرًا، جَهْرَةً اور جِهَارًا — اس کا بنیادی مفہوم ہے نمایاں کرنا۔ ظاہر کرنا۔ پھر عام طور پر یہ لفظ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ (۱) آواز کو ظاہر کرنا (یعنی بلند کرنا) اور اعلان کرنا تاکہ دوسرے سن لیں۔ (۲) کسی چیز کو دکھانے کے لیے ظاہر کرنا تاکہ وہ کھلم کھلا دکھائی دے۔ چنانچہ آواز کے لیے فرمایا: ﴿سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهٖ﴾ (13/الرعد:10) ''برابر ہیں تم میں سے وہ جو چھپائے بات کو اور وہ جو نمایاں کرے اس کو۔'' ﴿ثُمَّ اِنِّيْ دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ﴾ (71/نوح:8) ''پھر میں نے دعوت دی ان کو آواز بلند کرتے ہوئے۔'' ﴿لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ط﴾ (4/النساء:148) ''برائی کے ساتھ آواز بلند کرنے کو اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا مگر مظلوم کو اجازت ہے۔'' (ترجمہ احسن البیان)۔ اور دیکھنے کے لیے فرمایا: ﴿فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً﴾ (4/النساء:153) ''تو انہوں نے کہا تو دکھا ہمیں اللہ کھلم کھلا۔'' اور آیت زیر مطالعہ۔ اور عام مفہوم کے اعتبار سے فرمایا: ﴿يَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَجَهْرَكُمْ وَيَعْلَمُ مَا تَكْسِبُوْنَ ﴾ (6/الانعام:3) ''وہ جانتا ہے تمہارے چھپانے کو اور تمہارے نمایاں کرنے کو اور وہ جانتا ہے جو تم لوگ کماتے ہو۔''

اِجْهَرْ — ج: اِجْهَرُوْا۔ فعل امر ہے۔ تو نمایاں کر۔ ﴿وَ اَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ اَوِ اجْهَرُوْا بِهٖ ط﴾ (67/الملک:13) ''اور تم لوگ چھپاؤ اپنی بات کو یا نمایاں کرو اس کو۔''

ء خ ذ: البقرۃ آیت 48 دیکھیں۔ ص ع ق: البقرۃ آیت 19 دیکھیں۔ ن ظ ر: البقرۃ آیت 50 دیکھیں۔

ترکیب

'وَ' حرف عطف ہے۔ اِذْ ظرف زمان ہے اور اس سے پہلے اُذْكُرُوْا محذوف ہے۔ قُلْتُمْ، ماضی میں جمع مذکر حاضر کا صیغہ ہے۔ یَا حرف ندا ہے۔ اور مُوْسٰی، منادیٰ ہے۔ لَنْ، نواصب مضارع میں سے ہے اس لیے نُّؤْمِنَ حالت نصب میں ہے اور لَكَ متعلق فعل ہے۔ یاد کر لیجیے اگر اٰمَنَ یُؤْمِنُ کے ساتھ 'لِ' کا صلہ آئے تو اس سے مراد ہوتی ہے کسی کی بات کو تسلیم کر لینا خواہ اس میں دلی یقین شامل نہ ہو۔ اور اگر 'بِ' کا صلہ آئے تو مراد ہوتی ہے قلبی

یقین کے ساتھ کسی کی بات کو ماننا۔ گویا یہاں پر بنی اسرائیل حضرت موسیٰؑ سے کہہ رہے ہیں کہ تورات کی قلبی تصدیق تو دور کی بات، ہم ظاہری طور پر بھی آپؑ کی بات اس وقت تک نہ مانیں گے جب تک ہم علانیہ اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھ لیتے۔ حَتّٰی بھی نواصب مضارع میں سے ہے اس لیے نَرَی حالت نصب میں ہے۔ نَرَی فعل اس میں شامل ضمیر اس کا فاعل، لفظ اَللّٰہَ اس کا مفعول اور جَھْرَۃً حال ہے۔ جَھْرَۃً کو قُلْتُمْ کی ضمیر فاعلی کا حال بھی مانا گیا ہے اور لفظ اَللّٰہَ کا بھی۔ اگر قُلْتُمْ کی ضمیر فاعلی کا حال مانیں تب مطلب ہوگا جب تم نے باآواز بلند کہہ دیا اور اگر لفظ اَللّٰہَ کا حال مانیں تب مطلب ہوگا جب تک اللہ کو علانیہ یا کھلم کھلا نہیں دیکھ لیتے۔ ہمارے اکثر بزرگوں نے اسے لفظ اَللّٰہَ کا حال مان کر ترجمہ کیا ہے۔ آگے 'فَ' عطف کا ہے۔ اَخَذَتْ، واحد مؤنث غائب کا صیغہ ہے۔ کُمْ مفعول ہے اور اَلصّٰعِقَۃُ، اس کا فاعل۔ 'وَ' حالیہ ہے اور جملہ اسمیہ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ، حال ہے، کُمْ ضمیر کا۔

ترجمہ	وَاِذْ قُلْتُمْ	یٰمُوْسٰی	لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ	حَتّٰی نَرَی
البقرۃ:55	اور (یاد کرو) جب تم نے کہا	اے موسیٰؑ	ہم ہرگز نہیں مانیں گے آپؑ کی بات	یہاں تک کہ ہم دیکھیں

اللّٰہَ جَھْرَۃً	فَاَخَذَتْکُمُ	الصّٰعِقَۃُ	وَ	اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ
اللہ کو علانیہ	تو پکڑا تم کو	بجلی نے	اس حال میں کہ	تم دیکھ رہے تھے (اور اس کی مدافعت میں کچھ نہیں کر رہے تھے)

نوٹ مادہ "رءی" کی املاء اور استعمال کے متعلق چند باتیں ذہن نشین کرلیں۔

(۱) ثلاثی مجرد میں اس کا ماضی رَءٰی استعمال ہوتا ہے اور عام عربی میں اسی طرح لکھا جاتا ہے۔ لیکن قرآن مجید میں اسے "ی" کو حذف کر کے لکھا گیا ہے جیسے رَاٰ کَوْکَبًا۔

(۲) ثلاثی مجرد میں اس کا مضارع ہمزہ کو حذف کر کے یَرٰی استعمال ہوتا ہے اور قرآن مجید میں بھی اسے "ی" کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ البتہ ضمیر مفعولی لگاتے وقت "ی" کو حذف کیا گیا ہے جیسے اِنَّهٗ یَرٰکُمْ ھُوَ وَقَبِیْلُهٗ۔

(۳) ثلاثی مجرد میں جمع متکلم کے صیغے میں مضارع مضموم نَرَیُ اور مضارع منصوب نَرَیَ، دونوں تبدیل ہو کر نَرٰی ہو جاتے ہیں۔ اس لیے حَتّٰی نَرَی میں حَتّٰی کا اثر ظاہر نہیں ہوا۔

(۴) ثلاثی مجرد میں مضارع کے واحد متکلم کا وزن اَفْعَلُ ہے جبکہ باب افعال میں ماضی کے واحد مذکر غائب کا وزن اَفْعَلَ ہے۔ ان دونوں وزن میں یہ مادہ تبدیل ہو کر اَرٰی استعمال ہوتا ہے۔ جملہ کے مفہوم سے ان کا فرق پتہ چلتا ہے۔

(۵) جمع مذکر حاضر کے صیغے تَرَوْنَ کے ساتھ جب نّ ثقیلہ لگے تو تَرَوُنَّ لکھا جاتا ہے۔ لَتَرَوُنَّ الْجَحِیْمَ (التکاثر:6) اور واحد مؤنث حاضر کے صیغے تَرَیْنَ کے ساتھ جب نّ ثقیلہ لگے تو تَرَیِنَّ بنتا ہے۔ فَاِمَّا تَرَیِنَّ (مریم:26)۔ اس کا فعل امر 'رَ' ہے۔

آیت:56

﴿ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۶﴾ ﴾

ب ع ث

(ف) بَعْثًا اس کا بنیادی مفہوم ہے کسی کو اٹھا کر کسی طرف بھیجنا۔ اس لیے یہ اٹھانے اور بھیجنے، دونوں معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کی نسبت جب انسانوں کی طرف ہو تو انہی دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے مثلاً کہیں گے بَعَثْتُ الْبَعِیْرَ میں نے اونٹ کو اٹھایا اور چلایا اور بَعَثُ الْاِنْسَانِ فِیْ حَاجَۃٍ کا مطلب ہوگا کسی کو کسی کام کے لیے بھیجنا۔ اس کی نسبت جب اللہ تعالیٰ کی طرف ہو

تو پھر یہ متعدد معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً:

(۱) اشیاء کو عدم سے وجود میں لانا، یہ فعل اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے۔ شاید اِن معنوں میں فعل قرآنِ مجید میں استعمال نہیں ہوا (واللہ اعلم)۔

(۲) بھیجنا۔ چنانچہ رسولوں کو بھیجنے کے لیے فرمایا: ﴿فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ﴾ (2/البقرۃ:213) ''تو بھیجا اللہ تعالیٰ نے نبیوں کو خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے بنا کر۔'' غیر رسول کو بھیجنے کے لیے فرمایا: ﴿وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ﴾ (7/الاعراف:167) ''اور وہ وقت یاد کرو جب آپؐ کے پروردگار نے یہ جتلا دیا کہ وہ ان یہود پر قیامت کے دن تک کسی ایسے کو مسلط رکھے گا جو انہیں سزائے شدید میں مبتلا رکھے گا۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔ عذاب کو بھیجنے کے لیے فرمایا: ﴿قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ﴾ (6/الانعام:65) ''آپؐ کہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ قدرت رکھتا ہے اس بات پر کہ وہ تم پر بھیج دے عذاب تمہارے اوپر سے۔'' کوّے کو بھیجنے کے لیے فرمایا: ﴿فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا﴾ (5/المآئدۃ:31) ''پھر اللہ تعالیٰ نے ایک کوّے کو بھیجا۔''

(۳) مُردوں کو زندہ کرنا۔ ﴿فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ﴾ (2/البقرۃ:259) ''تو موت دے دی اللہ نے ان کو سو سال کے لیے پھر انہیں زندہ کیا۔'' ﴿وَالْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ﴾ (6/الانعام:36) ''اور مُردوں کو، اللہ ان کو زندہ کرے گا۔'' ﴿فَهٰذَا يَوْمُ الْبَعْثِ﴾ (30/الروم:56) ''تو یہ ہے دوبارہ جی اٹھنے کا دن۔'' یہ صفت اللہ تعالیٰ کبھی اپنے خاص بندوں کو بھی عطا فرما دیتا ہے جیسے کہ حضرت عیسیٰؑ۔

(۴) نیند سے اٹھانا۔ ﴿ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ﴾ (18/الکہف:12) ''پھر ہم نے ان کو جگا دیا۔'' ﴿ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ﴾ (6/الانعام:60) ''پھر وہ تم کو جگا دیتا ہے اس (دن) میں۔''

(۵) کھڑا کرنا، جگہ دینا۔ ﴿عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا﴾ (17/بنی اسرائیل:79) ''قریب ہے کہ کھڑا کر دے تجھ کو تیرا رب مقامِ محمود میں۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ) ''عجب کیا کہ آپ کا پروردگار آپ کو مقامِ محمود میں جگہ دے۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)

(۶) مقرر کرنا۔ ﴿وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا﴾ (5/المائدۃ:12) ''اور ہم نے انہی میں سے بارہ سردار مقرر کیے۔'' ﴿اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا﴾ (2/البقرۃ:247) ''بے شک اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے طالوت کو بادشاہ مقرر کر دیا ہے۔''

اِبْعَثْ ج: اِبْعَثُوْا - فعل امر ہے۔ تو اٹھا۔ تو بھیج۔ ﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ﴾ (2/البقرۃ:129) ''اے ہمارے رب! اور تو بھیج ان میں ایک رسول انہی میں سے۔'' ﴿فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا﴾ (4/النساء:35) ''تو ایک منصف اس مرد کے گھر والوں میں سے اور ایک منصف عورت کے گھر والوں میں سے مقرر کرو۔''

مَبْعُوْثٌ ج: مَبْعُوْثُوْنَ۔ اسم المفعول ہے۔ اٹھایا ہوا۔ بھیجا ہوا۔ ﴿ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ﴾ (17/بنی اسرائیل:49) ''کیا ہمیں دوبارہ اٹھایا جائے گا۔'' ﴿وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ﴾ (6/الانعام:29) ''اور ہم اٹھائے جانے والے نہیں ہیں۔'' یعنی ہمیں دوبارہ زندہ نہیں کیا جائے گا۔ مُردوں کے لیے اس کا استعمال بمعنی جی اٹھنا ہے۔

(انفعال) **اِنْبِعَاثًا** اٹھنا۔ جانا۔ ﴿اِذِ انْۢبَعَثَ اَشْقٰهَا﴾ (91/الشمس:12) ''جب اٹھا ان میں سے زیادہ بدبخت۔'' ﴿وَلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ﴾ (9/التوبۃ:46) ''لیکن ناپسند کیا اللہ نے اُن کے کھڑے ہونے کو۔''

م و ت: البقرۃ آیت 19 دیکھیں۔ لَعَلَّ: البقرۃ آیت 21 دیکھیں۔ ش ك ر: البقرۃ آیت 52 دیکھیں۔

ترکیب

ثُمَّ حرف عطف ہے بَعَثۡنَا فعل، اس میں شامل ضمیر نَحۡنُ اس کا فاعل اور کُمۡ اس کا مفعول ہے۔ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَوۡتِكُمۡ متعلق فعل ہے۔ لَعَلَّ حرف مشبہ بالفعل ہے، کُمۡ اس کا اسم اور جملہ فعلیہ تَشۡكُرُوۡنَ اس کی خبر ہے۔

ترجمہ	ثُمَّ بَعَثۡنٰكُمۡ	مِّنۡۢ بَعۡدِ مَوۡتِكُمۡ	لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ ﴿۵۶﴾
البقرۃ:56	پھر ہم نے اٹھایا تم کو (یعنی زندہ کیا)	تمہاری موت کے بعد	تا کہ تم شکرادا کرو

آیت:57

﴿ وَ ظَلَّلۡنَا عَلَيۡكُمُ الۡغَمَامَ وَ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡكُمُ الۡمَنَّ وَ السَّلۡوٰى ؕ كُلُوۡا مِنۡ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقۡنٰكُمۡ ؕ وَ مَا ظَلَمُوۡنَا وَلٰكِنۡ كَانُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ يَظۡلِمُوۡنَ ﴿۵۷﴾ ﴾

ظ ل ل

(س) ظَلًّا، ظُلُوۡلًا (۱) ہمیشہ رہنا۔ دن کے لیے استعمال ہو جیسے ظَلَّ الیوم تو مراد ہوتی ہے دن کا سایہ دار ہونا یا سارا دن سایہ رہنا۔ (۲) ظَلَّ، یَظَلُّ، افعال ناقصہ میں سے بھی ہے۔ اِن معنوں میں اس کے معنی ہوتے ہیں دن میں کسی کام کو کرنا یا سارا دن ایک جیسی حالت رہنا۔ پھر یہ صَارَ (ہو جانا) کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے اور اس وقت دن کی تخصیص نہیں رہتی۔ ان معنوں میں اس کے بعض صیغے کبھی صرف ایک لام کے ساتھ بھی لکھے جاتے ہیں۔ ﴿وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمۡ بِالۡاُنۡثٰى ظَلَّ وَجۡهُهٗ مُسۡوَدًّا﴾ (16/النحل:58) ''اور جب کبھی خوشخبری دی جاتی ہے ان کے کسی ایک کو بیٹی کی تو ہو جاتا ہے اس کا چہرہ سیاہ۔'' ﴿وَانۡظُرۡ اِلٰۤى اِلٰهِكَ الَّذِىۡ ظَلۡتَ عَلَيۡهِ عَاكِفًا ؕ﴾ (20/طٰہٰ:97) ''اور تو دیکھ اپنے معبود کی طرف جس پر تو ہوا اعتکاف کرنے والا۔''

ظِلٌّ ج: ظِلَالٌ۔ اسم ذات ہے۔ (۱) سایہ۔ اس کی ضد ضِحٌّ (دھوپ) ہے۔ ہر وہ جگہ جہاں دھوپ نہ پہنچے اسے ظِلٌّ کہتے ہیں نیز ہر ڈھانپ لینے والی چیز کو بھی ظِلٌّ کہہ دیا جاتا ہے۔ (۲) عزت وحفاظت، ہر قسم کی خوشحالی۔ ﴿اَلَمۡ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيۡفَ مَدَّ الظِّلَّ ۚ﴾ (25/الفرقان:45) ''کیا آپؐ نے دیکھا نہیں اپنے رب کی (قدرت کی) طرف کیسے اس نے پھیلایا سائے کو۔'' ﴿اِنَّ الۡمُتَّقِيۡنَ فِىۡ ظِلٰلٍ وَّعُيُوۡنٍ ﴿۴۱﴾﴾ (77/المرسلات:41) ''متقی لوگ آج سایوں اور چشموں میں ہیں۔'' (ترجمہ تفہیم القرآن) ''پرہیزگار ہر طرح سے عزت وحفاظت میں ہوں گے۔'' (امام راغبؒ)

ظُلَّةٌ ج: ظُلَلٌ۔ اسم ذات ہے۔ وہ چیز جس سے سایہ کیا جائے۔ بادل۔ سائبان۔ ﴿وَاِذۡ نَتَقۡنَا الۡجَبَلَ فَوۡقَهُمۡ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ﴾ (7/الاعراف:171) ''اور جب ہم نے اٹھایا پہاڑ کو ان کے اوپر جیسے کہ وہ سائبان ہے۔'' ﴿وَاِذَا غَشِيَهُمۡ مَّوۡجٌ كَالظُّلَلِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخۡلِصِيۡنَ لَهُ الدِّيۡنَ ۚ﴾ (31/لقمان:32) ''اور جب چھا جاتی ہیں ان پر موجیں سائبانوں کی طرح تو وہ پکارتے ہیں اللہ کو، خالص کرتے ہوئے اس کے لیے دین کو۔''

ظَلِيۡلٌ فَعِيۡلٌ کے وزن پر صفت ہے۔ ہمیشگی والا سایہ۔ گھنی چھاؤں۔ سایہ دینے والا۔ ﴿لَهُمۡ فِيۡهَاۤ اَزۡوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙ وَّنُدۡخِلُهُمۡ ظِلًّا ظَلِيۡلًا ﴿۵۷﴾﴾ (4/النساء:57) ''ان کے لیے اس میں پاک جوڑے ہیں اور ہم داخل کریں گے ان کو گھنی چھاؤں میں۔'' ﴿لَّا ظَلِيۡلٍ وَّلَا يُغۡنِىۡ مِنَ اللَّهَبِ ﴿۳۱﴾ؕ﴾ (77/المرسلات:31) ''جو دراصل نہ سایہ دینے والا ہے اور نہ شعلے سے بچا سکتا ہے۔'' (ترجمہ احسن البیان)

(تفعیل) تَظْلِیْلًا کسی پر کسی چیز کا سایہ کرنا۔ امان دینا۔ آیت زیرِ مطالعہ۔

غ م م

(ن) غَمًّا کسی چیز کو ڈھانپ دینا۔ غمگین کرنا (یعنی خوشی کو ڈھانپ دینا)۔

غَمٌّ اسم ذات ہے۔ رنج۔ بے چینی۔ ﴿ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۙ وَ نَجَّیْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ ؕ ﴾ (21/الانبیاء:88) ''تو ہم نے سُن لی اس کی اور ہم نے نجات دی اس کو غم سے۔''

غُمَّةٌ صفت ہے۔ پوشیدہ۔ مُبہم۔ مشتبہ۔ ﴿ ثُمَّ لَا یَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَیْكُمْ غُمَّةً ﴾ (10/یونس:71) ''پھر نہ رہے تم کو اپنے کام میں شبہ۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ) ''پھر وہ تمہاری تدبیر تمہارے حق میں پوشیدہ نہ رہے۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)

غَمَامَةٌ ج: غَمَامٌ۔ اسم ذات ہے۔ بادل۔ کیونکہ یہ سورج کی روشنی کو ڈھانپ دیتا ہے۔ آیت زیرِ مطالعہ۔

ن ز ل: البقرۃ آیت 4 دیکھیں۔

م ن ن

(ن) مَنًّا، مِنَّةً (۱) کسی پر وزن یا بوجھ ڈالنا۔ اس بنیادی مفہوم سے پھر دو معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ (ا) کسی پر احسان کرنا۔ (ب) احسان جتانا۔ ﴿ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ بَعَثَ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ ﴾ (3/آل عمران:164) ''اللہ نے احسان کیا ہے ایمان لانے والوں پر جب اس نے بھیجا ان میں ایک رسول انہی میں سے۔'' ﴿ یَمُنُّوْنَ عَلَیْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا ؕ قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَیَّ اِسْلَامَكُمْ ۚ ﴾ (49/الحجرات:17) ''وہ لوگ احسان جتاتے ہیں آپؐ پر کہ وہ اسلام لائے۔ آپؐ کہیے تم احسان مت جتاؤ مجھ پر اپنے اسلام کا۔''

(۲) کم کرنا۔ منقطع کرنا۔ ختم کرنا۔ کمزور کرنا۔

اُمْنُنْ فعل امر ہے۔ تو احسان کر۔ ﴿ هٰذَا عَطَآؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَیْرِ حِسَابٍ ﴿۳۹﴾ ﴾ (38/صٓ:39) ''یہ ہماری بخشش ہے۔ پس تو احسان کر یا روکے رکھ کسی حساب کے بغیر۔''

مَنٌّ اسم ذات ہے۔ (۱) مقررہ وزن یعنی ایک من۔ (۲) احسان۔ انعام۔ (۳) ایک قسم کی شبنم جو پتھروں اور درختوں پر شہد کی مانند جم کر خشک ہو جاتی تھی، جسے اللہ تعالیٰ نے صحرا میں بنی اسرائیل کے کھانے کے لیے نازل کیا تھا (اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کا ان پر احسان تھا)۔ یہ ذائقے میں میٹھی تھی۔ ﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَ الْاَذٰی ۙ ﴾ (2/البقرہ:264) ''اے ایمان والو! تم باطل مت کرو اپنے صدقات کو احسان سے اور تکلیف سے۔'' یعنی احسان جتا کر اور تکلیف دے کر۔ اور آیت زیرِ مطالعہ۔

مَمْنُوْنٌ اسم المفعول ہے۔ (۱) جس پر احسان کیا گیا۔ (۲) جب یہ مصدری معنی نمبر ۲ سے ہو تو مطلب ہوگا جسے ختم کیا گیا، جسے منقطع کیا گیا اور غَیْرُ مَمْنُوْنٍ کا مطلب ہوگا غَیْرُ مَقْطُوْعٍ یعنی جو ختم نہ ہو، جو منقطع نہ ہو اور بعض بزرگوں نے غَیْرُ مَمْنُوْنٍ کا ترجمہ ''بے شمار'' اور ''بغیر عمل'' بھی کیا ہے۔ واللّٰہ اعلم۔ ﴿ لَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ ﴿۸﴾ ﴾ (41/حٰمٓ السجدہ:8) ''ان کے لیے کبھی نہ ختم ہونے والا اجر ہے۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)

مَنُوۡنٌ فَعُوۡلٌ کے وزن پر مبالغہ ہے۔(۱) بہت زیادہ احسان جتانے والا۔(۲) موت۔ کہا جاتا ہے ذَھَبَتْ بِھِمُ الْمَنُوْنُ، موت نے ان کو تباہ کر دیا۔(۳) زمانہ۔ رَیْبُ الْمَنُوْنِ۔ حوادثِ زمانہ۔ رَیْبٌ کا استعمال جب مَنُوْنٌ (زمانہ) کے ساتھ ہو تو اس سے گردش زمانہ یا حوادث زمانہ مراد ہوتا ہے۔ کیونکہ زمانہ کی گردشوں کے تعین اوقات میں شک رہتا ہے کہ خدا جانے کب گردش کا وقت آجائے، اس لیے یہ معنی مراد لیے جاتے ہیں۔ اور گردش زمانہ سے مراد ہے کسی کی اچھی حالت بری حالت سے تبدیل ہو جائے۔ انسان کی زندگی کا سب سے بڑا حادثہ یا گردش، انسان کی موت ہوتی ہے اس لیے رَیْبُ الْمَنُوْنِ سے حادثہ موت بھی مراد لیا جاتا ہے۔ حادثہ موت میں رَیْبٌ یعنی شک سے یہ مراد نہیں کہ موت واقع ہونے میں شک وشبہ ہے بلکہ اس لحاظ سے رَیْبٌ کہا جاتا ہے کہ موت کا وقت طے نہیں، اس لیے انسان تردّد میں رہتا ہے کہ نہ جانے کب موت کا وقت آجائے۔ عربی زبان میں رَیْبُ الْمَنُوْنِ کا محاورہ اس وقت استعمال ہوتا ہے جب کوئی شخص کسی دوسرے کے برے انجام کا منتظر ہو۔ ﴿اَمْ یَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِہٖ رَیْبَ الْمَنُوْنِ ۝۳۰﴾ (52/الطور:30) ''کیا کہتے ہیں یہ شاعر ہے ہم منتظر ہیں اُس پر گردش زمانہ کے۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)

سَلْوٰی بٹیر کی قسم کے ایک پرندے کو سلویٰ کہتے ہیں۔ امام راغبؒ نے اسے مادہ 'س ل و' کے تحت بیان کیا ہے اور فرماتے ہیں ''السّلوٰی اصل میں ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو انسان کے لیے تسلی کا باعث ہو۔ اسی سے اَلسُّلْوٰنِ وَالتَّسَلِّیْ ہے جس کے معنی اطمینان اور راحت کے ہیں۔(واللہ اعلم)۔

ء ک ل: البقرۃ آیت 35 دیکھیں۔

ط ی ب

(ض) طِیۡبًا نفیس و پاکیزہ ہونا۔ حلال ہونا۔ کسی چیز سے دل کا خوش ہونا۔ پسند ہونا۔ ﴿قَالَ لَھُمْ خَزَنَتُھَا سَلٰمٌ عَلَیْکُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْھَا﴾ (39/الزمر:73) ''ان سے کہا اس کے دربان نے السلام علیکم، تم پاکیزہ رہے پس تم اس (جنت) میں داخل ہو جاؤ۔'' ﴿فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ﴾ (4/النساء:3) ''تو تم نکاح کرو جو تمہیں پسند ہوں عورتوں میں سے۔''

طُوۡبٰی یہ افعل التفضیل میں واحد مونث کا صیغہ فُعْلٰی ہے۔ اصل میں طُیْبٰی تھا۔ 'ی' 'و' میں تبدیل ہو کر طُوْبٰی بن گیا۔ اس کے معنی ہوتے ہیں بہت عمدہ، بہت پاکیزہ، خوشحالی۔ حضرت ابن عباسؓ کے مطابق اس کا معنی ہے ''دل کی خوشی اور آنکھوں کی ٹھنڈک''۔ حدیث شریف میں ہے کہ جنت کے ایک درخت کا نام بھی طوبیٰ ہے۔ ﴿اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰی لَھُمْ وَحُسْنُ مَاٰبٍ ۝۲۹﴾ (13/الرعد:29) ''جو لوگ ایمان لائے اور عمل کیے اچھے تو خوشحالی ہے ان کے لیے اور اچھا انجام ہے۔'' حدیث پاک میں ہے: طُوْبٰی لِمَنْ وَجَدَ فِیْ صَحِیْفَتِہٖ اسْتِغْفَارًا کَثِیْرًا (وارے نیارے اس شخص کے جو اپنے نامہ اعمال میں زیادہ استغفار پائے) او کما قال۔

طَیِّبٌ ج: طَیِّبُوْنَ۔ صفت ہے۔ پاک۔ پاکیزہ۔ حلال۔ امام راغبؒ فرماتے ہیں ''اصل میں 'طیّب' وہ چیز ہے کہ جس سے حواس لذت اُٹھائیں اور جی مزہ پائے۔'' ﴿وَکُلُوْا مِمَّا رَزَقَکُمُ اللہُ حَلٰلًا طَیِّبًا ۪﴾ (5/المائدۃ:88) ''اور کھاؤ اُس سے جو رزق دیا ہے تمہیں اللہ تعالیٰ نے حلال اور پاکیزہ۔'' ﴿وَالْبَلَدُ الطَّیِّبُ یَخْرُجُ نَبَاتُہٗ بِاِذْنِ رَبِّہٖ ۚ﴾ (7/الاعراف:58) ''اور پاکیزہ شہر، نکلتا ہے اس کا سبزہ اس کے رب کی اجازت سے۔'' ﴿وَالطَّیِّبُوْنَ لِلطَّیِّبٰتِ ۚ﴾ (24/النور:26) ''اور پاک مرد پاک عورتوں کے لائق ہیں۔'' اور انسانوں میں 'طیّب'' وہ ہیں کہ جو جہالت اور

بداعمالیوں کی نجاست سے پاک ہوں اور علم وایمان اور اعمالِ صالحہ سے آراستہ ہوں۔

طَیِّبَۃٌ ج: طَیِّبَاتٌ۔ طَیِّبٌ کی مونث۔ پاک۔ پاکیزہ۔ حلال۔ ﴿قَالَ رَبِّ هَبۡ لِیۡ مِنۡ لَّدُنۡكَ ذُرِّیَّةً طَیِّبَةً﴾ (3/آل عمران:38) ''حضرت زکریاؑ نے عرض کی اے میرے رب عطا فرما مجھ کو اپنے پاس سے پاکیزہ اولاد'' ﴿اَلۡیَوۡمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّیِّبٰتُ﴾ (5/المائدۃ:5) ''آج حلال کر دی گئیں ہیں تمہارے لیے پاکیزہ چیزیں۔'' اور آیت زیر مطالعہ۔

طِیْبٌ خوشبو۔ قرآن مجید میں استعمال نہیں ہوا۔

ر ز ق: البقرۃ آیت 3 دیکھیں۔	ظ ل م: البقرۃ آیت 17 دیکھیں۔	ك و ن: البقرۃ آیت 10 دیکھیں۔
ن ف س: البقرۃ آیت 9 دیکھیں۔		

ترکیب

'وَ' عطف کا ہے۔ ظَلَّلۡنَا فعل، اس کا فاعل اس میں شامل ضمیر نَحۡنُ ہے۔ عَلَیۡكُمُ متعلق فعل ہے اور اَلۡغَمَامَ اس کا مفعول ہے۔ اسی طرح اَنۡزَلۡنَا فعل ہے اس کا فاعل اس میں شامل ضمیر نَحۡنُ ہے۔ عَلَیۡكُمُ تعلق فعل ہے اور اَلۡمَنَّ وَالسَّلۡوٰی اس کے مفعول ہیں۔ كُلُوۡا فعل امر ہے اور اس کا فاعل اس میں شامل ضمیر اَنۡتُمۡ ہے۔ آگے مرکب جاری مِنۡ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقۡنٰكُمۡ متعلق فعل ہے۔ اس میں طَیِّبٰتِ، مضاف ہے اور مِنۡ کی وجہ سے مجرور ہے اور 'مَا' اسم موصول ہے اور جملہ فعلیہ رَزَقۡنٰكُمۡ اس کا صلہ ہے۔ صلہ اور موصول مل کر مضاف الیہ ہیں۔ آگے 'مَا' نافیہ ہے اور ظَلَمُوۡا۔ ماضی میں جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور 'نَا' ضمیر مفعولی ہے۔ ضمیر مفعولی 'نَا' لگنے سے ظَلَمُوۡا کا آخری الف گر گیا (واؤ الجمع)۔ نوٹ کر لیجئے اگر یہ ماضی کا جمع متکلم کا صیغہ ہوتا تو پھر ظَلَمۡنَا آتا۔ لٰكِنۡ، لٰكِنَّ کا مخفف ہے اور اس کی تفصیل آیت 12 کے آخر میں دیکھیں۔ كَانُوۡا افعال ناقصہ میں سے ہے اس کا اسم اس میں شامل ضمیر 'هُمۡ' ہے اور جملہ فعلیہ یَظۡلِمُوۡنَ اَنۡفُسَهُمۡ اس کی خبر ہے۔ اَنۡفُسَهُمۡ، یَظۡلِمُوۡنَ کا مفعول ہے اور اس کو تاکید کے لیے مقدم کر دیا گیا ہے۔ كَانَ جب مضارع پر داخل ہو تو ماضی استمراری کا مفہوم پیدا ہوتا ہے۔ (واللہ اعلم)۔

ترجمہ

البقرۃ:57

وَظَلَّلۡنَا	عَلَیۡكُمُ	الۡغَمَامَ	وَاَنۡزَلۡنَا	عَلَیۡكُمُ
اور ہم نے سایہ فگن کیا	تم پر	بادلوں کو	اور ہم نے اتارا	تم پر

الۡمَنَّ وَالسَّلۡوٰی	كُلُوۡا	مِنۡ طَیِّبٰتِ مَا	رَزَقۡنٰكُمۡ
من اور سلویٰ	تم کھاؤ	اس کے پاکیزہ سے جو	ہم نے عطا کیا تم کو

وَمَا ظَلَمُوۡنَا	وَلٰكِنۡ	كَانُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ یَظۡلِمُوۡنَ ﴿۵۷﴾
اور انہوں نے ظلم نہیں کیا ہم پر	اور لیکن (بلکہ)	وہ اپنے آپ پر ہی ظلم کیا کرتے تھے

نوٹ

آسان عربی گرامر (از لطف الرحمٰن خان صاحب) میں آپ كَانَ اور لَیۡسَ پڑھ چکے ہیں۔ یہ جب جملہ اسمیہ پر داخل ہوتے ہیں تو خبر کو نصب دیتے ہیں۔ خبر کو نصب دینے والے تقریباً گیارہ مزید افعال ناقصہ عربی میں استعمال ہوتے ہیں۔ لیکن ان میں سے صرف ظَلَّ، اَصۡبَحَ، مَا زَالَ، مَا دَامَ، مَا بَرِحَ اور مَا فَتِئَ قرآنِ مجید میں استعمال ہوئے ہیں۔ اِن میں سے ظَلَّ کی تفصیل آپ آیت زیر مطالعہ میں پڑھ چکے ہیں۔ باقی افعال کی مختصر سی تفصیل درج ذیل ہے اور یہ بات بھی دوبارہ یاد کر لیجئے کہ اِن افعال میں سے لَیۡسَ اور مَادَامَ کے صرف ماضی کے صیغے استعمال ہوتے ہیں اور باقی تمام کے ماضی اور مضارع دونوں استعمال ہوتے ہیں۔

اَصۡبَحَ۔ یُصۡبِحُ (باب افعال) میں اصل مفہوم ہے، صبح کے وقت ہوجانا لیکن پھر زیادہ تر صرف ہوجانے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔﴿فَاَلَّفَ بَیۡنَ قُلُوۡبِکُمۡ فَاَصۡبَحۡتُمۡ بِنِعۡمَتِہٖۤ اِخۡوَانًا ۚ﴾(3/آل عمران:103)''پھر اس نے الفت پیدا کی تمہارے دلوں کے مابین تو تم ہو گئے اس کی نعمت سے بھائی بھائی۔''﴿فَتُصۡبِحُوۡا عَلٰی مَا فَعَلۡتُمۡ نٰدِمِیۡنَ ﴿۶﴾﴾(49/الحجرات:6)''تو تم ہو جاؤ گے اس پر جو تم نے کیا ندامت کرنے والے۔'' کَانَ کی طرح اَصۡبَحَ بھی ''تامّہ'' ہوجاتا ہے۔ اس وقت اس کے معنی ہوتے ہیں ''صبح کرنا'' یا ''صبح کے وقت آنا'' مثلاً کہیں گے اَصۡبَحۡنَا بِالۡخَیۡرِ ہم نے خیریت سے صبح کی۔ اَصۡبَحَ عَلَیۡھِمُ الطُّوۡفَانُ، صبح کے وقت ان پر طوفان آیا۔ قرآنِ مجید میں فرمایا:﴿فَاَصۡبَحَ فِی الۡمَدِیۡنَۃِ﴾(28/القصص:18)''پھر اس نے (یعنی حضرت موسیٰؑ نے) صبح کی شہر میں۔''﴿فَسُبۡحٰنَ اللّٰہِ حِیۡنَ تُمۡسُوۡنَ وَ حِیۡنَ تُصۡبِحُوۡنَ ﴿۱۷﴾﴾(30/الروم:17)''سو پاکی بیان کرو اللہ تعالیٰ کی جب تم شام کرو اور جب تم صبح کرو۔''

زَالَ۔ یَزَالُ (ف) کے معنی ہیں زائل ہونا۔ اس سے پہلے جب مَا نافیہ یا لَا لگتا ہے تو معنی ہوتے ہیں زائل نہ ہونا۔ پھر یہ 'ہمیشہ ہونے' کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔﴿فَمَا زِلۡتُمۡ فِیۡ شَکٍّ مِّمَّا جَآءَکُمۡ بِہٖ ؕ﴾(40/مومن:34)''تو تم ہمیشہ شک میں رہے اس سے جو وہ لایا تمہارے پاس۔''﴿وَ لَا یَزَالُوۡنَ یُقَاتِلُوۡنَکُمۡ حَتّٰی یَرُدُّوۡکُمۡ عَنۡ دِیۡنِکُمۡ﴾(2/البقرۃ:217)''اور وہ ہمیشہ قتال کرتے رہیں گے تم سے یہاں تک کہ وہ پھیر دیں تم کو تمہارے دین سے۔''

مَادَامَ میں اصل فعل دَامَ ہے جس کے معنی ہیں ہمیشہ کے لیے ہوجانا یا رہنا اس کے ساتھ جو مَا لگا ہے۔ یہ مَا ظرفیہ ہے یعنی اس میں ظرف (وقت) کا مفہوم ہے جس کے معنی ہیں ''جب تک۔'' اس طرح مَادَامَ کا مطلب ہوجاتا ہے ''وہ جب تک رہا۔''﴿وَ اَوۡصٰنِیۡ بِالصَّلٰوۃِ وَ الزَّکٰوۃِ مَا دُمۡتُ حَیًّا ﴿۳۱﴾﴾(19/مریم:31)''اور اس نے مجھے تاکید کی نماز کی اور زکوٰۃ کی جب تک میں رہوں زندہ۔''

بَرِحَ۔ یَبۡرَحُ (س) اس کا بنیادی مفہوم ہے کسی چیز کو چھوڑ دینا یا کسی جگہ سے ہٹ جانا۔ جب اس کے ساتھ 'لَا' یا 'لَنۡ' لگتا ہے تو نفی پیدا ہوجاتی ہے یعنی کسی چیز کو نہ چھوڑنا یا کسی جگہ سے نہ ہٹنا۔ اس طرح اس میں ہمیشگی کا مفہوم پیدا ہوجاتا ہے اور یہ ہمیشہ حَتّٰی کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً فرمایا:﴿قَالُوۡا لَنۡ نَّبۡرَحَ عَلَیۡہِ عٰکِفِیۡنَ حَتّٰی یَرۡجِعَ اِلَیۡنَا مُوۡسٰی ﴿۹۱﴾﴾(20/طٰہٰ:91)''قوم نے کہا ہم تو اسی کی عبادت پر جمے رہیں گے یہاں تک کہ لوٹ آئیں ہماری طرف موسیٰؑ۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔

فَتِئَ۔ یَفۡتَأُ (س، ف) اس کا بنیادی مفہوم ہے کسی کو کسی کام سے روکنا۔ جب اِس کے ساتھ 'لَا' یا 'مَا' نافیہ لگتا ہے تو مطلب ہوتا ہے کسی کو کسی کام سے نہ روکنا۔ اس سے ہمیشگی کا مفہوم پیدا ہوتا ہے یعنی وہ ہمیشہ کرتا رہا یا کرتا رہے گا۔ قرآنِ مجید میں یہ فعل، افعال ناقصہ کی صورت میں صرف ایک مرتبہ سورہ یوسف کی آیت 85 میں استعمال ہوا ہے اور وہاں بھی 'لَا' محذوف ہے۔﴿قَالُوۡا تَاللّٰہِ تَفۡتَؤُا تَذۡکُرُ یُوۡسُفَ﴾(12/یوسف:85)''انہوں نے کہا اللہ کی قسم آپؑ ہمیشہ کرتے رہیں گے یوسفؑ کا تذکرہ۔'' (واللہ اعلم)۔

افعال ناقصہ کی مزید تفصیل عربی کا معلّم، حصہ سوم سے ایک نظر دیکھ لیں۔

آیت:58

﴿وَ اِذۡ قُلۡنَا ادۡخُلُوۡا ہٰذِہِ الۡقَرۡیَۃَ فَکُلُوۡا مِنۡہَا حَیۡثُ شِئۡتُمۡ رَغَدًا وَّ ادۡخُلُوا الۡبَابَ سُجَّدًا وَّ قُوۡلُوۡا حِطَّۃٌ نَّغۡفِرۡ لَکُمۡ خَطٰیٰکُمۡ ؕ وَ سَنَزِیۡدُ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴿۵۸﴾﴾

اِذۡ: البقرۃ آیت 30 دیکھیں۔ ق و ل: البقرۃ آیت 8 دیکھیں۔

د خ ل

(ن) دُخُوۡلًا داخل ہونا (لازم)۔ اس کی ضد خروج (نکلنا) ہے۔ یہ لفظ ظاہری اور معنوی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً فرمایا:

﴿ فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ ۚ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ؕ﴾ (3/آل عمران:97) ''اس میں واضح نشانیاں ہیں، ابراہیمؑ کے کھڑے ہونے کی جگہ ہے اور جو داخل ہوا اس میں وہ ہے امن میں ہونے والا۔'' ﴿ وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ﴾ (49/الحجرات:14) ''اور ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا'' اس کے ساتھ جب عَلٰی کا صلہ استعمال ہو تو مطلب ہوتا ہے کسی کی خدمت میں حاضر ہونا، کسی کی زیارت کرنا، یا کسی پر حملہ کرنا۔ مثلاً فرمایا: ﴿ وَجَآءَ اِخْوَةُ يُوْسُفَ فَدَخَلُوْا عَلَيْهِ ﴾ (12/یوسف:58) ''اور ایک روز آ نکلے برادرانِ یوسفؑ اور ان کی خدمت میں حاضر ہوئے'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔ ﴿ قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمَا ادْخُلُوْا عَلَيْهِمُ الْبَابَ ۚ ﴾ (5/المائدۃ:23) ''کہاں دو مردوں نے اللہ سے ڈرنے والوں میں سے کہ خدا کی نوازش تھی ان دو پر گھس جاؤ ان پر حملہ کر کے دروازہ میں'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)۔ اس صورت میں اس کا فعل مجہول بھی استعمال ہو جاتا ہے مثلاً فرمایا: ﴿ وَلَوْ دُخِلَتْ عَلَيْهِمْ مِّنْ اَقْطَارِهَا ﴾ (33/الاحزاب:14) ''اور اگر مدینے کے اطراف سے ان پر (لشکر) داخل کیے جاتے'' (ترجمہ احسن البیان)۔ لیکن اکثر بزرگوں نے آیت میں دُخِلَتْ کا ترجمہ فعل معروف کے لحاظ سے کیا ہے۔ مثلاً ''اور اگر شہر میں کوئی گھس آئے ان پر'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)، ''اور اگر ان (لوگوں) پر (مدینہ کے) اطراف سے کوئی (لشکر کافروں کا) آ گھسے'' (ترجمہ ماجدیؒ)، ''اگر گھس آتے (کفار کے لشکر) ان پر مدینہ کے اطراف سے'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔ (واللہ اعلم)۔ اس کے ساتھ 'ب' کا صلہ استعمال ہو تو مطلب ہوتا ہے داخل کرنا اور دَخَلَ بِاِمْرَءَتِہٖ، کنایۃً بیوی سے ہم بستری کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ قرآنِ مجید میں فرمایا: ﴿ وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ ۡ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ ﴾ (4/النساء:23) ''اور تمہاری بیویوں کی بیٹیاں جو تمہاری گودوں میں (پرورش پا رہی) ہیں اُن بیویوں سے جن سے تم صحبت کر چکے ہو اور اگر تم نے صحبت نہ کی ہو ان بیویوں سے تو کوئی حرج نہیں تم پر (ان کی بیٹیوں سے نکاح کرنے میں)'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔

اُدْخُلْ — ج: اُدْخُلُوْا۔ فعل امر ہے۔ تو داخل ہو۔ ﴿ قِيْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ ؕ﴾ (36/یٰسٓ:26) ''کہا گیا تو داخل ہو جا جنت میں۔'' ﴿ وَقِيْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيْنَ ۝ ﴾ (66/التحریم:10) ''اور کہا گیا تم دونوں داخل ہو آگ میں، داخل ہونے والوں کے ساتھ۔'' اور آیت زیرِ مطالعہ۔

دَاخِلٌ — ج: دَاخِلُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ داخل ہونے والا۔ اوپر آیت نمبر (66/التحریم:10) دیکھیں۔ ﴿ فَاِنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ ۝ ﴾ (5/المائدۃ:22) ''پھر اگر وہ وہاں سے نکل گئے، تو ہم داخل ہوں گے۔''

(س) دَخَلًا — عقل یا جسم میں خرابی داخل ہونا۔

دَخَلٌ — اسم ذات ہے۔ عقلی یا جسمانی خرابی۔ فساد۔ چھپی ہوئی دشمنی۔ فریب۔ خاندانی عیب یعنی وہ لوگ جو اپنے آپ کو کسی کی جانب منسوب کرتے ہوں اور فی الحقیقت ان میں سے نہ ہوں۔ ﴿ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ ﴾ (16/النحل:94) ''اور اپنی قسموں کو باہمی فساد کا ذریعہ نہ بناؤ'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔ ''اور نہ بناؤ اپنی قسموں کو آپس میں فریب دینے کا ذریعہ'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔

(افعال) اِدْخَالًا — داخل کرنا۔ ﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ ﴾ (4/النساء:57) ''اور جو لوگ ایمان لائے اور عمل کیے بھلے، ہم داخل کریں گے ان کو باغات میں۔''

اَدْخِلْ — ج: اَدْخِلُوْا۔ فعل امر ہے۔ تو داخل کر۔ ﴿ وَاَدْخِلْنِيْ بِرَحْمَتِكَ فِيْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ ﴾ (27/النمل:19) ''اور تو

داخل کر مجھ کو اپنی رحمت سے اپنے صالح بندوں میں۔'' ﴿اَدۡخِلُوۡۤا اٰلَ فِرۡعَوۡنَ اَشَدَّ الۡعَذَابِ﴾ (40/مومن:46)
''تم داخل کر دو فرعونیوں کو سخت ترین عذاب میں۔''

مُدۡخَلٌ — اسم المفعول ہے جو ظرف کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے۔ داخل کیا ہوا یا داخل کرنے کی جگہ۔ ﴿نُکَفِّرۡ عَنۡکُمۡ سَیِّاٰتِکُمۡ وَ نُدۡخِلۡکُمۡ مُّدۡخَلًا کَرِیۡمًا﴾ (4/النساء:31) ''تو ہم دور کریں گے تم سے تمہاری برائیوں کو اور ہم داخل کریں گے تم کو باعزت داخل کرنے کی جگہ میں۔''

(افتعال) اِدِّخَالًا — کسی جگہ مشقت سے داخل ہونا۔ گھسنا۔

مُدَّخَلٌ — اسم المفعول جو بطور ظرف استعمال ہوتا ہے۔ گھسنے کی جگہ۔ ﴿لَوۡ یَجِدُوۡنَ مَلۡجَاً اَوۡ مَغٰرٰتٍ اَوۡ مُدَّخَلًا﴾ (9/التوبہ:57) ''اگر وہ لوگ پائیں کوئی پناہ گاہ یا کوئی غار یا کوئی گھسنے کی جگہ۔''

ق ر ی

(ض) قَرًی اور قَرۡیًا — جمع کرنا۔ کہتے ہیں قَرَیۡتُ الۡمَاءَ فِی الۡحَوۡضِ۔ میں نے حوض میں پانی جمع کر دیا۔

قَرۡیَۃٌ — ج: قُرًی۔ جب لام تعریف داخل ہو تو اَلۡقُرٰی۔ اسم ذات ہے۔ جہاں انسان جمع ہو کر آباد ہو جائیں۔ اس مفہوم میں یہ لفظ بستی اور بستی والوں، دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ﴿رَبَّنَاۤ اَخۡرِجۡنَا مِنۡ ہٰذِہِ الۡقَرۡیَۃِ﴾ (4/النساء:75) ''اے ہمارے رب تو نکال ہم کو اس بستی سے۔'' ﴿وَ سۡـَٔلِ الۡقَرۡیَۃَ الَّتِیۡ کُنَّا فِیۡہَا﴾ (12/یوسف:82) ''اور آپؑ پوچھ لیجیے اس بستی والوں سے جس میں ہم تھے۔'' ﴿لَا یُقَاتِلُوۡنَکُمۡ جَمِیۡعًا اِلَّا فِیۡ قُرًی مُّحَصَّنَۃٍ اَوۡ مِنۡ وَّرَآءِ جُدُرٍ ؕ﴾ (59/الحشر:14) ''یہ لوگ نہیں لڑیں گے تم سے جم کر مگر قلعہ بند شہروں میں یا دیواروں کے پیچھے سے۔'' ﴿وَ تِلۡکَ الۡقُرٰۤی اَہۡلَکۡنٰہُمۡ لَمَّا ظَلَمُوۡا﴾ (18/الکہف:59) ''اور یہ بستیوں والے، ہم نے ہلاک کیا ان کو جب انہوں نے ظلم کیا۔'' ﴿وَ لِتُنۡذِرَ اُمَّ الۡقُرٰی وَ مَنۡ حَوۡلَہَا ؕ﴾ (6/الانعام:92) ''اور تا کہ آپؐ ڈرائیں مکہ والوں کو اور جو اُس کے ارد گرد ہیں۔'' اُمُّ الۡقُرٰی: مکہ معظّمہ کا دوسرا نام ہے۔ ام القری کے معنی بستیوں کی اصل اور جڑ کے ہیں۔ یا مرکزی بستی کے۔ مکہ معظّمہ چونکہ ساری دنیا کا دینی مرکز ہے۔ تمام روئے زمین پر خدا کا پہلا گھر وہیں بنا۔ اور قبلۂ اول ہونے کا شرف اسی کو حاصل ہوا۔ زمانۂ جاہلیت میں بھی تمام عرب کا دینی و دنیوی مرجع تھا اور آج بھی نہ صرف عرب بلکہ تمام عالمِ اسلامی کا۔ ان وجوہ سے قرآن مجید نے مکہ معظّمہ کو ام القری کہا ہے۔ (لغات القرآن، ج ا، ص ۲۳۷)

ء ك ل: البقرۃ آیت 35 دیکھیں۔ حَیۡثُ: البقرۃ آیت 35 دیکھیں۔ ش ی ء: البقرۃ آیت 20 دیکھیں۔ ر غ د: البقرۃ آیت 35 دیکھیں۔

بَابٌ ج: اَبۡوَابٌ۔ دروازہ۔

س ج د: البقرۃ آیت 34 دیکھیں۔

ح ط ط

(ن) حَطًّا — اترنا۔ نازل ہونا۔ (لازم)۔ کسی چیز کو اوپر سے نیچے اتارنا یا کسی کا بوجھ اتارنا (متعدی)۔ کہا جاتا ہے حَطَطۡتُ الرَّحۡلَ میں نے سواری سے پالان اتار کر نیچے رکھ دیا۔

(استفعال) اِسْتِحْطَاطًا بوجھ اتارنے کی درخواست کرنا۔

حِطَّۃٌ اسم ذات ہے۔ بوجھ اتارنے کی درخواست یا دعا۔ قرآن مجید میں یہ لفظ گناہوں کا بوجھ اتارنے کی دعا کے لیے آیا ہے ۔آیت زیر مطالعہ۔ اس سے مراد ہے حُطَّ عَنَّا ذُنُوْبَنَا یعنی اے اللہ ہمارے گناہ ہم سے اتار دے اور بعض بزرگوں نے اس سے مراد لی ہے قُوْلُوْا صَوَابًا یعنی صحیح بات کہنا۔ مولانا مودودیؒ فرماتے ہیں: ''حِطَّۃٌ کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ خدا سے اپنی خطاؤں کی معافی مانگتے ہوئے جانا، دوسرے یہ کہ لوٹ مار اور قتلِ عام کے بجائے بستی کے باشندوں میں درگزر اور عام معافی کا اعلان کرتے جانا۔'' اور مولانا عبدالماجد دریا بادیؒ فرماتے ہیں: ''قُوْلُوْا حِطَّۃٌ سے یہ مراد نہیں کہ بعینہٖ لفظ حِطَّۃٌ کا تلفظ ادا کرتے جاؤ۔ یہ لفظ تو عربی ہے، اور اسرائیلیوں کی زبان عربی نہیں۔ عبرانی تھی۔ مراد یہ ہے کہ انہیں زبان سے بھی کلمات توبہ واستغفار ادا کرتے رہنے کا حکم ملا تھا۔''

غ ف ر

(ض) غَفْرًا اور غُفْرَانًا اس کا بنیادی مفہوم ہے ڈھانپ دینا، چھپا دینا۔ امام راغبؒ فرماتے ہیں کہ غَفَرَ کے معنی ہیں کسی چیز پر کوئی ایسی چیز پہنا دینا جو اسے میل کچیل اور دوسری نقصان دہ چیزوں سے محفوظ رکھے۔ چنانچہ عربی میں کہتے ہیں اِغْفِرْ ثَوْبَكَ فِی الْوِعَاءِ اپنے کپڑوں کو تھیلے وغیرہ میں ڈال کر چھپا دو۔ اسی طرح کہتے ہیں غَفَرَ الشبابَ بالخضابِ اس نے خضاب سے بالوں کی سفیدی کو چھپا دیا۔ اَلْمِغْفَرُ لوہے کے خود (لوہے کی ٹوپی) کو کہتے ہیں جو دوران جنگ سپاہی سر پر پہن لیتے ہیں جس سے سر دشمن کے وار سے محفوظ رہتا ہے۔ اَلْغِفَارَۃُ اس کپڑے کو کہتے ہیں جس سے عورتیں اپنے ڈوپٹے کو تیل سے بچانے کے لیے اس کے نیچے سر پر اوڑھ لیتی ہیں اور اس کپڑے کو بھی کہتے ہیں جس سے کمان کے گوشے کو لپیٹتے ہیں اور اس بادل کو بھی جو دوسرے بادل پر چھایا ہوا ہو۔ ان تمام بنیادی مفاہیم کے ساتھ یہ لفظ جب قرآن وسنت میں اللہ تعالیٰ کے لیے استعمال ہو تو مطلب ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کا بندے کے گناہوں کو چھپا دینا، ڈھانپ دینا یا بندے کو گناہوں کی سزا سے محفوظ رکھنا۔ پھر اردو میں اس کا ترجمہ معاف کر دینا اور بخش دینا سے کیا جاتا ہے۔ ﴿وَمَنْ یَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۟﴾ (3/آل عمران:135) ''اور کون بخشتا ہے گناہوں کو اللہ کے سوا۔'' یہ لفظ بندوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے مثلاً فرمایا: ﴿وَلَمَنْ صَبَرَ وَ غَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝﴾ (42/الشوریٰ:43) ''اور بے شک جس نے صبر کیا اور معاف کیا تو یقیناً یہ حوصلے کے کاموں میں سے ہے۔'' کبھی یہ لفظ ظاہری طور پر درگزر کرنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے چاہے دل سے معاف نہ بھی کیا جائے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿قُلْ لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یَغْفِرُوْا لِلَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ اَیَّامَ اللّٰهِ﴾ (45/الجاثیہ:14) ''آپؐ کہیے ان لوگوں سے جو ایمان لائے کہ وہ لوگ درگزر کریں ان سے جو امید نہیں رکھتے اللہ کے دنوں کی یعنی بدلے کے دن کی۔''

اِغْفِرْ فعل امر ہے۔ تو بخش دے۔ تو درگزر کر۔ ﴿رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ﴾ (23/المؤمنون:118) ''اے میرے رب تو بخش دے اور تو رحم فرما۔''

غَافِرٌ ج: غَافِرُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ معاف کرنے والا۔ ﴿غَافِرِ الذَّنْۢبِ وَ قَابِلِ التَّوْبِ﴾ (40/المؤمن:3) ''معاف کرنے والا گناہ کا اور قبول کرنے والا توبہ کا۔''

غَفُوْرٌ — اسم المبالغہ ہے۔ بہت زیادہ یعنی دل کھول کر بخشنے والا۔ یہ اسمائے حسنٰی میں سے ہے۔﴿ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴾ (2/البقرہ:173) ”بے انتہا بخشنے والا ہے ہر حال میں رحم کرنے والا ہے۔“

غَفَّارٌ — اسم المبالغہ ہے۔ کثرت سے یعنی بار بار بخشنے والا۔ یہ بھی اسمائے حسنٰی میں سے ہے۔﴿ وَاِنِّیْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰی ﴾ (20/طٰہٰ:82) ”اور یقیناً میں کثرت سے بخشنے والا ہوں اس کو جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور عمل کیے نیک پھر اس نے ہدایت پائی۔“

مَغْفِرَۃٌ — اسم ذات ہے۔ معافی۔ بخشش۔﴿ وَاللّٰہُ یَدْعُوْٓا اِلَی الْجَنَّۃِ وَالْمَغْفِرَۃِ ﴾ (2/البقرہ:221) ”اور اللہ بلاتا ہے جنت اور مغفرت کی طرف۔“

(استفعال) اِسْتِغْفَارًا — قول اور عمل سے معافی مانگنا۔ قول اور عمل سے بخشش طلب کرنا۔ اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہی ہوتی ہے چاہے اللہ کا نام مذکور ہو یا نہ ہو۔ جس سے معافی مانگی جائے وہ مفعول بنفسہٖ آتا ہے۔ جس کے لیے معافی مانگی جائے اس پر لام کا صلہ آتا ہے اور جس غلطی یا گناہ کی معافی مانگی جائے اس پر کبھی لام کا صلہ آتا ہے اور کبھی نہیں۔﴿ لَوْ لَا تَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴾ (27/النمل:46) ”تم لوگ کیوں نہیں بخشش مانگتے اللہ سے تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔“ ﴿ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ﴾ (3/آل عمران:135) ”پھر انہوں نے معافی مانگی اپنے گناہوں کی۔“ ﴿ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَکُمْ رَبِّیْ ﴾ (12/یوسف:98) ”عنقریب میں بخشش طلب کروں گا تمہارے لیے اپنے رب سے۔“

اِسْتَغْفِرْ — ج: اِسْتَغْفِرُوْا۔ فعل امر ہے۔ تو معافی مانگ۔﴿ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ ﴾ (3/آل عمران:159) ”اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم مغفرت طلب کریں ان کے لیے اور مشورہ کریں ان سے فیصلوں میں۔“

مُسْتَغْفِرٌ — ج: مُسْتَغْفِرُوْنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ معافی مانگنے والا۔﴿ وَالْمُسْتَغْفِرِیْنَ بِالْاَسْحَارِ ﴾ (3/آل عمران:17) ”اور بخشش طلب کرنے والے راتوں کے پچھلے پہر میں۔“

خ ط ء

(س) (ا) خِطْأً اور خِطْأَۃً — قصد و ارادے کے ساتھ غلطی کرنا۔ گناہ کرنا۔ یہ قابل گرفت ہے۔ قرآن مجید میں فعل استعمال نہیں ہوا۔

(ب) خَطَأً — بنیادی مفہوم ہے صحیح راہ سے ہٹ جانا۔ چوک جانا۔ بغیر قصد اور ارادے کے غلطی کرنا۔ یہ (آخرت کے اعتبار سے) قابل گرفت نہیں۔ قرآن مجید میں فعل استعمال نہیں ہوا ہے۔

خَطِیْٓئَۃٌ — ج: خَطِیْٓئٰتٌ اور خَطَایَا۔ اسم ذات ہے۔ اس کا مطلب قریب قریب سَیِّئَۃٌ کی طرح ہے۔ غلطی۔ گناہ۔ چاہے ارادہ اور قصد سے ہو یا بغیر ارادے اور قصد کے۔﴿ مَنْ کَسَبَ سَیِّئَۃً وَّ اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِیْٓئَتُهٗ فَاُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ ﴾ (2/البقرہ:81) ”جس نے کمائی کوئی برائی اور اس کو گھیر لیا اس کی غلطی نے تو وہ لوگ آگ والے ہیں۔“ ﴿ وَمَنْ یَّکْسِبْ خَطِیْٓئَۃً اَوْ اِثْمًا ﴾ (4/النساء:112) ”اور جس نے کمائی کوئی خطا یا کوئی گناہ۔“ امام راغبؒ فرماتے ہیں اس آیت میں خَطِیْٓئَۃً سے مراد وہ فعل ہے جو بلا قصد ہوا ہو۔ اور اسی قسم کی خطا کے متعلق حضرت ابراہیمؑ نے کہا تھا ﴿ وَالَّذِیْٓ اَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَ لِیْ خَطِیْٓئَتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ ﴾ (26/الشعراء:82) ”اور وہ جس سے میں امید رکھتا ہوں کہ قیامت کے دن میرے گناہ بخش دے گا۔“ ﴿ وَّ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا نَّغْفِرْ لَکُمْ خَطِیْٓئٰتِکُمْ ﴾

(7/الاعراف:161)''اور تم لوگ داخل ہو دروازے میں سجدہ کرنے والے ہوتے ہوئے تو ہم بخش دیں گے تمہاری خطاؤں کو۔'' ﴿ اِنَّاۤ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِیَغۡفِرَ لَنَا خَطٰیٰنَا ﴾(20/طٰہٰ:73)''بے شک ہم ایمان لائے اپنے رب پر تاکہ وہ بخش دے ہمارے لیے ہماری خطاؤں کو۔'' اور آیت زیر مطالعہ۔

خِطْأٌ اسم ذات بھی ہے۔قصد و ارادے کے ساتھ کیا ہوا گناہ یا غلطی۔ یہ قابل گرفت ہے۔ ﴿ نَحۡنُ نَرۡزُقُهُمۡ وَ اِیَّاكُمۡ ؕ اِنَّ قَتۡلَهُمۡ كَانَ خِطۡاً كَبِیۡرًا ﴾(17/بنی اسرائیل:31)''ہم رزق دیتے ہیں ان کو بھی اور تم کو بھی بے شک ان کو قتل کرنا بڑی غلطی ہے۔''

خَطَأٌ اسم ذات بھی ہے۔ بغیر ارادے اور قصد سے کیا ہوا گناہ یا غلطی۔ ﴿ وَ مَا كَانَ لِمُؤۡمِنٍ اَنۡ یَّقۡتُلَ مُؤۡمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ ﴾ (4/النساء:92)''اور نہیں ہے جائز کسی مومن کے لیے کہ وہ قتل کرے کسی مومن کو مگر بلا ارادہ غلطی سے۔'' اسی قسم کی خطا کے متعلق آنحضرتؐ نے فرمایا رُفِعَ عَنْ اُمَّتِی الْخَطَأُ وَالنِّسْیَانُ کہ میری امت سے خطا اور نسیان اٹھالیے گئے ہیں۔

خَاطِئٌ ج: خَاطِؤُنَ۔ اسم الفاعل ہے۔ واحد مذکر۔ جان بوجھ کر غلطی کرنے والا۔ گناہ گار۔ ﴿ یٰۤاَبَانَا اسۡتَغۡفِرۡ لَنَا ذُنُوۡبَنَاۤ اِنَّا كُنَّا خٰطِـِٕیۡنَ ﴾ (12/یوسف:97)''اے ہمارے والد آپؑ بخشش طلب کریں ہمارے لیے ہمارے گناہوں کی بے شک ہم غلطی کرنے والے تھے۔''

خَاطِئَۃٌ اسم الفاعل ہے۔ واحد مؤنث۔ جان بوجھ کر غلطی کرنے والی۔ گناہگار۔ ﴿ نَاصِیَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ۚ ﴾ (96/العلق:16)''وہ پیشانی جو جھوٹی اور خطا کار ہے۔'' کبھی خَاطِئَۃٌ کا اطلاق ''گناہ'' کے لیے بھی ہوجاتا ہے۔ مثلاً فرمایا: ﴿ وَ الۡمُؤۡتَفِكٰتُ بِالۡخَاطِئَةِ ۚ ﴾ (69/الحاقۃ:9)''اور الٹی ہوئی بستیوں والوں نے (بڑے بڑے) قصور کئے تھے۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔ علامہ قرطبیؒ لکھتے ہیں اَلْخَاطِئَۃُ: اَلذَّنْبُ الْعَظِیْمُ۔ بہت بڑا گناہ۔

(افعال) **اِخْطَاءٌ** بلا ارادہ غلطی کرنا۔ چوک جانا۔ ﴿ وَ لَیۡسَ عَلَیۡكُمۡ جُنَاحٌ فِیۡمَاۤ اَخۡطَاۡتُمۡ بِهٖ ۙ ﴾(33/الاحزاب:5)''اور تم پر کوئی گناہ نہیں ہے اس میں جس میں تم چوک گئے۔'' اور حدیث پاک میں ہے مَنِ اجْتَھَدَ فَاَخْطَأَ فَلَهٗ اَجْرٌ جس نے اجتہاد کیا، لیکن اس سے غلطی ہوگئی اسے پھر بھی اجر ملے گا۔ قرآن مجید میں استعمال نہیں ہوا۔

مُخْطِئٌ اسم الفاعل ہے۔ مخطی اُسے کہا جاتا ہے جو نیکی کا ارادہ کرے لیکن اُس سے غلطی ہوجائے۔

ز ی د: البقرۃ آیت 10 دیکھیں۔

ح س ن

(ک) (ن) **حُسْنًا** پسندیدہ ہونا، خوبصورت ہونا، اچھا یا بھلا ہونا۔ ﴿ وَ حَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِیۡقًا ؕ ﴾(4/النساء:69)''اور اچھے ہوئے وہ لوگ بطور ساتھی کے۔''

حُسْنٌ اسم ذات ہے۔ خوبصورتی۔ اچھائی۔ بھلائی۔ نوٹ کر لیجیے یہ لفظ اسم ذات ہے اس لیے بطور صفت نہیں آسکتا کیونکہ اسم ذات صفت نہیں بنتے۔ ﴿ وَاللّٰهُ عِنۡدَهٗ حُسۡنُ الثَّوَابِ ﴾ (3/آل عمران:195)''اور اللہ، اس کے پاس ثواب کی خوبصورتی یعنی بہترین بدلہ ہے۔''

حَسَنٌ ج: حِسَانٌ۔ مؤنث: حَسَنَۃٌ وَ حُسْنَآءُ۔ ج: حَسَنَاتٌ اور حِسَانٌ۔ اسم صفت ہے۔ خوبصورت۔ حسین۔ اچھا۔ عمدہ۔ اس سے مراد ہر وہ نعمت ہے جو انسان کو حاصل ہو کر اس کی مسرت کا سبب بنے۔ یہ لفظ تمام ظاہری اور باطنی خوبیوں اور بھلائیوں کو شامل ہے۔ ﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا﴾ (2/البقرہ:245) ''کون ہے جو قرض دے اللہ کو ایک خوبصورت قرض۔'' ﴿مَنْ یَّشْفَعْ شَفَاعَۃً حَسَنَۃً یَّکُنْ لَّہٗ نَصِیْبٌ مِّنْھَا ج﴾ (4/النساء:85) ''جو سفارش کرے کوئی اچھی سفارش کی تو اس کے لیے ہے ایک حصہ اس میں سے۔'' ﴿فِیْھِنَّ خَیْرٰتٌ حِسَانٌ ﴿70﴾﴾ (55/الرحمٰن:70) ''ان میں اچھی سیرت والیاں، اچھی صورت والیاں ہوں گی۔'' ﴿مُتَّکِـِٕیْنَ عَلٰی رَفْرَفٍ خُضْرٍ وَّ عَبْقَرِیٍّ حِسَانٍ ﴿76﴾﴾ (55/الرحمٰن:76) ''سبز مسندوں اور عمدہ فرشوں پر تکیہ لگائے ہوئے ہوں گے۔'' (ترجمہ احسن البیان)۔

نوٹ ا: حِسَانٌ، حَسَنٌ کی بھی جمع ہے اور حَسَنَۃٌ وَ حُسْنَآءُ کی بھی جمع ہے۔ چنانچہ الرحمٰن:70 میں یہ ایک مونث لفظ (خَیْرَاتٌ) کی صفت کے طور پر استعمال ہوا ہے اور آیت 76 میں ایک مذکر لفظ (عَبْقَرِیٌّ) کی صفت کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ (واللہ اعلم)۔

نوٹ ۲: حَسَنَۃٌ اور اس کی جمع حَسَنَاتٌ صفت کے طور پر بھی استعمال ہوتے ہیں جیسے شَفَاعَۃٌ حَسَنَۃٌ، مَوْعِظَۃٌ حَسَنَۃٌ، اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ وغیرہ اور بطور اسم ذات بھی استعمال ہوتے ہیں اس صورت میں اس کے معنی ہوتے ہیں، نیکی، بھلائی، خوبی، نعمت وغیرہ۔ چنانچہ قرآن مجید میں فرمایا: ﴿رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّ فِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً﴾ (2/البقرۃ:201) ''اے ہمارے رب عطا فرما ہمیں دنیا میں بھی بھلائی اور آخرت میں بھی بھلائی۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن) ﴿اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْھِبْنَ السَّیِّاٰتِ ط﴾ (11/ھود:114) ''بے شک نیکیاں مٹا دیتی ہیں برائیوں کو۔'' حَسَنَۃٌ کی ضد سَیِّئَۃٌ آتی ہے جیسے فرمایا: ﴿اِنْ تَمْسَسْکُمْ حَسَنَۃٌ تَسُؤْھُمْ ز وَاِنْ تُصِبْکُمْ سَیِّئَۃٌ یَّفْرَحُوْا بِھَا ط﴾ (3/آل عمران:120) ''اگر پہنچے تمہیں کوئی بھلائی تو بری لگتی ہے اُنہیں اور اگر پہنچے تمہیں کوئی تکلیف تو (بڑے) خوش ہوتے ہیں اُس سے۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔

اَحْسَنُ مؤنث: حُسْنٰی۔ اسم التفضیل ہے۔ زیادہ اچھا یا سب سے اچھا۔ ﴿وَ مَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰہِ صِبْغَۃً﴾ (2/البقرہ:138) ''اور کون زیادہ اچھا ہے اللہ سے بلحاظ رنگ کے۔'' ﴿وَ تَمَّتْ کَلِمَتُ رَبِّکَ الْحُسْنٰی عَلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ۵ بِمَا صَبَرُوْا ط﴾ (7/الاعراف:137) ''اور پورا ہوا تیرے رب کا سب سے اچھا فرمان بنی اسرائیل پر بسبب اس کے جو انہوں نے صبر کیا۔'' ﴿قُلْ ھَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَی الْحُسْنَیَیْنِ ط﴾ (9/التوبۃ:52) ''آپ یہ بھی کہہ دیجئے تم تو ہمارے حق میں دو بھلائیوں ہی میں سے ایک (بھلائی) کے منتظر رہتے ہو۔'' (ترجمہ ماجدیؒ)۔ آیت میں حُسْنَیَیْنِ، حُسْنٰی کا تثنیہ ہے۔ اور اَلْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰی (سب سے اچھے نام) سے مراد ہیں اللہ تعالیٰ کے ۹۹ صفاتی نام۔ قرآنِ مجید میں فرمایا: ﴿قُلِ ادْعُوا اللّٰہَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ط اَیًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَہُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ج﴾ (17/بنی اسرائیل:110) ''کہہ دیجئے کہ اللہ کو اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر، جس نام سے بھی پکارو تمام اچھے نام اسی کے ہیں۔'' (ترجمہ احسن البیان)۔

(افعال) اِحۡسَانًا اس کے اصل لغوی معنی ہیں ''کسی کام کو حسن وخوبی کے ساتھ کرنا''۔ اس کی پھر دو قسمیں ہیں (1) کسی کام کو اپنی ذات میں اچھا اور مکمل کرنا۔ اپنے فعل میں حسن پیدا کرنا اور یہ چیز حسنِ علم اور حسنِ عمل سے پیدا ہوتی ہے۔ (2) بندوں کے حقوق حسن وخوبی کے ساتھ ادا کرنا، ان سے حسن سلوک کرنا اور ان پر انعام کرنا۔ ان معنوں میں عموماً اِلیٰ کا صلا استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا: ﴿وَاَحۡسِنۡ كَمَاۤ اَحۡسَنَ اللّٰهُ اِلَيۡكَ﴾ (28/القصص:77) ''اور احسان کیا کر (غریبوں پر) جس طرح اللہ نے تجھ پر احسان فرمایا ہے۔'' (ترجمہ ضیاء القرآن)۔ اردو زبان میں احسان کا لفظ عام طور پر اسی دوسرے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ کسی شخص کے عمل میں جب احسان کی یہ دونوں قسمیں جمع ہوتی ہیں تب اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان بذاتِ خود نیکی اور بھلائی کا پیکر بن کر دوسروں کا بھلا چاہتا ہے۔ ایک طرف تو اس کی عبادت میں حسن اور اخلاص پیدا ہوتا ہے۔ وہ اللہ کی عبادت یوں کرتا ہے کہ گویا وہ اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے یا کم از کم اسے یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کی وضاحت حدیث جبرئیلؑ میں بیان ہوئی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا: اَلۡاِحۡسَانُ اَنۡ تَعۡبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنۡ لَّمۡ تَكُنۡ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ (صحیح بخاری) ''احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی ایسی بندگی کرو گویا کہ تم اسے دیکھ رہے ہو اور اگر یہ درجہ نصیب نہ ہو تو اتنی بات کا یقین ہو کہ اللہ تعالیٰ تمہیں دیکھ رہے ہیں۔'' اسے یہ یقین حاصل ہوتا ہے کہ اس کی بھلائی کا صلہ بھلائی ہی کی صورت میں ملے گا۔ آدمی فرائض سے بڑھ کر نوافل ادا کرتا ہے اس کے اعمال اور اخلاق بہترین ہو جاتے ہیں۔ اور دوسری طرف اس کے اردگرد انسان ہوں یا حیوان سب اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ بندوں سے معاملات کرتے وقت ایسا شخص عدل وانصاف سے بلند ہو کر فضل اور عفو کو اختیار کرتا ہے۔ کسی مزدور کو مزدوری دیتے وقت طے شدہ رقم سے زیادہ ادا کرتا ہے۔ کسی سے کوئی کوتاہی ہو جائے تو درگزر کرتا ہے۔ حیوانات تک ایسے شخص سے فائدہ اٹھاتے ہیں چنانچہ علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں: جس شخص کے گھر میں اس کی بلی کو اس کی خوراک اور ضروریات نہ ملیں اور جس کے پنجرے میں بند پرندوں کی پوری خبر گیری نہ ہوتی ہو وہ کتنی ہی عبادت کرے محسنین میں شمار نہیں ہوگا۔ (بحوالہ معارف القرآن، ج۵ ص۳۹۱)۔ قرآنِ مجید میں سے مثالیں: ﴿اِنَّا لَا نُضِيۡعُ اَجۡرَ مَنۡ اَحۡسَنَ عَمَلًا ۚ﴾ (18/الکھف:30) ''بے شک ہم ضائع نہیں کرتے اس کے اجر کو جو عمدہ (اور مفید) کام کرتا ہے۔'' ﴿اِذَا مَا اتَّقَوۡا وَّ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوۡا وَّ اٰمَنُوۡا ثُمَّ اتَّقَوۡا وَّ اَحۡسَنُوۡا ؕ﴾ (5/الاعراف:93) ''جبکہ انہوں نے تقویٰ اختیار کیا اور ایمان لائے اور عمل کیے بھلائیوں والے پھر انہوں نے (مزید) تقویٰ اختیار کیا اور ایمان لائے پھر انہوں نے (اور) تقویٰ اختیار کیا اور درجۂ احسان کو پہنچے۔''

عدل اور احسان میں فرق: قرآن مجید میں فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاۡمُرُ بِالۡعَدۡلِ وَالۡاِحۡسَانِ﴾ (16/النحل:90) ''بے شک اللہ تعالیٰ تم کو عدل اور احسان کرنے کا حکم دیتا ہے۔'' امام راغبؒ فرماتے ہیں: ''احسان عدل سے بڑھ کر چیز ہے کیونکہ دوسرے کا حق پورا ادا کر دینا اور اپنا حق پورا لے لینے کا نام عدل ہے لیکن احسان یہ ہے کہ دوسروں کو ان کے حق سے زیادہ دیا جائے اور اپنے حق سے کم لیا جائے لہٰذا احسان کا درجہ عدل سے بڑھ کر ہے۔'' (مفردات القرآن، ج۱ ص۲۳۷)۔ اور حضرت مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں: ''عدل تو یہ ہے کہ دوسرے کا حق پورا پورا اس کو دے دے اور اپنا وصول کر لے، نہ کم نہ زیادہ، اور کوئی تکلیف تمہیں پہنچائے تو ٹھیک اتنی ہی تکلیف تم اس کو پہنچاؤ نہ کم نہ زیادہ، اور احسان یہ ہے کہ دوسرے کو اس کے اصل حق سے زیادہ دو اور خود اپنے حق میں چشم پوشی سے کام لو، کہ کچھ کم ہو جائے تو بخوشی قبول کر لو، اسی طرح دوسرا کوئی تمہیں ہاتھ یا زبان سے ایذا پہنچائے تو تم برابر کا انتقام لینے کے بجائے اس کو